

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

مقدمہ

علوم قرآن اور علم تفسیر سے متعلق ضروری معلومات

ذی
محسن تقی عثمانی

استاذ حدیث دارالعلوم کراچی ۳۰
(فرزند حضرت مولانا محمد تقی عثمانی)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

پیش لفظ

والدہ ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہم کی تفسیر معارف القرآن کو اللہ تعالیٰ نے عوام مجاہد میں بڑے معمولی قبولیت عطا فرمائی، اور جلد اول کا پہلا ایڈیشن ہاتھوں ہاتھ ختم ہو گیا، دوسرے ایڈیشن کی طلبات کے وقت حضرت مصنف مدظلہم نے جلد اول پر عمل طور سے نظر ثانی فرمائی، اور اس میں کافی ترمیم و اضافہ عمل میں آیا، اسی کے ساتھ حضرت موصوف مدظلہم کی خواہش تھی کہ دوسری اشاعت کے وقت جلد اول کے شروع میں علوم القرآن اور اصول تفسیر سے متعلق ایک مختصر مقدمہ بھی تحریر فرمائیں، تاکہ تفسیر کے مطالعہ سے پہلے قارئین ان ضروری معلومات سے مستفید ہو سکیں، لیکن متواتر اراض اور ضعف کی بناء پر موصوف کے لئے بذات خود اس مقدمے کی تصنیف مشکل تھی، چنانچہ حضرت موصوف نے یہ ذمہ داری احقر کے سپرد فرمائی۔

احقر نے تعمیل حکم اور تحصیل سعادت کے لئے یہ کام شروع کیا تو یہ مقدمہ بہت طویل ہو گیا، اور علوم قرآن کے موضوع پر خاصی مفصل کتاب کی صورت بن گئی، اس پر ہی کتاب کو معارف القرآن کے شروع میں بطور مقدمہ شامل کرنا مشکل تھا، اس لئے حضرت والد صاحب مدظلہم کے ایما پر احقر نے اس مفصل کتاب کی تلخیص کی، اور صرف وہ مباحث باقی رکھے جن کا مطالعہ تفسیر معارف القرآن کے مطالعہ کرنے والے کے لئے ضروری تھا، اور جو ایک عام قاری کے لئے دلچسپی کا باعث ہو سکتے تھے، یہ تلخیص معارف القرآن جلد اول کے زیر نظر ایڈیشن میں بطور مقدمہ شامل کی جا رہی ہے، اللہ تعالیٰ اسے مسلمانوں کے لئے نافع اور مفید بنائے اور اس نایاب چیز کے لئے ذخیرہ آخرت ثابت ہو۔

ان موضوعات پر مبسوط علمی مباحث احقر کی اس مفصل کتاب میں مل سکیں گے جو انشاء اللہ عفریب عقل کتابی صورت میں شائع ہوگی، لہذا جو حضرات تحقیق اور تفصیل کے طالب ہوں وہ اس کتاب کی طرف رجوع فرمائیں، وَمَا تَوْفِیْقِیْ اِلَّا بِاللّٰهِ عَلَیْہِ تَوَكَّلْتُ وَالِیْہِ اُنِیْبُ۔

احقر
محمد تقی عثمانی
۲۳ ربیع الاول ۱۳۹۶ھ

دارالعلوم کورنگی
کراچی ۷۵

لے الحمد للہ یہ کتاب "علوم القرآن" کے نام سے شائع ہو چکی ہے۔ ناشر

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ کَفَّحَ سَبَیْلَہُمْ عَلَیْہِ سَبَیْلَہُ الْاِنْدِیْنِ اَصْطَفَیْ

وحی اور اس کی حقیقت

قرآن کریم چنانکہ سرور کائنات حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کے ذریعہ نازل کیا گیا کہ اس لئے سب سے پہلے وحی کے بارے میں چند ضروری باتیں سمجھ لینی چاہئیں۔

وحی کی ضرورت ہر مسلمان جانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اس دنیا میں آزمائش کے لئے بھیجا ہے، اور اس کے ذریعہ کچھ نفع و نقصان عطا کر کے پوری کائنات کو اس کی خدمت میں لگا دیا ہے، لہذا دنیا میں آنے کے بعد انسان کے لئے دو کام ناگزیر ہیں، ایک یہ کہ وہ اس کائنات سے اور اس میں پیدا کی ہوئی اشیاء سے ٹھیک ٹھیک کام لے، اور دوسرے یہ کہ اس کائنات کو استعمال کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کے احکام کو نظر رکھے، اور کوئی ایسی حرکت نہ کرے جو اللہ تبارک و تعالیٰ کی مرضی کے خلاف ہو۔

ان دونوں کاموں کے لئے انسان کو "علم" کی ضرورت ہے، اس لئے کہ جب تک اسے یہ معلوم نہ ہو کہ اس کائنات کی حقیقت کیلئے اس کی کونسی چیز کے کیا خواص ہیں؟ ان سے کس طرح فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے؟ اس وقت تک وہ دنیا کی کوئی بھی چیز اپنے فائدے کے لئے استعمال نہیں کر سکتا، نیز جب تک اسے یہ معلوم نہ ہو کہ اللہ تعالیٰ کی مرضی کیا ہے؟ وہ کون سے کاموں کو پسند اور کون کو ناپسند فرماتا ہے؟ اس وقت تک اس کے لئے اللہ تعالیٰ کی مرضی کے مطابق زندگی گزارنا ناممکن نہیں۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ تین چیزیں ایسی پیدا کی ہیں جن کے ذریعہ اسے مذکورہ باتوں کا علم حاصل ہوتا ہے، ایک انسان کے حواس، یعنی آنکھ، کان، منہ اور ہاتھ پاؤں وغیرہ عقل اور ضمیر، وحی، چنانچہ انسان کو بہت سی باتیں اپنے حواس کے ذریعہ معلوم ہو جاتی ہیں، بہت سی عقل کے ذریعہ اور جو باتیں ان دونوں ذرائع سے معلوم نہیں ہو سکتیں ان کا علم وحی کے ذریعے عطا کیا جاتا ہے۔

علم کے ان تینوں ذرائع میں ترتیب کچھ ایسی ہے کہ ہر ایک کی ایک خاص حد اور مخصوص اثر ہوتا ہے، جس کے آگے وہ کام نہیں دیتا، چنانچہ جو چیزیں انسان کو اپنے حواس سے معلوم ہو جاتی ہیں ان کا علم بڑی عقل سے نہیں ہو سکتا، مثلاً ایک دیوار کو آنکھ سے دیکھ کر آپ کو یہ علم ہو جاتا ہے کہ اس کا رنگ سفید ہے، لیکن اگر آپ اپنی آنکھوں کو بند کر کے صرف عقل کی مدد سے اس دیوار کا رنگ معلوم کرنا چاہیں تو یہ ناممکن ہے، اسی طرح جن چیزوں کا علم عقل کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے وہ صرف حواس سے معلوم

نہیں ہو سکتیں، مثلاً آپ صرت آنکھوں سے دیکھ کر یا ہاتھوں سے چھو کر یہ پتہ نہیں لگا سکتے کہ اس دیوار کو کسی انسان نے بنایا ہے، بلکہ اس نتیجہ تک پہنچنے کے لئے عقل کی ضرورت ہے۔

غرض جہاں تک حواس خمسہ کا دیتے ہیں وہاں تک عقل کوئی رہنمائی نہیں کرتی، اور جہاں حواس خمسہ جواب دیتے ہیں وہیں سے عقل کا کام شروع ہوتا ہے، لیکن اس عقل کی رہنمائی بھی غیر محدود نہیں ہے، یہ بھی ایک حد پر جا کر رک جاتی ہے، اور بہت سی باتیں ایسی ہیں جن کا علم نہ حواس کے ذریعہ حاصل ہو سکتا ہو اور نہ عقل کے ذریعہ، مثلاً اسی دیوار کے بائیں میں یہ معلوم کرنا کہ اس کو کس طرح استعمال کرنے سے، اللہ تعالیٰ راضی اور کس طرح استعمال کرنے سے ناراض ہوگا، یہ نہ حواس کے ذریعہ ممکن ہے نہ عقل کے ذریعہ، اس قسم کے سوالات کا جواب انسان کو دینے کے لئے جو ذریعہ اللہ تعالیٰ نے معترف فرمایا ہے اسی کا نام وحی ہے اور اس کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے کسی کو منتخب فرما کر اسے اپنا پیغمبر قرار دیدیتا ہو اور اس پر اپنا کلام نازل فرماتا ہے، اسی کلام کو وحی کہا جاتا ہے۔

اس سے واضح ہو گیا کہ وحی انسان کے لئے وہ اعلیٰ ترین ذریعہ علم ہے جو اسے اس کی زندگی سے متعلق اُن سوالات کا جواب دیتا کرتا ہے جو عقل اور حواس کے ذریعہ حل نہیں ہو سکتے، لیکن ان کا علم حاصل کرنا اس کے لئے ضروری ہے، اس سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ صرت عقل اور مشاہدہ انسان کی رہنمائی کے لئے کافی نہیں بلکہ اس کی ہدایت کے لئے وحی الہی ایک ناگزیر ضرورت ہے، اور چونکہ بنیادی طور پر وحی کی ضرورت پیش ہی اُس جگہ آتی ہے جہاں عقل کام نہیں دیتی، اس لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ وحی کی ہر بات کا ادراک عقل سے ہو ہی جائے، بلکہ جس طرح کسی چیز کا رنگ معلوم کرنا عقل کا کام نہیں بلکہ حواس کا کام ہے، اسی طرح بہت سے دینی عقائد کا علم عطا کرنا بھی عقل کے بجائے وحی کا منصب ہے، اور ان کے ادراک کے لئے بڑی عقل پر بھروسہ کرنا درست نہیں۔

جو شخص دعوہ اللہ خدا کے وجود پر قائم نہ ہو اس سے تو وحی کے مسئلہ پر بات کرنا بالکل کمزور ہے، لیکن جو شخص اللہ تعالیٰ کے وجود اور اس کی قدرت کا علم پر ایمان رکھتا ہے اس کے لئے وحی کی عقلی ضرورت، اس کے امکان اور حقیقی وجود کو سمجھنا کچھ مشکل نہیں، اگر آپ اس بات پر ایمان رکھتے ہیں کہ یہ کائنات ایک قادر مطلق نے پیدا کیا ہے، وہی اس کے مربوط اور محکم نظام کو اپنی حکمت بالغہ سے چلا رہا ہے، اور اسی لئے انسان کو کسی خاص مقصد کے تحت یہاں بھیجا ہے تو پھر یہ کیسے ممکن ہو کہ اس انسان کو پیدا کرنے کے بعد اُسے بالکل اندھیرے میں چھوڑ دیا ہو، اور اُسے یہ تک نہ بتایا ہو کہ وہ کیوں اس دنیا میں آیا ہے، یہاں اس کے ذمہ کیا فرائض ہیں؟ اس کی منزل مقصود کیا ہے؟ اور وہ کس طرح اپنے مقصد زندگی کو حاصل کر سکتا ہے؟ کیا کوئی شخص جس کے پریش و حواس سلامت ہوں ایسا کر سکتا ہے کہ اپنے کسی نوکر کو ایک خاص مقصد کے تحت کسی سفر پر بھیج دے، اور اُسے نہ چلنے نہ وقت سفر کا

مقصد بتائے، اور نہ بعد میں کسی پیغام کے ذریعہ اُس پر یہ واضح کرے کہ اسے کس کام کے لئے بھیجا گیا ہے؟ اور سفر کے دوران اس کی ڈیوٹی کیا ہوگی؟ جب ایک معمولی عقل کا انسان بھی ایسی حرکت نہیں کر سکتا تو آخر اس خداوند قدوس کے بائیں میں یہ تصور کیسے کیا جاسکتا ہے جس کی حکمت بالغہ سے کائنات کا یہ سارا نظام چل رہا ہے؟ یہ آخر کیسے ممکن ہو کہ جس ذات نے چاند سورج، آسمان، زمین، ستاروں اور ستاروں کا ایسا عجیب العقول نظام پیدا کیا ہو وہ اپنے بندوں تک پیغام رسانی کا کوئی ایسا انتظام بھی نہ کر سکے جس کے ذریعہ انسانوں کو ان کے مقصد زندگی سے متعلق ہدایت دی جاسکے؟ اگر اللہ تعالیٰ کی حکمت بالغہ پر ایمان ہو تو پھر یہ بھی ماننا پڑے گا کہ اس نے اپنے بندوں کو اندھیرے میں نہیں چھوڑا، بلکہ ان کی رہنمائی کے لئے کوئی باقاعدہ نظام ضرور بنایا ہے، ہر رہنمائی کے اسی باقاعدہ نظام کا نام وحی در رسالت ہے۔

اس سے صاف واضح ہو جاتا ہے کہ وحی محض ایک نئی اعتقاد ہی نہیں بلکہ ایک عقلی ضرورت ہے جس کا انکار درحقیقت اللہ تعالیٰ کی حکمت بالغہ کا انکار ہے۔

وحی در رسالت کا یہ مقدمہ سلسلہ ہر کار و دو عالم محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم حضور پر نور وحی کے طریقے پر ختم ہو گیا، اب کسی انسان پر نہ وحی نازل ہوگی اور نہ اس کی ضرورت ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر مختلف طریقوں سے وحی نازل ہوتی تھی، صحیح بخاری کی ایک حدیث میں حضور عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت حارث بن ہشام نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ آپ پر وحی کس طرح آتی ہے؟ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کبھی تو مجھے گھنٹی کی سی آواز سنائی دیتی ہے، اور وحی کی صورت میرے لئے سب سے زیادہ صحت ہوتی ہے، پھر جب یہ سلسلہ ختم ہوتا ہے تو جو کچھ اس آواز نے کہا ہوتا ہے، مجھے یاد ہو چکا ہوتا ہے، اور کبھی فرشتہ میرے سامنے ایک مرد کی صورت میں آ جاتا ہے۔ (صحیح بخاری ۲/۱)

اس حدیث میں آپ نے وحی کی آواز کو گھنٹیوں کی آواز سے جو تشبیہ دی ہے شیعہ علی الدین ابن ابی بنی نے اس کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ ایک تو وحی کی آواز گھنٹی کی طرح مسلسل ہوتی ہے اور بیچ میں ٹوٹی ہوئی رہ سکتی ہے، گھنٹی جب مسلسل بجتی ہو تو عموماً سننے والے کو اس کی آواز کی سمت متعین کرنا مشکل ہوتا ہے، کیونکہ اس کی آواز ہر جہت سے آتی ہوئی محسوس ہوتی ہے، اور کلام الہی کی بھی یہ خصوصیت ہو کہ اس کی کوئی ایک سمت نہیں ہوتی، بلکہ ہر جہت سے آواز سنائی دیتی ہے، اس کیفیت کا صحیح اور آک تو بغیر مشاہدہ کے ممکن نہیں، لیکن اس بات کو عام ذہنوں سے قریب کرنے کے لئے آپ نے اُسے گھنٹیوں کی آواز سے تشبیہ دی ہے (فیض الباری ۱/۱۹۱)

جب اس طریقے سے آپ پر وحی نازل ہوتی تو آپ پر بہت زیادہ بوجھ پڑتا تھا، حضرت عائشہ اسی حدیث کے آخر میں فرماتی ہیں کہ میں نے سخت جاڑوں کے دن میں آپ پر وحی نازل ہوتے ہوئے

دیکھی ہے، ایسی سردی میں بھی جب وحی کا سلسلہ ختم ہوتا تو آپ کی مبارک پیشانی پسینہ سے شرابور ہو چکی ہوتی تھی، ایک اور روایت میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان فرماتی ہیں، کہ جب آپ پر وحی نازل ہوتی تو آپ کا سر سرسکے لگتا، چہرہ انور میسر ہو کر چہرہ کج ہو جاتا، شاخ کی طرح زرد پڑ جاتا، سامنے کے دانت سردی سے پکپکاتے لگتے، اور آپ کو اتنا پسینہ آتا کہ اس کے قطرے موتیوں کی طرح ڈھلکنے لگتے تھے (الاتقان ۱/۲۶)

وحی کی اس کیفیت میں بعض اوقات اتنی شدت پیدا ہو جاتی کہ آپ جس جا نور پر اس وقت سوار ہوتے وہ آپ کے بوجھ سے دب کر بیٹھ جاتا، اور ایک مرتبہ آپ نے اپنا سر اقدس حضرت زید بن ثابتؓ کے زانو پر رکھا ہوا تھا، اگر اسی حالت میں وحی نازل ہوتی شروع ہو گئی، اس سے حضرت زید کی ران پر اتنا بوجھ پڑا کہ وہ ٹوٹنے لگی (زاد المعاد ۱/۱۹۸)

بعض اوقات اس وحی کی ہلکی ہلکی آواز دوسروں کو بھی محسوس ہوتی تھی، حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ جب آپ پر وحی نازل ہوتی تو آپ کے چہرہ انور کے قریب شہد کی مچکیوں کی جھنبھنا ہٹ جیسی آواز سنائی دیتی تھی (ترویج مسند احمد کتاب السيرة النبوية ۲۰/۲۱۲)

وحی کی دوسری صورت یہ تھی کہ فرشتہ کسی انسانی شکل میں آپ کے پاس اگر اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچا دیتا تھا، ایسے مواقع پر عموماً حضرت جبرئیل علیہ السلام مشہور صحابی حضرت وحیہؓ کی صورت میں تشریف لایا کرتے تھے، البتہ بعض اوقات کسی دوسری صورت میں بھی تشریف لاتے ہیں، بہر کیف جب حضرت جبرئیل انسانی شکل میں وحی لے کر آتے تو نزول وحی کی یہ صورت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے سب سے آسان ہوتی تھی (الاتقان ۱/۲۶)

وحی کی تیسری صورت یہ تھی کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام کسی انسان کی شکل اختیار کر کے بغیر اپنی اصل صورت میں دکھائی دیتے تھے، لیکن ایسا آپ کی تمام عریں صرف تین مرتبہ ہوا ہے، ایک مرتبہ اس وقت جب آپ نے خود حضرت جبرئیل علیہ السلام کو ان کی اصل شکل میں دیکھنے کی خواہش ظاہر فرمائی تھی، دوسری مرتبہ معراج میں اور تیسری بار نبوت کے بالکل ابتدائی زمانے میں مکہ مکرمہ کے مقام اجنادین پہلے دو واقعات تو صحیح سند سے ثابت ہیں، البتہ یہ آخری واقعہ سنہ ۱۲۰۷ھ کے واقعے کے دوجہ سے مشکوک ہے۔ (فتح الباری ۱/۱۹۸)

چوتھی صورت براہ راست اور بلا واسطہ اللہ تبارک تعالیٰ سے ہمکلامی کی ہے، یہ شرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو باری کی حالت میں صرف ایک بار یعنی معراج کے وقت حاصل ہوا ہے، البتہ ایک مرتبہ خواب میں بھی آپ اللہ تعالیٰ سے ہمکلام ہوئے ہیں (الاتقان ۱/۲۶)

وحی کی پانچویں صورت یہ تھی کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام کسی بھی صورت میں آئے بغیر آپ کے قلب مبارک میں کوئی بات القاء فرماتے تھے، اسے اصطلاح میں "نفس فی الزور" کہتے ہیں (ایضاً)

تایخ نزول قرآن

قرآن کریم دراصل کلام الہی ہے، اس لئے ازل سے لوح محفوظ میں موجود ہے، قرآن کریم کا ارشاد ہے: **بَقِیُّ قُرْآنٍ مَّحْمُودٍ** (۲۲-۲۱: ۸۵) (بکہ یہ قرآن مجید ہے، لوح محفوظ میں ہے) پھر لوح محفوظ سے اس کا نزول دو مرتبہ ہوا ہے، ایک مرتبہ یہ پورے کا پورا آسمان دنیا کے بیت عزت میں نازل کر دیا گیا تھا، بیت عزت (جسے البیت المعمور بھی کہتے ہیں) کہہ اللہ کے معاذات میں آسمان پر فرشتوں کی عبارت گاہ ہے، یہ نزول لیلۃ القدر میں ہوا تھا، پھر دوسری مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر پھوٹا تھا اور کر کے حسب ضرورت نازل کیا جاتا رہا، یہاں تک کہ تیس سال میں اس کی تکمیل ہوئی، نزول فترت کی یہ دو صورتیں خود فترت قرآن کریم کے انداز بیان سے بھی واضح ہیں، اس کے علاوہ نسائی، بیہقی، اور حاکم وغیرہ نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے متعدد روایتیں نقل کی ہیں جن کا خلاصہ یہی ہے کہ فترت قرآن کریم کا پہلا نزول یکبارگی آسمان دنیا پر ہوا اور دوسرا نزول بتدریج آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر (الاتقان ۱/۴۱)

قرآن کریم کو پہلی مرتبہ آسمان دنیا پر نازل کرنے کی حکمت امام ابو شامہؒ نے یہ بیان کی ہے کہ اس سے قرآن کریم کی رفعت شان کو ظاہر کرنا مقصود تھا، اور ملائکہ کو یہ بات بتائی تھی کہ اللہ کی آخری کتاب ہو جاوے زمین کی عبادت کے لئے آسانی ملے والی ہے۔

شیخ زرقانیؒ نے یہ نکتہ بھی بیان کیا ہے کہ اس طرح دو مرتبہ آسمان سے یہ بھی جتنا مقصود تھا کہ یہ کتاب ہر شک وشبہ سے بالاتر ہے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک کے علاوہ یہ دو جگہ اور بھی محفوظ ہے، ایک لوح محفوظ میں اور دوسرے بیت عزت میں (مناہل العرفان ۱/۳۶) واللہ اعلم۔ اس پر تقریباً اتفاق ہے کہ قرآن کریم کا دوسرا تدریجی نزول جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک پر ہوا، اس کا آغاز اس وقت ہوا جب آپ کی عمر چالیس سال تھی، اس نزول کی ابتداء بھی صحیح قول کے مطابق لیلۃ القدر میں ہوئی ہے، اور یہی وہ تاریخ تھی جس میں چند سال بعد غزوہ بدر پیش آیا، لیکن یہ رات رمضان کی کوئی تاریخ میں تھی؟ اس بارے میں کوئی یقینی بات نہیں کہی جاسکتی، بعض لوگوں نے رمضان کی سترھویں، بعض نے اسیسویں اور بعض نے ستائیسویں شب معلوم ہوتی ہے (تفسیر ابن جریر ۱/۱۰۰) صحیح قول یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن کریم کے سب سے پہلے جو آیتیں تھیں وہ سورۃ علق کی ابتدائی آیات ہیں، صحیح بخاری میں حضرت عائشہؓ اس کا واقعہ

یہ بیان فرماتی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نزول وحی کی ابتداء تو پچھتے خوابوں سے ہوئی تھی، اس کے بعد آپ کی فطرت میں عبادت کرنے کا شوق پیدا ہوا، اور اس دوران آپ غار حرا میں کئی کئی راتیں گزارتے، اور عبادت میں مشغول رہتے تھے یہاں تک کہ ایک دن

لے قارئین کے لئے یہ بات یقیناً سمجھوتہ اور غلط فہمی کا باعث ہوگی کہ اس دفعہ میں وہ تمام آیات قرآنیہ (جو حوالہ کے طور پر دی گئی ہیں) کا سورۃ لمہر اور آیت نمبر دیکھ لیں۔ مثلاً سورۃ سورۃ بروج نمبر ۸۵ آیت نمبر ۲۱-۲۲-۲۳

اسی غامض آپ کے پاس اللہ تعالیٰ کی جانب سے فرشتہ آیا، اور اس نے سب سے پہلی بات یہ کہی کہ اِقْرَأْ (یعنی پڑھ) حضورؐ نے فرمایا کہ میں پڑھا ہوا نہیں ہوں۔ اس کے بعد خود حضورؐ نے واقعہ بیان کیا کہ میرے اس جواب پر فرشتے نے مجھ پر کڑا اور مجھے اس زور سے بھیجا کہ مجھ پر مشقت کی انتہا ہو گئی، پھر اس نے مجھے چھوڑ دیا، اور دوبارہ کہا کہ اِقْرَأْ، میں نے جواب دیا کہ میں تو پڑھا ہوا نہیں ہوں۔ فرشتے نے مجھے پھر کڑا اور دوبارہ اس زور سے بھیجا کہ مجھ پر مشقت کی انتہا ہو گئی، پھر اس نے مجھے چھوڑ کر کہا کہ اِقْرَأْ، میں نے جواب دیا کہ میں پڑھا ہوا نہیں ہوں۔ اس پر اس نے مجھے تیسری مرتبہ کڑا اور بھیج کر چھوڑ دیا، پھر کہا:۔

”اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ ۝ خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۝ اِقْرَأْ ۝ وَرَبُّكَ

الَّذِي عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۝ (۱-۱۹۶) (۵۵-۵۲:۲۲)

پڑھو اپنے اس پروردگار کے نام سے جس نے پیدا کیا، جس نے انسان کو منجھون سے پیدا کیا، پڑھو، اور تمہارا پروردگار سب سے زیادہ کریم ہے۔ الخ۔

یہ آپؐ پر نازل ہونے والی پہلی آیات تھیں، اس کے بعد تین سال تک وحی کا سلسلہ بند رہا، اسی زمانہ کو ”فترتِ وحی“ کا زمانہ کہتے ہیں، پھر تین سال کے بعد وہی فرشتہ جو غارِ حرا میں آیا تھا، آپؐ کو آسمان و زمین کے درمیان دکھائی دیا، اور اس نے سورۃ مقرر کی آیات آپؐ کو سنائیں، اس کے بعد وحی کا سلسلہ جاری ہو گیا۔

آپؐ نے قرآن کریم کی سورتوں کے عنوان میں دیکھا ہوگا کہ کسی سورۃ کے ساتھ کئی اور مدنی آیات لکھی اور کسی کے ساتھ مدنی لکھا ہوتا ہے، اس کا صحیح مفہوم سمجھ لینا ضروری ہے مفسرین کی اصطلاح میں ”مدنی آیت“ کا مطلب وہ آیت ہے جو آپؐ کے بعض ہجرت مدینہ طیبہ پہنچنے سے پہلے نازل ہوئی، اور ”مدنی آیت“ کا مفہوم یہ ہے کہ وہ آپؐ کے مدینہ پہنچنے کے بعد نازل ہوئی، بعض لوگ کئی کا مطلب یہ سمجھتے ہیں کہ یہ شہر مکہ میں نازل ہوئی، اور مدنی کا یہ کہ وہ شہر مدینہ میں اتاری، لیکن یہ مطلب درست نہیں، اس لئے کہ کئی آیتیں ایسی ہیں جو شہر مکہ میں نازل نہیں ہوئیں لیکن چونکہ ہجرت سے پہلے نازل ہو چکی تھیں اس لئے انھیں کئی کہا جاتا ہے، چنانچہ جو آیات مدنی، موقات یا سفر معراج کے دوران نازل ہوئیں وہ بھی کئی کہلاتی ہیں، یہاں تک کہ جو آیتیں سفر ہجرت کے دوران مدینہ کے رہتے میں نازل ہوئیں ان کو بھی کئی کہا جاتا ہے، اسی طرح بہت سی آیات ایسی ہیں جو شہر مدینہ میں نازل نہیں ہوئیں، مگر وہ مدنی ہیں، چنانچہ ہجرت کے بعد آپؐ کو بہت سے سفر پیش آئے جن میں آپؐ مدینہ طیبہ سے سیکڑوں میل دور بھی تشریف لے گئے، ان تمام مقامات پر نازل ہونے والی آیتیں مدنی ہی کہلاتی ہیں، یہاں تک کہ ان آیتوں کو بھی مدنی کہا جاتا ہے جو فتح مکہ یا غزوہ حندلیہ کے موقع پر خاص شہر مکہ یا اس کے معانات میں نازل ہوئیں، چنانچہ آیت قرآنی (لَئِنْ لَمْ يَنْتَهِ يَكْفُرْ لَكُمْ وَالَّذِينَ طَبَعُوا مِنْكُمْ وَلَئِنْ لَمْ يَنْتَهِ يَكْفُرْ لَكُمْ وَالَّذِينَ طَبَعُوا مِنْكُمْ وَلَئِنْ لَمْ يَنْتَهِ يَكْفُرْ لَكُمْ) (۵۸:۱۲) مدنی ہے حالانکہ وہ مکہ میں نازل ہوئی (البرہان ۱/۸۸، وصال العرفان ۱/۸۸)۔

بعض سورتیں تو ایسی ہیں کہ وہ پوری کی پوری کئی یا پوری کئی پوری مدنی ہیں، مثلاً سورۃ مدثر پوری مکتی ہے، اور سورۃ آل عمران پوری مدنی، لیکن بعض مرتبہ ایسا بھی ہوا ہے کہ پوری سورت کئی ہے، لیکن اس میں ایک یا چند آیات مدنی بھی آگئی ہیں، اور بعض مرتبہ اس کے برعکس بھی ہوا ہے، مثلاً سورۃ اعراف مکتی ہے، لیکن اس میں وَشَعَلُوهُمْ عَنِ النَّارِ يَوْمَ الْكَافَّةِ (۵۵:۲۲) اسی طرح سورۃ حج مدنی ہے لیکن اس میں چار آیتیں یعنی وَمَا كُنْزُكُمَا مِنْ قَبْلِكَ وَمِنْ رَسُولٍ وَلَا يُنَبِّئُ إِلَّا اِذَا اُتِيَ بِشَيْءٍ يَكُنُّ عَذَابُ يَوْمٍ يَعْلَمُ مکتی ہیں۔ (۵۵-۵۲:۲۲)

اس سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ کسی سورت کا مکتی یا مدنی ہونا عمرائے اس کی اکثر آیتوں کے اعتبار سے ہوتا ہے، اور اکثر ایسا ہونا تھا کہ جس سورت کی ابتدائی آیات ہجرت سے پہلے نازل ہوئیں اُسے مکتی قرار دیدیا گیا، اگرچہ بعد میں اس کی بعض آیتیں ہجرت کے بعد نازل ہوئیں ہوں۔ (مشاہد العرفان ۱/۹۲)

کئی مدنی آیتوں کی خصوصیات علماء تفسیر نے مکتی اور مدنی سورتوں کا استفادہ کر کے لکھی بعض ایسی خصوصیات بیان فرمائی ہیں جن سے پہلی نظر میں یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ سورت مکتی ہے یا مدنی، ان میں سے بعض خصوصیات قاعدہ کلیہ کی حیثیت رکھتی ہیں، اور بعض اکثری ہیں، قواعد کلیہ یہ ہیں:۔

- (۱) ہر وہ سورت جس میں لفظ ”مکہ“ (ہرگز نہیں) آیا ہے، وہ مکتی ہے، یہ لفظ بندرہ سورتوں میں ۲۲ مرتبہ استعمال ہوا ہے، اور یہ ساری آیتیں قرآن کریم کے آخری نصف حصہ میں ہیں۔
- (۲) ہر وہ سورت جس میں ”خفی“ مسلک کے مطابق کوئی سجدے کی آیت آئی ہو، کئی ہے۔
- (۳) سورۃ بقرہ کے سوا ہر وہ سورت جس میں آدمؑ و ابلیس کا واقعہ مذکور ہے وہ مکتی ہے۔
- (۴) ہر وہ سورت جس میں جہاد کی اجازت یا اس کے احکام مذکور ہیں، مدنی ہے۔
- (۵) ہر وہ آیت جس میں منافقوں کا ذکر آیا ہے، مدنی ہے۔

اور مندرجہ ذیل خصوصیات عمومی اور اکثری ہیں، یعنی کبھی کبھی ان کے خلاف بھی ہو جاتا ہے لیکن اکثر و بیشتر ایسا ہی ہوتا ہے۔

- ۱۔ مکتی سورتوں میں عموماً لفظ ”الْمَدَنِي“ (اے مدنی) کے الفاظ سے خطاب کیا گیا ہے، اور مدنی سورتوں میں ”يَا أَيُّهَا الْمَدَنِي“ (اے مدنی) کے الفاظ سے۔
- ۲۔ مکتی آیتیں اور سورتیں عموماً چھوٹی چھوٹی اور مختصر ہیں اور مدنی آیات و سورتیں اور مفصل ہیں۔

یہ قاعدہ اتفاق وغیرہ سے ناخوہ ہے، اور یہ اس قول کے مطابق تو درست ہے جس کی رو سے سورۃ حج کئی ہے لیکن اگر اسے مدنی قرار دیا جائے جیسا کہ بعض صاحبِ ذہن سے مروی ہے، تو وہ جیسے اس قاعدے سے متضاد ہوگی۔ (مشاہد العرفان ۱/۹۲)

۲۔ مکی سورتیں زیادہ تر توحید و رسالت اور آخرت کے اثبات، حشر و نشر کی منظر کشی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو صبر و تسلی کی تلقین اور پھیلی امتوں کے واقعات پر مشتمل ہیں، اور ان میں احکام و قوانین کم بیان ہوئے ہیں، اس کے برعکس مدنی سورتوں میں خاندانی اور تمدنی قوانین، چار و قاتل کے احکام اور حدود و فرائض بیان کئے گئے ہیں۔

۳۔ مکی سورتوں میں زیادہ تر مقامات پرستوں سے بڑا اور مدنی سورتوں میں اہل کتاب اور منافقین سے۔

۴۔ مکی سورتوں کا اسلوب بیان زیادہ پرشکوہ ہے، اس میں استعارات و تشبیہات اور تمثیلس زیادہ ہیں، اور ذخیرۃ الفاظ بہت وسیع ہے، اس کے برخلاف مدنی سورتوں کا انداز نسبتاً سادہ ہے۔

مکی اور مدنی سورتوں کے انداز اسلوب میں یہ فرق دراصل حالات، ماحول اور مباحثوں کے اختلاف کی وجہ سے پیدا ہوا ہے، مکی زندگی میں مسلمانوں کا واسطہ چونکہ زیادہ تر عرب کے بہت پرستوں سے تھا، اور کوئی اسلامی ریاست وجود میں نہیں آئی تھی، اس لئے اس دور میں زیادہ زور عقائد کی درستی، اخلاق کی اصلاح، بہت پرستوں کی مدلل تردید اور قرآن کریم کی شان و اعجاز پر دیا گیا، اس کے برخلاف مدینہ طیبہ میں ایک اسلامی ریاست وجود میں آچکی تھی، لوگ بحوق درجہ فوق اسلام کے سامنے تلے آ رہے تھے، علمی سطح پر بہت پرستی کا ابطال ہو چکا تھا اور تمام تر نظریاتی مقابلہ اہل کتاب سے تھا، اس لئے یہاں احکام و قوانین اور حدود و فرائض کی تعلیم اور اہل کتاب کی تردید پر زیادہ توجہ دی گئی، اور اس کے مناسب اسلوب بیان اختیار کیا گیا۔

قرآن کریم کا تدریجی نزول پیچھے آچکا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن کریم دفعۃً اور تدریجاً نازل نہیں ہوا، بلکہ تھوڑا تھوڑا کر کے تقریباً بیس سال میں اتارا گیا ہے، بعض اوقات جبریل علیہ السلام ایک چھوٹی سی آیت بلکہ آیت کا کوئی ایک جزے کر بھی تشریف لے آتے، اور بعض مرتبہ کئی آیتیں بیک وقت نازل ہوجاتیں، قرآن کریم کا سب سے چھوٹا حصہ جو مستقل نازل ہوا وہ **قوله اولی الصلوة** (نساء: ۹۵) ہے جو ایک طویل آیت کا ٹکڑا کر دوسری طرے پوری سورۃ انعام ایک ہی مرتبہ نازل ہوئی ہے (ابن کثیر ۲/۱۱۲)۔

قرآن کریم کو کیا رنگ نازل کرنے کے بجائے تھوڑا تھوڑا کر کے کیوں نازل کیا گیا؟ یہ سوال خود مشرکین عرب نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا تھا، باری تعالیٰ نے اس سوال کا جواب خود ان الفاظ میں دیا ہے:-

وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا تَزِيلُ آيَاتُ الْكِتَابِ فَاجْلِدْهُم بِآيَاتِ الْكِتَابِ وَقُلْ لَّيْسَ بِمَثَلِ إِلَّا

يُجْلَدُونَ يَا أَيُّهَا الْمُنَافِقُونَ (العنقران: ۲۲ و ۲۳)

”اور کافروں نے کہا کہ آپ پر قرآن ایک ہی دفعہ کیوں نہیں نازل کیا گیا؟ اسی طرح ہم نے قرآن کو تدریجاً اتارا ہے، تاکہ ہم آپ کے دل کو مطمئن کردیں، اور ہم نے اس کو رفتہ رفتہ پڑھا ہے، اور وہ کوئی بات آپ کے پاس نہیں لائیں گے، مگر ہم آپ کے پاس حق لائیں گے، اور (اس کی) عمدہ تفسیر پیش کریں گے۔“

امام رازی نے اس آیت کی تفسیر میں قرآن کریم کے تدریجی نزول کی جو چھتیں بیان فرمائیں ہیں یہاں ان کا خلاصہ سمجھ لینا کافی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ:-

(۱) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اُمّی تھے، لکھتے پڑھتے نہیں تھے، اس لئے اگر سارا قرآن ایک مرتبہ نازل ہو گیا ہوتا تو اس کا یاد رکھنا اور ضبط کرنا دشوار ہوتا، اس کے برخلاف حضرت موسیٰ علیہ السلام لکھنا پڑھنا جانتے تھے، اس لئے ان پر قورات ایک ہی مرتبہ نازل کر دی گئی۔

(۲) اگر پورا قرآن ایک دفعہ نازل ہو جاتا تو تمام احکام کی پابندی فوراً لازم ہوجاتی، اور یہ اچھا نہ تدریج کے خلاف ہوتا جو شریعت محمدی میں ملحوظ رہی ہے۔

(۳) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی قوم کی طرف سے ہر روز نئی اذیتیں برداشت کرنی پڑتی تھیں، جبریل علیہ السلام کا بار بار قرآن کریم لے کر آنا ان اذیتوں کے مقابلے کو آسان بنا دیتا تھا، اور آپ کی تقویت قلب کا سبب بنتا تھا۔

(۴) قرآن کریم کا ایک بڑا حصہ لوگوں کے سوالات کے جواب اور مختلف واقعات متعلق ہے اس لئے ان آیتوں کا نزول اسی وقت مناسب تھا جس وقت وہ سوالات کئے گئے، یا وہ واقعات پیش آئے، اس سے مسلمانوں کی بعیرت بھی بڑھتی تھی، اور قرآن کریم کی غیبی خبریں بیان کرنے سے اس کی حقانیت اور زیادہ آشکار ہوجاتی تھی (تفسیر کبیر ۶/۳۳۱)۔

شان نزول قرآن کریم کی آیتیں دو قسم کی ہیں، ایک تو وہ آیتیں ہیں جو اللہ تعالیٰ نے ان خود نازل فرمائیں، کوئی خاص واقعہ یا کسی کا کوئی سوال وغیرہ ان کے نزول کا سبب نہیں بنا، دوسری آیات ایسی ہیں کہ جن کا نزول کسی خاص واقعہ کی وجہ سے یا کسی سوال کے جواب میں ہوا، جیسے ان آیتوں کا پس منظر کہنا چاہیے، یہ پس منظر مفسرین کی اصطلاح میں ”سبب نزول“ یا ”شان نزول“ کہلاتا ہے، مثلاً سورۃ بقرہ کی آیت نمبر ۲۲۱ ہے:-

وَلَا تَتَّبِعُوا الْاَشْيَاءَ حَتَّىٰ يُؤْمِنَ تِلْكَ آيَةٌ مِنَ الْمَوْلَانِ مَثَلًا لِّمَنْ كَفَرَ وَلَمْ يُجْعَلْ لِّهٖ

مشرک عورتوں سے نکاح نہ کرو جب تک وہ ایمان نہ لے آئیں اور بلاشبہ ایک مؤمن کینز ایک مشرک سے بہتر ہے خواہ مشرک تمہیں پسند ہو۔“

یہ آیت ایک خاص واقعہ میں نازل ہوئی تھی، زمانہ جاہلیت میں حضرت مرثد بن ابی مرثد غوثی کے عناق نامی ایک عورت سے تعلقات تھے، اسلام لانے کے بعد یہ مرتزطیبہ چلے آئے، اور وہ عورت مکہ مکرمہ میں رہ گئی، ایک مرتبہ حضرت مرثدؓ کسی کام سے مکہ مکرمہ تشریف لے گئے تو عناق نے انھیں غناہ کی دعوت دی، حضرت مرثدؓ نے صاف انکار کر کے فرمایا کہ اسلام میرے اور تمھارے درمیان حائل ہو چکا ہے، لیکن اگر تم چاہو تو میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت کے بعد تم سے نکاح کر سکتا ہوں، مرتزطیبہ تشریف لاکر حضرت مرثدؓ نے آپ سے نکاح کی اجازت چاہی اور اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا، اس پر یہ آیت نازل ہوئی، اور اس نے مشرک عورتوں سے نکاح کی ممانعت کر دی، (اسباب النزول لخواجہ ۷ ص ۳۸)

یہ واقعہ مذکورہ بالا آیت کا ”شان نزول“ یا ”سبب نزول“ ہے، قرآن کریم کی تفسیر میں ”شان نزول“ نہایت اہمیت کا حامل ہے، بہت سی آیتوں کا مفہوم اس دقت تک سمجھ طور سے سمجھ میں نہیں آ سکتا جب تک اُن کا شان نزول معلوم نہ ہو۔

قرآن کریم کے سات حرف اور قراءتیں

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کی تلاوت میں آسانی پیدا کرنے کے لئے امت محمدیہ (علیہا السلام) کو ایک ہولت یہ عطا فرمائی ہے کہ اس کے الفاظ کو مختلف طریقوں سے پڑھنے کی اجازت دی ہے، کیونکہ بعض اوقات کسی شخص سے کوئی لفظ ایک طریقہ سے نہیں پڑھا جاتا تو اسے دوسرے طریقہ سے پڑھ سکتا ہے، صحیح مسلم کی ایک حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک مرتبہ بوزغھار کے تالاب کے پاس تشریف فرما تھے کہ حضرت جبریل علیہ السلام آگئے، اور انھوں نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم دیا ہے کہ آپ اپنی امت کو حکم دیں کہ وہ قرآن کو ایک ہی حرف پڑھے، آپ نے فرمایا کہ میں اللہ سے اس کی معافی اور مغفرت طلب کرتا ہوں، میری امت میں اس کی طاقت نہیں ہے، پھر جبریل علیہ السلام دوبارہ آپ کے پاس آئے اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم دیا ہے کہ آپ کی امت قرآن کو دو حرفوں پر پڑھے، آپ نے فرمایا کہ میں اللہ تعالیٰ سے معافی اور مغفرت مانگا ہوں، میری امت میں اس کی بھی طاقت نہیں ہے، پھر وہ تیسری بار آئے اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم دیا ہے کہ آپ کی امت قرآن کریم کو تین حرفوں پر پڑھے، آپ نے پھر فرمایا کہ میں اللہ تعالیٰ سے معافی اور مغفرت چاہتا ہوں، میری امت میں اس کی بھی طاقت نہیں ہے، پھر وہ چوتھی بار آئے اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم دیا ہے کہ آپ کی امت قرآن کو سات حرفوں پر پڑھے، پس وہ ان میں سے جس حرف پر پڑھیں گے اُن کی قراءت درست ہوگی، (بخاری، مناقب العرفان ۱۲۲/۱)

سات حرف سے مراد سات نوعیتیں ہیں، چنانچہ ایک حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:-

إِنَّ هَذَا الْقُرْآنَ أَنْزَلَ عَلَى سَبْعَةِ أَحْرَفٍ فَافْرَعُوا مَا تَشَاءُ مِنْهُ،

(صحیح بخاری ص ۳۵۲ القسطلانی ۴۵۲/۴)

”یہ قرآن سات حرفوں پر نازل کیا گیا ہے، پس ان میں سے جو تمھارے لئے آسان ہو

اس طریقہ سے پڑھ لو۔“

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد میں سات حرفوں سے کیا مراد ہے؟ اس بارے میں ابی بلطیم کے مختلف اقوال ہیں، لیکن محقق علماء کے نزدیک اس میں راجح مطلب یہ ہے کہ قرآن کریم کی جو قراءتیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوئی ہیں، اُن میں باہمی فرق و اختلافات کُل سات نوعیتوں پر مشتمل ہیں، اور وہ سات نوعیتیں یہ ہیں:-

(۱) اسماء کا اختلاف: جس میں افراد، تشبیہ، جمع اور تذکیر و تانیث دونوں کا اختلاف داخل ہے، مثلاً ایک قراءت میں تَمَّتْ کَلِمَتُ رَبِّكَ ہے اور دوسری قراءت میں تَمَّتْ کَلِمَتُ رَبِّكَ۔

(۲) افعال کا اختلاف: کہ کسی قراءت میں صیغہ ماضی ہے، کسی میں مضارع اور کسی میں امر مثلاً ایک قراءت میں تَبَتَّابِعْنِ یُنِ اسْقَارِی ہے اور دوسری میں تَبَتَّابِعُوا یُنِ اسْقَارِی۔

(۳) وجود و اعراب کا اختلاف: جس میں اعراب یا زیر بر پیش کا فرق پایا جاتا ہے، مثلاً لَا یُضَاقُ کَافٌ لَکَ جَہَنَّمَ وَلَا یُضَاقُ کَافٌ لَکَ جَہَنَّمَ وَلَا یُضَاقُ کَافٌ لَکَ جَہَنَّمَ۔

(۴) الفاظ کی کمی بیشی کا اختلاف: کہ ایک قراءت میں کوئی لفظ کم اور دوسری میں زیادہ ہو، مثلاً ایک قراءت میں تَجْرِی مِّنْ تَحْتِهَا الْآثَرُ اور دوسری میں تَجْرِی تَحْتِهَا الْآثَرُ۔

(۵) تقدیم و تاخیر کا اختلاف: کہ ایک قراءت میں کوئی لفظ مقدم ہے اور دوسری میں مؤخر ہے، مثلاً وَجَاءَتْ سَكْرَةُ الْمَوْتِ بِالْحَقِّ اور وَجَاءَتْ سَكْرَةُ الْمَوْتِ بِالْحَقِّ۔

(۶) بدلیت کا اختلاف: کہ ایک قراءت میں ایک لفظ ہے اور دوسری قراءت میں اس کی جگہ کوئی دوسرا لفظ مثلاً تَبَتَّابِعْنِی اَوْ تَبَتَّابِعُوا اور تَبَتَّابِعُوا اَوْ تَبَتَّابِعْنِی۔

(۷) احوال کا اختلاف: جس میں تغنی، ترقین، الماد، مد، قصر، ہمز، اظہار اور ادغام وغیرہ کے اختلافات داخل ہیں، یعنی اس میں لفظ تو نہیں بدلتا، لیکن اس کے پڑھنے کا طریقہ بدل جاتا ہے، مثلاً مؤنثی کو ایک قراءت میں مؤنثی کی طرح پڑھا جاتا ہے۔

بہر حال: اختلاف قراءت کی ان سات نوعیتوں کے تحت بہت سی قراءتیں نازل ہوئی ہیں

لہٰذا ان اقوال کی تفصیل اور اس مسئلہ کی مطہر تحقیق کے لئے ملاحظہ فرمائیے ”علم القرآن احقری مفصل کتاب ۱۳“

اور ان کے باہمی فرق سے معنی میں کوئی قابل ذکر فرق نہیں ہوتا تھا، صرف تلاوت کی سہولت کے لئے ان کی اجازت دی گئی تھی۔

شروع میں چونکہ لوگ قرآن کریم کے اسلوب کے پوری طرح عادی نہیں تھے، اس لئے ان سب اقسام کے دائرے میں بہت سی قراءتوں کی اجازت دیدی گئی تھی، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول تھا کہ ہر سال رمضان میں جبریل علیہ السلام کے ساتھ قرآن کریم کا ذکر کیا کرتے تھے جس سال آپ کی وفات ہوئی اس سال آپ نے دو مرتبہ ذکر فرمایا، اس ذکر کو عوضۃ اخیرہ کہتے ہیں، اس موقع پر بہت سی شترائیں مسوخ کر دی گئیں، اور صرف وہ قراءتیں باقی رکھی گئیں جو آج تک قرات کے ساتھ محفوظ چلی آتی ہیں۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے تلاوت قرآن کے معاملہ میں غلط فہمیاں رفع کرنے کے لئے اپنے عہد خلافت میں قرآن کریم کے سات نسخے تیار کرائے، اور ان سات نسخوں میں تمام قراءتوں کو اس طرح سے جمع فرمایا کہ قرآن کریم کی آیتوں پر لفظی اور زبر و پیش نہیں ڈالے، تاکہ اپنی مذکورہ قراءتوں میں سے جس قراءت کے مطابق چاہیں پڑھ سکیں اس طرح اکثر قراءتیں اس رسم الخط میں سما گئیں، اور جو شترائیں رسم الخط میں نہ سما سکیں ان کو محفوظ رکھنے کا طریقہ آپ نے یہ اختیار فرمایا کہ ایک نسخہ آپ نے ایک قراءت کے مطابق لکھا اور دوسرا دوسری قراءت کے مطابق، ائت نے ان نسخوں میں جمع شدہ قراءتوں کو یاد رکھنے کا اس قدر اہتمام کیا کہ علم قراءت ایک مستقیل علم بن گیا، اور سینکڑوں علماء، قراء اور حفاظ نے اس کی حفاظت میں اپنی عمریں خرچ کر دیں۔

قراءت میں قبولیت کا معیار دراصل ہوا یہ تھا کہ جس وقت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے قرآن کریم کے سات نسخے مختلف خطوں میں پیچھے تو ان کے ساتھ ایسے قاریوں کو بھی بھیجا تھا جو اپنی

تلاوت لکھا سکیں، چنانچہ یہ قاری حضرات جب مختلف علاقوں میں پہنچے تو انہوں نے اپنی اپنی قراءتوں کے مطابق لوگوں کو قرآن کی تعلیم دی، اور یہ مختلف قراءتیں لوگوں میں پھیل گئیں، اس موقع پر بعض حضرات نے ان مختلف قراءتوں کو یاد کرنے اور دوسروں کو سکھانے ہی کے لئے اپنی زندگیاں وقف کر دیں، اور اس طرح "علم قراءت" کی بنیاد چڑھ گئی، اور ہر خط کے لوگ اس علم میں کمال حاصل کرنے کے لئے ائمہ قراءت سے رجوع کرنے لگے، کسی نے صرف ایک قراءت یاد کی، کسی نے دو، کسی نے تین، کسی نے سات اور کسی نے اس سے بھی زیادہ، اس سلسلے میں ایک اصولی ضابطہ پوری اہمیت میں مسلم تھا، اور ہر جگہ اسی کے مطابق عمل ہوتا تھا، اور وہ یہ کہ صرف وہ "قراءت" قرآن ہونے کی حیثیت سے قبول کی جائے گی جس میں تین شرائط پائی جاتی ہوں:-

۱) مصاحف عثمانی کے رسم الخط میں اس کی گنجائش ہو۔

(۲) عربی زبان کے قواعد کے مطابق ہو۔

(۳) وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے صحیح سند کے ساتھ ثابت ہو، اور ائمہ قراءت میں مشہور ہو جس قراءت میں ان میں سے کوئی ایک شرط بھی مفقود ہو اسے قرآن کا جزء نہیں سمجھا جاسکتا، اس طرح متواتر قراءتوں کی ایک بڑی تعداد نسلاً بعد نسل نقل ہوتی رہی، اور سہولت کے لئے ایسا بھی ہوا کہ ایک امام نے ایک یا چند قراءتوں کو اختیار کر کے انہی کی تعلیم دینی شروع کر دی، اور وہ قراءت اس امام کے نام سے مشہور ہو گئی، پھر علماء نے ان شترائوں کو جمع کرنے کے لئے کتابیں لکھنا شروع کیں، چنانچہ سب سے پہلے امام ابو عبیدہ قاسم بن سلام، امام ابو حاتم مجتہانی، قاضی بخاری اور امام ابو جعفر طبری نے اس فن پر کتابیں مرتب کیں جن میں بیس سے زیادہ قراءتیں جمع تھیں، پھر علامہ ابوبکر ابن مجاہد (متوفی ۲۴۱ھ) نے ایک کتاب لکھی، جس میں صرف سات قاریوں کی قراءتیں جمع کی گئی تھیں، ان کی یہ تصنیف اس قدر مقبول ہوئی کہ یہ سات قراءتیں دوسرے قراء کے مقابلہ میں بہت زیادہ مشہور ہو گئیں، بلکہ بعض لوگ یہ سمجھنے لگے کہ صحیح اور متواتر قراءتیں صرف یہی ہیں، حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ علامہ ابن مجاہد نے محض اتفاقاً ان سات قراءتوں کو جمع کر دیا تھا، ان کا منشأ یہ ہرگز نہیں تھا کہ ان کے سوا دوسری قراءتیں غلط یا ناقابل قبول ہیں، علامہ ابن مجاہد کے اس عمل سے دوسری غلط فہمی بھی پیدا ہوئی کہ بعض لوگ "سبعۃ احراء" کا مطلب یہ سمجھنے لگے کہ ان سے ہی سات قراءتیں مراد ہیں، جنہیں ابن مجاہد نے جمع کیا ہے، حالانکہ صحیح بتایا جاسکتا ہے کہ یہ سات قراءتیں صحیح قراءتوں کا محض ایک حصہ ہیں، درجہ ہر وہ قراءت جو مذکورہ بالا تین شرائط پر پوری اُترتی ہو، صحیح قابل قبول اور ان سات حرود میں داخل ہے جن پر قرآن کریم نازل ہوا۔

سات شترائے بہر حال، علامہ ابن مجاہد کے اس عمل سے جو سات قاری سب سے زیادہ مشہور ہوئے وہ یہ ہیں:-

(۱) نافع بن عبد الرحمن بن ابی نعیم (متوفی ۱۶۹ھ) آپ نے مشرالیس تابعین سے استفادہ کیا تھا جو براہ راست حضرت ابی بن کعب، عبد اللہ بن عباس اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہم کے شاگرد تھے، آپ کی قراءت مدینہ طیبہ میں زیادہ مشہور ہوئی اور آپ کے راویوں میں ابو موسیٰ قالون (متوفی ۲۳۱ھ) اور ابو سعید دریش (متوفی ۲۴۱ھ) زیادہ مشہور ہیں۔

(۲) عبد اللہ بن کثیر الداری (متوفی ۲۴۱ھ) آپ نے صحابہ میں سے حضرت انس بن مالک، عبد اللہ بن زبیر، زید بن اسلم، ابی الوہاب انصاری کی زیارت کی تھی، اور آپ کی قراءت مکہ مکرمہ میں زیادہ مشہور ہوئی، اور آپ کی قراءت کے راویوں میں بڑی اور قنبل زیادہ مشہور ہیں۔

(۳) ابو عمرو زبان بن العلاء (متوفی ۲۵۱ھ) آپ نے حضرت مجاہد اور سعید بن جبیر کے

واسطہ سے حضرت ابن عباسؓ اور اُن کی کعبہ سے روایت کی ہے، اور آپ کی قرات بقصرہ میں کافی مشہور ہوئی، آپ کی قرات کے راویوں میں ابو عمر الدوریؒ (متوفی ۳۸۸ھ) اور ابو شیبہؒ (متوفی ۲۴۰ھ) زیادہ مشہور ہیں،

(۴) عبد اللہ المحضیؒ جو ابن عامر کے نام سے معروف ہیں (متوفی ۳۸۸ھ) آپ نے صحابہؓ میں سے حضرت نعان بن بشیرؓ اور حضرت وانکم بن اسقعؓ کی رایت کی تھی، اور قرات کا فن حضرت مینو بن شہاب مجزویؒ سے حاصل کیا تھا جو حضرت عثمانؓ کے شاگرد تھے، آپ کی قرات کا زیادہ رواج شام میں رہا، اور آپ کی قرات کے راویوں میں ہشامؒ اور ذکوانؒ زیادہ مشہور ہیں۔

(۵) حمزہ بن حبیب الزیاتی مولى مکرہ بن ربیع النخعیؒ (متوفی ۳۸۸ھ) آپ سلمانؓ عیش کے شاگرد ہیں، وہ بھی بن وثابؓ کے 'دہ زربن مجیش' کے اور انھوں نے حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ اور عبد اللہ بن مسعودؓ سے استفادہ کیا تھا، آپ کے راویوں میں خلف بن ہشامؒ (متوفی ۳۸۸ھ) اور غلاب بن خالدؒ (متوفی ۳۸۸ھ) زیادہ مشہور ہیں۔

(۶) عامر بن ابی الجعد الاسدیؒ (متوفی ۳۸۸ھ) آپ زربن مجیش کے واسطہ سے حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ اور ابو عبد الرحمنؓ کے واسطہ سے حضرت علیؓ کے شاگرد ہیں، آپ کی قرات کے راویوں میں شعبہ بن عیاشؒ (متوفی ۳۸۸ھ) اور حفص بن سلمانؒ (متوفی ۳۸۸ھ) زیادہ مشہور ہیں، انھیں عموماً تلاوت ابی حفص بن سلمانؒ کی روایت کے مطابق ہوتی ہے۔

(۷) ابو الحسن علی بن حمزہ الکسانیؒ (متوفی ۳۸۸ھ) ان کے راویوں میں ابو الحارث مروزیؒ (متوفی ۳۸۸ھ) اور ابو عمر الدوریؒ (جو ابو عمروؒ کے راوی بھی ہیں) زیادہ مشہور ہیں، نوخر الذکر تینوں حضرات کی قراتیں زیادہ ترک و تہ میں رائج ہوئیں۔

دلیل اور چودہ قراتیں لیکن جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے ان شات کے علاوہ ادھیچ کی قراتیں تو اتر ادریج ہیں، چنانچہ بعد میں جب یہ غلط فہمی پیدا ہونے لگی صحیح قراتیں ان شات ہی میں خاص ہیں تو متعدد علماء (مثلاً علامہ شذائیؒ اور ابو بکر بن ہرآنؒ) نے شات کے بجائے دس قراتیں ایک کتاب میں جمع فرمائیں، چنانچہ قرات مشرکہ کی اصطلاح مشہور ہو گئی، ان دس قراتوں میں مندرجہ بالا شات قرات کے علاوہ ان میں حضرات کی قراتیں بھی شامل کی گئیں:-

(۱) ابو حفص زید بن العقیقؒ (متوفی ۳۸۸ھ) ان کی قرات مدنیہ طیبہ میں زیادہ رائج ہوئی۔
(۲) یعقوب بن اسحق حضرمیؒ (متوفی ۳۸۸ھ) آپ کی قرات زیادہ قرقرہ میں مشہور ہوئی۔
(۳) خلف بن ہشامؒ (متوفی ۳۸۸ھ) جو حمزہ کی قرات کے بھی راوی ہیں، آپ کی قرات کو تہ میں زیادہ رائج تھی۔

اس کے علاوہ بعض حضرات نے چودہ قاریوں کی قراتیں ہی صحیح کہیں اور مذکورہ دس حضرات پر مندرجہ ذیل قرات کی قراتوں کا اضافہ کیا:-

(۱) حسن بصریؒ (متوفی ۳۸۸ھ) جن کی قرات کا مرکز بقصرہ تھا۔
(۲) محمد بن عبد الرحمن ابن محضؒ (متوفی ۳۸۸ھ) جن کا مرکز مکہ مکرمہ میں تھا۔
(۳) یحییٰ بن مبارک یزیدیؒ (متوفی ۳۸۸ھ) جو بقصرہ کے باشندے تھے۔
(۴) ابو الفرج شنبوزیؒ (متوفی ۳۸۸ھ) جو بغداد کے باشندے تھے۔

بعض حضرات نے چودہ قاریوں میں حضرت شنبوزیؒ کے بجائے حضرت سلمانؓ عیشؓ کا نام شامل کیا ہے، ان میں سے پہلے دس قراتیں صحیح قول کے مطابق متواتر ہیں، اور ان کے علاوہ شاذ ہیں و منابل العرفان بحوالہ منجد المقرین لابن الجریؒ)۔

تایخ حفاظت قرآن

عہد رسالت میں قرآن کریم چونکہ ایک ہی دفعہ پورا کرا نازل نہیں ہوا، بلکہ اس کی مختلف آیات ضرورت اور حالات کی مناسبت سے نازل کی جاتی رہی ہیں، اس لئے عہد رسالت میں یہ ممکن نہیں تھا کہ شروع ہی سے اُسے کتابی شکل میں لکھ کر محفوظ کر لیا جائے

چنانچہ ابتدائے اسلام میں قرآن کریم کی حفاظت کے لئے سب سے زیادہ زور حافظ پر دیا گیا، شروع شروع میں جب وحی نازل ہوتی تو آپؐ اُس کے الفاظ کو اُس وقت دہرائے لگتے تھے، تاکہ وہ اچھی طرح یاد ہو جائیں، اس پر سورہ قیامہ کی آیات میں اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو ہدایت فرمائی کہ قرآن کریم کو یاد رکھنے کے لئے آپؐ کو عین نزول وحی کے وقت جلدی جلدی الفاظ دہرائے کی ضرورت نہیں، اللہ تعالیٰ خود آپؐ میں ایسا حافظ پیدا فرمادے گا کہ ایک مرتبہ نزول وحی کے بعد آپؐ اُسے بھول نہیں سکیں گے، چنانچہ یہی ہوا کہ ادھر آپؐ پر آیات قرآنی نازل ہوتیں اور ادھر وہ آپؐ کو یاد ہو جائیں، اس طرح سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا سینہ مبارک قرآن کریم کا سب سے زیادہ محفوظ گنجینہ تھا، جس میں کسی ادنیٰ غلطی یا ترمیم و تغیر کا امکان نہیں تھا، پھر آپؐ مزید حیات کے طور پر ہر سال رمضان کے مہینے میں حضرت جبریل علیہ السلام کو قرآن سنایا کرتے تھے، اور جس سال آپؐ کی وفات ہوئی اُس سال آپؐ نے دوسرے مرتبہ حضرت جبریل علیہ السلام کے ساتھ ذکر کیا۔ (صحیح بخاری ج ۱ ص ۳۶ ج ۱)

پھر آپؐ صحابہ کرامؓ کو قرآن کریم کے معانی کی تعلیم ہی نہیں دیتے تھے، بلکہ انھیں اس کے الفاظ بھی یاد کراتے تھے، اور خود صحابہ کرامؓ کو قرآن کریم سیکھنے اور اسے یاد رکھنے کا اتنا شوق تھا کہ

ہر شخص اس معاملہ میں دوسرے آگے بڑھنے کی فکر میں رہتا تھا، بعض عورتوں نے اپنے شوہروں سے سوائے اس کے کوئی ہر طلب نہیں کیا کہ وہ انھیں شکرانہ کریم کی تعلیم دیں گے، سینکڑوں صحابہؓ نے اپنے آپ کو ہر غم ماسوائے آزاد کر کے اپنی زندگی اسی کام کے لئے وقف کر دی تھی، وہ قرآن کریم کو نہ صرف یاد کرتے بلکہ راتوں کو نماز میں اسے پڑھتے رہتے تھے، حضرت عبادہ بن صامتؓ فرماتے ہیں کہ جب کوئی شخص ہجرت کر کے مکہ مکرمہ سے مدینہ طیبہ آتا تو آپؐ اُسے ہم انصاریوں میں سے کسی کے جوگے فرمادیتے، تاکہ وہ اسے قرآن سکھائے، اور سجدہ نبویؐ میں قرآن سیکھے سکھانے والوں کی آوازیں کا اتنا شور مچنے لگا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ تاکید فرمانا پڑی کہ اپنی آوازیں پست کرو، تاکہ کوئی غلط پیش نہ آئے (مشاہل القرآن ۱/۲۳۲)

چنانچہ تھوڑی ہی مدت میں صحابہ کرامؓ کی ایک ایسی بڑی جماعت تیار ہو گئی جسے قرآن کریم از بر حفظ تھا، اس جماعت میں خلفائے راشدین کے علاوہ حضرت طلحہؓ، حضرت سعدؓ، حضرت ابن مسعودؓ، حضرت حذیفہ بن یمانؓ، حضرت سالمؓ، مولیٰ ابی حذیفہؓ، حضرت ابو ہریرہؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت عبداللہ بن عباسؓ، حضرت عمر بن عاصؓ، حضرت عبداللہ بن عمروؓ، حضرت معاذ بن عمروؓ، حضرت عبداللہ بن زبیرؓ، حضرت عبداللہ بن اسبابؓ، حضرت عائشہؓ، حضرت حفصہؓ، حضرت ام سلمہؓ وغیرہ بطور خاص قابل ذکر ہیں۔

غرض ابتدائے اسلام میں زیادہ زور حفظ قرآن پر دیا گیا، اور اس وقت کے حالات میں یہی طریقہ زیادہ محفوظ اور قابل اعتماد تھا، اس لئے کہ اس زمانے میں لکھنے پڑھنے والوں کی تعداد بہت کم تھی، کتابوں کو شائع کرنے کے لئے پریس وغیرہ کے ذرائع موجود نہ تھے، اس لئے اگر صرف لکھنے پر اعتماد کیا جاتا تو نہ قرآن کریم کی وسیع پیمانے پر اشاعت ہو سکتی، اور نہ اُس کی قابل اعتماد حفاظت، اس کے بجائے اللہ تعالیٰ نے اہل عرب کو حافظہ کی ایسی قوت عطا فرمادی تھی کہ ایک ایک شخص ہزاروں اشعار کا حافظ ہوتا تھا، اور معمولی معمولی دیہاتیوں کو اپنے اور اپنے خاندان ہی کے نہیں اُن کے گھوڑوں تک کے نسب نامے یاد ہوتے تھے، اس لئے قرآن کریم کی حفاظت میں اسی قوت حافظہ سے کام لیا گیا، اور اسی کے ذریعہ قرآن کریم کی آیات اور سورتیں عرب کے گوشے گوشے میں پہنچیں۔

کتابت قرآن قرآن کریم کو حفظ کرنے کے علاوہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کریم کو لکھنے کا بھی خاص ہتمام فرمایا، حضرت زید بن ثابتؓ فرماتے ہیں کہ میں آپؐ کے لئے وحی کی کتابت کرتا تھا، جب آپؐ پر وحی نازل ہوتی تو آپؐ کو سخت گرمی لگتی، اور آپؐ کے جسم اطہر پسینہ

سلہ مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "علوم القرآن" احقر کی مفصل کتاب۔

کے قطرے موتیوں کی طرح ڈھلکنے لگتے تھے، پھر جب آپؐ سے یہ کیفیت ختم ہو جاتی تو میں مونڈے کی کوئی ہڈی یا کسی اور چیز کا ٹکڑا لے کر خدمت میں حاضر ہوتا، آپؐ نکھواتے رہتے، اور میں نکھاتا جاتا، پہلا ٹکڑا جب میں نکھ کر فارغ ہوتا تو شکرانہ کو نقل کرنے کے بعد مجھے یوں محسوس ہوتا جیسے میری ٹانگ ٹوٹنے والی ہے، اور میں کبھی چل نہیں سکوں گا، بہر حال، جب میں فارغ ہوتا تو آپؐ فرماتے "پڑھو" میں پڑھ کر سناٹا، اگر اس میں کوئی فروگزاشت ہوتی تو آپؐ اس کی اصلاح فرمادیتے اور پھر اسے لوگوں کے سامنے لے آتے (مجمع الزوائد ۱/۵۹۱ بحوالہ طبرانی)

حضرت زید بن ثابتؓ کے علاوہ اور بھی بہت سے صحابہؓ کتابت وحی کے فرائض انجام دیتے تھے جن میں خلفائے راشدین، حضرت ابی بن کعبؓ، حضرت زبیر بن عوامؓ، حضرت معاذ بن جعفرؓ، مغیرہ بن شعبہؓ، حضرت خالد بن الولیدؓ، حضرت ثابت بن قیسؓ، حضرت ابان بن سعیدؓ وغیرہ بطور خاص قابل ذکر ہیں (تفصیل کے لئے دیکھئے فتح الباری ۱/۱۸۷ اور زاد المعاد ۲/۱۲۰)

حضرت عثمانؓ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول یہ تھا کہ جب قرآن کریم کا کوئی حصہ نازل ہوتا تو آپؐ وحی کو یہ ہدایت بھی فرمادیتے تھے کہ اسے فلاں سورت میں فلاں فلاں آیات کے بعد لکھا جائے (فتح الباری ۱/۱۸۷) اُس زمانے میں چونکہ عرب میں کاغذ کیاب تھا، اس لئے یہ قرآنی آیات زیادہ تر پتھر کی سلوں، چمڑے کے پارچوں، کھجور کی شاخوں، بانس کے ٹکڑوں، درخت کے پتوں اور جانوروں کی ہڈیوں پر لکھی جاتی تھیں، البتہ کبھی کبھی کاغذ کے ٹکڑے بھی استعمال کئے گئے ہیں (ایضاً ۱/۱۸۷)

اس طرح عہد رسالت میں قرآن کریم کا ایک نسخہ تو وہ تھا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی نگرانی میں لکھوایا تھا، اگرچہ وہ مرتب کتاب کی شکل میں نہیں تھا، بلکہ متفرق پارچوں کی شکل میں تھا، اس کے ساتھ ہی بعض صحابہؓ کرامؓ بھی اپنی یادداشت کے لئے آیات قرآنی اپنے پاس لکھ لیتے تھے، اور یہ سلسلہ اسلام کے ابتدائی عہد سے جاری تھا، چنانچہ حضرت عمرؓ کے اسلام لانے سے پہلے ہی اُن کی بہن اور بہنوئی کے ایک صحیفہ میں آیات قرآنی لکھی ہوئی تھیں (تسلسلہ اسلام، حضرت ابو بکرؓ کے عہد) لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں قرآن کریم کے جتنے نسخے لکھے گئے تھے اُن کی کیفیت یہ تھی کہ یا تو وہ متفرق اشیاء پر لکھے ہوئے تھے

کوئی آیت چمڑے پر، کوئی درخت کے پتے پر، کوئی ہڈی پر، یا وہ پھل پر لکھے ہوئے تھے، کسی صحابی کے پاس ایک سورت لکھی ہوتی تھی، کسی کے پاس دس پانچ سورتیں اور کسی کے پاس صرف چند آیات، اور بعض صحابہؓ کے پاس آیات کے ساتھ تفسیری جملے بھی لکھے ہوئے تھے۔ اس بنا پر حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے اپنے عہد خلافت میں یہ ضروری سمجھا کہ قرآن کریم

کے ان منتشر حصوں کو یک جا کر کے محفوظ کر دیا جائے، انھوں نے یہ کارنامہ جن حرکات کے تحت اور جس طرح انجام دیا اس کی تفصیل حضرت زید بن ثابتؓ نے یہ بیان فرمائی ہے کہ جنگ یتامہ کے فوراً بعد حضرت ابوبکرؓ نے ایک روز مجھے بیٹھ کر بلوایا، میں ان کے پاس پہنچا تو وہاں حضرت عمرؓ بھی موجود تھے، حضرت ابوبکرؓ نے مجھ سے فرمایا کہ ”عمرؓ نے ابھی آکر مجھ سے یہ بات کہی ہے کہ جنگ یتامہ میں قرآن کریم کے حفاظ کی ایک بڑی جماعت شہید ہو گئی، اور اگر مختلف مقامات پر قرآن کریم کے حافظ اسی طرح شہید ہوتے رہے تو مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں قرآن کریم کا ایک بڑا حصہ ناپید نہ ہو جائے، لہذا میری رائے یہ ہے کہ آپ اپنے حکم سے قرآن کریم کو جمع کر دینے کا کام شروع کر دیں، میں نے عمرؓ سے کہا کہ جو کام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا وہ ہم کیسے کریں۔

عمرؓ نے جواب دیا کہ خدا کی قسم! یہ کام بہتر ہی بہتر ہے، اس کے بعد عمرؓ مجھ سے بار بار یہی کہتے رہے یہاں تک کہ مجھے بھی اس پر شرح صدر ہو گیا اور اب میری رائے بھی وہی ہے جو عمرؓ کی ہے، اس کے بعد حضرت ابوبکرؓ نے مجھ سے فرمایا کہ ”تم لو جو ان اور مجھدار آدمی ہو، ہمیں تمھارے ہائے میں کوئی بدگمانی نہیں ہے، تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کتابت وحی کا کام بھی کرتے رہے ہو لہذا تم قرآن کریم کی آیتوں کو تلاش کر کے انھیں جمع کرو۔“

حضرت زید بن ثابتؓ فرماتے ہیں کہ خدا کی قسم! اگر یہ حضرات مجھے کوئی پہاڑ ڈھولنے کا حکم دیتے تو مجھ پر اس کا اتنا بوجھ نہ ہوتا جتنا جمع قرآن کے کام کا ہوا، میں نے اُن سے کہا کہ آپ وہ کام کیسے کر رہے ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا، حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا کہ خدا کی قسم! یہ کام بہتر ہی بہتر ہے، اس کے بعد حضرت ابوبکرؓ رضی اللہ عنہ، مجھ سے بار بار یہی کہتے رہے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے میرا سینہ اس رائے کے لئے کھول دیا جو حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ کی رائے تھی، چنانچہ میں نے قرآنی آیات کو تلاش کرنا شروع کیا، اور کچھ روکی شاخوں، پتھر کی تختیوں اور لوگوں کے سینوں پر قرآن کریم کو جمع کیا (صحیح بخاری، کتاب فضائل القرآن)۔

جمع قرآن کے سلسلے میں حضرت زید بن ثابتؓ کا طریق کار
اس موقع پر جمع قرآن کے سلسلے میں حضرت زید بن ثابتؓ کے طریق کار کو ابھی طرح سمجھ لینا چاہیے جیسا کہ نیچے ذکر آچکا ہے، وہ خود حافظ قرآن تھے، لہذا وہ اپنی یادداشت سے پورا قرآن لکھ سکتے تھے، ان کے علاوہ بھی سیکڑوں حفاظ اُس وقت موجود تھے، ان کی ایک جماعت بنا کر بھی قرآن کریم لکھا جاسکتا تھا۔

نیز قرآن کریم کے جو نسخے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں لکھ لئے گئے تھے حضرت زیدؓ ان سے بھی قرآن کریم نقل فرما سکتے تھے، لیکن انھوں نے احتیاط کے پیش نظر صرف کسی ایک طریقہ پر بس نہیں کیا، بلکہ ان تمام ذرائع سے بیک وقت کام لے کر اس وقت تک کوئی آیت اپنے صحیفوں میں

درج نہیں کی جب تک اس کے متوازن ہونے کی تحریری اور زبانی شہادتیں نہیں مل گئیں، اس کے علاوہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کریم کی جو آیات اپنی نگرانی میں لکھوائی تھیں وہ مختلف صحابہؓ کے پاس محفوظ تھیں، حضرت زیدؓ نے انھیں یک جا فرمایا تاکہ دنیا و آخرت ان سے ہی نقل کیا جائے، چنانچہ یہ اعلان عام کر دیا گیا کہ جس شخص کے پاس قرآن کریم کی جتنی آیات لکھی ہوئی ہو جو ہوں وہ حضرت زیدؓ کے پاس لے آئے، اور جب کوئی شخص اُن کے پاس قرآن کریم کی کوئی لکھی ہوئی آیت لے کر آتا تو وہ مندرجہ ذیل چار طریقوں سے اس کی تصدیق کرتے تھے۔

(۱) سب سے پہلے اپنی یادداشت سے اس کی توثیق کرتے۔
(۲) پھر حضرت عمرؓ بھی حافظ قرآن تھے، اور روایات سے ثابت ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے اُن کو بھی اس کام میں حضرت زیدؓ کے ساتھ لگادیا تھا اور جب کوئی شخص کوئی آیت لیکر آتا تھا تو حضرت زیدؓ اور حضرت عمرؓ دونوں مشترک طور پر اسے وصول کرتے تھے (فتح الباری ۱/۹) بحوالہ ابن ابی داؤد۔

(۳) کوئی بھی ہوئی آیت اُس وقت تک قبول نہیں کی جاتی تھی جب تک دو قابل اعتبار گواہوں نے اس بات کی گواہی نہ دیدی ہو کہ یہ آیت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے لکھی گئی تھی۔ (اتقان ۱/۶)

(۴) اس کے بعد ان لکھی ہوئی آیتوں کا اُن مجموعوں کے ساتھ مقابلہ کیا جاتا تھا جو مختلف صحابہؓ نے تیار کر رکھے تھے (البرہان فی علوم القرآن للزکشی ۲/۱۲۳)

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں جمع قرآن کا یہ طریق کار زمین میں رہا تو حضرت زید بن ثابتؓ کے اس ارشاد کا مطلب ابھی طرح سمجھ میں آسکتا ہے کہ سورۃ براءہ کی آخری آیات لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِّنْ أَنفُسِكُمْ فَخُذُوا حِذْرًا فَهُوَ بَرٌ ذُو آلَاءٍ بَهِيمٍ ان کے پاس ملیں، ان کے سوا کسی اور کے پاس نہیں ملیں۔ اس کا مطلب یہ ہو گیا کہ یہ آیتیں سوائے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے کسی اور کو یاد نہیں تھیں، یا کسی اور کے پاس لکھی ہوئی نہ تھیں، اور اُن کے سوا کسی اور کا جُزبہ قرآن ہونا معلوم نہ تھا، بلکہ مطلب یہ ہے کہ جو لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی لکھوائی ہوئی متفرق آیتیں لے لے کر آ رہے تھے اُن میں سے یہ آیتیں سوائے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے کسی کے پاس نہیں ملیں، ورنہ جہاں تک ان آیات کے جزو قرآن ہونے کا تعلق ہے یہ بات تو اتر کے ساتھ سب کو معلوم تھی، کیونکہ سینکڑوں صحابہؓ کو یاد بھی تھی، اور جن حضرات کے پاس آیات قرآنی کے مکمل مجموعے تھے اُن کے پاس لکھی ہوئی بھی تھیں، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نگرانی میں الگ لکھی ہوئی صرف حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس ملیں، کسی اور

کے پاس نہیں (البرہان ۱/ ۲۳۷ و ۲۳۸)۔

ام کی خصوصیات

بہر کیف! حضرت زید بن ثابتؓ نے اس زبردست احتیاط کے ساتھ آیات قرآنی کو جمع کر کے انہیں کاغذ کے صحیفوں پر مرتب شکل میں تحریر فرمایا (تھان ۶۰/۱) لیکن ہر ضرورت علیحدہ صحیفے میں لکھی گئی، اس لیے یہ نسخہ بہت سے صحیفوں پر مشتمل تھا، اصطلاح میں اس نسخہ کو "ام" کہا جاتا ہے، اور اس کی خصوصیات یہ تھیں:-

- (۱) اس نسخہ میں آیات قرآنی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بتائی ہوئی ترتیب کے مطابق مرتب تھیں، لیکن سورتیں مرتب نہیں تھیں، بلکہ ہر سورت الگ الگ لکھی ہوئی تھی (القان، حوالہ بالا)۔
- (۲) اس نسخہ میں سورتوں کے ساتوں حروف (جن کی تشریح پیچھے آچکی ہے) جمع تھے (مناہل العرفۃ ۱/ ۲۲۶، دلائل القرآن لکھنؤ، ص ۲۸)۔

- (۳) اس میں وہ تمام آیتیں جمع کی گئی تھیں جن کی تلاوت منسوخ نہیں ہوئی تھی۔
- (۴) اس نسخہ کو لکھوانے کا مقصد یہ تھا کہ ایک مرتب نسخہ تمام امت کی اجماعی تصدیق کے ساتھ تیار ہو جائے، تاکہ ضرورت پڑنے پر اس کی طرف رجوع کیا جاسکے۔

حضرت ابوبکرؓ کے لکھوانے ہوئے یہ صحیفے آپ کی حیات میں آپ کے پاس رہے، پھر حضرت عمرؓ کے پاس رہے، حضرت عمرؓ کی شہادت کے بعد انھیں ام المؤمنین حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے پاس منتقل کر دیا گیا، پھر حضرت حفصہؓ کی وفات کے بعد مروان بن الحکمؓ نے اسے اس خیال سے نذر آتش کر دیا کہ اس وقت حضرت عثمانؓ کے تیار کرائے ہوئے مصاحف تیار ہو چکے تھے، اور اس بات پر امت کا اجماع منعقد ہو چکا تھا کہ رسم الخط اور سورتوں کی ترتیب کے لحاظ سے ان مصاحف کی پیروی لازم ہے، مروان بن الحکمؓ نے سوچا کہ اب کوئی ایسا نسخہ باقی نہ رہنا چاہیے جو اس رسم الخط اور ترتیب کے خلاف ہو۔ (فتح الباری ۱۶/۹)

جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ خلیفہ بنے تو اسلام عتب سے حضرت عثمانؓ کے عہد میں جمع قرآن شکل کر دوم اور ابرار کے دور دراز علاقوں تک پہنچ چکا تھا ہرگز علاقے کے لوگ جب مسلمان ہوتے تو وہ ان مجاہدین اسلام یا ان تاجروں سے قرآن کریم سیکھتے، جنکی بدلت انھیں اسلام کی نعمت حاصل ہوتی تھی، اور آپ بھی بڑھ چکے ہیں کہ قرآن کریم شات حروف پر نازل ہوا تھا، اور مختلف صحابہ کرامؓ نے اسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مختلف قراءتوں کے مطابق سیکھا تھا، اس لیے ہر صحابی نے اپنے شاگردوں کو اسی قراءت کے مطابق قرآن پڑھایا، جس کے مطابق خود انھوں نے صحف سے پڑھا تھا، اس طرح قراءتوں کا یہ اختلاف دور دراز ممالک تک پہنچ گیا، جب تک لوگ اس حقیقت سے واقف تھے کہ قرآن کریم شات حروف پر نازل ہوا ہے، اس وقت تک اس اختلاف سے کوئی خرابی

پیدا نہیں ہوئی، لیکن جب یہ اختلاف دور دراز ممالک میں پہنچا اور یہ بات ان میں پوری طرح مشہور نہ ہو سکی کہ قرآن کریم شات حروف پر نازل ہوا ہے، تو اس وقت لوگوں میں جھگڑے پیش آنے لگے بعض لوگ اپنی قراءت کو صحیح اور دوسرے کی قراءت کو غلط قرار دینے لگے، ان جھگڑوں سے ایک طرف تو یہ خطہ تھا کہ لوگ قرآن کریم کی متواتر سرتوں کو غلط قرار دینے کی سنگین غلطی میں مبتلا ہوں گے، دوسرے سوائے حضرت زیدؓ کے لکھے ہوئے ایک نسخہ کے جو مدینہ طیبہ میں موجود تھا، پورے عالم اسلام میں کوئی ایسا معیاری نسخہ موجود نہ تھا جو پوری امت کے لئے حجت بن سکے، کیونکہ دوسرے نسخے انفرادی طور پر لکھے ہوئے تھے، اور ان میں ساتوں حروف کو جمع کرنے کا کوئی اہتمام نہیں تھا، اس لیے ان جھگڑوں کے تصفیہ کی قابل اعتماد صورت یہی تھی کہ ایسے نسخے پورے عالم اسلام میں پھیلا دیے جائیں، جن میں ساتوں حروف جمع ہوں اور انھیں دیکھ کر یہ فیصلہ کیا جاسکے کہ کونسی قراءت صحیح اور کونسی غلط ہے، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنے عہد خلافت میں یہی عظیم الشان کارنامہ انجام دیا۔

اس کارنامے کی تفصیل روایات حدیث سے یہ معلوم ہوتی ہے کہ حضرت حذیفہ بن یمانؓ آرمینیا اور آذربائیجان کے محاذ پر جہاد میں مشغول تھے، وہاں انھوں نے دیکھا کہ لوگوں میں قرآن کریم کی قراءتوں کے بارے میں اختلاف ہو رہا ہے، چنانچہ مدینہ طیبہ واپس آتے ہی وہ سیدھے حضرت عثمانؓ کے پاس پہنچے، اور جا کر عرض کیا کہ امیر المؤمنین! قبل اس کے کہ یہ امت اللہ کی کتاب کے بارے میں یہود و نصاریٰ کی طرح اختلافات کی شکار ہو، آپ اس کا علاج کیجئے، حضرت عثمانؓ نے پوچھا بات کیسا ہے؟ حضرت حذیفہؓ نے جواب میں کہا کہ میں آرمینیا کے محاذ پر جہاد میں شامل تھا وہاں میں نے دیکھا کہ شام کے لوگ آپ کی قراءت پڑھتے ہیں، جو اہل عراق نے نہیں سنی ہوئی، اور اہل عراق عبداللہ بن مسعودؓ کی قراءت پڑھتے ہیں جو اہل شام نے نہیں سنی ہوئی، اس کے نتیجے میں ایک دوسرے کو کافر قرار دے رہے ہیں۔

حضرت عثمانؓ نے خود بھی اس خطرے کا احساس پہلے ہی کر چکے تھے، انھیں یہ اطلاع ملی تھی کہ خود مدینہ طیبہ میں ایسے واقعات پیش آئے ہیں کہ قرآن کریم کے ایک معلم نے اپنے شاگردوں کو ایک قراءت کے مطابق قرآن پڑھایا، اور دوسرے معلم نے دوسری قراءت کے مطابق، اس طرح مختلف اساتذہ کے شاگرد جب باہم ملتے تو ان میں اختلاف ہوتا، اور بعض مرتبہ یہ اختلاف اساتذہ تک پہنچ جاتا، اور وہ بھی ایک دوسرے کی قراءت کو غلط قرار دیتے، جب حضرت حذیفہ بن یمانؓ نے بھی اس خطرے کی طرف توجہ دلائی تو حضرت عثمانؓ نے جلیل القدر صحابہ کو جمع کر کے ان سے شورو کیا اور فرمایا کہ: مجھے یہ اطلاع ملی ہے کہ بعض لوگ ایک دوسرے سے اس قسم کی باتیں کہتی ہیں

کر میری قراءت جہاں قرات سے بہتر ہے، اور یہ بات کفر کی حد تک پہنچ سکتی ہے، لہذا آپ لوگوں کی اس بات میں کیا رائے ہے؟ صحابہؓ نے خود حضرت عثمانؓ سے پوچھا کہ "آپ نے کیا سوچا ہے؟" حضرت عثمانؓ نے فرمایا کہ "میری رائے یہ ہے کہ ہم تمام لوگوں کو ایک مصحف پر جمع کر دیں تاکہ کوئی اختلاف اور افتراق پیش نہ آئے،" صحابہؓ نے اس رائے کو پسند کر کے حضرت عثمانؓ کی تائید فرمائی۔

چنانچہ حضرت عثمانؓ نے لوگوں کو جمع کر کے ایک خطبہ دیا، اور اس میں فرمایا کہ تم لوگ مدینہ طیبہ میں میرے قریب، ہوتے ہوئے قرآن کریم کی قراتوں کے بارے میں ایک دوسرے کی تکذیب اور ایک دوسرے سے اختلاف کرتے ہو، اس سے ظاہر ہے کہ جو لوگ مجھ سے دور ہیں وہ تو اور بھی زیادہ تکذیب اور اختلاف کرتے ہوں گے، لہذا تمام لوگ مل کر قرآن کریم کا ایسا نسخہ تیار کریں جو سب کے لئے واجباً مقدر ہو، اس غرض کے لئے حضرت عثمانؓ نے حضرت حفصہؓ کے پاس پیغام بھیجا کہ آپ کے پاس حضرت ابوبکرؓ کے تیار کرائے ہوئے، جو صحیفہ موجود ہیں وہ ہمارے پاس بھیج دیجئے، ہم ان کو مصاحف میں نقل کر کے آپ کو واپس کر دیں گے، حضرت حفصہؓ نے وہ صحیفہ حضرت عثمانؓ کے پاس بھیج دیئے، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے چار صحابہؓ کی ایک جماعت بنائی، جو حضرت زید بن ثابتؓ، حضرت عبداللہ بن زبیرؓ، حضرت سعید بن العاصؓ اور حضرت عبدالرحمن بن حارث بن ہشامؓ پر مشتمل تھی، اس جماعت کو اس کام پر مامور کیا گیا کہ وہ حضرت ابوبکرؓ کے صحیفوں سے نقل کر کے کئی ایسے مصاحف تیار کرے جن میں سورتیں بھی مرتب ہوں، ان چار صحابہؓ میں سے حضرت زیدؓ انصاری تھے، اور باقی تینوں قراءت شریعی، اس لئے حضرت عثمانؓ نے ان سے فرمایا کہ تجب تمہارا اور زیدؓ کا قرآن کے کسی حصہ میں اختلاف ہو رہی ہے اس میں اختلاف ہو کہ کونسا لفظ کس طرح لکھا جائے؟ تو اسے قریش کی زبان کے مطابق لکھنا، اس لئے کہ قرآن کریم انہی کی زبان میں نازل ہوا ہے۔

بنیادی طور پر تو یہ کام مذکورہ چار حضرات ہی کے سپرد کیا گیا تھا، لیکن پھر دوسرے صحابہؓ کو بھی ان کی مدد کے لئے ساتھ لگا دیا گیا، ان حضرات نے کتابت قرآن کے سلسلے میں مندرجہ ذیل کام انجام دیئے۔

(۱) حضرت ابوبکرؓ کے زمانے میں جو نسخے تیار ہوئے ان میں سورتیں مرتب نہیں تھیں، بلکہ ہر سورت الگ الگ لکھی ہوئی تھی، ان حضرات نے تمام سورتوں کو قریب کے ساتھ ایک ہی مصحف میں لکھا (مسند رک ۲/۲۲۹)

(۲) قرآن کریم کی آیات اس طرح لکھیں کہ ان کے رسم الخط میں تمام متواتر قراتیں

لے یہ پوری تفصیل اور اس سلسلے کی تمام روایات فتح الباری ص ۱۱۳ تا ۱۱۹ سے ماخوذ ہیں۔

سجائیں، اسی لئے ان پر نہ فقط لگائے گئے اور نہ حرکات (زیر زبریں) تاکہ اسے تمام متواتر قراتوں کے مطابق پڑھا جاسکے، مثلاً مسرھا لکھا تاکہ اسے نثراً اور منثراً ہاد دونوں طرح پڑھا جاسکے کیونکہ یہ دونوں قراتیں درست ہیں (ماہل العرفان ۱/۲۵۳ و ۲۵۴)

(۳) اب تک قرآن کریم کا مکمل معیار نسخہ جو پوری امت کی اجتماعی تصدیق سے تیار کیا گیا، صرف ایک تھا، ان حضرات نے اس نئے مرتب مصحف کی ایک سے زائد نقلیں تیار کیں، عام طور پر مشہور یہ ہے کہ حضرت عثمانؓ نے پانچ مصاحف تیار کرائے تھے، لیکن ابو حاتم سجستانیؒ کا ارشاد ہے کہ مکمل سات نسخے تیار کئے گئے تھے، جن میں سے ایک مکہ مکرمہ، ایک شام، ایک یمن، ایک بحرین، ایک بصرہ اور ایک کوفہ بھیج دیا گیا، اور ایک مدینہ طیبہ میں محفوظ رکھا گیا (فتح الباری ۱/۱۱۹) (۴) مذکورہ بالا کام کرنے کے لئے ان حضرات نے بنیادی طور پر قراءتیں صحیفوں کو سامنے رکھا

جو حضرت ابوبکرؓ کے زمانے میں لکھے گئے تھے، لیکن اس کے ساتھ ہی مزید احتیاط کے لئے وہی نسخہ کا اختیار کیا جو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں اختیار کیا گیا تھا، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کی جو متفرق تحریریں مختلف صحابہؓ کے پاس محفوظ تھیں، انہیں دوبارہ طلب کیا گیا اور ان کے ساتھ از سر نو مقابلہ کر کے یہ نسخے تیار کئے گئے، اس مرتبہ سورۃ احزاب کی ایک آیت

مِنَ الْمُؤْمِنِينَ رِجَالٌ صَدَقُوا مَا عَاهَدُوا اللَّهَ عَلَيْهِ فَمِنْهُمْ مَنِ انْتَحَبَ لِنَفْسِهِ فَمِنْهُمْ مَنِ انْتَحَبَ لِنَفْسِهِ فَمِنْهُمْ مَنِ انْتَحَبَ لِنَفْسِهِ

خزیمہ بن ثابت انصاریؓ کے پاس ملی، پیچھے ہم لکھ چکے ہیں کہ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ یہ آیت کسی اور شخص کو یاد نہیں تھی، کیونکہ حضرت زیدؓ خود فرماتے ہیں کہ "مصحف لکھتے وقت سورۃ احزاب کی وہ آیت نہ ملی جو میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پڑھتے ہوئے سنا کرتا تھا، اس سے صحت واضح ہے کہ یہ آیت حضرت زیدؓ اور دوسرے صحابہؓ کو اچھی طرح یاد تھی، اسی طرح اس کا مطلب

یہ بھی نہیں ہے کہ یہ آیت کہیں اور لکھی ہوئی نہ تھی، کیونکہ حضرت ابوبکرؓ کے زمانے میں جو صحیفے لکھے گئے ظاہر ہے کہ یہ آیت ان میں موجود تھی، نیز دوسرے صحابہؓ کے پاس قرآن کریم کے جو انفرادی طور پر لکھے ہوئے نسخے موجود تھے ان میں یہ آیت بھی شامل تھی، لیکن چونکہ حضرت ابوبکرؓ کے زمانے کی

طرح اس مرتبہ بھی ان تمام متفرق تحریروں کو جمع کیا گیا تھا جو صحابہؓ کرامؓ کے پاس لکھی ہوئی تھیں اس لئے حضرت زیدؓ وغیرہ نے کوئی آیت ان مصاحف میں اس وقت تک نہیں لکھی جب تک ان تحریروں میں بھی وہ نہ مل گئی، اس طرح دوسری آیتیں تو متعدد صحابہؓ کے پاس علیحدہ لکھی ہوئی تھیں، لیکن سورۃ احزاب کی یہ آیت سوائے حضرت خزیمہؓ کے کسی اور کے پاس الگ لکھی ہوئی دستیاب نہیں ہوئی۔

(۵) قرآن کریم کے یہ متعدد معیار نسخے تیار فرمانے کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے وہ

تمام انفرادی نسخے بذراآت فرمادیے جو مختلف صحابہؓ کے پاس موجود تھے تاکہ رسم الخط مسلمہ قرار توں کے اجتماع اور سورتوں کی ترتیب کے اعتبار سے تمام مصاحف یکساں ہو جائیں، اور ان میں کوئی اختلاف باقی نہ رہے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے اس کارنامے کو پوری اہمیت نے بہ نظر احسان دیکھا، اور تمام صحابہؓ نے اس کام میں اُن کی تائید اور حمایت فرمائی، صرف حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کو اس معاملہ میں کچھ رنجش رہی جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں ملتا، حضرت علیؓ فرماتے ہیں:-
 "عثمانؓ کے بارے میں کوئی بات اُن کی بھلائی کے سوا نہ کہو، کیونکہ اللہ کی قسم! انھوں نے مصاحف کے معاملہ میں جو کام کیا وہ ہم سب کی موجودگی میں مشورے سے کیا،" (ریخ الباری ۱۵/۹)

تلاوت میں آسانی پیدا کرنے کے اقدامات
 حضرت عثمانؓ کے مذکورہ بالا کارنامے کے بعد اُمت کا اس پراجہ شروع کیا کہ قرآن کریم کو رسم عثمانی کے خلاف کسی اور طریقے سے لکھنا جائز نہیں چنانچہ اس کے بعد تمام مصاحف اسی طریقے کے مطابق لکھے گئے، اور صحابہؓ و تابعینؓ نے مصاحف عثمانی کی نقول تیار کر کے قرآن کریم کی وسیع پیمانے پر اشاعت کی۔

لیکن ابھی تک قرآن کریم کے نسخے چونکہ نقطوں اور زیر و بر پیش سے خالی تھے، اس لئے اہل عجم کو ان کی تلاوت میں دشواری ہوتی تھی، چنانچہ جب اسلام عجمی ممالک میں اور زیادہ پھیلا تو اس بات کی ضرورت محسوس ہوئی کہ اس میں نقطوں اور حرکات کا اضافہ کیا جائے، تاکہ تمام لوگ آسانی سے اس کی تلاوت کر سکیں، اس مقصد کے لئے مختلف آدمی مقرر کئے گئے، جن کی مختصر تاریخ درج ذیل ہے:

نقطہ
 اہل عرب میں ابتداء حروف پر نقطے لگانے کا رواج نہیں تھا، اور عربیہ دالے اس طرز کے اتنے عادی تھے کہ انھیں بغیر نقطوں کی تحریر پڑھنے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی تھی، اور سیاق و سباق کی مدد سے مشتبہ حروف میں ہستیا ز بھی بہ آسانی ہو جاتا تھا، خاص طور سے قرآن کریم کے معاملے میں کسی اشتباہ کا امکان اس لئے نہیں تھا کہ اس کی حفاظت کا مدار کتابت پر نہیں بلکہ حافظوں پر تھا، اور حضرت عثمانؓ نے جو نسخے عالم اسلام کے مختلف حصوں میں بھیجے تھے ان کے ساتھ قاری بھی بھیجے گئے تھے، جو اسے پڑھنا سکھا سکیں۔

اس میں روایات مختلف ہیں، کہ قرآن کریم کے نسخے پر سب سے پہلے کس نے نقطہ ڈالے؟ بعض روایتیں یہ کہتی ہیں کہ یہ کارنامہ سب سے پہلے حضرت ابوالاسود دؤلیؓ نے انجام دیا اور ابراہانؓ (۱۲۰/۱) بعض کا کہنا ہے کہ انھوں نے یہ کام حضرت علیؓ کی تلقین کے تحت کیا (اصح الاصح ۱۵۰/۳) اور بعض نے کہا ہے کہ کوثرؓ کے گورنر زید بن ابی سلیمان نے ان سے یہ کام کرایا اور ایک روایت یہ بھی ہے کہ یہ کارنامہ لے اس کی تفصیل کے لئے احقریٰ فضل کتاب علوم القرآن، ملاحظہ فرمائیے۔

عجاج بن یوسف نے حسن بصریؒ، یحییٰ بن یعربؒ اور نصر بن عاصم لیثیؒ کے ذریعہ انھما دیا (تفسیر القرطبی ۱۶۱/۱) **حرکات**
 نقطوں کی طرح شروع میں دستور آن کریم پر حرکات (زیر و بر پیش) بھی نہیں تھیں، اور اس میں بھی روایات کا بڑا اختلاف ہے کہ سب سے پہلے کس نے حرکات لگائیں؟

بعض حضرات کا کہنا ہے کہ یہ کام سب سے پہلے ابوالاسود دؤلیؓ نے انجام دیا، بعض کہتے ہیں کہ یہ کام عجاج بن یوسف نے یحییٰ بن یعربؒ اور نصر بن عاصم لیثیؒ سے کرایا (دستور طبعی ۶۲/۱)

اس سلسلے میں تمام روایات کو پیش نظر رکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حرکات سب سے پہلے ابوالاسود دؤلیؓ نے وضع کیں، لیکن یہ حرکات اُس طرح کی نہ تھیں جیسی آجکل رائج ہیں، بلکہ زیر کے لئے حروف کے اوپر ایک نقطہ (ر) زیر کے لئے حروف کے نیچے ایک نقطہ (ز) اور پیش کیلئے حروف کے سامنے ایک نقطہ (پ) اور تنوین کے لئے دو نقطے (ت یا یا یا) مقرر کئے گئے۔

بعد میں خلیل بن احمدؒ نے ہمزہ اور تشدید کی علامتیں وضع کیں (صحیح الاصحی ۱۶۱/۳ و ۱۶۱/۴)۔ اس کے بعد عجاج بن یوسف نے یحییٰ بن یعربؒ، نصر بن عاصم لیثیؒ اور حسن بصریؒ رحمہم اللہ سے بیک وقت قرآن کریم پر نقطے اور حرکات دونوں لگانے کی فرمائش کی، اس موقع پر حرکات کے اظہار کے لئے نقطوں کے بجائے زیر و بر پیش کی موجودہ صورتیں معشر کی گئیں، تاکہ حرکت کے ذاتی نقطوں سے اُن کا التباس پیش نہ آئے، واللہ بجاۃ العلم۔

احزاب یا منزلیں
 صحابہؓ اور تابعینؓ کا معمول تھا کہ وہ ہر ہفتے ایک قرآن ختم کر لیتے تھے، اس مقصد کے لئے انھوں نے روزانہ تلاوت کی ایک مقدار معطر کی ہوئی تھی جسے "جزب" یا "منزل" کہا جاتا ہے، اس طرح پورے قرآن کو مکمل سات احزاب پر تقسیم کیا گیا تھا (البرہان ۲۵۰/۱)

اجزاء یا پارے
 آجکل قرآن کریم تین اجزاء پر منقسم ہے، جنہیں تین پارے کہا جاتا ہے، یہ پاروں کی تقسیم معنی کے اعتبار سے نہیں، بلکہ بچوں کو پڑھانے کے لئے آسانی کے خیال سے تین مساوی حصوں پر تقسیم کر دیا گیا ہے، چنانچہ بعض اوقات بالکل ادھوری بات پر پارہ ختم ہو جاتا ہے، بعض کے ساتھ یہ کہنا مشکل ہے کہ یہ تین پاروں کی تقسیم کس نے کی ہے؟ بعض حضرات کا خیال ہے کہ حضرت عثمانؓ نے مصاحف نقل کراتے وقت انہیں تین مختلف صحیفوں میں لکھوایا تھا، لہذا یہ تقسیم آپ ہی کے زائد کی ہے، لیکن متقدمین کی کتابوں میں اس کی کوئی دلیل احقر کو نہیں مل سکی، البتہ علامہ بدر الدین زکریاؒ نے لکھا ہے کہ قرآن کے تین پارے مشہور چلے آئے ہیں اور مدارس کے قرآنی نسخوں میں اُن کا رواج ہے (البرہان ۲۵۰/۱ و مناقب العرفان ۳۰۲/۱) لہذا ہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ تقسیم عہد صحابہؓ کے بعد تعلیم کی سہولت کے لئے کی گئی ہے، واللہ اعلم۔

اُخماس اور اعشار

قرآن اولیٰ کے تشریحی نسخوں میں ایک اور علامت کا رواج تھا، اور وہ یہ کہ ہر پانچ آیتوں کے بعد دھماکے پر لفظ "مخمس" یا "خ" اور ہر دس آیتوں کے بعد لفظ "عشر" یا "ع" لکھ دیتے تھے، پہلی قسم کی علامتوں کو "اُخماس" اور دوسری قسم کی علامتوں کو "اعشار" کہا جاتا تھا۔ منہاجل احقران (۳۰۳/۱) علامتہدین میں یہ اختلاف بھی رہا ہے کہ بعض حضرات ان علامتوں کو جائز اور بعض مکروہ سمجھتے تھے، یقینی طور سے یہ کہنا بھی مشکل ہو کہ یہ علامتیں سب سے پہلے کس نے لگائیں؟ ایک قول یہ ہے کہ اس کا موجد حجاج بن یوسف تھا، اور دوسرا قول یہ ہے کہ سب سے پہلے عباسی خلیفہ مامون نے اس کا حکم دیا تھا۔ البرہان (۲۵۱/۱) لیکن یہ دونوں اقوال اس درست معلوم نہیں ہوتے کہ خود صحابہ کے زمانے میں "اعشار" کا تصور ملتا ہے، چنانچہ حضرت مسروقؓ فرماتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ مصحف میں "اعشار" کا نشان ڈالنے کو مکروہ سمجھتے تھے۔ مصنف ابن ابی شیبہ (۲/۲۹۷)

رکوع

"اُخماس" اور "اعشار" کی علامتیں تو بعد میں متروک ہو گئیں، لیکن ایک اور علامت جو آج تک رائج چلی آتی ہے، رکوع کی علامت ہے، اور اس کی تعیین قرآن کریم کے مضامین کے لحاظ سے کی گئی ہے، یعنی جہاں ایک سلسلہ کلام ختم ہوا وہاں رکوع کی علامت (دھماکے پر حررت) بنا دی گئی، احقر کو جب جو کے باوجود مستند طور پر یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ رکوع کی ابتداء کس نے اور کس دور میں کی؟ البتہ یہ بات تقریباً یقینی ہے کہ اس علامت کا مقصد آیات کی ایسی متوسط مقدار کی تعیین ہے جو ایک رکعت میں پڑھی جاسکے، اور اس کو "رکوع" اسی لئے کہتے ہیں کہ نماز میں اس جگہ پہنچ کر رکوع کیا جائے، پورے قرآن میں ۵۴۰ رکوع ہیں، اس طرح اگر تراویح کی ہر رکعت میں ایک رکوع پڑھا جائے تو ستائیسویں شب میں تشریح قرآن کریم ختم ہو سکتا ہے۔ رفتادنی عالمگیر یہ فصل المزاد (۱/۹۱۲)

رموز اوقات

تلاوت اور تجوید کی سہولت کے لئے ایک اور مفید کام یہ کیا گیا کہ مختلف قرآنی جملوں پر ایسے اشارے لکھ دیئے گئے جن سے یہ معلوم ہو سکے کہ اس جگہ وقف کرنا (دانس لینا) کیسا ہے؟ ان اشارات کو "رموز اوقات" کہتے ہیں، اور ان کا مقصد یہ ہے کہ ایک غیر عربی داں انسان بھی جب تلاوت کرے تو صحیح مقام پر وقف کر سکے، اور غلط جگہ نہ اس توڑنے سے معنی میں کوئی تبدیلی پیدا نہ ہو، ان میں سے اکثر رموز شب سے پہلے علامہ ابو عبد اللہ محمد عہ نقاوسی عالمگیر میں مشائخ بخاری کے حوالے سے رکوعات کی تعداد ۵۴۰ بیان کی گئی ہے، لیکن جب قرآن کریم کے رموز بخاری و قسیمی کی تعداد ۵۵۸ پائی، اور بعض اسماء میں خط میں لکھا کہ ان کی گنتی کے مطابق رکوعات کی کل تعداد ۵۶۷ ہے، ہو سکتا ہے کہ کتب کی علامت لگانے میں بھی مختلف نسخوں میں کچھ اختلاف رہا ہو، واللہ اعلم

بن طہور سجادی رحمۃ اللہ علیہ نے وضع فرمائے۔ والنشر فی القرائت العشر (۲۲۵/۱) ان رموز کی تفصیل یہ ہے: ط: یہ "وقف مطلق" کا مخفف ہے، اور اس کا مطلب یہ ہے کہ یہاں بات پوری ہو گئی ہے اس لئے یہاں وقف کرنا بہتر ہے۔

ج: یہ "وقف جائز" کا مخفف ہے، اور اس کا مطلب یہ ہے کہ یہاں وقف کرنا جائز ہے۔
ن: یہ "وقف مجوز" کا مخفف ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ وقف کرنا درست تو ہے، لیکن بہتر یہ ہے کہ وقف نہ کیا جائے۔

ص: یہ "وقف مخصص" کا مخفف ہے، اور اس کا مطلب یہ ہے کہ اس جگہ بات تو پوری نہیں ہوئی، لیکن جملہ جو تکمیل ہو گیا ہے، اس لئے سانس لینے کے لئے دو سر مقامات کے بجائے یہاں وقف کرنا چاہئے۔ (المخ العشر، ص ۱۶۳)

مر: یہ وقف لازم کا مخفف ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر یہاں وقف نہ کیا جائے تو آیت کے معنی میں فحش غلطی کا امکان ہے، لہذا یہاں وقف کرنا زیادہ بہتر ہے، بعض حضرات اسے وقف واجب بھی کہتے ہیں، لیکن اس سے مراد فقہی واجب نہیں جس کے ترک گناہ ہو، بلکہ مقصد صرف یہ ہے کہ تمام اوقات میں اس جگہ وقف کرنا سب سے زیادہ بہتر ہے۔ (النشر، ص ۲۳۱)

لا: یہ "لا یقف" کا مخفف ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ "یہاں نہ ٹھہرو" لیکن اس کا منشاء یہ نہیں کہ یہاں وقف کرنا جائز ہے، بلکہ اس میں بہت سے مقامات ایسے ہیں جہاں وقف کرنے میں کوئی حرج نہیں، اور اس کے بعد والے لفظ سے ابتداء کرنا بھی جائز ہے، لہذا اس کا صحیح مطلب یہ ہے کہ اگر یہاں وقف کیا جائے تو بہتر یہ ہے کہ اسے دوبارہ ٹوٹا کر پڑھا جائے، اگلے لفظ سے ابتداء کرنا مستحسن نہیں۔ (النشر، ص ۲۳۳ ج ۱) لہ

ان رموز کے باقی میں تو یقینی طور پر ثابت ہو کہ یہ علامہ سجادی کے وضع کئے ہوئے ہیں ان کے علاوہ بھی بعض رموز قرآن کریم کے نسخوں میں موجود ہیں، مثلاً:۔

مع: یہ "معانقہ" کا مخفف ہے، یہ علامت اس جگہ لکھی جاتی ہے، جہاں ایک ہی آیت کی دو تفسیریں ممکن ہیں، ایک تفسیر کے مطابق وقف ایک جگہ ہوگا، اور دوسری تفسیر کے مطابق دوسری جگہ، لہذا ان میں سے کسی ایک جگہ وقف کیا جاسکتا ہے، لیکن ایک جگہ وقف کرنے کے بعد دوسری جگہ وقف کرنا درست نہیں، مثلاً: لَکَ مَثَلُ مِمَّنْ فِی النَّوْرِۃِ وَ مَثَلُ مِمَّنْ فِی النَّجْمِۃِ۔

نم: زیم آخر جہ شطآنہ الخ اس میں اگر النورۃ پر وقف کر لیا تو لَکَ مَثَلُ مِمَّنْ فِی النَّجْمِۃِ پر وقف درست نہیں، اور اگر النَّجْمِۃ پر وقف کر لے تو النَّوْرِۃ پر وقف درست نہیں، ہاں دونوں جگہ وقف کریں تو درست ہے، اس کا ایک نام "مقابلہ" بھی ہے، اور اس کی سب سے پہلے نشان دی

امام ابو الفضل رازی نے فرمائی ہے (النشر ص ۲۳۴ ج ۱ والاتقان ص ۸۸ ج ۱)

سکتہ: یہ "سکتہ" کی علامت ہے، اور اس کا مقصد یہ ہے کہ اس جگہ رکنا چاہئے، لیکن سانس نہ ٹوٹنے پائے، یہ عموماً اس جگہ لایا جاتا ہے جہاں ملا کر پڑھنے سے معنی میں غلط فہمی کا اندیشہ ہو۔ وقفہ: اس جگہ "سکتہ" سے قدرے زیادہ دیر تک رکنا چاہئے، لیکن سانس یہاں بھی نہ ٹوٹے۔ ق؛ یہ "قیل علیہ الوقت" کا مخفف ہے، مطلب یہ ہے کہ بعض حضرات کے نزدیک یہاں وقفہ ہے اور بعض کے نزدیک نہیں ہے۔

وقف: یہ لفظ "وقف" ہے جس کے معنی ہیں "بٹھ جاؤ" اور یہ اس جگہ لایا جاتا ہے جہاں پڑھنے والے کو یہ خیال ہو سکتا ہو کہ یہاں وقفہ درست نہیں۔

صلی: یہ "الوصل اولى" کا مخفف ہے جس کے معنی ہیں کہ "ملا کر پڑھنا بہتر ہے"۔ صل: یہ "وقتی یوصل" کا مخفف ہے، یعنی یہاں بعض لوگ بٹھرتے ہیں اور بعض ملا کر پڑھنے کو پسند کرتے ہیں۔

وقف التبی صلی اللہ علیہ وسلم: یہ ان مقامات پر رکھا جاتا ہے جہاں کسی روایت کی رو سے یہ ثابت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تلاوت کرتے ہوئے اس جگہ وقف فرمایا تھا۔

قرآن کریم کی طباعت جب تک پریس ایجاد نہیں ہوا تھا قرآن کریم کے تمام نسخے قلم سے لکھے جاتے تھے، اور ہر دور میں ایسے کاتبوں کی ایک بڑی جماعت موجود رہی ہے جس کا کتابت قرآن کے سوا کوئی مشغلہ نہیں تھا، قرآن کریم کے حروف کو بہتر سے بہتر انداز میں لکھنے کے لئے مسلمانوں نے جو محنتیں کیں اور جس طرح اس عظیم کتاب کے ساتھ اپنے والہانہ شغف کا اظہار کیا، اس کی ایک بڑی مفصل اور دلچسپ تاریخ ہے جس کے لئے مستقبل تصنیف چاہئے، یہاں اس کی تفصیل کا موقع نہیں۔

پھر جب پریس ایجاد ہوا تو سب سے پہلے ہیبرگ کے مقام پر ۱۳۷۷ھ میں قرآن کریم طبع ہوا جس کا ایک نسخہ اب تک دارالکتب المصریہ میں موجود ہے، اس کے بعد متعدد مستشرقین نے قرآن کریم کے نسخے طبع کرائے، لیکن اسلامی دنیا میں ان کو قبولیت حاصل نہ ہو سکی، اس کے بعد مسلمانوں میں سب سے پہلے مولائے عثمان نے روس کے شہر سینٹ پیٹرس برگ میں ۱۸۷۷ء میں قرآن کریم کا ایک نسخہ طبع کرایا، اسی طرح قازان میں بھی ایک نسخہ چھاپا گیا، ۱۸۷۸ء میں ایران کے شہر تبریز میں قرآن کریم کو پھر طبع کیا گیا، پھر اس کے مطبوعہ نسخے دنیا بھر میں عام ہو گئے۔ تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو تاریخ القرآن لکھنؤ ص ۸۶، علوم القرآن، ڈاکٹر محمد علی صالح لود و ترجمان غلام احمد زبیری ط ۱۳۸۱

علم تفسیر

اب کچھ ضروری معلومات علم تفسیر کے سلسلے میں پیش خدمت ہیں، عربی زبان میں "تفسیر" کے لفظی معنی ہیں "بکھولنا" اور اصطلاح میں علم تفسیر اس علم کو کہتے ہیں جس میں قرآن کریم کے معانی بیان کئے جاتے ہیں، اور اس کے احکام اور حکمتوں کو کھول کر واضح کیا جائے (البرہان) قرآن کریم میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب کرتے ہوئے ارشاد ہے:-

وَكَشَرْنَا لَكَ الْكِتَابَ الَّذِي كُنَّا يُبَيِّنُ لِّلنَّاسِ مَا نَزَّلَ إِلَيْهِمْ (۲۴:۱۶)

"اور ہم نے قرآن آپ پر اتارا تاکہ آپ لوگوں کے سامنے وہ باتیں دھانت سے بیان فرمادیں جو ان کی طرف اتاری گئیں ہیں"۔

پھر قرآن کریم کا ارشاد ہے:-

فَعَلَّمَ مَنَّ اللَّهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ إِذْ بَعَثَ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْ أَنفُسِهِمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ أُنزِلَتْ وَبَيَّنَّا لَهُمْ مَا كَانُوا يَكْتُمُونَ (۱۷۴:۳)

"بلاشبہ اللہ نے مسلمانوں پر بڑا احسان فرمایا جبکہ ان کے درمیان انہی میں سے ایک رسول بھیجا، جو ان کے سامنے اللہ کی آیات کی تلاوت کرے، اور انہیں پاک صاف کرے، اور

انہیں اللہ کی کتاب اور دلائل کی باتوں کی تعلیم دے"۔

پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرامؓ کو صرف قرآن کریم کے الفاظ ہی نہیں سکھاتے تھے، بلکہ اس کی پوری تفسیر بیان فرمایا کرتے تھے، یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرامؓ کو ایک ایک سورت پڑھنے میں جوہن اوقات کئی کئی سال لگ جاتے تھے، جس کی تفصیل انشاء اللہ آگے آئے گی۔

جب تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں تشریف فرما تھے اُس وقت تک کسی آیت کی لغیر معلوم کرنا کچھ مشکل نہیں تھا، صحابہ کرامؓ کو جہاں کوئی دشواری پیش آتی وہ آپ سے رجوع کرتے اور انہیں سلی بخشن جواب مل جاتا، لیکن آپ کے بعد اس بات کی ضرورت تھی کہ تفسیر قرآن کو ایک مستقل علم کی صورت میں محفوظ کیا جاتا، تاکہ امت کے لئے قرآن کریم کے الفاظ کے ساتھ ساتھ اس کے صحیح معنی بھی محفوظ ہو جائیں، اور پھر دیگر لوگوں کے لئے اس کی معنوی تحریک کی گنجائش باقی نہ رہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ کے فضل اور اس کی توفیق سے اس امت نے یہ کارنامہ اس حسن و خوبی سے انجام دیا کہ آج ہم یہ بات بلاخوف تردید کہہ سکتے ہیں کہ اللہ کی اس آخری کتاب کے صرف الفاظ ہی محفوظ نہیں رہے بلکہ اس کی وہ صحیح تفسیر و تشریح بھی محفوظ ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے جانشینان و ملاحہ کے ذریعہ ہم تک پہنچی ہے۔

تفسیر قرآن کے مآخذ علم تفسیر اس امت نے کس کس طرح محفوظ کیا؟ اس راہ میں انہوں نے کسی کسی شقیں اٹھائیں؟ اور یہ چند جدید کئے مراحل سے گزری؟ اس کی ایک طویل اور دلچسپ تاریخ ہے جس کا یہاں موقع نہیں، لیکن یہاں مختصراً یہ بتانا ہے کہ تفسیر قرآن کے مآخذ کیا ہیں؟ اور علم تفسیر پر جو بے شمار کتابیں ہزار ہاں میں ملتی ہیں انہوں نے قرآن کریم کی تشریح میں کن سرچشموں سے مستفاد کیا ہے، یہ سچے سچے ہیں۔

۱۔ قرآن کریم

علم تفسیر کا پہلا مآخذ خود قرآن کریم ہے، چنانچہ ایسا بہ کثرت ہوتا ہے کہ کسی آیت میں کوئی بات مجس اور تشریح طلب ہوتی ہے تو خود قرآن کریم ہی کی کوئی دوسری آیت اس کے مفہوم کو واضح کر دیتی ہے، مثلاً سورہ فاتحہ کی دعا میں یہ جملہ موجود ہے کہ "بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ" یعنی ہمیں ان لوگوں کے راستہ کی ہدایت کیجئے جن پر آپ کا انعام ہوا، اب یہاں یہ بات واضح نہیں ہے کہ وہ لوگ کون ہیں جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام فرمایا، لیکن ایک دوسری آیت میں ان کو واضح طور سے متعین کر دیا گیا ہے، چنانچہ ارشادِ خداوندی: "فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِیْنَ اٰتٰیْنَا الْکِتٰبَ عَلَیْهِمْ ذِکْرٌ مِّنْ لَّدُنَّیْ ۚ وَآٰیٰتٍ لِّتَذَكَّرَ اٰیٰتِیْ" (۱۶: ۴)

یہ وہ لوگ ہیں جن پر اللہ نے انعام فرمایا، یعنی انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالح لوگ۔ چنانچہ مفسرین کرام جب کسی آیت کی تفسیر کرتے ہیں تو سب سے پہلے یہ دیکھتے ہیں کہ اس آیت کی تفسیر خود قرآن کریم ہی میں کسی اور جگہ موجود ہے یا نہیں؟ اگر موجود ہوتی ہے تو سب سے پہلے اسی کو اختیار فرماتے ہیں۔

۲۔ حدیث

"حدیث" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال کو کہتے ہیں، اور جیسا کہ پیچھے بیان کیا جا چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کے ساتھ آپ کو مبعوث ہی اس لئے فرمایا تھا کہ آپ لوگوں کے سامنے قرآن کریم کی صحیح تشریح کھول کر بیان فرمادیں، چنانچہ آپ نے اپنے قول اور عمل دونوں سے یہ فریضہ بحسن و خوبی انجام دیا، اور درحقیقت آپ کی پوری مبارک زندگی قرآن ہی کی عملی تفسیر ہو، اس لئے مفسرین کرام نے قرآن کریم کو سمجھنے کے لئے دوسرے بزرگ مسیحی زیادہ زور حدیث پر دیا ہے، اور احادیث کی روشنی میں کتاب اللہ کے معنی متعین کئے ہیں، البتہ چونکہ حدیث میں صحیح، ضعیف اور موضوع ہر طرح کی روایات موجود ہیں، اس لئے محقق مفسرین اس وقت تک کسی روایت کو قابل اعتماد نہیں سمجھتے جب تک وہ تنقید روایات کے اصولوں پر پوری دانتی ہو، لہذا جو روایت جہاں نظر آجائے اُسے دیکھ کر قرآن کریم

لے اس پہلے علم القرآن پر محقق مفضل کتاب ملاحظہ فرمائیے۔

کی کوئی تفسیر متعین کر لینا درست نہیں، کیونکہ وہ روایت ضعیف اور دوسری مضبوط روایتوں کے خلاف بھی ہو سکتی ہے، اور حقیقت یہ معاملہ بڑا نازک ہے، اور اس میں قدم رکھنا اپنی لوگوں کا کام ہے جنہوں نے اپنی عمریں ان علم کو حاصل کرنے میں خرچ کی ہیں۔

۳۔ صحابہ کے اقوال

صحابہ کرام نے قرآن کریم کی تعلیم براہ راست آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے حاصل کی تھی، اس کے علاوہ نزول وحی کے وقت وہ بہ نفس نفیس موجود تھے، اور انہوں نے نزول قرآن کے پورے ماحول اور پس منظر کا بذات خود مشاہدہ کیا تھا، اس لئے فطری طور پر قرآن کریم کی تفسیر میں ان حضرات کے اقوال جتنے مستند اور قابل اعتماد ہو سکتے ہیں، بعد کے لوگوں کو وہ مقام حاصل نہیں ہو سکتا، لہذا جن آیتوں کی تفسیر ان یا حدیث سے معلوم نہیں ہوتی ان میں سب سے زیادہ اہمیت صحابہ کرام کے اقوال کو حاصل ہے، چنانچہ اگر کسی آیت کی تفسیر صحابہ کا اتفاق ہو تو مفسرین کرام اسی کو اختیار کرتے ہیں اور اس کے خلاف کوئی اور تفسیر بیان کرنا جائز نہیں، ہاں، اگر کسی آیت کی تفسیر میں صحابہ کرام کے اقوال مختلف ہوں تو بعد کے مفسرین دوسرے دلائل کی روشنی میں یہ دیکھتے ہیں کہ کونسی تفسیر کو ترجیح دی جائے؟ اس معاملہ میں اہم اصول اور قواعد اصول فقہ، اصول حدیث اور اصول تفسیر میں مدد ملتی ہیں، ان کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں۔

۴۔ تابعین کے اقوال

صحابہ کے بعد تابعین کا ممبر آتا ہے، یہ وہ حضرات ہیں جنہوں نے قرآن کریم کی تفسیر صحابہ کرام کے بعض ہی، اس لئے ان کے اقوال بھی علم تفسیر میں بڑی اہمیت کے حامل ہیں، اگرچہ اس معاملہ میں علماء کا اختلاف ہے کہ تابعین کے اقوال تفسیر میں حجت ہیں یا نہیں؟ (الاتقان ۲/ ۱۷۹) لیکن ان کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

۵۔ لغت عرب

قرآن کریم چونکہ عربی زبان میں نازل ہوا ہے، اس لئے تفسیر قرآن کے لئے اس زبان پر مکمل عبور حاصل کرنا ضروری ہے، قرآن کریم کی بہت سی آیات ایسی ہیں کہ ان کے پس منظر میں چونکہ کوئی لسان نزول یا کوئی اور لہجہ یا کلامی مسئلہ نہیں ہوتا، اس لئے ان کی تفسیر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ و تابعین کے اقوال منقول نہیں ہوتے، چنانچہ ان کی تفسیر کا ذریعہ صرف لغت عرب ہوتی ہے اور لغت ہی کی بنیاد پر اس کی تشریح کی جاتی ہے، اس کے علاوہ اگر کسی آیت کی تفسیر میں کوئی اختلاف ہو تو مختلف آراء میں عیاں کے لئے بھی علم لغت سے کام لیا جاتا ہے۔

۶۔ تدبر اور استنباط

تفسیر کا آخری مآخذ "تدبر اور استنباط" ہے، قرآن کریم کے نکات و اسرار ایک ایسا احسب

نہایت گہری جس کی کوئی حد نہایت نہیں، چنانچہ جس شخص کو اللہ تعالیٰ نے اسلامی علوم میں بصیرت عطا فرمائی ہو وہ جتنا جتنا اس میں غور و فکر کرتا ہے آتے ہی آتے نئے اسرار و نکات سامنے آتے ہیں، چنانچہ مفسرین کرام اپنے اپنے تذکرے نتائج بھی اپنی تفسیروں میں بیان فرماتے ہیں، لیکن یہ اسرار و نکات اسی وقت قابل قبول ہوتے ہیں جبکہ وہ مذکورہ بالا پانچ کاغذ سے متصادم نہ ہوں، لہذا اگر کوئی شخص قرآن کی تفسیر میں کوئی ایسا نکتہ یا اجتہاد بیان کرے جو قرآن و سنت، اجماع، اجتہاد و تابعین کے اقوال کے خلاف ہو یا کسی دوسرے شرعی اصول سے ٹکراتا ہو تو اس کا کوئی اعتبار نہیں، بعض صوفیاء نے تفسیر میں اس قسم کے اسرار و نکات بیان کرنے شروع کئے تھے، لیکن ائمہ کے محقق علماء نے انھیں قابل اعتبار نہیں سمجھا، کیونکہ قرآن و سنت اور شریعت کے بنیادی اصولوں کے خلاف کسی کی شخصی رائے ظاہر ہے کہ کوئی حیثیت نہیں رکھتی (راتقان ۱۸۷/۲)

اسرائیلیات کا حکم "اسرائیلیات" ان روایتوں کو کہتے ہیں جو اہل کتاب یعنی یہودیوں و عیسائیوں سے ہم تک پہنچی ہیں، پہلے زمانے کے مفسرین کی عادت تھی کہ وہ کسی آیت کے ذیل میں ہر قسم کے وہ روایات نکھ دیتے تھے جو انھیں سند کے ساتھ پہنچی تھیں، ان میں بہت سی روایتیں اسرائیلیات بھی ہوتی تھیں، اس لئے ان کی حقیقت سے واقف ہونا بھی ضروری ہے، ان کی حقیقت یہ ہے کہ بعض صحابہ کرام اور تابعین پہلے اہل کتاب کے مذہب تک تعلق رکھتے تھے، بعد میں جب وہ مشرف بہ اسلام ہوئے اور قرآن کریم کی تعلیم حاصل کی تو انھیں قرآن کریم میں پچھلی آیتوں کے بہت سے وہ واقعات نظر آئے جو انھوں نے اپنے سابقہ مذہب کی کتابوں میں بھی پڑھے تھے، چنانچہ وہ قرآنی واقعات کے سلسلے میں وہ تفصیلات مسلمانوں کے سامنے بیان کرتے تھے جو انھوں نے اپنے پڑلے مذہب کی کتابوں میں دیکھی تھیں، یہی تفصیلات اسرائیلیات کے نام سے تفسیر کی کتابوں میں داخل ہو گئی ہیں حافظ ابن کثیر نے جو بڑے محقق مفسرین میں سے ہیں، انھوں نے لکھا ہے کہ اسرائیلیات کی تین قسمیں ہیں:

(۱) وہ روایات جن کی سچائی قرآن و سنت کے دوسرے دلائل سے ثابت ہے، مثلاً فرعون کا غرق ہونا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا کوہ طور پر تشریف لے جانا وغیرہ۔

(۲) وہ روایات جن کا بھوٹ ہونا قرآن و سنت کے دوسرے دلائل سے ثابت ہے، مثلاً اسرائیلی روایات میں یہ مذکور ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام اپنی آخری عمر میں (معاذ اللہ) مرتد ہو گئے تھے، اس کی تردید قرآن کریم سے ثابت ہے، ارشاد ہے کہ وَمَا كَفَرْنَا بِكَ وَلَا تَكُنْ مِنَ الْمُنْكَرِينَ (نمل: ۲۴) اور سلیمان کا کافر نہیں ہونے، بلکہ شیطاں نے سحر کیا، اسی طرح مثلاً اسرائیلی روایات میں مذکور ہے کہ (معاذ اللہ) حضرت داؤد علیہ السلام نے اپنے سپہ سالار اور یاکی ہوی سے زنا کیا، یا اُسے مختلف تدبیروں سے مردار اس کی بیوی سے نکاح کر لیا، یہ بھی کھلا جھوٹ ہے اور اس قسم کی روایتوں کو غلط سمجھنا لازم ہے۔

(۳) وہ روایات جن کے بارے میں قرآن و سنت اور دوسرے شرعی دلائل خاموش ہیں، جیسے کہ قورات کے احکام وغیرہ، ایسی روایات کے بارے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ وسلم کی تعلیم یہ ہے کہ ان کے بارے میں سکوت اختیار کیا جائے، نہ ان کی تصدیق کی جائے اور نہ تکذیب، البتہ اس مسئلہ میں علماء کا اختلاف ہے کہ آیا ایسی روایات کو نقل کرنا جائز بھی ہے یا نہیں؟ حافظ ابن کثیر نے قول فیصل یہ بیان کیا ہے کہ انھیں نقل کرنا جائز تو ہے، لیکن اس سے کوئی فائدہ نہیں، کیونکہ شرعی اعتبار سے وہ حجت نہیں (مقدمہ تفسیر ابن کثیر)

تفسیر قرآن کے بارے میں ایک شدید غلط فہمی

مذکورہ بالا تفصیل سے یہ بات واضح ہو گئی ہوگی کہ قرآن کریم کی تفسیر ایک انتہائی نازک اور مشکل کام ہے، جس کے لئے صرف عربی زبان جان لینا کافی نہیں، بلکہ تمام متعلقہ علوم میں مہارت ضروری ہے، چنانچہ علماء نے لکھا ہے کہ مفسر قرآن کے لئے ضروری ہے کہ وہ عربی زبان کے خود صرف اور بلاغت اور کے علاوہ علم حدیث، اصول فقہ و تفسیر اور عقائد و کلام کا وسیع و عمیق علم رکھتا ہو، کیونکہ جب تک ان علوم سے مناسبت نہ ہو انسان قرآن کریم کی تفسیر میں کسی صحیح نتیجے تک نہیں پہنچ سکتا۔

افسوس ہے کہ کچھ عرصہ سے مسلمانوں میں یہ خطرناک دبا چل پڑی ہے کہ بہت سے لوگوں نے صرف بولی پڑھ لینے کو تفسیر قرآن کے لئے کافی سمجھ رکھا ہے، چنانچہ جو شخص بھی معمولی عربی زبان پڑھ لیتا ہے، وہ قرآن کریم کی تفسیر میں رائے زنی شروع کر دیتا ہے، بلکہ بعض اوقات ایسا بھی دیکھا گیا ہے کہ عربی زبان کی نہایت معمولی مشہور کتبہ دالے لوگ جنھیں عربی پر بھی مکمل عبور نہیں ہوتا، نہ صرف میں ہوتے طریقے پر قرآن کی تفسیر شروع کر دیتے ہیں، بلکہ پڑانے مفسرین کی غلطیاں نکالنے کے دپے ہو جاتے ہیں، یہاں تک کہ بعض ستم ظریف تو صرف ترجمے کا مطالعہ کر کے اپنے آپ کو قرآن کا عالم سمجھنے لگتے ہیں، اور بڑے بڑے مفسرین پر تنقید کرنے سے نہیں بچتے۔

خوب اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ یہ انتہائی خطرناک طرز عمل ہے جو دین کے معاملہ میں نہایت ہلک گمراہی کی طرف لیجاتا ہے، دنیوی علوم و فنون کے بارے میں ہر شخص اس بات کو سمجھ سکتا ہے کہ اگر کوئی شخص محض انگریزی زبان سیکھ کر میڈیکل سائنس کی کتابوں کا مطالعہ کرے تو دنیا کا کوئی خاص مفصل اسے ڈاکٹر تسلیم نہیں کر سکتا، اور نہ اپنی جان اس کے حوالے کر سکتا ہے، جب تک کہ اس نے کسی میڈیکل کالج میں باقاعدہ تعلیم و تربیت حاصل نہ کی ہو، اس لئے کہ ڈاکٹر بننے کے لئے صرف انگریزی سمجھ لینا کافی نہیں، بلکہ باقاعدہ ڈاکٹری کی تعلیم و تربیت حاصل کرنا ضروری ہے، اسی طرح کوئی انگریزی دان انجینئرنگ کی کتابوں کا مطالعہ کر کے انجینئر بننا چاہے تو دنیا کا کوئی بھی باخبر انسان اسے انجینئر تسلیم نہیں کر سکتا، اس لئے کہ یہ کام صرف انگریزی زبان سیکھنے سے نہیں آ سکتا، بلکہ اس کے لئے ماہر اساتذہ کے زیر تربیت رہ کر

ان سے باقاعدہ اس فن کو سیکھنا ضروری ہے، جب ڈاکٹر اور انجینئر بننے کے لئے یہ کڑی شرائط ضروری ہیں تو آخر قرآن و حدیث کے معاملہ میں صرف عربی زبان سیکھ لینا کیسے کافی ہو سکتا ہے، زندگی کے ہر شعبہ میں ہر شخص اس اصول کو جانتا اور اس پر عمل کرتا ہے کہ ہر علم و فن کے سیکھنے کا ایک خاص طریقہ اور اس کی مخصوص شرائط ہوتی ہیں، جنہیں پورا کئے بغیر اس علم و فن میں اس کی رائے معتبر نہیں سمجھی جاتی، تو آخر قرآن و سنت اتنے لاوارث کیسے ہو سکتے ہیں کہ ان کی تشریح و تفسیر کے لئے کسی علم و فن کے حاصل کرنے کی ضرورت نہ ہو، اور اس کے معاملہ میں جو شخص چاہے رائے زنی شروع کرے؟

بعض لوگ کہتے ہیں کہ قرآن کریم نے خود ارشاد فرمایا ہے کہ :-

وَقَدْ يَسْرُنَا اَنْفَعُ لَنَا اَللّٰهُ كَرِيْمٌ (۱۱۵۴)

اور بلاشبہ ہم نے قرآن کریم کو نصیحت حاصل کرنے کے لئے

آسان کر دیا ہے۔

اور جب قرآن کریم ایک آسان کتاب ہو تو اس کی تشریح کے لئے کسی لمبے چوڑے علم و فن کی ضرورت نہیں، لیکن یہ استدلال ایک شدید مغالطہ ہے جو خود کم فہمی اور سطحیت پر مبنی ہے، واقعہ یہ ہے کہ قرآن کریم کی آیات دو قسم کی ہیں، ایک تو وہ آیتیں ہیں جن میں عام نصیحت کی باتیں، سبق آموز واقعات اور عبرت و موعظت کے مضامین بیان کئے گئے ہیں، مثلاً دنیا کی ناپائنداری، جنت و دوزخ کے حالات، خوف خدا اور فکر آخرت پیدا کرنے والی باتیں، اور زندگی کے دوسرے سیرے سائے حقائق، اس قسم کی آیتیں بلاشبہ آسان ہیں، اور جو شخص بھی عربی زبان سے واقف ہو وہ انہیں سمجھ کر نصیحت حاصل کر سکتا ہے، مذکور بالا آیت میں اسی قسم کی تعلیمات کے بارے میں یہ کہا گیا ہے کہ ان کو ہم نے آسان کر دیا ہے، چنانچہ خود اس آیت میں لفظ لِلَّذِي کر نصیحت کے واسطے اس پر دلالت کر رہا ہے۔

اس کے برخلاف دوسری قسم کی آیتیں وہ ہیں جو احکام و قوانین، عقائد اور علمی مضامین پر مشتمل ہیں، اس قسم کی آیتوں کا کماحقہ سمجھنا اور ان سے احکام و مسائل مستنبط کرنا ہر شخص کا کام نہیں، بیشک اسلامی علوم میں بصیرت اور بینش حاصل نہ ہو، یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرامؓ کی مادری زبان اگرچہ عربی تھی، اور عربی سمجھنے کے لئے انہیں کہیں تعلیم حاصل کرنے کی ضرورت نہیں تھی، لیکن وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن کریم کی تعلیم حاصل کرنے میں طویل مدتیں صرف کرتے تھے، علامہ سیوطیؒ نے امام ابو عبد الرحمن سہلیؒ سے نقل کیا ہے کہ جن حضرات صحابہؓ نے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن کریم کی باقاعدہ تعلیم حاصل کی ہے مثلاً حضرت عثمان بن عفانؓ اور عبد اللہ بن مسعودؓ وغیرہ انہوں نے یہیں بتایا کہ جب وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن کریم کی دس آیتیں سیکھتے تو اس وقت تک آگے نہیں بڑھتے تھے جب تک ان آیتوں کے متعلق تمام علمی اور علمی باتوں کا احاطہ نہ کر لیں، وہ فرماتے تھے کہ :-

فَعَلَّمَنَا الْقُرْآنَ وَالْعِلْمَ وَالْعَمَلَ جَمِيعًا

”ہم نے قرآن اور علم و عمل ساتھ ساتھ سکھا کر اتمام (۱۱۶۲)“

ہمارے مولا امام مالکؒ میں روایت ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے صرف سورہ بقرہ یاد کرنے میں پورے ۱۸ سال صرف کئے، اور مسند احمدؒ میں حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ ہم میں سے جو شخص سورہ بقرہ اور سورہ آل عمران پڑھ لیتا ہماری نگاہوں میں اس کا مرتبہ بہت بلند ہو جاتا تھا (اتقان ۱۶۷/۲، نوے ۷۷) خود کرنے کی بات یہ ہے کہ یہ حضرات صحابہؓ جن کی مادری زبان عربی تھی، جو عربی کے شعرا و ادب میں مہارت تامہ رکھتے تھے، اور جن کو لمبے لمبے قصیدے معمولی توجہ سے ازبر ہو جایا کرتے تھے، انہیں قرآن کریم کو یاد کرنے اور اس کے معانی سمجھنے کے لئے اتنی طویل مدت کی کیا ضرورت تھی کہ آٹھ آٹھ سال صرف ایک سورت پڑھنے میں خرچ ہو جائیں؟ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ قرآن کریم اور اس کے علوم کو سیکھنے کے لئے صرف عربی زبان کی مہارت کافی نہیں تھی، بلکہ اس کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت اور اعلیٰ سے فائدہ اٹھانا ضروری تھا، اب ظاہر ہے کہ جب صحابہ کرامؓ کو عربی زبان کی مہارت اور ذہول دمی کا براہ راست مشاہدہ کرنے کے باوجود عالم قرآن بننے کے لئے باقاعدہ حضورؐ سے تعلیم حاصل کرنے کی ضرورت تھی تو تو زہد قرآن کے سینکڑوں سال بعد عربی کی معمولی شد بد پیدا کر کے یا صرف ترجمہ دیکھ کر مغیرہ قرآن بننے کا دعویٰ کتنی بڑی جسارت اور علم و دین کے ساتھ کیسا افسوسناک مذاق ہے؟ ایسے لوگوں کو جو اس جسارت کا ارتکاب کرتے ہیں سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد اچھی طرح یاد رکھنا چاہئے کہ :-

مَنْ قَالَ فِي الْقُرْآنِ بَغْيٌ فَلْيُعْلَمْ فَلْيَتَّبِعُوا مَقْعِدَهُ فِي التَّاسِرِ

جو شخص قرآن کے معاملہ میں علم کے بغیر کوئی بات کہے تو وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں بنائے

(ابوداؤد، از اتقان ۱۶۹/۲)

اور :- مَنْ تَكَلَّمَ فِي الْقُرْآنِ بِرَأْيِهِ فَاصْأَبَ فَقَدْ أَخْطَأَ

جو شخص قرآن کے معاملہ میں (محض) اپنی رائے سے گفتگو کرے اور اس میں کوئی صحیح

بات بھی کہہ دے تب بھی اس نے غلطی کی (ابوداؤد نسائی، از اتقان ۱۶۹/۲)

مشہور تفسیریں

عہد رسالت کے بعد سے قرآن کریم کی بے شمار تفسیریں بھی گئی ہیں، بلکہ دنیا کی کسی کتاب کی بھی کی خدمت نہیں کی گئی، حتیٰ قرآن کریم کی گئی ہے، ان سب تفاسیر کا تعارف کسی مفصل کتاب میں بھی ممکن نہیں، چر جائیکہ اس مختصر مقدمہ میں اس کا ارادہ کیا جائے، لیکن یہاں ہم ان اہم تفسیروں کا

مختصر تعارف کرنا چاہتے ہیں جو معارف القرآن کا خاص مآخذ رہی ہیں، اور جن کا حوالہ معارف القرآن میں بار بار آیا ہو، اگرچہ معارف القرآن کی تصنیف کے دوران بہت سی تفاسیر اور سینکڑوں کتابیں پیش نظر رہی ہیں، لیکن یہاں صرف ان تفاسیر کا تذکرہ مقصود ہے جن کے حوالے بکثرت آئیں گے۔

تفسیر ابن جریر اس تفسیر کا اصل نام جامع البیان ہے، اور یہ علامہ ابو جعفر محمد بن جریر طبری (متوفی ۲۵۵ھ) کی تالیف ہے، علامہ طبری اپنے اپنے درجے کے مفسر، محدث اور مؤرخ ہیں منقول ہے کہ وہ چالیس سال تک مسلسل لکھتے میں مشغول رہے، اور ہر روز چالیس ورق لکھنے کا معمول تھا (الامداد والنبایہ، ص ۱۴۵ ج ۱) بعض حضرات نے ان پر شیعہ ہونے کا الزام عائد کیا ہے، لیکن محققین نے اس الزام کی تردید کی ہے، اور حقیقت بھی یہی ہے کہ وہ اہل سنت کے حلیل القدر عالم ہیں، بلکہ ان کا شمار ائمہ مجتہدین میں ہوتا ہے۔

ان کی تفسیر تین جلدوں میں ہے، اور بعد کی تفاسیر کے لئے بنیادی مآخذ کی حیثیت رکھتی ہے، وہ آیات کی تفسیر میں علماء کے مختلف اقوال نقل کرتے ہیں، اور پھر جو قول ان کے نزدیک راجح ہوتا ہے اسے دلائل کے ذریعہ ثابت کرتے ہیں، البتہ ان کی تفسیر میں صحیح و دقیق ہر طرح کی روایات جمع ہو گئی ہیں، اس لئے ان کی بیان کی ہوئی ہر روایت پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا، دراصل اس تفسیر سے ان کا مقصد یہ تھا کہ تفسیر قرآن کے بارے میں جس قدر روایات انھیں دستیاب ہو سکیں ان سب کو جمع کر دیا جائے، تاکہ اس صحیح شدہ مواد سے کام لیا جاسکے، البتہ انھوں نے ہر روایت کے ساتھ اس کی سند بھی ذکر کی ہے، تاکہ جو شخص چاہے راویوں کی تحقیق کر کے روایت کے صحیح یا غلط ہونے کا فیصلہ کر سکے۔

تفسیر ابن کثیر یہ حافظ عطاء الدین ابو الفداء اسماعیل بن کثیر دمشقی شافعی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۷۷۴ھ) کی تصنیف ہے، جو آٹھویں صدی کے ممتاز اور محقق علماء میں سے ہیں، ان کی تفسیر چار جلدوں میں شائع ہو چکی ہے، اس میں زیادہ زور تفسیری روایات پر دیا گیا ہے، اور خاص بات یہ کہ مصنف روایتوں پر محدثانہ تنقید بھی کرتے ہیں، اور اس لحاظ سے یہ کتاب تمام کتب تفسیر میں ایک ممتاز مقام رکھتی ہے۔

تفسیر سیوطی اس کا پورا نام "الجامع لاحکام القرآن" ہے، اندلس کے مشہور اور محقق عالم علامہ ابو عبد اللہ محمد بن احمد بن ابی بکر بن فرح القرطبی (متوفی ۷۷۶ھ) کی تصنیف ہے جو فقہ میں امام مالک کے مسلک کے پیرو تھے، اور عبادت و زہد کے اعتبار سے شہرہ آفاق تھے، اصل میں اس کتاب کا بنیادی موضوع تو قرآن کریم سے فقہی احکام و مسائل کا استنباط تھا، لیکن اس ضمن میں انھوں نے آیتوں کی تشریح، مشکل الفاظ کی تحقیق، اعراب، بلاغت اور متعلقہ روایات کو بھی تفسیر میں خوب جمع کیا ہے، یہ کتاب بارہ جلدوں میں ہے اور بار بار شائع ہو چکی ہے۔

تفسیر کبیر یہ امام فخر الدین رازی (متوفی ۸۰۵ھ) کی تصنیف ہے، اور اس کا اصلی نام "مفاتیح الغیب" ہے، لیکن تفسیر کبیر کے نام سے مشہور ہے، امام رازی متکلمین اسلام کے امام ہیں، اس لئے ان کی تفسیر میں عقل اور کلامی مباحث اور باطل فرقوں کی تردید پر بہت زور دیا گیا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ حل قرآن کے لحاظ سے بھی یہ تفسیر اپنی نظیر آپ ہے، اور اس میں جس دشمنی انداز میں قرآن کریم کے معانی کی توضیح اور آیات قرآنی کے باہمی ربط کی تشریح کی گئی ہے، وہ بڑا قابل قدر ہے، اغلب یہ کہ امام رازی نے سورۃ فتح تک کی تفسیر خود لکھی ہے، اس کے بعد وہ اسے پورا کر کے چنانچہ سورۃ فتح سے آخر تک کا حصہ قاضی شہاب الدین بن خلیل الحولی الدمشقی (متوفی ۸۱۵ھ) یکشنبہ نجم الدین احمد بن محمد القسطلی (متوفی ۸۴۷ھ) نے مکمل فرمایا (كشف الظنون ۲/۲۷۷)۔

امام رازی نے اپنے زمانے کی ضرورت کے مطابق چونکہ کلامی بحث اور باطل فرقوں کی تردید پر خاص زور دیا ہے، اور اس ضمن میں ان کی بحثیں بہت سے مقامات پر انتہائی طویل ہو گئی ہیں، اس لئے بعض حضرات نے ان کی تفسیر پر تبصرہ کیا ہے کہ فیہ کل شیء الا الغیور (اس کتاب میں تفسیر کے سوا سب کچھ ہے) لیکن یہ تبصرہ تفسیر کبیر پر بڑا ظلم ہے، اور حقیقت وہی ہے جو اوپر بیان ہوئی، اگر حل قرآن کے لحاظ سے بھی اس تفسیر کا یہ بہت بلند ہے، البتہ چند ایک مقامات پر انھوں نے جو براہمت کی راہ سے ہٹ کر آیات قرآنی کی تفسیر کی ہے، لیکن ایسے مقامات آٹھ ضخیم جلدوں کی اس کتاب میں خال خال ہیں۔

تفسیر البحر المحیط یہ علامہ ابو حنیفہ غناطی اندلسی (متوفی ۸۵۰ھ) کی تصنیف ہے، جو اسلامی علوم کے علاوہ علم خود بلاغت میں خصوصی ہمارت رکھتے تھے، چنانچہ ان کی تفسیر میں خود بلاغت کا رنگ نمایاں ہے، وہ ہر آیت کے الفاظ کی تحقیق، ترکیبوں کے اختلافات اور بلاغت کے نکات بیان کرنے پر خاص زور دیتے ہیں۔

احکام القرآن للبخاری یہ امام ابو بکر جصاص رازی (متوفی ۸۴۰ھ) کی تصنیف ہے جو فقہ حنفی میں ایک ممتاز مقام کے حامل ہیں، ان کی اس کتاب کا موضوع قرآن کریم سے فقہی احکام مسائل کا استنباط ہے، اور انھوں نے مسلسل آیتوں کی تفسیر کے بجائے صرف ان آیتوں کی فقہی تفصیلات بیان فرمائی ہیں جو فقہی احکام پر مشتمل ہیں، اس موضوع پر اور بھی متعدد کتابیں لکھی گئی ہیں، لیکن اس کتاب کو ان سب میں ایک نمایاں اور ممتاز مقام حاصل ہے۔

تفسیر الدر المنثور یہ علامہ جلال الدین سیوطی (متوفی ۹۱۱ھ) کی تصنیف ہے، اور اس کا پورا نام "الدر المنثور فی التفسیر بالمأثور" ہے، اس میں علامہ سیوطی نے ان تمام روایات کو جمع کرنے کی کوشش کی ہے جو قرآن کریم کی تفسیر سے متعلق ان کو ملی ہیں، ان سے پہلے بہت سے محدثین مطلقاً ان جریجہ امام لغوی، ابن مردودہ، ابن حبان، ماجہ وغیرہ اپنے اپنے طور پر یہ کام کر چکے تھے

علامہ سیوطیؒ نے ان سب کی بیان کردہ روایات کو اس کتاب میں جمع کر دیا ہے، البتہ انہوں نے ردایا کی تصانیف پروری سند ذکر کرنے کے بجائے صرف اس مصنف کا نام ذکر کرنے پر اکتفا کیا ہے جس نے اس روایت کو اپنی سند سے بیان کیا ہے، تاکہ بوقت ضرورت اس کی مراجعت کر کے سند کی تحقیق کی جاسکے، چونکہ ان کا مقصد روایات کے ذخیرہ کو بجا کرنا تھا، اس لئے اس کتاب میں بھی صحیح و سقیم ہر طرح کی روایتیں جمع ہو گئی ہیں، اور سند کی تحقیق کے بغیر ان کی بیان کی ہوئی ہر روایت کو قابل اعتماد نہیں سمجھا جاسکتا، علامہ سیوطیؒ بعض مرتبہ ہر روایت کے ساتھ یہ بھی بتا دیتے ہیں کہ اس کی سند کس درجہ کی ہے، لیکن چونکہ تنقید حدیث کے معاملہ میں وہ خاصے متکبران مشہور ہیں، اس لئے اس پر بھی کما حقہ اعتماد کرنا مشکل ہے۔

تفسیر مظہری یہ علامہ قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتیؒ متوفی ۱۲۸۴ھ کی تصنیف اور انہوں نے اپنے شیخ طریقت مرزا مظہر جان جاناں دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے نام پر اس تفسیر کا نام تفسیر مظہری رکھا ہے، ان کی یہ تفسیر بہت سادہ اور واضح ہے، اور اختصار کے ساتھ آیات قرآنی کی تشریح معلوم کرنے کے لئے نہایت مفید انہوں نے الفاظ قرآنی کی تشریح کے ساتھ متعلقہ روایات کو بھی کافی تفصیل سے ذکر کیا ہے، اور دوسری تفسیروں کے مقابلے میں زیادہ چھان بھٹک کر روایات لینے کی کوشش کی ہے۔

روح المعانی اس کا پورا نام روح المعانی فی تفسیر القرآن العظیم و السبع المثانی ہے، اور یہ بغداد کے آخری دور کے مشہور عالم علامہ محمود آلوسی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۱۳۰۲ھ) کی تصنیف ہے، اور میں جلدوں پر مشتمل ہے، انہوں نے اپنی اس تفسیر کو بڑی حد تک جامع بنانے کی کوشش کی ہے، لغت، نحو، ادب اور بلاغت کے علاوہ فقہ، عقائد، کلام، فلسفہ اور ہیئت، تصوف اور متعلقہ روایات پر بھی مبسوط بحثیں کی ہیں اور کوشش یہ کی ہے کہ آیت سے متعلق کوئی علی گوشہ نشین نہ ہو، روایات حدیث کے معاملے میں بھی اس کے مصنف دوسرے مفسرین کے مقابلے میں محتاط رہے ہیں، اس لحاظ سے یہ بڑی جامع تفسیر ہے، اور اب تفسیر قرآن کے سلسلے میں کوئی بھی کام اس کی طرف سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔

نفسہ جہ نے والے درس قرآنی کے متعلق جو سے فوائس کی گئی جس کو چنا خدا رنگ بنا پر میری جہس ڈکوسا
پھر اٹھنے کے ایک دوسری جہس کی کردار ان دوس کے مسئلہ سے الگ ایک ہفتہ وادی دوس
بنام معارف القرآن چلی گیا جانتے جس میں بنائے قرآن کی تفسیر میں لفظ پر مرکب ماسلمان
کی موجود ضرورت کے لئے لفظ خاص خاص آیات کا انتخاب کر کے ان کی تفسیر اور متعلق احکام بیان
پر کر کے، اسقر نے اس کو اس مشرق کے ساتھ منظور کر لیا کہ دوس کا کئی معادہ مذکور لگا اور کئی
یا بند کی کئی جدول نکرون کا جو میرے نزدیک وہی قرآن کے مناسب ہے، میں پڑھنے منظور کر لی گئی
نام مذکور تھا کہ یہ دوس بنام معارف القرآن ۳۳ شوال ۱۳۴۴ھ میں چلائی مسطورہ سے
شرع ہوا اور تفسیر پر لگا ہوا سال یا بندی سے جاری کیا بیان ایک جہس ۳۴ شوال ۱۳۴۴ھ میں دیکھ پست
کی اپنی اپنی یا لیس کے تحت اس دوس کو تفسیر کر دیا گیا ہے دوس معارف القرآن میری بنائے اور میری
آواز میری پرست ہو گیا جس میں ان میرے باروں کی شکل تفسیر میں ایک منتخب آیات کی تفسیر جس حق نے
اسی اور مانی آیات کو اس میں شامل نہیں کیا تھا جو خاص علی معارف میں پرست جس اور دیکھ پانی
تفسیر کے فوہ حوام کے نہ میں نہیں کرنا اس کا مشکل تھا، یا وہ آیات جو کر مسرت کی ہیں۔

جس وقت یہ کام شروع کیا کہ اس کا کوئی دور دو یا نہ تھا کہ کسی وقت کمال
صورت میں ایک مشقی تفسیر کے انداز پر شائع ہوگی، مگر ہوا یہ کہ جب یہ درس بشر پر نام شروع
ہوا تو پاکستان کے سب ملاوٹوں سے اور ان سے لیا وہ طر مالک افریقہ یورپ و غیرہ میں اپنے والے
مسلمانوں کی طر سے یہ شہر خطوط اور دیکھ پاکستان کو اور نو و احقر وصول ہوتے ہیں جہاں معلوم
ہو کہ جہس سے دیندار اور نو تعلیم یافتہ مسلمان اس دوس سے بہت شغف دیکھتے ہیں، افریقہ
میں جو کہ یہ دوس آخر شب یا کچھ صبح صادق کے وقت پہنچتا تھا وہاں کے لوگوں نے اس کو
شیپ کر لیا وڈ کے لئے لکھنے ڈاکر کے بعد میں سب کو بار بار دینے کا اہتمام کیا اور جہس کے اس
کا تقاضا ہوا کہ اس دوس کو کمالی صورت میں شائع کیا جائے، عام مسلمانوں کے اس اشتیاق
نے اس کا کارہ کی ہمت بڑھادی اور امراض و مضغ کے بارہو گیا وہ سال یکدہ مسئلہ جہس پر پہنچا
جہاں لکھا مسئلہ ۴۴م اور مسئلہ ۴۵ میں جب دوس کا مسئلہ بند ہوا تو جہس سے معذرت کی طر سے یہ
تقاضا ہوا کہ جہس پر چکا ہے اس کو کمال صورت میں شائع کیا جائے اور دوس میں پر آیات متحرک

گئی ہیں ان کی بھی جدول کر دی جائے، بنام ہندیا لراہہ کر لیا کہ موجودہ پر نظر ثانی اور ورمیا سے
باقی اندوہ ثابت کی تکمیل کا کام شروع کیا جائے، چنانچہ ۱۶ صفر ۱۳۴۴ھ میں سورہ فاتحہ کی تفسیر
نظر ثانی مکمل ہوئی، اور سورہ بقرہ پر کام شروع کیا اس میں ان کا کئی آیات مشکل بہت ہیں جو
دیکھ پر لکھ کر تفسیر میں ان میں ان میں، یہ کام بہت محنت اور فرصت کا متقاضی تھا، جہس

مشاغل اور امراض نے فرصت دہی اور کفر بنایا یہ کام ڈیول میں چڑ گیا۔

پھر ایک ہفتہ ایک خدمت دہیوں مشاغلہ کے شہان میں اس کے اسطون بد میں کچھ مجوزے کی لکھیں
بنام جہس تفسیر کا سبب جہس نور اور بنی اور بنی رشتہ جہس جہس، کفر و معارف میں اس کے مجوزے
جہس سے معذوری کر دیا، آخری آنسو دوسے بھی قضا ہوئے، مگر میں کچھ کرنا نہ ہر لے گی، اس کے
ساتھ پاؤں میں لٹریں کا پڑتا دور شروع ہوا، اس کا جو علاج کیسے کا کر کر رہا تھا وہ میں کا گیا
یہ ہوا اور وہ پاؤں سے معذوری ہو گیا، قضا باقی جس سے اس طرح معذوری کی بیماری کے ساتھ
موت و حیات کی کشمکش میں لگا رہا جب مجھے میرے اور یکرام سے معذوری ہو گیا اور زندگی کی آہ
میں میں لکھ گئی قراب اس یا لیسوس پر آکر یہ تفسیر کی اور ان میں قدر پر کیے تھے ان پر نظر ثانی اور
تکمیل میں دوسرے اب یہ پاؤں کی جہس ضائع ہو جائیں تھے، حق تعالیٰ نے قلب میں بہت عطا فرمائی
اور شوال ۱۳۴۴ھ کے ترمیم پر طر طر میں آئے تعالیٰ نے اس کا کام شروع کر دیا، اور ۱۶ صفر
۱۳۴۴ھ کو سورہ بقرہ کی تکمیل پر کر کے بہت و طاعت کے لئے دیدی، اس کے بعد میں میں
بیماری و معذوری کی حالت میں یہ کام کر رہی تھی رشتہ سے چلا رہا تھا تعالیٰ نے اس کی برکت سے وصال
میں بعد وصال دوس کی ہی رنج فرادی تو جہس مسئلہ ۴۴ سے کا کسی قدر تیز ہوا مگر اسی کے ساتھ تک
میں بعد اختیارات نے سیاسی مکتبوں کا ایک طر فاف کھڑا کر دیا، میں اگر کچھ عصر و زمان سے سیاست
سے باکل یکسو ہو چکا تھا مگر اختیارات نے پاکستان میں خاص اسلامی حکومت کے بنائے
کیونکہ اور وصال اور وصال میں جہس کے خطرات قوی کر دیے، اور وصال پر ہمیں اسلام بار کھڑا لے
کے لئے جہس و جد و جد میں طر میں ہو گئے، اس مسئلے کی اہمیت نے میرا پرنا و کر دیا کہ کم از کم
اسلام اور وصال پر ایم میں فرق اور مشرق میں خطرات کا تاج سے قوم کو آگاہ کرنے کی حد تک
اس سیاسی میدان میں پیش کیا جائے، اس کے لئے میری حقاری عقل سے مجھے پڑے، اور وصال پر وصال
پاکستانی کے اہم مواقع میں جلوس میں شرکت میں بھی نہ پڑی، مسئلہ کی وضاحت اور تفسیر اور
پورے ہو گئے، مگر سیاست کے میدان میں مسافر اور حقائق سے باہر نہ زور دیا کام کر کے وہاں آگیا
کا تاج باکل خلافت اور یکس نظر، اس کے اثر سے پاکستان میں جو زوال کا تقاضا آگیا، وکلیو
الکھ میں حقین کی جہس ہند۔

اختیارات کے بعد آخر نے میرا سیاست سے مستعفی ہو کر بنایا یہ کام شروع کیا، اور بعد
علی کر کہ جب مسئلہ ۴۴ تک تیرا باروں کی معارف القرآن پر نظر ثانی اور ورمیا پر مکتوبات
کی تفسیر میں مکمل ہو گئی، اور سورہ آل عمران سے سورہ فتح تک وکلیو لکھی تفسیر میں کھسکی گئی
اب قرآن مجید حضرت کے قریب ہو گیا تو اشر تعالیٰ نے بہت عطا فرمایا، اور باقی ملا لکھ

حیرات و حیرت کا شعلہ ہے، یہاں آپ نے خیال نہ کر لی کہ ان بے جان اُسے شعور چیزوں کو ہدایت سے کیا کام!

کیونکہ قرآنی تعلیمات سے واضح ہے کہ کائنات کی تمام نظام اور ان کا ذرہ ذرہ اپنے اپنے
 جگہ کے موافق ثابت و اساس بھی رکھتا ہے اور عقل و شعور بھی، اور دوسری بات یہ کہ جو ہر کس طرح
 ہم کہہ سکیں ہر ذرہ اپنے، اسی درجے پر جمنا چاہیے، یہ جو ہر بہت کہہ سکتی تھی کہ اپنے تصور کا ہوا
 کہا جائے، اس کا ہم اپنے ہر کس کے ان کے ضمن شعور کا استعارہ آ کر ان کی اس کا مکلف نہیں بنایا گیا
 جمنا جو کہ میں حیات کے لئے ضروری ہے، ہر عقل و شعور بنائے نہیں، ان کو ذی حیات، ہر ذرہ کے عقل و شعور
 کہا جائے، اور جن میں حیات کے ساتھ عقل و شعور کے آثار بھی نمایاں کرتے ہیں ان کو ذی عقل
 کہا جائے، اور اسی اختلاف درجات اور عقل و شعور کی پیش کی درجے تمام کائنات میں اس کا نام
 شریعہ کا مکلف میں انسان و حیوان کو قرار دیا گیا ہے، کہ ان میں عقل و شعور بھی ہے، مگر اس کے پس
 اند کو دوسری الہ اور اقراس میں حیات و اساس با عقل و شعور کا مکلف نہیں، کیونکہ میں عقل اور شعور

وَلَا تَقْعُوبُونَ أَلْسِنَتَكُمْ ۚ
(سورة الاحزاب: ٥٣)

میں نے کہا کہ اگر کوئی سطور میں ہے تو اس کے لئے اس کی
ایک ایک بات کو دیکھ کر یہ سطور کو سطور میں لکھنا
میں نے دیکھا تھا، لیکن اس کے لئے اس کے لئے اس کے لئے
میں نے دیکھا تھا، لیکن اس کے لئے اس کے لئے اس کے لئے
میں نے دیکھا تھا، لیکن اس کے لئے اس کے لئے اس کے لئے
میں نے دیکھا تھا، لیکن اس کے لئے اس کے لئے اس کے لئے

ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کی حسد، اثناء اور اس کی آگنی بیانی کے اثرات انسانی کی معرفت ہی ہو سکتے ہیں اور یہی ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ کی معرفت ہی سبکے بڑا علم ہے، اور یہ علم چونکہ عقل و شعور کے نہیں بلکہ اس کے لئے آیت ہے، نہایت نواگ تمام کائنات کے اندر روح و حیات بھی ہے، اور ان کا احساس بھی عقل و شعور بھی، مگر بعض کائنات میں جو بڑا نازک اور ڈھکی ہے کہ عام دیکھنے والوں کو اس کا احساس نہیں ہوتا۔ اسی لئے جو تین میں ان کو بے جا بے عقل کہا جاتا ہے، اور اس بناء پر بھی کہ انھیں مشرب کا دیکھنے نہیں بنا آگئی، قرآن کا یہ فیصلہ اس وقت کا ہے جب دنیا میں یہ کہیں کوئی نفسی تضاد نہ

کوئی فلسفہ مذہبی تھا، اہم دین نے دے فلسفیوں نے بھی اپنے اپنے وقت میں اس کی تصدیق کی۔ قدیم فلسفہ میں بھی اس خیال کے کچھ ٹوٹ گزرتے ہیں، اور جدید فلسفہ اور ذہنی شخص نے تو پوری وضاحت کے ساتھ اس کو ثابت کیا ہے۔

[illegible]

تَسْبِيحُ اسْمِكَ الْأَعْلَى ○ الْإِنْفِ
تَحْلِيْلُ قَسْوَى ○ وَالْإِنْفِ قَدْ
قَدْ

”میں نے آپ اپنے پروردگار کے شان کی تعظیم کی ہے۔“
میں نے ساری مخلوقات کو بنایا، پھر ضعیف
ہوا اور وہ جس نے بغیر میرے علم کے پھر دوبارہ بنائی۔

یہی جس نے غلام غلامت کے لئے خاص خاص مزاج اور خاص خاص خدمتیں تجویز فرما کر ہر ایک کو اس کے مناسب پابت کر دی۔

اسی جانب غور کا نتیجہ یہ کہ کائنات عالم کے تمام انواع و اقسام کے اشیاء پر مبنی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کے لیے بھی ایک ہی کرم ہے۔

فلک در آرد آب و آتش بسند اند
 این دو تو مرده با حق زنده اند

زبان سے نکل کر آواز کے سمن کا اور آگ کی ناک کر سکتی ہے، خدا کا نیکو عزوجل بھی زیادہ قریب رہا، اس اور آگ کا فرق یہ تھا کہ آواز کے نکلنے سے ہر جگہ کی بات کہہ دیتا ہے، اور آواز آگ کے نہیں، وہ اپنے دوشے سے خوب فرما رہا ہے۔

مرزا باں دامشتری جز گوش نیست
واقف این راز جز بے پوش نیست

اسی طرح کانوں سے دیکھنے یا سونگھنے کے احکام نہیں لیا جاسکتا، تاکہ سے دیکھنے یا سونگھنے کے احکام نہیں لیا جاسکتا، سورۃ مزیم میں اسی معنی میں کوئی الفاظ میں بیان فرمایا ہے :

إِنْ يَكُنْ مِنْ فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ
أَلَا لِي، لَأَكْفُرَنَّ بِمَا كُفَرْتُمْ بِهِ،

”ابن کوئی نہیں آسان اور میں میں جوتا ہو
وہ جس کا بندہ ہو کر“

دوسرا درجہ پائیت کا اس کے مقابلے میں خاص ہے، یعنی صرف ان چہسزوں کے ساتھ مخصوص

کے چار درجات ہیں جن میں سب سے اعلیٰ انبیاء علیہم السلام ہیں اور درمیان میں دو لوگ ہیں جو ان سب سے نیچے ہیں سب سے زیادہ اونٹے کہ ہوئے ہیں جن میں کائنات میں کوئی نہیں ہے، عورت میں ان کو اور دنیا کہا جاتا ہے۔ چہذا۔ وہ ہیں جنہوں نے دین کے نبوت میں اپنی جان تک دی ہے اور صلہ۔ وہ ہیں جو شریعت کے پورے شیعہ ہوتے ہیں ۱۰ درجات میں ہیں عہد میں جن میں کوئی نہیں ہے نیک و بد اور کہا جاتا ہے۔

اس آیت میں پہلے مشرب اور اجالی طرح سے صرفہ مستقیم کہا گیا ہے کہ ان چار طبقوں کے حضرات ہیں راستے پر طبعی و درالگو مستقیم کہ اس کے بعد آخر کی آیت میں طبعی اور مشی صحت سے آنا کیسے نہیں کہ گمنام ہے اور اوشاد ہے:

تَحْقِيقُ الْمَشْهُوبِ عَلَیْهِمْ وَلَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ عَمِیْنُ زَارِعَاتُ اَنْ اُوْرُوْا کُلَّ اَمْرٍ بِرَکَابِ کَاضِبٍ
 کہایا اور دکان گروں کا چراتے سے تم پر ہے، مَشْهُوبِ عَلَیْہِمْ سے دو لوگ ارازمی جو بدی کے
 احکام کو جاننے پہنچانے کے بارے و شرارت افسانے اوافواض کی وجہ سے ان کی خلاف ورزی کرتے ہیں
 اور دوسرے لفظوں میں احکام پر اقبال کی تعمیل میں کو کاہی ویسی غصہ لایہ کرتے ہیں، جیسے عام طور پر یہ
 کامال متضاد کہ دنیا کے ذلیل منافق کی خاطر دین کو قرآن کرنے اور اپنا بائیکاٹ توڑ کر کرتے تھے، اور
 مَشْہُوْر سے مراد وہ لوگ ہیں جنہاں رافضیت اور اہل سنت کے سبب رہیں کے مسائل میں غلط رہتے
 چڑھنے اور دین کی محسوس حد دو سے بیکار افراد اور غلو میں ہستہا ہستے جیسے عام طور پر لٹکا
 تھے کوئی کی انتہی میں اتنے بڑے کہ وہیں کو غصہ جانیال، ایک ملوں چل کر کہہ کے ابا کی بات نہ مانیں
 انھیں تیل گس کر کے سے گزرتے ہیں اور دوسری طرف نہ زانی کو ان کو خدا بنائیں۔

آپ کا مکمل مطلب ہے کہ جو کہم دہ راستہ نہیں چاہتے جو اخوانی نفسانی کے نام پر چل رہا ہو دنیا میں نقصان دہ کرنے والوں کا ہے، اور نہ وہ راستہ چاہتے ہیں جو جاہل گروہ اور سو میں ظلم و فساد کرنے والوں کا ہے، بلکہ ان کے درمیان کا سودا چاہتے ہیں جس میں نہ فساد نہ ہے نہ نقصان دہی، اور ضرورت اور اخوانی نفسانی کے انبار کے زیر شہادت اور عقائد کا قاصد ہے جس کے

سودا کا قحطی کا خوف، آفات کی فکر، غصہ، نفرت، حسرت، کافرتوں اور مصلحین کے درمیان، یہ کہ جو اللہ ہمیں عطا کرے، ہم اس کا مستحق ہیں، اور جو اللہ نے ہم سے لے لیا، اس کا مستحق ہے۔ افرام کا عالم فناء، نبیوں، دوسروں اور اوس کے لئے عجاibat کی دہشت کے کفر، مینگی کوئی نہیں، اسی غصہ رافقی نے سراجہ مستقیم کی دیکھ کر مضاحمت کے ساتھ اچھالی اور سلیس دونوں پہلوؤں نے واضح فرما دیے۔

یہاں ایک بات قابلِ غور اور اسیں غور کرنے سے ایک تہہ علم کا دور وادہ کھلتا ہے۔ دور کو کھڑا سنبھلنے کی غرض سے نظارہ شہادت ہے، حق کو کھڑا کرنا اور افسوس فرما کر جاننا۔

یہ مختصر بھی مختار اور واضح بھی، کیونکہ یہ ہواستہرآن و تحقیق صراطِ مستقیم کی تشریح ہے۔ ہر آدمی کو علمِ
دولت اس کی انفعالی، لیکن قرآن کی اس مختصر صورت میں بخود اور وضاحت کے اس سبکو سمجھ کر اور
مستقیم کے تئیں کے لئے اللہ تعالیٰ سے منتقل و توفیق ہوا۔ اجمالی اور اعلیٰ پہلوؤں سے صراطِ مستقیم
اسطے متبعی فرما کر اگر سید عالم سے چاہے جو دورانِ مگوئی کو تلاش کر اور ان کے طریق کو اختیار کر
قرآنِ کریم نے اس جگہ نہ فرما کر ہواستہرآن کا نام نہ اختیار کر دیا کیونکہ محض کتابِ انسانی قریب
کے لئے کافی نہیں، ہر آدمی فرما کر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کیونکہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی
بغداد اس دنیا میں رہی نہیں، اور آپ کے بعد کوئی دوسرا رسولِ ابرہی نہیں، اس لئے صراطِ مستقیم
جن لوگوں کے ذہنِ جاہل پر کتا ہے ان میں نبی کے علاوہ اپنے حضرات بھی شامل کر دیئے گئے،
جو انقامت پر پیشہ مردوں کے، مثلاً عاتقین، شہداء اور صالحین۔

[illegible]

اس خاص طرز میں شاہد اس کی طرف اشارہ ہو کر انسان کی تعلیم و تربیت جس شخص کے ہاں لود و اپنول سے نہیں ہو سکتی، بلکہ وہ مالِ مابین کی صحبت اور ان سے بیکار حاصل ہوتی ہے، جس میں وہ صحبت انسان کا علم اور ان کی انسانیت ہو سکتی ہے۔ بعض کتابت ملز اور دیگر نہیں ہو سکتی، اپنول اگر جو مہم

کورس قرعظا ہی سیکھا ہے

رمی، آدمی بناتے ہیں

اور جو ایک ایسی ہیئت ہے کہ چونکہ اسے تمام کار و بار میں اہل بیت کے حصہ کمالی ملتی ہے
 ذکر الہی اور ایسا ہی کہہ سکتے ہیں، لہذا اچھا ہے کہ ان کو اس کی کتاب قرآن کریم اور ذکر میں ملے کہ یہ دنیاوی
 کمالات کے حصہ حاصل ہے۔ کوئی تفسیر نہ ہے، اسی طرح قرآن و حدیث کا حصہ حاصل انسان
 کی تعلیم اور ہر انسان کی تربیت کے لئے بزرگ کمالی نہیں جو کہ اسے جب تک اس کو کسی تفسیر اور ہر
 حاصل نہ کرنا چاہئے، قرآن و حدیث کے معاملے میں بہت سے تفسیریں آئی ہیں، اسی معاملے میں ہر انسان
 کو مصلحت ہے کہ اسے قرآن و حدیث کے ماہر ہو سکے، یہ ہے اہل غلو کے خلاف تصور ہے، اگر
 حصہ کتاب کافی ہو تو سونے کے جیسے کہ ضرورت نہ تھی، کتاب کے ساتھ دوسروں کو ملے گا کہ ہر انسان

بعض صلوات حاصل ہونے فرمایا کہ سورۃ فاتحہ پڑھے قرآن کا بار آورے اور آیت اہل لیلۃ
 نُصَلِّیْ وَآلِ اَبِیْہِیْمَیْنِ پوری سورۃ فاتحہ کا بار اور دعا ہے کہ کوئی کس کے پہلے پڑھے جن شرک
 سے بڑی ہوئے کا اطلاق ہے اور دوسرے جیلے اپنی قوت و قدرت سے بڑی کرنے کا اطلاق ہے کہ
 بندہ عاجز و بے اثر نہ ہو بلکہ مدد کے کچھ نہیں کر سکتا جن کا پیچہ اپنے سب کاموں کو اٹھائی کے سپرد
 کرتا ہے جس کی ہدایت قرآن کریم ہی ہونا چاہیے نہ ہے : قَدْ غَفِیْتُ عَنْ ذُنُوْبِیْ غَلِیْبًا وَرَدَّہُ ۱۱۳
 قُلْ هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ الْمَشَآءَیْمَ وَرَدَّہُ ۱۱۴ وَرَدَّہُ ۱۱۵ وَرَدَّہُ ۱۱۶ وَرَدَّہُ ۱۱۷ وَرَدَّہُ ۱۱۸
 اِنَّہٗ اَوْفٰی بِمَا وَعَدَہُ ۱۱۹ وَرَدَّہُ ۱۲۰ (مزمحل ۹۰)

ان تمام آیات کا حاصل یہی ہے کہ ان میں اپنے بڑے بڑے اعمال اور سہرا اپنی قابلیت پر کرے
 دیکسی دوسرے کی مدد پر کیلئے احکام صرف اللہ تعالیٰ ہی پر چھوڑنا چاہئے، وہی کا واپس ملتا ہے۔
 اس سے دیکھئے اصول احکام کے ثابت ہوتے، ازل پر کہ۔

اللہ کے سوا کہیں کی عبادت نہ ہو، عبادت کے معنی اور معلوم ہو چکے ہیں کہ کسی ذات کی شہنائی و عطرے
 اس کی عبادت پر نہ کیے کہ شرک کرنا محبت کی بنا پر اس کے سامنے اپنی عاجزی اور ذلت کا اظہار کر
 حرام و ناجائز، معافی مستہرم اور اللہ تعالیٰ کے سوا کسی مخلوق کے ساتھ ایسا معاملہ کیا جائے تو کسی شرک
 کہلاتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ شرک صرف اس کو نہیں کہے کہ بت پرستوں کی طرح کسی شجر کے کوئی
 و غیر کو خدائی پرست یا ذات کا مالک سمجھے بلکہ کسی کی عظمت، محبت، اخلاص کو رو دینا جو ہر خدا نے
 ہی کا حق ہے یہی شرک میں داخل ہے بشریکان مجید ہی پر جو دعاؤں کے شرک کا بیان کرتے ہوئے
 ہوا خدا فرمایا ہے،

اِنَّکُمْ وَاٰلِکُمْ اَنْتُمْ وَاٰلِکُمْ اَنْتُمْ
 لَقَدْ بَانَ مَا کُنْتُمْ فَعَلُوْا ۱۲۱

حضرت ہدی بن حاتم جو مسلمان ہوئے تھے پہلے نصرانی تھے انھوں نے یہ آیت کے اہلے میں
 رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ یہ قرآن پڑھنے کا ایک عبادت نہیں کرتے تھے، پھر نصرانی میں
 ان کو مہر دینا لے کا الزام ہم پر کیجئے گا کیا آپ نے فرمایا یا نہیں کہ تمہارے علماء ہم پر یہ آیت
 ایسی ہی نہیں کہ حرام و حلال پر دیتے ہیں ان کو اللہ نے حلال کیا ہے، اور ہم اپنے علماء کے کہتے ہیں کہ حرام
 ہی کہتے ہو اور ہم یہ کہتے ہیں کہ حلال ہی کہتے ہیں ان کو اللہ تعالیٰ نے حرام کیا ہے تمہارے علماء، ان کو حلال
 کر دیتے ہیں، تو ہم ان کے کہنے کا اتباع کر کے حلال کر دیتے ہیں اور یہی ہے حاتم نے عرض کیا کہ جو ایک ایسا
 تو ہے، اس پر حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کسی قرآن کی عبادت ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ کسی چیز کے حلال و حرام سزاوارے کا حق صرف حق تعالیٰ کا ہے جو غفلت میں

میں کسی دوسرے کو شرک فرمائے اور اللہ تعالیٰ کے احکام حرام و حلال معلوم ہونے کے اور ان کے
 خلاف کسی دوسرے کے قول کو واجب اتباع سمجھے و گویا اس کی عبادت کرتا ہے، اور دوسرے میں
 مسبب ہے۔

عام مسلمان جو قرآنی وصت کو برا و است سمجھنے کی اور ان سے احکام شرع نہ جاننے کی صلاحیت
 نہیں رکھے اس نے کسی امام مجتہد یا عالم فاضل کے قول پر ایمان کر کے عمل کرتے ہیں کسی کو اس آیت
 سے کوئی تعلق نہیں ہوگا کہ وہ روایت قرآنی وصت پر عمل ہے اور احکام خداوندی ہی کی اخلاص ہے،
 اور وہ قرآن کریم ہی اس کی ہدایت فرماتی ہے،

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فَاِذَا تَدَبَّرْنَا
 تَوَلَّیْ ۱۲۲

نہیں اگر تم کو وہ احکام یاد آئیں کہ ہمیں جانتے ہو
 اللہ جل جلالہ ۱۲۲

اور ہمیں طرح احکام و مسائل و احکام کے سوا کسی کو شرک یا شرک پر کسی طرح کسی
 کے نام کی ضرورت، ماننا کسی شرک میں داخل ہے، اللہ تعالیٰ کے سوا کسی دوسرے کو عبادت روا
 شکل کرنا ہم کو اس سے دعا، انگنا کسی شرک ہے، کیونکہ عبادت میں دعا کو عبادت فرمایا گیا ہے۔
 اس طرح لئے اعلان و افعال جو احکام شرک کیجے جائے ہیں ان کا انکباب بھی بیکم شرک کہ

جہ صحت و عین عقلم نے فرمایا کہ مسلمان جو کہنے کے بعد میں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث
 میں حاضر ہوا تو یہ حدیثیں مطیع ہوتی ہیں، آپ نے کچھ سے کچھ سے فرمایا اس حدیث کو اپنے منہ سے نکال دیا
 گرم اس وقت ہدی بن حاتم کا عقیدہ مطیع کے متعلق وہ تھا کہ نصرانیوں کا ہو گیا ہے، مگر
 ظاہری طور پر بھی عبادت پر کفر نہ تھا بلکہ کفر و کفر نہ تھا، ہدایت کی گئی، انفس کو انھیں پر ہزاروں
 مسلمان رہے کہ اس کا مطیع بننا لگاتے ہوئے ہیں، اور ان کی پر دہائیں کر کے کہ بڑا دیکھ
 شرک کا جرم کے مرتکب ہو چکے ہیں، اسی طرح کسی کو کہہ دیا کہ بڑا بڑا بیت اللہ کے سوا کسی دوسری
 چیز کے گرد طواف کرنا یا سب عبادات شرک ہیں، انھیں انھیں کے افواہ و اعلان و دعاؤں
 کا کفر ہے، دوسرا مسئلہ یہ کہ عبادت اور عبادت صرف اللہ تعالیٰ ہی سے کرنا ہے کہیں دوسرے جان نہیں
 مستحق عبادت و توسل کا نہیں، اور مسلمانوں سے دعا مانگنے کا اور اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو عبادت
 اور احکام کی نفی نہیں، تو ہماری سبب کے باعث ہر انسان و دوسرے انسان سے مانا ہے
 اس کے بغیر اس دنیا کا نظام چل ہی نہیں سکتا، عبادت کو دین منہ سے توڑنا ساری مخلوق کی خدمت کا
 اور ضرور و مملو، برحق، و بار خداوند مخلوق کی مدد میں جو ہے، اور جو جس کو دیکھنا چاہئے ہے
 مجبور ہے، ظاہر ہے کہ کسی دین اور دینیت میں نہ عبادت نہیں، وہ اس عبادت میں داخل نہیں، جو
 اللہ تعالیٰ کے ساتھ حق و ص ہے، اس طرح فرمائی سبب کے ذریعہ کسی نبی و اول سے دعا کرنے

نہیں ہوتا، کیونکہ ایسے خوارقِ عادات کے اظہار سے جو مقصد پر وہ اس کے بغیر پورا نہیں ہوتا۔

اس لئے معلوم ہوا کہ عقیدہ تو یہی رکھنا ہو کہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی قدرت و مشیت سے ہو رہا ہے اس کے ساتھ انبیاء و اولیاء کی عظمت و ضرورت کا بھی اعتراف ضروری ہے، اس کے بغیر رضائے الہی اور مطاعت احکام خداوندی سے محروم رہیگا، جس طرح کوئی شخص بلب اور پتکے کی قدر نہ پہچانے اور ان کو ضائع کرنے تو دشمنی اور نفاق سے محروم رہتا ہے۔

وسیلہ، استقامت اور ہمت اور اہمیت کے مسئلے میں بکثرت لوگوں کو اشکال رہتا ہے، امید ہو کہ اس تشریح سے اصل حقیقت واضح ہو جائے گی، اور یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ نبیؐ و اولیاء کو وسیلہ بنانا نہ مطلقاً جائز ہے اور نہ مطلقاً ناجائز، بلکہ اس میں وہ تفصیل ہے جو اوپر ذکر کی گئی ہے کہ کسی کو اختیار سمجھ کر وسیلہ بنایا جائے تو شرک و حرام ہے، اور رضی واسطہ اور ذریعہ سمجھ کر کیا جائے تو جائز ہے، اس میں عام طور پر لوگوں میں اذیاد و تعریض کا عمل نظر آتا ہے۔

واللہ اسأل الصواب والستدوسین المبنی والمعاد

مسئلہ مستقیم کی ہدایت و نیاں اور اہل تغیر میں یہ بات وضاحت سے آگئی ہے کہ قرآن کریم نے جس میں کلیہ کا مبنیائی ہے دعا کو ہر شخص کے لئے ہر کام کے لئے ہر حال میں انتخاب فرمایا ہو وہ صراطِ مستقیم کی ہدایت کی دعا ہے، جس طرح آخرت کی کامیابی اس صراطِ مستقیم پر موقوف ہو، جو انسان کو جنت کی طرف لیجاتا ہے اس طرح دنیا کے سامنے کاموں میں بھی غور کر دو تو کامیابی کا مدار صراطِ مستقیم ہی ہے، جس کام میں وہ آلات و ذرائع خستہ یا کئے گئے، جس کے نتیجے میں مقصد کا حصول عاویۃ لازمی ہو تو کامیابی عاویۃ لازمی ہوتی ہے، چنانچہ انسان اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوتا تو اگر وہ غور کرے تو معلوم ہو جائے گا کہ کام کے کسی مرحلے میں اس نے غلطی کی ہے، صحیح راستہ ہاتھ سے چھوٹ گیا تھا، اس لئے ناکامیابی ہوئی۔

اس کا حاصل یہ ہو کہ صراطِ مستقیم کی ہدایت صرف آخرت اور دین کے کاموں کے ساتھ مخصوص نہیں، دنیا کے سب کاموں کی درستی اور کامیابی بھی اسی پر موقوف ہے، اس لئے یہ دعا ایسی ہو کہ نومن کو ہر وقت عز و جان بنانے کے قابل ہے، شرط یہ ہو کہ آنحضرت اور نبوت کے ساتھ کی جائے، محض الفاظ کا پڑھ لینا نہ ہو، واللہ الموفق والمعين۔

بسم اللہ تعالیٰ تفسیر سورۃ فاتحہ ختم ہوئی،

و اللہ اعلم و آخرہ و ظاہرہ و باطنہ

بسم اللہ تعالیٰ

سورۃ البقرہ

۱۱ اور تعداد آیات | اس سورت کا نام سورۃ البقرہ ہے اور اسی نام سے حدیث اور آثار صحابہ میں اس کا ذکر موات ہے، جس روایت میں سورۃ بقرہ کہنے کو منع کیا ہے وہ صحیح نہیں، دین کثیر، تعداد آیات دو سو چھیالیس ہی اور کلمات چھ ہزار دو سو اکیس اور حروف پچیس ہزار پانسویں (دین کثیر)

زمانہ نزول | یہ سورت مدنی ہے، یعنی ہجرت مدینہ طیبہ کے بعد نازل ہوئی، اگرچہ اس کی بعض آیات مکہ مکرمہ میں حج کے وقت نازل ہوئی ہیں، مگر وہ بھی باصطلاح مفسرین مدنی کہلاتی ہیں۔

سورۃ البقرہ قرآن کریم کی سب سے بڑی سورت ہے، اور مدینہ طیبہ میں سب سے پہلے اس کا نزول شروع ہوا، اور مختلف زمانوں میں مختلف آئین نازل ہوئی ہیں، یہاں تک کہ دبا یعنی سود کے متعلق ہر آیات ہیں وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی آخری عمر میں نازل ہوئی، اور اس کی ایک آیت "وَاتَّقُوا يَوْمًا تُفْصَلُونَ فِيهِ أَبْنَاءُ الَّذِينَ يَدْعُونَ لِلْكَافِرِينَ" تو قرآن کی بالکل آخری آیت ہے، جو سندِ ہجری میں ۱۰ ہجری کو مرقی کے مقام پر نازل ہوئی، جبکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حجۃ الوداع کے فرائض ادا کرنے میں مشغول تھے، و قرطبی، اور اس کے اسی نوے دن کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی، اور وحی الہی کا سلسلہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا۔

مضامین سورۃ البقرہ | یہ قرآن کریم کی سب سے بڑی سورت اور نبوت سے احکام پر مشتمل ہے، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ: سورۃ البقرہ کو پڑھا کرو، کیونکہ اس کا پڑھنا برکت ہے، اور اس کا چھوڑنا حسرت اور بد نصیبی ہے، اور اہل باطل اس پر قابو نہیں پاسکتے۔

قرطبی نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ اس جگہ اہل باطل سے مراد جاودہ گریں، مراد یہ ہے کہ اس سورت کے پڑھنے والے پر کسی کا جاودہ نہ چلے گا، قرطبی از مسلم بروایت ابو امامہ باہلی

اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس گھر میں سورۃ بقرہ پڑھی جائے شیطان وہاں سے ہٹا جاتا ہے (ابن کثیر از حاکم)

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سورۃ بقرہ منام القرآن اور ذرۃ القرآن ہے، اسم اور ذرۃ ہر چیز کے اعلیٰ و افضل حصہ کو کہا جاتا ہے، اس کی ہر آیت کے نزول کے وقت انبی فرشتے اس کے جکو میں نازل ہوئے ہیں (ابن کثیر از مسند احمد) اور حضرت ابو ہریرہؓ کی ایک حدیث میں ہے کہ اس سورت میں ایک آیت ایسی ہے جو تمام آیات قرآن میں اشرف و افضل ہے، اور وہ آیت انکرسی ہے (ابن کثیر از ترمذی) حضرت علیؓ بن مسعودؓ نے فرمایا کہ: سورۃ بقرہ کی دس آیتیں ایسی ہیں کہ اگر کوئی شخص ان کو رات میں پڑھے تو اس رات کو جہنم، شیطان گھر میں داخل نہ ہوگا، اور اس کو اور اس کے اہل عیال کو اس رات میں کوئی آفت، بیماری، بچہ و غم وغیرہ ناگوار چیز پیش نہ آئے گی، اور اگر یہ آیتیں کسی مجنون پر پڑیں تو اس کو فاقہ ہو جائے گا، وہ دس آیتیں یہ ہیں: چار آیتیں شروع سورۃ بقرہ کی پھر تین آیتیں درمیانی یعنی آیت الکرسی اور اس کے بعد کی دو آیتیں پھر آخر سورۃ بقرہ کی تین آیتیں۔

احکام و مسائل

مفہوم و مسائل کے اعتبار سے بھی سورۃ بقرہ کو ایک خاص ہستی یا حاصل ہے، ابن عربیؒ منبر مانتے ہیں کہ میں نے اپنے بزرگوں سے سنا ہے کہ سورۃ بقرہ میں ایک ہزار اور ایک ہزار تہی اور ایک ہزار چھتیس، ایک ہزار تہی اور تھیں ہیں قرطبیؒ (ابن کثیر) یہی وجہ ہے کہ حضرت فاروقؓ اعظمؓ نے جب سورۃ بقرہ کو تفسیر کے ساتھ پڑھا تو اس کی تعلیم میں بارہ سال خرچ ہوئے، اور حضرت علیؓ بن عمرؓ نے یہ سورت آٹھ سال میں پڑھی (قرطبیؒ)

سورۃ فاتحہ درحقیقت پورے قرآن کا خلاصہ ہے، اس کے بنیادی مفہامین یہ ہیں: اول اللہ تعالیٰ کی ربوبیت، یعنی پروردگار عالم ہونے کا بیان، دوسرے اس کا متحی عبادت ہونا، اور اس کے سوا کسی کا لائق عبادت نہ ہونا، تیسرے طلب ہدایت، سورۃ فاتحہ کا آخری مضمون صراطِ مستقیم کی ہدایت طلب ہے اور درحقیقت پورا مسترآن اس کے جواب میں ہے، کہ جو شخص صراطِ مستقیم چاہتا ہو قرآن ہی میں ملے گا۔ اسی لئے فاتحہ کے بعد پہلی سورۃ بقرہ رکھی گئی، اور اس کو ذلک الکتاب سے شروع کر کے اس طرف اشارہ کر دیا گیا کہ جس صراطِ مستقیم کو تم ڈھونڈ رہے ہو وہ یہ کتاب ہے۔

اس کے بعد اس سورت میں اول ایمان کے بنیادی اصول، توحید، رسالت، آخرت اجمال طور پر اور آخر سورت میں ایمان مفصل بیان فرمایا گیا ہے، اور درمیان میں ہر شعبہ زندگی: عبادات، معاملات، معاشرت، جہتلات، اصلاح ظاہر و باطن کے متعلق ہدایات کے بنیادی اصول اور ان کے ساتھ بہت سی جہیز نیاات بیان ہوئی ہیں۔

سُورَةُ الْبَقَرَةِ

سُورَةُ الْبَقَرَةِ مَدَنِيَّةٌ ۲۸۶ آيَاتُهَا ۲۸۶ وَكُتِبَتْهَا ۲۰

سورۃ بقرہ مدنی ہے، اس میں ۲۸۶ آیتیں ہیں اور ۲۰ رکوع

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ ۝

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے

الْم ۝ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۤفِيْهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝

اس کتاب میں کچھ شک نہیں راہ بتلاتی ہے ڈرنے والوں کو،

الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ

جو کہ یقین کرتے ہیں بے دبی چیزوں کا اور قائم رکھتے ہیں نماز کو اور جو ہم نے روزی دی ہے

يُنْفِقُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَا اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَا اُنْزِلَ

ان کو اس میں خرچ کرتے ہیں، اور وہ لوگ جو ایمان لاتے اس پر کہ کچھ نازل ہوا تیری طرف اور اس پر

مِّنْ قَبْلِكَ ۚ وَبِالْآخِرَةِ هُمْ يُوقِنُوْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى

کہ کچھ نازل ہوا تجھ سے پہلے اور آخرت کو وہ یقین جانتے ہیں، وہی لوگ ہیں ہدایت پر اپنے

مِّنْ تَّرْهِيْمٍ ۚ ۝ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝

پروردگار کی طرف سے اور وہی ہیں مراد کو پہنچنے والے۔

خلاصہ تفسیر

یہ کتاب ایسی ہے جس میں کوئی شبہ نہیں رہیں قرآن کے مخائب اللہ ہونے میں کسی شبہ

کی غائبی کش نہیں، اگرچہ کوئی ناہم اس میں مشتبہ رکھتا ہو، کیونکہ یقینی بات کسی کے شبہ کرنے سے بھی حقیقت میں یقینی ہی رہتی ہے، راہ ہٹانے والی ہے خدا سے ڈرنے والوں کو جو یقین لاتے ہیں چھپی ہوئی چیزوں پر (یعنی جو چیزیں ان کے حواس و عقل سے پوشیدہ ہیں صرف اللہ و رسول کے فرمانے سے ان کو صحیح مانی لیتے ہیں) اور قائم رکھتے ہیں خدا کو (قائم رکھنا یہ ہو کہ اس کو پابندی کے ساتھ اس کے وقت میں پورے شرائط و ارکان کے ساتھ ادا کریں) اور جو کچھ ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں (یعنی نیک کاموں میں) اور وہ لوگ ایسے ہیں کہ یقین رکھتے ہیں اس کتاب پر بھی جو آپ کی طرف اتاری گئی ہے اور ان کتابوں پر بھی جو آپ سے پہلے اتاری جا چکی ہیں (مطلب یہ ہو کہ ان کا ایمان سرآبی پر بھی ہے اور پہلی کتابوں پر بھی) اور ایمان بچا سمجھنے کو کہتے ہیں عمل کرنا دوسری بات ہے، جتنی کتابیں اللہ نے پہلے انبیاء پر نازل فرمائی ہیں ان کو بچا سمجھنا فرض اور شرط ایمان ہے، یعنی یہ سمجھئے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے نازل فرمائی تھیں وہ صحیح ہیں خود غرض لوگوں نے جو اس میں تبدیل و تخریج کی ہے وہ غلط ہے، وہ گیا عمل سزوہ صرف قرآن پر ہوگا، پہلی کتابیں سب منسوخ ہو گئیں، ان پر عمل جائز نہیں) اور آخرت پر بھی وہ لوگ یقین رکھتے ہیں، بس یہ لوگ ہیں ٹھیک راہ پر جو ان کے پروردگار کی طرف سے ملی ہے اور یہ لوگ ہیں پورے کامیاب (یعنی ایسے لوگوں کو دنیا میں تو یہ نعمت ملی کہ راہ حق ملی اور آخرت میں ہر طرح کی کامیابی ان کے لئے ہے) :

حِلُّ لُغَاتٍ ذَلِكُمْ كَسَى دُورَ كِي حَيْسِرُ كِي طَرَفُ اشَارَةِ كِي لَئِي اسْتِمالِ ہوتا ہے، وَرَئِبٌ شُكٌّ وَشِبْہُ
 ھُكْمٌ حَقِّ ہدایت سے بنا ہے، اور ہدایت کے معنی رہنمائی، مُتَّقِبٌ جن میں صفت اتقویٰ ہو
 تقویٰ کے لفظی معنی بچنے کے ہیں، براود اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے بچنا ہے، عَجَبٌ لُغْلُ معنی ہر دو چیز جو انسان کی
 نظر اور دوسرے کو اس سماعت وغیرہ سے باہر ہو، یَقِیْمُوْنَ اقامت سے بنا ہے، جس کے معنی سیدھا کرنے
 کے ہیں، اور سزا کا سیدھا کرنا یہ ہے کہ آداب اور خشوع و خضوع کے ساتھ اراد کی جائے، وَرَزَقْنَا لَكُمْ رِزْقًا
 بنا ہے، جس کے معنی میاں روزی اور گزارنے کا سامان دینا، یُفِیْقُوْنَ اتفاق سے بنا ہے، خرچ کرنے کے معنی
 میں آتا ہے، الْخِزْفُ لغت میں مؤخر اور بعد میں آنے والی چیز کو آخرت کہا جاتا ہے، اس جگہ عالم دنیا کے مقابلے
 میں عالم آخرت برآگیا، یَوْ قِیْسُوْنَ اِیقَان سے ہے اور دو یقین سے بنا ہے، اور یقین اس کو کہتے ہیں جس میں
 کسی شک و شبہ کی گنجائش نہ ہو، مُتَّقِبُوْنَ اخلاص سے اور وہ فَلَاحٌ سے بنا ہے، فَلَاحٌ کے معنی پوری کامیابی۔

معارف و مسائل

حروف مقطوعہ جو بہت سی سورتوں
کے شروع میں آتے ہیں ان کی تحفہ تین

اصطلاح میں حروف مقطعه کہا جاتا ہے، انہیں ہر حرف مجزا جدا سا کن پڑھا جاتا ہے، الف، لام، میم۔
حروف مقطعه جو اوائل سطور میں آتے ہیں، ان کے متعلق بعض مفسرین نے فرمایا کہ یہ ان سورتوں
کے نام ہیں، ایضاً حضرات نے فرمایا کہ اسبابِ اربعہ کے رموز ہیں، مگر جہوہ صحابہ و تابعین اور علماء امت کے
نزدیک رائج یہ ہے کہ یہ حروف رموز اور اسرار ہیں، جس کا علم سوائے خدا تعالیٰ کے کسی کو نہیں اور
ہو سکتا، جو کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کا علم بطور ایک راز کے دیا گیا ہو جس کی تبلیغ امت کے لئے
رکھ دی گئی ہو اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ان حروف کی تفسیر و تشریح میں کچھ منقول نہیں
امام تفسیر قرطبی نے اپنی تفسیر میں اس کو اختیار فرمایا ہے، ان کے بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ:-

عام شہس۔ سفیان ثوریؒ اور ایک جماعت قدس نے فرمایا ہے کہ ہر آسمانی کتاب میں اللہ تعالیٰ کے کچھ خاص رموز و اسرار ہوتے ہیں، اسی طرح یہ خروف و اعداد مستتر قرآن میں حق تعالیٰ کا راز ہے، اس لئے یہ ان منشاہیات میں سے ہیں جن کا علم صرف حق تعالیٰ ہی کو ہے، ہمارے لئے ان میں بحث و گفتگو کو بھی جائز نہیں، مگر اسی کے باوجود وہ ہمارے فائدے سے تعالیٰ عزیز میں، اذلی تو ان پر ایمان لانا ہمیں ان کا پڑھنا ہمارے لئے ثواب عظیم، دوسرے ان کے پڑھنے کے منہی فرماندہ رکات ہیں، سو اگرچہ ہمیں معلوم نہ ہوں مگر غیبی ہے وہ ہمیں سب سے بڑھ چکے ہیں ۝

پیشہ فرائض

تخصرت مدین اکبر، فاروقی اعظم، عثمان غنی، علی مرتضیٰ، عبید اللہ بن مسعود وغیرہ جیسے صحابہ کرام ان حروف کے مخلوق ہیں بخدیہ تھا کہ یہ اللہ تعالیٰ کے اسرار ہیں، ہیں ان پر ایمان لانا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آئے ہیں اور جس طرح آئے ہیں ان کی تلاوت کرنا چاہیے، مگر سنی معلوم کرنے کی فکر میں پڑا درست نہیں۔

ابن کثیرؒ نے بھی قرطبیؒ وغیرہ سے نقل کر کے اسی مضمون کو ترجیح دی ہے، اور بعض اکابر علماء سے جو این حدیث کے معنی منقول ہیں اس سے صرف تفصیل و تنبیہ اور تسہیل مقصود ہے، یہ نہیں کہ مراد حق تعالیٰ یہ ہے کہ اس لئے اس کو بھی غلط کہنا تحقیق علماء کے خلاف ہے۔

ذَلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيهِ لَفْظٌ ذَلِيقَ كَيْسٍ دُورِ كِي چیز کی طرف اشارے کے لئے آتا ہے اور کتاب سے مراد قرآن کریم ہے، رَیْب کے معنی شک و شبہ، منے یہ ہیں کہ یہ کتاب ایسی ہے جس میں کوئی شک و شبہ نہیں، یہ موقع بظاہر اشارہ بعید کا نہیں تھا، کیونکہ اسی بسترآن کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے جو لوگوں کے سامنے ہے، مگر اشارہ بعید سے اس کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے کہ سورہ فاتحہ میں جس صراطِ مستقیم کی درخواست کی گئی تھی یہ سارا بسترآن اس درخواست کا جواب بصورت قبولیت اور صراطِ مستقیم کی تشریح و تفصیل ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ ہم نے یہ دعا مانگی اور قرآن

بیچ دیا، ہر جائیداد کا آفتاب پر، ہر غلّے کی دہانت چاہتا ہے وہ اس کو چڑھے دے اور اس کے مستقبل پر عمل کرے۔

اور پھر دوسرے متعلق دانلوہ سے اس امر کو شک و شبہ نہیں ہوگا کہ کسی کلام میں شک و شبہ کی دو صورتیں ہوتی ہیں ایک یہ کہ خود کلام میں غلطی ہو، دوسرا وہ کلام علی شک و شبہ ہو جائے، دوسرے یہ کہ جسے دانے کے لہجہ میں غلطی ہو، اس صورت میں کلام علی شک و شبہ نہیں ہوتا، بلکہ کسی لہجے کا غلطی کی وجہ سے کسی کو شک ہو جائے، جن کا ذکر گذشتہ آئینہ میں ہوتا ہے، کہ بعد ازاں کتب و تصانیف میں آیا ہے۔ اس لئے ہزاروں کہ لہجوں کی شک و شبہات و اعتراضات کے باوجود وہ صحیح ہے، بلکہ اس کتاب میں بھی شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔

اُخت کا دوسرا حصہ ہے، یعنی وہ شخص جس کا حصہ ہے، اگرچہ قرآن کی ہدایت نہ عروں نوح بشیر کے لئے بلکہ
 تمام کائنات عالم کے لئے عام ہے، سورۃ فاتحہ کی تعبیر میں بیان ہو چکا ہے کہ ہدایت کے معنی دوسرے
 ہیں، ایک وجہ تمام نوح اللہ کی تمام حوائج و فوہ کے لئے سب سے عام اور شامل ہے، دوسرا وجہ
 مؤمنین کے لئے خاص اور میرا دوسرا حصہ بھی خاص کے لئے مخصوص ہے، میرا اس کے دو بابت کی کوئی
 پروا نہ ہے، انہیں قرآن کی ترجمہ کے مختلف مواقع میں ہمیں ہدایت عائد کا کرنا ہے، یہی ہمیں ہدایت عائد کا دوسرا
 حصہ ہدایت عائد کا حصہ ہے، اس نے مغربی کی تعبیر کی گئی ہے کہ وہ ہے جس پر سب سے نہیں ہونا چاہئے کہ ہدایت
 کی نفاذ و ضرورت قوی لوگوں کو ہے کہ جس شخص میں کہ وہ مذکورہ شخصیت سے معلوم ہو کر اس کی جگہ شخص کی
 خصوصیت سے لازم نہیں آتا کہ قرآن فریق فرقوں کے لئے ہدایت نہیں ہے۔

مستحقین کی عوامی صفات: اس کے بعد درج ذیل میں مقبولین کی مخصوص صفات، علامات و بیان کر کے یہ بتلا دیا گیا ہے کہ یہ بات ولایت یافتہ ہے یا نہیں۔ ان صفات کا استعمال اس شخص پر کیا جائے گا جس کو یہ عہدہ حاصل ہو۔ اس صفت میں شامل ہر بات ان کے ساتھ ہے، ان کے خلاف اور نظریات اور احوال میں کوئی کوئی اختلاف نہیں ہوتا۔

شاہد بھی وہ ہے کہ خدین کی مخصوص صفات بیان کرنے کے بعد ارشاد ہو ہے اَوْ قُلْتُ لَكَ
كَلِمَ خُدُوسٍ يَتَقَرَّبُ اَوْ قُلْتُ لَكَ هُوَ الْمَلِكُ فَخَرَجَ مِنْ رُكْبِ يَدِ الْمَلِكِ رَايَ هُوَ اَنْ
رَبِّكَ كَرَامَتِ عَلَيَّ هُوَ الْمَلِكُ يَدِ رُكْبِ يَدِ الْمَلِكِ رَايَ هُوَ اَنْ

مفتیوں کی صفات جو ہیں وہ اکثر ہیں۔ یہاں کوئی ایسی چیز ان کی اجمالی غرضوں اور اس کے بنیادی اصول سمجھانے میں، اور عملی مسائل کے بنیادی اصولوں میں، اس لئے ان صفات کو روز افزوں کے ساتھ برقرار رکھا جائے گا۔

اَللّٰہِ اِنِّیْ اَتُوْبُکَ بِالْغُیْبِ وَکَلِّیْکَ الْعِلْمَ وَبِعَمَلِیْ فِیْکَ الْعِلْمَ وَکَلِّیْکَ الْعِلْمَ وَکَلِّیْکَ الْعِلْمَ ۝

میں خدا سے ڈرتے رہاں گا ایسے ہی کہ تمہیں کہتے ہیں ہے وہ بھی جیسا کہ خدا کا اور تمام کہتے ہیں
 خدا کو اور جو کہنے دے دے کہ جس سے کہ جس سے کہتے ہیں۔

اس آیت میں متین کی نہیں مسئلہ بیان کی گئی ہے، ابناں بالغ، و انما صبطہ، اولاد کی و ما یخرج کرنا، اس کے ضمن میں بہت سے اہم مسائل آگئے ہیں اور ان کی بھر پور تفسیل سے ہم کو آگاہ کر پیش مسئلہ، ابنا کی تعریف کو قرآن نے خود بیان کرنا لایا ہے جس کے صحت و درستی میں ہر ماہی اگر باطن کی ترویج کروا رہا ہے، لفظ ایمان اور طیبہ کے ضمن کہ لے جا رہا ہے تو ابنا کی پوری حقیقت آج انھیں سمجھ کر بھی جاتی ہے۔

نفس میں کسی کی بات کو کسی کے عقائد پر یقینی طور سے مائل لینے کا نام ایمان ہے۔ اس لئے سوسائٹ و مشاہدات میں کسی کے قول کی تصدیق کرنے کو ایمان نہیں کہتے۔ مثلاً کوئی شخص سفید کپڑے کو سفید و سیاہ کو سیاہ کہہ رہا ہے اور دوسرا اس کی تصدیق کرتا ہے اس کو تصدیق کرنا کہنا ہوگا ایمان کا نہیں کہا جائے گا، کیونکہ اس تصدیق میں قائل کے عقائد کو کوئی دخل نہیں، بلکہ یہ تصدیق مشاہدہ کی بناء پر ہے۔ اور اصطلاح پر ضرورت میں خبر رسول کو مایل بنانا بھی بعض لوگوں کا حق ہے یعنی یہ بھی ایمان ہے۔ اختلاف طلب نفس میں ایسی چیزوں کے لئے ہونا چاہئے۔ چونکہ یہی طریق انسان کو معلوم ہونے اور نہ ایمان کے حواس غرض اس کا بڑھ چکیا، یعنی ذہن دو آگے سے نظر آئیں، نہ کہ اس سے مست ہونے، نہ کہ اس سے سوچ کر کا بنائے۔ بلکہ کوئی خاطر ہو سکے۔ اور نہ آخستہ چکر کوئی کو معلوم کیا جاسکے۔

[illegible]

ذرا اب دماغی الجب کے سنے ہے جو سمجھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو بیانات و تعلیمات نے کر آئے ہیں ان سب کو بغیر طوطیوں کے کہنا مانتا اس پر دل ہے کہ اس کو قلعہ کربلا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق جو افسوسناک حادثہ ہوا ہے وہ دیکھ لیں اسلام کے نزدیک ایمان کا یہی فریق ہے اور عقیدہ کفر کا

عبدالله بن مسعود بن عمرو

اس نعرے کا ام ایماں بتلایا گیا ہے، اس سے پہلے معلوم ہو گیا کہ شخص جاننے کو اپنا

مشتعل کی قسم میں مشقین کی دوسری صفت پر بیان مندرجہ بالا میں مذکورہ آیت پر ایمانی
مطلب بیان کیا گیا ہے۔ دیکھتے ہیں، آخرت سے راہ و دار آخرت سے ہم کو نشانہ میں داتا نور اور نور
اور حق کے نام سے بھی ذکر کیا گیا ہے اور ہم باعتراف اس کے ذکر اور اس کے ہونے کا مالک سے
بہرہ ور ہے۔

آخرت پر ایمانی اور اگرچہ ایمان کا غلبہ کے غلام میں نہ پکڑا ہے، مگر اس کو جو ہر چیز
انفعلی غلبہ ہو، اس نے ذکر کیا گیا کہ یہ اس لئے ایمان میں اس حیثیت سے سبب ہیں، اگرچہ
ہے کہ حقیقتاً میں ایمان پر عمل کا جذبہ پیدا کرنا، اس کا اثر ہے۔

اور اسلامی عقائد میں بھی وہ اخلاقی مفید ہے جس نے دنیا کی اپنی کو کوی اور جس نے
آسمان تسلیم پر عمل کرنے والوں کو پہلے انسان کا دماغی اور پھر دنیا کی سیاست میں بھی تمام اوقاف
حاکم کے مقابلے میں ایک سہارا کی مقام عطا فرمایا، اور جو حیدر و توسیع و رسالت کی طرح تمام انبیاء
علیہم السلام کو وہ تمام شرائط میں مشترک اور متفق طلب کیا ہے۔

وہ ظاہر ہے کہ جن لوگوں کے سامنے صرف دنیا کی زندگی اور، اس کی عیش و عشرت ان کا ہوتا
مقصود ہے، اس کی جمیعت کو جمیعت سمجھتے ہیں، آخرت کی زندگی اور اعمال کے حسب کتاب اور جبریل
و ملاکوں نہیں آتے، وہ جب بھوک، سچ اور سلا مسرہ کی تعریف کر اپنی عیش و عشرت میں غفلت افکار
برتنے دیکھیں، تو ان کو جرات سے روکنے والی کوئی چیز نہ پائی نہیں رہتی، حکومت کے شعور پر قائم
تخلیقا خدا و بزرگوار اور اس کے احسان کے لئے کافی نہیں، مادی مجرم قوت و مزاج کے عبادی
ہوتی جاتے ہیں، کوئی مشرکین انسان اگر شعری سر کے خوف سے اپنی خواہشات کو ترک نہیں
کرتے تو کسی حد تک کسی کو حکومت کی راہ و گزیر کا غلام، جو اخلاقی میں اور دلائل و براہین عقل پر
حکومت اور اس کے قوانین کو سامنے نہیں آتے، کوئی بھوک کر سکتا ہے کہ اپنی عیش و عشرت اور خواہش
کو چھوڑ کر پابندیوں کا وطن اپنے گھر میں ڈال لے۔

ہاں وہ صرف عقیدہ آخرت اور خوب نفاذ ہے جس کی وجہ سے انسان کی ظاہری اور باطنی
مالت ملت و خلوت میں یکساں ہو جاتی ہے، وہ یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ انسان کے بندہ و رازوں اور ان
پر ہر چیز میں اور رات کی تاریکیوں میں بھی کوئی دیکھنے والا ہے و گھر واپس کوئی لکھنے والا ہے
اعمال کو گھر ہے۔

یہی وہ عقیدہ تھا جس پر اہل اعلیٰ کرنے کی وجہ سے اسلام کے ابتدائی دور میں ایسا کیا سباز
ساختہ پیدا ہوا کہ مسلمانوں کی حدیث و دیگر، چال چلن و دیگر لوگ عالم دینان سے اسلام کے گویے
ہو جاتے تھے، یہاں یہ بابت بھی قابلِ نظر ہے کہ اس آیت میں یہ ایک خوشی کے ساتھ دنیا کی خوشیوں

نہیں، بلکہ جو خوشیوں استحال فرمایا گیا ہے، کیونکہ ایمان کا مقابلہ کفر نہیں، اور ایمان کا
مقابلہ شکست و قہر و اس میں انسان ہے کہ آخرت کی زندگی کی بعض نعمتوں کو نہ مانگیں
کرنا، بلکہ اس کا اسیاتین ضروری ہے، جیسے کہ چار اصول کے مسئلے ہیں، مشقین کی یہ صفت
کہ آخرت میں ان تعالیٰ کے سامنے پیش در حساب کتاب، پھر جزا و سزا کا نقشہ ہر وقت ان کے پیش
رہتا ہے۔

وہ نفس جو در مردوں کا بھی غضب کرنے کے لئے جھوٹے مقدمے لڑتا ہے، جھول گواہی
دے دیتا ہے، اللہ تعالیٰ کے زمان کے خلاف حرام مال کمانے اور کمانے میں لگا ہوا ہے یا دنیا
کے ذلیل مقاصد حاصل کرنے کے لئے خلاف شرع ذرائع جستار کر رہا ہے، وہ ہزار بار آخرت
پر ایمان لے لے گا، قہر کرے اور وہاں ہر شے نسبت میں اس کو خرم کیا بھی جائے، لیکن مشرکین جن
حقائق کا مظاہر کر لے، وہ اسے عمل نہیں، اور وہ ان انسان کی زندگی میں انقلاب لائیں اور ان کی
اسی کے نتیجے میں انھیں کو ہدایت دے گا، انہیں باجائے ہم کو کفر سے بڑھ کر اپنی آیت
میں ہے، اُولَئِکَ یَحِلُّ عَلَیْہِمْ ذُنُوبُہُمْ وَ اُولَئِکَ یَحْتَمِلُ عَذَابُہُمْ اَلْیَوْمَ یعنی جس میں لوگ
ہیں شک و گمان کے پروردگار اور۔

اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَاَسْمَاءُ عَلَیْہِمْ اَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ یَنْتَظِرُوْا رَحْمَۃً

لَهُمْ یَوْمَئِذٍ ۝۱ خَتَمَ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوْبِہُمْ وَعَلٰی سَمْعِہِمْ وَعَلٰی

اَبْصَارِہُمْ غَشَاوۃٌ ۝۲ وَ لَہُمْ عَذَابٌ عَظِیْمٌ ۝۳

ایمان دے گئے، مگر کوی اشارے ان کے دلوں پر اور ان کے کانوں پر اور

انہیں ان کے عذاب کا

خاتمہ

جنگ جو لوگ کافر ہیں، یہ برابر ہے ان کے حق میں عذاب، ان کو دوا میں یا نہ دوا میں،
وہ ایمان ملا دے جسے وہ بات ان کا فزوں کے مشعل ہے جن کی نسبت، خدا تعالیٰ کو معلوم ہے کہ ان کا
خاتمہ ہو گا، عذاب کا فزوں نہیں، ان میں ہے، سے لوگ بدعت میں سلیمان ہو گئے، ہنگامہ اور ان کے
پاوروں کے کانوں پر اور ان کی انھوں پر ہو ہے، اور ان کے لئے سزا ملے گی ہے۔

معارف مسائل

مؤلفہ کا پہلے ہی آیتوں میں ذکر کیا گیا کہ کتابِ جاہلیت اور ہر رنگ کے مشابہ خلاصہ مضمون مع ربط سے اہل تہذیب و ایمان کرنے کے بعد ان خوش نصیب لوگوں کا ذکر کیا، جنوں نے اس کتابِ جاہلیت سے پرہیز کیا تھا۔ یہی کو مستشرقین کی اصطلاح میں مؤمنین اور متقیین کا لقب دیا گیا ہے، اور ان حضرات کی مخصوص صفات و کمالات بھی بیان کی گئیں، اس کے بعد یہ آیتوں میں ان لوگوں کا ذکر ہے جنہوں نے اس جاہلیت کو قبول نہیں کیا، بلکہ انکار و منکر سے چلتے آئے۔ پھر ان لوگوں میں اور ذکر ہوئے، ایک وہ جنوں نے کفر کا انکار و کائنات کا راستہ نہیں اختیار کیا جن کو مستشرقین کی اصطلاح میں کافر کہا گیا، دوسرے وہ لوگ جو اپنی باطنی بات اور نیکی و اہل ایمان کی بنا پر بہت بھی ذکر کئے گئے، ضعیف کی آواز اور دلی حقیقت کو صاف طور پر بظاہر کر دیتے، بلکہ کفر اور فریب کی راہ اختیار کی، مسلمانوں سے کہتے کہ ہم مسلمان ہیں، قرآن اور اس کی ہدایت کو مانتے ہیں، جتنا کہ ساتھ ہیں، اور دلوں میں بھی کفر و انکار تھا، انکار کی مجلسوں میں جا کر کہتے کہ ہم تمہارے عقیدے سے تیار و متعلقہ ہیں، مسلمانوں کو دھوکہ دینے اور ان کے دماغ معلوم کرنے کے لئے یہاں سے چلتے ہیں۔

اس پر وہ تمام مستشرقین کی اصطلاح میں منافق ہے، یہ پندرہ آیتیں ہیں جو قرآن کو نہ ماننے والوں کے متعلق نازل ہوئی ہیں، ان میں سے مذکورہ ذکر آیتوں میں چھ کے کاروں کا ذکر ہے، اور آئمہ جو آیتوں میں منافقین کا ذکر اور ان کے متعلق حالات و معاملات اور ان کا انجام مذکور ہے، ان منافقوں کی تفصیل پر بھی ان فقرات سے معلوم ہو گا کہ قرآن مجید نے سورۃ مؤمنون کی ابتدائی بیس آیتوں میں ایک لون قریش کا پتہ دیا، جو وہ قرآن سے اور دوسری طرف تمام اقوام عالم کو کسی جاہلیت کے قبول یا انکار کے معیار سے دو حصوں میں تقسیم کر دیا، ایک جاہلیت ہے جن کو مشرکین و مشرکین کہا جا رہا ہے، دوسرے جاہلیت سے انحراف و انکار کرنے والے جن کا کلمہ یا منافق کہا جا رہا ہے۔

پہلی قسم وہ ہے جن کا راستہ ہے نہ اطلاق الٰہی فی الشک و اعتدال علیہم کو کہا گیا ہے اور دوسری قسم وہ ہے جن کے راستہ ہے غلبۃ الشک و غلبۃ علیہم و کذا العنایۃ، یہی ہونا چاہی ہو۔

مشرقی کریم کہ اس قسم سے ایک اصول سند یہ بھی بیان آیا کہ اقوام عالم کے حضرات اگرچہ ان میں ایسی تقسیم اصول ہی قرار دیا ہو جسے وہ صرف اصول و فطریات ہی کے اعتبار سے نہیں سمجھتے تو

نسب، وطن، زبان، رنگ اور ہنس و فانی حالات ایسی چیزیں ہیں جن کے اشتراک یا اختلاف سے قوموں کے ٹکڑے نہ کئے جاسکتے، مشرق و غرب کریم کا اس بارے میں واضح فیصلہ بھی سورۃ منافقین میں مذکور ہے۔

خلفائکم فیمنکم کما فیمنکم | ایسا نہ ملے کہ سب کو بد کہا، پھر کہ
 و منکم من یستخفون منکم | لوگ ہیں سے ان میں اور کہ کار ہو گئے

ذکر اور صدر روا، ان میں جن خالی نے ان کا فرق کا ذکر فرمایا ہے جو اپنے کفر و انکار میں اندر و خارج یک جہت تھے، اور اس مذکورہ سے وہ کسی جن بدت کو نہ لے کر دلوں و دلوں کو دیکھنے کے لئے بھی تیار نہ تھے، ایسے لوگوں کے بارے میں مشرکین ایسے ہیں کہ ان کو ایک مزا اس میں نظر نہ رہتی تھی، یہ کہ ان کے دلوں پر تہرہ و تہرہ کی بات ہے، کالوں، آنکھوں کو ان وصف کے متحمل کرنے سے ہنسنے لگا رہا تھا، کالی کا حال جن وصف کے بارے میں ایسا ہو چکا ہے کہ گویا نہ ان کی کوئی عقل نہ دیکھنے کے لئے انکھیں دھونے کے لئے نہ تھیں۔

آفر آیت میں ایسے لوگوں کا عذاب عظیم میں مبتلا ہونا ذکر کیا گیا ہے۔

سورۃ نعرہ میں اس کے اطلاق میں چاہا ہے کہ میں، ہر مسکری کو بھی کفر اس لئے کہنے ہیں کہ میں نے کسی اہل ایمان کو چھو یا ہے، اصطلاح شرعی میں جن چیزوں پر ایمان لا کر فرض ہے ان میں سے کسی چیز کے انکار کا نام کفر ہے، شرف ایمان کا نقص ہے کہ رسول کو مسمل، امیر علیہ وسلم کو چھو کر انحراف کی طرف سے ملے ہے اور اس کا ثبوت بھی قریشیوں سے ان سب چیزوں کی رو سے اخذ کیا گیا، اور چون کہ اس بارے میں شخص رسول کی قسم کر لیا، اسلام کی ان تعلیمات میں سے ہیں کہ نبوت یعنی روحانی ہونا، کالی کا بھی حق، یہ کہ اس کی تصدیق مذکورہ وہ کار کرنا ہے گا۔

ایسی باتیں ہیں | لفظ اللہ تعالیٰ ایسی چیز ہے جس سے خود ہی پیدا ہو اور الٰہی شہر ہے کہ کہتے ہیں جس سے صمد پیدا ہوا اور دریاں ہیں اس کا جزو نہ ملے نہ کہا جا سکتا، مگر وہ حقیقت مطلقاً ڈرانے کا لفظ نہیں کہنے، بلکہ ایسا ڈرانا یا خوف و ترس کے ذریعہ دینا اور ان کو آگ سے صائب پہنچانے اور دلوں سے ڈرا دیا ہے، اسی سے پتہ چلا کہ جو دھار و اعلیٰ اس انسان کو دھارنے کے ہیں اس کو انکار اور ان لوگوں کو تہرہ نہیں کہا جا سکتا، عظیم اسلام کو نقص و صحت سے ڈرنا کہ ان کے دھار دیا گیا کہ وہ انرا یا شفت کا شہرہ دینے والے صاحب سے ڈراتے ہیں، ابیہ علیہ السلام کے لئے اس لفظ کو شہرہ کرنے میں اس کی جاہلیت ہے کہ کمالیہ نبی کے لئے ضروری ہے کہ مخاطب کی خیر خواہی کی صورت اور وہی کے غرض کو کرے، اس لئے ایک کلمہ یا دو کلمہ یا تین کلمہ یا چار کلمہ یا پانچ کلمہ یا اس آیت میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل دینے کے لئے یہ بتایا گیا ہے کہ یہ مذہبی اور

يُخَذُّ عَوْنَ اللَّهِ وَالَّذِينَ آمَنُوا هُمْ لَا أَنْفُسُهُمْ وَمَا
دعا بازی کرتے ہیں اللہ سے اور ایمان والوں سے اور دراصل کسی کو دعا نہیں دیتے مگر اپنے آپ کو
يَشْعُرُونَ ﴿١﴾ فِي قُلُوبِهِم مَّرَضٌ فَزَادَهُمُ اللَّهُ مَرَضًا وَلَهُمْ
اور نہیں سمجھتے، ان کے دلوں میں بیماری ہے پھر بڑھادی اللہ نے ان کی بیماری اور ان کیلئے
عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿٢﴾ بِمَا كَانُوا يَكْفُرُونَ ﴿٣﴾ وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوا
عذاب دردناک ہو اس بات پر کہ سمیٹا کہتے تھے ، اور جب کہا جاتا رہا کہ فساد نہ ڈالو
فِي الْأَرْضِ قَالُوا إِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُونَ ﴿٤﴾ أَلَا إِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُونَ
ملک میں تو کہتے ہیں ہم تو اصلاح کرنے والے ہیں ، جان لو وہی ہیں خرابی کرنے والے
وَلَكِنْ لَا يَشْعُرُونَ ﴿٥﴾ وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ امْكُثُوا كَمَا مِنْ النَّاسِ
لیکن نہیں سمجھتے ، اور جب کہا جاتا ہے ان کو ایمان لاؤ جس طرح ایمان لاتے
قَالُوا أَأَتُونَنَا مِنْ الْكِبَارَةِ أَلَا إِنَّهُمْ هُمُ السَّافِهَاءُ وَلَكِنْ
سب لوگ تو کہتے ہیں کیا ہم ایمان لائیں جس طرح ایمان لیا کرتے تھے جان لو وہی ہیں بیوقوف لیکن
لَا يَعْلَمُونَ ﴿٦﴾ وَإِذْ الْقَوْمُ الَّذِينَ آمَنُوا قَالُوا آمِنَّا وَإِذَا خَلَوْا
نہیں جانتے ، اور جب ملاقات کرتے ہیں مسلمانوں کو تو کہتے ہیں ہم ایمان لے آکر ہیں اور جب تنہا
إِلَىٰ شَيْطَانِهِمْ قَالُوا إِنَّا مَعَكُمْ إِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزَءُونَ ﴿٧﴾
ہوتے ہیں اپنے شیطانوں کے پاس تو کہتے ہیں کہ بیشک ہم تمہارے ساتھ ہیں ہم تو ہنسی کرتے ہیں (یعنی مسلمانوں کا)
اللَّهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ وَيَمُدُّهُمْ فِي طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُونَ ﴿٨﴾ أُولَٰئِكَ
اللہ ہنسی کرتا ہو گا ان سے اور ترقی دیتا ہو گا ان کو اکی سرکش ہیں (اور) حالت یہ کہ وہ عقل کے اندر نہیں آتے
الَّذِينَ اسْتَرْوَا الضَّلَالَةَ بِالْهُدَىٰ فَمَا رَبَّتْ تَجَارِعُهُمْ وَمَا
وہی ہیں جنہوں نے مولیٰ گرا ہی ہدایت کے بدلے سونا فتح نہ ہوئی انکی سوداگری اور
كَانُوا مُهْتَدِينَ ﴿٩﴾ مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْقَدَ نَارًا فَلَمَّا
منہوں نے راہ پا لے والے ، ان کی مثال اس شخص کی ہے جو جس نے آگ جلائی پھر جب

<p>اَضَاعَتْ مَا حَوْلَهُ ذَهَبَ اللَّهُ بِنُورِهِمْ وَتَرَكَهُمْ فِي ظُلُمٍ لَا رُشٍ كَرِيهَا اَمَك نے اس کے آس پاس کو تو زائل کر دی اللہ نے انکی روشنی اور چھوڑا ان کو اندھیر میں</p>	
<p>يَبْصُرُونَ ﴿١٥﴾ صُمُّ بَكْمٌ عُمَىٰ قَهُمٌ لَا يَرْجِعُونَ ﴿١٦﴾ اَوْ كَصَيْبٍ مِّنَ السَّمَاءِ فِيهِ ظُلُمٌ اَوْ سَرَعٌ وَسَبَقُ يَجْعَلُونَ اَصَابِعَهُمْ فِي اُذُنِهِمْ مِّنَ الصَّوَاعِقِ حَذَرَ الْمَوْتِ وَاللَّهُ مَعْيِطُ بَاكِفِرِينَ ﴿١٧﴾</p>	
<p>کچھ نہیں دیکھتے ، بہرے ہیں گونگے ہیں اندھے ہیں سورہ نہیں تو میں گے یا انکی مثال ایسی ہر جیسے زور سے دیکھنے پر اور ہر آواز سے سننے پر اور گرج اور بجلی دہکتے ہیں انگلیاں اپنے</p>	
<p>اَذُنِهِمْ مِّنَ الصَّوَاعِقِ حَذَرَ الْمَوْتِ وَاللَّهُ مَعْيِطُ بَاكِفِرِينَ ﴿١٧﴾ کانوں میں مایے کرک کے موت کے ڈر سے اور اللہ احاطہ کرنے والا ہر کافروں کا،</p>	
<p>يَكَادُ الْبَرُّ يُخْطَفُ ابْصَارُهُمْ كُلَّمَا اَصْأَ لَهُمْ نُّورًا فِيهِ تَرِبٌ كَرَجَلِي اُپکے اُن کی آنکھیں ، جب جگمگاتے ہیں اُن پر تو بجنے لگتے ہیں اس کی روشنی میں</p>	
<p>وَإِذَا اُظْلِمَ عَلَيْهِمْ قَامُوا اَدْوَا وَاَوْشَاءَ اللَّهُ لَذَهَبَ بِسَمْعِهِمْ وَاَبْصَارِهِمْ اور جب اندھیرا ہوا ہر تو کھڑے رہ جاتے ہیں اور اگر چاہے اللہ تو بجاتے انکے کان اور آنکھیں</p>	
<p>إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿١٨﴾</p>	
<p>بیشک اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔</p>	

خُلاصَةُ تَقْسِيرِ

اور لوگوں میں بعض ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں ہم ایمان لائے اللہ پر اور آخری دن پر
حالانکہ وہ بالکل ایمان والے نہیں بلکہ چالبازی کرتے ہیں اللہ سے اور ان لوگوں سے جو ایمان
لا چکے ہیں، اور واقع میں کسی کے ساتھ بھی چالبازی نہیں کرتے بجز اپنی ذات کے اور وہ اس کا
شعور نہیں رکھتے (یعنی اس چالبازی کا انجام بد خود اپنے ہی کو بھگتنا پڑے گا) اُن کے دلوں میں
بڑا مرض ہے، سو اور بھی بڑھا دیا اللہ نے اُن کا مرض داس مرض میں اُن کی بد اعتقادی اور اسلام
اور مسلمانوں کی ترقی دیکھ کر حسد میں جلا اور ہر وقت اپنا کفر ظاہر ہو جانے کی فکر و خلیجان سب
داخل ہیں، مسلمانوں کی ترقی سے اُن کا مرض حسد اور بڑھنا واضح ہے، اور انکے لئے سزا ہے دردِ ناک

ہے اس وجہ سے کہ وہ جھوٹ بولا کرتے تھے (یعنی ایمان کا جھوٹا دعویٰ کیا کرتے تھے) اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ فساد مت کرو زمین میں تو کہتے ہیں ہم تو اصلاح ہی کرنے والے ہیں ان کی روشنی روشنی سے جب فتنے فساد واقع ہونے لگے اور کسی غیر خواہنے فساد کی کراہی کا بروقی موجب فساد ہو کر گئی ہے اس کو چھوڑ دو تو اس کے جواب میں یہ اپنے آپ کو بھائے مفسد کے صلہ بتاتے ہیں یعنی اپنے فساد ہی کو اصلاح سمجھتے ہیں) یاد رکھو بے شک یہی لوگ مفسد ہیں لیکن وہ اس کا شعور نہیں رکھتے (یہ تو ان کی جہالت اور غیارت کا بیان ہے کہ اپنے عیب ہی کو گنہگار سمجھتے ہیں) آگے دوسری حیالت کا بیان ہے کہ دوسروں کے گنہگار یعنی ایمان خالص کو عیب اور حقیر سمجھتے ہیں) اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ تم بھی ایسا ہی ایمان لے آؤ جیسا ایمان لائے ہیں اور لوگ تو کہتے ہیں کہ کیا ہم ایمان لادیں گے جیسا ایمان لے آؤ ہیں یہ بوقوف، یاد رکھو کہ جنگ ہی ہیں بوقوف لیکن اس کا علم نہیں رکھتے یہ منافق ایسی کھلی ہوئی بات بظاہر عسریب مسلمانوں کے سامنے کر لیتے ہوں گے جن سے ان کو کوئی اندیشہ نہ تھا، ورد مآ طور پر توروہ اپنے گنہگار کو چھپاتے پھرتے تھے) اور جب ملتے ہیں وہ منافقین ان لوگوں سے جو ایمان لائے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے ہیں اور جب غلو میں پہنچتے ہیں اپنے شریر سرداروں کے پاس تو کہتے ہیں کہ ہم بے شک تمھارے ساتھ ہیں، ہم تو (مسلمانوں سے) صرف استہزاء کیا کرتے ہیں (یعنی ہم مسلمانوں سے بطور تمسخر کہہ دیتے ہیں کہ ہم ایمان لائے ہیں ورنہ ہم تو تمھارے ہم مشرب ہیں، آگے ان کے استہزاء کا جواب ہو کہ اللہ تعالیٰ ہی استہزاء کر رہے ہیں ان کے ساتھ اور ڈھیل دیتے چلے جاتے ہیں ان کو کہ وہ اپنی سرکشی میں جہان دوسر گرداں ہو رہے ہیں (وہ اللہ کا استہزاء ہی ہو کہ ان کو صلت دی جا رہی ہے جب وہ خوب کفر میں کامل ہو جاویں اور مجرم سنگین ہو جاوے اس وقت اچانک پکڑ لئے جاویں گے، چونکہ اللہ تعالیٰ کا یہ فعل ان کے استہزاء کے مقابلہ میں تھا اس لئے اس کو استہزاء کے عنوان سے تعبیر کر دیا گیا) یہ وہ لوگ ہیں کہ انھوں نے گمراہی لے لی بجائے ہدایت کے تو نفع بخش نہ ہوئی ان کی یہ تجارت اور نہ یہ ٹھیک طریقہ پر چلے (یعنی ان کو تجارت کا سلیقہ نہ ہوا کہ ہدایت جیسی قیمتی چیز کے بدلہ میں گمراہی لے لی) ان کی حالت اس شخص کی حالت کے مشابہ ہو جس نے کہیں آگ جلائی ہو پھر جب روشن کر دیا ہو اس آگ نے اس شخص کے گرد اگر دکی سب چیزوں کو ایسی حالت میں سلب کر دیا ہو اللہ تعالیٰ نے ان کی روشنی کو اور چھوڑ دیا ہوا ان کو اندھیروں میں کہ کچھ دیکھتے بھالنے نہ ہوں، تو جس طرح یہ شخص اور اس کے ساتھی روشنی کے بعد اندھیرے میں رہ گئے اسی طرح منافقین حق واضح ہو کر سامنے آجائے کے بعد گمراہی کے اندھیرے میں جا پھنسے اور جس طرح آگ جلانے

دالوں کی آنکھ کان، زبان، اندھیرے میں بیکار ہو گئے، اسی طرح گمراہی کے اندھیرے میں پھنس کر ان کی یہ حالت ہو گئی کہ گویا وہ) پہرے میں گھومتے ہیں، اندھے ہیں سو یہ اب رجوع نہ ہوں گے، رکھ ان کے حواس حق کو دیکھنے سننے سمجھنے کے قابل نہ رہیں یہ مثال تو ان منافقین کی تھی جو خود دل کھول کر کھنڈ پر جے ہوئے ہیں، کبھی ایمان کا دھیان بھی دل میں نہیں آتا، آگے منافقین کے اس گردہ کی مثال ہے جو فی الواقع تردد میں تھے، کبھی کبھی اسلام کی حقانیت دیکھ کر اس کی طرف متوجہ ہونے لگتے، پھر جب اغراض نفسانی کا غلبہ ہوتا تو یہ متبطلان بدل جاتا تھا، یا ان منافقوں کی ایسی مثال ہے جیسے انسان کی طرف سے بارش ہو اس میں اندھیری بھی ہو اور برق بھی ہو چو لوگ اس بارش میں مل رہے ہیں وہ ٹھونسے لیتے ہیں اپنی انگلیاں اپنے کانوں میں کرکٹ کے سبب اندیشہ موت سے، اور اللہ تعالیٰ احاطہ میں لے ہوئے ہو کافروں کو، برق کی یہ حالت ہو کہ معلوم ہوتا ہے کہ ابھی ان کی بنائے اس نے لی جہاں ذرا ان کو بجلی کی چمک ہوئی تو اس کی روشنی میں چلنا شروع کر دیا، اور جب ان پر تاریکی ہوئی پھر کھڑے کے کھڑے رہ گئے، اور اگر اللہ تعالیٰ ارادہ کرتے تو ان کے کان اور آنکھ سب سلب کر لیتے بلاشبہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہیں (تو جس طرح یہ لوگ کبھی طوفان باد و باران میں کبھی چلنے سے رہ جاتے ہیں کبھی موقیع پا کر آگے چلنے لگتے ہیں یہی حال ان متردد منافقین کا ہے) ۴

معارف مسائل

جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ سورۃ بقرہ کے شروع میں ریلے آیات قرآن کریم کا شک و شبہ سے بالاتر ہونا بیان کرنے کے بعد بتائیں آیتوں میں اس کے ماننے والوں اور نہ ماننے والوں کے حالات کا ذکر کیا گیا ہے، اول پانچ آیتوں میں ماننے والوں کا تذکرہ متقین کے عنوان سے ہے، پھر دو آیتوں میں ایسے ماننے والوں کا ذکر ہے جو کھلے طور پر قرآن کا معاندانہ انکار کرتے تھے، ان تیرہ آیتوں میں ایسے منکرین و کفار کا ذکر ہے جو ظاہر میں اپنے آپ کو مؤمن مسلمان کہتے تھے، مگر حقیقت میں مؤمن نہ تھے، ان لوگوں کا نام قرآن میں منافقین رکھا گیا کہ مذکورہ بالا آیات میں پہلی دو آیتوں میں منافقین کے متعلق فرمایا کہ لوگوں میں لیکن ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے اللہ پر حالانکہ وہ بالکل ایمان والے نہیں بلکہ وہ چالبازی کرتے ہیں اللہ سے اور ان لوگوں سے برائیاں لایچے ہیں، اور واقع میں کسی کے ساتھ بھی چالبازی نہیں کرتے بجز اپنی ذات کے، اور وہ اس کا شعور نہیں رکھتے ۴

اس میں ان کے دعویٰ ایمان کو غلط اور جھوٹ قرار دیا گیا، اور یہ کہ ان کا یہ دعویٰ محض فریب ہے

اس کا ذائقہ بھی چکھا، اور کفر میں تو پہلے سے مستلک ہی تھے، پھر کفر و اسلام دونوں کو دیکھنے بچنے کے بعد انہوں نے اپنی ذلیل دنیاوی اغراض کی خاطر اسلام کے بدلے کفر ہی کو ترجیح دی، ان کے اس عمل کو مسترآن کریم نے تجارت (بیوپار) کا نام دے کر یہ بتلایا کہ ان لوگوں کو بیوپار کا بھی سلیقہ نہ آیا، کہ بہترین قیمتی چیزیں یعنی ایمان دے کر دوسری اور بخلیت چیزیں کفر خرید لیا۔

آخر میں چار آیتوں میں منافقین کے حال کی دو مثالیں دے کر اس کا قابل نفرت ہونا بیان فرمایا گیا، دو مثالیں اس بناء پر دی گئیں کہ منافقین میں دو طرح کے آدمی تھے، ایک وہ جو اپنے کفر میں بالکل پختہ تھے، ایمان کا اظہار صرف دنیوی مصلحت کی وجہ سے کرتے تھے، ایمان و اسلام سے ان کو کوئی واسطہ نہ تھا، دوسرے کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو اسلام کی حقانیت سے متاثر ہو کر کبھی کبھی سچے مسلمان ہونے کا ارادہ بھی کر لیتے تھے، مگر پھر دنیوی اغراض سامنے آکر ان کو اس ارادہ سے روک دیتی تھیں، اسی طرح وہ ایک تذبذب اور تردد کے حال میں رہتے۔

اسی مضمون کے ضمن میں ان ظالموں کو یہ تنبیہ بھی کر دی گئی کہ وہ سب کے سب اللہ تعالیٰ کے احاطہ قدرت سے باہر نہیں، ہر وقت ہر حال میں ہلاک بھی کر سکتے ہیں، اور بینائی و شنوائی کی طاقتیں بھی سلب کر سکتے ہیں۔

یہ تیسری آیتیں منافقین کے حال و مثال پر مشتمل ہیں، ان میں بہت سے احکام و مسائل اور اہم ہدایات بھی ہیں۔

درا کیا کفر و نفاق جہد نبوی کے ساتھ اس معاملہ میں صحیح یہ ہے کہ منافق کے نفاق کو پہچانتا اور اس کو منافق مخصوص تھا، اب بھی موجود ہو؟ مسترآر دینا دو طریقوں سے ہوتا تھا، ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو بذریعہ وحی بتلادیا کہ فلاں شخص دل سے مسلمان نہیں منافق ہے، دوسرے یہ کہ اُس کے کسی قول و فعل سے کبھی عقیدہ اسلام کے خلاف کوئی بات یا اسلام کی مخالفت کا کوئی عمل ظاہر اور ثابت ہو جائے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد انقطاع وحی کے سبب ان کے سچانے کی پہلی صورت قربانی نہ رہی، مگر دوسری صورت اب بھی موجود ہے، جس شخص کے کسی قول و فعل سے اسلامی قلع و عمارت کی مخالفت یا ان پر استہزاء یا تحریف ثابت ہو جائے، مگر وہ اپنے ایمان و اسلام کا مدعی ہے تو وہ منافق سمجھا جائے گا، ایسے منافق کا نام مسترآن کی اصطلاح میں ملکہ ہے، **الَّذِينَ يُبَدِّلُونَ دِينَهُمْ** آیتاً ۱۲۶ اور حدیث میں اُس کو زندقہ کے نام سے موسوم کیا گیا ہے، مگر چونکہ اس کا کفر و میل سے ثابت اور واضح ہو گیا، اس لئے اس کا حکم سب کفار جیسا ہو گیا، الگ کوئی حکم اس کا نہیں ہے، اسی لئے علماء اہل سنت نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد منافقین کا قضیہ ختم ہو گیا، اب جو تو من نہیں وہ کافر کہلائے گا۔

حضرت امام مالک سے عمدہ شرح بخاری میں نقل کیا گیا ہے کہ بعد زمانہ نبوت کے نفاق کی یہی صورت ہے جس کو پہچانا جاسکتا ہے، اور ایسا کرنے والے کو منافق کہا جاسکتا ہے۔

(۲) ایمان و کفر کی حقیقت آیات مذکورہ میں غور کرنے سے ایمان و اسلام کی پوری حقیقت واضح ہو جاتی ہے، اور اس کے بالمقابل کفر کی بھی، کیونکہ ان آیات میں منافقین کی طرف ایمان کا دعویٰ **اٰمَنَّا بِاللّٰهِ** میں، اور قرآن کریم کی طرف سے ان کے اس دعوے کا غلط ہونا و **مَآ هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ** میں ذکر کیا گیا ہے، یہاں حسد بائیں غور طلب ہیں۔

اڈول یہ کہ جن منافقین کا حال قرآن کریم میں بیان فرمایا گیا ہے وہ اصل میں یہودی تھے، اور اللہ تعالیٰ اور روز قیامت پر ایمان لانا یہود کے مذہب میں بھی ثابت اور مسلم ہو، اور جو چیسز ان کے عقیدہ میں نہیں تھی یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت و نبوت کو ماننا اور آپ پر ایمان لانا اس کو انہوں نے اپنے بیان میں ذکر نہیں کیا، بلکہ صرف دو چیزیں ذکر کیں، ایمان باللہ، ایمان بالیوم الآخر، جس میں ان کو جھوٹا نہیں کہا جاسکتا، پھر قرآن کریم میں ان کو جھوٹا قرار دینا اور ان کے ایمان کا انکار کرنا کس بنا پر ہے! بات یہ ہے کہ کسی نہ کسی طرح اپنی من مانی صورتوں میں خدا تعالیٰ یا آخرت کا اقرار کر لینا ایمان نہیں، یوں تو مشرکین بھی کسی نہ کسی انداز سے اللہ تعالیٰ کو مانتے ہیں اور سب بڑا قادر مطلق مانتے ہیں اور مشرکین ہندوستان تو پرتو کا نام دے کر قیامت کا ایک نمونہ بھی تسلیم کرتے ہیں، مگر قرآن کی نظر میں یہ ایمان نہیں، بلکہ صرف وہ ایمان سبتر ہے جو اس کی بتلانی ہوئی تمام صفات کے ساتھ ہو، اور آخرت پر ایمان وہ معتبر ہے جو قرآن کریم اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بتلائے ہوئے حالات و احصاء کے ساتھ ہو۔

ظاہر ہے کہ یہود اس معنی کے اعتبار سے نہ اللہ پر ایمان رکھتے ہیں نہ آخرت پر، کیونکہ ایک طرف تو وہ حضرت عزیر علیہ السلام کو خدا کا بیٹا قرار دیتے ہیں، اور آخرت کے معاملہ میں بھی یہ غلط اعتقاد رکھتے ہیں کہ انبیاء کی اولاد کچھ بھی کرتی رہے وہ بہر حال اللہ تعالیٰ کی محبوب ہوا، ان سے آخرت میں کوئی باز پرس ہوگی اور کچھ عذاب ہو ابھی تو بہت معمول ہوگا، اس لئے قرآنی اصطلاح کے اعتبار سے ان کا یہ کہنا کہ ہم اللہ اور روز قیامت پر ایمان لائے ہیں غلط اور بھوٹ ہوا۔

(۳) کفر و ایمان کا ضابطہ قرآن کی اصطلاح میں ایمان وہ ہے جس کا ذکر ادر سورہ بقرہ کی تیسری آیت میں کیا **وَرُوْاۤ اِلَیْهِنَّ لَھُمْ اٰیٰتُہُمْ اَوْھٰتُہُنَّ اَلْاٰیٰتُ**، جس سے معلوم ہوا کہ ایمان کا دعویٰ صحیح یا غلط کے جانچنے کا معیار صحابہ کرام کا ایمان ہے، جو اس کے مطابق نہیں وہ اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک ایمان نہیں۔

اگر کوئی شخص مسترآنی عقیدہ کا مضمون قرآنی تصریح یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریح

کے خلاف قرار دے کر یہ کہے کہ میں تو اس عقیدہ کو ماننا شروع نہیں، جیسا کہ آجکل قادیانی گردہ کہتا ہے کہ ہم بھی عقیدہ ختم نبوت کو مانتے ہیں، مگر اس عقیدہ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تصریحات اور صحابہ کرام کے ایمان سے بالکل مخالفت شریعت کرتے ہیں، مرزا غلام احمد کی نبوت کیلئے جگہ نکالتے ہیں، قرآن کریم کی اس تصریح کے مطابق وہ اسی کے مستحق ہیں کہ ان کو **مُتَافِئُونَ مِثْلُ شَيْءٍ** کہا جائے، یعنی وہ ہرگز مؤمن نہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ ایمان صحابہ کے خلاف کوئی شخص کسی عقیدہ کا نیا مفہوم بنائے، اور اس عقیدہ کا پابند ہونے کی وجہ سے اپنے آپ کو مؤمن مسلمان بتلائے اور مسلمانوں کے نماز و زکوٰۃ میں شریک بھی ہوا مگر جب تک وہ قرآن کے اس بتلائے ہوئے معیار کے مطابق ایمان نہیں لائے گا، اس وقت تک کہ قرآن کی اصطلاح میں مؤمن نہیں کہلائے گا۔

ایک شبہ کا ازالہ | حدیث و فقہ کا یہ مشہور مقولہ کہ ”اہل قبلہ کو کافر نہیں کہا جاسکتا“ اس کا مطلب بھی آیت مذکورہ کے تحت میں یہ متنبہ ہو گیا کہ اہل قبلہ سے مراد صرف وہ لوگ ہیں جو ضروریات دین میں سے کسی چیز کے منکر نہیں، ورنہ یہ منافقین بھی تو قبلہ کی طرف سب مسلمانوں کی طرح نماز پڑھتے تھے، مگر یہ صرف رد بقبلہ نماز پڑھنا ان کے ایمان کے لئے اس بنا پر کافی نہ ہو کہ ان کا ایمان صحابہ کرام کی طرح تمام ضروریات دین پر نہیں تھا۔

۴۴ جھوٹ لکھ گھنائونی چیز ہے | یہاں منافقین کے قول **اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ** میں غور کیجئے کہ یہ لوگ پرلے درجے کے کافر ہونے کے باوجود اپنی دانت میں جھوٹ بولنے سے اجتناب کرتے ہیں، کیونکہ دعویٰ ایمان کے لئے صرف اللہ اور روز قیامت پر ایمان کا ذکر کرتے ہیں، ایمان ان کے رسول کا ذکر اس لئے نہیں کرتے کہ جھوٹ نہ ہو جائے، اس سے معلوم ہوا کہ جھوٹ ایسی گندمی اور گھنائونی چیز ہے کہ کوئی شریعت آدمی خواہ کافر فاسق ہو جھوٹ بولنا پسند نہیں کرتا۔

یہ دوسری بات ہے کہ ان کا دعویٰ ایمان باطل و باہوم الآخر بھی مشرانی اصطلاح کے خلاف ہونے کی وجہ سے نتیجہ جھوٹ ثابت ہوا۔

۴۵ ایمان وادیان کے ساتھ براسلوک کرنا | آیت مذکورہ میں منافقین کا ایک مال یہ بتلایا ہے **يَخَادِعُونَ** اللہ تعالیٰ کے ساتھ بُرائی کرتا ہے | اللہ یعنی یہ لوگ اللہ تعالیٰ کو دھوکہ دینا چاہتے ہیں اور اس کے ساتھ چال بازی کرتے ہیں، حالانکہ گردہ منافقین میں شاید کوئی بھی ایسا نہ ہو جو اللہ تعالیٰ کو دھوکہ دینے کا قصد رکھتا ہو، یا یہ سمجھتا ہو کہ وہ اللہ تعالیٰ کو فریب دے سکتا ہے، بلکہ حقیقت یہ تھی کہ یہ لوگ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور مؤمنین کو دھوکہ دینے کے قصد سے شیعہ حرکتیں کرتے تھے، اللہ تعالیٰ نے آیت مذکورہ میں اس کو اللہ کو دھوکہ دینا مشراردے کر یہ بتلادیا کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کے کسی رسول یا ولی کے ساتھ

کوئی بُرا معاملہ کرتا ہے وہ درحقیقت اللہ تعالیٰ ہی کے ساتھ ایسا معاملہ کرنے کے حکم میں ہے، دوسری طرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رفعت شان کی طرف بھی اشارہ کر دیا گیا کہ آپ کی شان میں کوئی گستاخی کرنا ایسا ہی جرم ہے جیسا اللہ جل شانہ کی شان میں گستاخی جرم ہے۔

۱۶ جھوٹ بولنے کا وبال | آیات مذکورہ میں منافقین کے عذاب الیم کی وجہ بتلایا گیا **اَيُّكُنْ بِكُوفٍ** یعنی اُن کے جھوٹ بولنے کو قرار دیا ہے، حالانکہ ان کے کفر و نفاق کا جرم سب سے بڑا تھا، اور دوسرے جرائم مسلمانوں سے حسد اُن کے خلاف سازشیں بھی بڑے جرائم تھے، مگر عذاب الیم کا سبب ان کے جھوٹ بولنے کو قرار دیا، اس میں یہ اشارہ پایا جاتا ہے کہ جھوٹ بولنے کی عادت ان کا اصلی جرم تھا، اسی بُری عادت نے اُن کو کفر و نفاق تک پہنچا دیا تھا، اس لئے جرم کی حیثیت اگرچہ کفر و نفاق کی بڑی ہوئی ہے مگر ان سب خرابیوں کی جبر اور بنیاد جھوٹ بولنا ہے، اسی لئے قرآن کریم نے جھوٹ بولنے کو بُت پرستی کے ساتھ جوڑ کر اس طرح ارشاد فرمایا ہے:

فَاَجْتَنِبُوا الزِّيْفَ مِنَ الْاَدْوَانِ | یعنی بچو بہت پرستی کی خواہش سے اور بچو
وَاَجْتَنِبُوا قَوْلَ الزُّوْرِ (۳۰-۳۲) | جھوٹ بولنے سے ۵

۴۶ اصلاح و فساد کی تعریف | آیات مذکورہ میں گزر چکا ہے کہ جب کوئی ان منافقین سے یہ کہتا کہ اپنی نفاق اور مصلح و مفید کی پہچان کے ذریعہ زمین میں فساد پھیلاؤ تو وہ بڑے زور اور تاکید سے کہتے تھے **اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُونَ** اس میں لفظ **اِنَّمَا** جو حصراً و انحصار کے لئے بولا جاتا ہے اس کی وجہ سے معنی اس جملہ کے یہ ہیں کہ ہم تو مصلح ہی ہیں، لیکن ہمارے کسی عمل کا فساد سے کوئی واسطہ نہیں، مگر قرآن کریم نے اُن کے جواب میں فرمایا **اَلَا اِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُونَ وَلٰكِنْ لَا يَشْعُرُونَ**، یعنی یاد رکھو کہ یہی لوگ مفسد ہی ہیں مگر ان کو اس کا شعور نہیں۔

اس پر آدمیوں میں معلوم ہوئے، ایک یہ کہ منافقین کی حرکات حقیقتہً زمین میں فتنہ و فساد پھیلانے کا سبب تھیں، دوسری بات یہ کہ منافقین فتنہ و فساد پھیلانے کی نیت اور قصد سے یہ کام نہ کرتے تھے بلکہ ان کو معلوم بھی نہ تھا کہ اس کا نتیجہ فتنہ و فساد ہے، جیسا کہ مشرانی کی تصریح **وَلٰكِنْ لَا يَشْعُرُونَ** سے معلوم ہوتا ہے۔

وجہ یہ ہے کہ زمین میں فتنہ و فساد جن چیزوں سے پھیلتا ہے اُن میں کچھ تو ایسی چیزیں ہیں جن کو ہر شخص فتنہ و فساد سمجھتا ہے، جیسے قتل، غارتگری، چوری، دھوکہ، فریب، اغواء، بدکاری وغیرہ ہر بھدار آدمی ان کو فتنہ و فساد سمجھتا ہے، اور ہر شریعت آدمی ان سے بچتا ہے، اور کچھ چیزیں ایسی بھی ہیں جو اپنی ظاہری سطح کے اعتبار سے کوئی فتنہ و فساد نہیں ہوتیں، مگر اُن کی وجہ سے انسانوں کے اخلاق پر باؤ ہوتے ہیں، اور انسانوں کی احسن لائق گراؤٹ سائے فتنوں اور فسادوں کے دروازے کھول دیتی

ہے، ان منافقین کا بھی یہی حال تھا کہ چوری، ڈاکہ، بدکاری وغیرہ سے بچتے تھے، اسی لئے بڑی زور سے اپنے مفید ہونے کا انکار اور صلح ہونے کا اثبات کیا۔

مگر ففاق اور کینہ و حسد اور اس کے ماتحت دشمنوں سے سازشیں یہ چیزیں انسان کے اخلاق کو ایسا تباہ کر دیتی ہیں کہ انسان بہت سے حیوانوں کی سطح سے بھی نیچے آ جاتا ہے، اور ایسے کام کرنے پر اُتر آتا ہے جو کبھی کسی پھلے مانس سے متصور نہیں ہوتے، اور جب انسان اپنے انسانی اخلاق کو ہٹا دیتا تو انسانی زندگی کے ہر شعبہ میں فساد ہی فساد آ جاتا ہے، فساد بھی ایسا عظیم جو نہ درندے جانوروں سے متوقع ہے نہ ڈاکوؤں اور چوروں سے، کیونکہ ان کے فساد کو قانون اور حکومت کی طاقت سے روکا جاسکتا ہے، مگر قانون تو انسان ہی جاری کرتے ہیں، جب انسان انسان نہ رہا تو قانون کی جوگت بننے لگی اس کا تماشا آج کل کی آنکھوں پر شخص ہر جگہ اور ہر وارہ میں دیکھتا ہے، آج دنیا کا تمدن مرنے کی پذیر ہے، تعلیم و تعلم کے اور دنیا کا جال بگاڑوں گاؤں تک پھیلا ہوا ہے، تہذیب و تہذیب کے الفاظ ہر شخص کی زبان پر ہیں، قانون سازی کی مجلسوں کا بازار گرم ہے، تنفیذ قانون کے بے شمار ادارے اربوں روپے کے خرچ سے قائم ہیں، دفتری انتظامات کی بھول بھالیاں ہیں، مگر جرائم اور فتنے فساد روز بروز بڑھتے ہی جاتے ہیں، وجہ اس کے سرا نہیں کہ کوئی قانون خود کار نہیں ہوتا، بلکہ اس کو انسان چلاتے ہیں، جب انسان اپنی انسانیت کو ہٹا دیتا تو پھر اس فساد کا علاج نہ قانون سے ہو سکتا ہے نہ حکومت اور محکموں کے چکر سے، اسی لئے انسان کے عظیم ترین محسن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی تمام تر توجہ اس پر مرکوز فرمائی ہے کہ انسان کو صحیح معنی میں انسان بنادیں، تو پھر فساد و جبرائیم خود بخود ختم ہو جاتے ہیں، نہ پولیس کی زیادہ ضرورت رہتی ہے نہ عدالتوں کے اس پھیلاؤ کی جو دنیا میں پایا جاتا ہے، اور جب تک دنیا کے جس حصہ میں آپ کی تعلیم و ہدایت پر عمل ہوتا رہا دنیا نے وہ امن و امان دیکھا جس کی نظیر نہ پہلے کبھی دیکھی گئی نہ ان تعلیمات کو چھوڑنے کے بعد متوقع ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات پر عمل کی روح ہے اللہ تعالیٰ کا خوف، اور قیامت کے حساب کتاب کی فکر، اس کے بغیر کوئی قانون و دستور اور کوئی محکمہ اور کوئی مدرسہ اور یونیورسٹی انسان کو جبرائیم سے باز رکھنے پر مجبور نہیں کر سکتی۔

آج کی دنیا میں جن لوگوں کے ہاتھ میں خستہ پار کی باگ کردہ جرائیم کے اسداد کے لئے نئے نئے انتظام کو تو سوچتے ہیں، مگر اس رُوح انتظام یعنی خوفِ خدا سے نہ صرف غفلت برتتے ہیں بلکہ اس کو فنا کرنے کے اسباب ہتھیار کرتے ہیں، جس کا لازمی نتیجہ ہمیشہ یہی سامنے آتا رہتا ہے کہ

مرض بڑھتا گیا جوں جوں رد اکی

کھلے طور پر فساد مچانے والے چوروں، غارت گردوں کا علاج سہل ہے، مگر ان انسانیت فراموش

انسانوں کا فساد ہمیشہ ہر رنگ اصلاح ہوتا ہے، وہ کوئی دلچسپ لغزب اصلاحی اسکیم بھی بنا رکھ لیتے ہیں، اور خاص ذاتی اغراض فاسدہ کو اصلاح کا رنگ دے کر (فَسَادَاتُخُنْ مُصْلِحِيخُونْ کے نعرے لگاتے رہتے ہیں، اسی لئے حق تعالیٰ سبحانہ نے جہاں فساد سے روکا ہے اس کے ساتھ ہی یہ بھی فرمادیا وَ اللّٰهُ يَعْلَمُ الْمُنْفِذَ مِنَ الْمُصْلِحِ (۲۲۰:۱۲)، یعنی اللہ تعالیٰ ہی جانتے ہیں کہ مفید کون ہو اور مصلح کون؟ جس میں اشارہ فرمایا کہ فساد و اصلاح کی اصل حقیقت حق تعالیٰ ہی جانتے ہیں جو دلوں کے حال اور نینوں سے بھی واقف ہیں، اور ہر عمل کے خواص و نتائج کو بھی جانتے ہیں کہ اس کا نتیجہ صلاح ہوگا یا فساد، اس لئے اصلاح کے لئے صرف نیک اصلاح کافی نہیں، بلکہ عمل کا رخ بھی شریعت کے مطابق صحیح ہونا ضروری ہے، بعض اوقات کوئی عمل پوری نیک نیتی اور اصلاح کے قصد سے کیا جاتا ہے مگر اس کا اثر فساد و فتنہ ہوتا ہے۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ وَالَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ

اے لوگو! بندگی کرو اپنے رب کی جس نے پیدا کیا تم کو اور ان کو جو تم سے پہلے

تعلّمكم تَتَّقُونَ ۝ الَّذِي جَعَلَ لَكُمْ الْأَرْضَ فِرَاشًا وَالسَّمَاءَ

تمہیں تاکہ تم پر ہیز گار بن جاؤ، جس نے بنایا واسطے تمہارے زمین کو بھونکا اور آسمان کو

بِنَاءً ۝ وَأَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَخْرَجَ بِهِ مِنَ الثَّمَرَاتِ رِزْقًا

بھست اور انکار آسمان سے پانی پھر نکالے اس سے میرے تمہارے کھالے

لَكُمْ ۝ فَلَا تَجْعَلُوا لِلّٰهِ أَدَادًا وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ ۝

کے واسطے سو نہ ٹھہراؤ کسی کو اللہ کے مقابل اور تم تو جانتے ہو

خلاصہ تفسیر

اے لوگو! عبادت اختیار کرو اپنے پروردگار کی جس نے تم کو پیدا کیا اور ان لوگوں کو بھی جو تم سے پہلے گزر چکے ہیں، جب نہیں کہ تم دوزخ سے بچ جاؤ، شاہی محاورہ میں عجب نہیں کا لفظ وعدہ کے موقع پر بولا جاتا ہے، وہ ذات پاک ایسی ہے جس نے بنایا تمہارے لئے زمین کو فرش اور آسمان کو چھت اور برسایا آسمان سے پانی، پھر پردہ عدم سے نکالا بذریعہ اس پانی کے پھلوں سے غذا کو تم لوگوں کے واسطے، اب تو مت ٹھہراؤ اللہ پاک کے مقابل اور تم تو جانتے ہو جتنے ہوا (یعنی یہ جانتے ہو کہ یہ تمام تصرفات خدا تعالیٰ کے سوا کوئی کرنے والا نہیں، پھر خدا کے مقابل میں دوسری چیزوں کو معبود بنانا کیسے درست ہو سکتا ہے)۔

معارف و مسائل

رابط آیات | سورۃ بقرہ کی دوسری آیت میں اُس دعا و درخواست کا جواب تھا جو سورۃ فاتحہ میں آئی ہے، یعنی اِلهِنا الذی لا اِلٰہَ اِلاَّ اَنْتَ یٰحَیُّ یَاقَیُّوْمُ جو صراطِ مستقیم تم طلب کرتے ہو وہ اس کتاب میں ہے، کیونکہ قرآن کریم اول سے آخر تک صراطِ مستقیم ہی کی تشریح ہے۔ اس کے بعد مسترآنی ہدایات کو قبول کرنے اور نہ کرنے کے اعتبار سے انسان کے تین گروہ بیان کیا گیا، پہلی تین آیات میں مؤمنین متعین کا ذکر ہوا، جنہوں نے ہدایات قرآنی کو اپنا نصب العین بنالیا، بعد کی دو آیتوں میں اُس گروہ کا ذکر کیا جس نے ٹھٹھے طور پر اُس ہدایت کی مخالفت کی، اس کے بعد تیسرے آیتوں میں اُس خطرناک گروہ کے حالات بیان کئے گئے جو حقیقت میں قرآنی ہدایات کے مخالفت تھے، مگر دنیا کی ذلیل اغراض یا مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کے خیال سے اپنے کفر و مخالفت کو چھپا کر مسلمانوں میں شامل رہتے اور اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کرتے۔

اس طرح سورۃ بقرہ کی ابتدائی تین آیتوں میں ہدایت کے قبول کرنے اور نہ کرنے کے معیار پر عمل انسانوں کو تین گروہوں میں بانٹ دیا گیا، جس میں اس طرف بھی اشارہ پایا گیا کہ انسانوں کی گروہی اور قومی تقسیم نسب اور وطن یا زبان اور رنگ کی بنیادوں پر معقول نہیں، بلکہ اس کی صحیح تقسیم نہیب کی بنیاد پر ہو، کہ اللہ تعالیٰ اور اس کی ہدایات کو ماننے والے ایک قوم اور نہ ماننے والے دوسری قوم جن کو سورۃ مجادلہ میں حزب اللہ اور حزب الشیطان کا نام دیا گیا۔

غرض سورۃ بقرہ کی ابتدائی تین آیتوں میں مسترآنی ہدایات کو ماننے یا نہ ماننے کی بنیاد پر انسان کو تین قوموں میں تقسیم کر کے ہر ایک کا کچھ حال بیان فرمایا گیا۔

اس کے بعد مذکورہ اکیسویں اور بائیسویں آیتوں میں تینوں گروہوں کو خطاب کر کے وہ دعوت پیش کی گئی ہے جس کے لئے قرآن نازل ہوا، اس میں مخلوق پرستی سے باز آنے اور ایک خدا کی عبادت کرنے کی طرف دعوت ایسے انداز سے دی گئی ہے، کہ اس میں خود کے ساتھ اس کے واضح دلائل بھی موجود ہیں، جن میں ادنیٰ سمجھ بوجھ والا انسان بھی ذرا سا غور کرے تو توحید کے اقرار پر مجبور ہو جائے۔

پہلی آیت میں یٰٰٓاَيُّهَا النَّاسُ سے خطاب شروع ہوا، لفظ النَّاسُ عسریٰ زبان میں مطلق انسان کے معنی میں آتا ہے، اس لئے مذکورہ تینوں گروہ اس میں داخل ہیں، جن کو مخاطب کر کے ارشاد فرمایا اَعْبُدُوْا رَبَّکُمْ، عبادت اُسے، معنی میں اپنی پوری طاقت و کسب و کار منسوب کرنا، اور خوف و عظمت کے پیش نظر نامستزائی سے دور رہنا و مرجع البیان

ص ۳، ج ۱، اور لفظ رب کے معنی پر دروگاہ کے ہیں، جس کی پوری تشریح پہلے گذر چکی ہے، ترجمہ یہ ہوا کہ "عبادت کرو اپنے رب کی"

یہاں پر لفظ رب کی جگہ لفظ "اللہ" یا "اسما جسنی" میں سے کوئی اور نام بھی لایا جاسکتا تھا، مگر ان میں سے اس جگہ لفظ رب کا انتخاب کرنے میں یہ حکمت ہو کہ اس مختصر سے جملے میں دعوے کے ساتھ دلیل بھی آگئی، کیونکہ عبادت کی مستحق صرف وہ ذات ہو سکتی ہے جو انسان کی پرورش کی کفیل ہو، جو اس کو ایک نقطہ سے تدریجی تربیت کے ساتھ ایک بھلا چنگا، جمیع و بصیر، عقل و ادراک والا مہر انسان بنادے، اور اس کی بقا و ارتقاء کے وسائل ہیا کرے۔

اور یہ ظاہر ہے کہ انسان کتنا ہی جاہل ہو، اور اپنی بصیرت کو ہر باور چکا ہو، جب بھی ذرا غور کرے گا تو اس کا یقین کرنے پر، اُسے ہرگز تامل نہیں ہو گا، کہ یہ شان ربوبیت بجز حق تعالیٰ کے اور کسی میں نہیں، اور انسان پر یہ تربیاتی انعامات نہ کسی پتھر کے تراشے ہوئے بٹ نے کئے ہیں اور نہ کسی اور مخلوق نے، اور وہ کیسے کرتے جب کہ وہ سب خود اپنے وجود اور بقا میں اُس ذات واجبہ و لازمہ کے محتاج ہیں، ایک محتاج دوسرے محتاج کی کیا حاجت دوائی کر سکتا ہے؟ اور اگر ظاہری طور پر کر بھی تو وہ بھی درحقیقت اُس ذات کی تربیت ہوگی، جس کی طرف یہ دونوں محتاج ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ اس جگہ لفظ رب "لا کر یہ واضح کر دیا گیا کہ جس ذات کی عبادت کی طرف دعوت دی گئی ہے، اس کے سوا کوئی دوسری بتی عبادت کی مستحق ہو ہی نہیں سکتی۔

اس جملہ میں انسانوں کے تینوں گروہوں کو خطاب ہے، اور ہر مخاطب کیلئے اس جملہ کا سنی و مطلب جدا ہو، مثلاً جب کہا گیا کہ اپنے رب کی عبادت کرو، تو کفار کے لئے اس خطاب کے معنی یہ ہوتے کہ مخلوق پرستی چھوڑ کر توحید اختیار کرو، اور منافقین کے لئے اس کے یہ معنی ہوتے کہ لفاظی چھوڑ کر اخلاص پیدا کرو، گناہگار مسلمانوں کے لئے یہ معنی ہوتے کہ گناہ سے باز آؤ اور کامل اطاعت اختیار کرو، اور متقی مسلمانوں کے لئے اس جملہ کے یہ معنی ہوتے کہ اپنی طاعت و عبادت پر ہمیشہ قائم رہو، اور اس میں ترقی کی کوشش کرو (روح البیان)

اس کے بعد رب کی چند صفات خاصہ کا ذکر کر کے اس مضمون کی مزید توضیح مستزادی گئی، ارشاد ہوتا ہے اَلَّذِیْ خَلَقَکُمْ وَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ فِیْ سَمٰوٰتٍ وَّ اَرْضٍ وَّ دُغَارٍ وَّ هٰی جِسْمٌ یَّسِّرُ لَکُمُ السَّبِيْلَ وَّ یُعِیْذُکُمْ مِنَ الْغَاسِقِ اِذَا رَجَعْتَ اِلَیْہِمْ فَاَنْتَ لَدَیْہِمْ اَعْبُدُوْا رَبَّکُمْ اِنَّکُمْ اِلَیْہِ رَاجِعُونَ، اس میں رب کی وہ صفات بتلائی گئی جو اللہ جل شانہ کے سوا کسی مخلوق میں پائے جاسکے، کہ کسی کو وہم و گمان بھی نہیں ہو سکتا، کہ نیست سے ہست اور نابود سے بود کرنا، پھر بطن مادر کی تاریکیوں اور گندگیوں میں ایسا جبین و جلیل، پاک و صاف انسان بنادینا کہ فرشتے بھی اس کی پاکی پر رشک کریں، یہ سوائے اُس ذات حق کے کس کا کام ہو سکتا

اس کے زور و اسباب ظاہر کی حقیقت کو پہچان کے گا کہ یہ مسئلہ اسباب و حقیقت ایک ہے اور جس کے پیچھے دستِ مہدوت کا فرما ہے۔

برن اور بھاپ کے چمچنے والے وانا پانی پر وہ اگر اس طہنت کو کہہ لیں تو انہیں معلوم ہو جائے کہ برن اور بھاپ کے کئی کوئی حقیقت ہے اور حقیقی باد و طافان نہ ہر فن میں ہے نہ بھاپ ہی بلکہ سب طاغوت اور قوتوں کا سرچشمہ اس ذات حق تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے جس نے برن اور بھاپ پیدا کیے اس کو کہنے کے لئے بصیرت چاہئے اور جس نے اس حقیقت کو نہیں سمجھا وہ دنیا پر کتنا کج دانشمند، غلام و غلامانہ و غلامانہ کی مثال اس دنیا کی ہر قوت کی ہے یہ کہ جس نے اپنے پیشانی پر چاند اور بھگیاں گاڑ کے اپنے من و وجد میں شرح اور سبزیں سبزیں کے کھلانے سے اور پلے گئے ہیں اور شرح جھنڈی کھلانے سے وہی شرح پانی ہے، یہ وہ کج کردہ ان جھنڈیوں کی کوڑھ و کٹ کرنے لگے اور کہے کہ وہ جھنڈیوں کی طاقت کی ایک ہیں کائنات بڑی ہیرو قاتلہ پیا کی طرح جو کل ڈی کوڑھ لگا اور دو کتان کا کام ہے، جس طرح دنیا اس دنیا پر نہیں ہے کہ اس جانی کو جبر نہیں کہ جھنڈیاں صفت ہیں اور کام و حقیقت ڈھانڈے رکھے، کو وہ وہی کوڑھ لگا ہے اور دو کتا ہے، جیسا کہ اس میں نہیں صفتیں کے کل پرندوں کا ہے، اور جس نے ذرا غلط کو اور کمر کرنا تو ہے یہ نفاذ چاہتا ہے کہ وہ حقیقت اس کا جلا تا کہ وہ دنیا پر کام ہے نہ ان کے کل پرندوں کا، بلکہ اصل طاقت اس اسلم کی ہے جو ان کے کھانڈ پیدا ہو رہی ہے۔ اس طرح ایک کو وہ انسان اس طہنت پر پڑتا ہے کہ حقیقت کو نہیں بھی نہیں پاتا، دگر دگر مسئلہ اسلم یا دے ہے نہ وہ غلط کو تو کمر کو اور دو کتا کام کو، تو معلوم ہو چکا اسلم اور آگ وہی بھی کچھ نہیں، طاقت و قوت ہر فن اس ذات کی ہے جس نے آگ اور پانی پیدا کی ہیں اور اس کی مشیت و امر کے ماتحت یہ سب چیزیں اپنی ذرا کی اور کمر کر رہا ہے

شاک واد و آب و آتش بندہ اند

ایمن و در مردہ با من زندہ اند

کسی کا حق اس کی غناوت اور قتل کے لئے قتل ہے، اس جہل میں غلط فہمی اور اسلم و شرما ہے جو دنیا و اپنی ایک کے میں آئے ہے، اور ایسے موافق پر لڑا جاتا کہ چنان کسی قبل کا و قوت اپنی نہ ہو کمر ہاں اور حید کے نتیجہ میں غناوت اور جنت کا حصول اور ابید کے ملکات یعنی ہے، مگر اس میں غناوت سے کو امر و وجہ عزائ سے بڑا کرنے میں محنت ہے بڑا ہے کہ انسان کا کوئی عمل اپنی ذات میں غناوت و جنت کی قیمت نہیں ہیں سنا، بلکہ فضیلت خداوندی اس کا اصل سبب ہو رہا ہے، قتل کی تو فیض ہو رہا اس غلطی خداوندی کی علامت ہے، طہنت نہیں۔

عقیدہ فریدی دنیا پر اس دامن اعتقاد تو حید پر اسلام کا سب سے پہلا بنیادی عقیدہ ہے، یہ صرف ان سکون و اطمینان کا شام ہے ایک نظر میں نہیں بلکہ انسان کو مسیح میں انسان بننے کا واحد ذریعہ ہے انسان کی تمام شکلات کامل اور ہر حالت میں اس کے لئے پکا، اور ہر قسم و شکل میں اس کا عکاس ہے، جو عقیدہ تو حید کا ماحول ہے کہ عناصر کے کون و فساد و ان کے ساتھ طغیانات عرصت ایک ہی کی حقیقت کے کائنات اور اس کی شکست کے مظاہر ہے

ہر نفسیہ جو طہنت کی آواز

ہر عقیدہ میں جس ہزاروں دواز

اور دیکھ رہے کہ جب یہ عقیدہ کی غلبہ و ماسخ پر چھا جائے اور اس کا حال میں جانتے تو وہ دنیا ہی اس کے لئے حقیقت ہیں جانتے، ماسخ بھگتے، اساد اور ہر شاہ کی بنیاد ہی میں نہیں دم جو مانی کی، مگر کہ اس کے سامنے یہ سب بے گناہ

انفردان و خلافت و دشمن و دوست

کو دلی پروہ و در نصرت و دوست

اس عقیدہ کا ایک ساری دنیا ہے بنیاد پر غرور و خطر سے بالا قزندگی گزراؤ ہے، اُن کا حال یہ ہر کسے ہے

نمودہ پرانے بڑی روش و فرادہ ہند کی ہی پر سرکش

امید و پر کس نہاںش و کس و ہمیں است بنیاد و فرادہ کس

کنا لا لا اور جو کتا تو حید بڑا ہے اس کا ہی مفہوم ہے، مگر بلا رہے کہ تو حید کا ماحول بنائی اور اس کے لئے کئی فیاض، بلکہ ہے اس کا لائیں اور لائیں کے ساتھ جتنا بخرو دی ہو،

کہو کہ تو حید خدا و احد و چہ پور و واحد گفت

کنا لا لا، ان کے چمچنے والے قوت و قوت دنیا میں گردوں میں اور اتنے ہی کس نے میں لئے نہیں ہوئے، لیکن ماہ پر وہ بہ صرف ذرا ہی جتن خرچ ہے، تو حید کا ونگ ان میں دنیا و دنیا کا ہی دیکھ حال پر کتا پیلے بزرگوں کا عقائد کہ بڑی سے بڑی قوت و طاقت ان کو صوب کر سکتی تھی اور وہ کس قوم کی مدد کی کثرت میں ان پر نرا خدا و پکسی تھی، مذکورٹی بڑی سے بڑی دولت و سلطنت ان کے قلوب کو غفلت و غفلت میں ہی طرف تھکا تھی، ایک پیچیدہ اور کمر سامی و دنیا کو کتا کہہ رہا تھا کہ ہم پر کتا نہیں چلا سکتے، کتب و بی خلا شیطانی و بی، ایسا ہے ہر کتا کہ چلتا جو ضروری ہی مذمت میں دنیا پر چلائے ان کی طاقت و قوت اس فیض تو حید میں مغرور، اللہ تعالیٰ ہیں اور سب سلمان کو یہ دولت نصیب فرمائے۔

رسالت محمدی کا اثبات

بدریعا عجزاً و شرفاً

وَلَا تَكُنَّمْ فِي رَءِیْبٍ مِّمَّا تَخَالِ غِیْبِیْ مَا قَدْ آتٰهُ اَیُّوْسُ رَءِیْبِیْنِ

اور اگر تم شک میں ہو اس کلام سے جو آئینا ہم نے اپنے بندے پر تو لے آؤ ایک صورت

یَتِلَّاهُمْ وَادْعُوْا شَہِیْدَآءَ کُم مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ﴿۵۷﴾

اس جیسی اور کلام اس کو جو تمہارا دھوکا دہو اور اللہ کے سوا اگر تم سچے ہو

فَاِنْ کُمْ تَفْعَلُوْا وَاَنْ تَفْعَلُوْا فَاَقْبُوْا النَّارَ اَلَّیْہِ دَفُوْدُهَا النَّاسُ وَ

پھر اگر ایسا نہ کر سکو اور اگر نہ کر سکو گے تو پھر پھر اس آگ سے جس کا ایندھن آدمی اور

الْحِجَارُ اَلَّیْہِ اَعْدَتْ لِلْکٰفِرِیْنَ ﴿۵۸﴾

پتھر اس تباہی کی ہوئی ہے کافروں کے واسطے

خلاصہ تفسیر

ہر قسم کے مشعلان میں جو اس کتاب کی سبست جو ہم نے نازل فرمائی ہو اپنے بندے سے خاص پر تو اچھا ہر قسم بناؤ ایک عدد و کلام اور اس کا نام یہ ہو کہ ہر قسم میں علی و ابان مانو جو اور اس کی نظم و نثر کے مشاقی ہو پھر اصل اللہ علیہ وسلم نے اس کی کوئی مشق بھی نہیں کی اور جب اس کے بار آور دوسرے فرقان کے یہ ایک کلمہ کہ اس کی بھی مثل دینا سکو تو بڑا انصاف و انصاف ثابت ہو جائے گا کہ چھوڑنا مناسب اندیشہ کی اور آپ اللہ کے پیغمبر ہیں اور جولو اپنے حاکم کیسیوں کو جو اخلاص الگ و الگ پڑ کر رکھے ہیں اگر تم سچے ہو پھر اگر تم یہ کام نہ کر سکو اور قیامت تک کسی دکر سکو گے تو پھر لڑا چکے دیو و روتوں سے جس کا ایندھن آدمی اور پتھر یہ تیار ہو چکی ہے کافروں کے واسطے

معارف و مسائل

وہ لوط آیات و ضابطہ مضمون سورہ جعشرہ کی تیسوی اور چہرہوی آیتیں ہیں اس سے کچل و کچل ہیں و حدیث کا ثبوت تھا اور دونوں آیتوں میں رسالت لے اور حدیث چہرہوی کی تیسوی ضابطہ ثابوت ہے

محمدی کا اثبات ہے و علیہ الصلوٰۃ و السلام اور حاجت پڑھانے کے آگے اس کے دو وعدہ ہیں اولیٰ توحید اور رسالت پہلی دو آیتوں میں اللہ تعالیٰ کے چند مخصوص کلام ذکر کر کے توحید ثابت کی گئی تھی اس دو آیتوں میں اللہ تعالیٰ کا کلام چہرہوی کے کہ حضرت علی علیہ السلام کی رسالت ثابت فرمائی گئی ہے اور طریق اثبات و دونوں کا ایک ہی ہے کہ پہلی دو آیتوں میں چند ایسے کام ذکر کرے جو سوائے حق تعالیٰ کے کوئی نہیں کر سکتا مثلاً زمین اور آسمان کا پیدا کرنا آسمان سے اپنی آنکھ بانٹنا سے پہلے پہل پیداکرنا

اور دوسرا خاصہ اللہ سے متماثل ہے کہ جو کلام اللہ کے سوا کوئی دوسرا نہیں کر سکتا تو سنی میں حدیث میں اس کے سوا کوئی دوسرا نہیں کر سکتا اور ان دونوں آیتوں میں ایک ایسا کلام بھی بیان کیا ہے جو اللہ تعالیٰ کے سوا کسی دوسرے کا نہیں کر سکتا اور دونوں کی انسانی فرد یا جماعت اس کی مثل و نظیر نہیں ہے جس طرح زمین و آسمان کی بنیاد پانی برساتے اور اس سے پہلے پہل پھیلنے سے انسانی طاقت کا ماہر ہونا اس کی دلیل جن کو کہ ہم صرف اللہ تعالیٰ ہی کے ہیں ایسی طرح کلام بھی ان کا نہیں بلکہ پھر پیش کر کے یہ پوری مخلوق کا عاجز و رہنا اس کی دلیل ہے کہ یہ کلام اللہ تعالیٰ ہی کا ہے جس مخلوق کا نہیں اس آیت میں فرقان کے پوری دنیا کے انسانوں کو خطاب کر کے چیلنے والے ہر گھر تمام کلام کو اللہ کا کلام نہیں بلکہ کسی انسان کا کلام کہنے پر تو ہم بھی انسان ہو نہیں سکتے ایسا کلام پیش کر کے پھر قدرت پر تباہ ہونے والا کلام تو کیا تمام اس کلام کے ایک چھوٹے سے ٹکڑے کی نظیر و مثال بنا کر کلام اور اس سے پڑھا جائے لے یہ سزا آسانی دی جاتی ہے کہ تمہارا کوئی آدمی نہ بنا سکو تصدیق و ثبوت ایسے سامنے ہیں ان سے اپنے حاکم اور دو گارہی کر اور ایک تین اعلیٰ کافر نفس کر کے اس فرقان کی چھوٹی سی سورت کی مثال بناؤ

پھر اس پر نہیں کیا دوسری آیت میں ان کو حیرت و دلانہ کہ تمہاری جالی نہیں کہ اس میں ایک سورت بانگو چہرہ اب سے خدا کا ایک سبب تمام کی مثال بنانے سے اپنا جہر محسوس کرتے ہو اور یہ صفت اس کی دلیل ہے کہ یہ انسان کا کلام نہیں بلکہ ایسی ہستی کا کلام ہے جو تمام مخلوق سے فوق اور بلند و بالا ہے جس کی قدرت کاملہ سبب عادی ہے تو پھر اس پر ایمان دلانا اپنے انھوں نہیں اپنا شکار کرنا ہے اس سے بچو

حاصل یہ کہ فرقان آیتوں میں فرقان کریم کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اعلیٰ معجزہ بہت لاکر آپ کی رسالت اور حقانیت کا ثبوت پڑا گیا ہے دوسرے اعلیٰ اعلیٰ علیہ وسلم کے معجزات تو بڑے ہیں اور یہ بڑے حیرت انگیز ہیں ان سبب میں سے اس جگہ آپ کے علم حیرت سے تین فرقان کے ذکر کا مقصد کر کے بتلوا کہ کیا کر آپ کا سبب پڑا معجزہ فرقان ہے اور اس معجزہ کو ایسا علیہ السلام

کون دلا علوم ایسا کہ دلا بھی ہو تو کسی آپ کے لئے اس کے استاد و شغل خوار کر دے گا کہ کوئی آپ سے بڑی مشغول اس سے دیکھ جائے کہ کسی ایسی ہے چاروں قوم جو آپ انہیں چاہتے تھے وہ ان کریم نے بھی ان کے مشعلوں پر لکھا تھا ان آپ کے تھے کہ انہیں آپ پر ہر قسم کی تعظیم و تعریف ہے خیر ہے وہ ان کوئی بڑا عالم تھے۔ مگر خاص کی نسبت یہ کہ اگر ہم میں کوئی شخص ہے جس کا فرض حاصل ہے کہ وہ دست کوڑا لے کر انہیں جبر و کفر لانا تھا آپ کے لئے خصوصی طور پر ایسے سامان ہر قسم کے معمول و خوراک پر ہر جگہ کے آپ کی کسی طرح کیسے بننے چاہتے تھے کہ وہ بھی دیکھیں باطل کی مٹی میں ہے اگر آجنا تک کہ کسی کو نہ تھے وہ آپ کے ان خصوص فیشر و عمل تھا جس کے لئے خاص خاص اہمکات کیے جاتے تھے اور مشاعرے منترہ کرتے اور اس میں ہر شخص ساجد تھا کہ کوشش کرتا تھا کہ کوئی تعالیٰ نے اس کی ذات عطا فرمائی تھی کہ ان کی چیزوں سے بھی دیکھیں کہ انہیں کوئی فیشر انہیں عطا کیا تھا دیکھیں اس میں شریک نہ رہتے۔

اس آئینی محصل برائے کے ساتھ سمجھیں کہ آیت کی شرافت نفس، اسکا نفس فاضلہ، فہم و فراست کے فیوضی و کار و ملکات و اہانت کے اعلیٰ تر شاہ پہلے آیت کی ملکات مقدس میں ہر وقت مشاغلہ کے ساتھ تھے، جس کا نتیجہ ہر تھا کہ وہ جس کے شے سے بڑے مغرور و مکتبر سردار آپ کی تسلیم کرتے تھے اور اس کے کسی آیت کو کہیں کے لذت پہنچا کر اٹھا۔

یہ احمق محض جالیوں میں سال تک کمر بٹا کر اپنی برادری کے سامنے دھتے ہیں، کسی دوسرے ملک کا سفر بھی نہیں کرتے، جس سے یہ خیال پیدا ہو سکتا ہے کہ وہاں جا کر علوم حاصل کئے ہوں گے، صرف کلب شاہ کے دروازے پر سفر ہوئے، وہی جگہ جتنے مشنروں کے لئے جس میں اس کا کوئی ارکان نہیں۔

اس حق پر مبنی ذات معنوس کی زندگی کے جائزین سالی کنہیں اپنی ادا داری میں اس طرح گفتگو کر دیتے تھے کہ ہمیں کسی کتاب یا فہم کو نام لگا کر باطل کرنا چاہیے، جس کی جگہ ہمیں کوئی نغمہ و قصیدہ ہی چاہیے۔
 ٹھیک چالیس سال کے بعد ان کے زمانہ مالک پر دو علوم آئے گا جس کا کام قرآن سے جو اہل عقل و فہم و جادہ سے کے لحاظ سے اور معنوی علوم و فنون کے لحاظ سے تیز اصول و علوم ہے، اگر صرف انسانی ہوتا تو ہمیں اس کے سمجھنے پر نہ ملے یہی انصاف پسند کو کیا ہندو سکتا ہے، مگر یہاں نہیں بلکہ اس کے ساری دنیا کو خود ہی کی پہنچ و یاد کو کسی کو اس کے علوم کا حق اپنی ہونے میں مشہد ہو کر اس کو حاصل بنانا ہے۔
 اب ایک طرف قرآن کی یہ تقدیر اور پہنچ اور دوسری طرف ساری دنیا کی مخالفت و انقیاد ہے۔
 اسلام اور پنجہ اسلام کو شکست دینے کے لئے اپنی اپنی جان و ادا و آبرو سب معنواں کو تیار ہے، مگر تاکہ کر کے لئے کوئی نہ جانتا نہیں کہ تاکہ قرآن کی ایک جہی کی صورت کی مثال بنانا ہے معنوس کر لینے کو کتاب ہے مثال دینے نظیر میں ہے، جب بھی ایک ایک عمل کی دہائی سے اس کا پورا پورا

قرآن اور وجہ ایمان کی تفصیل میں جانتے بغیر بھی قرآن کریم کے معجزہ ہونے کے لئے کم نہیں ہیں گو ہر مالمہ جاہل سمجھ سکتا ہے۔

عالمِ قرآن کی دوسری وجہ اہلِ علم و قرآن کی ہمدردی ہے۔ دیکھئے: یہ اب تک معلوم ہے کہ قرآنِ اقدس کے احکام ساری دنیا کے لئے آئے، لیکن اس کے علاوہ اسلئے پہلے خطابِ عرب سے، جسے کوار کوئی طرف سے آقا یا انبیاء گرامی نہ سمجھتے تھے۔ اہلِ علم ان کا نظریہ سراسر اور پیدائش و صفت تمام جہاں میں وہ اقوام و نہاتے ممتاز سمجھے جاتے تھے۔ قرآن ان کو مخاطب کر کے پہنچ کر اسے ہر اگر نصیب ہوئے تھے۔ قرآن نے انہیں ان کی حق پرستی کی مثال بنا کر دکھادیا اور ہر متر کی ان کی ہر حق پرستی کی طرف اشارہ کیا۔ اصل اور اعلیٰ مساوات و اسلوب کی حد تک ہوتی ہے قرآن میں انہیں کے لئے اس کی نظر پیش کرنے سے مدد معقول ہوتا، لیکن ستر قرآن سے صرف عیسائی مفسرین کے متعلق قرآن ہی نہیں، بلکہ اعلیٰ فصاحت و علمت کے اعتبار سے بھی پوری دنیا کو پہنچا دیا اور اس پہنچا کر قبول کرنے کے لئے اقوامِ عالم میں سب سے زیادہ مستحقِ عرب ہی تھے، اگر انی اوراق پر نگاہ دوں تو ہر شے اس کی اہمیت اور قدرت کا کلام نہیں مختار و بنا، جو اب کے لئے کیا مشکل تھا کہ ایک ایسی مجلس کے کام کی مثال لکھ سوں، بہتر کلام اور پیدائش کر دے، اور ایک اور قوی یہ کام نہ کرے تو قرآن کے ان کو یہ ہولت بھی اس حق کی ساری قوم میں کر جائے، جو متر قرآن کے اس بلند پایہ دعوے اور پھر قرآن طریقت سے غیرت و دل سے یہ بھی عرب کی خود قوم پوری کی پوری خاصیت ہے، چند سطر یہیں مخاطب ہوئے ہیں۔

عرب کے سرداروں نے قرآن اور اسلام کے شائے اور میں اسلام حملی اور غلبہ کرکے
غلوب کرنے میں جس طرح اپنی اڑیں چمکا کر دکھایا، اور کسی گھمے بڑے آدمی سے عقلی نہیں مشرب
ہوئی، اخفیت حملی اور غلبہ کرکے کہنے سے زعفران کو طرح طرح کی اڑیں سے کرکھا کر دکھانے
اسلام کو چھوڑ دیں، مگر جب یہ جھگڑا یاں اور نشہ نہیں ہے، ترشی کا ٹکڑے، تو خوشی کا پہلو اٹھایا
عرب کا سردار و غریب اور ہجوم کا ٹانہ بند ہی کر کے اپنے اس معاشرہ اور اور عرب کی وہی دولت و حکومت
اور بہتر نہیں وہ حال کی کمیوں کی پیش کش اس کام کے لئے کی کرکے اسلام کی تبلیغ چھوڑ دیں، چاہئے
کے جس غلوب میں قرآن کی چٹنے، عتیں سنا دینے پر کھانا، فرمایا جب ہے کہ ہر کس کو کارگر نہ ہوں تو کھانا
قائد کے لئے تیار ہو کر کھلی اور بہتر اور دھواں بہتر جو قرآنی عرب نے اخفیت حملی اور غلبہ کرکے
ملاؤں کے لئے یہ سب سروسز کی گئی تھی، جان، مال، اور اور، عرب کو اس کام میں سرچ کرنے
کے لئے تیار ہونے، یہ سب کچھ کارگر کی ہے، یہ نہ کہ قرآن کے سب سے پہلے کرکھ کرکے اور میں سب سے پہلے
چھوڑ کرنا اور اس حالت میں سارے عرب کے کے معاشرے کے لئے یہ کام کرکے اور میں سب سے پہلے

کہا کہ جان تک میں نے غور کیا تو گوں کہ سب دینی فائدہ ہیں، ان کا کلام پر مشعر ہے: **ذُکِّرَانَتْ بِنُو**
دَاوُدَ وَذَاکُمَا میں بلکہ مجھے وہ کلام صادق نظر آتا ہے۔

اور ذرا قرآن لے کر یہاں سے یہاں تک سفر کیا، اور سہرا میں اگر چہ گیا
نہیں، اور وہی نے اس طرح گندارے کو سوائے ذوق کے پانی کے سب پیٹ میں کچھ نہیں گیا، اس
نہام و صبر میں مجھے یہ کہ کہ یہ صلیبیٹ معلوم ہوئی تو کوئی ضعف محسوس کیا تو خاص میں ۱۲ ج ۱،

دائیں گئے تو لوگوں سے کہا کہ میں نے ذوق اور ذوق کے قصداً اور ذوق کے کلام بہت سے
پہا اور کاہنوں کے کلمات اور مجاہد کے کلمات بہت سنے ہیں، پھر صلیبیٹ و سلم کے کلام کی
مثال میں نے آج تک کہیں نہیں سنی، تم سب میری بات مانو اور کہتے کہ ان کا ذکر، چنانچہ مجھے کچھ

سال میں ان کی پوری قوم کے فقیر بنا ایک ہزار آدمی تھے، پھر کوسلمان ہوئے اور خاص میں ۱۲ ج ۱
اسلام اور حضرت صلیبیٹ و سلم کے سب سے دشن، اور چیل اور افسان میں شریعت
و طہر بھی لوگوں سے چھپ کر قرآن سننا کر کے، اور اس کے عجیب و غریب دیکھنے میں دیکھنے لگاتے

سے متاثر ہوئے تھے، پھر جب ذوق کے کہ لوگوں نے ان کو کہا کہ جب تم اس کلام کو ایسا بے فکری سے
قرآن کو قبول کریں نہیں کر سکتے، اور وہی کا جواب ہے کہ کہی حدیثات میں مانا
قبول نہیں ہو سکتے، رعایت اور معاوضہ مقابلہ نہ کرنا ہے، وہ اس کلام میں آگے بڑھنا چاہتے ہیں،

اس کا جواب دینے میں اب جبکہ ہم اور وہ دونوں پر برتری کے ایک ہی قریب وہ کہنے لگے کہ
میں ایک ہی چیز ہوں جو تم سے آسانی سے دینی ہے، اب یہ اس میں کیسے ان کا مقابلہ کریں، میں تو کہی
اس کا انفرادہ ذکر کیا تو دفعہ اعلیٰ،

فلا کلام بہت کہ کوسنراق کے اس دعوے اور پہلے پر صرف یہی نہیں کہ ہونے وہ نے دار
مانی بلکہ اس کے بے مثل دیکھنے ہوئے اور بے فکر کا کھیلے طور پر اعتراف بھی
کیا ہے، اگر کسی انسان کا کلام ہر اتنا اس کی کوئی دہم دینی کہ سارا وہ جب بلکہ سادی و دنا اس کا حال

فانے سے عاجز ہو جاتی۔
مستقران اور پیغمبرستان کے مقابل میں جان وال، اولاد و آہر و سب کچھ قرآن کرنے کے لئے
توہ تیار ہو گئے، مگر اس کے لئے کوئی آگے نہ بڑھا کہ مستقران کے پہلے کو قبول کر کے وہ سولہ اس کے

مقابلہ میں پیش کرنا تھا۔
اس کو کہہ چکی کہ وہ لوگ اپنے باپ و اجداد و افعال کے اور جو صنعت مزاج تھے، و جہت
کے اس دہانے تھے، جب انھوں نے قرآن کو سن کر کہہ دیا کہ وہ دفعہ اس کلام کی مثل نہیں
ہوئے تو محض دھاندلی اور کھٹکی کے طور پر کوئی کلام پیش کرنا اپنے لئے کامیاب دیکھ کر وہ یہ بھی ہلکتے

تھو کہ ہم نے کوئی چیز نہیں سنی، پھر دی وچ سے عرب کے قصداً و لہذا اس اہم مقام میں ہمیں
قبول کر دیں گے، اور خود کو خود سوائے یوں اس لئے پوری ذوق سے سکوت چست کیا، اور خود کو
مزا جئے انھوں نے صاف طور پر دست و سب میں کیا جیسے کہ وہ قائل ہیں، بیان ہو چکے ہیں۔

اسی مسئلہ کا ایک اور دفعہ یہ کہ عرب کے سرور اسعد بن زواد نے آنحضرت صلیبیٹ و سلم کے
کے چچا حضرت عباس کے سامنے اقرار کیا کہ،
تہم نے ذوق اور، محض صلیبیٹ و سلم کی حالت کے چند دفعہ دیکھنے دیکھنے اور شکایت

غراب کے، میں انھیں کے ساتھ کتا بول کر، یا مشہرہ اشہرہ رسول ہیں، ہر گرجہ ہے،
۱۰ ج کلام اور دفعہ یہ کہ اس کلام میں سر کتا
(خاص میں ۱۲ ج ۱)

قبیلہ میں صلیبیٹ و سلم کا ایک شخص کیس میں نبیہ رسولی صلیبیٹ و سلم کی خدمت میں حاضر
ہوا، آپ قرآن سننا اور چند سلاطین کے جن کا وہ اسب حضرت صلیبیٹ و سلم کے مقابلہ
نوبت میں دفعہ مسلمان ہو گئے، اور بعد میں ہی قوم میں وہیں گئے، تو لوگوں نے کہا،

میں نے تم و ذاتی کے قصداً و لہذا کے کلام سنے ہیں، بہت سے کاتھوں کے کلمات تھے
کا خود ہر جہت کے شکایت سن کر بولیں، مگر صلیبیٹ و سلم کے کلام کی مثل میں نے
ان تک نہیں سنی، اس مسئلہ میں اب اس وقت اور وہی کا جواب دینے کی طرف،

کتنی ہی ان کی قوم کے ایک ہزار آدمی تھے کہ ہر دفعہ آنحضرت صلیبیٹ و سلم کی خدمت
میں حاضر ہوا کہ شرف و اسلام ہو گئے،
(خاص میں ۱۲ ج ۱)

ہا اور ذوق صلیبیٹ و سلم کی دلوں سے متاثر نہیں ہو آیت کے معاملات سے مجبور اور
جاندار تھے، بلکہ وہ لوگ جو ہر وقت ہر طرح رسولی صلیبیٹ و سلم کی مخالفت میں گئے
ہوئے تھے، قرآن کے متعلق ان کا بھی یہی حال تھا، مگر ابی خدا و رحمتی دج سے اس کا بائبل و گول

ہر دہ کرتے تھے۔
مگر وہ سب نے ان کے قصداً نہیں کھری میں ہوا اور یہی مثل کہا ہے کہ ایک مرتبہ ابو جہل اور ابوسہیل
اور افسان میں شریعتی راست کو اپنے اپنے گھروں سے اس لئے نکلا کہ جبکہ رسولی صلیبیٹ و سلم
سے قرآن سنیں، ان میں ہر ایک صلیبیٹ و سلم کا ایک ایک کی دوسرے کو خبر دے، اور افسانہ عادیہ و گول

میں چھپ کر قرآن سننے لگے، تو اس میں ایسا ہوئے کہ ساری رات گذر گئی، جب تک کہ وہی کوسب
پ

راہبہ جو ہے، انصاف کا راستہ میں چلی گئی، اور ہر ایک نے دوسرے کا فخر سنا تو سب آپس میں ایک دوسرے کو ملامت کرنے لگے کہ تم نے تو بڑی حرکت کی، اور کسی نے بے بسی کا ہوا تو کوئی ایسا نہ کرے کیونکہ اگر ہر ایک کے جوش کو اس کی خبر ہو گئی تو وہ سب مل جل کر بوجا جائیں گے۔

[illegible]

اور پہلی نے کہا کہ صاف بات یہ ہے کہ ہمارے خاندان اور پڑوسیوں کے خاندان میں ہمیشہ سے جنگ چلی آئی ہے، قوم کی سادت و قیادت ہمہ تن عاقل و کریم کے ہر شاہنشاہ نے اپنے ہاتھ لگا کر کی ہے، انہوں نے حکومت و سرپرستی کے ذریعہ قوم پر اپنا اثر و نفوذ قائم کیا ہے اور انہیں قوم کی سرپرستی میں بھی ان سے بھی نہیں ہے، یہ ان کے کہہ کر اور ان کے کہہ کر، انہوں نے خود راہیں اپنے سر پہ لیں تو ہم اس میدان میں بھی مارا کرتے ہیں۔

ان حالات میں ان کے خاندانی سے برآوردہ اخص کو بٹانے میں ایک نیا پیدا ہوا ہے جس پر
 آسان سے توجہ دی ہے۔ یہ ایک قابلہ ہے کہ اس کا مقابلہ کرے جس نے ہم سے توجہ کر لیا ہو کہ
 بہتر طور پر غائب سے ان کا مقابلہ کرے جسے بدو پر چرائی اور اسی کے خاندانی سے اور خاصاً قصص ۱۵ ج ۱
 یہ سترہویں کارڈ کہہ کر ہر ایک کا دشمن کو بھی ہر ایک کا دشمن کرنا چاہیے، یہ تمام واقعات
 ملا جلا ہونے والے ہیں جو ان کے خاندانی سے کر رہے ہیں۔

تیسری وجہ: عجازِ مفرق آئی کہ ہے کہ اس میں غیب کی امداد آئندہ پیش آنے والے واقعات کی بہت سی خبریں ہیں جو مفسرِ آں نے دیں، اور ہر کامیاب مفسرِ واقعہ

[illegible]

چوتھی وجہ: اچھا مہاز سترنا کی ہے۔ یہ کہ اس میں پھیلے آستون اور ان کی شرکت اور تاجزیں
حالات کا ایسا صاف تذکرہ کہ کوس زمانہ کے بڑے بڑے علما، مہر و نصابی جو
پہلی کنز کے مابین رہے۔ ہاتھ آئے ان کو بھی قنی معلومات، دھنیں اور رسول اللہ ﷺ
رسل نے تو بھی دیکھی تھیں یہ قدم رکھا دیکھی عالم کی نسبت انھیں، ان کی کتاب کو ہر وقت کا، ہر
ابتدا و نبی سے آپ کے زمانہ تک ختم افراہم عالم کے تاریخی حالات اور نہایت صحیح اور بکے سوانح
اور ان کی ستر لیتوں کی تفصیلات کا بیان کیا ہے کہ کچھ اس کے نہیں ہو سکتا کہ کلام اللہ تعالیٰ
میں کیا ہو اور اللہ تعالیٰ نے یہ آپ کو خبر میں دی ہیں۔

یہ ہے کہ اس کی متعدد آیات میں لوگوں کے دل کی پیس ہوئی باتوں کی اطلاع دینے کی (پانچویں حصہ) اور جبرائیل کے اقرار سے ثابت ہو گیا کہ وہ امتِ محمدیہ اور مہدی مہدی کے کلام میں عالم النیب والہ شہادت ہی کر سکتا ہے، یہی بشر ہے، ملازمین نہیں، انشاء اللہ تعالیٰ ہے۔

اور یہ ارشاد کر :-

عَمْرُوْنَ فِي الْاَنفُسِمْ قَوْلًا بَعْدَ بَيِّنَةٍ
اَللّٰهُمَّ اِنَّمَا نَعْمُوْنَ ۝ (۸۱۵۹)

جسٹس دجبر: جس سب جہاں میں جہیز کو اٹھانے کے لیے کسی نے ظاہر نہیں کیا، قرآن کریم نے اس کا انکشاف کیا ہے۔
 اہل حق و جاہل اسلام کی کئی ذرا کیات ہیں جن میں قرآن نے کسی قوم یا فرد کے متعلق یہ
 پیش گوئی کی کہ وہ ظالم کام نہ کریں گے، اور پیروہ و فوج باوجود ظاہری قدرت کے
 اس کام نہ کرے، جیسے یہودی کے متعلق قرآن نے اعلان کیا کہ اگر وہ اپنی افواج اپنے آپ کا لشکر
 بنائیں تو ان کے لیے جہیز کافی ہے۔

لوگوں کی باتا مدہ تحصیل علوم، استادوں کے ساتھ طویل ملازمت و محبت، وسیع مطالعہ، مدقوں کی مشاقی ان کی علمی مہارت کے کھلے ہوئے اسباب نہیں ہیں؛ اگر ان کے کلام دوسروں سے ممتاز ہوں تو اس میں تعجب کی کیا بات ہو؟ تعجب کی بات تو یہ ہے کہ جس نے کسی کتاب قلم کو ہاتھ نہ لگایا ہو کسی مدرسہ و مکتب میں قدم نہ رکھا ہو، وہ ایسی کتاب دنیا کے سامنے پیش کرے کہ ہزاروں صدی اور لاکھوں فیضی اس پر مشربان ہو جائے کو اپنا سرمایہ فخر سمجھیں، اور ان کو جو کچھ علم و حکمت حاصل ہو کر اس کو بھی آپ ہی کے فیض تعلیم کا اثر مستراردیں، اس کے علاوہ سعدی اور فیضی کے کلام کا مثل پیش کرنے کی کسی کو ضرورت بھی کیا تھی؟ کیا انھوں نے نبوت کا دعویٰ کیا تھا، اور اپنے کلام کے بمثل دے کر نظیر ہونے کو اپنا معجزہ کہا تھا، اور دنیا کو اس کا چیلنج دیا تھا کہ ہمارے کلام کی کوئی مثال پیش نہیں کی جاسکتی جس کے نتیجے میں لوگ اس کا مقابلہ کرنے اور مثال پیش کرنے کے لئے مجبور ہوتے۔

پھر مشرکان کی صرف فصاحت و بلاغت اور نظم و ترتیب ہی بے مثال نہیں لوگوں کے دل و دماغ پر اس کی تاثیرات عجیبہ اس سے زیادہ بے مثال اور حیرت انگیز ہیں جن کی وجہ سے قوموں کے مزاج بدل گئے، انسانی اخلاق میں ایک کایا پلٹ ہو گئی، عرب کے تند خو، گنوار، حلم و احتیاط اور علم و حکمت کے استاد مانے گئے، ان حیرت انگیز اعتلابی تاثیرات کا اقرار صرف مسلمان ہیں موجودہ زمانے کے سینکڑوں غیر مسلموں نے بھی کیا ہے، یورپ کے مستشرقین کے مقالات اس بارے میں جمع کئے جائیں تو ایک مستقل کتاب ہو جائے، اور حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس موضوع پر ایک مستقل کتاب بنام شہادۃ الاقوام علی صدق الاسلام تحریر فرمائی کہ اس جگہ چند حوالے نقل کئے جاتے ہیں۔

ڈاکٹر مستادلی بان نے اپنی کتاب تذکرہ عرب میں ممالی سے اس حیرت انگیزی کا اعتراف کیا، ان کے الفاظ کا ترجمہ اردو میں یہ ہے:

”اس پیغمبر اسلام اس نبی اُن کی بھی ایک حیرت انگیز سرگزشت ہے، جس کی آواز نے ایک قوم کو اپنا کوجہ اس وقت تک کسی ملک گیر کے زیر حکومت نہ آئی تھی رام کیا، اور اس درجہ پر پہنچا دیا کہ اس نے عالم کی بڑی بڑی سلطنتوں کو زیر و زبر کر ڈالا، اور اس وقت بھی وہی نبی اُن کی اپنی قریب کے اندر سے لاکھوں ہندوگان خدا کو کلمہ اسلام پر قائم رکھے ہوئے ہے۔“

مشرود دل جس نے قرآن مجید کا ترجمہ اپنی زبان میں کیا ہے لکھتا ہے کہ:

”جتنا بھی ہم اس کتاب دینی قرآن کو الٹ پلٹ کر دیکھیں اُس قدر پہلے مطالعہ میں اس کی ناز و غلی نئے نئے پہلوؤں سے اپنا رنگ جماتی ہے، لیکن فوراً ہمیں محو کر دیتی ہے، متغیر و متبدل ہوتا اور آخر میں ہم سے تعلیم کر کر چھوڑتی ہے، اس کا طرز بیان باعتبار اس کے مضامین و اغراض کے،

عقیدت مالی شان اور تہذیب و تہذیب اور جہاں اس کے مضامین سخن کی غایت رنوت تک پہنچ جاتے ہیں۔

غرض یہ کتاب ہر زمانہ میں اپنا زور اثر دکھاتی رہے گی۔“ (شہادۃ الاقوام، ص ۱۳)

مصر کے مشہور مصنف احمد فتی بہک زا غلول نے مشہور ۱۹۹۵ء میں مسٹر کونٹ ہنری کی کتاب الاسلام کا ترجمہ عربی میں شائع کیا تھا، اصل کتاب فریچ زبان میں تھی، اس میں مسٹر کونٹ نے قرآن کے متعلق اپنے تاثرات ان الفاظ میں ظاہر کئے ہیں:

”تفعل حیران ہے کہ اس قسم کا کلام ایسے شخص کی زبان سے کیونکر نکلے جو بالکل اُن کی تھا تمام مشرق نے استرا کر لیا ہے کہ نوع انسانی مفقودہ یعنی ہر لحاظ سے اس کی نظیر پیش کرنے سے عاجز ہے، یہ وہی کلام ہے جس کی بلند و نشاء پر رازی نے طربین خطاب کو مطمئن کر دیا، اُن کو خدا کا مستر و ہونا پڑا، یہ وہی کلام ہے کہ جب عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت کے متعلق اس کے چلے جعفر بن ابی طالب نے حبشہ کے بادشاہ کے دربار میں پیش تو اس کی آنکھوں سے میا خستہ آنسو جاری ہو گئے، اور ہشت چلا اٹھا کہ یہ کلام اُسی سرچشمہ سے نکلا ہے جس سے عیسیٰ علیہ السلام کا کلام نکلا تھا۔“ (شہادۃ الاقوام، ص ۱۳)

انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا، جلد ۱۶، ص ۵۹۹ میں ہے:

”قرآن کے مختلف حصوں کے مطالب ایک دوسرے سے بالکل متفاوت ہیں، بہت سی آیات دینی و اخلاقی خیالات پر مشتمل ہیں، مظاہر قدرت، تاریخ، الہامات انبیاء کے ذریعہ اس میں خدا کی عظمت، ہر بانی اور خدا قوت کی یاد دہانی ملتی ہے، بالخصوص حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے واسطے خدا کو واحد اور قادر مطلق ظاہر کیا گیا ہے، رت پرستی اور مخلوق پرستی کو بالکل غلط ناجائز و مشرک و یا گیا ہے، قرآن کی نسبت یہ بالکل بجا کہا جاتا ہے کہ وہ دنیا بھر کی موجودہ کتابوں میں سب سے زیادہ پڑھا جاتا ہے۔“

امحکماتان کے نامور مورخ ڈاکٹر گہن اپنی مشہور تصنیف رسلطنت روم کا اخطاط و زوال، کی جلد ۱ باب میں لکھتے ہیں:

”قرآن کی نسبت ہر ممالک تک سے لے کر دور یا نے گنگا تک نے ان لیا ہے کہ یہ پارہ شست کی رُوح ہے، قانون اساسی ہے، اور صرف اصولی مذہب ہی کے لئے نہیں، بلکہ احکام تعزیری کے لئے اور قوانین کے لئے بھی ہے جن پر نظام کا مدار ہو جن سے نوع انسان کی زندگی وابستہ ہو، جن کو حیات انسانی کی ترتیب تسمیق سے گہرا تعلق ہو، حقیقت یہ ہے کہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی شریعت سب پر مادی ہے، یہ شریعت ایسے دانشمندانہ اصول اور اس قسم کے قانونی انداز پر مرتب ہوئی ہے کہ سامنے جہاں میں اس کی نظیر نہیں مل سکتی۔“

کریمان بغیر صانع کے اشیاء کو اس اشارت کا سنبھال نہیں جاتا، اگرچہ صرف ایمان میں ہی ہر چیز معلوم اور وام سے پہچانے کا سبب ہو، اور مومن مستند بھی اس جگہ پر کسی دشمنی وقت میں وہ ہر شے سے مٹا جائے گا، اور جن میں پہچانے کا سبب نہ ہو، مگر غائب ہونے سے پہلے اشیاء کا بغیر صانع کے کوئی ممکن نہیں ہوتا، اور روح انسان ہی قریشی

إِنَّ اللَّهَ لَا يَشْفَعُ أَنْ يَتُوبَ مُتَلَابًا بَعُوضَةً فَمَا خُوَّاهَا
 یہ ملک اور مقرر، ہمیں اس بات سے کہ سب سے کہ کوئی مثال ہوگی، اس پر کہ ہر ایک کو جو
 فَمَا الَّذِينَ آمَنُوا أَفَعَلَمُونَ أَنَّهُ الْعَزِيزُ الرَّحِيمُ ۚ وَأَمَّا الَّذِينَ
 سوجوہی ہو وہ نصیب جانے پر کہ مثال سے کہ کوئی مثال ہوگی، اس پر کہ ہر ایک کو جو
 كَفَرُوا وَتَفَعَّلُوا مَا أَرَادَ اللَّهُ بِهِمْ أَنْ يَعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ يَبْذُلُهُمْ
 ہیں سو کہتے ہیں کیا مطلب تھا، اور اس کا اس مثال سے گزرا کہ جو مثال سے کہ کوئی مثال ہوگی، اس پر کہ ہر ایک کو جو
 وَتَفَعَّلُوا مَا أَرَادَ اللَّهُ بِهِمْ أَنْ يَعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ يَبْذُلُهُمْ
 اور واجب کرنا، اس سے ہر ایک کو اور گزرا کہ جو مثال سے کہ کوئی مثال ہوگی، اس پر کہ ہر ایک کو جو
 عَمَّا دَلَّ عَلَىٰ مَنَاسِكَتِهِمْ ۚ وَتَفَعَّلُوا مَا أَرَادَ اللَّهُ بِهِمْ أَنْ يَعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ يَبْذُلُهُمْ
 کے معاد کو کہ معبود ماننے کے بعد اور قطع کرنے میں، اس پر کہ ہر ایک کو جو
 يُؤْمَلُ وَيُفْعَلُ ۚ وَتَفَعَّلُوا مَا أَرَادَ اللَّهُ بِهِمْ أَنْ يَعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ يَبْذُلُهُمْ
 کو اور خدا کرتے ہیں ملک میں وہی ہیں تو لے والے۔

خُلَاصَةُ تَفْسِيرِ

وہم مخالفین نے قرآن کے کلام الہی بولنے پر اعتراض کیا تھا کہ اس میں بہت ہی حقیر و ذلیل چیزوں کا ذکر تعظیمات میں کیا گیا ہے جیسے چھوٹا، اگرچہ خدا کا کلام ہونا تو اس حقیر چیز کا ذکر اس میں، مگر ہر ایک کا واجب و ایمان کا، ہاں واقعی اللہ تعالیٰ تو ہمیں سزا دے گا کہ سب سے کہ کوئی مثال ہوگی، اس پر کہ ہر ایک کو جو

ہی کوئی ہے اس کے وہی کی جانب سے اور دیکھو وہ لوگ کہ جو کہتے ہیں ہر شے کے کہی ہو جائے
 وہ لوگ کہتے ہیں کہ کوئی کوئی مطلب ہے جس کا قصد کیا ہوگا، اللہ تعالیٰ نے اس حقیر مثال سے
 عزا کرتے ہیں اللہ تعالیٰ اس مثال کی وجہ سے ہر شے کو اور دیتے کہتے ہیں اس کی وجہ سے ہر شے کو
 اور گزرا کہتے ہیں اللہ تعالیٰ اس مثال سے کہی ہو کر صرف اللہ تعالیٰ کرنے والوں کو کہ کوئی مثال ہوگی، اس پر کہ ہر ایک کو جو
 ہیں اس معاد کو کہ اللہ سے کہتے ہیں اس کے استحکام کے بعد دینی عبادتوں میں اس میں سب کی
 اور اللہ نے اللہ تعالیٰ کے وہی کے کہ کوئی مثال ہوگی، اس پر کہ ہر ایک کو جو
 حکم دینے اور اللہ تعالیٰ نے اس پر کہ کوئی مثال ہوگی، اس پر کہ ہر ایک کو جو
 ہوں چہ ہند اور خدا کے درمیان ہیں، جو اس کے اور اقربا اور رشتہ داروں کے درمیان ہیں
 نام الہی اسلام کے درمیان ہیں اور جو خدا کے واسطے ہیں، اور خدا کے دینے ہیں
 ہیں کو کہ کوئی مثال ہوگی، اس پر کہ ہر ایک کو جو
 وہ بھی اس خدا میں شامل ہے، جس پر کہ کوئی مثال ہوگی، اس پر کہ ہر ایک کو جو
 آخرت کی نعمت سب ہاتھ سے دے دیتے، کیونکہ حاکم کی دینی زندگی میں ہمیشہ تلخ ہی رہتی ہے۔

معارف مسائل

نزل آیات پہلے فترت آن کریم صلی علیہ وسلم کے کہ فرشتے ان کریم
 میں کسی ملک و شہر کے کہ کوئی مثال ہوگی، اس پر کہ ہر ایک کو جو
 اس کے کلام الہی بولنے میں جو ہر شے کی صورت کی مثل بنا کر دکھلانے والا کیا
 میں مگر یہ قرآن کا ایک شہد ذکر کر کے اس کا جواب دیا گیا ہے، مشہور تھا کہ قرآن کریم میں
 عموماً وہ جہر جیسے حقیر و ذلیل کا ذکر آیا ہے، یا اللہ تعالیٰ کی اور اس کے کلام کی عظمت کے خلاف
 ہوا اگرچہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہونا تو اس میں ہی حقیر و ذلیل کا ذکر نہ ہونا، کیونکہ ہر شے کو
 الہی چیزوں کے ذکر سے شرم و حیا محسوس کرتے ہیں۔

جواب یہ دیا گیا کہ جب کسی حقیر و ذلیل چیز کی مثال دینی ہو تو کسی ایسی ہی حقیر چیز سے
 مثال دینا منافقانہ و خلاف فطرت ہے، اس غرض کے لئے اس حقیر گستاخی جیسے کا ذکر کرنا شرم و حیا
 کے تقاضا سے نہیں، اس لئے اللہ تعالیٰ الہی چیزوں کے ذکر سے نہیں شرماتے، اور یہ بھی بتا دیا
 کہ ایسے اعطاء شہادت صرف ان لوگوں کو کیا ہوا کرتے ہیں جن کے غلو اور مانوس سے ان کے
 مذکورہ وجہ سے کہتے ہیں کہ مصلحت مفقود ہوگی، ایمان والوں کو کسی ایسے شہادت مانگنے
 نہیں ہوتے۔

اس کے بعد اس کی ایک اور حکمت بھی بتلا دی کہ ایسی مثالوں سے لوگوں کا ایک امتحان بھی ہوتا ہے، نظر دیکھ کر نئے والوں کے لئے یہ مثالیں ہدایت کا سامان پیدا کرتی ہیں، اور بے پروائی برتنے والوں کے لئے اور زیادہ مگر ایسی کا سبب بنتی ہیں، اس کے بعد یہ بھی بتلا دیا کہ قرآن کریم کی ان مثالوں سے صرف ایسے سرکش لوگ گمراہ ہوتے ہیں جو اللہ تعالیٰ سے کئے ہوئے عہد کو توڑتے ہیں اور جن تعلقات و روابط کو اللہ نے جوڑنے کا حکم دیا ہے یہ لوگ اُن کو توڑتے ہیں، جس کا نتیجہ زمین میں فساد پھیلانا ہوتا ہے۔

بَعْرُوضَةٍ فَمَا خَوْفُهَا اس لفظ کے معنی یہ ہیں کہ ٹھنڈی ہو یا اس سے بھی زیادہ اس جگہ زیادہ سے زیادہ ہو کہ حقارت میں زیادہ ہو۔ (منظہری)

فَضْلُ يَهْ كَثِيرًا وَتَهْلِي يَهْ كَثِيرًا، قرآن اور اس کی مثالوں کے ذریعہ بہت سی مخلوق کو ہدایت کرنا تو ظاہر ہے، مگر اس کے ذریعہ بہت سے لوگوں کو گمراہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح یہ قرآن اس کے ماننے والوں اور اس پر عمل کرنے والوں کے لئے ذریعہ ہدایت ہے اسی طرح اس کا انکار کرنے والوں اور مخالفت کرنے والوں کے لئے ذریعہ گمراہی بھی ہے۔

وَمَا يُفْضِلُ بِهِ إِلَّا الْفَاسِقِينَ - فاسقین فسق کے لفظی معنی حسیب و باطن اور باہر کھل جانے کے ہیں، اصطلاح شرع میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت سے نکل جانے کو فسق کہتے ہیں، اور اطاعتِ الہیہ سے نکل جانا کفر و انکار کے ذریعہ بھی ہوتا ہے، اور علی ناسرمانی کے ذریعہ بھی، اس لئے لفظ فاسق کافر کے لئے بھی بولا جاتا ہے، قرآن کریم میں بیشتر لفظ فاسقین کا مشرور ہی کے لئے استعمال ہوا ہے، اور مؤمن غنا ہنگام کو بھی فاسق کہا جاتا ہے، فقہاء کی اصطلاح میں عموماً لفظ فاسق اس معنی کیلئے استعمال ہوا ہے کہ اصطلاح میں فاسق کو کافر کے بالمقابل اس کی تقسیم قرار دیا گیا ہے، جو شخص کسی کبیرہ گناہ کا ارتکاب کرے اور پھر اس سے توبہ بھی نہ کرے، یا صغیرہ گناہ پر اصرار کرے، اس کی عادت بنائے وہ فقہاء کی اصطلاح میں فاسق کہلاتا ہے، (منظہری) اور جو شخص یہ فسق کے کام اور گناہ علانیہ جرات کے ساتھ کرتا پھرے اس کو ناجر کہا جاتا ہے۔

معنی آیت کے یہ ہیں کہ قرآن کی ان مثالوں سے بہت سے لوگوں کو ہدایت ہوتی ہے، اور بہت سے لوگوں کے حصہ میں گمراہی آتی ہے، مگر ان مثالوں سے گمراہی صرف انہی لوگوں کا حصہ ہوتا ہے جو ناسخ یعنی اطاعت خداوندی سے بچل جانے والے ہیں، اور جن میں کچھ بھی خدا تعالیٰ کا خوف ہوتا ہو کہ وہ توبہ راست ہی حاصل کرتے ہیں۔

اَلَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِيثَاقِهٖۚ وَغَدَاۤءُ صُورَتِ ۙ حَامِلَةٌ اُوْر

جو قسم کے ساتھ مضبوط و مستحکم کیا جاتے۔

اس آیت میں پہلی آیت کے مضمون کی مزید تشریح ہے اور منکرینِ قرآن کے انجہام کا ذکر ہے کہ قرآن کی ان مثالوں سے جن پر مشرکین نے اعتراض کیا ہے صرف وہی لوگ گمراہ ہوتے ہیں جو حق تعالیٰ کی اطاعت و فرمانبرداری سے سرکشی کرتے ہیں جس کی ذکوہ ہے۔

اول یہ کہ ایسا کرنے والے اُس اِزلی معاہدے کو توڑ ڈالنے ہیں جو تمام انسانوں نے اپنے رب کے باندھا تھا، جبکہ تمام انسانوں کی اس عالم میں پیدائش سے پہلے حق تعالیٰ نے تمام پیدا ہونے والے انسانوں کی ارواح کو جمع کر کے ایک سوال فرمایا تھا کہ اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ کہ یعنی کیا میں تمہارا رب اور پروردگار نہیں ہوں؟ اُنس پر سب نے یک زبان ہو کر کہا تھا بلیٰ تین آپ رب کیوں نہ ہوتے؟ جس میں بڑی تاکید کے ساتھ اس کا اصرار ہے کہ اللہ جل شانہ ہمارے رب اور پروردگار ہیں، اور اس کا لازمی تقاضا یہ ہو کہ ہم اس کی اطاعت سے سب کو تجاوز نہ کریں، اس لئے یہ عہد اِزلی انسان اور اللہ جل شانہ کے درمیان ہو چکا، اب دنیا میں پیدا ہونے کے بعد تمام انبیاء علیہم السلام اور آسمانی کتابیں اسی عہد کی تجدید اور یاد دہانی اور اس پر عمل کی تفصیلات بتلانے کے لئے آئے ہیں، جس نے اس معاہدے ہی کو توڑ ڈالا، اس سے کیا توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ کسی سفیہ بڑا آسمانی کتاب سے فائدہ اٹھائے؟

دوسری وجہ یہ کہ ان لوگوں نے ان تمام تعلقات کو قلعہ کر ڈالا ہے جن کو جوڑے رکھنے کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا تھا، ان تعلقات میں وہ تعلق بھی داخل ہو جو بن برے اور اللہ کے درمیان ہے، اور وہ تعلق بھی جو انسان کا اپنے ماں باپ اور دوسرے عزیزوں سے ہے، اور وہ تعلق بھی جو ایک انسان کا اپنے پڑوسی اور دوسرے شہر کا کار کے ساتھ ہو، اور وہ تعلق بھی جو عام مسلمانوں یا عام انسانوں کے ساتھ ہے، ان تمام تعلقات کے پورے حقوق ادا کرنے ہی کا نام اسلام، یا شریعت اسلام ہے، اور انہی میں کوتاہی کرنے سے ساری زمین میں فساد آتا ہے، اسی لئے اس چلے کے بعد فرمایا **وَيُعْسِدُ دُونَ فِي الْأَرْضِ**، یعنی یہ لوگ زمین میں فساد پھالتے ہیں، ”آخر آیت میں ان کے انجام بد کا ذکر فرمایا کہ یہ لوگ بڑے خسارے میں ہیں۔

مثال میں کسی حقیر ذلیل یا شرمناک چیز کا ذکر کرنا کوئی عیب نہیں ہے

اِنْ اِنَّهٗ لَا يَسْتَحْيٰی سۡءَاۤىٕ هَآؤِہٖ اَکْثَرُ مِمَّا یُنْفَعُ النَّاسَ وَہُوَ لَیْسَ بِفَاحِشٍ عَلَیہٗ حِلٌّ وَلَا نَجِسٌ فَمَن زَادَ عَلَیہٗ فَسَادًا فَاُولٰٓئِکَ ہُمُ الْمُبْذَلُونَ

اور نہ قائل کی عظمت شان کے منافی ہے، قرآن و سنت اور علماء ملت کے اقوال میں بکثرت ایسی مثالیں بھی مذکور ہیں جو عرفاً شرمناک سمجھی جاتی ہیں، مگر قرآن و سنت نے اس عربی شعر و حکایت کی پرواہ کئے بغیر اصل مقصد پر نظر رکھ کر ان مثالوں سے اجتناب گوارا نہیں کیا۔

کریں گے زمین میں ایسے لوگوں کو جو خدا کریں گے اس میں اور خوں ریزیاں کریں گے اور ہم
برابر تہیج کرتے رہتے ہیں بعد ازاں اور آپ کی پاکی بیان کرتے رہتے ہیں فرشتوں کی یہ گزارش
نہ بطور اعتراض اور نہ اپنا استحقاق جاننے کے لئے، بلکہ فرشتوں کو کسی طرح یہ معلوم
ہو گیا تھا کہ جو نئی مخلوق زمین سے بنائی جائے گی ان میں ایک وہ ہر طرح کے لوگ ہونگے، بعض لوگ
اس نیابت کے کام کو اور زیادہ خراب کریں گے، اس لئے نیاز مندانہ عرض کیا کہ ہم سب کے
سب ہر خدمت کے لئے حاضر ہیں، اور اگر وہ ملائکہ میں کوئی گناہ کرنے والا بھی نہیں، اس لئے
کوئی نیا عمل بڑھانے اور نئی مخلوق پیدا کرنے کی ضرورت ہی کیلئے ہے، خصوصاً جبکہ اس نئی مخلوق
میں یہ بھی احتمال ہے کہ وہ آپ کی مرضی کے خلاف کام کریں گے جس سے آپ ناخوش ہوں ہم
ہر خدمت کے لئے حاضر ہیں اور ہماری خدمت آپ کی مرضی کے مطابق ہی ہوگی (حق تعالیٰ نے
ارشاد فرمایا کہ میں جانتا ہوں اس بات کو جس کو تم نہیں جانتے یعنی جو چیز تمہاری نظر میں تخلیق
بنی آدم سے مانع ہے کہ ان میں بعض فساد بھی پھیلا دیں گے وہی چیز درحقیقت ان کی تخلیق کا
اصلی سبب ہے، کیونکہ اجراء احکام و انتظام تو جہی وقوع میں آسکتا ہے جب کوئی اعتدال سے
تجاوز کرنے والا بھی ہو، یہ مقصود ہم فرما سہاراؤں کے جمع ہونے سے پورا نہیں ہو سکتا،
اور اعتدال سے تجاویز کر جانے والی ایک مخلوق جنات پہلے سے موجود تھی، اس سے یہ کام کیوں
نہ لیا گیا، اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کام کے لئے نوزوں وہ مخلوق ہو سکتی ہے جن میں شر و فساد کا
عنصر موجود ہو مگر غالب نہ ہو، جنات میں یہ عنصر غالب تھا، اس لئے تخلیق آدم کی تجویز فرمائی،
آگے اسی حکمت الہیہ کی مزید توضیح اس طرح کی گئی کہ نیابت خداوندی کے لئے ایک خاص علم کی
ضرورت ہے، وہ علم ملائکہ کی استعداد سے خارج ہے، اس لئے فرمایا کہ ہم دیکھا اللہ تعالیٰ نے
آدم علیہ السلام کو (ان کو پیدا کر کے) سب چیزوں کے اسماء کا یعنی سب چیزوں کے نام اور ان
کے خواص و آثار سب کا علم آدم کو دے دیا گیا، پھر وہ چیزیں فرشتوں کے رد ہر ذکر دیں پھر فرمایا
کہ بتلاؤ مجھ کو اسماء ان چیزوں کے (یعنی مع ان کے آثار و خواص کے) اگر تم پہنچے ہو (یعنی اپنے
اس قول میں پہنچے ہو کہ ہم خلافت ارضی کا کام اچھا انجام دے سکیں گے) فرشتوں نے عرض کیا کہ
آپ تو پاک ہیں اس الزام سے کہ آدم علیہ السلام پر اس علم کو ظاہر فرما دیا ہم سے پوشیدہ رکھا
کیونکہ کسی آیت یا روایت سے یہ ثابت نہیں ہے کہ آدم علیہ السلام کو علم اسماء کی تعلیم فرشتوں سے
لگ کر دی گئی، اس سے ظاہر یہ ہے کہ تعلیم تو سب کے سامنے یکساں دی گئی مگر آدم علیہ السلام
کی فطرت میں اس علم کے حاصل کر لینے کی صلاحیت تھی انھوں نے حاصل کر لیا، فرشتوں کی طبیعت
اس کی متحمل نہ تھی ان کو یہ علم حاصل نہ ہوا، مگر ہم کو ہی علم نہیں مگر وہی جو کچھ آپ نے ہم کو علم دیا

بیشک آپ بڑے علم والے ہیں حکمت والے ہیں ذکر جس قدر جس کے لئے مصلحت جانا
اسی قدر علم و فہم اس کو عطا فرمایا، اس سے فرشتوں کا یہ اعتراض تو ثابت
ہو گیا کہ وہ اس کام سے عاجز ہیں جو نائب کے سپرد کرنا ہے، آگے حق تعالیٰ
کو یہ منظور ہوا کہ آدم علیہ السلام میں اس علم خاص کی مناسبت کو فرشتوں کے
سامنے آشکارا فرمادیں، اس لئے احق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ اے آدم
تم بتلاؤ ان کو ان چیزوں کے اسماء (یعنی مع حالات و خواص کے جب
آدم علیہ السلام نے یہ سب فرشتوں کے رد ہر بتلا دیا تو فرشتے اتنا سمجھ گئے
کہ آدم علیہ السلام اس علم کے ماہر ہو گئے ہیں) سو جب بتلا دیے ان کو
آدم علیہ السلام نے ان چیزوں کے اسماء تو حق تعالیٰ نے فرمایا رد بھو
میں تم سے نہ کہتا تھا کہ بیشک میں جانتا ہوں تمام پوشیدہ چیزیں
آسمانوں کی اور زمین کی اور جانتا ہوں جس بات کو ظاہر کر دیتے ہو
اور جس کو دل میں رکھتے ہو۔

معارف مسائل

رابط آیات | پچھل آیات میں اللہ جل شانہ کی خاص و عام نعمتوں کا ذکر کر کے
انسان کو ناشکری اور نافرمانی سے بچنے کی ہدایت کی گئی،

اس آیت سے آخر رکوع تک دس آیتوں میں آدم علیہ السلام کا قصہ بھی اسی سلسلہ میں ذکر فرمایا ہے،
کیونکہ نعمت و وقیم کی ہوتی ہے، ایک صوری بین محسوس، جیسے کھانا، پینا، روپیہ، مکان، جائیداد
دوسری معنوی، جیسے عزت و آبرو، مسرت، علم، پچھل آیات میں صوری اور ظاہری نعمتوں کا ذکر
تھا، اور ان گیارہ آیتوں میں معنوی نعمتوں کا ذکر ہے، کہ ہم نے تمہارے باپ آدم علیہ السلام کو
دولت علم دی، اور سجدہ ملائکہ بنانے کی عزت دی، اور تم کو ان کی اولاد میں ہونے کا فخر عطا کیا۔
خلاصہ مضمون آیت کا یہ ہے کہ اللہ جل شانہ نے جب تخلیق آدم اور دنیا میں اس کی خلافت
قائم کرنے کا ارادہ کیا، تو فرشتوں سے لفظ ہران کا امتحان لینے کے لئے اس ارادے کا ذکر فرمایا
جس میں اشارہ یہ تھا کہ وہ اس معاملے میں اپنی رائے کا اظہار کریں، فرشتوں نے رائے یہ پیش کی
کہ انسانوں میں تو ایسے لوگ بھی ہوں گے جو فساد اور خوں ریزی کریں گے، ان کو زمین کی خلافت اور
انتظام سپرد کرنا سمجھ میں نہیں آتا، اس کام کے لئے تو فرشتے زیادہ انسب معلوم ہوتے ہیں، کہ

نیکی ان کی فطرت ہے، بُرائی کا صدور ہی ان سے ممکن نہیں، وہ مکمل اطاعت گزار ہیں، دنیا کے متطلباً بھی وہ درست کر سکیں گے، اللہ تعالیٰ نے ان کی رائے کے غلط ہونے کا اظہار اول ایک حاکمانہ طرز سے دیا کہ خلافت ارضی کی حقیقت اور اس کی ضروریات سے ہم واقف نہیں، اس کو میں ہی مکمل طور پر جانتا ہوں۔

پھر دوسرا جواب حکیمانہ انداز سے آدم علیہ السلام کی فرشتوں پر ترجیح، اور مقام علم میں آدم کے تفوق کا ذکر کر کے دیا گیا، اور بتلایا گیا کہ خلافت ارض کے لئے زمین خلوقات کے نام اور ان کے خواص و آثار کا جاننا ضروری ہے اور فرشتوں کی استعداد اس کی متعلیٰ نہیں۔

یہاں یہ بات غور طلب ہو کہ حضرت حق جل و علا شانہ کا فرشتوں کی مجلس میں اس واقعہ کا اظہار کس حیثیت سے تھا؟ کیا ان سے مشورہ لینا مقصود تھا؟ یا محض ان کو اطلاع دینا پیش نظر تھا؟ یا فرشتوں کی زبان سے ان کی رائے کا اظہار کرنا اس کا منشاء تھا؟

سو یہ بات ظاہر ہے کہ مشورہ کی ضرورت تو وہاں پیش آتی ہے جہاں مسئلہ کے سب پہلو کسی پر روشن نہ ہوں، اور اپنے علم و بصیرت پر مکمل اطمینان نہ ہو، اس لئے دوسرے عقلاء و اہل دانش سے مشورہ کیا جاتا ہے، یا ایسی صورت میں جہاں حقوق و دوسروں کے بھی مساوی ہوں تو ان کی رائے لینے کے لئے مشورہ ہوتا ہے، جیسے دنیا کی عام کونسلوں میں رائج ہے، اور یہ ظاہر ہے کہ یہاں دونوں صورتیں نہیں ہو سکتیں، اللہ سبحانہ و تعالیٰ خالق کائنات ہیں، ذرہ ذرہ کا علم رکھتے ہیں اور ظاہر و باطن ہر چیز ان کے علم و بصیرت کے سامنے برابر ہے، ان کو کیا ضرورت کہ کسی سے مشورہ لیں!

اسی طرح یہاں یہ بھی نہیں کہ کوئی پارلیمانی حکومت ہو، جس میں تمام ارکان کے مساوی حقوق ہیں، اور سب سے مشورہ لینا ضروری ہو، کیونکہ اللہ تعالیٰ ہی سب کے خالق اور مالک ہیں، فرشتے ہوں یا جن و انس سب ان کی مخلوق و ملک ہیں، کسی کو حق نہیں کہ ان کے کسی فعل کے متعلق سوال بھی کر سکے کہ آپ نے یہ کیوں کیا اور فلاں کام کیوں نہیں کیا، لَایَسْئَلُ عَنْهَا شَيْءٌ وَهُمْ لَیَسْئَلُونَ (۱۲: ۱۱) اللہ تعالیٰ سے اس کے کسی فعل کے متعلق سوال نہیں کیا جاسکتا اور سب سے ان کے اعمال کا سوال کیا جاسکتا ہے۔

بات یہی ہو کہ درحقیقت یہاں مشورہ لینا مقصود نہیں اور نہ اس کی ضرورت، مگر صورت مشورہ کی بنائی گئی، جس میں مخلوق کو سنت مشورہ کی تعلیم کا فائدہ ہو سکتا ہے، جیسے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو صحابہ کرام سے مشورہ لینے کی ہدایت قرآن میں فرمائی گئی، حالانکہ آپ تو صاحب وحی ہیں، تمام معاملات اور ان کے تمام پہلو آپ کو بذریعہ وحی بتلائے جاسکتے تھے،

مگر آپ کے ذریعہ مشورہ کی سنت جاری کرنے اور امت کو سکھانے کے لئے آپ کو بھی مشورے کی تائید فرمائی گئی۔

غرض فرشتوں کی مجلس میں اس واقعہ کے اظہار سے ایک فائدہ تو تعلیم مشورہ کا حاصل ہوا رکمانی روح البیان، دوسرا فائدہ خود الفاظ قرآنی کے اشارہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انسان کی پیدائش سے پہلے فرشتے یہ سمجھتے تھے کہ ہم سے زیادہ افضل و اعلم کوئی مخلوق اللہ تعالیٰ پیدا نہیں کریں گے۔

اور تفسیر ابن جریر میں حضرت عبد اللہ بن عباس سے ایک روایت میں اس کی تصریح بھی ہے کہ خلقت آدم علیہ السلام سے پہلے فرشتے آپس میں کہتے تھے کہ اَللّٰهُ یَخْلُقُ اللّٰهُ خَلْقًا اَکْثَرُ عَلَیْہِ مَا ذَلَا اَعْلَمُ رَبِّیْ اللّٰهُ تعالیٰ کوئی مخلوق ہم سے افضل اور اعلم پیدا نہ فرما دیں گے، حضرت حق جل شانہ کے علم میں تھا کہ ایک ایسی مخلوق بھی پیدا کرنا ہے جو تمام خلوقات سے زیادہ افضل و اعلم ہوگی، اور جس کو اپنی خلافت و نیابت کا خلعت عطا کیا جائے گا۔

اس لئے فرشتوں کی مجلس میں آدم علیہ السلام کو پیدا کرنے اور زمین کے نائب بنانے کا ذکر کیا گیا کہ وہ اپنے خیال کا اظہار کریں۔

چنانچہ فرشتوں نے اپنے علم و بصیرت کے مطابق نیاز مندی کے ساتھ رائے کا اظہار کیا کہ جس مخلوق کو آپ خلیفہ زمین بنائے ہیں، اس میں تو شر و فساد کا مادہ بھی ہے، وہ دوسروں کی اصلاح اور زمین میں امن و امان کا انتظام کیسے کر سکتا ہے، جبکہ وہ خود خویشی کا بھی مرکز ہوگا، اس سے بچائے آپ کے فرشتوں میں شر و فساد کا کوئی مادہ نہیں، وہ خطا و غلطی سے معصوم ہیں، اور ہر وقت آپ کی تسبیح و تقدیس اور عبارت و اطاعت میں لگے ہوتے ہیں، وہ بظاہر اس خدمت کو اچھی طرح انجام دے سکتے ہیں۔

غرض اس سے معاذ اللہ حضرت حق جل شانہ کے فعل پر اعتراض نہیں، کیونکہ فرشتے ایسے خیالات و حالات سے معصوم ہیں، بلکہ مقصد محض دریافت کرنا تھا، کہ ایک ایسی معصوم جماعت کے موجود ہوتے ہوئے دوسری غیر معصوم مخلوق پیدا کر کے یہ کام اُس کے حوالے کرنا اور اس کو ترجیح دینا کس حکمت پر مبنی ہے!

چنانچہ اس کے جواب میں پہلے تو حق تعالیٰ نے اجمالی طور پر یہ فرمایا کہ: اِنِّیْ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ، یعنی تم خلافت الہیہ کی حقیقت اور اس کے لوازم سے واقف نہیں، اس لئے یہ سمجھ رہے ہو کہ ایک معصوم مخلوق ہی اس کو انجام دے سکتی ہے، اس کی پوری حقیقت کو ہم ہی جانتے ہیں۔

اس کے بعد فرشتوں کو اس کا کچھ تفصیل علم کرانے کے لئے ایک خاص واقعہ کا اظہار کیا گیا کہ تمام کائنات عالم کے نام اور ان کے خواص و آثار جن کے علم کی صلاحیت صرف آدم علیہ السلام ہی میں ودیعت کی گئی تھی، فرشتوں کی فطرت و جبلت اس کے مناسب نہ تھی، وہ سب آدم علیہ السلام کو سکھاتے اور بتلاتے گئے تھے، مثلاً دنیا کی نافع و مضر چیزیں اور ان کے خواص و آثار، ہر جان دار اور ہر قوم کے مزاج و طبائع اور ان کے آثار، ان چیزوں کے حصول کرنے کے لئے طبیعت ملکی متعل نہیں، فرشتہ کیا جالے کہ بھوک کیا ہوتی ہے، پیاس کی تکلیف کیسی ہوتی ہے، انسانی جذبات کا کیا اثر ہوتا ہے، کسی چیز سے نشہ کس طرح پیدا ہوتا ہے، سانپ اور بھوکا زہر کس بدن پر کیا اثر کرتا ہے۔

غرض زمینی مخلوقات کے نام اور خواص و آثار کی دریافت فرشتوں کے مزاج اور مخصوص طبیعت سے بالکل علیحدہ چیز تھی، یہ علم صرف آدم ہی کو سکھایا جاسکتا تھا، انہیں کو سکھایا گیا، پھر فرشتوں کی کسی تصریح یا اشارہ سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ آدم علیہ السلام کو یہ تعلیم کسی بہتانی میں فرشتوں سے ملنے دی گئی، اس لئے ہر کتاب کے تعلیم سب کے لئے عام ہی ہو، مگر اس تعلیم سے فائدہ اٹھانا آدم علیہ السلام کی طبیعت میں تھا وہ سیکھ گئے، فرشتوں کی فطرت میں تھا وہ نہ سیکھ سکے، اسی لئے یہاں تعلیم کو آدم کی طرف منسوب کیا گیا، اگرچہ یہ تعلیم فی نفسہ عام تھی، آدم اور ملائکہ دونوں کو شامل تھی، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ظاہری تعلیم کی صورت ہی عمل میں نہ آئی ہو، بلکہ آدم علیہ السلام کی فطرت میں ان چیزوں کا علم ابتدا سے آفرینش سے ودیعت کر دیا گیا ہو، جیسے بچہ ابتداء ولادت میں ماں کا دودھ پینا جانتا ہے، چلنے کا پتہ پیرنا جانتا ہو، اس میں کسی ظاہری تعلیم کی ضرورت نہیں ہوتی۔

اب رہا یہ سوال کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت میں تو سب کچھ ہو، وہ فرشتوں کا مزاج اور طبیعت بدل کر ان کو بھی یہ چیزیں سکھا سکتے تھے، تو ان کو کیوں نہ سکھایا گیا، مگر اس کا ماحول تو یہ ہوا کہ فرشتوں کو ہی انسان کیوں نہ بنادیا، کیونکہ اگر فرشتوں کی جبلت و فطرت کو بدل جاتا تو پھر وہ فرشتے نہ رہتے، بلکہ انسان ہی ہو جاتے۔

خلاصہ یہ کہ زمینی مخلوقات کے اسماء اور ان کے خواص و آثار کا آدم علیہ السلام کو علم دیا گیا، جو فرشتوں کے بس کا نہیں تھا، اور پھر ان مخلوقات کو فرشتوں کے سامنے کر کے سوال کیا گیا کہ اگر تم اپنے اس خیال میں پتے ہو کہ ہم سے زیادہ کوئی مخلوق اعلم و افضل پیدا نہیں ہوگی، یا یہ کہ زمین کی خلافت و نیابت کے لئے فرشتے بہ نسبت انسان زیادہ موزوں ہیں تو ان چیزوں کے نام اور خواص بتلاؤ جن پر خلیفہ زمین کو حکومت کرنا ہے۔

یہاں سے یہ فائدہ بھی حاصل ہو گیا کہ ماکم کے لئے ضروری ہو کہ اپنی محکوم رعایا کے مزاج و طبائع سے اور ان کے خواص و آثار سے پروراد اہت ہو، اس کے بغیر وہ ان پر عدل و انصاف کے ساتھ حکمرانی نہیں کر سکتا، جو شخص یہ نہیں جانتا کہ بھوک سے کیسی اور کتنی تکلیف ہوتی ہے، اگر اس کی عدالت میں کوئی دعویٰ کرے کہ بھوکا رکھنے کے متعلق پیش ہو تو وہ اس کا فیصلہ کیا اور کس طرح کرے گا؟ غرض اسی واقعہ سے حق تعالیٰ نے فرشتوں کو یہ بتلادیا کہ زمین کی نیابت کے لئے معصوم و موزوں ہیں، بلکہ اس کو دیکھنا ہے کہ وہ زمین کی چیزوں سے پروراد اہت ہو، ان کے استعمال کے طریقوں اور ان کے اثرات کو جانتا ہو، اگر تمہارا یہ خیال صحیح ہو کہ فرشتے اس خدمت کے لئے زیادہ موزوں ہیں تو ان چیزوں کے نام اور خواص بتلاؤ۔

فرشتوں کا اظہار رائے چونکہ کسی اعتراض یا فخر و غرور یا اپنا استحقاق جتلانے کے لئے نہیں، بلکہ بعض اپنے خیال کا اظہار ایک نیاز مند خادم کی طرح اپنی خدمات پیش کرنے کے لئے تھا، اس لئے قرآن بول اٹھے، سُبْحَنَكَ لَا عِلْمَ لَنَا إِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا إِنَّكَ أَنْتَ الْعَلِيمُ الْحَكِيمُ (پاک ہیں آپ، ہم کو علم نہیں، مگر وہی جو آپ نے عطا فرمایا، بے شک آپ بڑے علم و حکمت والے ہیں) جس کا حاصل اپنے خیال سے رجوع اور اس کا امتداد تھا کہ زیادہ اعلم و افضل مخلوق بھی موجود ہے، اور یہ کہ زمین کی نیابت کے لئے وہی موزوں ہیں۔

دوسرا سوال اس جگہ یہ ہوا کہ فرشتوں کو اس کی کیسے خبر ہوئی کہ انسان خوں ریزی کرے گا، کیا انہیں علم غیب تھا؟ یا محض اہل اور تخمینہ سے انہوں نے یہ سمجھا تھا؟

اس کا جواب جمہور محققین کے نزدیک یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہی ان کو انسان کے حالات اور اس کے ہونے والے معاملات بتلا دیئے تھے، جیسا کہ بعض آثار میں ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے آدم علیہ السلام کو خلیفہ زمین بنانے کا ذکر فرمایا، تو فرشتوں نے اللہ تعالیٰ ہی سے اس خلیفہ کا حال دریافت کیا، اللہ سبحانہ و تعالیٰ ہی نے ان کو بتلایا (روح المعانی) اس سے فرشتوں کو تعجب ہوا کہ جب انسان کا یہ حال ہے کہ وہ فساد و خوں ریزی بھی کرے گا تو اس کو نیابت زمین کے لئے منتخب فرمائا کس حکمت پر مبنی ہے۔

اسی کا ایک جواب تو حضرت حق جل شانہ کی طرف سے آدم علیہ السلام کے علی تفوق کا اظہار فرما کر دیا گیا، اور فساد و خوں ریزی سے جو شبہ اس کے استحقاق نیابت پر کیا گیا تھا، اس کا جواب اپنی إِنِّي آخِذٌ بِمَا لَكُمْ مَعَكُمْ میں اجمالاً دیدیا گیا، جس میں اشارہ ہے کہ جس چیز کو تم نیابت و خلافت کے منافی سمجھو، ہو درحقیقت وہ ہی اس کی الہیت کا بڑا سبب ہے، کیونکہ نیابت زمین کی ضرورت ہی رفع فساد کے لئے ہے، جہاں فساد نہ ہو وہاں خلیفہ اور نائب

بھیجے گی ضرورت ہی نہیں، غرض یہ بتلادیا گیا کہ منشاء الہی یہ ہو کہ جس طرح اس نے ایک ایسی مقدس معصوم مخلوق فرشتے پیدا کر دیے جس سے کسی گناہ کا صدور ہو ہی نہیں سکتا، اور جس طرح اس نے شیطا طین پیدا کر دیئے جن میں نیکی اور بھلائی کی صلاحیت نہیں، اسی طرح ایک ایسی مخلوق بھی پیدا کرنا منشاء حسد اور ہمدی ہے، جس میں خیر و شر نیکی اور بدی کا مخلوط مجموعہ ہو، اور جس میں خیر و شر کے دونوں جذبات ہوں، اور جو جذباتِ شر کو مغلوب کر کے خیر کے میدان میں آگے بڑھے، اور رضائے خداوندی کا خلعت حاصل کرے۔

واضح لغت خود حق تعالیٰ ہیں | اس قصہ آدم علیہ السلام اور تعلیم اسماء کے واقعہ سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ زبان اور لغت کے اصل واضع خود حق سبحانہ و تعالیٰ ہیں، پھر اس میں مخلوق کے ہستعالات سے مختلف صورتیں اور مختلف زبانیں پیدا ہو گئیں، امام اشعریؒ نے اسی آیت سے استدلال کر کے اللہ سبحانہ و تعالیٰ ہی کو واضح لغت قرار دیا ہے۔

آدم علیہ السلام کا تفوق فرشتوں پر | اس واقعہ میں شرآن حکیم کے یہ ملیح الفاظ بھی قابلِ نظر ہیں کہ جب فرشتوں کو خطاب کر کے منبرمایا کہ ان چیزوں کے نام بتلاؤ لفظ **أَمْسِكُوا** ارشاد فرمایا کہ مجھے بتلاؤ، اور جب آدم علیہ السلام کو اسی چیز کا خطاب ہوا تو لفظ **أَمْسِكْهُمْ** فرمایا گیا، یعنی آدم علیہ السلام کو حکم ہوا کہ فرشتوں کو یہ اسماء بتلائیں۔

اس طرز بیان کے فرق سے واضح ہو گیا کہ آدم علیہ السلام کو معلم کا درجہ دیا گیا، اور فرشتوں کو طالب علم کا، جس میں آدم علیہ السلام کی فضیلت و تفوق کا ایک اہم صورت سے اظہار کیا گیا ہے اس واقعہ سے یہ بھی معلوم ہوا کہ فرشتوں کے علوم میں بھی کمی اور زیادتی ہو سکتی ہے کیونکہ جن چیزوں کا ان کو علم نہیں تھا، آدم علیہ السلام کے ذریعہ ان کو بھی ان چیزوں کا اجمال طور پر کسی نہ کسی درجہ میں علم ویدر یا گیا۔

خلافت ارض کا مسئلہ | زمین کا انتظام اور اس میں خدا کا قانون نافذ کرنے کے لئے اس کی طرف سے کس نائب کا معتبر رہونا، جو ان آیات سے معلوم ہوا، اس سے دستورِ مملکت کا اہم باب نکل آیا، کہ اقتدار اعلیٰ تمام کائنات اور پوری زمین پر صرف اللہ تعالیٰ کا ہو، جیسا کہ شرآن مجید کی بہت سی آیات اس پر شاہد ہیں: **إِنَّ الْخَلْقَ وَالْإِیْثَاقَ وَالْأَمْرَ وَالْأَمْرَ وَالْأَمْرَ وَالْأَمْرَ** اور **لَهُ مُلْكُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ** (۱۰: ۳۲) اور **لَهُ الْوَلَدُ الْأَوَّلُ وَالْآخِرُ وَالْأَوَّلُ وَالْآخِرُ** (۵۴: ۵۴) وغیرہ زمین کے انتظام کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے نائب آتے ہیں، جو باؤن حسد اور ہمدی زمین پر سیاست و حکومت اور ہنگام خسد ایتعالیٰ کی تعلیم و تربیت کا کام کرتے اور احکامِ الہیہ کو نافذ کرتے ہیں، اس خلیفہ و نائب کا اقتدار بلاد اسطہ خود حق تعالیٰ کی طرف سے ہوتا ہے، اس میں کسی کے کسبِ عمل کا کوئی دخل

نہیں، اسی لئے پوری اُمت کا اجماعی عقیدہ ہے کہ نبوت کسی پسند نہیں، جس کو کوئی اپنی سی دھاری سے حاصل کر سکے، بلکہ حق تعالیٰ ہی خود اپنے علم و حکمت کے تقاضے سے خاص خاص افراد کو احکام کیلئے مقرر فرماتا ہے، جن کو اپنا نبی و رسول یا خلیفہ و نائب قرار دیتے ہیں، شرآن حکیم نے جگہ جگہ اس کا اظہار فرمایا ہے، ارشاد ہے:

اللَّهُ يَصْطَفِي مِنَ الْمَلَائِكَةِ رُسُلًا وَمِمَّنِ الْإِنسَانِ إِنَّ اللَّهَ يُصْطَفِي
اللَّهُ تَعَالَى يَخْتَارُ مَن يَشَاءُ فَمَا هِيَ شِئْتُهُمْ
اللَّهُ تَعَالَى يَخْتَارُ مَن يَشَاءُ فَمَا هِيَ شِئْتُهُمْ

نیز ارشاد ہے: **اللَّهُ آخِذٌ بِعَمَلِكُمْ** (۱۲۴: ۶) **اللَّهُ آخِذٌ بِعَمَلِكُمْ** اس آیت میں خوب جانتے ہیں کہ اپنی رستہ کس کو عطا فرمادیں؟

یہ خلیفہ اللہ بلا واسطہ حق تعالیٰ سے اس کے احکام معلوم کرتے، اور پھر ان کو دنیا میں نافذ کرتے ہیں، یہ سلسلہ خلافت و نیابت الہیہ کا آدم علیہ السلام سے شروع ہو کر خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم تک ایک ہی انداز میں چلتا رہا، یہاں تک کہ حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم اس زمین پر اللہ تعالیٰ کے آخری خلیفہ ہو کر ہیبت ہی اہم خصوصیات کے ساتھ تشریف لاتے۔

ایک خصوصیت یہ تھی کہ آپ سے قبل نہ سبباً خاص خاص قوموں یا ملکوں کی مسرت و معیشت ہوتے تھے، ان کا حلقہ حکومت و اختیار اپنی قوموں اور ملکوں میں محدود ہوتا تھا، ابراہیم علیہ السلام ایک قوم کی طرف، لوط علیہ السلام دوسری قوم کی طرف مبعوث ہوئے، حضرت موسیٰ اور عیسیٰ علیہما السلام اور ان کے درمیان آنے والے انبیاء بنی اسرائیل کی طرف بھیجے گئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو پورے عالم اور اس کی دونوں قوم جنات و انسان کی زمین میں اللہ کے آخری خلیفہ طرف بھیجا گیا، آپ کا اقتدار و اقتدار پوری دنیا کی دونوں قوموں پر حاوی ہیں اور آپ کی خصوصیات، فرمایا گیا، شرآن کریم نے آپ کی پشت و نبوت کے عام ہونے کا اعلان اس آیت میں فرمایا:

قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ
إِنِّي أَنَا اللَّهُ الَّذِي لَمْ يَلِدْ وَلَدًا
لَمْ يَلِدْ وَلَدًا وَلَمْ يَلِدْ وَلَدًا
لَمْ يَلِدْ وَلَدًا وَلَمْ يَلِدْ وَلَدًا

اور صحیح مسلم کی حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے تمام انبیاء

علیہم السلام پر چھ چیزوں میں خاص فضیلت بخشی گئی ہے، ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ آپ کو تمام عالم کا نبی و رسول بنا کر بھیجا گیا۔

دوسری خصوصیت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ ہے کہ پچھلے انبیاء کی خلافت دنیایت جس طرح خاص خاص ملکوں اور قوموں میں محدود ہوتی تھی اسی طرح ایک خاص زمانے کے لئے مخصوص ہوتی تھی، اُس کے بعد دوسرا رسول آجاتا، تو پہلے رسول کی خلافت دنیایت ختم ہو کر آنے والے رسول کی خلافت قائم ہو جاتی تھی۔

ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو حق تعالیٰ نے خاتم الانبیاء بنا دیا، کہ آپ کی خلافت دنیا قیامت تک قائم رہے گی، اُس کا زمانہ بھی کوئی مخصوص زمانہ نہیں، بلکہ جب تک زمین آسمان قائم اور زمانہ کا وجود ہے وہ بھی قائم ہے۔

تیسری خصوصیت یہ ہے کہ پچھلے انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات و شریعت ایک زمانہ تک محفوظ رہتی اور چلتی تھی، رفتہ رفتہ اُس میں تحریفات ہوتے ہوئے وہ کالعدم ہو جاتی تھیں، اُس وقت کوئی دوسرا رسول اور دوسری شریعت بھیجی جاتی تھی۔

ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ خصوصیت ہے کہ آپ کا دین آپ کی شریعت قیامت تک محفوظ رہے گی، مسترآن خیدر جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا اس کے الفاظ اور معانی سب چیزوں کی حفاظت اللہ تعالیٰ نے خود اپنے ذمہ لے لی، اور ارشاد فرمایا:

إِنَّا نَحْنُ حَافِظُونَ مَا نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ (۹۱: ۵)

کے محافظ ہیں

اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات و ارشادات جن کو حدیث کہا جاتا ہے، اس کی حفاظت کا بھی اللہ تعالیٰ نے ایک خاص انتظام فرما دیا، کہ قیامت تک آپ کی تعلیمات اور ارشادات کو جان سے زیادہ عزیز سمجھنے والی ایک جماعت باقی رہے گی، جو آپ کے علوم و معارف اور آپ کے شرعی احکام صحیح صحیح لوگوں کو پہنچاتی رہے گی، کوئی اس جماعت کو نشانہ نہ کیا گا اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ان کے ساتھ رہے گی۔

خلاصہ یہ ہے کہ پچھلے انبیاء علیہم السلام کی کتابیں اور صحیفے سب مٹ و محو ہو جاتے، اور بالآخر دنیا سے گم ہو جاتے، یا غلط سلط باقی رہتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی کتاب قرآن اور آپ کی بتلائی ہوئی ہدایت حدیث سب کی سب اپنے اصل خود و خال کے ساتھ قیامت تک موجود و محفوظ رہیں گی، اسی لئے اس زمین پر آپ کے بعد نہ کسی نے نبی اور رسول کی ضرورت ہے، نہ کسی اور خلیفہ اللہ کی گنجائش۔

چوتھی خصوصیت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ ہے کہ پچھلے انبیاء کی خلافت دنیایت جو محدود و جزا کے لئے ہوتی تھی ہر نبی و رسول کے بعد دوسرا رسول مخاب اللہ مقرر ہوتا اور نیابت کا کام سنبھالتا تھا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ خلافت دنیایت و نیابت ا قیامت کے بعد نظام خلافت ہے، اس لئے قیامت تک آپ ہی اس زمین میں خلیفہ اللہ ہیں، آپ کی کائنات کے بعد نظام عالم کیلئے جو نائب ہوگا وہ خلیفہ الرسول اور پیکار نائب ہوگا، صحیح بخاری میں ہے کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا:

كَانَتْ بَيْنَنا وَبَيْنَ مَنْ بَعْدَنا ثَلَاثُ شَيْئَاتٍ: الْأَوَّلُ نَبِيٌّ كَمَا هَلَكَ مِنْبَغِي خَلْفَهُ نَبِيٌّ دَلَّيْهُ لَا نَبِيَّ بَعْدِي شَيْءٌ وَتَسِيكُونُ خَلْفَاءَ فَتَكُونُونَ

”بنی اسرائیل کی سیاست، و حکومت ان کے انبیا کرتے تھے، ایک نبی فوت ہوتا تو دوسرا نبی آ جاتا تھا، اور خبردار ہو کر میرے بعد کوئی نبی نہیں، اہل میرے خلیفہ ہوں گے اور بہت ہوں گے۔“

پانچویں خصوصیت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ ہے کہ آپ کے بعد آپ کی امت کے مجموعے کو اللہ تعالیٰ نے وہ مقام عطا فرمایا جو انبیاء علیہم السلام کا ہوتا ہے، یعنی امت کے مجموعے کو معصوم قرار دیا، کہ آپ کی پوری امت کبھی گمراہی اور غلطی پر جمع نہ ہوگی، یہ پوری امت جس مسئلہ پر اجماع و اتفاق کرے وہ حکم خداوندی کا منظر سمجھا جائے گا، اسی لئے کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کے بعد اسلام میں تیسری حجت اجماع امت تسلر دی گئی ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

فَنُجِيعُ أُمَّتِي عَلَى الْفَلَاحِ

اس کی مزید تفصیل اُس حدیث سے معلوم ہوتی ہے جس میں یہ ارشاد ہے کہ میری امت میں ہمیشہ ایک جماعت حق پر قائم رہے گی، دنیا کتنی ہی بدل جائے، حق کتنا ہی مضل ہو جائے، مگر ایک جماعت حق کی حمایت ہمیشہ کرتی رہے گی، اور انجام کار وہی غالب رہے گی۔

اس سے ہمیں واضح ہو گیا کہ پوری امت کبھی گمراہی اور غلطی پر جمع نہ ہوگی، اور جب کہ امت کا مجموعہ معصوم قرار دیا گیا تو خلیفہ رسول کا انتخاب بھی اُسی کے سپرد کر دیا گیا، اور خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نیابت زمین اور نظم حکومت کے لئے انتخاب کا طریقہ مشروع ہو گیا، یہ امت جسے خلافت کے لئے منتخب کرے وہ خلیفہ رسول کی حیثیت سے نظام عالم کا واحد ذمہ دار ہوگا، اور خلیفہ سائے عالم کا ایک ہی ہو سکتا ہے۔

خلفائے راشدین کے آخری عہد تک یہ سلسلہ خلافت صحیح اصول پر چلتا رہا، اور اسی لئے ان کے فیصلے صرف دینی اور ہنگامی فیصلوں کی حیثیت نہیں رکھتے، بلکہ ایک محکم دستاویز

اور ایک درجہ میں امت کے لئے حجت مانے جاتے ہیں، کیونکہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان متعلق منبرایا:

عليكم بسنتي وسنة الخلفاء
الراشدين

خلافت راشدہ کے بعد خلافت راشدہ کے بعد کچھ طوائف الملوکی کا آغاز ہوا، مختلف خطوں میں مختلف امیر بنائے گئے، ان میں سے کو بھی خلیفہ کہلانے کا مستحق نہیں، ہاں کسی ملک یا قوم کا امیر خاص کہا جاسکتا ہے اور جب پوری دنیا کے مسلمانوں کا اجتماع کسی ایک فرد پر متعذر ہو گیا، اور ہر ملک ہر قوم کا ملحدہ علیحدہ امیر بنانے کی رسم چل گئی، تو مسلمانوں نے اس کا تقرر اسی اسلامی نظریہ کے تحت جاری رکھا، کہ ملک کے مسلمانوں کی اکثریت جس کو امیر منتخب کرے وہ ہی اس ملک کا امیر اور امام کہلائے، قرآن مجید کے ارشاد: **وَأَمْرُهُمْ شُورَى بَيْنَهُمْ** (۲۸۱:۲) کے عموم سے اس پر استدلال کیا جاسکتا ہے۔

مغربی جمہوریت اور اسلامی جمہلیاں اسی طرز عمل کا ایک نمونہ ہیں، فرق اتنا ہے کہ جمہوری ملکوں کی اسمبلی اور ان کے ممبران شورا میں مسروق بالکل آزاد و خود مختار ہیں، محض اپنی رائے سے جو چاہیں اچھا یا برا قانون بناتے ہیں، اسلامی اسمبلی اور اس کے ممبران اور منتخب کردہ امیر سب اس اصول و قانون کے پابند ہیں جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ ان کو ملا ہے، اس اسمبلی یا مجلس شوریٰ کی ممبری کے لئے بھی کچھ شرائط ہیں، اور جس شخص کو یہ منتخب کریں اس کے لئے بھی کچھ حدود و قیود ہیں، پھر ان کی قانون سازی بھی شریعت کے تحت کے تحت کے اصول کے دائرہ میں ہو سکتی ہے، اس کے خلاف کوئی قانون بنانے کا ان کو اختیار نہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے اپنے فرشتوں کو مخاطب کر کے جو ارشاد فرمایا کہ میں زمین میں اپنا نائب بنانے والا ہوں، اس سے دستور مملکت کی چند اہم دفعات پر روشنی پڑتی ہے۔ آیت مذکورہ سے دستور مملکت کی ازل: یہ کہ آسمان اور زمین میں اقتدار اعلیٰ اللہ جل مجدہ کا ہے، چند اہم دفعات کا ثبوت دوسرے: یہ کہ زمین میں اللہ تعالیٰ کے احکام کی تنفیذ کے لئے اس کا نائب خلیفہ اس کا رسول ہوتا ہے، اور ضمنی طور پر یہ بھی واضح ہو گیا کہ خلافت اہلبیت کا سلسلہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہو گیا، تو اب خلافت رسول کا سلسلہ اُس کے قائم مقام ہوا، اور اس خلیفہ کا تقرر ملت کے انتخاب کے تحت ہوتا ہے۔

وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلَائِكَةِ اسْجُدُوا لِآدَمَ فَسَجَدُوا إِلَّا إِبْلِيسَ

اور جب ہم نے حکم دیا کہ فرشتوں کو کہ سجود کرو آدم کو تو سب سجدے میں گر پڑے، مگر شیطان

أَبَىٰ وَاسْتَكْبَرَ وَكَانَ مِنَ الْكَافِرِينَ ﴿۳۵﴾

اس نے مانا اور تکبر کیا، اور تمکارہ کافروں میں سے

خلاصہ تفسیر

اور جس وقت حکم دیا ہم نے سب فرشتوں کو اور جنوں کو بھی جیسا کہ بعض روایات میں حضرت ابن عباس رضی عنہما سے منقول ہے، غرض ان سب کو یہ حکم دیا گیا کہ سجدہ میں گر جاؤ آدم کے سامنے، سب سجدہ میں گر پڑے مگر ابلیس کے کہ اس نے کہا مانا اور غرور میں آگیا، اور ہو گیا کافروں میں سے۔

معارف و مسائل

ربط آیات | پچھلے واقعہ میں جب آدم علیہ السلام کی فضیلت فرشتوں پر ظاہر ہو چکی، اور دلائل سے یہ امر ثابت ہو گیا کہ صلاحیت

خلافت کے لئے جن علوم کی ضرورت ہے وہ آدم علیہ السلام میں سب مجتمع ہیں، اور ملائکہ کو ان میں سے بعض علوم حاصل ہیں، اور جنوں کو تو بہت ہی کم حصہ ان علوم کا حاصل ہے، جیسا کہ اوپر تفصیل کے ساتھ بیان کر دیا ہے، اور اس حیثیت خاص سے کہ ملائکہ و جن ہر دو گروہ کے علوم کے یہ جامع ہیں، ان کا شرف ہر دو گروہ پر ظاہر ہو گیا، اب حق تعالیٰ کو منظور ہوا کہ اس مقدمہ کو معاملہ سے بھی ظاہر فرما دیا جائے، اور ملائکہ اور جنوں سے ان کی کوئی خاص تعلیم کرائی جائے جس سے یہ ظاہر ہو کہ یہ ان دونوں سے کامل اور صادق

آئینہ خواہاں ہر دو گروہ کو تہنیت داری

کے ہیں، اور آدم علیہ السلام ان علوم خاصہ میں ملائکہ اور جن ہر دو گروہ سے کامل اور دونوں کے علوم و قومی کو جامع ہیں، جیسا کہ مفصل طور پر مذکور ہوا، اب حق تعالیٰ کو منظور ہوا کہ ان غیر کاملوں سے اس کامل کی کوئی ایسی تعلیم کرائی جائے کہ علم بھی یہ امر ظاہر ہو جائے کہ یہ ان دونوں سے کامل اور جامع ہیں، جب تو یہ دونوں ان کی تعلیم کر رہے ہیں، اور گویا زبان حال کہہ رہے ہیں کہ جو آدم صفا ہم میں الگ الگ ہیں وہ ان کے اندر یک جا ہیں، اس لئے جو عمل تعظیمی تجویز فرمایا گیا ہے اس کی حکایت ذکر فرماتے ہیں کہ ہم نے فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم کو سجدہ کریں، سب فرشتوں نے سجدہ کیا، مگر ابلیس نے سجدے سے انکار کیا، اور غرور میں آگیا۔

تعظیمی کا حرام ہونا ثابت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر میں غیر اللہ کے لئے تعظیمی کو جائز قرار دیتا تو بیوی کو مکہ دیتا کہ شوہر کو سجدہ کیا کرے، (مگر اس شریعت میں تعظیمی مطلقاً حرام ہے، اس لئے کسی کو کسی کے لئے جائز نہیں)۔

یہ حدیث میں صحابہ کرام کی روایت سے ثابت ہے، اصول حدیث کی معروف کتاب تدریج الراوی میں ہے کہ جس روایت کو دس صحابہ کرام نقل فرمادیں تو وہ حدیث متواتر ہو جاتی ہے، جو بشران کی طرح قطعی ہے، یہاں تو میں صحابہ کرام سے منقول ہے، یہ میں صحابہ کرام کی روایتیں ماسیہ بیان القرآن میں حضرت حکیم الامت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے جمع فرمادی ہیں ضرورت ہو تو وہاں دیکھا جاسکتا ہے۔

مسئلہ :- ابلیس کا کفر محض علی نافرمانی کا نتیجہ نہیں، کیونکہ کسی فرض کو ترک کر دینا اصول شریعت میں فسق و گناہ ہے، کفر نہیں، ابلیس کے کفر کا اصل پس حکم بپائی سے معارضہ اور مقابلہ کرنا ہے کہ آپ نے جس کو سجدہ کرنے کا مجھے حکم دیا ہے وہ اس قابل نہیں کہ میں اس کو سجدہ کروں، یہ معارضہ بلاشبہ کفر ہے۔

مسئلہ :- یہ بات قابل غور ہے کہ ابلیس علم و معرفت میں یہ مقام رکھتا ہے کہ اس کو طواغوس الملائکہ کہا جاتا تھا، پھر اس سے یہ حرکت کیسے صادر ہوئی؟ بعض علماء نے فرمایا کہ اس کے کبر کے سبب اللہ تعالیٰ نے اس سے اپنی نفی ہوئی معرفت اور علم و فہم کی دولت سلب کر لی، اس لئے اس کی حالت کا کام کر بیٹھا، بعض نے فرمایا کہ کبر و غرور اور خود پسندی نے حقیقت شناسی کے باوجود اس بلا میں مبتلا کر دیا، تفسیر روح المعانی میں اس جگہ ایک شعر نقل کیا ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ بعض اوقات کسی گناہ کے وبال سے تائید حق انسان کا ساتھ چھوڑ دیتی ہے، تو اس کی ہر کوشش اور عمل اس کو گمراہی کی طرف دھکیل دیتا ہے، شعر یہ ہے،

إِذَا الْكَفْرُ تَكُنَّ غَوًى تَنْزِيلُ اللَّهِ يُلْعَثُ شَيْ
فَأَوَّلُ مَا يَنْجِبُنِي عَلَيْكَ إِجْتِهَادُكَ

روح المعانی میں اس سے یہ بھی ثابت کیا ہے کہ انسان کا ایمان وہی معتبر ہو جو آخر عمر اور اول منازل آخرت تک ساتھ رہے، موجودہ ایمان و عمل اور علم و معرفت پر غرور نہ ہونا چاہئے اور

وَقُلْنَا يَا آدَمُ اسْكُنْ أَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا
اور ہم نے کہا اے آدم رہا کرو اور تیری عورت جنت میں اور کھاؤ اس میں جو چاہو

حَيْثُ شِئْتُمَا وَلَا تَقْرَبَا هَذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُونَا مِنَ الظَّالِمِينَ
جہاں کہیں سے چاہو اور پاس مت جانا اس درخت کے، پھر تم ہر جاؤ گے ظالم

فَأَزَلَّهُمَا الشَّيْطَانُ عَنْهَا فَأَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيهِ وَقُلْنَا اهْبِطُوا

پھر بلا دیا ان کو شیطان نے اس جگہ سے پھر نکالا ان کو اس عزت و راحت سے کہ جس میں تھے اور ہم نے کہا تم سب اتار

بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ وَلَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَمَتَاعٌ إِلَىٰ الْحِينِ

تم ایک دوسرے کے دشمن ہو گے اور تمہارے واسطے زمین میں ٹھکانا ہو اور نفع اٹھانا ایک وقت تک

خلاصہ تفسیر

اور ہم نے حکم دیا کہ اے آدم رہا کرو تم اور تمہاری بیوی رجن کو اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کا طر سے آدم علیہ السلام کی پسلی سے کوئی مارہ لے کر بنا دیا تھا، بہشت میں پھر کھاؤ و پوٹو اس میں سے ہا فرغت جس جگہ سے چاہو اور نزدیک نہ جائو اس درخت کے ورنہ تم بھی اپنی میں شمار ہو جاؤ گے جو اپنا نقصان کر بیٹھے ہیں (خدا جانے وہ کیا درخت تھا، مگر اس کے کھانے سے منع فرمادیا، اور پھر آٹا کر اختیار ہو کر اپنے گھر کی چیزوں سے غلام کو جس چیز کے برتنے کی چاہے اجازت دیدے، اور جس چیز کو چاہے منع کر دے) پس بعض سن دیدی آدم و حوا کو شیطان نے اس درخت کی وجہ سے سو بر طرت کر کے رہا ان کو اس پیش سے جس میں وہ تھے اور ہم نے کہا کہ بیچو اترو تم میں سے بعضے بعضوں کے دشمن رہیں گے اور تم کو زمین پر کچھ عرصہ بٹھرنا ہے اور کام چلانا ایک میعاد معین تک (یعنی وہاں جا کر بھی دوام نہ ملے گا کچھ عرصہ کے بعد وہ گھر بھی چھوڑنا پڑے گا)۔

معارف و مسائل

یہ آدم علیہ السلام کے قصہ کا مکمل ہے جس میں بیان کیا گیا کہ جب آدم کی فضیلت اور خلافت ارضی کی مصلحت فرشتوں پر واضح کر دی گئی، انھوں نے تسلیم کر لیا، اور ابلیس اپنے تکبر اور معارضہ کی وجہ سے کافر ہو کر کمال دیا گیا، تو آدم علیہ السلام اور ان کی زوجہ حوا کو یہ حکم ملا کہ تم دونوں جنت میں رہو، اور اس کی نعمتوں سے فائدہ اٹھاؤ، مگر ایک معین درخت کے لئے یہ ہدایت کی کہ اس کے پاس نہ جانا، یعنی اس کے کھانے سے مکمل پرہیز کرنا، شیطان جو آدم کی وجہ سے مردود ہوا، خار کھاتے ہوئے تھا اس نے کسی طرح موقع پا کر اور مصلحتیں بتلا کر ان دونوں کو اس درخت کے کھانے پر آمادہ کر دیا، ان کی لغزش کی وجہ سے ان کو بھی یہ حکم ملا کہ اب تم زمین پر جا کر رہو، اور یہ بھی بتلا دیا کہ زمین کی رہائش جنت کی طرح بے غل و غش نہ ہوگی، بلکہ وہاں آپس میں اختلافات اور دشمنیاں بھی ہوں گی جس سے زندگی کا لطف پورا نہ رہے گا۔

وَقُلْنَا يَا آدَمُ اسْكُنْ أَثْتَ وَزَوْجَكَ الْجَنَّةَ ۖ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا ۖ وَرِزْقًا غَدًا ۖ وَلَا تَقْرَبَا هَذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُونَا مِنَ الْغَافِلِينَ ۚ

اور ہم نے کہا کہ اے آدم! اور تم اور تمہاری زوجہ جنت میں رہو۔ یہ واقعہ حضرت آدم کی تخلیق اور ملائکہ کے سجود کے بعد کا ہے، بعض حضرات نے اس سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ یہ تخلیق اور سجدہ کا واقعہ جنت کے باہر کہیں ہوا ہے، اس کے بعد جنت میں داخل کیا گیا، لیکن ان الفاظ میں یہ مفہوم یقین نہیں، بلکہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تخلیق بھی جنت میں ہوئی، اور سجدے کا واقعہ بھی جنت میں پیش آیا، مگر اس وقت تک کہ ان کو کوئی فیصلہ اس کے متعلق نہیں سنایا گیا تھا کہ آپ کا مسکن دستقر کہاں ہوگا، اس واقعہ کے بعد یہ فیصلہ سنایا گیا۔

وَقُلْنَا يَا آدَمُ اسْكُنْ أَثْتَ وَزَوْجَكَ الْجَنَّةَ ۖ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا ۖ وَرِزْقًا غَدًا ۖ وَلَا تَقْرَبَا هَذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُونَا مِنَ الْغَافِلِينَ ۚ

کے ہیں جس کے حاصل کرنے میں کوئی محنت و مشقت بھی نہ ہو، اور وہ اتنی کثیر اور وسیع ہو کہ اس کے کم یا کم ہوجانے کا خطرہ نہ ہو، معنی یہ ہوئے کہ آدم و حوا علیہما السلام کو فرمایا کہ جنت کے پہلے فراغت استعمال کرتے رہو، نہ ان کے حاصل کرنے میں تمہیں کسی محنت کی ضرورت ہوگی، اور نہ یہ دیکھ کر کہ یہ خدا ختم ہوا کہ ہوجائے گی۔

وَلَا تَقْرَبَا هَذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُونَا مِنَ الْغَافِلِينَ ۚ

فریب نہ جاؤ، اصل مقصد تو یہ تھا کہ اس کا پہل نہ کھاؤ، مگر تاکید کے طور پر عنوان یہ اختیار کیا گیا کہ اس کے پاس بھی نہ جاؤ، اور مراد یہی ہو کہ کھانے کے لئے اس کے پاس نہ جاؤ، یہ درخت کو فاسق قرآن کریم نے متعین نہیں کیا، اور کسی مستند حدیث میں بھی اس کی تعین مذکور نہیں، ائمہ تفسیر میں سے کسی نے عہد کا درخت قرار دیا، کسی نے انگور کا، کسی نے انجیر کا، مگر جس کو قرآن وحدیث نے بہم چھوڑا ہے اس کو متعین کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے (قرطبی)

فَتَكُونَا مِنَ الْغَافِلِينَ ۚ

یعنی اگر آپ نے اس غیبی منوعہ کو کھایا تو آپ ظالموں میں داخل ہو جائیں گے۔

فَأَزَلَّاهُمَا الشَّيْطَانُ عَنْهَا ۖ وَفُتِحَتِ السَّمَاءُ فَكَانَتْ أَبْوَابًا ۖ وَسُفِّتِ السَّمَاءُ فَكُنَّ مَدَائِجَ ۖ وَالْمَلَائِكَةُ كُتِبَتْ عَلَيْهَا خُطُبَاتٌ مِّنْ لَّدُنْهَا وَلَهُمْ أَعْيُنٌ يَّرِئُونَ ۚ

اور ان کی اولاد کی طرف ہوگا، کہ ان کو بطور عتاب کے یہ جتلا یا گیا کہ ایک سزا تو یہ ہے کہ جنت سے زمین پر اکرا گیا، دوسری سزا اس کے ساتھ یہ بھی ہے کہ آپ کی اولاد کے درمیان باہم عداوتیں بھی ہوں گی، اور ظاہر ہے کہ اولاد کے باہم عداوت ہونے سے والدین کا لطف زندگی بھی رخصت ہو جاتا ہے، تو یہ بھی ایک قسم کی معنوی اور روحانی سزا ہوگی۔ (بیان القرآن)

یہاں ایک سوال یہ ہوتا ہے کہ جب شیطان کو مسجد سے انکار کی بنا پر پہلے ہی مڑو کر کے جنت سے نکال دیا گیا تھا، تو یہ آدم و حوا کو بہکانے کے لئے جنت میں کیسے پہنچا؟ اس کا بے غبار جواب یہ ہے کہ شیطان کے بہکانے اور وہاں تک پہنچنے کی بہت سی صورتیں ہو سکتی ہیں، یہ بھی ممکن ہو کہ بغیر ملاقات کے ان کے دل میں دوسوہ ڈالا ہو، اور یہ بھی ممکن ہے کہ شیطان جنات میں سے ہے، اور اللہ تعالیٰ نے جنات کو بہت سے ایسے تصرفات پر قدرت دی ہے جو عام طور پر انسان نہیں کر سکتے، ان کو مختلف شکلوں میں متشکل ہو جانے کی بھی قدرت دی ہے، ہو سکتا ہے کہ اپنی قوت جنت کے ذریعہ سرزمین کی صورت سے آدم و حوا کے ذہن کو متاثر کیا ہو، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کسی دوسری شکل میں مثلاً سانپ وغیرہ کی شکل میں متشکل ہو کر جنت میں داخل ہو گیا ہو، اور شاید یہی سبب ہو کہ آدم علیہ السلام کو اس کی دشمنی کی طرف دھیان نہ رہا، قرآن مجید کی آیت قُلْنَا يَا آدَمُ اسْكُنْ أَثْتَ وَزَوْجَكَ الْجَنَّةَ ۖ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا ۖ وَرِزْقًا غَدًا ۖ وَلَا تَقْرَبَا هَذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُونَا مِنَ الْغَافِلِينَ ۚ سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ شیطان نے صرف دوسوہ اور ذہنی اثر ڈالنے سے کام نہیں لیا، بلکہ آدم و حوا سے زبانی گفتگو کر کے اور قہیں کھا کر متاثر کیا۔

فَأَزَلَّاهُمَا الشَّيْطَانُ عَنْهَا ۖ وَفُتِحَتِ السَّمَاءُ فَكَانَتْ أَبْوَابًا ۖ وَسُفِّتِ السَّمَاءُ فَكُنَّ مَدَائِجَ ۖ وَالْمَلَائِكَةُ كُتِبَتْ عَلَيْهَا خُطُبَاتٌ مِّنْ لَّدُنْهَا وَلَهُمْ أَعْيُنٌ يَّرِئُونَ ۚ

یعنی شیطان نے اس دھوکہ اور لغزش کے ذریعہ آدم و حوا علیہما السلام کو ان نعمتوں سے محال دیا جن میں وہ آرام سے گزر رہے تھے، یہ نکالنا اگرچہ حکم خداوندی ہوا، مگر سبب اس کا شیطان تھا، اس لئے نکالنے کی نسبت اس کی طرف کر دی گئی۔

وَقُلْنَا يَا آدَمُ اسْكُنْ أَثْتَ وَزَوْجَكَ الْجَنَّةَ ۖ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا ۖ وَرِزْقًا غَدًا ۖ وَلَا تَقْرَبَا هَذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُونَا مِنَ الْغَافِلِينَ ۚ

یعنی ہم نے حکم دیا کہ نیچے اتر جاؤ، اس طرح کہ تم میں بعض بعضوں کے دشمن رہیں گے، اس حکم کے مخاطب حضرت آدم و حوا ہیں، اور شیطان کو اس وقت تک آسمانوں سے باہر نہیں کیا گیا تھا تو وہ بھی اسی خطاب میں شامل ہے، اس صورت میں باہم عداوت ہونے کا مطلب یہ ہوگا کہ شیطان کے ساتھ تمہاری عداوت کا سلسلہ دنیا میں بھی جاری رہے گا، اور اگر بقول بعض اس واقعہ کے وقت سے پہلے ہی شیطان محال لا جا چکا تھا، تو پھر اس کلام کا بیج آدم و حوا اور ان کی اولاد کی طرف ہوگا، کہ ان کو بطور عتاب کے یہ جتلا یا گیا کہ ایک سزا تو یہ ہے کہ جنت سے زمین پر اکرا گیا، دوسری سزا اس کے ساتھ یہ بھی ہے کہ آپ کی اولاد کے درمیان باہم عداوتیں بھی ہوں گی، اور ظاہر ہے کہ اولاد کے باہم عداوت ہونے سے والدین کا لطف زندگی بھی رخصت ہو جاتا ہے، تو یہ بھی ایک قسم کی معنوی اور روحانی سزا ہوگی۔ (بیان القرآن)

وَلَهُمْ أَعْيُنٌ يَّرِئُونَ ۚ

یعنی آدم و حوا علیہما السلام کو یہ بھی ارشاد ہوا کہ تم کو زمین پر کچھ عرصہ ٹھہرنا ہے اور ایک مہاد معین تک کام چلانا ہے، یعنی زمین پر جا کر بھی دوام نہ ملے گا، کچھ مدت کے بعد اس گھر کو بھی چھوڑنا پڑے گا۔

سند ذرائع کا مسئلہ | وَلَا تَقْرَبُوا هَٰذَا الشَّجَرَ ۖ " یعنی اس درخت کے قریب بھی نہ جاؤ، یہ ظاہر ہے کہ اصل مقصد تو یہ تھا کہ اس درخت یا اس کے پھل کو نہ کھاؤ، مگر احتیاطی حکم یہ دیا گیا کہ اس کے قریب بھی نہ جاؤ اس سے اصولی فقہ کا مسئلہ سند ذرائع ثابت ہوا، یعنی بعض چیزیں اپنی ذات میں ناجائز یا ممنوع نہیں ہوتیں، لیکن جب یہ خطرو ہو کر ان چیزوں کے اختیار کرنے سے کسی حرام ناجائز کام میں مبتلا ہو جائے گا تو اس جائز چیز کو بھی روک دیا جاتا ہے، جیسے درخت کے قریب جانا ذریعہ بن سکتا تھا اس کے پھل پھول کھانے کا، اُس ذریعہ کو بھی منع فرما دیا گیا، اسی کا نام اصولی فقہ کی اصطلاح میں **سند ذرائع** ہے۔

مسئلہ عصمتِ انبیاء
اس واقعہ سے معلوم ہوا کہ حضرت آدم علیہ السلام کو کسی خاص درخت کے کھانے سے منع فرمایا گیا تھا، اور اس پر بھی تنبیہ کر دیا گیا تھا کہ شیطان تمہارا دشمن ہو، ایسا نہ ہو کہ وہ تمہیں گناہ میں مبتلا کر دے، اس کے باوجود آدم علیہ السلام نے اُس درخت سے کھا لیا جو ناپا بر گناہ ہے، حالانکہ انبیاء علیہم السلام گناہ سے معصوم ہوتے ہیں، تحقیق یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی عصمت تمام گناہوں سے عقلاً اور لفظاً ثابت ہے، ائمہ اربعہ اور جمہور امت کا اس پر اتفاق ہے، کہ انبیاء علیہم السلام تمام چھوٹے بڑے گناہوں سے معصوم و محفوظ ہوتے ہیں اور بعض لوگوں نے جو یہ کہا ہے کہ صغیر گناہ اُن سے بھی سرزد ہو سکتے ہیں، جمہور امت کے نزدیک صحیح نہیں (قرطبی)

وجہ یہ ہو کہ انبیاء علیہم السلام کو لوگوں کا مقتدا بننا کر بھیجا جاتا ہے، اگر ان سے بھی کوئی کام اللہ تعالیٰ کی مرضی کے خلاف خواہ گناہ کبیرہ ہو یا صغیرہ صادر ہو سکے تو انبیاء کے اقوال و افعال سے امن اٹھ جاتے گا، اور وہ قابلِ اعتماد نہیں رہیں گے، جب انبیاء ہی پر اعتماد و اطمینان نہ رہے تو دین کا کہاں ٹھکانا ہے۔

البتہ مشرق کریم کی ہیبت سی آیات میں متعدد انبیاء کے متعلق ایسے واقعات مذکور ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے گناہ سرزد ہوا، اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُن پر عتاب بھی ہوا، حضرت آدم علیہ السلام کا یہ قصہ بھی اسی میں داخل ہے۔

ایسے واقعات کا حاصل باتفاق امت یہ ہو کہ کسی غلط فہمی یا غلط فہم کی وجہ سے ان کا صدور ہو جا سکے، کوئی پیغمبر جان بوجھ کر اللہ تعالیٰ کے کسی حکم کے خلاف عمل نہیں کرتا، غلطی اجتہادی ہوتی ہے، یا غلط فہم کی وجہ سے، سبب قابل معافی ہوتی ہے، جس کو اصطلاح شرع میں گناہ نہیں کہا جاسکتا، اور یہ سہو نسیان کی غلطی ان سے ایسے کاموں میں نہیں ہو سکتی جن کا تعلق تبلیغ و تعلیم اور

آیات مذکورہ سے متعلق مسائل و احکام شرعیہ

اُنْکُنْ اَنْتَ دَرُوْجًاۙ الْجَنَّةِۚۤ مِیْنِ حَضْرَتِ اٰدَمَ وَاٰوٰی اٰلِہٖمُ السَّلَامِ
 دونوں کے لئے جنت کو مسکن بنانے کا ارشاد ہے جس کو مختصر لفظوں میں یوں
 بھی کہا جا سکتا ہے اُنْکُنَا الْجَنَّةِۚ یعنی آپ دونوں جنت میں رہیں، جیسا کہ اس کے بعد کَلَّا اور
 لَا تُغْنٰی تَابٰیْنِ دونوں کو ایک ہی صیغہ میں جمع کیا گیا ہے، مگر یہاں اس کے خلاف اَنْتَ دَرُوْجًا
 کے الفاظ کو اختیار کرنے میں غائب مرتب حضرت آدم کو بشارت دیا اور اپنی سے فرمایا کہ آپ کی
 زوجہ بھی جنت میں رہے، اس میں دو مسئلوں کی طرف اشارہ ہے۔

مسئلہ، اوّل یہ کہ بیوی کے لئے رافٹن کا انتظام شوہر کے ذمہ ہے، دوسرے یہ کہ سکونت میں بیوی شوہر کے تابع ہے، جس مکان میں شوہر ہے اس میں اس کو رہنا چاہئے۔

مسئلہ: لفظ اُسْتَنْکُن میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ اس وقت ان دونوں حضرات کے لئے جنت کا قیام محض عارضی تھا، دائمی قیام جو شان ملکیت کی ہوتی ہے وہ نہ تھی، کیونکہ لفظ اُسْتَنْکُن کے معنی یہ ہیں کہ اس مکان میں رہا کرو یہ نہیں فرمایا کہ یہ مکان تمہیں دید یا گیا یہ تھا اور امکان ہو، درجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے علم میں تھا کہ آئندہ ایسے حالات پیش آئیں گے کہ آدم و حوا علیہما السلام کو جنت کا مکان چھوڑنا پڑے گا، نیز جنت کا استحقاق ملکیت ایمان اور عمل صالح کر کے معاوضہ میں حاصل ہوتا ہے جو قیامت کے بعد ہوگا، اس سے حضرات فقہاء نے یہ مسئلہ اخذ کیا ہے کہ اگر کوئی شخص کسی کو کہے کہ میرے گھر میں رہا کرو یا یہ کہ میرا گھر تمہارا مسکن ہو، اس سے مکان کی ملکیت اور دائمی استحقاق اس شخص کو حاصل نہیں ہوتا، قرطبی، فذا، وغیرہ میں ہیں: **وَمَكَانُهُمْ غَدَاً** یعنی کھاؤ تم دونوں جنت سے با فراغت اس میں بطور زندگی رہنا سبق خطا، **مِنْ أَدَمَ عَلَيْهِ السَّلَامُ** کو نہیں کیا گیا بلکہ دونوں کو ایک ہی لفظ میں شریک کر کے مَثَلًا مَثْبُوتاً فرمایا۔

اس میں اشارہ اس کی طرف ہو سکتا ہے کہ غذا اور خوراک میں یہی شہرہ کے تعلق نہیں، وہ اپنی ضرورت و خواہش کے وقت اپنی مرضی کے مطابق استعمال کرے اور یہ اپنی خواہش کے مطابق۔

برجگ چلنے پھرنے کی آزادی
 انسان کا فطری حق ہے

وَعَنْ أَحْمَدَ يَشْتَلُّهَا لَفْظُ رَفْدًا، باکولات میں وسعت و کثرت کی طرف اشارہ ہو کہ جو چیز جتنی چاہیں کھا سکتے ہیں بجز ایک نہ رخصت کیے اور کسی چیز میں کاٹاؤ اور مانع نہیں اور لفظ

يَشْتَلُّهَا میں مقامات کی وسعت کا بیان ہے، کہ پوری جنت میں جہاں چاہیں جس طرح چاہیں کھائیں، کوئی خطہ ممنوع نہیں، اس میں اشارہ ہے کہ چلنے پھرنے اور مختلف مقامات سے اپنی ضروریات حاصل کرنے کی آزادی انسان کا فطری حق ہے، ایک محدود و دو معین مقام یا مکان میں اگرچہ ضرورت و خواہش کی ساری چیزیں ہوتا کر دی جائیں، مگر وہاں سے باہر جانا ممنوع ہو تو یہ بھی ایک قسم کی قید ہو اس لئے حضرت آدم علیہ السلام کو کھانے پینے کی تمام چیزیں بکثرت و فراغت عطا کر دینے پر اکتفا نہیں کیا گیا، بلکہ حَبْثُ يَشْتَلُّهَا فرما کر ان کو چلنے پھرنے اور ہر جگہ جانے کی آزادی بھی دی گئی۔

تشریح سے ہو، بلکہ اُن سے ذاتی افعال اور اعمال میں ایسا ہونسیاں ہو سکتا ہے (تفسیر بحر المحیط)
مگر چونکہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک انبیاء علیہم السلام کا مقام نہایت بلند ہے، اور بڑوں سے
بھونٹیں غلیبی بھی ہو جائے تو بہت بڑی غلطی سمجھی جاتی ہے، اس لئے قرآن حکیم میں ایسے واقعات
کو معصیت اور گناہ سے تعبیر کیا گیا ہے، اور اس پر عتاب بھی کیا گیا ہے، اگرچہ حقیقت کے اعتباراً
سے وہ گناہ ہی نہیں۔

حضرت آدم علیہ السلام کے اس واقعہ کے متعلق علماء تفسیر نے بہت سی توجیہات لکھی ہیں
ان میں چند یہ ہیں:

اول یہ کہ جس وقت آدم علیہ السلام کو منع کیا گیا تھا، تو ایک خاص درخت کی طرف
اشارہ کر کے منع کیا گیا کہ اس کے قریب نہ جاؤ، اور مراد خاص یہی درخت نہیں تھا، بلکہ اس
کی جنس کے سارے درخت مراد تھے، جیسے حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے
ایک مرتبہ ریشمی کپڑا اور ایک ٹکڑا سونے کا ہاتھ میں لیکر ارشاد فرمایا کہ یہ دونوں چیزیں
میری امت کے مردوں پر حرام ہیں، ظاہر ہے کہ حرمت صرف اُس کپڑے اور سونے کے ساتھ مخصوص نہیں
تھی، جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک میں تھے، بلکہ تمام ریشمی کپڑے اور سونے کا یہ حکم
ہے، لیکن یہاں کسی کو یہ وہم بھی ہو سکتا ہے کہ مانعت صرف اُس کپڑے اور سونے کے ساتھ وابستہ ہو
جو اُس وقت آپ کے دست مبارک میں تھے، اسی طرح حضرت آدم علیہ السلام کو یہ خیال ہو گیا کہ
جس درخت کی طرف اشارہ کر کے منع کیا گیا تھا مانعت اسی کے ساتھ خاص ہے، شیطان نے یہی
دوسرے اُن کے دل میں مزین اور مستحکم کر دیا، اور قسمیں کھا کر یہ باور کرایا کہ میں تمہارا خیر خواہ ہوں، تمہیں کسی
ایسے کام کا مشورہ نہیں دے رہا جو تمہارے لئے ممنوع یا مبغض ہو، جس درخت کی مانعت کی گئی ہے وہ
دوسرا ہے، اس درخت کی مانعت نہیں ہے۔

اور یہ بھی ممکن ہے کہ شیطان نے یہ دوسرے دل میں ڈالا ہو کہ اس درخت کی مانعت صرف
آپ کی ابتداء پیدائش کے وقت کے ساتھ مخصوص تھی، جیسے چھوٹے بچوں کو اول عمر میں قوی غذا
سے روکا جاتا ہے، بلکہ غذا دی جاتی ہے، اور وقت پیدا ہوجانے کے بعد ہر غذا کی اجازت ہو جاتی ہے
قواب آپ قوی ہو چکے ہیں، اس لئے وہ مانعت باقی نہیں رہی۔

اور یہ بھی ممکن ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کو جس وقت شیطان نے اس درخت کے
کھانے کے منافع بتلائے کہ اس کے کھانے سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جنت کی نعمتوں میں رہنے
کا اطمینان ہو جائے گا، اُس وقت اُن کو وہ مانعت یاد رہی ہو جو ابتداء آفرینش کے وقت اس
درخت کے متعلق کی گئی تھی، قرآن مجید کی آیت فَتَنِي وَكَفَّ نَجْوَىٰ لَكَ هَؤُلَاءِ ۝۲۰ میں آدم علیہ السلام

بھول گئے اور ہم نے ان میں پھنسی نہ پائی، یہ اس احتمال کی تائید کرتی ہے۔
بہر حال اس طرح کے متعدد احتمالات ہو سکتے ہیں، جن کا حاصل یہ ہو کہ جان بوجھ کر نافرمانی
کا مدد در حضرت آدم علیہ السلام سے نہیں ہوا، بھول ہو گئی، یا اجتہادی لغزش ہو، درحقیقت
گناہ نہیں، مگر آدم علیہ السلام کی شان نبوت اور قرب خداوندی کے مقام عالی کے اعتبار سے
پہنشنش بھی بڑی سمجھی گئی، اور مقرر آن میں اس کو معصیت کے الفاظ سے تعبیر کیا گیا، اور آدم
علیہ السلام کی توبہ و استغفار کے بعد معاف کرنے کا ذکر فرمایا گیا۔

اور یہ بحث فضول ہے کہ جب شیطان کو جنت سے مردود کر کے نکال دیا گیا تھا تو پھر وہ
آدم علیہ السلام کو بہکانے کے لئے وہاں کس طرح پہنچا؟ کیونکہ شیطان کے بہکانے اور دوسرے
ڈالنے کے لئے یہ ضروری نہیں کہ جنت میں داخل ہو کر ہی دوسرے ڈالے، جنات و شیطا طین کو
حق تعالیٰ نے یہ قدرت دی ہے کہ وہ دُور سے بھی دل میں دوسرے ڈال سکتے ہیں، اور اگر داخل ہو کر
بالشاذ گفتگو ہی کو تسلیم کیا جائے تو اس کے بھی مختلف احتمالات ہو سکتے ہیں جس کی تحقیق میں
پڑنا بے فائدہ اور لافین بحث ہے۔

اسی طرح یہ سوال کہ آدم و حوا علیہما السلام کو اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی منہبہ کر دیا تھا، اِنَّ
الَّذِينَ يَنْظُرُونَ نَجْمًا عَنَّا ۝۱۲ کہ شیطان تمہارا دشمن ہے، ایسا نہ ہو کہ یہ کوئی ایسا کام کر لے جس کی وجہ سے
تمہیں جنت سے نکلنا پڑے، پھر حضرت آدم علیہ السلام اس کے دھوکے میں کس طرح آ گئے، اس کا جواب
بھی یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جنات و شیطا طین کو مختلف شکلوں میں ظاہر ہونے کی قدرت عطا فرمائی
ہے، ممکن ہے کہ وہ کسی ایسی صورت میں سامنے آیا ہو جس کی وجہ سے آدم علیہ السلام یہ نہ پہچان سکے کہ یہ
شیطان ہے۔

فَلَقَىٰ آدَمُ مِنْ رَبِّهِ كَلِمَةً فَتَابَ عَلَيْهِ ۚ إِنَّهُ هُوَ التَّوَّابُ

پھر یہ کہ میں آدم نے اپنے رب سے چند باتیں پھر متوجہ ہو گیا اللہ اس پر بیشک دہی ہے توبہ قبول کرنے والا

الرَّحِيمُ ۝۱۳ قُلْنَا اهْبِطُوا مِنْهَا جَمِيعًا ۚ فَمَا يَأْتِيَنَّكُمْ مِنْ

مہربانی، ہم نے حکم دیا چلے جاؤ یہاں سے سب، پھر اگر تم کو پہنچے میری طرف سے کوئی

هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ۝۱۴

ہدایت تو جو چلا میری ہدایت پر نہ خوف ہوگا اُن پر اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

وَالَّذِينَ كَفَرُوا وَكَانُوا بِآيَاتِنَا أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ ۖ هُمْ

اور جو لوگ منکر ہوتے اور جھٹلایا ہماری نشانیوں کو وہ ہیں دوزخ میں جانے والے وہ

فِيمَا خَلِدُونَ ﴿٣٠﴾

اس میں ہمیشہ رہیں گے۔

خُلاصۂ تفسیر

بعد ازاں حاصل کرتے آدم علیہ السلام نے اپنے رب سے چند الفاظ یعنی معذرت کے کلمات کہ وہ بھی اللہ تعالیٰ ہی سے حاصل ہوئے تھے، حضرت آدم علیہ السلام کی غلامت پر اللہ تعالیٰ کی رحمت متوجہ ہوئی اور خود ہی معذرت کے الفاظ تلقین فرمادیئے، تو اللہ تعالیٰ نے رحمت کے ساتھ توجہ فرمائی کہ ان پر زمین توبہ قبول کر لے، بیشک وہی میں بڑی توبہ قبول کرنے والے بڑے مہربان اور حضرت حواء کی توبہ کا بیان سورۃ اعراف میں ہے، قَالَ لَا زُنْيَا فَلَئِمَّا آفَكْنَا، جس سے معلوم ہوا کہ وہ بھی توبہ اور قبول توبہ میں آدم علیہ السلام کے ساتھ شریک رہیں، مگر معاف فرمانے کے بعد بھی زمین پر جانے کے حکم کو منسوخ نہیں فرمایا کیونکہ اس میں ہزاروں حکمتیں اور مصلحتیں مضمون تھیں، البتہ اس کا طرز بدل دیا کہ پہلا حکم زمین پر اترنے کا حاکمانہ طور پر بطور مزا تھا، اب یہ حکم حکیمانہ انداز سے اس طرح ارشاد ہوا فَلَئِمَّا آفَكْنَا اضْطُرُّوا مِنْهَا جُنُودًا (یعنی) ہم نے حکم فرمایا کہ نیچے جاؤ اس ہیئت سے سب کے سب، پھر اگر آدے تمھارے پاس میری طرف سے کسی قسم کی ہدایت (یعنی احکام شرعیہ بذریعہ وحی) سو جو شخص پر وہی کر چکا میری اس ہدایت کی تونہ کچھ اندیشہ ہوگا ان پر اور نہ ایسے لوگ غمگین ہوں گے (یعنی ان پر کوئی خوفناک واقعہ نہ پڑے گا اور قیامت کے ہولناک واقعات سے ان کا بھی خوف زدہ ہونا اس کے منافی نہیں، جیسا کہ احادیث صحیحہ میں سب پر ہزل اور خوف کا عام ہونا معلوم ہوتا ہے، حزن وہ کیفیت ہے جو کسی مصرت و مصیبت کے واقع ہو جانے کے بعد قلب میں پیدا ہوتی ہے، اور خوف ہمیشہ قبل وقوع ہوا کرتا ہے، یہاں حق تعالیٰ نے حزن و غم دونوں کی نفی فرمادی، کیونکہ ان پر کوئی آفت و کلفت واقع نہ ہوگی جس سے حزن یا خوف ہو، آگے ان لوگوں کا حال بیان کیا ہے جو اس ہدایت کی پیروی نہ کریں، فرمایا) اور جو لوگ کفر کریں گے اور تکذیب کریں گے ہمارے احکام کی یہ لوگ ہوں گے دوزخ والے وہ اس میں ہمیشہ کورہیں گے۔

معارف و مسائل

رابطہ آیا پہلی آیات میں شیطانی دستور حضرت آدم کی نافرمانی اور اس کے نتیجے میں جنت نکلتے اور زمین پر اترنے

کا حکم مذکور تھا، حضرت آدم علیہ السلام نے اپنے خطاب عتاب کہاں کئے تھے، نہ ایسے سنگدل تھے کہ اس کی بہار کر جاتے، بے چین ہو گئے، اور فوراً ہی معافی کی التجا کرنے لگے، مگر پیغمبرانہ معرفت اور اس کی وجہ سے انتہائی ہیبت سے کوئی بات زبان سے نہ نکلتی تھی، یا اس خوف سے کہ معافی کی التجا ہمیں خلافت شان ہو کر مزید عتاب کا سبب نہ بن جائے، زبان خاموش تھی، اللہ رب العزت دونوں کی بات سے واقف اور رحیم و کریم ہیں، یہ حالت دیکھ کر خود ہی معافی کے لئے کچھ کلمات ان کو سکھائیئے، اس کا بیان ان آیات میں ہے کہ، آدم علیہ السلام نے حاصل کر لئے اپنے رب سے چند الفاظ، تو اللہ تعالیٰ نے ان پر رحمت کے ساتھ توجہ فرمائی، (یعنی ان کی توبہ قبول کر لی) بے شک وہی میں بڑے توبہ قبول کرنے والے مہربان مگر چونکہ روئے زمین پر آنے میں اور بھی ہزاروں حکمتیں اور مصلحتیں مضمون تھیں، مثلاً ان کی نسل سے فرشتوں اور جنات کے درمیان ایک نئی نوع انسان کا وجود ملے آنا اور ان کو ایک طرح کا اختیار دینے کا احکام شرعیہ کا مکلف بنانا پھر ان میں خلافتِ ابدیہ قائم کرنا، حدود اور احکام شرعیہ نافذ کرنا، تاکہ یہ نئی مخلوق ترقی کر کے اس مقام پر پہنچ سکے جو بہت سے فرشتوں کو بھی نصیب نہیں، اور ان مقاصد کا ذکر تخلیق آدم علیہ السلام سے پہلے ہی کر دیا گیا تھا، اِنِّي جَاعِلٌ فِيْكَ خَلِيفَةً۔

اس لئے خطا معاف کرنے کے بعد بھی زمین پر اترنے کا حکم منسوخ نہیں فرمایا، البتہ اس کا طرز بدل دیا کہ پہلا حکم حاکمانہ اور زمین پر اترنا بطور مزا کے تھا، اب یہ ارشاد حکیمانہ اور زمین پر آنا خلافتِ ابدیہ کے اعزاز کے ساتھ ہوا، اس لئے بعد کی آیات میں اُن فَرَاقْنِ مَنْصِبِيْكَ بَيَان ہے جو ایک خلیفۃ اللہ ہونے کی حیثیت سے اُن پر عائد کئے گئے تھے، اسی لئے زمین پر اترنے کے حکم کو پھر مکرر بیان کر کے فرمایا کہ، ہم نے حکم فرمایا کہ نیچے جاؤ اس جنت سے سب کے سب پھر اگر آئے تمھارے پاس میری طرف سے کسی قسم کی ہدایت، یعنی احکام شرعیہ بذریعہ وحی کے، تو جو شخص پر وہی کرے گا میری اس ہدایت کی، تونہ کچھ اندیشہ ہوگا ان پر اور نہ وہ غمگین ہوں گے، یعنی نہ کسی گزشتہ چیز کے خوف ہونے کا غم ہوگا، نہ آئندہ کسی تکلیف کا خطرہ۔

تَلَقَّيْ، تلقی بمعنی پیش شوق اور رغبت کے ساتھ کسی کا استقبال کرنا، اور اس کو مستقبل کرنا (روح کشاف) مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جب اُن کو توبہ کے کلمات کی تلقین کی گئی تو آدم علیہ السلام نے اہتمام کے ساتھ اُن کو قبول کیا۔

تَلَقَّيْنَا، وہ کلمات جو حضرت آدم علیہ السلام کو اُخْرَضِ توبہ بتلائے گئے کیا تھے، اس میں مغفرت و مصلحت سے کئی روایات منقول ہیں، مشہور قول حضرت ابن عباسؓ کا ہے کہ وہ کلمات وہی ہیں جو مسترآن مجید میں دوسری جگہ منقول ہیں، اِنِّيْ رَزَقْنَا اَلْاِنْسَانَ اَلْفَسَاوِلَ اَلَّذِيْ تَغْفِرُ

لَتَنَادَىٰ مَخْتَمًا فَتَشَاوَرُوا مِنَ الْخَيْرِ يَوْمَئِذٍ - (۲۳: ۷)

تائب، توبہ کے اصل معنی رجوع کرنے کے ہیں، اور جب توبہ کی نسبت بندہ کی طرف کی جاتی ہے تو اس کے معنی تین چیزوں کا مجموعہ ہوتا ہے، اول اپنے کئے ہوئے گناہ کو گناہ سمجھنا اور اس پر نادم و شرمندہ ہونا، دوم اس گناہ کو بالکل چھوڑ دینا، تیسرے آئندہ کے لئے دوبارہ نہ کرنے کا پختہ عزم و ارادہ کرنا، اگر ان میں چیزوں میں سے ایک کی بھی کمی ہوئی تو وہ توبہ نہیں، اس سے معلوم ہوا کہ محض زبان سے اللہ توبہ کے الفاظ بول دینا نجات کے لئے کافی نہیں جب تک یہ تینوں چیزیں جمع نہ ہوں، یعنی گزشتہ پر ندامت اور حال میں اس کا ترک، اور مستقبل میں اس کے نہ کرنے کا عزم و ارادہ، تائب علیہ یہاں توبہ کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے معنی ہیں توبہ قبول کرنا، بعض سلف سے پوچھا گیا کہ جس شخص سے کوئی گناہ سرزد ہو جائے وہ کیا کرے تو فرمایا وہی کام کرے جو اس کے پہلے والدین آدم و حوا علیہما السلام نے کیا، کہ اپنے کئے پر ندامت اور آئندہ نہ کرنے کے عزم کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے معافی کے لئے عرض کیا، رَبَّنَا ظَلَمْنَا أَنفُسَنَا وَإِنَّا لَكَاظِمُونَ، یعنی ہمارے پروردگار ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کر لیا ہے، اگر آپ معاف نہ کریں اور ہم پر جرم نہ کریں تو ہم سخت خسارہ والوں میں داخل ہو جائیں گے، اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا، رَبِّ إِنِّي ظَلَمْتُ نَفْسِي فَاغْفِرْ لِي، یعنی اے میرے ہائے دلے میں نے اپنے جان پر ظلم کر لیا ہے، تو آپ ہی میری مغفرت فرمائیے، اور حضرت یونس علیہ السلام سے جب لغزش ہو گئی تو عرض کیا، لَا إِلَهَ إِلَّا أَنْتَ سُبْحَانَكَ إِنِّي كُنْتُ مِنَ الظَّالِمِينَ (۸۰: ۲۱)، یعنی اللہ کے سوا کوئی لائق عبادت نہیں، آپ ہر برائی سے پاک ہیں، میں ظلم کرنے والوں میں داخل ہو گیا ہوں : (مطلب ہو کہ مجھ پر رحم فرمائیے، (قرطبی)

قائدہ : حضرت آدم و حوا سے جو اجتہادی سنسز یا بحول صادر ہوئی ہے، اولاً تو قرآن مجید نے دونوں ہی کی طرف اس کی نسبت کی ہے، فَادْرَأْنِيَا الشَّيْطَانُ عَنَّمَا فَتَاخَرَجْتُمَا اور زمین پر اترنے کے حکم میں بھی حضرت حوا کو شریک کر کے لفظ اُخْرِجْتُمَا فرمایا ہے، مگر بعد میں توبہ اور قبول توبہ میں یہ لفظ مفرد صرف آدم علیہ السلام کا ذکر ہے، حضرت حوا کا نہیں، اس مقام کے علاوہ بھی اس سنسز کا ذکر صرف آدم علیہ السلام کی طرف کر کے کیا گیا ہے، فَخَصَّيْنَا آدَمَ وَغَيْرَهُ۔

ہو سکتا ہے کہ اس کی وجہ یہ رعایت ہو کہ عورت کو اللہ تعالیٰ نے مشورہ رکھا ہے، اس لئے بطور پروردگار کی طرف سے اس کا ذکر صراحتاً نہیں فرمایا، اور ایک حسب گزشتہ ظَلَمْنَا أَنفُسَنَا میں دونوں کی توبہ کا ذکر بھی دیا گیا، تاکہ کسی کو یہ شبہ نہ ہے کہ حضرت حوا

کا قصور محال نہیں ہوا، اس کے علاوہ عورت چونکہ اکثر احوال میں مرد کے تابع ہے، اس لئے اس کے مستقبل ذکر کی ضرورت نہیں بھی گئی۔ (مستطاب)

تائب اور تائب میں فرق امام قرطبی نے فرمایا کہ لفظ تائب بندہ کے لئے بھی بولا جاتا ہے جیسے إِنَّ اللَّهَ يُجِيبُ الْمُتَوَّابِينَ (۱۱۰: ۱) اور اللہ تعالیٰ کیلئے بھی جیسے اس آیت میں هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ، جب بندہ کے لئے استعمال ہوتا ہے تو معنی ہوتے ہیں گناہ سے اطاعت کی طرف رجوع کرنے والا، اور جب اللہ تعالیٰ کے لئے استعمال ہوتا ہے تو معنی ہوتے ہیں توبہ قبول کرنے والا، یہ صرف لفظ تائب کا حکم ہے، اسی معنی کا دوسرا لفظ تَائِبٌ ہے، اس کا استعمال اللہ تعالیٰ کے لئے جائز نہیں، اگرچہ لغوی معنی کے اعتبار سے وہ بھی غلط نہیں، مگر اللہ تعالیٰ کی شان میں صرف وہی صفات اور القاب استعمال کرنا جائز ہیں، جن کا ذکر قرآن و سنت میں وارد ہے، باقی دوسرے الفاظ اگرچہ معنی کے اعتبار سے صحیح ہوں، مگر اللہ تعالیٰ کے لئے اس کا استعمال درست نہیں۔

مکہ سے توبہ قبول کرنا اختیار اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ توبہ قبول کرنے اور گناہ معاف کرنے کا اختیار سوائے خدا تعالیٰ کے سوا کسی کو نہیں، اللہ تعالیٰ کے اور کسی کو نہیں، یہ تو نصاریٰ اس قاعدے غفلت کی بنا پر سخت فتنہ میں

مستلا ہو گئے، کہ پادریوں اور پیسروں کے پاس جاتے، اور ان کو کچھ ہدیہ دے کر اپنے گناہ معاف کرا لیتے، اور سمجھتے تھے کہ انھوں نے معاف کر دیا تو اللہ کے نزدیک بھی معاف ہو گیا، آج بھی بہت سے نادان مسلمان اس طرح کے غلط اور خام عقیدے رکھتے ہیں، جو سراسر غلط ہیں، کوئی عالم یا مرشد کسی کے گناہ کو معاف نہیں کر سکتا، زیادہ سے زیادہ دعا کر سکتا ہے۔

آدم کا زمین پر اترنا سزا کے طور پر نہیں، تَحْنُتَا اَهْبَطُوا اَرْضًا جَبِيحًا جنت سے زمین پر اترنے کا حکم بلکہ ایک مقصد کی تکمیل کے لئے تھا، اس سے پہلی آیت میں آپکا ہوا، اس جگہ پھر اس کو مکرر لانے

میں غالباً حکمت یہ ہو کہ پہلی آیت میں زمین پر اترنے کا ذکر بطور عتاب اور سزا کے آیا تھا، اسی اس کے ساتھ انسانوں کی باہمی عداوت کا بھی ذکر کیا گیا، اور یہاں زمین پر اترنے کا ذکر ایک خاص مقصد خلافت الہیہ کی تکمیل کے لئے اعزاز کے ساتھ ہے، اسی لئے اس کے ساتھ ہدایت بھیجے کا ذکر جو خلافت الہیہ کے فرائض منصبی میں سے ہے، اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اگرچہ زمین پر اترنے کا ابتدائی حکم بطور عتاب اور سزا کے تھا، مگر بعد میں جب خطا معاف کر دی گئی تو دوبارہ مصلح اور حکمتوں کے پیش نظر زمین پر بھیجے کے حکم کو اس کی حیثیت بدل کر برقرار رکھا گیا، اور اب ان کا نزول زمین کے حاکم اور خلیفہ کی حیثیت سے ہوا، اور یہ وہی حکمت ہے جس کا ذکر تھنا بین آدم کے وقت ہی فرشتوں سے کیا جا چکا تھا، کہ زمین کے لئے اُن کو خلیفہ بنانا ہے۔

دعا و غم سے نجات مرنے والوں کو نصیب ہوتی ہے جو اللہ کے نوازا ہوگا۔ اس آیت میں آسمانی ہدایات کی پیروی کرنے والوں کے لئے دو انعام مذکور ہیں، ایک یہ کہ ان پر کوئی خوف نہ ہوگا، دوسرے وہ غمیں نہ ہوں گے۔

خوف، آئندہ پیش آنے والی کسی تکلیف و مصیبت کے اندیشہ کا نام ہے اور حزن کسی مقصد مراد کے فوت ہو جانے سے پیدا ہونے والے غم کو کہا جاتا ہے، غور کیا جائے تو عیش و راحت کی تمام انواع و اقسام کا ان دونوں غظوں میں ایسا احاطہ کر دیا گیا ہے کہ آرام و آسائش کا کوئی فرد اور کوئی قسم اس سے باہر نہیں، پھر ان دونوں غظوں کی تعبیر میں ایک خاص فرق کیا گیا ہے کہ خوف کی نفی تو عام انداز میں کر دی گئی، مگر حزن کے متعلق یہ نہیں منسرایا کہ لا حزن علیہم، بلکہ بصیغہ فعل لایا گیا، اور اس کی ضمیر فاعل کو مستند کر کے وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ فرمایا گیا، اس میں اشارہ اس طرف ہے کہ کسی چیز یا مراد کے فوت ہونے کے غم سے آزاد ہونا صرف انہی اولیاء اللہ کا مقام ہے جو اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی ہدایات کی مکمل پیروی کر لے والے ہیں، ان کے سوا کوئی انسان اس غم سے نہیں بچ سکتا خواہ وہ ہفت اقلیم کا بادشاہ ہو یا دنیا کا بڑے سے بڑا مالدار کیونکہ ان میں کوئی بھی ایسا نہیں ہوتا جس کو اپنی طبیعت اور خواہش کے خلاف کوئی بات پیش نہ آئے اور اس کا غم نہ ہو، جیسا کہ کہا گیا ہے

دریں دنیا کے بے غم نہ باشد

وگر باشد بنی آدم نہ باشد

مخلاف اولیاء اللہ کے کہ وہ اپنی مرضی اور ارادے کو اللہ رب العزت کی مرضی اور ارادے میں فنا کر دیتے ہیں، اس لئے ان کو کسی چیز کے فوت ہونے کا غم نہیں ہوتا، مگر ان مجید میں دوسری جگہ بھی اس کو ظاہر کیا گیا ہے، کہ خاص اہل جنت ہی کا یہ حال ہوگا کہ وہ جنت میں پہنچ کر اللہ تعالیٰ کا آپ پر شکر کریں گے کہ ان سے غم دور کر دیا گیا، اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزْنَ (۱۲:۲۵) اس سے معلوم ہوا کہ اس دنیا میں کچھ نہ کچھ غم ہونا ہر انسان کے لئے ناگزیر ہے، مگر اس شخص کے جس نے اپنا تعلق حق تعالیٰ کے ساتھ مکمل اور مضبوط کر لیا ہو، خواجہ عزیز الحسن مجددؒ نے خوب فرمایا ہے کہ جو بچتا ہو غموں سے آپ کا دیوانہ ہو جائے

اس آیت میں اللہ والوں سے خوف و غم کی نفی کرنے سے مراد یہ ہے کہ دنیا کی کسی تکلیف یا کسی خواہش و مراد پر ان کو خوف و غم نہ ہوگا، آخرت کی فکر و غم اور اللہ جل شانہ کی ہیبت و جلال تو ان پر اور مستحکم زیادہ ہوتی ہے، اسی لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں یہ آیا ہے کہ آپ اکثر غمگین اور متفکر رہتے تھے، وجہ یہ ہے کہ آپ کا یہ فکر و غم کسی دنیوی نعمت کے فوت ہونے یا کسی مصیبت کے خطرہ سے نہیں، بلکہ اللہ جل شانہ کی ہیبت و جلال سے اور امت

کے حالات کی وجہ سے تھا۔

نیز اس سے یہ بھی لازم نہیں آتا کہ دنیا میں جو چیزیں خوفناک سمجھی جاتی ہیں ان سے انبیاء و اولیاء کو بشری طور پر طبیعتی خوف نہ ہو، کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سامنے جب لاشعی کا سانپ بن گیا تو ان کا ڈر جانا قرآن مجید میں مذکور ہے فَأَوْجَسَ فِي فُجَيْفَةٍ مُّؤْمِنٌ (۱۷:۲۰) کیونکہ یہ فطری اور طبیعتی خوف ابتداً بحال میں تھا، جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا لَا تَخَفْ تو یہ ڈر بالکل نکل گیا۔ اور یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا یہ خوف عام انسانوں کی طرح اس بنیاد پر نہ تھا کہ یہ سانپ ان کو کوئی تکلیف پہنچائے گا، بلکہ اس لئے تھا کہ بنی اسرائیل اس سے کہیں گراہی میں نہ پڑ جائیں تو یہ خوف ایک قسم کا اخروی خوف تھا۔

آخری آیت وَالَّذِينَ كَفَرُوا سے یہ بتلادیا گیا ہے کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کی بھیجی ہوئی ہدایت کی پیروی نہیں کریں گے ان کا ٹھکانا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جہنم ہوگا، اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو اس ہدایت کو ہدایت سمجھنے اور اس کی پیروی کرنے سے انکار کر دیں یعنی کفار اور مؤمنین جو ہدایت کو ہدایت ماننے کا اقرار کرتے ہیں وہ عمل کیسے بھی گنہگار ہوں اپنے گناہوں کی سزا بھگتنے کے بعد بالآخر جہنم سے نکال لئے جائیں گے۔ واللہ اعلم۔

يٰۤاَيُّهَا اِسْرٰٓءِیْلُ اذْكُرُوْا النِّعْمَۃَ الَّتِیْ اَنْعَمْتُ عَلَیْكُمْ وَاذْكُرُوْا

اے بنی اسرائیل یاد کرو میرے وہ احسان جو میں نے تم پر کئے اور تم پر یاد کرو

بِعَهْدِیْٓ اَوْفِ بِعَهْدِکُمْ ؕ وَاِیَّآیَ فَاَرْهَبُوْنَ ۝ وَاٰمِنُوْا بِمَا

میرا اقرار تو میں پروردگاروں تمہارا اقرار اور مجھ ہی سے ڈرو، اور امن و اس کتاب

اَنْزَلْتُ مُّصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ وَلَا تَكُوْنُوْا اَوَّلَ کٰفِرِیْنَ ۝

کو جو میں نے تماری ہر پہچ بتا دیا ہے اس کتاب کو جو تمہارے پاس ہو اور مت ہو سب سے اول منکر اس کے اور

لَا تَشْرَوْا بِاٰیٰتِیْ ثَمَنًا قَلِیْلًا ؕ وَاِیَّآیَ فَاتَّقُوْنَ ۝ وَلَا تَلْسَبُوْا

ذو میری آیتوں پر مول تھوڑا اور مجھ ہی سے بچنے رہو، اور مت ملامت

الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْسِبُوْا الْحَقَّ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝

بیچ میں غلط اور مت چھپاؤ حق کو جان بوجھ کر۔

خلاصہ تفسیر اے بنی اسرائیل (یعنی حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد)

دعا و غم سے نجات مرنے والوں کو نصیب ہوتی ہے جو اللہ کے نوازا ہوگا

اس آیت میں آسمانی ہدایات کی پیروی کرنے والوں کے لئے دو

انعام مذکور ہیں، ایک یہ کہ ان پر کوئی خوف نہ ہوگا، دوسرے وہ غمگین نہ ہوں گے۔
 خوف، آئندہ پیش آنے والی کسی تکلیف و مصیبت کے اندیشہ کا نام ہے اور حزن کسی مقصد
 مراد کے فوت ہو جانے سے پیدا ہونے والے غم کو کہا جاتا ہے، غور کیا جائے تو عیش و راحت کی تمام
 انواع و اقسام کا ان دونوں غظوں میں ایسا احاطہ کر دیا گیا ہے کہ آرام و آسائش کا کوئی فرد اور کوئی قسم اس
 سے باہر نہیں، پھر ان دونوں غظوں کی تعبیر میں ایک خاص فرق کیا گیا ہے کہ خوف کی نفی تو عام انداز
 میں کر دی گئی، مگر حزن کے متعلق یہ نہیں منسرایا کہ لا حزن علیہم بلکہ بصیغہ فعل لایا گیا، اور
 اس کی ضمیر فاعل کو مستم کر کے وَلَا تَهْتَدُوا بِخَيْرٍ قُوْنُ فرمایا گیا، اس میں اشارہ اس طرف ہے
 کہ کسی چیز یا مراد کے فوت ہونے کے غم سے آزاد ہونا صرف انہی اولیاء اللہ کا مقام ہے جو اللہ تعالیٰ
 کی دی ہوئی ہدایات کی بھل پیروی کر لے، ان کے سوا کوئی انسان اس غم سے نہیں بچ سکتا
 خواہ وہ ہفت اقلیم کا بادشاہ ہو یا دنیا کا بڑے سے بڑا مالدار کیونکہ ان میں کوئی بھی ایسا نہیں ہوتا
 جس کو اپنی طبیعت اور خواہش کے خلاف کوئی بات پیش نہ آئے اور اس کا غم نہ ہو، جیسا کہ کہا گیا ہے

دریں دنیا کے بے غم نہ باشد

وگر باشد بنی آدم نہ باشد

مخلاف اولیاء اللہ کے کہ وہ اپنی مرضی اور ارادے کو اللہ رب العزت کی مرضی اور ارادے
 میں فنا کر دیتے ہیں، اس لئے ان کو کسی چیز کے فوت ہونے کا غم نہیں ہوتا، مگر ان مجید میں دوسری جگہ
 بھی اس کو ظاہر کیا گیا ہے، کہ خاص اہل جنت ہی کا یہ حال ہوگا کہ وہ جنت میں پہنچ کر اللہ تعالیٰ کا آپ
 پر شکر کریں گے کہ ان سے غم دور کر دیا گیا، اَلْعَمَلُ الَّذِي اَدَّهَبَ عَنْكَ الْحُزْنَ (۱۲۵:۲۵) اس سے
 معلوم ہوا کہ اس دنیا میں کچھ نہ کچھ غم ہونا ہر انسان کے لئے ناگزیر ہے، مگر اس شخص کے جس نے اپنا
 تعلق حق تعالیٰ کے ساتھ سمجھ لیا اور مضبوط کر لیا، خواجہ عزیز الحسن مجددیؒ نے خوب فرمایا کہ
 جو بچتا ہو غموں سے آپ کا دیوانہ ہو جائے

اس آیت میں اللہ والوں سے خوف و غم کی نفی کرنے سے مراد یہ ہے کہ دنیا کی کسی
 مصیبت یا کسی خواہش و مراد پر ان کو خوف و غم نہ ہوگا، آخرت کی فکر و غم اور اللہ جل شانہ کی
 ہیبت و جلال تو ان پر اور مست زیادہ ہوتی ہے، اسی لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں
 یہ آیا ہے کہ آپ اکثر غمگین اور متفکر رہتے تھے، وجہ یہ ہے کہ آپ کا یہ فکر و غم کسی دنیوی نعمت کے
 فوت ہونے یا کسی مصیبت کے خطرہ سے نہیں، بلکہ اللہ جل شانہ کی ہیبت و جلال سے اور امت

کے حالات کی وجہ سے تھا۔

نیز اس سے یہ بھی لازم نہیں آتا کہ دنیا میں جو چیزیں خوفناک سمجھی جاتی ہیں ان سے انبیاء
 و اولیاء کو بشری طور پر طبیعتی خوف نہ ہو، کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سامنے جب لاشی کا
 سانپ بن گیا تو ان کا ڈر جانا قرآن مجید میں مذکور ہے فَأَوْجَسَ فِي فُجَيْفِهِ خِيفَةً مُّؤْمِنًا (۱۷:۲۷) کیونکہ یہ
 فطری اور طبیعتی خوف ابتداً حال میں تھا، جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا لَا تَخَفْ تو یہ ڈر بالکل بھل گیا۔
 اور یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا یہ خوف عام انسانوں کی طرح اس
 بنیاد پر نہ تھا کہ یہ سانپ ان کو کوئی تکلیف پہنچائے گا، بلکہ اس لئے تھا کہ بنی اسرائیل اس سے کہیں
 گراہی میں نہ پڑ جائیں تو یہ خوف ایک قسم کا اخروی خوف تھا۔

آخری آیت وَالَّذِينَ كَفَرُوا سے یہ بتلادیا گیا ہے کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کی بھیجی ہوئی
 ہدایت کی پیروی نہیں کریں گے ان کا ٹھکانا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جہنم ہوگا، اس سے مراد وہ لوگ
 ہیں جو اس ہدایت کو ہدایت سمجھنے اور اس کی پیروی کرنے سے انکار کر دیں یعنی کفار اور مؤمنین جو
 ہدایت کو ہدایت ماننے کا اقرار کرتے ہیں وہ عمل کیسے بھی گنہگار ہوں اپنے گناہوں کی سزا بھگتتے
 گے بعد الاخر جہنم سے نکال لئے جائیں گے۔ واللہ اعلم۔

يٰۤاَيُّهَا اِسْرٰٓءِیْلُ اذْكُرُوْا النِّعْمَۃَ الَّتِیْ اَنْعَمْتُ عَلَیْكُمْ وَاذْكُرُوْا

اے بنی اسرائیل یاد کرو میرے وہ احسان جو میں نے تم پر کئے اور تم پر یاد کرو

بِعَهْدِیْٓ اَوْفِ بِعَهْدِیْكُمْ ؕ وَاِیَّآیْ فَاَرْهَبُوْنَ ۝۱۰ وَامْنُوْا بِمَا

میرا اقرار تو میں پروردگاروں تمہارا اقرار اور مجھ ہی سے ڈرو، اور امن و اس کتاب

اَنْزَلْتُ مُّصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ وَلَا تَكُوْنُوْا اَوَّلَ کٰفِرِیْنَ ۝۱۱

کو جو میں نے تماری ہر پہچ بتا دیا ہے اس کتاب کو جو تمہارے پاس ہو اور مت ہو سب سے اول منکر اس کے اور

لَا تَشْرَوْا بِاٰیٰتِیْ ثَمَنًا قَلِیْلًا ؕ وَاِیَّآیْ فَاَتَّقُوْنَ ۝۱۲ وَلَا تَلْبِسُوْا

ذو میری آیتوں پر مول تمہارا اور مجھ ہی سے بچنے رہو، اور مت ملاؤ

الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكُنْ لَّكُمُ الْحَقُّ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝۱۳

سچ میں غلط اور مت چھاؤ سچ کو جان بوجھ کر۔

خلاصہ تفسیر اے بنی اسرائیل (یعنی حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد)

نہیں کیا، بلکہ دوسرے نام اسرائیل کا استعمال کیا، اس میں حکمت یہ ہے کہ خود اپنے لقب اور نام ہی سے ان کو معلوم ہو جائے کہ ہم عیسیٰ یعنی اللہ کی عبادت گزار بندے کی اولاد ہیں، ہمیں بھی ان کے نقش قدم پر چلنا چاہئے، اس آیت میں بنی اسرائیل کو خطاب کر کے ارشاد فرمایا کہ:-

اور پورا کرو تم میرے عہد کو، یعنی تم نے جو مجھ سے عہد کیا تھا، تو ریت میں جس کا بیان بقول قتادہؓ و مجاہدؓ اس آیت میں ہے: **وَلَقَدْ أَخَذَ اللَّهُ مِيثَاقَ بَنِي إِسْرَءِيلَ وَكُتِبَ فِي الْكِتَابِ لَكُمْ عَشْرَةٌ آيَاتٍ** (ان، قُرْآنِ احسنًا، دیباچہ ۶، سورہ مائدہ: آیت ۱۲) اس میں سب سے اہم مادہ تمام رسولوں پر ایمان لانے کا شامل ہے، جن میں ہمارے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم خصوصیت سے داخل ہیں نیز نماز، زکوٰۃ، اور صدقات بھی اس عہد میں شامل ہیں، جن کا خلاصہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان اور آپ کا مکمل اتباع ہے، اسی لئے حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ اس عہد سے مراد محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع ہے (ابن جریر بسند صحیح)

پورا کروں گا میں تمھارے عہد کو، یعنی اسی آیت مذکورہ میں اللہ تعالیٰ نے یہ وعدہ فرمایا کہ جو لوگ اس عہد کو پورا کریں گے تو ان کے گناہ معاف کر دیئے جائیں گے، اور جنت میں داخل کیا جائے گا، تو حسب وعدہ ان لوگوں کو جنت کی نعمتوں سے سرفراز کیا جائے گا۔

خلاصہ یہ ہے کہ اے بنی اسرائیل تم میرا عہد محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع کا پورا کرو، تو میں اپنا عہد تمھاری مغفرت اور جنت کا پورا کروں گا، اور صرف مجھ سے ہی ڈرو، اور عوام الناس معتقدین سے نہ ڈرو کہ ان کی منشاء کے خلاف کلمہ حق کہیں گے تو وہ معتقد نہ رہیں گے آمدنی بند ہو جائے گی۔

(۱) اُمّت محمدیہ کی ایک خاص فضیلت اور اطاعت کی طرف دعوت دی ہے، اور اُمّت محمدیہ کو جب اسی کام کے لئے دعوت دی تو احسانات و انعامات کے ذکر کے بغیر فرمایا **قَدْ كُفِّرَتْ عَنْكُمْ**، یعنی تم مجھے یاد کرو میں تمہیں یاد رکھوں گا، اس میں اُمّت محمدیہ کی خاص فضیلت کی طرف اشارہ ہے، کہ ان کا تعلق حسن و نعم سے بلا واسطہ ہی، یہ محسن کو پہچان کر احسان کو پہچانتے ہیں، بخلاف دوسری اُمّتوں کے کہ وہ احسانات کے ذریعہ محسن کو پہچانتے ہیں۔

(۲) ایفائے عہد واجب اس آیت سے معلوم ہوا کہ عہد و معاہدے کو پورا کرنا ضروری ہے، اور عہد شکنی اور عہد شکنی حرام ہے، سورہ مائدہ کی پہلی آیت میں اس سے زیادہ وضاحت کے ساتھ یہ

مضمون آیا ہے: **أَوْ كُفُّوا يَدَافِعُ** رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عہد شکنی کرنے والوں کو جو سزا آخرت میں ملیگی

اس سے پہلے ہی ایک سزا دی جائے گی کہ خشر کے میدان میں جہاں تمام اولین و آخرین کا اجتماع ہوگا عہد شکنی کرنے والے پر ایک جھنڈا بطور علامت کے لگا دیا جائے گا، اور جیسی بڑی عہد شکنی کی ہے اسی جیسی یہ جھنڈا بلند ہوگا، اس طرح ان کو میدان خشر میں رسوا اور شرمندہ کیا جائے گا (صحیح مسلم عن سعید)

(۳) جو شخص کسی گناہ یا ثواب کا سبب بنے، اس پر **أَوَّلُ كَافِرٍ** کا فر ہونا خواہ سب سے پہلے ہو یا بعد ہی کرنے والوں کا گناہ یا ثواب کھاتا ہے

یہ فرمایا کہ پہلے کافر بنو، اس میں اشارہ اس طرف ہے کہ جو شخص اول کفر اختیار کرے گا تو بعد میں اس کو دیکھ کر جو بھی کفر میں مبتلا ہوگا اس کا وبال جو اس شخص پر پڑے گا، اس پہلے کافر بھی اس کا وبال آئے گا، اس طرح یہ پہلا کافر اپنے کفر کے علاوہ بعد کے لوگوں کے کفر کا سبب بنکر ان سب کے وبال کفر کا بھی ذمہ دار ٹھہرے گا، اور اس کا عذاب چند در چند ہو جائے گا۔

فَأَوَّلُ۔ اس سے معلوم ہوا کہ جو شخص دنیا میں دوسروں کے لئے کسی گناہ میں مبتلا ہونے کا سبب بنتا ہے تو جتنے آدمی اس کے سبب مبتلائے گناہ ہوں گے ان سب کا گناہ ان لوگوں کو بھی ہوگا اور اس شخص کو بھی، اس طرح جو شخص دوسروں کے لئے کسی نیک کا سبب بن جائے تو جتنے آدمی اس کے سبب نیک عمل کریں گے، اس کا ثواب جیسا ان لوگوں کو ملے گا ایسا ہی اس شخص کے نامہ اعمال میں بھی لکھا جائے گا، شتران مجید کی متعدد آیات اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی متعدد احادیث میں یہ مضمون بار بار آیا ہے۔

(۴) **وَلَقَدْ كُفِّرْنَا بِلَايَتِي قَسَمًا**، اس آیت میں اللہ تعالیٰ کی آیات کے بدلے میں قیمت لینے کی ممانعت کا مطلب وہ ہے جو آیت کے سابق لسانی سے معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں کی مرضی اور ان کی اغراض کی خاطر اللہ تعالیٰ کی آیات کا مطلب غلط بتلا کر یا چھپا کر لوگوں سے پیسے لئے جائیں، یہ فعل اجماع امت حرام ہے۔

(۵) تعلیم شتران پر رہا یہ معاملہ کہ کسی کو اللہ تعالیٰ کی آیات صحیح بتلا کر یا چھپا کر اس کی اجرت لینا کیسا اجرت لینا جائز ہے؟ اس کا تعلق آیت مذکورہ سے نہیں، خود یہ مسئلہ اپنی جگہ قابل غور و بحث ہے

کہ تعلیم شتران پر اجرت و معاوضہ لینا جائز ہے یا نہیں، فقہ اہل سنت کا اس میں اختلاف ہے، امام مالکؒ شافعیؒ، احمد بن حنبلؒ جائز قرار دیتے ہیں، اور امام عظیم ابو حنیفہؒ اور بعض دوسرے منع فرماتے ہیں کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شتران کو ذریعہ کسب معاش کا بنانے سے منع فرمایا ہے۔

لیکن مشائخ حنفیہ نے بھی جب ان حالات کا مشاہدہ کیا، کہ شتران مجید کے معلمین کو اسلامی بیت المال سے گزارہ ملا کرتا تھا، اب ہر جگہ اسلامی نظام میں فتور کے سبب ان معلمین

کو عموماً کچھ نہیں ملتا، یہ اگر اپنے معاش کے لئے کسی محنت مزدوری یا تجارت وغیرہ میں لگ جائیں تو بچوں کو تعلیم مسترآن کا سلسلہ بحیرہ بند ہو جائے گا، کیونکہ وہ دن بھر کا مشغلہ چاہتا ہے، اس لئے تعلیم مسترآن پر توجہ لینے کو بضرورت جائز قرار دیا، جیسا کہ صاحب ہدایہ نے فرمایا ہے کہ آجکل اسی پر نشوونما دینا چاہئے، کہ تعلیم مسترآن پر اجرت و تنخواہ لینا جائز ہے، صاحب ہدایہ کے بعد آنے والے دوسرے فقہاء نے بعض ایسے ہی دوسرے وظائف جن پر تعلیم مسترآن کی طرح دین کی بقتا موقوف ہو، مثلاً امامت و اذان اور تعلیم حدیث و فقہ وغیرہ کو تعلیم مسترآن کے ساتھ ملحق کر کے ان کی بھی اجازت دی (رد مختار، شامی)

(۶) ایصال ثواب کے لئے ختم قرآن پر علامہ شامی نے درمختار کی شرح میں اور اپنے رسالہ شفا بعلیل اجرت لینا باتفاق حجاز نہیں میں بڑی تفصیل اور قوی دلائل کے ساتھ یہ بات واضح کر دی کہ تعلیم مسترآن وغیرہ پر اجرت لینے کو جن متاحسریں فقہاء نے جائز قرار دیا ہے اس کی علت ایک ایسی دینی ضرورت ہے جس میں غفل آنے سے دین کا پورا نظام بخل ہو جاتا ہے، اس لئے اس کو ایسی ہی ضرورت کے مواقع میں محدود رکھنا ضروری ہے، اس لئے فردوں کو ایصال ثواب کیلئے ختم مسترآن کرنا یا کوئی دوسرا وظیفہ پڑھوانا اجرت کے ساتھ حرام ہے، کیونکہ اس پر کسی عام دینی ضرورت کا مدار نہیں، اور اجرت لیکر پڑھنا حرام ہوا تو اس طرح پڑھنے والا اور پڑھوانے والا دونوں گناہگار ہوئے، اور جب پڑھنے والے ہی کو کوئی ثواب نہ ملا تو میت کو وہ کیا پہنچائے گا، علامہ شامی نے اس بات پر فقہاء کی بہت سی تصریحات تاج الشریعہ، عینی شرح ہدایہ، حاشیہ خیر الدین بر بحر الرائق وغیرہ سے نقل کی ہیں، اور خیر الدین دلی کا یہ قول بھی نقل کیا ہے کہ ایصال ثواب کے لئے قبر پر مسترآن پڑھوانا اجرت دے کر ختم مسترآن کرنا صحابہ و تابعین اور اسلاف امت سے کہیں منقول نہیں، انہی نے بدعت ہے (شامی، ص ۱۳۴، ج ۱)

(۷) حق بات کو چھپانا اس میں آیت دَاوُلْ تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ الْوُ سے ثابت ہوا کہ حق بات کو غلط حیلہ ملتا کرنا حرام ہے ہر باتوں کے ساتھ گڈمڈ کر کے اس طرح پیش کرنا جس سے مخاطب مغالطہ میں پڑ جائے جائز نہیں، اسی طرح کسی خوت یا طبع کی وجہ سے حق بات کا چھپانا بھی حرام ہے، مسئلہ واضح ہو، اس میں کسی تفصیل کی ضرورت نہیں، امام شریعتی نے اپنی تفسیر میں حق کو چھپانے سے پرہیز کرنے کا ایک واقعہ اور مفصل مکالمہ حضرت ابو حازم تابعی اور خلیفہ سلیمان بن عبد الملک کا نقل کیا ہے، جو بہت سے فوائد کی وجہ سے قابل ذکر ہے۔

حضرت ابو حازم تابعی سلیمان بن عبد الملک کے ساتھ مذکور ہو کر ایک مرتبہ سلیمان بن عبد الملک مدینہ طیبہ میں اور عبد الملک کے دربار میں اور جبہ و زقیام کیا تو لوگوں کو دریافت کیا کہ مدینہ طیبہ میں اب کوئی ایسا آدمی موجود ہے جس نے

کبھی صحابی کی صحبت پائی ہو؟ لوگوں نے بتلایا، ہاں ابو حازم ایسے شخص ہیں، سلیمان نے اپنا آدمی بھیج کر ان کو بلوایا، جب وہ تشریف لائے تو سلیمان نے کہا کہ اسے ابو حازم یہ کیا ہے مرواتی اور بیروانی ہے؟ ابو حازم نے کہا، آپ کے میری کیا ہے مرواتی اور بیروانی دیکھی ہے؟ سلیمان نے کہا کہ مدینہ کے سب سے بڑے لوگ مجھ سے ملنے آئے، آپ نہیں آئے، ابو حازم نے کہا، امیر المؤمنین میں آپ کو اللہ کی پناہ میں دیتا ہوں اس سے کہ آپ کوئی ایسی بات کہیں جو واقعہ کے خلاف ہے، آج سے پہلے نہ آپ مجھ سے واقعہ تھے اور نہ میں نے کبھی آپ کو دیکھا تھا، ایسے حالات میں خود ملاقات کے لئے آنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، بیروانی کیسی!

سلیمان نے جواب سنکر ابن شہاب زہریؒ اور حاضر مجلس کی طرف التفات کیا، تو امام زہریؒ نے فرمایا کہ ابو حازم نے صحیح منسرایا، آپ نے غلط کی۔

اس کے بعد سلیمان نے زود سے سخن بدل کر کچھ سوالات شروع کئے اور کہا اے ابو حازم! یہ کیا بات ہے کہ ہم موت سے گھبراتے ہیں؟ آپ نے فرمایا وجہ یہ ہے کہ آپ نے اپنی آخرت کو دیران اور دنیا کو آباد کیا ہے، اس لئے آبادی سے دیرانہ میں جانا پسند نہیں۔

سلیمان نے تسلیم کیا، اور پوچھا کہ کل اللہ تعالیٰ کے سامنے حاضری کیسے ہوگی؟ منسرایا کہ نیک عمل کرنے والا تو اللہ تعالیٰ کے سامنے اس طرح جائے گا جیسا کوئی مسافر سفر سے واپس اپنے گھر والوں کے پاس جاتا ہے، اور بُرے عمل کرنے والا اس طرح پیش ہوگا، جیسا کوئی بھگتا ہوا غلام بچہ کر آقا کے پاس حاضر کیا جاتا ہے۔

سلیمان یہ سنکر رو پڑے، اور کہنے لگے کاش میں معلوم ہوتا کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے لئے کیا صورت تجویز کر رکھی ہے، ابو حازم نے فرمایا کہ اپنے اعمال کو اللہ کی کتاب پر پیش کر دو تو تیرے گناہیں سلیمان نے دریافت کیا کہ مسترآن کی کس آیت سے یہ پتہ لگے گا؟ فرمایا اس آیت سے، اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِي نَعِيمٍ قَدْ اَتَتْ الْفُجَّارَ لَعْنَةُ الْجَحِيْمِ (۱۳۰، ۱۳۱) یعنی بلا شیعہ نیک عمل کرنے والے جنت کی نعمتوں میں ہیں، اور نافرمان، عکلاء، شکار و درخ میں۔

سلیمان نے کہا کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت تو بڑی ہے، وہ بکاروں پر بھگادی ہے، فرمایا اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِيْنَ (۱۴۰)، یعنی اللہ تعالیٰ کی رحمت نیک عمل کرنے والوں سے قریب ہے۔

سلیمان نے پوچھا اے ابو حازم اللہ کے بندوں میں سب سے زیادہ کون عزت والا ہے؟ فرمایا وہ لوگ جو موت اور عقل سلیم رکھنے والے ہیں۔

پھر پوچھا کہ کونسا عمل افضل ہے؟ تو فرمایا کہ فرائض و اجابت کی ادائیگی حرام چیزوں

سے بچنے کے ساتھ۔

پھر دریافت کیا کہ کونسی دعا زیادہ قابل قبول ہے؟ تو فرمایا کہ جس شخص پر احسان کیا گیا اس کی دعا اپنے محسن کے لئے اقرب الی القبول ہے۔

پھر دریافت کیا کہ صدقہ کونسا افضل ہے؟ تو فرمایا کہ مصیبت زدہ سائل کے لئے باوجود اپنے افلاس کے جو کچھ ہو سکے، اس طرح خرچ کرنا کہ اس سے پہلے احسان جتانے اور نہ مال مٹول کر کے ایذا پہنچانے۔

پھر دریافت کیا کہ کلام کونسا افضل ہے؟ تو فرمایا کہ جس شخص سے تم کو خوف ہو یا جس سے تمہاری کوئی حاجت ہو اور امید وابستہ ہو اس کے سامنے بغیر کسی رو رعایت کے حق بات کہہ دینا۔ پھر دریافت کیا کہ کونسا مسلمان سب سے زیادہ ہوشیار ہو؟ فرمایا وہ شخص جس نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے تحت کام کیا ہو، اور دوسروں کو بھی اس کی دعوت دی ہو۔

پھر پوچھا کہ مسلمانوں میں کون شخص اچھا ہے؟ فرمایا وہ آدمی جو اپنے کسی بھائی کی اس کے ظلم میں امداد کرے، جس کا حاصل یہ ہوگا کہ اس نے دوسرے کی دنیا درست کرنے کے لئے اپنا دین بچ دیا، سلیمانؑ نے کہا کہ صحیح منسرایا۔

اس کے بعد سلیمانؑ نے اور واضح الفاظ میں دریافت کیا کہ ہمارے ہمارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ ابو حازمؒ نے فرمایا کہ مجھے اس سوال سے معاف رکھیں تو بہتر ہے، سلیمانؑ نے کہا کہ نہیں، آپ ضرور کوئی نصیحت کا کلمہ کہیں۔

ابو حازمؒ نے فرمایا، اے امیر المؤمنین تمہارے آباء و اجداد نے بڑے شمشیر و گول پر تسلط کیا، اور زبردستی ان کی مرضی کے خلاف ان پر حکومت قائم کی، اور بہت سے لوگوں کو قتل کیا، اور یہ سب کچھ کرنے کے بعد وہ اس دنیا سے رخصت ہو گئے، کاش! آپ کو معلوم ہو تاکہ اب وہ مرنے کے بعد کیا کہتے ہیں، اور ان کو کیا کہا جاتا ہے۔

حاشیہ نشینوں میں سے ایک شخص نے بادشاہ کے مزاج کے خلاف ابو حازمؒ کی اس صاف گوئی کو مستحکم کہا کہ ابو حازمؒ تم نے یہ بہت بڑی بات کہی ہے، ابو حازمؒ نے فرمایا کہ تم غلط کہتے ہو، بڑی بات نہیں کہیں، بلکہ وہ بات کہی جس کا ہم کو حکم ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے علماء سے اس کا عہد لیا ہے کہ حق بات تو گور کرنا کہیں گے چھپائیں گے نہیں، اَلْجَوَابُ لِلْعَالَمِینَ وَلَا تَخْشَوْنَ قَوْمًا (۱۸۴:۲) یہی وہ بات ہے جس کے لئے یہ طویل حکایت امام قرطبی نے آیت مذکورہ کی تفسیر میں درج فرمائی ہے۔

سلیمانؑ نے پھر سوال کیا کہ اچھا اب ہمارے درست ہونے کا کیا طریقہ ہے؟ منسرایا کہ

پیچھے چھوڑ دو، عروت نہتیار کر دو، اور حقوق والوں کو ان کے حقوق انصاف کے ساتھ تقسیم کر دو۔ سلیمانؑ نے کہا کہ ابو حازمؒ کیا ہو سکتا ہے کہ آپ ہمارے ساتھ رہیں، منسرایا، خدا کی پناہ سلیمانؑ نے پوچھا یہ کیوں؟ فرمایا کہ اس لئے کہ مجھے خطرہ یہ ہے کہ میں تمہارے مال و دولت اور عورت و جاہ کی طرف کچھ مائل ہو جاؤں جس کے نتیجے میں مجھے عذاب بھگتنا پڑے۔

پھر سلیمانؑ نے کہا کہ اچھا آپ کی کوئی حاجت ہو تو بتلائیے کہ ہم اس کو پورا کریں؟ فرمایا: ہاں ایک حاجت ہے کہ جہنم سے نجات دلاؤ اور جنت میں داخل کر دو، سلیمانؑ نے کہا کہ یہ تو میرے اختیار میں نہیں، منسرایا کہ پھر مجھے آپ سے اور کوئی حاجت مطلوب نہیں۔

آخر میں سلیمانؑ نے کہا کہ اچھا میرے لئے دعا کیجئے، تو ابو حازمؒ نے یہ دعا کی، یا اللہ اگر سلیمانؑ آپ کا پسندیدہ ہے تو اس کے لئے دنیا و آخرت کی بہتری کو آسان بنا دے، اور اگر وہ آپ کا دشمن ہو تو اس کے بال پر کر اپنی مرضی اور محبوب کاموں کی طرف لے آ۔

سلیمانؑ نے کہا کہ مجھے کچھ وصیت فرمادیں، ارشاد فرمایا کہ مختصر یہ ہے کہ اپنے رب کی غلامی و حبس اس درجہ میں رکھو کہ وہ تمہیں اس مقام پر نہ دیکھے جس سے منع کیا ہے، اور اس مقام سے غیر حاضر نہ پائے جس کی طرف آنے کا اس نے حکم دیا ہے۔

سلیمانؑ نے اس مجلس سے فارغ ہونے کے بعد تنوگنیاں بطور ہدیہ کے ابو حازمؒ کے پاس بھیجیں، ابو حازمؒ نے ایک خطا کے ساتھ ان کو واپس کر دیا، خط میں لکھا تھا کہ اگر یہ تنوگنیاں میرے کلمات کا معاوضہ ہیں تو میرے نزدیک خون اور خنزیر کا گوشت اس سے بہتر ہے، اور اگر اس لئے بھیجا ہے کہ بیت المال میں میرا حق ہے تو مجھ جیسے ہزاروں علماء اور دین کی خدمت کرنے والے میں اگر سب کو آپ نے اتنا ہی دیا ہے تو میں بھی لے سکتا ہوں اور نہ مجھے اس کی ضرورت نہیں۔

ابو حازمؒ کے اس ارشاد سے کہ اپنے کلمات نصیحت کا معاوضہ لینے کو خون اور خنزیر کی طرح قرار دیا ہے اس مسئلہ پر بھی روشنی پڑتی ہے کہ کس طاعت و عبادت کا معاوضہ لینا ان کے نزدیک جائز نہیں۔

وَأَقِمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ وَارْكَعُوا مَعَ الرَّاكِعِينَ ﴿۲۱۱﴾

اور قائم رکھو نماز اور دیا کرو زکوٰۃ اور گھجکھ نمازیں گھجکھ والوں کے ساتھ

أَتَأْمُرُونَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنسَوْنَ أَنْفُسَكُمْ وَأَنْتُمْ تَسْلُونَ

کیا تم کہتے ہو لوگوں کو نیک کام کا اور بھولتے ہو اپنے آپ کو اور تم تو پڑھتے ہو

اَلْكِتَابِ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝۶۱ وَاسْتَعِيْزُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ لِئَلَّا

کتاب پھر کیوں نہیں سوچتے ہو، اور مدد چاہو صبر سے اور نماز سے اور

اِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ ۝۶۲ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنْهُمْ

البتہ وہ بھاری ہے مگر اپنی عاجزوں پر جن کو خیال ہے کہ وہ دوبارہ ہونے والے

مُلَقَّوْنَ اَتِيْهِمْ وَاَنْتُمْ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ۝۶۳

میں اپنے رب کے اور یہ کہ اُن کو اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔

خلاصہ تفسیر

اور قائم کرو ستم لوگ نماز کو یعنی مسلمان ہو کر اور روز کوۃ کو اور عاجزی کرو و عاجزی کرنے والوں کے ساتھ علماء بنی اسرائیل کے بعض اقارب مسلمان ہو گئے تھے جب ان سے گفتگو ہوتی تو خفیہ طور پر یہ علماء اُن سے کہتے تھے کہ بیشک محمد صلی اللہ علیہ وسلم رسول برحق ہیں ہم لوگ تو کسی مصلحت سے مسلمان نہیں ہوتے، مگر تم اس مذہب اسلام کو نہ چھوڑنا، اسی بنا پر حق تعالیٰ نے فرمایا کیا غضب ہو کہ کہتے ہو اور لوگوں کو نیک کام کرنے کو یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے اور آپ کی اطاعت کرنے کو اور اپنی خبر نہیں لیتے حالانکہ تم تلاوت کرتے رہتے ہو کتاب کی (یعنی توریت کی جس میں جا بجا ایسے عالم بے عمل کی مذمتیں مذکور ہیں) تو پھر کیا ستم آتا بھی نہیں سمجھتے اور مدد لو یعنی اگر تم کو حُتّ مال و حُتّ جاہ کی وجہ سے ایمان لانا دشوار معلوم ہوتا ہو تو مدد لو صبر اور نماز سے یعنی ایمان لا کر صبر اور نماز کا التزام کرو تو یہ حُتّ مال و جاہ دل سے نکل جائے گی، اور اگر کوئی کہے کہ خود نماز اور صبر کا التزام بہت دشوار ہے تو میں نے کہ اور بیشک وہ نماز دشوار و صبر ہے مگر جن کے قلوب میں خشوع ہو ان پر کچھ بھی دشوار نہیں، وہ خاشعین وہ لوگ ہیں جو خیال رکھتے ہیں اس کا کہ بیشک اللہ اپنے رب سے اس بات کا بھی خیال رکھتے ہیں کہ وہ اپنے رب کی طرف واپس جانے والے ہیں تو ان کو اس کا حساب کتاب بھی دینا ہو گا ان دونوں خیالوں سے رغبت بھی پیدا ہوگی خوف بھی اور یہی دو چیزیں ہر عمل کی مدد ہیں۔

معارف و مسائل

ربط آیات | بنی اسرائیل کو اللہ تعالیٰ نے اپنی نعمتیں اور احسانات یاد دلایا کہ ایمان اور عمل صالح

کی طرف دعوت دی ہے، پچھلے تین آیتوں میں ایمان و عقائد سے متعلق ہدایات تھیں، اور ان چار آیتوں میں اعمال صالحہ کی تلقین ہے، اور ان میں جو اعمال سب سے زیادہ اہم ہیں ان کا ذکر ہے، اور اصل مطلب آیات کا یہ ہے کہ ————— اور اگر تم کو حُتّ مال و جاہ کے غلبہ سے ایمان لانا دشوار معلوم ہوتا ہو تو اس کا علاج یہ ہو کہ صبر اور نماز سے مدد حاصل کرو، صبر سے حُتّ مال گھٹ جائے گی، کیونکہ مال اسی درجہ سے مطلوب محبوب ہے کہ وہ ذریعہ ہے لذات و شہوات کے پورا کرنے کا جب ان لذات و شہوات کی مطلق العنانی چھوڑنے پر ہمت باندھ لو گے، تو پھر مال کی تسرا دانی کی نہ ضرورت ہے گی نہ اُس کی بھنت ایسی غالب آئے گی کہ اپنے نفع نقصان سے اندھا کر دے، اور نماز سے حُتّ جاہ کم ہو جائے گی، کیونکہ نماز میں ظاہری اور باطنی ہر طرح کی پستی اور عاجزی ہی ہے، جب نماز کو صحیح صحیح ادا کرنے کی عادت ہو جائے گی تو حُتّ جاہ و منصب اور تکبر و عشرہ گھٹے گا، اصل مادہ فساد جس کے سبب ایمان لانا دشوار تھا یہی مال و جاہ کی بھنت تھی، جب یہ مادہ فساد گھٹ گیا تو ایمان لانا آسان ہو جائے گا۔

اب سمجھئے کہ صبر میں تو صرف غیر ضروری خواہشات اور شہوات کا ترک کرنا ہے، اور نماز میں بہت افعال کا واقع کرنا بھی ہے، اور بہت سی جائز خواہشات کو بھی وقتی طور پر ترک کرنا ہو گا مثلاً کھانا، پینا، کلام کرنا، چلنا پھرنا، اور دوسری انسانی ضروریات جو شرعاً جائز و مباح ہیں ان کو بھی نماز کے وقت ترک کرنا ہے، اور وہ بھی اوقات کی پابندی کے ساتھ دن رات میں پانچ مرتبہ اس لئے نماز نام ہو کچھ افعال معینہ کا، اور معینہ اوقات میں تمام ناجائز و جائز چیزوں سے صبر کرنے کا۔

غیر ضروری خواہشات کے ترک کرنے پر انسان بہت باندھ لے تو چند روز کے بعد طبیعت تقاضا بھی ختم ہو جاتا ہے، کوئی دشواری نہیں رہتی، لیکن نماز کے اوقات کی پابندی اور اس کے تمام شرائط کی پابندی اور ضروری خواہشات سے بھی ان اوقات میں پرہیز کرنا یہ انسانی طبیعت پر بہت بھاری اور دشوار ہے، اس لئے یہاں پیشہ ہو سکتا ہے کہ ایمان کو آسان بنانے کا جو نسخہ تجویز کیا گیا کہ صبر اور نماز سے کام لو، اس نسخہ کا استعمال خود ایک دشوار چیز ہے خصوصاً نماز کی پابندیوں کا تو اس دشواری کا کیا علاج ہو گا! اس کے لئے ارشاد فرمایا، بیشک وہ نماز دشوار ضرور ہے، مگر جن کے قلوب میں خشوع ہو ان پر کچھ بھی دشوار نہیں، اس میں نماز کے آسان کرنے کی ترکیب بتلا دی گئی۔

اصل یہ ہو کہ نماز میں دشواری کی وجہ اور سبب پر غور کریں تو معلوم ہو گا کہ انسان کا قلب مگر بیدار خیال میں آزاد پھرنے کا، اور سب اعضائے انسانی قلب کے تابع ہیں، اس لئے قلب کا تقاضا یہی ہوتا ہو کہ اس کے سب اعضا بھی آزاد ہیں، اور منہ اس امر اس آزادی کے خلاف

ہے، کہ نہ ہنسوں نہ لوؤ نہ کھاؤ نہ پیو، نہ چلو، وغیرہ وغیرہ اس لئے قلب ان تقیدات سے تنگ ہوتا ہے اور اس کے تلمیذ اعضائے انسانی بھی اس سے تکلیف محسوس کرتے ہیں۔

خلاصہ یہ ہو کہ سبب اس دشواری اور گرانی کا قلب کی حرکت فکر یہ ہے، تو اس کا علاج سکون سے ہونا چاہئے، اس لئے خشوع کو نماز کے آسان ہونے کا ذریعہ بتایا گیا، کیونکہ خشوع کے معنی ہی سکون قلب کے ہیں، اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ سکون قلب یعنی خشوع کس طرح حاصل ہو تو یہ بات تجربہ سے ثابت ہو کہ اگر کوئی شخص اپنے قلب کے مختلف افکار و خیالات کو براہ راست نکالنا چاہے تو اس میں کامیابی قریب بحال ہو، بلکہ اس کی مذہب سیر یہ ہو کہ نفس انسانی چونکہ ایک وقت میں دو طرف متوجہ نہیں ہو سکتا، اس لئے اگر اس کو کسی ایک خیال میں محدود فریق کر دیا جائے تو دوسرے خیالات اور افکار خود بخود دل سے نکل جائیں گے، اس لئے تین خشوع کے بعد وہ خیال بتلاتے ہیں جس میں مستغرق ہو جانے سے دوسرے خیالات دفع ہوں، اور ان کے دفع ہونے سے حرکت فکر یہ قلب کی منقطع ہو کر سکون حاصل ہو، اور سکون سے نماز میں آسانی ہو کر اس پر مداومت اور پابندی نصیب ہو، اور اس پابندی سے کبر و غرور اور حب چاہ کہ ہو، تاکہ ایمان کے رستہ میں جو حاصل ہے وہ دور ہو کر ایمان کا بل ہو جائے، سبحان اللہ کیا مرتب علاج اور مطلب ہے۔

اب اس خیال مذکور کی تلقین و تصیین اس طرح فرمائی: وہ خاشعین وہ لوگ ہیں جو خیال رکھتے ہیں اس کا کہ وہ بے شک ملنے والے ہیں اپنے رب کے، تو اس وقت اس خدمت کا خوب انعام ملے گا، اور اس بات کا بھی خیال رکھتے ہیں کہ وہ اپنے رب کی طرف واپس جانے والے ہیں، تو اس وقت اس کا حساب و کتاب بھی دینا ہوگا، ان دونوں خیالوں سے رغبت و درہست یعنی امید اور خوف پیدا ہوں گے، ازل تو ہر خیال محدود میں مستغرق ہو جاتا قلب کو نیک کام پر جادوتا ہو، خصوصاً امید و ہرجا خیال، اس کو تو خاص طور پر دخل ہے نیک کام میں مستعد کر دینے کے لئے۔

ایقینوا الصلوٰۃ، صلوٰۃ کے لفظی معنی دعا کے ہیں، اصطلاح شریع میں وہ خاص عبادت ہے جس کو نماز کہا جاتا ہے، مسترآن کریم میں عموماً نماز کی جتنی توجہ تاکید کی گئی ہے لفظ اقامت کے ساتھ آئی ہے، مطلق نماز پڑھنے کا ذکر صرف ایک دو جگہ آیا ہے، اس کو اقامت صلوٰۃ کی حقیقت کو سمجھنا چاہئے، اقامت کے لفظی معنی سپید ہا کرنے اور ثابت رکھنے کے ہیں، اور عادت جو عموماً بار بار یا درخت وغیرہ سپید ہا کرتا ہوتا ہوا رہتا ہے، اگر جانے کا خطرہ کم ہو تو اس لئے اقامت کے معنی دائم اور قائم کرنے کے بھی آتے ہیں۔

مسترآن و سنت کی اصطلاح میں اقامت صلوٰۃ کے معنی نماز کو اس کے وقت میں پابندی کے ساتھ اس کے پورے آداب و شرائط کی رعایت کر کے ادا کرنا ہے، مطلق نماز پڑھ لینے کا نام اقامت

صلوٰۃ نہیں ہے، نماز کے جتنے فضائل اور آثار و برکات قرآن و حدیث میں آئے ہیں وہ سب اقامت صلوٰۃ کے ساتھ مقید ہیں، مثلاً مسترآن کریم میں ہے:

إِنَّ الصَّلَاةَ تَنْهَىٰ عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ - (۲۵: ۳۱) | عین نماز انسان کو ہر بے حیائی اور ہر بے کام سے روک دیتی ہے

نماز کا یہ اثر اسی وقت ظاہر ہوگا جب کہ نماز کی اقامت اس معنی سے کرے جو ابھی ذکر کئے گئے ہیں اس لئے بہت سے نمازیوں کو بڑا ہیوں اور بے حیائیوں میں مبتلا دیکھ کر اس آیت پر کوئی شبہ نہ کرنا چاہئے، کیونکہ ان لوگوں نے نماز پڑھی تو ہے مگر اس کو قائم نہیں کیا۔

أَتُوا الزَّكَاةَ، لفظ زکوٰۃ کے معنی لغت میں دواتے ہیں، پاک کرنا اور بڑھنا، اصطلاح شریعت میں مال کے اس حصہ کو زکوٰۃ کہا جاتا ہے جو شریعت کے احکام کے مطابق کسی مال میں نکالا جائے اور اس کے مطابق صرف کیا جائے۔

اگرچہ یہاں خطاب موجودہ بنی اسرائیل کو ہے جس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ نماز اور زکوٰۃ اسلام سے پہلے بنی اسرائیل پر فرض تھی، مگر سورۃ مائدہ میں ذَلَّلْنَا آدَمَ فِيهِ الْبَنِيَّةَ آدَمَ وَبَعَثْنَا فِيهِمُ اثْنَيْ عَشَرَ نَبِيًّا وَقَالُوا اللَّهُ إِنَّا مَعَكُمْ وَلَكِنْ أَتَيْنَاكُمْ بِالْحَقِّ (۱۱: ۵) الخ سے ثابت ہو کہ نماز اور زکوٰۃ بنی اسرائیل پر فرض تھی، اگرچہ اس کی کیفیت اور ہیئت وغیرہ میں فرق ہو۔

وَأَن لَّكُم مِّنَ الشَّيْءِ الَّذِي تَرَكَتُم مِّنْ دُونِهِ حُكْمٌ، رکوع کے لفظی معنی چھوڑنے کے ہیں، اور اس معنی کے اعتبار سے یہ لفظ عہد پر بھی بولا جاسکتا ہے، کیونکہ وہ بھی چھوڑنے کا انتہائی درجہ ہے، مگر اصطلاح شریع میں اس خاص چھوڑنے کو رکوع کہتے ہیں جو نماز میں معروف و مشہور ہے۔

آیت کے معنی یہ ہیں کہ رکوع کر دو رکوع کرنے والوں کے ساتھ: یہاں ایک بات قابل غور ہے کہ نماز کے تمام ارکان میں سے اس جگہ رکوع کی تخصیص کیوں کی گئی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں نماز کا ایک جز، بول کر رکوع نماز مطلقاً گئی ہے، جیسے قرآن مجید میں ایک جگہ فَتَرَأَوْنَ الْفَيْجَ مَسْرُورًا ہر نماز فجر مراد ہے، اور بعض روایات حدیث میں عہدہ کا لفظ بول کر پوری رکعت یا نماز مراد لی گئی ہے، اس لئے مراد آیت کی یہ ہو گئی کہ نماز پڑھنا نماز پڑھنے والوں کے ساتھ، لیکن یہ سوال پھر بھی باقی رہ جاتا کہ نماز کے بہت سے ارکان میں سے رکوع کی تخصیص میں کیا حکمت ہے؟

جواب یہ ہو کہ یہود کی نماز میں عہدہ وغیرہ تو تھا، مگر رکوع نہیں تھا، رکوع اسلامی نماز کی خصوصیات میں سے ہے، اس لئے راغبین کے لفظ سے انتہائی محکم یہ کہ نماز مراد ہوں گے، جن کی نماز میں رکوع بھی ہے، اور معنی آیت کے یہ ہیں کہ تم بھی امت محمدیہ کے نمازیوں کے ساتھ نماز ادا کرو، یعنی اول ایمان قبول کرو پھر جماعت کے ساتھ نماز ادا کرو۔

اجاعت نماز کے احکام | نماز کا حکم اور اس کا مندرجہ ہونا تو لفظ "آفِیْہِوَا الصَّلٰوۃُ" سے معلوم ہو چکا تھا، اس جگہ تیغ الشریکین کے لفظ سے نماز کو جماعت کے ساتھ ادا کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ یہ حکم کس درجہ کا ہے؟ اس میں علماء فقہاء کا اختلاف ہے، ایک جماعت صحابہ و تابعین اور فقہائے امت کی جماعت کو واجب قرار دیتی ہے، اور اس کے چھوڑنے کو سخت گناہ اور بعض صحابہ کرام تو اس نماز ہی کو جائز قرار نہیں دیتے جو بلا غرض شرعی کے بدن جماعت پڑھی جاتے، یہ آیت ظاہری الفاظ کے اعتبار سے ان حضرات کی حجت ہے، جو وجوب جماعت کے قائل ہیں۔ اس کے علاوہ چند روایات حدیث سے بھی جماعت کا واجب ہونا سمجھا جاتا ہے، ایک حدیث میں ہے کہ:

لَا صَلَوةَ لِبَعَادٍ مِّنَ الْمَسْجِدِ إِلَّا فِي الْمَسْجِدِ (رواہ ابو داؤد)

"یعنی مسجد قریب رہنے والے کی نماز صرف مسجد میں جائز ہے۔"

اور مسجد کی نماز سے ظاہر ہے کہ جماعت کی نماز اور اگر تو الفاظ حدیث سے یہ مطلب نکلا کہ مسجد کے قریب رہنے والے کی نماز بغیر جماعت کے جائز نہیں۔

مسجد کے سوا کسی اور جگہ جماعت | اور صحیح مسلم میں بروایت حضرت ابو ہریرہ منقول ہے کہ ایک نابینا صحابی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ میرے ساتھ کوئی ایسا آدمی نہیں جو مجھے مسجد تک پہنچا دیا اور لیجا کرے، اس لئے اگر آپ اجازت دیں تو میں نماز گھر میں پڑھ لیا کروں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ازل توان کو اجازت دیدی، مگر جب وہ جانے لگے تو سوال کیا کہ کیا اذان کی آواز تمہارے گھر تک پہنچتی ہے؟ انھوں نے عرض کی کہ اذان کی آواز تو میں سنتا ہوں، آپ نے فرمایا پھر تو آپ کو مسجد میں آنا چاہئے، اور بعض روایات میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ پھر میں آپ کے لئے کوئی گھانٹاں اور رخصت نہیں پاتا (آخر جہ ابو داؤد)

اور حضرت عبداللہ بن عباس نے کہا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

مَنْ تَمِيعَ الْيَتَامَا فَلَمْ يَجِبْ قَلَامُ صَلَوةٍ لَهُ إِلَّا مَنْ عُلِّيَ بِهَا (صحیحہ القرطبی)

"یعنی جو شخص یتیموں کی آواز سنتا ہے اور جماعت مسجد میں نہیں آتا تو اس کی نماز نہیں بھٹی مگر یہ کہ اس کو کوئی غرض شرعی ہو۔"

ان احادیث کی بناء پر حضرت عبداللہ بن مسعود اور ابو موسیٰ اشعرنی وغیرہ حضرات صحابہؓ نے یہ فتویٰ دیا کہ جو شخص مسجد سے اتنا قریب رہتا ہے کہ اذان کی آواز وہاں تک پہنچتی ہے تو اگر وہ بلا غرض کے جماعت میں حاضر نہ ہوا تو اس کی نماز ہی نہیں ہوتی (آواز سننے سے مراد یہ ہے کہ متوسط آواز والے آدمی کی آواز وہاں پہنچ سکے، آگے بھر ضرورت یا غیر معمولی بلند آواز کا اس میں اعتبار نہیں)۔

یہ سب روایات ان حضرات کی دلیل ہیں جو جماعت کو واجب قرار دیتے ہیں، مگر جمہور امت علماء فقہاء صحابہ و تابعین کے نزدیک جماعت سنت مؤکدہ ہے، مگر سنن مؤکدہ میں سنت فخر کی طرح سب سے زیادہ مؤکدہ اور قریب بوجوب ہے، ان سب حضرات نے قرآن کریم کے امر و نہی و تنزیہ و تنقیہ کے لفظوں کو دوسری آیات اور روایات کی بناء پر تاکید کے لئے قرار دیا ہے۔ اور جن احادیث کے ظاہر سے معلوم ہوتا ہے کہ مسجد کے قریب رہنے والے کی نماز بغیر جماعت کے ہوتی ہی نہیں، اس کا یہ مطلب قرار دیتے ہیں کہ یہ نماز کامل اور مقبول نہیں، اس معاملے میں حضرت عبداللہ بن مسعود کا بیان بہت واضح اور کافی ہے جس کو امام مسلم نے روایت کیا ہے جس کا ترجمہ یہ ہے:

فقہ الامت حضرت عبداللہ بن مسعود نے فرمایا کہ جو شخص یہ چاہتا ہو کہ کل (محشر میں) اللہ تعالیٰ سے مسلمان ہونے کی حالت میں ملے تو اس کو چاہئے کہ ان (پانچ) نمازوں کے ادا کرنے کی پابندی اس جگہ کرے جہاں اذان دی جاتی ہے، (یعنی مسجد) کیونکہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے کچھ ہدایت کے طریقے بتلائے ہیں، اور ان پانچ نمازوں کو جماعت کے ساتھ ادا کرنا انہی سنن حدیثی میں ہے، اور اگر تم نے یہ نمازیں اپنے گھر میں پڑھ لیں، جیسے یہ جماعت سے الگ رہنے والا اپنے گھر میں پڑھ لیتا ہے، کسی خاص شخص کی طرف اشارہ کر کے فرمایا، تو تم اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کو چھوڑ بیٹھو گے، اور اگر تم نے اپنے نبی کی سنت کو چھوڑ دیا تو تم گمراہ ہو جاؤ گے (اور جو شخص وضو کرے اور اچھی طرح پاکی حاصل کرے) پھر کسی مسجد کا رخ کرے تو اللہ تعالیٰ اس کے ہر قدم پر نیکی اس کے نامہ اعمال میں درج فرماتے ہیں، اور اس کا ایک درجہ بڑھا دیتے ہیں، اور ایک گناہ معاف کر دیتے ہیں، اور ہم نے اپنے مجمع کو ایسا پایا ہے کہ منافقین بین الشقاق کے سوا کوئی آدمی جماعت سے الگ نماز نہ پڑھتا تھا، یہاں تک کہ بعض حضرات کو غدر اور بیماری میں بھی دوا آدمیوں کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر مسجد میں لایا جاتا اور صف میں کھڑا کر دیا جاتا تھا۔

اس بیان میں جس طرح باجماعت نماز کی پوری تاکید اور اہمیت و ضرورت کا ذکر ہے اسی کے ساتھ اس کا یہ درجہ بھی بیان فرمادیا کہ وہ سنن ہدی میں سے ہے جس کو فقہاء سنت مؤکدہ کہتے ہیں، چنانچہ اگر کوئی شخص غرض شرعی مثلاً مرض وغیرہ کے بغیر تنہا نماز پڑھ لے، اور جماعت میں شریک نہ ہو تو اس کی نماز تو ہو جائے گی، مگر سنت مؤکدہ کے ترک کی وجہ سے مستحق عتاب ہوگا، اور اگر ترک جماعت کی عادت بنائے تو سخت گنہگار ہے، خصوصاً اگر ایسی صورت ہو جائے کہ مسجد دیران رہے اور لوگ گھروں میں نماز پڑھیں تو یہ سب غماستخی سزا میں، اور قاضی عیاضؒ نے فرمایا کہ ایسے لوگ اگر سمجھانے سے باز نہ آئیں تو ان سے قتال کیا جائے (قرطبی ۲/۸ ج ۱)

بے عمل و اعظ کی مذمت | اَنَا مَرْكُوزُ الثَّامِنِ بِالْبَيْتِ وَتَسْتَوِي اَلْاُتْسَلُّمُ، اس آیت میں خطا۔
اگرچہ علمائے یہود سے ہے، ان کو ملامت کی جارہی ہے، کہ وہ اپنے دوستوں اور رشتہ داروں کو
یہ تلقین کرتے تھے کہ تم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی پیروی کرتے رہو، اور دین اسلام پر قائم
رہو جو علامت ہو اس بات کی کہ علمائے یہود دین اسلام کو یقینی طور پر حق سمجھتے تھے، مگر خود
نفسانی خواہشات سے اتنے مغلوب تھے کہ اسلام قبول کرنے کے لئے تیار نہ تھے، لیکن معنی
کے اعتبار سے یہ ہر اس شخص کی مذمت ہے جو دوسروں کو تو نیکی اور بھلائی کی ترغیب دے، مگر خود
عمل نہ کرے، دوسروں کو خدا سے ڈرائے، مگر خود نہ ڈرے، ایسے شخص کے بارے میں احادیث میں
بڑی ہراناگ و عیبیں آئی ہیں، حضرت انسؓ سے روایت ہو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا
کہ شب معراج میرا گذر کچھ لوگوں پر ہوا جن کے ہرٹ اور ذباہیں آگ کی قینچیوں سے کترے جا رہے تھے
میں نے جبرئیلؑ سے پوچھا یہ کون ہیں اجبرئیلؑ نے بتایا کہ یہ آپ کی امت کے دنیا دار و اعظ ہیں، جو لوگوں کو
تو نیکی کا حکم کرتے تھے، مگر اپنی خیر نہ لینے تھے (ابن کثیر)

ابن عساکر نے ذکر کیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ بعض جنتی بعض دوزخیوں کو آگ میں دیکھ کر پوچھیں گے کہ تم آگ میں کیوں نہ گر بیٹھ گئے ! حالانکہ ہم تو بخدا انہی نیک اعمال کی بدولت جنت میں داخل ہوئے ہیں جو ہم نے تم سے سچھے تھے، اہل دوزخ کہیں گے، "ہم زبان سے کہتے ضرور تھے، لیکن خود عمل نہیں کرتے تھے" (ابن کثیر)

سبباً فاسق و غلط و نصیحت نہیں کر سکتا! لیکن مذکورہ بیان سے یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ بے عمل یا فاسق کے لئے دوسروں کو غلط و نصیحت کرنا جائز نہیں، اور جو شخص کسی گناہ میں مبتلا ہو وہ دوسروں کو اس گناہ سے باز رہنے کی تلقین نہ کرے، کیونکہ کوئی اچھا عمل الگ ہٹکی ہے، اور اس اچھے عمل کی تبلیغ دوسری مستقل ہٹکی ہے، اور ظاہر ہو کہ ایک ہٹکی کو چھوڑنے سے یہ ضروری نہیں ہوتا کہ دوسری ہٹکی بھی چھوڑ دی جائے، جیسے ایک شخص اگر نماز نہیں پڑھتا تو اس کے لئے یہ لازم نہیں کہ وہ روزہ بھی ترک کر دے، بالکل اسی طرح اگر کوئی شخص نماز نہیں پڑھتا تو اس کے لئے یہ ضروری نہیں کہ دوسروں کو نماز پڑھنے کے لئے بھی نہ کہے، اسی طرح کسی ناجائز فعل کا ارتکاب الگ گناہ ہو، اور اپنے زیر اثر لوگوں کو اس ناجائز فعل سے نہ روکنا دوسرا گناہ ہے، اور ایک گناہ کرنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ دوسرا گناہ بھی ضرور کیا جائے۔ (روح المعانی) چنانچہ امام مالکؒ نے حضرت سعید بن جبیرؓ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ اگر ہر ایک شخص کو سونپ کر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر چھوڑ دے کہ میں خود گنہگار ہوں، جب گناہوں سے خود پاک ہو جاؤں گا تو لوگوں کو تبلیغ کر دوں گا، تو نتیجہ یہ نکلے گا کہ تبلیغ کرنے والا کوئی بھی باقی نہ رہے گا، کیونکہ ایسا کون ہے جو گناہوں سے پاک ہو؟ حضرت حسنؓ کا ارشاد ہو کہ شیطان تو یہی چاہتا ہے کہ لوگ اسی غلط خیال میں پڑ کر تبلیغ کا فریضہ

پھر بیٹھیں (قرطبی) بلکہ حضرت سیدہ حکیم الامتؓ تھا نویں تو فرمایا کرتے تھے کہ جب مجھے اپنی کسی بُری عادت کا علم ہوتا ہے تو میں اس عادت کی خدمت اپنے مواظف میں خاص طور سے بیان کرتا ہوں تاکہ عطا کی برکت سے یہ عادت جاتی رہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ آیت اَنَا مُرَوِّقُ النَّاسِ بِأَلْبِزِ وَتُفْسِدُونَ أَنْفُسَكُمْ کا مطلب یہ نہیں ہو کہ بے عمل آدمی کو دماغ کا عطا کینا جائز نہیں، بلکہ مطلب یہ ہے کہ دماغ کو بے عمل نہیں ہونا چاہئے، اور دونوں میں فرق واضح ہو، مگر یہاں یہ سوال ہوتا ہے کہ بے عمل ہونا تو دماغ کا کیلئے جائز ہو، وغیرہ دماغ کیلئے پھر دماغ کی تخصیص کیوں؟ جواب یہ ہے کہ ناجائز تو دونوں کے لئے ہے، مگر دماغ کا جرم غیر دماغ کے جرم کے مقابلے میں زیادہ سنگین اور زیادہ قابل ملامت ہے، کیونکہ دماغ جرم کو جرم سمجھتے ہوئے جان بوجھ کر کرتا ہے، اس کے پاس پشیمند نہیں ہوتا کہ مجھے اس کا جرم ہونا معلوم نہ تھا، برخلاف غیر دماغ کے اور ان پڑھ جاہل کے کہ اس کو خواہ علم حاصل نہ کرنے کا الگ گناہ ہو، لیکن ارتکاب گناہ میں اس کے پاس کسی درجہ میں غدر موجود ہوتا ہے، کہ مجھے معلوم نہ تھا، اس کے علاوہ عالم اور دماغ اگر کوئی جبرم کرتا ہے تو یہ دین کے ساتھ ایک قسم کا ہتھڑا ہے، چنانچہ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن جتنا ان پڑھ لوگوں کو معاف کرے گا اتنا علماء کو معاف نہیں کرے گا۔
دو لغویات یا بیماریاں | حُب مال اور حُب جاہ، یہ دونوں قلب کی ایسی بیماریاں ہیں جن کے باعث انسان اور ان کا علاج | کی دنیاوی زندگی اور خردی زندگی اور غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ انسانی تاریخ میں ایک حقیقی انسانیت سوز لڑائیاں لڑی گئیں اور جو فساد برپا ہوئے، ان میں سے اکثر و بیشتر کو انہی دو بیماریوں نے جنم دیا تھا۔

محبت مال کے نتائج یہ نکلتے ہیں :

۱۔ کج فہمی اور بخل پیدا ہوتا ہو جس کا ایک قومی نقصان قویہ ہوتا ہے کہ اس کی دولت قریب کو کرنی فائدہ نہیں پہنچاتی، دوسرا نقصان خود اس کی ذات کو پہنچتا ہے، اگر ماسٹر شہر میں کوئی ایسے شخص کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتا۔

۲۔ خود غرضی پیدا ہوتی ہے جو مال کی ہوس کو پورا کرنے کے لئے اسے ہشیار میں ملاوٹ، ناپ تول میں کمی، رشوت، سستان، صحر و فریب اور دغا بازی کے منت سے چیلے بٹھاتی ہے، وہ اپنی تنجور کو پہلے سے زیادہ بھرنے کے لئے دوسروں کا خون، شہوڑ لینا چاہتا ہے، بالآخر سرمایہ دار اور مزدور کے جھگڑے جنم لیتے ہیں۔

۲۔ ایسے شخص کو کتنا ہی مال مل جائے لیکن مزید کمانے کی کوشش ایسی سوار ہوتی ہے کہ تقریباً اور آرام کے وقت بھی بے چینی اُسے کھائے جاتی ہے کہ کسی طرح اپنے سرمایہ میں زیادہ سے زیادہ

اضافہ کر دیں، بالآخر جو مال اس کے آرام و راحت کا ذریعہ بننا وہ اس کے لئے وبال جان بن جاتا ہے۔
مہم حق بات خواہ کتنی ہی روشن ہو کر سامنے آجائے، مگر وہ ایسی کسی بات کو ماننے کی ہمت نہیں
کرتا جو اس کی ہوس مال سے متصادم ہو، یہ تمام چیزیں بالآخر پرے سے معاشرہ کا امن و چین پر باد
کڑھتی ہیں۔

غور کیا جائے تو قریب قریب یہی حال محبت کا نظر آئے گا، اگر اس کے نتیجہ میں تکبر و خود غرضی
حقائق کی پامالی ہو، اقتدار اور اس کے لئے خوں ریز لڑائیاں، اور اسی طرح کی بے شمار انسانیت سوز
خراپیاں جنم لیتی ہیں جو بالآخر دنیا کو دوزخ بنا کر چھوڑ دیتی ہیں، ان دونوں بیماریوں کا علاج قرآن کریم نے یہ
تجویز فرمایا: **فَاتَّقُوا اللَّهَ يَا الَّذِينَ آمَنُوا لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ** اور مدد و نصیر اور نمائندے، یعنی صبر
اختیار کرو، یعنی اپنی لذات و شہوات پر قابو حاصل کرو، اس سے سخت مال گھٹ جائے گی، کیونکہ مال
کی محبت اسی لئے پیدا ہوتی ہے کہ مال لذات و شہوات کو پورا کرنے کا ذریعہ ہے، جب ان لذات و خواہشات
کی انفرادی و معنوی پسروی چھوڑنے پر ہمت، ماندہ لوگے تو شروع میں اگرچہ شاق گذرے گا لیکن رفتہ رفتہ یہ خواہشات
اعتدال پر آجائیں گی، اور اعتدال تمہاری مارت بن جائے گا، تو پھر مال کی فراوانی کی ضرورت نہ رہے گی،
اس کی محبت ایسی غالب آئے گی کہ اپنے نفع نقصان سے اندھا کر دے۔

اور نماز سے حسب جاہ کم ہو جائے گی، کیونکہ نماز میں ظاہری اور باطنی ہر طرح کی عاجزی اور پستی
ہے، جب نماز کو صحیح صحیح ادا کرنے کی عادت ہو جائے گی تو ہر وقت اللہ کے سامنے اپنی عاجزی اور پستی
کا تصور رہنے لگے گا، جس سے تکبر و غرور و راجحہ جا گھٹ جائے گی۔

وَالَّذِينَ آمَنُوا وَتَطْمَئِنُّ قُلُوبُهُمْ بِذِكْرِ اللَّهِ أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ قرآن سنت میں چاہیے خشوع کی ترغیب، جو اس سحر آلودہ قلبی سکون و
انحصاری ہے جو اللہ کی عظمت اور اس کے سامنے اپنی حقارت کے علم سے پیدا ہوتی ہے، اس کے
نتیجہ میں طاعت آسان ہو جاتی ہے، کہیں اس کے آثار بدن پر بھی ظاہر ہونے لگتے ہیں کہ وہ باادب
متواضع اور شکستہ قلب نظر آتا ہے، اگر دل میں خوف خدا اور تواضع نہ ہو تو خواہ وہ ظاہر میں کتنا ہی
ابواب اور متواضع نظر آئے وہ خشوع کا حامل نہیں۔

بلکہ آثار خشوع کا قصد اظہار کرنا بھی پسندیدہ نہیں، حضرت عمرؓ نے ایک نوجوان کو دیکھا کہ ہر
بھکانے بیٹھا ہے، فرمایا: سر اٹھا، خشوع دل میں ہوتا ہے۔

حضرت ابراہیمؑ بھی نماز کا ارشاد ہے کہ مڑنا پھٹنے، مڑنا کھانے اور سر جھکانے کا نام خشوع
نہیں، خشوع تو یہ ہے کہ تم حق کے معاملہ میں شریعت و ذیل کے ساتھ یکساں سلوک کرو، اور اللہ نے
جو تم پر سنائی ہے اسے ادا کرنے میں اللہ کے لئے قلب کو فانی کر دو۔

حضرت حسنؓ کا ارشاد ہے کہ: حضرت عمرؓ جب بات کرتے تو سنا کر کرتے تھے، جب چلتے تو

تیز چلتے، اور جب مارتے تو دوسرے مارتے تھے، حالانکہ بلاشبہ وہ خشوع رکھنے والے تھے۔
خلاصہ یہ کہ اپنے قصد و نیت سے غاصبین کی سی صورت بنانا شیطان اور نفس کا دھوکہ ہے اور
مذہب ہے، ان اگر بے اختیار یہ کیفیت ظاہر ہو جائے تو محذور ہے۔ (قرطبی)

فائز: خشوع کے ساتھ ایک دوسرا لفظ خشوع بھی ہوتا ہے، قرآن کریم میں بھی
بار بار آیا ہے، یہ دونوں لفظ تفسیراً یکساں معنی ہیں، لیکن خشوع کا لفظ اصل کے اعتبار سے آواز اور لہجہ
کی پستی اور تذلل کے لئے بولا جاتا ہے، جب کہ وہ مصنوعی نہ ہو بلکہ قلبی خوف اور تواضع کا نتیجہ ہو،
قرآن کریم میں جو خشوع لکھا ہے (وَأَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ حَنِيفًا) اور نماز پست ہو گئیں، اور خشوع کا لفظ بدن کی تواضع اور
انکساری کے لئے ہوتا ہے، مفسرین یکجہ میں ہیں:

فَقُلْتُ أَفَعَبَدْتُم مَّا خَضِعُونَ ہیں ان کی گرد میں اس کے سامنے جھکتے ہیں۔
نماز میں خشوع کی نماز میں خشوع کی تاکید قرآن و سنت میں بار بار آئی ہے، قرآن مجید کا ارشاد ہے:
فَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ حَنِيفًا اور نماز قائم کر کے یاد کرنے کے لئے:
اور نماز پست یا ذکر کرنے کی ضد ہے، جو نماز میں اللہ جل شانہ سے غافل ہے وہ اللہ کو یاد کرنے کا
فریضہ ادا نہیں کر رہا۔

ایک اور آیت میں ارشاد ہے:

وَلَا تَكُن مِّنَ الْكَافِرِينَ اور تو غافلوں میں سے نہ ہو۔
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: نماز تو صرف تمسک اور تواضع ہی ہے، جس کا
ظاہری مطلب یہ ہے کہ جب تمسک اور تواضع دل میں نہ ہو تو وہ نماز نہیں۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ تمسک کی نماز اسے بے حیائی اور ہر ایموں سے بے روک رکھے وہ اللہ سے
دور ہی ہوتا ہے، اور غافل کی نماز بے حیائی سے اور ہر ایموں سے نہیں روکتی، معلوم ہوا کہ غفلت
کے ساتھ نماز پست ہے والا اللہ سے دور ہی ہوتا جاتا ہے۔

امام غزالیؒ نے مذکورہ آیات و روایات اور دوسرے دلائل پیش کر کے فرمایا کہ اگر ان کا یہ تقاضا
ہو کہ خشوع نماز کے لئے شرط ہو، اور نماز کی صحت اس پر موقوف ہو، پھر فرمایا کہ سفیان ثوری، حسن
بصری اور معاذ بن جبل رضی اللہ عنہم کا مذہب یہی تھا کہ خشوع کے بغیر نماز ادا نہیں ہوتی، بلکہ فاسد
لیکن ائمہ اربعہ اور دیگر فقہاء نے خشوع کو شرط صلوٰۃ قرار نہیں دیا، بلکہ اسے نماز کی توجہ قرار
دینے کے باوجود صرف اتنا شرط کیا ہے کہ بھیجہ تحریر کے وقت قلب کو حاضر کر کے اللہ کے لئے نماز کی

نیت کرے، باقی نماز میں اگر خشوع حاصل نہ ہو تو اگرچہ اتنی نماز کا ثواب اُسے نہیں ملے گا جتنے حصہ میں خشوع نہیں رہا، لیکن فقہ کی رو سے وہ تارک صلوٰۃ نہیں کہلائے گا، اور نہ اُس پر تعزیر وغیرہ کے وہ احکام مرتب ہوں گے جو تارک صلوٰۃ پر لگتے ہیں۔

امام غزالیؒ نے اس کی یہ وجہ بیان فرمائی ہے کہ فقہاء باطنی احوال اور قلبی کیفیات پر حکم نہیں لگاتے، بلکہ وہ تو صرف اعضائے ظاہرہ کے اعمال پر ظاہری احکام بیان کرتے ہیں، یہ بات کہ فلاں عمل کا ثواب آخرت میں ملے گا یا نہیں، یہ فقہ کی حد سے خارج ہے، تو چونکہ باطنی کیفیات پر حکم لگانا ان کی بحث سے خارج ہے، اور خشوع ایک باطنی کیفیت ہے، اس لئے انہوں نے خشوع کو پوری نماز میں شرط قرار نہیں دیا، بلکہ خشوع کے اولی مرتبہ کو شرط کیا، اور وہ یہ کہ کم از کم تکبیر تحریمہ کے وقت بعض اللہ کی عبادت و تعظیم کی نیت کر لے۔

خشوع کو پوری نماز میں شرط قرار نہ دینے کی دوسری وجہ یہ ہے کہ مستقرآن حکیم کی دوسری آیات میں تشریع احکام کا یہ واضح اصول بتا دیا گیا ہے کہ انسانوں پر کوئی ایسی چیز فرض نہیں کی جاتی جو انکی طاقت و امکان سے باہر ہو، اور پوری نماز میں خشوع برقرار رکھنے سے ماسوا چند خاص افراد کے اکثر لوگ عاجز ہو جاتے ہیں، اس لئے تکلیف بالایطاقان سے بچنے کے لئے پوری نماز کی بجائے صرف ابتدا و صلوٰۃ میں خشوع کو شرط قرار دیا گیا۔

نماز خشوع کے بغیر بھی امام غزالیؒ آخر میں ارشاد فرماتے ہیں کہ خشوع کی اس غیر معمولی اہمیت کے باوجود بالکل بے فائدہ نہیں ہیں اللہ سے یہی امید ہو کہ غفلت کے ساتھ نماز پڑھو اور لا بھی بالقلیہ تارک صلوٰۃ کے درجہ میں نہیں کیونکہ بہر حال اُس نے اسے فرض کا اقام تو کیا ہے، اور تھوڑی سی دیر کے لئے قلب کو اللہ کے لئے فانی بھی کیا کہ کم از کم نیت کے وقت تو صرف اللہ ہی کا دھیان تھا، ایسی نماز کا کم سے کم فائدہ یہ عذر ہے کہ اس کا نام تاسر مانوں اور بے نمازوں کی فہرست سے نکل گیا۔

مگر دوسری حیثیت سے پتہ چلتا ہے کہ کہیں غافل کی حالت تارک سے بھی زیادہ بُری نہ ہو، کیونکہ جو غلام آقا کی خدمت میں حاضر ہو کر آقا سے بے توجہی برتنا اور تحقیر آمیز لہجہ میں کلام کرتا ہے اس کی حالت اُس غلام سے زیادہ شدید ہے جو خدمت میں حاضر ہی نہیں ہوتا۔

خلاصہ کلام یہ کہ معاملہ ہم درجہ کا ہے، عذاب کا خوف بھی ہے اور بخشش کی امید بھی، اس لئے غفلت و تساہل کو چھوڑنے کے لئے اپنی مستور رہبر کو بخشش کرتے رہنا چاہئے، وَمَا تَوْفِيقِي إِلَّا بِاللّٰهِ۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اذْكُرُوْا النِّعَمَ الَّتِيْ اٰتٰىكُمْ وَفَضَّلَكُمْ
اے جنی اسرائیل! یاد کرو میرے احسان جو میں نے تم پر کئے اور اس کو کہ میں نے تم کو بڑائی دی

عَلَى الْعَالَمِيْنَ ۝ وَاتَّقُوا يَوْمًا لَا تَجْزِيْ فَنْسُكُمْ نَفْسٌ شَيْئًا وَلَا يُشْفِكُمْ مِنْهَا

تمام عالم پر، اور ڈرو اس دن سے کہ کھانا نہ آئے کوئی شخص کسی کے کچھ بھی اور قبول نہ ہو اس کی

شَفَاعَةُ ۝ وَلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَلَا هُمْ يُنصَرُونَ ۝

طرف سے سفارش اور نہ لیا جائے اس کی طرف سے بدلہ اور نہ اُن کو مدد پہنچے۔

خلاصہ تفسیر: اولاد یعقوب! (علیہ السلام) کی تم لوگ میری اس نعمت کو یاد کرو تاکہ شکر اور اطاعت کی تحریک ہو، جو میں نے تم کو انعام میں دی تھی، اور اس بات کو یاد کرو،

کہ میں نے تم کو (خاص خاص برائوں میں) تمام دنیا جہان والوں پر فوقیت دی تھی، اور ایک ترجمہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ میں نے تم کو ایک بڑے حصہ مخلوق پر فوقیت دی تھی، مثلاً اس زمانہ کے لوگوں پر۔

فاصلہ کا :- اس آیت میں خطاب چوتھے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کے یہودیوں کو ہے، اور عموماً ایسا ہوتا ہے، کہ باپ دادا پر جو احسان و اکرام کیا جائے اس سے اس کی اولاد بھی فائدہ حاصل کرتی ہے، جس کا عام طور پر مشاہدہ ہوتا رہتا ہے، اس لئے ان کو بھی اس آیت میں مخاطب سمجھا جا سکتا ہے۔

اور دوسرے ایسے دن سے کہ (جس میں) نہ تو کوئی شخص کسی شخص کی طرف سے کچھ مطالبہ ادا کر سکتا ہو، اور نہ کسی شخص کی طرف سے کوئی سفارش قبول ہو سکتی ہے، جبکہ خود اس شخص میں ایمان نہ ہو جس کی سفارش کرتا ہے، اور نہ کسی شخص کی طرف سے کوئی معاوضہ لیا جا سکتا ہے، اور نہ اُن لوگوں کی طرفدار کی جمل کے گی۔

فاصلہ :- آیت میں جس یوم کا ذکر ہوا اس سے قیامت کا دن مراد ہو، مطالبہ ادا کرنے کا مطلب یہ ہے کہ مثلاً کسی کے ذمہ نماز روزہ کا مطالبہ ہو، اور دوسرا کہہ دے کہ میرا نماز روزہ لے کر اس کا حساب بیاں کر دیا جائے، اور معاوضہ یہ کہ کچھ مال وغیرہ داخل کر کے بچا لائے، سو دونوں باتیں نہ ہوں گی، اور بد دن ایمان کے سفارش قبول نہ ہونے کو جو فرمایا ہے نوادر آیتوں سے معلوم ہوا کہ اس کی صورت یہ ہوگی کہ ایسوں کی خود سفارش ہی نہ ہوگی، جو قبول کی گنجائش ہو، اور طرفداری کی صورت یہ ہوگی کہ کوئی زوردار حمایت کر کے زیر دستی نکال لائے۔

غرض یہ کہ دنیا میں مدد کرنے کے جتنے طریقے ہوتے ہیں بد دن ایمان کے کوئی طریقہ بھی نہ ہوگا۔

وَ اِذْ نَجَّيْنٰكُمْ مِّنْ اِلٰی فِرْعَوْنَ يَسُوْهُمُوْكُمْ سُوْعَ الْعَذَابِ ۚ اِنَّكُمْ لَمِّنْ جُحُوْمٍ

اور یاد کرو اس وقت کو جبکہ رانی دی ہم نے تم کو فرعون کے لوگوں سے جو کہتے تھے تم کو برا عذاب دینے کرتے تھے

اَبْنَاءُكُمْ وَيَسْتَحْيُوْنَ نِسَاءَكُمْ وَفِيْ ذٰلِكُمْ بَلَاءٌ مِّنْ رَبِّكُمْ

تمہارے بیٹوں کو اور زندہ چھوڑتے تھے تمہاری عورتوں کو اور اس میں آزمائش تھی تمہارے رب کی

عَظِيمٌ ۵۱

طوت سے بڑی

خلاصہ تفسیر | اور چون خاص بڑا ردوں کا حوالہ دیا ہے اب یہاں سے اُن کی تفصیل بیان کرنی شروع کی، پہلا معاملہ تو یہ ہے کہ اور وہ زمانہ یاد کرو جب کہ رہائی دی ہم نے تم لوگوں کے آباء و اجداد کو متعلقین فرعون سے جو فکر میں لگے رہتے تھے تمہاری دل آزاری کے، اگلے کاٹتے تھے تمہاری اولاد (ڈکڑا گئے اور زندہ چھوڑ دیتے تھے تمہاری عورتوں کو (لڑکیوں کو کہ زندہ رہ کر بڑی عورتیں ہو جائیں) اور اس واقعہ میں تمہارے پروردگار کی طرف سے تمہارا ایک بڑا بھاری امتحان تھا۔

فائدہ :- کسی نے فرعون سے پیشین گوئی کر دی تھی کہ بنی اسرائیل میں ایک لڑکا ایسا پیدا ہوگا جس کے ہاتھوں تیری سلطنت جاتی رہے گی، اس لئے اس نے نوزائیدہ لڑکوں کو قتل کرنا شروع کر دیا، اور چونکہ لڑکیوں سے کوئی اندیشہ نہ تھا اس لئے اُن سے کچھ تعرض نہیں کیا، دوسرے اس میں اس کا اپنا ایک مطلب بھی تھا کہ اُن عورتوں سے مانا گری اور خدمت گاری کا کام لیتا تھا، سو یہ عنایت بھی اپنے مطلب کے لئے تھی۔

اور اس واقعہ سے یا تو یہ ذبح و قتل مذکور مراد ہے، اور مصیبت میں صبر کا امتحان ہوتا ہے اور یا رہائی دینا مراد ہے چونکہ ایک نعمت ہے، اور نعمت میں شکر کا امتحان ہوتا ہے، اور اس نجات دینے کی تفصیل آگے بیان سنرائی۔

وَإِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ فَأَنْجَيْنَاكُمْ وَأَغْرَقْنَا آلَ فِرْعَوْنَ وَأَنْتُمْ

اور جب بھاڑ دیا ہم نے تمہاری وجہ سے دریا کو پھرنے کا اور ہم نے تم کو اور ڈوب دیا فرعون کے لوگوں کو اور تم

تَنْظُرُونَ ۵۱ وَإِذْ وَعَدْنَا مُوسَىٰ أَرْبَعِينَ لَيْلَةً ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ

دیکھ رہے تھے اور جب ہم نے وعدہ کیا موسیٰ سے چالیس رات کا پھر تم نے بنایا

الْعِجْلَ مِنْ بَعْدِهَا وَأَنْتُمْ ظَالِمُونَ ۵۲

بجھڑا موسیٰ کے بعد اور تم ظالم تھے

خلاصہ تفسیر | اور وہ زمانہ یاد کرو جب کہ شق کر دیا ہم نے تمہارے (رستہ دینے کی) وجہ سے دریا سے شور کو پھر ہم نے (ڈوبنے سے) بچا لیا تم کو اور فرق کر دیا متعاقبین فرعون

کو (میں فرعون کے) اور تم (اس کا) معائنہ کر رہے تھے۔

فائدہ :- یہ نعمت اس وقت ہو کہ موسیٰ علیہ السلام پیدا ہو کر پیغمبر ہو گئے، اور مدتوں فرعون کو بھاتے رہے، جب وہ کسی طرح نہ مانا تو حکم ہوا کہ بنی اسرائیل کو خفیہ طور پر لے کر یہاں چلے جاؤ، راستہ میں دریا حائل ہوا اور اسی وقت پیچھے سے فرعون بھی مع لشکر آپہنچا حق تعالیٰ کے حکم سے دریا شق ہو گیا اور بنی اسرائیل کو گزرنے کا راستہ مل گیا، یہ تو بار ہو گئے، فرعون کے پیچھے تک دریا اسی طرح رہا، وہ بھی تعاقب کی غرض سے اس میں گھس گیا، اس وقت سب طرف سے دریا سمٹ کر اپنی سابق حالت پر ہو گیا، اور فرعون اور اس کے ساتھی سب یہاں ہی غرق ہو کر ختم ہو گئے۔

اور وہ زمانہ یاد کرو، جبکہ وعدہ کیا تھا ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) سے رتوریت دینے کا ایک مدت گزرنے پر جس میں دس رات کا اضافہ ہو کر چالیس رات کا زمانہ ہو گیا تھا، پھر تم لوگوں نے دہشت کے لئے تجویز کر لیا گو سالہ کو موسیٰ (علیہ السلام) کے (جانے کے) بعد اور تم نے اس تجویز میں صریح ظلم پر کمر باندھ رکھی تھی کہ ایسی بے جا بات کے قائل ہو گئے تھے۔

فائدہ :- یہ نعمت اس وقت ہو جب فرعون کے غرق ہونے کے بعد بنی اسرائیل بقول بعض مصر میں واپس آکر پہنچے گئے، یا بقول بعض کسی اور مقام پر پھر گئے تو موسیٰ علیہ السلام سے بنی اسرائیل نے عرض کیا کہ اب ہم بالکل مطمئن ہو گئے، اگر کوئی شریعت ہمارے لئے مقرر ہو تو اس کو اپنا دستور العمل بنائیں، موسیٰ علیہ السلام کی عرض پر حق تعالیٰ نے وعدہ فرمایا کہ تم کو وہ طور پر آکر ایک مہینہ ہماری عبادت میں مشغول رہو، ایک کتاب تم کو دیں گے، آپ نے ایسا ہی کیا، اور تورات آپ کو مل گئی، مگر دس روز مزید عبادت میں مشغول رہنے کا حکم اس لئے دیا گیا کہ موسیٰ علیہ السلام نے ایک ماہ روزہ رکھنے کے بعد انظار فرمایا تھا، اللہ تعالیٰ کو روزہ دار کے منہ کا راتھ راتھ جو غلوئے معدہ کی تجویز سے پیدا ہو جاتا ہے، پسند ہوا اس لئے موسیٰ علیہ السلام کو حکم ہوا کہ دس روزے اور رکھیں تاکہ وہ راتھ پھر پیدا ہو جائے، اس طرح یہ چالیس روزے پورے ہو گئے، موسیٰ علیہ السلام تو یہاں رہے، اور وہاں ایک شخص سامری نامی تھا اس نے چاندی یا سونے کا ایک بچھڑے کا قالب بنا کر اس کے اندر وہ مثل جو اس نے جبرئیل علیہ السلام کے گھوڑے کے قدم کے نیچے سے اٹھا کر اپنے پاس محفوظ رکھی ہوئی تھی ڈال دی، اُس بچھڑے میں جان چڑھ گئی، اور جبلا بنی اسرائیل نے اس کی پرستش شروع کر دی۔

ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْكُمْ مِّنْ بَعْدِ ذَلِكَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ۵۲

پھر معاف کیا ہم نے تم کو اس پر بھی تاکہ تم احسان مانو۔

خلاصہ تفسیر | پھر بھی ہم نے (تمہاری توبہ کرنے پر) درگزر کیا، تم سے اتنی بڑی بات ہوتی

پچھے اس توقع پر کہ تم احسان مانو گے۔

فائدہ ۱۰۔ اس توبہ کا بیان کنگے کی تیسری آیت میں مذکور ہے، اللہ تعالیٰ کے اس توقع رکھنے کا مطلب نمونہ اللہ یہ نہیں کہ خدا تعالیٰ کو شک تھا، بلکہ طلب ہو کہ یہ درگزر کرنا ایسی چیز ہے کہ دیکھنے والوں کو شکر گزاری کی توقع کا گمان ہو سکتا ہے۔

وَإِذْ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ وَالْفُرْقَانَ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ ﴿۵۶﴾

اور جب وہی ہم نے موسیٰ کو کتاب اور حق کو ناقص سے جدا کرنا دیا تاکہ تم سیدھی راہ پاؤ

خلاصہ تفسیر اور دو زمانہ یاد کرو جب ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو کتاب (توریت) دی اور فیصلہ کی چسیسز اس توقع پر کہ تم راہ چلتے رہو۔

فائدہ ۱۱۔ فیصلہ کی چیز یا تو ان احکام شریعیہ کو کہا جو توریت میں لکھے ہیں (کیونکہ) شرع سے تمام اعتقادی اور عملی اختلافات کا فیصلہ ہو جاتا ہے، یا معجزوں کو کہا کہ ان سے بچے، جھوٹے دعویٰ کا فیصلہ ہوتا ہے، یا خود توریت ہی کو کہہ دیا کہ اس میں کتاب ہونے کی صفت بھی ہے اور فیصلہ ہونے کی صفت بھی۔

وَإِذْ قَالَ مُوسَى لِقَوْمِهِ يُقَوْمِ إِنكُمْ ظَلَمْتُمْ أَنفُسَكُمْ

اور جب کہا موسیٰ نے اپنی قوم سے اے قوم تم نے نقصان کیا اپنا

بَاتِعَاذِكُمُ الْعَجَلُ فَتَوْبُوا إِلَىٰ بَارِعِكُمْ فَأَقْتُلُوا أَنفُسَكُمْ

بہشت بنا کر سو اب توبہ کر اپنے پیدا کرنے والے کی طرف اور مار ڈالو اپنی اپنی جان

ذِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ عِنْدَ بَارِعِكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ إِنَّهُ هُوَ

یہ بہتر ہے تمہارے لئے تمہارے خالق کے نزدیک پھر متوجہ ہوا تم پر بیشک وہی ہے

التَّوَّابُ الرَّحِيمُ ﴿۵۷﴾

معاف کرنے والا نہایت مہربان۔

خلاصہ تفسیر اور دو زمانہ یاد کرو جب موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے فرمایا کہ اے میری قوم بے شک تم نے اپنے آپ کو نقصان کیا اس کو سالہ پرستی کی جوڑے سے سو تم اپ

اپنے خالق کی طرف متوجہ ہو پھر بعض آدمی (جنہوں نے گوسالہ پرستی نہیں کی) بعض آدمیوں کو (جنہوں نے

گوسالہ پرستی کی) قتل کرو یا یہ (علمہ رآد) تمہارے لئے بہتر ہوگا، تمہارے خالق کے نزدیک، پھر اس علمہ رآد کرنے سے حق تعالیٰ تمہارے حال پر (اپنی عنایت سے) متوجہ ہوئے، بے شک وہ تو ایسے ہی ہیں کہ توبہ قبول کر لیتے ہیں اور عنایت فرماتے ہیں۔

فائدہ ۱۲۔ یہ اس طریق کا بیان ہے جو ان کی توبہ کے لئے تجویز ہوا، یعنی مجرم لوگ قتل کئے جائیں جیسا ہماری شریعت میں بھی بعض گناہوں کی سزا باوجود توبہ کے بھی قتل و جان ستانی مقرر ہے، مثلاً قتل عمد کے عوض قتل اور ثبوت زنا با شہادۃ پر رجم، کہ توبہ سے یہ سزا ساقط نہیں ہوتی، چنانچہ ان لوگوں نے اس پر عمل کیا، جس کی وجہ سے آخرت میں مورد رحمت و عنایت ہو گئے۔

وَإِذْ قُلْتُمْ يَمُوسَىٰ لَنْ نُؤْمِنَ بِكَ حَتَّىٰ نَرَىٰ اللَّهَ بَهْرَةً فَأَخَذْنَا لَكُمْ

اور جب تم نے کہا اے موسیٰ ہم ہرگز یقین مذکر ہی تجھے تیرا جب تک کہ نہ دیکھ لیں اللہ کو سامنے پھر آیا

الصُّبْحَةَ وَأَنْتُمْ تَنْظُرُونَ ﴿۵۸﴾

تم کو بجلی نے اور تم دیکھ رہے تھے

خلاصہ تفسیر اور دو زمانہ یاد کرو جب تم لوگوں نے دیوں کہا کہ اے موسیٰ ہم تمہارے کہنے سے ہرگز نہ مانیں گے (کہ یہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے) یہاں تک کہ ہم (خود) اللہ تعالیٰ کو علانیہ

طور پر دیکھ لیں، سو (اس گستاخی پر) تم پر کوکب بجلی کی آپڑی، اور تم اس بجلی کا آنا، آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔

فائدہ ۱۳۔ اس کا قصہ اس طرح ہوا تھا کہ جب موسیٰ علیہ السلام نے کوہ طور سے توریت لا کر

پیش کی، کہ یہ اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے، تو بعض گستاخ لوگوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ خود ہم سے کہہ دے کہ یہ

ہماری کتاب ہے، توبہ شک ہم کو یقین آجائے گا، موسیٰ علیہ السلام نے باذن الہی فرمایا کہ کوہ طور پر چلو

یہ بات بھی ہو جائے گی، بنی اسرائیل نے اس کام کے لئے مشر آدمی منتخب کر کے موسیٰ علیہ السلام کے

ساتھ کوہ طور پر روانہ کئے، وہاں پہنچے پر اللہ تعالیٰ کا کلام ان لوگوں نے خود سنا، تو اس وقت اور رنگ

لانے کہ ہم کو تو کلام سننے سے قناعت نہیں ہوتی، خدا جانے کون بول رہا ہوگا، اگر خدا کو دیکھ لیں تو

بے شک مان لیں، چونکہ دنیا میں کوئی شخص اللہ تعالیٰ کو دیکھنے کی قوت نہیں رکھتا، اس لئے اس

گستاخی پر ان پر بجلی آپڑی، اور سب ہلاک ہو گئے، ربلاکت کے متعلق اگلی آیت میں بیان ہے،

ثُمَّ بَعَثْنَاكُمْ مِنْ بَعْدِ مَوْتِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ﴿۵۹﴾

پھر اٹھا کر آ کیا ہم نے تم کو مر گئے پچھے تاکہ تم احسان مانو۔

خلاصہ تفسیر

پھر ہم نے (موسیٰ علیہ السلام کی دعا سے) تم کو زندہ کراٹھایا تمہارے مرجانے کے بعد اس توقع پر کہ تم احسان مانو گے۔

فائل کا :- موت کے لفظ سے ظاہر معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ اس پہل سے مر گئے تھے، اُن کے دوبارہ زندہ کئے جانے کا قصہ یہ ہوا کہ موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے عرض کیا کہ بنی اسرائیل میں ہی برگران رہتے ہیں، اب وہ یہ سمجھیں گے کہ میں نے اُن کو کہیں لیا کر کس تدبیر کے ان کا کام تمام کرا دیا ہوگا، پھر اس جنت سے محفوظ رکھے، اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے اُن کو پھر زندہ کر دیا۔

وَلَقَدْ نَاغَلَيْكُمْ الْغَمَامَ وَانْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّاءَ وَالسَّلْوَىٰ

اور سایہ کیا ہم نے تم پر ابرکا اور آٹما تم پر من اور سلوی

كُلُوا مِنْ طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ وَمَا ظَلَمُونَا وَلَكِنْ كَانُوا أَنْفُسَهُمْ

کھاؤ پاکیزہ چیزیں جو ہم نے تم کو دی اور انہوں نے ہمارا کچھ نقصان نہ کیا بلکہ اپنا ہی

يُظْلِمُونَ ﴿۵۰﴾

نقصان کرتے رہے

خلاصہ تفسیر

اور سایہ لگن کیا ہم نے تم پر ابر کو (میدان قیہ میں) اور (خزائے غیب سے) پہنچایا ہم نے تمہارے پاس ترنجبین اور بلیریں اور تم کو اجازت دی کہ کھاؤ نفیس چیزوں سے جو کہ ہم نے تم کو دی ہیں، اور معروہ لوگ اس میں بھی خلاف بات کر بیٹھے اور (اس سے) انہوں نے ہمارا کوئی نقصان نہیں کیا، لیکن اپنا ہی نقصان کرتے تھے۔

فائل کا :- دونوں قصے دادی قیہ میں واقع ہوئے، دادی قیہ کی حقیقت یہ ہے کہ بنی اسرائیل کا اہل وطن ملک شام ہے، حضرت یوسف علیہ السلام کے وقت میں مصر آئے تھے، اور یہاں ہی رہ پڑے، اور ملک شام میں عاتق نامی قوم کا تسلط ہو گیا، فرعون جب غرق ہو گیا اور یہ لوگ مطمئن ہو گئے، تو اللہ تعالیٰ کا ان کو حکم ہوا کہ عاتق سے چا کر اور اپنی اہل جگہ کو اُن کے قبضہ سے چھڑالو، بنی اسرائیل اس ارادہ پر مقرر ہوئے، اور اُن کی حدود میں پہنچ کر جب عاتق کے زور و قوت کا حال معلوم ہوا تو جنت دار بیٹھے اور چار سے صاف انکار کر دیا، اللہ تعالیٰ نے اُن کو اس انکار کی یہ سزا دی کہ چالیس برس تک ایک میدان میں سرگرداں و پریشان پھرتے رہے، گھر پہنچنا بھی نصیب نہ ہوا۔ یہ میدان کچھ بہت بڑا رقبہ نہ تھا، بلکہ مقرر اور شام کے درمیان پانچ چھ کوس یعنی تقریباً دس میل

کا رقبہ تھا، روایت یہ ہے کہ یہ لوگ اپنے وطن مصر جانے کے لئے دن بھر سفر کرتے، اور رات کو کسی منزل پر اترنے صحیح کو دیکھتے کہ جہاں سے چلے آئے وہیں ہیں، اسی طرح چالیس سال سرگرداں و پریشان اس میدان میں پھرتے رہے، اسی لئے اس میدان کو دادی قیہ کہا جاتا ہے، قیہ کے معنی میں سرگرداں اور پریشان کہتے ہیں، دادی قیہ ایک کھلا میدان تھا، نہ اس میں کوئی عمارت تھی نہ درخت، جس کے نیچے دھوپ اور سردی اور گرمی سے بچا جاسکے، اور نہ یہاں کوئی کھانے پینے کا سامان تھا، نہ پہننے کے لئے لباس، مگر اللہ تعالیٰ نے معجزہ کے طور پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا سے اسی میدان میں اُن کی تمام ضروریات کا انتظام فرما دیا، بنی اسرائیل نے دھوپ کی شکایت کی تو اللہ تعالیٰ نے ایک سفید رقیق ابر کا سایہ کر دیا، اور صبح کا تقاضا ہوا تو من و سلوی نازل فرما دیا، یعنی درختوں پر ترنجبین جو ایک شیریں چیز پر بکثرت پیدا کر دی، یہ لوگ اس کو جمع کر لیتے، اس کو من کہا گیا ہے، اور بلیریں اُن کے پاس جمع ہو جاتیں، اُن سے بھائی نہ تھیں، یہ اُن کو کپڑے لیتے، اور ذبح کر کے کھاتے، اسی کو سلوی کہا گیا ہے، یہ لوگ دونوں لطیف چیزوں سے پیٹ بھر لیتے، چونکہ ترنجبین کی کثرت معمول سے زائد تھی، اور بلیریں کا وحشت نہ کرنا یہ بھی معمول کے خلاف ہو، لہذا اس خلیت سے دونوں چیزیں خزانہ غیب کے مترادف تھیں، اُن کو پانی کی ضرورت پیش آئی تو موسیٰ علیہ السلام کو ایک پتھر پر لاشی مارنے کا حکم دیا گیا اس پتھر سے چٹے پھوٹ پڑے، جیسا کہ دوسری آیات قرآنی میں مذکور ہے، ان لوگوں نے رات کی اندھیری کا شکوہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے غیب سے ایک روشنی عمودی شکل میں ان کے محلہ کے درمیان قائم فرما دی، کپڑے میلے ہوئے اور پھٹنے لگے اور لباس کی ضرورت ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے بطور اعجاز یہ صورت کر دی کہ اُن کے کپڑے نہ میلے ہوں نہ پھٹیں اور بچوں کے بدن پر جو کپڑے ہیں وہ ان کے بدن کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ اس مقدار سے بڑھتے رہیں۔ (تفسیر مستطبی)

اور اُن لوگوں کو یہ بھی حکم ہوا تھا کہ بقدر خرچ لے لیا کریں، آئندہ کے لئے جمع کر کے نہ رکھیں مگر ان لوگوں نے حرص کے مائے اس میں بھی خلاف کیا، تو رکھا ہوا گوشت مٹنا شروع ہو گیا، اسی کی فرمایا ہے کہ اپنا ہی نقصان کرتے تھے۔

وَإِذْ قُلْنَا ادْخُلُوا هَذِهِ الْقَرْيَةَ فَاكُلُوا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ

اور جب ہم نے کہا داخل ہو اس شہر میں اور کھاؤ پھر اس میں جہاں چاہو

رَغَدًا وَاَدْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَقُولُوا حِطَّةٌ نَغْفِرْ لَكُمْ خَطِيئَتَكُمْ

خراغت سے اور داخل ہو دروازے میں سجدہ کرتے ہوئے اور کہتے جاؤ بخدا تو بخدا کر دے تمہارے گناہوں

وَسَنَزِيدُ الْمُحْسِنِينَ ﴿۵۸﴾

اور زیادہ بھی دیں گے نیک والوں کو

خلاصہ تفسیر | اور وہ زمانہ یاد کرو جب ہم نے حکم کیا کہ تم لوگ اس آبادی کے اندر داخل ہو پھر کھاؤ اس کی چیزوں میں سے جس جگہ تم رغبت کر دے بھگنی سے، اور یہ بھی حکم دیا کہ جب اندر جانے لگو تو دروازہ میں داخل ہونا رعا جزئی سے (جھکے جھکے اور زبان سے یہ کہتے جانا کہ توبہ ہے) توبہ ہے ہم معاف کر دیں گے تمہاری (پچھلی) خطائیں تو سب کی، اور مزید برآں اور دیں گے دل سے نیک کام کرنے والوں کو۔

فائدہ | بقول شاہ عبدالقادر صاحب رحمۃ اللہ علیہ یہ فقرہ بھی زمانہ وادی تیبہ کا ہے، کہ جب من و سلویٰ کھاتے کھاتے اُکٹا گئے اور اپنے معمولی کھانے کی درخواست کی جیسا آگے کی چوتھی آیت میں آ رہا ہے، تو ان کو ایک شہر میں جانے کا حکم ہوا تھا، کہ وہاں کھانے پینے کی اور معمولی چیزیں ملیں گی، سو یہ حکم اس شہر کے اندر جانے کے متعلق ہے، اس میں قولی اور فعلی ادب داخل ہونے کے متعلق بیان کیا گیا، اور اندر جا کر کھانے پینے میں توسیع کی گئی، اس قول پر بہت سے بہت یہ کہا جاسکے گا کہ قصہ کے بیان میں تقدم و تاخير ہو گیا، کہ بعد کا قصہ پہلے بیان ہوا اور پہلے کا بعد میں، تو یہ اشکال اُس وقت ہوتا جب قرآن مجید میں خود قصوں کا بیان کرنا مقصود اصلی ہوتا، اور جب نظر نتائج پر ہے تو اگر ایک فقرہ کے اجزاء میں ہر جزو کا نتیجہ جدا ہوا، اور اُن نتائج کے کسی اثر کا لحاظ کر کے جزو مقدم کو مؤخر اور جزو مؤخر کو مقدم کر دیا جائے تو اس میں نہ کوئی مضائقہ ہے، اور نہ کوئی اشکال۔ دیگر مفسرین حضرات نے اس حکم کو اس شہر کے متعلق سمجھا ہے جس پر جہاد کرنے کا حکم ہوا تھا، اور بعد مدت تیبہ کے پھر اس پر جہاد ہوا، اور وہ فتح ہوا، اس وقت یروشع علیہ السلام نبی تھے، یہ حکم ان کی معرفت اس شہر کے بارے میں ہوا تھا۔

قول ازل کی بناء پر پچھلی خطاؤں میں وہ درخواست بھی داخل کر لینا مناسب جو من و سلویٰ چھوڑ کر معمولی کھانوں کے متعلق کی گئی تھی، مطلب یہ ہو گا کہ یہ درخواست تھی گوستاخی، لیکن خیر! اب اگر اس ادب اور حکم کو بجالائے تو اس کو محافط کر دیں گے، اور ہر قول پر یہ معافی تو سب کہنے والوں کے لئے عام ہوگی، اور جو اخلاص سے اعمال صالحہ کریں گے اُن کا انعام اس کے علاوہ ہے۔

قَبَلُ الَّذِينَ ظَلَمُوا أَقْوَلًا غَيْرَ الَّذِي قِيلَ لَهُمْ فَانزِلْنَا عَلَىٰ

پھر بدل ڈالا ظالموں نے بات کو خلاص اس کے کہ جو کہہ دی گئی تھی ان سے پھر اُتارا، ہم نے

الَّذِينَ ظَلَمُوا رِجْزًا مِنَ السَّمَاءِ بِمَا كَانُوا يَفْسُقُونَ ﴿۵۹﴾

ظالموں پر عذاب آسمان سے اُن کی عدول حکمی پر۔

خلاصہ تفسیر | سو بدل ڈالا اُن ظالموں نے ایک اور طرح خلاص تھا اس کلمہ کے جس (کے کہنے) کی اُن سے فرمائش کی گئی تھی، اس پر ہم نے نازل کی ان ظالموں پر ایک سادی آفت اس وجہ سے کہ وہ عدول حکمی کرتے تھے۔

فائدہ | یہ آیت آیت سابقہ کا تتمہ ہے، وہ کلمہ خلاص یہ تھا کہ جُطَّةٌ بمعنی توبہ کی حسبِ گواراہ تمسخر جُطَّةٌ فی شُجُوْرَةٍ یعنی غلہ درمیان جوئے، کہنا شروع کیا، وہ آفت سادی طاعون تھا، جو حدیث کی رو سے بے حکموں کے لئے عذاب اور حکمرانوں کے لئے رحمت ہے، اس شرارت کی اُن کو یہ سزا ملی کہ ان میں طاعون پھوٹ پڑا اور بہت سے آدمی فنا ہو گئے، بعضوں نے ہلاک شدگان کی تعداد ستر ہزار تک بتائی ہے۔ (قرطبی)

معارف و مسائل

کلام میں لفظی تغیر و تبدل | اس آیت سے معلوم ہوا کہ بنی اسرائیل کو یہ حکم دیا گیا تھا کہ اس شہر میں جُطَّةٌ کا حکم شریعی | یعنی توبہ تو بہ کہتے ہوئے داخل ہوں، انھوں نے شرارت سے ان الفاظ کو بدل کر جُطَّةٌ کہنا اختیار کیا، اس کی وجہ سے اُن پر آسمانی عذاب نازل ہوا، یہ الفاظ کی تبدیلی ایسی تھی کہ جس میں صرف الفاظ ہی نہیں بدلے، بلکہ معنی بھی بالکل الٹ گئے، جُطَّةٌ کے معنی توبہ یعنی ملنا ہوں کو نظر انداز کرنے کے تھے، اور جُطَّةٌ کے معنی گندم کے ہیں، جس کا کلمہ مامور بہا ہے کوئی تعلق نہیں الفاظ کی ایسی تبدیلی خواہ مسترآن میں ہو یا حدیث میں، یا اور کسی امر الہی میں بلاشبہ اور بالاتفاق حرام ہے، کیونکہ یہ ایک قسم کا استہزاء یا تحریف ہے، اسی پر یہ عذاب نازل ہوا۔

اب رہا یہ مسئلہ کہ معنی اور مقصود کو محفوظ رکھتے ہوئے صرف الفاظ کی تبدیلی کا کیا حکم ہے؟ امام قسطلانی نے اپنی تفسیر میں اس کے متعلق فرمایا ہے کہ بعض کلمات اور اقوال میں معنی کی تصریح الفاظ بھی مقصود اور ادب عبارت کے لئے ضروری ہوتے ہیں، ایسے اقوال میں لفظی تبدیلی بھی جائز نہیں، جیسے اذان کے الفاظ مقررہ کے بجائے اسی معنی کے دوسرے الفاظ پڑھنا جائز نہیں، اسی طرح نماز میں جو دعائیں مثلاً سبحانک ایلہم، الفحات، دعائے قنوت، یا تسبیحات رکوع و سجود جن الفاظ سے منقول ہیں انہیں الفاظ میں اور اگرنا ضروری ہے، دوسرے الفاظ میں اگر جہ من وہی محفوظ بھی رہیں مگر تبدیلی جائز نہیں، اسی طرح تمام مسترآن کریم کے الفاظ کا یہی حکم ہے، کہ تلاوت قرآن سے جو احکام

متعلق ہیں وہ صرف اپنی الفاظ کے ساتھ ہیں، جو قرآن کریم کے نازل ہوتے ہیں، اگر کوئی ان الفاظ کا ترجمہ دوسرے لفظوں میں کر کے پڑھے جس میں معنی بالکل محفوظ رہیں اس کو اصطلاح شریعت میں تلاوت قرآن نہ کہا جائے گا، اور نہ اس پر وہ ثواب حاصل ہوگا جو قرآن پڑھنے پر مقرر ہے کہ ایک حرف پر دس نیکیاں بھی جاتی ہیں، کیونکہ قرآن صرف معنی کا نام نہیں بلکہ معنی اور الفاظ نازل شدہ کے مجموعہ کو قرآن کہا جاتا ہے۔

آیت مذکورہ میں کَسَبْتَنِي الْإِسْلَامَ لَمْ يَكُنْ أَحَدًا وَلَا غَيْرَ الَّذِي قَبِلْتُ لَهُمْ کے الفاظ سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ ان کو توبہ کے لئے جو الفاظ حقیقہ کے بتلائے گئے تھے یہ الفاظ بھی ماحول تھے، ان کا بدلنا خود بھی گناہ تھا، پھر تبدیلی ایسی کر دی کہ معنی ہی اُلٹ گئے، اس لئے عذاب آسمانی کے مستحق ہو گئے۔

لیکن جن اقوال اور کلمات میں اصل مقصود معنی ہی ہیں، الفاظ مقصور نہیں ان میں اگر لفظی تبدیلی ایسی کی جائے کہ معنی پر کوئی اثر نہ پڑے وہ پوری طرح محفوظ رہیں تو جوہر محدثین اور فقہاء کے نزدیک یہ تبدیلی جائز ہے، بعض حضرات محدثین حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں ایسی لفظی تبدیلی کو بھی جائز نہیں کہتے، مستشرقین نے امام مالک، شافعی، امام اعظم ابو حنیفہ سے نقل کیا ہے کہ حدیث میں روایت بالمعنی بھی جائز ہے، مگر مشرطیہ ہے کہ روایت کرنے والا عربی زبان کا ماہر اور مواقع خطاب اور جس ماحول میں حدیث وارد ہوئی ہے اس سے پوری طرح واقف ہو، تاکہ اس کی غلطی سے معنی میں فرق نہ آجائے۔

اور ائمہ حدیث کی ایک جماعت جس طرح الفاظ حدیث سے ہیں اسی طرح نقل کرنا ضروری سمجھتے ہیں، کوئی لفظی تغیر و تبدل جائز نہیں رکھتے، محمد بن سیرین، قاسم بن محمد وغیرہ حضرات کا بھی یہی مسلک ہے، یہاں تک کہ ان میں سے بعض حضرات کا قائل یہ ہے کہ اگر راوی حدیث نے کوئی لفظ نقل کرنے میں کوئی لغوی غلطی بھی کی ہے تو اس سے سننے والے کو اس غلطی کے ساتھ روایت کرنا چاہئے اپنی طرف سے تغیر نہ کرے، اس کے ساتھ یہ ظاہر کرنے کے میرے خیال میں صحیح لفظ اس طرح ہے، مگر مجھے روایت اس طرح پہنچی ہے، ان حضرات کا استدلال اس حدیث سے ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو یہ تلقین فرمائی تھی کہ جب سونے کے لئے بستر پر جائے تو یہ دعا پڑھے، اَللّٰهُمَّ بَيِّنْ لِّيْ اَمْرًا نَّبِيًّا اَنْزَلْتَ وَبَيِّنْ لِّيْ اَمْرًا نَّبِيًّا اَنْزَلْتَ، اس شخص نے تَبَيَّنْتَ کی جگہ وَتَبَيَّنْتَ پڑھ دیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر یہی ہدایت فرمائی کہ لفظ تَبَيَّنْتَ پڑھا کرے جس سے معلوم ہوا کہ لفظی تبدیلی بھی جائز نہیں۔

اسی طرح ایک حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

نَهَى اللّٰهُ اَمْرًا سَمِعَ مَعًا لَيْتِي | فَيَلْعَنُهَا كَمَا سَمِعَتْهَا
فَيَنْهَى اللّٰهُ عَنْهَا كَمَا سَمِعَتْهَا | فَيَلْعَنُهَا كَمَا سَمِعَتْهَا
جس شخص کو اس شخص کو سرسبز و شاداب کے
جس شخص کو اس شخص کو سرسبز و شاداب کے
جس شخص کو اس شخص کو سرسبز و شاداب کے

اس سے بھی ظاہر ہے کہ جن الفاظ سے سننا تھا اپنی لفظوں سے پہنچانا مراد ہے۔

مگر جوہر محدثین اور فقہاء کے نزدیک اگرچہ اولیٰ اور افضل تو یہی ہے کہ جہاں تک ہو سکے حدیث کی روایت میں ٹھیک وہی الفاظ نقل کرے جو سنئے ہیں، اپنے قصد سے ان میں تبدیلی نہ کرے، لیکن اگر وہ الفاظ پوری طرح یاد نہیں ہے تو ان کا مفہوم اپنے الفاظ میں نقل کر دینا بھی جائز ہے، اور حدیث بلخیا کما سمعہا کا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ جو مضمون سننا ہو وہی بعینہ نقل کر دے، اس کے مفہوم میں کوئی مسرت نہ آئے، الفاظ کی تبدیلی اس کے منافی نہیں، امام قرطبی نے اس کی تائید میں سرمایا کہ خود ہی حدیث اس کی دلیل ہے کہ الفاظ کی تبدیلی بضرورت جائز ہے، کیونکہ خود اس حدیث کی روایت ہی ہم تک مختلف الفاظ سے پہنچی ہے۔

اور پہلی حدیث میں جو لفظ رسول اللہ کے بجائے نبیؐ ہی پڑھے کا امر فرمایا، اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ لفظ نبیؐ میں صفت مدح بہ نسبت رسولؐ کے زیادہ ہے، کیونکہ رسولؐ کا لفظ توقُّف کے معنی میں دوسروں کے لئے بھی بولا جاتا ہے، بخلاف لفظ نبیؐ کے کہ وہ خاص اسی منصب کیلئے استعمال ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اپنے مخصوص بندوں کو بذریعہ وحی خطاب کرنے کا عطا کیا جاتا ہے۔

اور دوسری وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے، کہ دعاؤں میں الفاظ منقولہ کا اتباع خواص و آثار کے اعتبار سے ایک خاص اہمیت رکھتا ہے، دوسرے الفاظ میں وہ خاصیت نہیں رہتی (قرطبی، اسی کو حامل حضرات جو تعویذ گنڈے کرتے ہیں وہ اس کی بڑی رعایت کرتے ہیں کہ جو الفاظ منقول ہیں ان میں تغیر و تبدل نہ کیا جائے، اس لحاظ سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ ارجحہ ماثورہ بھی اسی قسم ازل میں داخل ہیں، جن میں معنی کے ساتھ الفاظ مخصوصہ کی حفاظت بھی مقصود ہے، واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم۔

وَإِذْ اسْتَسْقَىٰ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ فَقُلْنَا اضْرِبْ بِعَصَاكَ الْحَجَرَ

اور جب ہانی مانگا موسیٰ نے اپنی قوم کے واسطے تو ہم نے کہا مار اپنے عصا کو پتھر پر

فَإِنْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ نَضِيبًا قَدْ عَلِمَ كُلُّ أُنَاسٍ مِّنْهُمْ

سو پتھر نکلے اس سے بارہ چٹے، پہچان لیا ہر قوم نے اپنا گھاٹ۔

كُلُوا وَاشْرَبُوا مِنْ رِزْقِ اللَّهِ وَلَا تَعْتُوا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِينَ ۝۶۰

کھاؤ اور پیو اللہ کی روزی اور نہ پھر د ملک میں فساد مچانے۔

خلاصہ تفسیر اور وہ زمانہ یاد کرو جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پانی کی دعا مانگی، اپنی قوم کے واسطے، اس پر ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا کہ اپنے اس عصا کو فلان پتھر پر مارو اس سے پانی نکل آوے گا، پس (عصا پتھر پر مارنے کی دیر نہیں) فوراً اس سے بارہ چٹے پھوٹ نکلے، (اور بنی اسرائیل کے بھی بارہ ہی خاندان تھے، چنانچہ ہر گھرانے اپنے پانی پینے کا موقع معلوم کر لیا اور ہم نے یہ نصیحت کی کہ کھانے کو، کھاؤ اور (پینے کو) پیو، اللہ تعالیٰ کے رزق سے اور حد (اعتدال) سے مت نکلو، فساد (دفعہ) کرتے ہوئے سر زمین میں۔

فائل کا :- یہ قصہ بھی وادی تیبہ میں ہوا، وہاں پیاس لگی تو پانی مانگا، موسیٰ علیہ السلام نے دعا کی تو ایک خاص پتھر کو صرف عصا مارنے سے قدرت خداوندی سے بارہ چٹے نکل پڑے، اور ان کے بارہ خاندان اس طرح تھے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کے بارہ فرزند تھے، ہر ایک کی اولاد کا ایک ایک خاندان تھا، ان کو انتظامی معاملات میں الگ الگ ہی رکھا جاتا تھا، سب کے انسر بھی جدا جدا تھے، اس لئے چٹے بھی بارہ ہی نکلے۔

کھانے سے مراد من و سلوکی اور پینے سے مراد یہی پانی تھا، اور ان اسرائیلی اور ترکب احکام کو تنہا و فساد سے تعبیر فرمایا۔

قاصد بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ایسے خوارق (اور معجزات) کا انکار بہت بڑی غلطی ہو، جب بعض پتھروں میں اللہ تعالیٰ نے بیداد قیاس اور خلاف عقل یہ تاثیر رکھی ہے کہ لوہے کو جذب کرتا ہے تو اس پتھر میں اگر یہ تاثیر پیدا کر دی ہو کہ احسن اہل زمین سے پانی کو جذب کر لے اور اس سے پانی نکلنے لگے تو کیا محال ہے۔

ہمارے زمانے کے عقلاء کو اس بیان سے سبق حاصل کرنا اور فائدہ اٹھانا چاہئے، اور پھر یہ نظریہ بعض سلفی فکر والوں کے لئے ہے، وہ نہ خود اگر اس پتھر کے اجزاء ہی میں پانی پیدا ہو جائے تو ہمیں کونسا محال لازم آتا ہے، جو حضرات ایسے امور کو محال کہتے ہیں تو اللہ وہ اب تک محال کی حقیقت ہی کو نہیں سمجھے۔

معارف مسائل

آیت مذکورہ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کے لئے ہتسقاہ کی دعا انسرمانی،

اللہ تعالیٰ نے پانی کا سامان کر دیا، کہ پتھر پر لٹھی مارنے سے چٹے ابل پڑے، اس سے معلوم ہوا کہ ہتسقاہ کی اصل دعا ہی ہے، شریعت موسویہ میں بھی صرف دعا پر انتقاہ کیا گیا، جیسا کہ امام اعظم ابو حنیفہ کا ارشاد یہ کہ ہتسقاہ کی اصل پانی کے لئے دعا کرنا ہے، یہ دعا کبھی خاص نماز ہتسقاہ کی صورت میں کی گئی ہے، جیسا کہ حدیث صحیح میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نماز ہتسقاہ کے لئے عید گاہ کے میدان میں تشریف لے جانا اور نماز اور خطبہ اور دعا کرنا منقول ہے، اور کبھی ایسا ہی ہوا کہ بغیر کسی خاص نماز کے صرف دعا پر انتقاہ کیا گیا، جیسا کہ صحیحین میں حضرت انس کی روایت منقول ہے کہ خطبہ جمعہ ہی میں آپ نے دعا فرمائی، اللہ تعالیٰ نے بارش نازل فرمادی۔

اور یہ بات سب کے نزدیک مسلم ہے کہ ہتسقاہ خواہ بصورت نماز کیا جائے، یا صرف دعا کی صورت میں اس کے مؤثر ہونے کے لئے گناہوں سے توبہ اپنے فقر و مسکنت اور عبودیت کا اظہار ضروری ہے، گناہوں پر اصرار اور اللہ تعالیٰ کی انسرمانیوں پر قائم رہتے ہوئے تاثیر دعا کے انتظار کا کس کو حق نہیں اللہ تعالیٰ اپنے کرم سے یوں بھی قبول انسرمانیوں، ان کے قبضہ قدرت میں سب کچھ ہے۔

وَإِذْ قُلْتُمْ يَمُوسَىٰ لَنْ نَّصْبِرَ عَلَىٰ طَعَامٍ وَاحِدٍ فَادْعُ لَنَا رَبَّكَ

اور جب کہا تم نے اے موسیٰ ہم ہرگز صبر نہ کریں گے ایک ہی طرح کے کھانے پر سو دعا مانگ بہار و اسطر

يُخْرِجْ لَنَا مِمَّا تُنْبِتُ الْأَرْضُ مِنْ بَقْلِهَا وَقِثَّائِهَا وَفُومِهَا

اچھے درجہ کے کھانے کہ نکال دے ہمارے واسطے جو اُگتا ہے زمین سے ترکاری اور گلڑی اور گیہوں

وَعَدَّيْنِهَا وَبَصِلَتٍ لَكُنَّ الَّذِي هُوَ آذِنِي بِالَّذِي

اور مسور اور پیاز، کہا موسیٰ نے کیا لینا چاہتے ہو وہ چیز جو ادنیٰ ہے اس کے بدلہ میں جو

هُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ مِنْهُمَا وَاصْرَافًا فَانْ كُمْ مِمَّا سَأَلْتُمْ وَصُرْبَتْ عَلَيْهِمُ

بہتر ہے، اترہ کسی شہر میں تو تم کو ملے جو مانگتے ہو اور ڈالی گئی اُن پر ذلت

الذِّلَّةُ وَالْمَسْكِنَةُ وَبَاءَ وَبَغَضٍ مِنَ اللَّهِ لَوْلَا ذَلِكَ بَانَتْ لَهُمْ

اور محتاجی اور بھری اللہ کا غضب لے کر یہ اس لئے ہوا کہ

كَانُوا يَكْفُرُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ وَيَقْتُلُونَ النَّبِيِّنَ بِغَيْرِ الْحَقِّ ط

جہیں مانتے تھے احکام خداوندی کو اور خون کرتے تھے پیغمبروں کا ناحق،

كُلُوا وَاشْرَبُوا مِنْ رِزْقِ اللَّهِ وَلَا تَعْتُوا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِينَ ۖ

کھاؤ اور پیو اللہ کی روزی اور نہ پھر د ملک میں فساد مچانے۔

خلاصہ تفسیر اور وہ زمانہ یاد کرو جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پانی کی دعا مانگی، اپنی قوم کے واسطے، اس پر ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا کہ اپنے

اس عصا کو فلان پتھر پر مارو اس سے پانی نکل آوے گا، پس (عصا پتھر پر مارنے کی دیر نہیں) فوراً اس سے بارہ چٹے پھوٹ نکلے، (اور بنی اسرائیل کے بھی بارہ ہی خاندان تھے، چنانچہ ہر گھرانے نے اپنے پانی پینے کا موقع معلوم کر لیا اور ہم نے یہ نصیحت کی کہ کھانے کو، کھاؤ اور (پینے کو) پیو، اللہ تعالیٰ کے رزق سے اور حد (اعتدال) سے مت نکلو، فساد (دفعہ) کرتے ہوئے سر زمین میں۔

فائل کا :- یہ قصہ بھی وادی تیبہ میں ہوا، وہاں پیاس لگی تو پانی مانگا، موسیٰ علیہ السلام نے دعا کی تو ایک خاص پتھر کو صرف عصا مارنے سے قدرت خداوندی سے بارہ چٹے نکل پڑے، اور ان کے بارہ خاندان اس طرح تھے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کے بارہ فرزند تھے، ہر ایک کی اولاد کا ایک ایک خاندان تھا، ان کو انتظامی معاملات میں الگ الگ ہی رکھا جاتا تھا، سب کے انسر بھی جدا جدا تھے، اس لئے چٹے بھی بارہ ہی نکلے۔

کھانے سے مراد من و سلوکی اور پینے سے مراد یہی پانی تھا، اور انسرائیلی اور ترکب احکام کو تنہا و فساد سے تعبیر فرمایا۔

قاصد بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ایسے خوارق (اور معجزات) کا انکار بہت بڑی غلطی ہو، جب بعض پتھروں میں اللہ تعالیٰ نے بعد از قیاس اور خلاف عقل یہ تاثیر رکھی ہے کہ گوبے کو جذب کرتا ہے تو اس پتھر میں اگر یہ تاثیر پیدا کر دی ہو کہ احسن ازہرین سے پانی کو جذب کر لے اور اس سے پانی نکلنے لگے تو کیا محال ہے۔

ہمارے زمانے کے عقلاء کو اس بیان سے سبق حاصل کرنا اور فائدہ اٹھانا چاہئے، اور پھر یہ نظریہ بعض سلفی فکر والوں کے لئے ہے، وہ نہ خود اگر اس پتھر کے اجزاء ہی میں پانی پیدا ہو جائے تو ہمیں کونسا محال لازم آتا ہے، جو حضرات ایسے امور کو محال کہتے ہیں تو اللہ وہ اب تک محال کی حقیقت ہی کو نہیں سمجھے۔

معارف مسائل

آیت مذکورہ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کے لئے ہتھیار کی دعا انسرائیلی،

اللہ تعالیٰ نے پانی کا سامان کر دیا، کہ پتھر پر لٹھی مارنے سے چٹے ابل پڑے، اس سے معلوم ہوا کہ ہتھیار کی اصل دعا ہی ہے، شریعت موسویہ میں بھی صرف دعا پر انتفاء کیا گیا، جیسا کہ امام اعظم ابو حنیفہ کا ارشاد یہ کہ ہتھیار کی اصل پانی کے لئے دعا کرنا ہے، یہ دعا کبھی خاص نماز استسقاء کی صورت میں کی گئی ہے، جیسا کہ حدیث صحیح میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نماز استسقاء کے لئے عید گاہ کے میدان میں تشریف لے جانا اور نماز اور خطبہ اور دعا کرنا منقول ہے، اور کبھی ایسا ہی ہوا کہ بغیر کسی خاص نماز کے صرف دعا پر انتفاء کیا گیا، جیسا کہ صحیحین میں حضرت انس کی روایت منقول ہے کہ خطبہ جمعہ ہی میں آپ نے دعا فرمائی، اللہ تعالیٰ نے بارش نازل فرمادی۔

اور یہ بات سب کے نزدیک مسلم ہے کہ استسقاء خواہ بصورت نماز کیا جائے، یا صرف دعا کی صورت میں اس کے مؤثر ہونے کے لئے گناہوں سے توبہ اپنے فقر و مسکنت اور عیوبیت کا اظہار ضروری ہے، گناہوں پر اصرار اور اللہ تعالیٰ کی انسرائیلیوں پر قائم رہتے ہوئے تاثیر دعا کے انتظار کا کس کو حق نہیں اللہ تعالیٰ اپنے کرم سے یوں بھی قبول انسرائیلیں، ان کے قبضہ قدرت میں سب کچھ ہے۔

وَإِذْ قُلْتُمْ يَمُوسَىٰ لَنْ نَّصْبِرَ عَلَىٰ طَعَامٍ وَاحِدٍ فَادْعُ لَنَا رَبَّكَ

اور جب کہا تم نے اے موسیٰ ہم ہرگز صبر نہ کریں گے ایک ہی طرح کے کھانے پر سو دعا مانگ بہار و اسطر

يُخْرِجْ لَنَا مِمَّا تُنْبِتُ الْأَرْضُ مِنْ بَقْلِهَا وَقِثَآئِهَا وَفُومِهَا

اچھے درجہ کے کھانے کہ نکال دے ہمارے واسطے جو اُگتا ہے زمین سے ترکاری اور گلڑی اور گیہوں

وَعَدَآئِهَا وَبَصِلَتِهَا قَالَ أَتَسْتَبْدِلُونَ الَّذِي هُوَ أَدْنَىٰ بِالَّذِي هُوَ

اور مسور اور پیاز، کہا موسیٰ نے کیا لینا چاہتے ہو وہ چیز جو ادنیٰ ہے اس کے بدلہ میں جو

هُوَ خَيْرٌ أَهَيُّطُوا مَصْرًا فَإِنَّ لَكُمْ مِمَّا سَأَلْتُمْ طَوَّافًا وَصُرِبَتْ عَلَيْهِمُ

بہتر ہے، آؤ کسی شہر میں تو تم کو ملے جو مانگتے ہو اور ڈال دی گئی اُن پر ذلت

الدِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ وَبَاءَ وَبَغَضَ مِنْ اللَّهِ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ

اور محتاجی اور بھری اللہ کا غضب لے کر یہ اس لئے ہوا کہ

كَانُوا يَكْفُرُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ وَيَقْتُلُونَ النَّبِيِّنَ بِغَيْرِ الْحَقِّ ط

ہیں مانتے تھے احکام خداوندی کو اور خون کرتے تھے پیغمبروں کا ناحق،

ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَاكَانُوا يَعْتَدُونَ ﴿۱۱﴾

یہ اس لئے کہ انہیں مان تھے، اور حد پر نہ دہتے تھے۔

خلاصہ تفسیر

اور (وہ زمانہ یاد کرو) جب تم لوگوں نے (یوں) کہا کہ اسے موسیٰ (روز کے روز) ہم ایک ہی قسم کے کھانے پر کبھی نہ رہیں گے، (یعنی من و سلویٰ پر) آپ ہمارے واسطے اپنے پروردگار سے دعا کریں کہ وہ ہمارے لئے ایسا چیزیں پیدا کریں جو زمین میں اگلا کرتی ہیں، ساگ (جوا) گلوئی (ہوئی) (گیہوں) (جوا) (مسور) (ہوئی) (پیاز) (ہوئی) آپ نے فرمایا کیا تم عوض میں لینا چاہتے ہو، (دنی) درجہ کی چیزوں کو ایسی چیز کے مقابلہ میں جو اعلیٰ درجہ کی ہے، (اچھا) اگر نہیں مانتے تو کسی شہر میں (جا کر) (اترو) (وہاں) البتہ تم کو وہ چیزیں ملیں گی جن کی تم درخواست کرتے ہو اور ایسی ایسی گستاخیوں سے ایک زمانہ میں جا کر نقش کی طرح، (جم غنی) ان پر ذلت رکھ دو دوسروں کی (جگہ) میں قدر نہ رہی، اور پستی رکھ خود ان کی طبائع میں اولوہی سبزی نہ رہی، اور سخت ہو گئے غضب (آہی) کے (اور) یہ (ذلت و غضب) اس وجہ سے (ہوا) کہ وہ لوگ ملے ہوئے تھے احکام (آہی) کے اور قتل کر دیا کرتے تھے پیغمبروں کو (کہ وہ قتل خود ان کے نزدیک بھی) (ناحق) (ہوتا تھا) اور (زیر) یہ (ذلت و غضب) اس وجہ سے (ہوا) کہ ان لوگوں نے اطاعت نہ کی، اور دائرۃ اطاعت سے بھل بھل جاتے تھے۔

فائدہ:۔ یہ قصہ بھی دادی تیرہ مکا ہے، من و سلویٰ سے انکار ان زکاریوں اور غلوں کی درخواست کی، اس میدان کے داخل حدود میں کوئی شہر آباد تھا، وہاں جا کر رہنے کا حکم ہوا کہ بڑا جوتو کھاؤ کھاؤ۔

اور منجملہ ذلت و مسکنت کے یہ بھی ہے کہ یہودیوں سے سلطنت قرب قیامت تک کیلئے چھین لی گئی، البتہ بالکل قیامت کے قریب محض لیڈروں کا سا بے ضابطہ تھوڑا زور و شور و جہال یہودی کا کل چالیس دن کے لئے ہو جائے گا، اور اس کو کوئی عاقل سلطنت نہیں کہہ سکتا، اور ان کو یہ بات موسیٰ علیہ السلام کی معرفت جلد دی گئی تھی، کہ اگر بے حکمی کر دے تو ہمیشہ دوسری قوموں کے محکوم رہو گے، جیسا کہ سورۃ اعراف کی آیت: **وَاِذْ كُنَّا ذُنُرًا لِّبَنِي اِسْرٰٓءٰٓءَ عَلٰیٰہِمُ اِلٰی یَوْمِ الْقٰیٰمَةِ مَنْ یَّسْتَوْفِیْہُمْ سُوْءُ الْعٰدٰی (۱۱۰) (۱۱۱) میں مذکور ہے، (موجودہ اسرائیل حکومت کی حیثیت بھی امریکہ اور برطانیہ کے غلام سے زیادہ کچھ نہیں)۔**

اور یہت سے پیغمبر مختلف اوقات میں یہودیوں کے ہاتھ سے قتل ہوئے، جس کو وہ لوگ بھی دل میں سمجھتے تھے کہ ہمارا یہ فعل ناحق ہے، لیکن غلو اور ضد نے اندھا بنا رکھا تھا۔

معارف و مسائل

یہودیوں پر اہل ذلت کا مطلب اور اسرائیل آیات مذکورہ میں یہود کی سزا و نیا میں دائمی ذلت و مسکنت کی موجودہ حکومت سے مشبہ اور اس کا جواب اور دنیا و آخرت میں غضب الہی کو بیان کیا گیا ہے۔

ان کی دائمی ذلت و مسکنت کا مفہوم جو ائمہ تفسیر صحابہ و تابعین سے منقول ہے، اس کا خلاصہ ابن کثیر کے الفاظ میں یہ ہے کہ لَا یَزَالُ الذُّنُورُ مَسْتَدِلِّیْنَ مِنْ وَجْہِہُمْ مَسْتَدِلِّیْنَ لَہُمْ وَضَرْبٌ عَلَیْہِہُمُ الصَّغَارُ یعنی وہ کہتے ہی مالدار بھی ہو جائیں ہمیشہ تمام اقوام میں ذلیل و حقیر ہی رہے جائیں گے، جن کے ہاتھ لگیں گے ان کو ذلیل کرے گا، اور ان کی غلامی کی علامتیں لگائے گا۔

امام تفسیر ضحاک ابن مزاحم نے حضرت عبداللہ بن عباس سے ان کی ذلت و مسکنت کا یہ مفہوم نقل کیا ہے کہ ہم اہل القبا لائے یعنی الجزیۃ، مطلب یہ ہے کہ یہودی ہمیشہ دوسروں کی غلامی میں رہیں گے، ان کو ٹیکس وغیرہ ادا کرتے رہیں، خود ان کو کوئی قوت و اقتدار حاصل نہ ہوگا۔

اس مضمون کی ایک آیت سورۃ آل عمران میں ایک زیادتی کے ساتھ اس طرح آئی ہے:

حُیِّیْہُمْ عَلَیْہِمْ الذِّلَّةُ اِیْمًا
تُعْطُوْا اِلَّا بِتَحَبُّلٍ مِّنَ اللّٰہِ وَتَحَبُّلٍ
وَقَدْ نَسَّیْہُمْ - (۱۱۲: ۱۱۳)

تجاویز گئی ان پر بے قدری جہاں کہیں جائیگے
مگر ان ایک تو ایسے ذریعہ سے جو اللہ کی طرف
سے ہوا اور ایک ایسے ذریعہ سے جو آدمیوں کی طرف

سے ہو

اللہ تعالیٰ کے ذریعہ کا مطلب تو یہ ہے کہ جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے ہی اپنے قانون میں امن دیدیا ہو، جیسے نالغ بچے، عورتیں یا ایسے عبادت گذار جو مسلمانوں سے لڑتے نہیں پھرتے، وہ محفوظ و مامون رہیں گے، اور آدمیوں کے ذریعہ سے مراد معاہدہ صلح ہے، جس کی ایک صورت تو یہ ہے کہ مسلمانوں سے معاہدہ صلح کا یا حبزیہ دے کر ان کے ملک میں رہنے کا ہو جائے، مگر الفاظ قرآنی میں **وَقَدْ نَسَّیْہُمْ** فرمایا ہے **وَقَدْ نَسَّیْہُمْ** نہیں، اس لئے یہ صورت بھی محتمل ہے کہ دوسرے غیر مسلموں سے معاہدہ صلح کا کر کے ان کی پشت پناہی میں آجائیں تو مامون رہ سکتے ہیں، پھر یہ ہشتاد و چل من اللہ اور جبل من الناس کا اگر بقول کثافت ہشتاد متصل قرار دیا جائے تو معنی یہ ہوں گے کہ یہودی ہمیشہ ہر جگہ ذلیل و خوار رہیں گے، بجز ان دو صورتوں کے کہ یا تو اللہ کے عہد کے ذریعہ ان کے بچے خوریں وغیرہ اس ذلت و خواری سے بھل جائیں یا معاہدہ صلح کے ذریعہ اپنے آپ کو ذلت و خواری سے بچالیں اور جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے معاہدہ صلح کے ذریعہ ذلت و خواری سے نکلنے کی صورت مسلمانوں سے معاہدہ صلح کر کے بھی ہو سکتی ہے، اور یہ بھی احتمال ہے کہ دوسری قوموں سے معاہدہ صلح کا کر کے ان کے

ہمارے ذلت و خواری سے محفوظ رہیں۔

یہ سب تقریریں استثنائے متصل کی تقدیر پر ہے، اور بہت سے حضرات مفسرین نے اس کو استثناء منقطع قرار دیا ہے، تو مطلب یہ ہو گا کہ یہ لوگ اپنی ذلت اور اپنی قومی حیثیت سے تو ذلیل و خواری رہیں، مگر قانونِ آبی کی دست میں آکر ان کے بعض افراد اس سے محفوظ ہو جائیں گے، یا دوسرے لوگوں کا سہارا لے کر ذلت و خواری پر پردہ ڈال دیں۔

اس طرح سورہ بقرہ کی آیت کی وضاحت سورہ آل عمران کی آیت سے پوری ہو گئی، اور اس سے وہ تمام شبہات بھی دور ہو گئے جو آج کل فلسطین میں یہودیوں کی حکومت قائم ہونے کی بناء پر بہت مسلمانوں کو پیش آتے ہیں کہ تران کے قلعی ارشادات سے تو یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہودیوں کی حکومت بھی قائم نہ ہوگی، اور واقعہ یہ پایا جاتا ہے کہ فلسطین میں ان کی حکومت قائم ہو گئی، جواب واضح ہے کہ فلسطین میں یہودیوں کی موجودہ حکومت کی حقیقت سے جو لوگ باخبر ہیں وہ خوب جانتے ہیں کہ یہ حکومت درحقیقت اسرائیل کی نہیں ہے بلکہ امریکہ اور برطانیہ کی ایک چھائی سے زیادہ اس کی حیثیت نہیں، یہ اپنی ذاتی طاقت سے ایک مہینہ بھی زندہ نہیں رہ سکتے، یوروپین طاقتوں نے اسلامی ہلاک کر دیا کرتے تھے، لے آئے ان کے بیچ میں اسرائیل کا نام دے کر ایک چھاؤنی بنائی ہوئی ہے، اور اسرائیلی ان کی نظروں میں ہیں، ان کے شرماں بردار غلام سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتے، صرف قرآن کریم کے ارشاد بخوبی قی الثانی کے ہمارے ان کا اپنا وجود قائم ہے، وہ بھی ذلت کے ساتھ، اس لئے موجودہ اسرائیلی حکومت سے قرآن کریم کے کسی ارشاد پر ادنیٰ شبہ بھی نہیں ہو سکتا۔

اس کے علاوہ یہاں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ یہود، نصاریٰ اور مسلمانوں میں سب سے پہلے یہود میں ان کی شریعت، ان کی تہذیب سب سے پہلی ہو، اگر پوری دنیا میں فلسطین کے ایک چھوٹے سے قصبہ پر ان کا تسلط کیس طرح ہو بھی گیا، تو پوری دنیا کے نقشہ میں یہ حصہ ایک نقطہ سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا ہے، اس کے بالمقابل نصاریٰ کی سلطنتیں اور مسلمانوں کے دور منزل کے بادجوان کی سلطنتیں بت پرستوں کی سلطنتیں، لاندہوں کی حکومتیں جو جگہ جگہ مشرق سے مغرب تک پھیل ہوئی ہیں ان کے مقابلہ میں فلسطین اور وہ بھی آدھا، اور اس پر بھی امریکہ، برطانیہ کے زیر سایہ کوئی تسلط یہودیوں کا ہو جائے تو کیا اس سے پوری قوم یہود پر خدا تعالیٰ کی طرف سے لگائی ہوئی دائمی ذلت کا کوئی جواب بن سکتا ہے!

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَادُوا وَالنَّصَارَى وَالصَّبِیِّیْنَ

بے شک جو لوگ مسلمان ہوئے اور جو لوگ یہودی ہوئے اور نصاریٰ اور صابین

مَنْ آمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ

جو ایمان لایا (ان میں سے) اللہ پر اور روزِ قیامت پر اور کام کئے نیک تو ان کے لئے جو ان کا ثواب

عِنْدَ رَبِّهِمْ ۖ وَلَا تَخَوْفُ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿۶۲﴾

ان کے رب کے پاس، اور نہیں ان پر کچھ خوف اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

خلاصہ تفسیر

اس مقام پر یہودیوں کی شرارت کا حال معلوم کر کے سامعین کو یا خود یہود کو یہ خیال گذر سکتا ہے کہ ان حالات میں اگر غدر پیش کر کے ایمان لانا بھی چاہیں تو غالباً اللہ کے نزدیک قبول نہ ہو، اس خیال کو دفع کرنے کے لئے اس آیت میں ایک قانون اور ضابطہ لکھ کر دیا کہ یہ حقیقی بات ہے کہ مسلمان، یہودی اور نصاریٰ اور فرقہ صابین ان سب میں جو شخص یقین رکھتا ہو اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات پر اور قیامت پر اور کارگزاری اچھی کرے (موافق قانونِ شریعت) ایسوں کے لئے ان کا حقِ خدمت بھی ہے ان کے پروردگار کے پاس (پہنچ کر) اور (وہاں جا کر) کسی طرح کا اندیشہ بھی نہیں ان پر، اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

فائدہ: قانون کا حاصل ظاہر ہے کہ ہمارے دربار میں کسی کی تخصیص نہیں جو شخص پوری اطاعت اعتقاد اور اعمال میں خستیار کرے گا خواہ وہ پہلے سے کیسا ہی ہو ہمارے ہاں مقبول اور اس کی خدمت مشکور ہے، اور ظاہر ہے کہ نزولِ قرآن کے بعد پوری اگلاطاعت محمدی یعنی مسلمان ہونے میں منحصر ہو، مطلب یہ ہوا کہ جو مسلمان ہو جائے گا حقِ نجات اخروی ہوگا، اس میں اس خیال کا جواب ہو گیا، یعنی ان شرارتوں کے بعد بھی اگر مسلمان ہو جائیں تو ہم سب معاف کر دیں گے۔

اور صابین ایک فرقہ تھا جس کے معتقدات اور طرزِ عمل کے بارے میں چونکہ کسی کو پورا پورا پتہ نہ چلا اس لئے مختلف اقوال ہیں، واللہ اعلم۔

اور اس قانون میں بظاہر تو مسلمانوں کے ذکر کی ضرورت نہیں تھی، کیونکہ وہ تو مسلمان ہیں ہی لیکن اس سے کلامِ پاک میں ایک خاص بلاغت اور مضمون میں ایک خاص وقعت پیدا ہو گئی، اسکی ایسی مثال ہے کہ کوئی حاکم یا بادشاہ کسی ایسے ہی موقع پر یوں کہے کہ ہمارا قانون عام ہے کوئی موافق ہو یا مخالف، جو شخص بھی اطاعت کرے گا امورِ رعایت ہوگا، اب ظاہر ہے کہ موافق تو اطاعت کر ہی رہا ہے سنا، تو اصل میں مخالفت کو ہے، لیکن اس میں نہ تو یہ ہوتا ہے کہ ہم کو جو موافقین پر رعایت ہو سو اس کی علت ان سے کوئی ذاتی خصوصیت نہیں، بلکہ ان کی صفتِ موافقت پر مدار ہے ہمداری رعایت کا، سو اگر مخالفت بھی خستیار کرے تو وہ بھی اس موافق کے برابر ہو جائے گا، اس لئے مخالفت کے ساتھ موافق کو بھی ذکر کر دیا گیا۔

وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّورَ طُحُّدَا

اور جب لیا ہم نے تم سے اقرار اور بلند کیا تمہارے اوپر کوہ طور کو کہ بکڑو جو

مَا أَتَيْنَاكُمْ بِقُوَّةٍ ۖ وَآذِكُرُّوْا مَا فِيهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۶۳﴾

کتاب ہم نے تم کو دی زور سے اور یاد رکھو جو کچھ اس میں ہے تاکہ تم ڈرو۔

خلاصہ تفسیر اور (وہ زمانہ یاد کرو) جب ہم نے تم سے قول دستار لیا کہ قرآن پر عمل کریں گے اور اس قول دستار لینے کے لئے ہم نے طور پہاڑ کو اٹھا کر تمہارے اوپر

(عمازت میں) معلق کر دیا، اور اس وقت کہا کہ (جلدی) قبول کرو جو کتاب ہم نے تم کو دی ہے (یعنی قرآن) مضبوطی کے ساتھ، اور یاد رکھو جو احکام اس (کتاب) میں ہیں جس سے توقع ہے کہ تم متقی بن جاؤ۔

فائدہ۔۔ جب موسیٰ علیہ السلام کو طور پر تورات عطا ہوئی اور آپ نے واپس تشریف لا کر قوم کو دکھائی اور سنائی تو اس میں احکام ذرا سخت تھے، مگر ان لوگوں کی حالت کے مطابق ایسے ہی احکام مناسب تھے، تو ازل تو انہوں نے یہی کہا تھا کہ جب ہم سے اللہ تعالیٰ خود کہہ دیں گے کہ یہ میری کتاب ہے تو میں مانیں گے، (جس کا قصہ اوپر گزر چکا ہے) غرض وہ شتر آری جو موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ کوہ طور پر گئے تھے واپس آ کر انہوں نے گواہی دی، مگر اس شہادت میں (اپنی طرف سے) اتنی آمیزش بھی کر دی کہ اللہ تعالیٰ نے آخر میں یہ شہادہ دیا تھا کہ تم سے جس قدر عمل ہو سکے کرنا ہوتا ہو سکا ہے، تو کچھ تو جہلی شرارت کچھ احکام کی مشقت اور کچھ اس آمیزش کا جیلہ ملا، غرض صاف معاف دیا کہ ہم سے تو اس کتاب پر عمل نہیں ہو سکتا، حق تعالیٰ نے فرشتوں کو حکم دیا کہ کوہ طور کا ایک بڑا ٹکڑا اٹھا کر ان کے سروں پر معلق کر دو، کہ یا تو مانو ورنہ ابھی گرا، آخر چار ناچار ماننا پڑا۔

ایک شبہ کا ازالہ یہاں یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ دین میں تو اکراہ نہیں ہے، یہاں کیوں اکراہ کیا گیا؟ جواب یہ ہے کہ اکراہ ایمان لانے پر نہیں، بلکہ ازل اپنی خوشی سے ایمان داسلام قبول کر لینے اور اس کے خلاف بغاوت کرنے کی وجہ سے ہے، باغیوں کی سزا تمام محکومتوں میں بھی عساکر مخالفت اور دشمن قوموں سے الگ ہوتی ہے، ان کے لئے ہر حکومت میں دوزی راستے ہوتے ہیں یا اٹھا قبول کریں، یا قتل کئے جائیں، اسی وجہ سے اسلام میں مرتد کی سزا قتل ہے، کفر کی سزا قتل نہیں۔

ثُمَّ تَوَلَّيْنَاكَ مِنْ بَعْدِ ذَلِكَ ۖ فَلَوْلَا فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهُ

پھر تم پھرتے اس کے بعد سو اگر نہ ہوتا اللہ کا فضل تم پر اور اس کی ہرمانی

لَكُنْتُمْ مِنَ الْخَاسِرِينَ ﴿۶۴﴾

تو ضرور تم تباہ ہوتے

خلاصہ تفسیر پھر تم اس قول و قرار کے بعد بھی (اس سے) پھرتے، سو اگر تم لوگوں پر خدا تعالیٰ کا فضل اور رحم نہ ہوتا تو اس جہد شکنی کا مقصد توبہ تھا کہ ضرور تم (فوراً) تباہ (اور ہلاک) ہو جاتے، مگر ہماری عنایت و رحمت عامہ ہو کہ حیات مستعار کے ختم ہونے تک ہمت

بے رکھی ہے، لیکن کب تک؟ آخر بعد از مرگ و بال اعمال میں مستلزم ہو گے) فائدہ: حق تعالیٰ کی رحمت عامہ دنیا میں مومن کا فریب پر ہے، جس کا اثر عاقبت اور دوسری راحت ہے، رحمت خاصہ کا بطور آخرت میں ہوگا جس کا اثر نجات اور قرب خداوندی ہے۔

بظاہر اس آیت کے جزو آخر کے مخاطب وہ یہودی ہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں موجود تھے، چونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہ لانا بھی جہد شکنی میں داخل ہے، اس لئے ان کو بھی جہد شکنوں میں شامل کر کے بطور مثال فرمایا گیا کہ اس پر بھی ہم نے تم پر دنیا میں کوئی عذاب ایسا نازل نہیں کیا جیسا پہلے بے ایمانوں اور عہد شکنوں پر ہوتا رہا، یہ محض خدا کی رحمت ہے۔

اور چونکہ اب از روئے احادیث ایسے عذابوں کا نہ آنا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت ہے، اس لئے بعض مفسرین نے فضل و رحمت کی تفسیر بعثت محمدیہ سے کی ہے۔

اس معنوں کی تائید کے لئے گزشتہ بے ایمانوں کا ایک واقعہ اگلی آیت میں بیان ہو رہا ہے:

وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِينَ اعْتَدُوا مِنْكُمْ فِي السَّبْتِ فَقُلْنَا لَهُمْ

اور تم غیب جان چکے ہو جنہوں نے کہ تم میں سے زیادتی کی تھی ہفتہ کے دن میں تو ہم نے کہا ان

كُونُوا قِرَدَةً خَاسِئِينَ ﴿۶۵﴾ فَجَعَلْنَاهُمْ نَكَالًا لِّمَا بَلَّوْا كَيْدَهُمَا وَمَا

سے کہ ہو جاؤ بندر ذلیل، پھر کیا ہم نے اس واقعہ کو عبرت ان لوگوں کیلئے جو وہاں

خَلَفَهُمَا وَوَعْدَهُ لِّلْمُتَّقِينَ ﴿۶۶﴾

تھے اور جو پیچھے آنے والے تھے اور نصیحت دین والوں کی واسطے

خلاصہ تفسیر اور تم جانتے ہی ہو ان لوگوں کا حال جنہوں نے تم میں سے (حدیث شرع سے) تجاوز کیا تھا دربارہ (اس حکم کے جو) ہفتہ کے دن کے متعلق تھا کہ اس روز

بھل کا شکار ہو کر رہی، اس پر ہم نے ان کو رہنے کو قریبی نگرانی سے منع کرنے کے لئے ایک روایت کو مست
بندہ ذیل میں بنا دیا ہے وہ بندہ وہی ہے غالب میں منع ہو گئے ہیں ہم نے اس کو ایک روایت
جسرت و انکیزہ بنا دیا، ان لوگوں کے لئے بھی جو اس قوم کے معاصر تھے اور ان لوگوں کے لئے بھی جو
ما بعد کے زمانے میں آئے ہیں، اور دینار و اس واقعہ کو موجب سمجھتے ہوئے، ان کے لئے اور بھی
کئے گئے۔

فَالَّذِينَ۔ یہ واقعہ بھی اس سرسبز و آباد ملک کا حضرت داؤد علیہ السلام کے زمانے میں ہوا،
یہ اس سرسبز ملک کے ہندو کاؤں میں اور عبادت کے لئے مقرر تھا، اور بھل کا شکار بھی اس روز منع تھا
یہ لوگ مندر کے کرائے کیا کرتے اور بھل کے شوقین تھے، اس قسم کو زمانہ اور شکار کیا، اس حالت
کی طرف سے منع صورت کا عذاب نازل ہوا، جن دن کے بعد وہ سب مر گئے۔
اس واقعہ کو دیکھنے اور سننے والے درجہ سب سے لوگ تھے، وہ زمانہ اور داؤد امیر زمانہ، قرآن فرماؤں
کے لئے نوبہ واقفان مسرتان سے قریب کرانے والا تھا، اس لئے اس کو نکال کر فرمایا، اور مندر بانی و ازاں
کو یہ واقعہ فرمایا اور یہی مقام رکھنے والا تھا اس کو متوجہ فرمایا۔

معارف و مسائل

دینی معاملات میں کوئی ایسا جہل ہے اس ایت میں یہودیوں کے جس اعتقاد میں حدود سے تجاوز کا کر
وہی ہم پر بھل جانے پر حرام ہے کہ اس کو سب عذاب بتلایا گیا ہے، اور ایسا ثابت ہے کہ
کہ وہ صاف طور پر ہم پر شرعی کی غلامی و روزی دہی، بلکہ ایسے جیسے تھے جس طرح شرعی کا ابطال تھا
آپا تھا، مثلاً ہندو کے وہ بھل کی قوم میں ایک دور کا ہندو لاکھ روپیہ چھوڑ دیا، اور یہ دور زمین
پر کسی چیز سے ہندو دی، پھر اقرار کئے روز اس کو پکڑ کر کھائے، تو یہ ایک ایسا جہل ہے جس میں ہم پر شرعی
کا ابطال بلکہ ایک قسم کا چھوڑا، اور اس نے ایسا سیکر کرے والوں کو بڑا سرکش یا مندرمان فرما دے کہ
ان پر عذاب کیا۔

لہذا اس سے ان نفس جہلوں کی حرمت ثابت نہیں ہوتی جن میں سے بعض خود رسول اللہ صلی
علیہ وسلم نے جلائے ہیں مثلاً ایک سرحدہ کو بھوکے جانے میں وہ میر خراب ہو کر خود ناسور میں آگ
ہو گھر اس سے بچنے کا ایک حیلہ خود رسول اللہ صلی علیہ وسلم نے یہ بتلایا کہ میں کا تیار کرنا چاہتا
تھو کہ تم سے ذرا دھڑکے و فروخت کرو، مثلاً وہ میر خراب ہو کر زمین و دروہ میں فروخت کر دی،
پھر ان روز وہوں میں سے ایک سرحدہ ہو کر خریدنے کو یہاں تک ہم پر شرعی کی تعمیل مقصود ہو کر ابطال
و مقصود ہو کر واقع ہے، اس طرح بعض دوسرے مسائل میں بھی فقہاء نے حرام سے بچنے کا ایسا

ایسی ہی تدبیریں بتلائی ہیں، ان کو یہودیوں کے جہلوں کی طرح کہنا اور سمجھنا غلط ہے۔
واقعہ منع سو بہت یہودی تھے، یہودیوں نے ازل ازل اس طرح کے جہل کے چھاپا
کچھیں، مگر یہود نے ہرے سام طور پر شکار کھینچے تھے، قرآن میں دو جہلیوں کو کہیں ایک جہالت
علا، مسلما کی بھی جہلوں نے ان کو ایسا کرنے سے روکا، یا اذکار کے تو ان سے بہرہ و منافعات
قطع کر کے باطل نگاہ ہو گئے، اور بس کے دوسرے کرنے، ایک میں یہ ناسور مان کر دے گئے،
دوسرے میں علا، مسلما ہے، ایک روز ان کو یہ محسوس ہو کہ جس حد میں ہم نافرمان لوگ تھے تو
نور باطل سننا، یا زور دہاں جا کر دیکھا تو سب کے سب بندہ وہی کی صورت میں منع ہو گئے تھے، اور
قارون نے فرمایا کہ ان کے یہاں ہند بنا دے گئے تھے اور بڑے خزانے کی شکل میں منجیل کر کے گئے
تھے، اور یہ مندر ہند وہاں پر مشتبہ اور اور قلعہ والے انسانوں کو پہچانتے تھے، ان کے فریب آ کر
روئے تھے۔

مَسْجِدَ قَوْمِ كَيْسِ اس معاملہ میں بھی بات وہ ہے جو خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے
جہلیوں میں تھی، عہد ان میں مسلمانوں میں منقول ہے، مگر بعض لوگوں نے اپنے زمانے
کے بندہ وہی اور خسر یوں کے بارے میں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ کیا وہی
منع شدہ یہودی ہیں آپ نے فرمایا کہ انہی قحالی جب بھی قوم میں منع صورت کا عذاب نازل
کرتے ہیں تو ان کی نسل نہیں ہیں، بلکہ چند روز میں جاگ ہو کر ختم ہو جائے ہیں، اور یہ میر فرمایا کہ
مندار رخسار پر دنیا میں پہلے سے بھی موجود تھے اور آج بھی ہیں، مگر یہ مندر ہند وہی اور خسر یوں
سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔

اس موقع پر بعض مفسرین نے بھی بھکاری کے حوالہ سے بندہ وہی میں نہا کہ میز میں سنگساری
کرنے کا ایک واقعہ نقل کیا ہے، مگر یہ واقعہ بخاری کے بھی نسخوں میں موجود ہے نہ خود صحیح بڑا
مستثنیٰ نے اس پر اس کی تعمیل بیان فرمائی ہے۔

وَإِذْ قَالَ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تَذَرُوا بَنِي إِسْرَءِيلَ

اور جب کہا موسیٰ نے اپنی قوم سے انہی فرمان پر حکم کرنا کہ وہ ایک گانے
قَالُوا أَلَمْ نَعْبُدْكَ وَآلِهَتُكَ أَقُولُ بِاللَّهِ أَنَّا كُنَّا مِنَّا الْجَاهِلِينَ
وہ بولے کیا تو ہم سے پہلے کرتا ہے کہا بتاؤ خدا کی کہ ہوں ہیں جاہلوں میں۔

خلاصہ تفسیر اور روزانہ یاد کرو جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے فرمایا
کہ تم قحالی تم کو کہہ رہے ہیں کہ وہ اگر اس لائن کے قائل کا پتہ لگا چاہتے ہو

بنائیت بلع انداز میں کیا گیا ہے۔ لیکن بعض چھسٹروں میں تاثر مٹا کر یہ ہے جس سے نہیں جاری ہو جاتی ہیں جن سے مخلوق خدا کا خدا تعالیٰ ہے۔ اور ان کی بدودوں کے واسطے دلت بھی نہیں رکھ خلقی مخلوق و مصیبت میں گھل جائیں اور بعض چھسٹروں میں ان کے کتاثر نہایت ہے جس سے کمر نفع پہنچا ہے۔ تو یہ پھر نہایت اولیٰ کے کم تر مہم ہونے اور ان کے قلوب اللہ و روح دوم کے پھر نہایت سے بھی غفلت ہیں۔

اور بعض چھسٹروں میں گواس درجہ کا اثر نہیں، مگر بھی ایک اثر ہے کہ خوف خدا سے بچ کر گرتے ہیں، گورہے میں پہلی قسموں سے یہ ضعیف تر ہیں، مگر ان کے قلوب میں تو کرم و رحیمہ طیف ترین جذبہ انفعال بھی نہیں۔

أَقْطَبُوعُونَ أَنْ يُؤْمِنُوا بِكُمْ وَقَدْ كَانَ فَرِيقٌ مِنْهُمْ

اب کما تم اسے مسلمانوں، قریب دیکھتے ہو کہ وہ انہیں کبھی بات اور ان میں ایک فرق تھا

يَسْتَمِعُونَ لَكُمْ اللَّهُ ثُمَّ يَتَوَكَّفُونَ مِنْ بَعْضِ مَا عَقَلُوا مِنْكُمْ

کرسٹا خدا اللہ کا کلام پھر بدل ڈالتے تھے اس کو جان لو کہ کر اودو

يَعْلَمُونَ ۝

جانتے تھے۔

خلاصہ تفسیر | مسلمان بہرہوں کو مومن بنانے کی فکر سنیں کر رہے تھے اور اس میں کلفت

امٹاتے تھے تو یہ کہ حالات اور اخلاص کا ہونا کہ مسلمانوں کی اس کا اختلاط

کر کے ان کی کلفت اس آیت کے ذریعہ دلع فرماتے ہیں،

و اسے مسلمانوں کو کیا رہ سائے تھے، فکر اب بھی تم قریب دیکھتے ہو کہ یہ رہا بدوی اٹھاتے

گھنے سے ایمان لے آویں گے، حالانکہ ان سب مذکورہ قسموں سے بڑھ کر ایک اور بات بھی

ان سے ہو چکی ہے کہ ان میں کچھ لوگ ایسے گذرے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا کلام سنتے تھے اور پھر

اس کو کچھ کا کچھ کر دیتے تھے اور اس کو سمجھنے کے بعد دیا کرتے اور (دلف بہ کہ یہی) جانتے تھے کہ ہم بڑا کر رہے ہیں، بعض اخراجی نفسانیاں کا کلام والی کا باعث ہوئیں،

فانذار۔ مطلب یہ کہ جو کہ ایسے دنیاک اور اخراجی نفسانی کے اسیر ہوں وہ کسی کے

کچھ سننے سے کب باز آنے والے اور کسی کی کب سننے والے ہیں۔

لو کہ کلام اللہ سے مراد بالآخر توبہ ہو، اودو مٹا سے مراد جو اسلہ ایمانیا علیہم السلام کے ہے

اور کثرت سے لو اس کے بعض کلمات یا تفسیریں اور لوں بدل ڈالتا ہیں اور کلام سے مراد کلام جو کلام شرک و کفر میں نے بطور تصدیق توفیق علیہ السلام کو بطور چرستانا تھا اور سماع سے مراد لا واسطہ اور توفیق سے مراد وہ ہے یہ نقل کر دینا کہ انہیں انہی تعالیٰ نے یہ بھی مشر راہ تھا کہ جو حکم تمہارے اواز ہو کہ وہ احاطہ ہے ۵

اور مذکورہ بالا میں سے کسی اور کا صدور گروان بہرہوں سے مذہب اور حجاز غفلت ملی، مثلاً علیہ کے زمانے میں موجود تھے، لیکن چونکہ وہ لوگ بھی اپنے اسلاف کے اسی اعمال پر انکار و نفرت نہ دیکھتے تھے اس لئے یہ بھی ویسے ہی ہوتے۔

وَإِذْ يَقُولُ الَّذِينَ آمَنُوا أَفَلَا الْاٰمَنَاءُ ۚ وَإِذَا اخْلَافَ جَمْعُهُ إِلَى

اور جب کہ ہیں مسلمانوں سے کہیں کہ مسلمان ہونے اور جب تمہارا ہونا ہے اس کو

بَعْضُ قَالُوا أَأَنْتُمْ تَدْعُونَنَا إِلَى اللَّهِ عَلَى كَيْفِمْ لِمَا تَدْعُونَ

اس کو کہ ہے ہم تم کو کہہ رہے ہو ان سے بظاہر کیا، اللہ نے تمہارا کہ جھٹلا ہیں ہم کو

بِهِ عَشْرَ رَيْبَكُمْ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ۝

اس سے تمہارے رب کے کہے کیا تم نہیں سمجھتے۔

خلاصہ تفسیر | اور جب ملتے ہیں دو مٹھیں ہوں مسلمانوں سے تو اس سے تو کہہ ہیں کہ ہم

ایمان لے آئے ہیں اور جب تمہاری ہیں جاتے ہیں یہ بیٹھے و منافق یہ وہی

و سب کے بیٹے و ملازم یہ ہوں کہ اس کی سبوت و ہم مشر کی کے مدعی ہوتے

ہیں اس وقت اودو دوسرے ہوں ان سے کہتے ہیں کہ تم رہا، کیا وہ غلبہ کر رہا ہو کہ اٹھالوں

کو تو شاید میں ہوں یا میں تھکتے ہو تو ان کے مفید مذہب، اللہ تعالیٰ نے (توفیق میں)

تم پر کشف کر دی ہیں و عجز و غفلت پر مشہور دیکھتے ہیں، نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ لوگ ہم کو جست

میں غلوب کر دیں گے کہ وہ دیکھیں یا مغیر اللہ کے پاس ہے تھا، یہی کتاب میں آیا ہے کیا تم

راستی مونی میں بات کہہ رہے تھے۔

فانذار۔ منافقین بھی ایک آہو بات خوشامد میں ہے ایمان کی سچائی جتنکے کے لو

مسلمانوں سے کہہ رہے تھے تو قریت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق بشارت آئی ہوں

یا قرآن مجید کے متعلق خبر لائی ہے، دیکھو و دیکھو، اس پر دوسرے لوگ ان کو ملامت کرتے تھے۔

تو میں ہیں، بلکہ نفرت حضرت علی علیہ السلام و جناب حضور مقبول علیہ السلام و ان کے دھرم سے کافر نہیں ہوتے، انہیں اگر کسی عیسائی کے سبب و دوست میں پڑے کسی کے پھر کائناتے جائیں گے، اور جو کچھ وہ عربی تبارہ الفا میں الفا مسمیہ کیونکہ وہ عربیوں کی بادیت کا عربی خود قلم ہے، لہذا ان کا بہت سیدہ و مخدوم کے سبب وہ لوگ کافر ہیں گئے، اگر کفار کے لئے بدستور ہے و دوست سے کھلتا ہوا جاننا کہیں بھی آسمانی کتاب میں نہیں آجیں کرانہ تعالیٰ نے جس قدر بغیر کر دیا ہے ثابت ہوا کہ وہ عربی و عربیہ و اسرائیل بلکہ غلاب و دین ہے۔

بَلْ مَنْ مِّنْكُمْ سَبَّ سَيِّئَةً وَآخَاطَتْ بِهِ لَحْيَيْكَ فَادْرِكْهُ فَادْرِكْهُ

جو کس جس میں نے کلمہ اچھا اور پھر یا اس کو اس کے منہ والے سو دیں ہیں و دوست

الْقَارِءُ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ۝ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ

کے دیکھنا ہے، اس میں ہی نہیں رہے گئے، اور جو ایمان لائے اور عمل کئے

أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ الْجَنَّةِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ۝

وہی ہیں جنت کے رہنے والے وہ اسی میں ہمیشہ رہیں گے۔

خُلَاَصَةُ تَفْسِيرِ اٰخِرُوْنَ اِنَّا كُنَّا

ہم و ہمارے دربار کو کچھ بگڑا مارا خالی ہے، جو شخص قصداً برسی یا کسی کو کہے اور اس کو اس کی خطا

و قصور اس طرح و اسطرح کرے کہ کہیں یہ کسی کا ارتکاب ہے، سو پائے گئے کہ اپنی و دوست سے بھی

دور و اس میں ہمیشہ رہیں گے، اور جو لوگ اور رسول پر ایمان لائے وہاں اور ایک کلام

کر گیا پائے گئے اپنی بہشت ہوتے ہیں، اور وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔

فَاٰخِرُ ۝ خُلاَصَةُ کے سبب سے معنی آدمی کو کہ گنہگار اس کو اسطرح سے معنی کے ساتھ

کفار کے ساتھ خصوصاً جو کہ کفر کو کہیں گے، جو کوئی بھی صالح مقبول نہیں ہوتا، بلکہ کفار کے

قبل اگر کچھ نیک اعمال کے کسی ہوں تو وہ بھی مٹائے اور مٹا دیا جاتا ہے، اسی وجہ سے کفار میں

سرتاپا وہی ہی ہوتی ہیں کہ جس کو سب سے زیادہ نیک ہوں، مگر ان ایمان کے کراؤں کو ان کا ایمان

خود بہت بڑا عمل حاصل ہے، اور وہ اسطرح اعمال میں بھی ان کے ساتھ اعمال میں درج ہوتے ہیں، ان

نے وہ کچھ کے اثر سے خالی نہیں، بلکہ اسطرح منکر ان کی حالت پر حماروں نہیں آتا۔

خلاصہ یہ کہ جب اس ضابطہ کے ذریعہ کا اس کا ادبی نہیں ہوتا ثابت ہو گیا، تو جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کا نام لیا، جس میں کچھ بد حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں ہیں تو یہ نام کا انکار کر کے کائنات میں جا نہیں سکتے، اس نے اس ضابطہ کے رو سے وہ کسی غلام کی اتار نہیں گئے، تو ان کا دعویٰ مکرر دہرائے کہ اس نے اصل ضابطہ

وَاِذَا اَحَدٌ نَّامٍ مِّثْلَ نَبِيٍّ اِسْرَآوِيْلَ لَا تَعْبُدُوْهُ ۚ اِلَّا اللّٰهُ

اور جب ہم نے یا مشورہ بنی اسرائیل سے کہ عبادت نہ کرنا مگر اللہ کی

وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَذِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتٰمٰی وَالْمَسْكِيْنَ وَ

اور ان باپ سے ملوک نیک کرنا اور کنبہ والوں سے اور یتیموں اور محتاجوں سے اور

قُوْلُوا لِلنَّاسِ حَسَنًا وَّاَقِمُوا الصَّلٰوةَ وَآتُوا الزَّكٰوةَ وَذُرُّوْا

کچھ سب لوگوں سے نیک بات اور قائم رکھو نماز اور دینے دہیو زکوٰۃ پھر

كُوْلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمْ قُلُوْبًا وَّمِنْكُمْ وَاَنْتُمْ مُّعٰی ضَرُوْنَ ۝

خ کھرجے مگر غمخوڑے سے تم میں اور تم ہی پر کھانے والے۔

اور وہ زبانی ذکر میں جب یا ہم نے اور یہ میں قول و قرآن میں اسرائیل سے

خلاصہ تفسیر اس عبارت میں کہ اگر کسی کا بھروسہ ہے، اور ان باپ کی بھی طسیر

خدمت گذاری کرنا، اور اپنی قربات میں کسی اور سے اپنے کچھ بھول کر بھی اور خوب محتاجوں کی بھی

اور عام لوگوں سے وجہ کوئی بہت دیکھا ہوا بھی طرح و خوش خلقی سے کہتا ہے یا بھائی دیکھنا

ناگاہی دیکھا دیکھنا کو، پھر تم قول و قرآن کے اس سے پھر گئے پھر دیکھو وہ جس قدر کے، اور

تمہاری تو معمولی عبادت ہے، انشاء کے ہٹ جاتا۔

فَاٰخِرُ ۝ یہ بعد دفعہ چندہ وہی ہیں جو قرآن کے پہلے آجندہ ہے، اور یہ کے حضور

ہونے سے قبل شریعت موسیٰ کے آجندہ ہے، جب قرآن شریعت برحق و شریعت محمدی کے متبع

ہو گئے۔

مسئلہ ۱۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ اسطرح اسلام اور سابقہ شریعتوں میں مشترک

ہیں ہیں جو قرآن، و ان کے بعد و کتب سابقہ اور ان کے بعد و کتب سابقہ کی خدمت اور تمام انسانوں کے

ساتھ گفتگو میں برحق و خوش خلقی کرنا اور نماز اور زکوٰۃ سب واجب ہیں۔

وَإِذْ يَأْتِيَنَّكَ ابْنُ ابْنِ مَرْثَدَةَ لِيُنْفِيَنَّهُ وَابْنَ مَرْثَدَةَ وَابْنَ مَرْثَدَةَ وَابْنَ مَرْثَدَةَ

اور دیکھئے، اس نے میری طرف سے جو شخص کو مرنے سے روکا اور تو نے وہی اس کو مرنے سے روکا۔
اَلَمْ تَجْعَلْ لَّكُمْ سُوْرًا لَا تَعْلَمُوْنَ اَنْفُسَكُمْ اَسْتَكْبَرْتُمْ
پھر جھوٹا کیا جب تمہاری اس لڑکی کوئی رسول دیکھ جو تمہارا بھائی کو تو تمہیں خبر نہ تھی،

فَقَرَّبْنَاكَ لَهُمْ وَفَرَّقْنَا نَفْسُكَ عَنْهُمْ

پھر ایک جماعت کو چھوڑا اور ایک جماعت کو تم سے نفرت کر دیا

اور ہم نے اے نبی! اس میں سے کسی بھی عورت کی عیادت کے لئے ہمیشہ سے جڑے ہوئے رہے۔
خلاصہ تفسیر: سچے اول، رسول علیہ السلام کو تکلیف دہ قرار دیا اور دیکھا کہ ان کے بعد
اور میں نے اپنے بعد کچھ سے بڑا برکت رکھتا ہے۔ یہی وہی ہے اور (پھر اس عورت کے ساتھ کے
انہی میں سے) حضرت عائشہ کی بیوی پر تم کو دیکھتے، واضح دلائل دینی اور عیادت، وہاں فرماتے
اور ہم نے ان کو روح القدس و جبریل علیہ السلام سے جو بات دیکھی وہاں جو عیادت خود ایک
دلیل واضح تھی تو کیا، تعجب کی بات نہیں کہ اس پر بھی تم سرکشی کرتے رہے اور جب کسی
دینی کوئی جبریل تھا ہے اس لیے احکام لاتے ہیں کو تھا اول نہ جانتا تھا، جب ہی کہہ رہے تھے ان
پہلوں کی حفاظت سے، پھر کرنا شروع کر دیا، سواری پہلوں میں سے اچھوٹ کر کو تو ان کو ہاتھ نہ ملے
پھر بتا دیا اور انھوں کو دیکھو کہ، عمل ہی کرانے گئے۔

فَأَنشَأْنَا فَرَقًا مِّنْ بَيْنِهِمَا فَبَشِّرْهُ بِأَنَّكَ أَهْلٌ بِتِلْكَ الْوَادِعِ
پھر ہم نے ان کے درمیان میں سے ایک فرقہ بنایا اور ان کو بتا دیا کہ تم وہاں کے رہنے والے ہو۔
کافی شمس

وجہ اول رسول اللہ فہمنا و روح القدس لیس لہ کلام

اور جبریل علیہ السلام کے واسطے سے عیادت علیہ السلام کی کن طریقوں سے ثابت ہوئی، اول، تو
دلائل کے وقت میں شہادت کے حفاظت کی حق، تو ان کے دم کرنے سے حل بیوی قرار پایا،
پھر بعد وہ کہ حضرت سے حضرت عیادت علیہ السلام کے حفاظت تھے، اس لئے جبریل علیہ السلام
حفاظت کے لئے ساتھ رہتے تھے، جن کو ان میں ان کے ذریعہ سے آسان پر انھوں نے گئے، پھر نے
ہر دست سے پہلوں کی نگہبانی کی کہ حضرت عیادت علیہ السلام کی بھی نگہبانی کی اور حضرت ذکر
اور حضرت جبریل علیہ السلام کو قتل ہی کیا۔

وَقَالُوا أَفَلَوْنَا عَلَّمْتُ ابْنُ لَعْنَتِهِمُ اللَّهُ بِكُمُ هُمْ فَقِيلَ مَا

اور کہتے ہیں ہمارے دونوں بھائیوں کو بلکہ حضرت کی پڑاوت کے ان کے کوئی سبب سمجھتے

يُؤْمِنُونَ

ایمان لائے ہیں

خلاصہ تفسیر: اور وہ کہتے ہیں کہ ہمارے قلوب (ایسے) محفوظ ہیں کہ ان میں
میں مخالفت مذہب کا جو اسلام ہوا ہی نہیں ہوتا، تو نہ سبب پر ہم غیب
بائیں میں حق تعالیٰ نے اس لئے نہیں کہ ان کو ان کے کوئی سبب ان پر
کی لڑکی کو اسلام جو مذہب حق ہے اس سے نفور اور موعظ مذہب پر مصر ہیں اس وجہ سے ان
خود اسادایان دیکھتے ہیں اور خود اسادایان نہیں ہیں وہ کافر ہی ٹھہرے
فائض: یہ تو اسادایان ان امور کی بابت ہی جوں کے وہب اور اسلام میں مشترک ہیں
شاذ کا کافی ہوا، قیامت کا کافی ہو گا ان امور کے وہی حال تھے لیکن خود نبوت محمدی اور قرآن
کے کلام حق ہونے کے منکر تھے، اس لئے انہوں نے یہاں نہ تھا۔

اور اس غصے سے ان کو باقتدار نسبت ایمان کیا، جس کے معنی مطلق نہیں کے ہیں، مگر وہ بعض
شہادہ کے ساتھ ہی مطلق ہو کر ان کو ایمان نہیں کہتے، ہشتر ماہ وہاں میرے ہو چکی اور وار
افل الشہادہ کے تقاب کے ساتھ ہو۔

وَلَمَّا جَاءَهُمْ كِتَابٌ مِّنْ عِندِ اللَّهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ

اور جب پہنچی ان کو کتاب اللہ کہ بن سے جو سچا ثابت ہے اس کتاب کے

وَكَاذِبًا مِّنْ قَبْلِ يَسْتَفْضِحُونَ عَلَى الَّذِينَ كَفَرُوا فَلَمَّا جَاءَهُمْ

اور ان سے پہلے ان کے کافروں پر، جب یہاں کے کفر کو

مَّا لَكُمْ كَذِبًا أَفَرَأَيْتُمْ لَكُمُ عَلَى الْكَافِرِينَ

کہ تمہارا کذاب اس سے کہ کفر ہے، سو کثرت ہے اللہ کے منکروں پر

اور جب ان کو ایک ایسی کتاب پہنچی دینی قرآن مجید، جو تمہاری کتاب اللہ ہے
اور وہ اس کتاب کی دیکھی، تصدیق کرنے والی ہے جو پہلے سے ان کے

خلاصہ تفسیر

پس رہی، تو وہاں ملائکہ اس کے قبل (غور) بجا کر سننے والوں، اگلا سے دینے لگیں مٹ کر پہنچ کر ایک نئی آنے والے میں اور ایک کتاب لائے والے میں (اگر) چہرہ پہنچے ہیں کہ وہ (دوب) جانتے اور جانتے ہیں تو اس کا (صاف) انکار کر رہے ہیں اور ان کی رائے مسکروں پر کہ جہاں وہی کہ بعض تعجب کے سبب (اگر) کریں،

فائدہ: ارشد ان کو جو مصنفہ تھی تو رواد فرمایا تو اس کی وجہ سے کہ تو رواد میں ہمیشہ محمدؐ
 اور ذوالشہان کی کہ ہمیشہ گنگو تھیں یہاں تک کہ صادق ظاہر ہو گیا، اس تو رواد کا سامنے نہ رالیا تو رواد
 اور صاحب تو رواد اصل مشہور ہو کر اس کی تکلیف ہو کر نہیں رہا اور وہ رواد کی کہ کذب لازم آئے گی۔
 ایک شہید ملاں کا جواب اور اگر کسی کی کہ شہید ہو کر جب وہ حق کو حق جانتے تھے تو پھر ان کو کوئی شک نہ تھا
 کا فرمے کہ ملاں!

فاس کا جواب ہے کہ ایمان صرف جاننے کا نام نہیں بلکہ جاننے کا نام ہے اور نیز یہ شیطان مسک نہیادہ کو حق جانتا ہے، مگر جاننے کے باوجود انکار کرنے کی وجہ سے اور یہی گنہگار شدت برہمگئی اس لیے اگلی آیت میں ایمان کے سفر کی وجہ ان کا عذاب بتلایا گیا ہے، چنانچہ ان شاء اللہ تعالیٰ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّؤُوفِ الرَّحِيمِ

بڑی چیز کو دہا جس کے بدلے کچا اٹھوں نے اپنے آپ کو کہہ سکر ہوتا اس چیز کے جواری

لَعَلَّآ اِنْ يَنْزِلِ الْاَلَهُ مِنْ ذِكْرِهِمْ كَيْفَ يَشَاءُ لَنُصِيبَنَّكُمْ ذِكْرًا مِمَّا تَعْتَبُونَ

اے اس عہد پر آمنا اے اللہ اپنے فضل سے جس پر چاہے اپنے بندوں میں سے، سو گناہوں سے

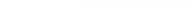
بِعُصْبٍ عَلَى عُصْبٍ، وَرِلِّ الْكَافِرِينَ عَذَابٌ مُّهِينٌ ⑨

انسانیت اور امت مسلمہ کے درمیان جو کچھ ہے

خلاصہ تفسیر
و حقوبتِ آخرت سے محروم آجائے ہیں، اور وہ حالتِ ایسے اگر کوئی

دعا کا اثر بھی انھیں داس اعظم پر کائنات تعالیٰ اپنے افضل سے جس بلند پراس کو منظور چو الٰہی محسوس

کے صفحہ اچھٹے اور آخرت میں ان کٹر کربو الوں کو ایسی سزا ہوگی جس میں دیکھ کر ہر ایک مظلوم اور استبداد کے مجرم



فائدہ :- ایک غصہ کو فرو بردھراصر، اہل غصہ بالائے غصہ فرما دے، مزاج کے ساتھ
ہیں کی قیمت بتانا یہ مقصود ہے کہ جو عذاب کفار کے ساتھ خاص ہے، کہو کہ اگر ہم غرضوں کو عذاب
اس کو ایک کرنے کے لئے جو کجا "ذات" کے لئے نہیں۔

آج کے آئین میں جو ای کا قول نقل کیا ہے اس سے ای کا کفر ثابت ہوتا ہے، اور حد بھی مقرر ہو گیا ہے،

[illegible]

اور جب کہا جائے کہ ان سے الو اس کڑا مشق لے جیسا کہ تو کہتے ہیں ہم لیتے ہیں جو آڑ ہے

عَلَيْنَا وَيَكْفُرُونَ بِمَا وَرَاءَهُ وَهُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَهُمْ

قُلْ فَلِمَ تَقْتُلُونَ أَنْبِيَاءَ اللَّهِ مِنْ قَبْلُ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ﴿٥﴾

اے ایسا کہہ دیکھ کیوں قتل کرنے کی ہراسہ کے بیچروں کو پہلے سے اگر تم ایسا نہ رکھتے تھے۔

اور وہ بیان دیہودوں سے کہا جاتا ہے کہ خرم ایمان ملاؤ ان تمام کتابوں پر جو افتہ تم

اگلی سہ ماہی تو جواب میں لکھتے ہیں کہ ہم تو صرف اس (بی کنگ) پر اہتمام لادیں گے جو ہم (لوگوں)

اس کے علاوہ ہیں (جیسے انجیل اور مستورون الیہ رب) کا وہ انکار کرتے ہیں، حالانکہ وہ دتوفا کے

ماسوا اٹھائیں، کبھی ذلیٰ غفص، حق (ظہور واقعی)، یمن، اور ذلیٰ غفص، حق ہونے کے علاوہ، تصدیق و تکرار والی
 جہن ہیں اس کتاب کی ہر آیت کے پاس ہے یعنی خود کو کی، آیت دیکھیں کہ دہا کا حق ہر کس کی

خاندان... جوہر کا کچھ نہ ہو تو قادیان کا دوسرا کچھ ہو گا۔

والدی بھی، تو ان کا یہ قول صریح کھنڈ ہے، اور اس کے سامنے جو یہ کہا کہ (تورقہ) جو ہم پر نازل کی گئی ہے، اس سے جسے مترشح ہوتا ہے، اس کا مضمون معائنہ ہے کہ اگر اس میں ایسا جو کچھ میرا نانا، ابا، ام، کھنڈ،

اول کہ جب اور کتابوں کی حقیقت اور واقعیت بھی دلیل قطعی سے ثابت ہے تو پھر اس کتاب کی کیا وجہ ہے! ہاں اگر اس دلیل میں کوئی کلام تھا تو اس کو پیش کر کے تعلق کر لینے، بھار کھنک کی آخر کیا وجہ!

دوسرے اور کتاب میں مشرق قرآن مجید جو قویٰ و قاطع مسند ہے تو اس کے انکار سے تو خود قرآن کی گداز و انکار لازم آتا ہے۔

تیسرے یہ کہ انبیاء علیہم السلام کو قتل کرنا نام آسانی مسابو کی دوسے کفر ہے، پھر خدا کے گرد کے لوگوں نے جو کئی بیویں کو قتل کیا جن کی قطعی کتب قرآنی کے انکسار کے ساتھ خاص تھی، اور مومن و فاکین کو اپنا بیچارہ وقت مانگتے ہوئے تو برا راست قرآن کے ساتھ کفر کرنے سے ہوا اس سے تو خدا فرشتہ پڑیاں کا دعویٰ بھی غلط ثابت ہے۔ دوسری کسی بھی پہلو سے خدا و قول و فعل صحیح اور درست ہیں۔

تیسرے بعض اور وجہ و دلائل سے ان یہودیوں کا رد فرمایا گیا ہے، چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

وَلَقَدْ جَاءَكُمْ مُوسَىٰ بِالْبَيِّنَاتِ ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِن

اور آپ کا آچکا تھا، اس مومن مرد معجزے سے کہ ہر بنا لیا کرتے ہیں، اس کے

بَعْلٍ ۚ وَاتَّخَذْتُمُ ظُلُمُوتًا

میں، جیسے، اور تم ظالم ہو۔

خلاصہ تفسیر اور حضرت موسیٰ علیہ السلام پر جو لوگوں کے پاس معنی صاف و دلایل (توحید و رسالت کی) دلالت دیکھ، اس پر کسی تم کو ہونے کے سال کو رد و رد، بنا لیا، مومن علیہ السلام کے لئے طوطی بنانے کے اور خدا پر اس پر ہر میں اسے (میں) ہے جسے۔

فانذار۔ یہاں سے وہ لافیں لڑا ہیں جو اس سے پہلے بیکہ قرآن نہ مل تھی، مومن علیہ السلام کے نبی پر ہونے پر تمام طرحی قصص مثلاً عصا، اور دھنیا، اور کاف پھٹا وغیرہ۔

وہی تقریر کا مثل ظاہر کرتی دعویٰ تو یہاں کا کرتے ہو اور صریح شریک میں لگا ہو، جس میں

موسیٰ علیہ السلام کے بعد انسانی کی صریح مذکور ہے، اور یہ کہ اس کے بعد کو مسود بنائے کا معاملہ اگرچہ ان یہودیوں کے ساتھ پیش نہیں آیا تھا جو حضور صلی علیہ وسلم کے زمانے میں نزول ستران کے وقت موجود تھے، مگر چونکہ یہ لوگ اپنے اہلاد کے حامی اور ظن دار بنے تھے،

اس لئے فی الجملہ یہ بھی دوسری مثال ہیں۔ اور اس سے بات بھی چلتی ہے کہ کون کے اسلاف نے مومن علیہ السلام کی تہذیب کے کفر کیا وہ اگر صلی علیہ وسلم کے انکار کے رنگ ہیں تو فوجاں عجیب نہیں۔

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّورَ خُذُوا مَا

اور جب، ہم نے دیا قرار تمہارا اور بلند کیا تمہارے اوپر کوہ طور کہ

اَتَقْبِلُوهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَلَا تَصْنَعُوا كَالَّذِينَ خَلَفُوا وَتَرَىٰ

تم کو دیکھو کہ اس سے اور اسلئے کہ تمہارے اوپر نہ کیا اور پلائی تھی ان کے

فِي قُلُوبِهِمُ الْعِجْلُ يُكْفِّرُهُمْ قُلْ يَغْفِرُ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ اِنَّ

دلوں میں مجھت اس کی تھی کہ اس کے کفر کے لئے کہ ہر جی دین سکھا کر تم کو ایمان

اِنَّ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِينَ

اگر تم ایمان والے ہو۔

اور وہ زمانہ یاد کرو کہ جب ہم نے تمہارا قول دستار دیا تھا، اور اس قول و

وقت ہم دیا تھا کہ جو تم کو دینے میں ہم دست داری تھی، اسے ساتھ لیا اور ان کا نام

کول سے اتھو اس وقت، انھوں نے دیکھ کے ان سے زبان سے تو کہہ دیا کہ ہم نے قبول کر لیا اور

سنا لیا، اور جو کہ واقع میں بات دل سے نہ تھی، اس لئے کہ باطن حال میں بھی کہتے تھے کہ،

ہم نے عمل نہ کیا، اور جو ان کی اس قول میں کہ ان کے قتل، اگر کثرت دین، ہم دیکھو سال

پوست ہو گیا تھا، ان کے کفر سالن، کی وجہ سے دیکھو دیکھو فرستے ان کے انھوں نے ایک

بیت پرست قوم کو جو کہ خود خواست کی تھی تمہارے لئے کوئی ایسا ہی نہیں جو یہ کہہ دیا جاتے

آپ فرمادیجئے کہ جو دینا چاہتے اپنے ایمان موعود کے افعال کو سو، یہ ایمان کو بہت بڑے جہاں

جہاں کی علیہ تمہارا ایمان تم کو کہہ رہا ہے، اگر تم نہ چھوڑو اب میں، اہل ایمان کو مومن یا ایمان نہیں ہے۔

اور بعض یہود نے حضرت علیؑ علیہ السلام سے کہا تھا کہ آپ کو فتنی میں داخل
 کرنا نالایق نہیں جس کو ہم میں جانتے پہچانتے۔ اس کے جواب میں کہا گیا ہے کہ
 وہ تو ایک ہی دانشور ہیں، کوئی پھر سے اس پر کھینچ کر لائے، واطمینان کے ہیں، ورنہ کو
 وہ خوب جانتے پہچانتے ہیں، مگر ان کا اعلان نہ کرنا چاہیے، بلکہ یہ جاننا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حالت
 کی وجہ سے ہے، اور قاصدہ تفسیر کو کہہ کر انھیں نہیں کیا کرتا دینے والے کا، مگر صرف وہی لوگ
 جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عادی ہیں۔

اَوْ كَلَّمَاعَهُدَّوَاَعَهُدَّانَبِيَّهٖ فَرِئُوْنٌ مِنْهُمْ اَبْلَ اَكْثَرُ و

لَا يُؤْمِنُونَ ①

ہمیں کرتے۔

خطابہ
 ترجمہ: یہود کو جو بعد از ولادت پاکا جاتی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کے باب میں قوتاً میں کیا گیا تھا اور منوں بعد میں ہی ہے صاف انکا کردار اس کے متعلق افسوسناک ہے کہ ان کا وہاں سے ان کو کھلا ہے اور وہ ان کی فوجی حالت پر کما حقہ اپنے لئے مسلم بعد از کبھی کسی نو پڑا نہیں کیا کہ ایک باب کبھی ایمان تو گزرتا ہے وہی بدستور کوئی بعد از ہوگا مگر وہ اس کا ان میں سے کسی نہ کسی منہ پر ہے لہذا ان کو نہ ہوگا بلکہ ان کو قبول بعد کرنے والوں میں زیادہ تو چاہیے کہ انھیں ملے جو (ہرگز) اس عہد کے ہیں جس وقت کہ رسول خدا تو من خدا ہی پر ایمان نہ دے گا اس سے بڑا کفر ہے

فائدہ ۱۔ اور ایک جماعت کی تحصیل اس لئے کی گئی کہ بعضے اُن میں گئے ان جو کوپورا بھی کرتے تھے جن کا خیر میں چاہے مولیٰ اللہ علیہ وسلم بھی ایمان لے آئے۔

وَلَمَّا جَاءَهُمْ رَسُولٌ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ مُصَدِّقًا لِمَا مَعَهُمْ مَبْدُوءٌ
فَرِحُوا فِي الْأَنْبِيَاءِ أُولَئِكَ كَتَبَ اللَّهُ دَرَأَاءَ ظُهُورِهِمْ
رَأْيَكَ جَمْعُ لے اہل کتاب سے کتاب اللہ کو اپنی پہچان کے

كَانَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ﴿١٩﴾

گرچہ وہ جانتے ہی نہیں۔

خلاصہ تفسیر
اور آیت میں ایک خاص جگہ شکنی کا ذکر فرماتے ہیں، جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان دلانے میں کام تمام خدا ارشاد ہوتا ہے، اور جب ان کے پاس ایک عظیم الشان، بلیغ کتبے اللہ تعالیٰ کی طرف سے خود رسول پورے کے ساتھ، تصدیق بھی کرے، تو اس کتاب کی ہر ایک کوئی کہ اس ہے وہی قوۃ الٰہی، مگر جو اس میں آپ کی ہجرت کی خبر ہے، تو اس حالت میں آپ پر ایمان کا نیا ہونا، پر عمل تھا جس کو وہی مصنف اور ہاتھ لکھنے والا ہے، ان اہل کتاب میں کے ایک فرقے نے خود اس کتاب اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان دیا، اور دوسرے ان کو اس کے معنوں کا ایک کتاب اللہ ہے کے نام پر اسلاف طریقی ہیں۔

وَاتَّبِعُوا مَا أَمَرُوا الشَّيَاطِينَ عَلَىٰ مَلِكٍ سَلْبِقُونَ ۖ وَمَا أَفْرِسَ سَلْبِقُونَ

اور بھی بدلو اس علم کے جوڑتے تھے شیطان سلیمان کے اور ماہیت کی معرفت اور کفر پر نہیں کیا سلیمان

وَلِيَكُنَ الشُّبُهَاتُ كُفْرًا وَاعْلَمُوا أَنَّ النَّاسَ الْمُبْحَرِينَ وَمَا أُنْزِلَ
عَلَى الْمَلَائِكَةِ بِبَابِ هَارُوتَ وَمَا سَارُوتَ وَمَا يُعَلِّمُونَ مِنْ كَلَمٍ
جَوْادٍ وَفَرِشُونَ فِيهِمْ جَنَّاتٍ أَمَّارَاتٍ وَهُوَ الَّذِي يَنْزِلُ فِيهِ رُوحُ الْقُدُسِ

عَقِبْ يَقُولُ لَا إِيمَانَ خِيْنَ فَنَدَبَهُ فَلَا تَكْفُرْ فَيَعْلَمُونَ مِنْهُمَا مَا
 رَوَوْا مِنْ ظَنِّهِمْ كَذِبَ كَذِبٍ كَرِيمٍ (اِسْمٰعِيْلِيْنَ يٰ سُرُوْرُ كَاذِبٌ جَرِيْرٌ هُوَ سَيُجَاوِزُ
 يَمِيْنُ قَوْمٍ يٰ بَنِي اِسْرٰءِيْلَ وَرُوْحُكُمْ وَاْمَا هُمْ بِضَالِّيْنَ يٰ
 جِيْ ۙ هُوَ الَّذِيْ تَوَلَّاهُمْ مِنْ دُوْنِ اِسْحٰقَ عَلِيْهِ السَّلَامُ وَوَاٰلِهٖ وَسَلَّمَ اَسْمٰعِيْلِيْنَ يٰ سُرُوْرُ كَاذِبٌ جَرِيْرٌ هُوَ سَيُجَاوِزُ
 يَمِيْنُ قَوْمٍ يٰ بَنِي اِسْرٰءِيْلَ وَرُوْحُكُمْ وَاْمَا هُمْ بِضَالِّيْنَ يٰ جِيْ ۙ هُوَ الَّذِيْ تَوَلَّاهُمْ مِنْ دُوْنِ اِسْحٰقَ عَلِيْهِ السَّلَامُ وَوَاٰلِهٖ وَسَلَّمَ اَسْمٰعِيْلِيْنَ

مِنْ أَتَىٰ الْإِنسَانَ إِذَا دَانَ اللَّهُ وَنَتَحَدَّثُونَ مَا بَصُرَ لَهُمْ وَلَا يَفْقَهُهُمْ
 اس کا بجز حکم اللہ کے، اور سمجھے ہیں وہ بجز بول فقہائی کرتے الہا اور فائدہ نہ کرتے
 وَلَقَدْ عَلِمُوا لِسَانَ تَلْوَينَ فِي الْأَخْيَرِ مِنْ تَحْلَاقٍ نَدَّ
 اور خوب جان پکے ہیں کہ جس نے انھیں اُتار دیا وہ تو نہیں اس کے لئے آخرت میں کچھ حصہ،

تکلیف ہے نہ دوسری۔ اور اس میں تسبیح کی مجلس کے بعد غلاباؤں پر فتنے آسمان پر پڑائے گئے ہوں گے، واقعہ اس علم پر مشتمل افعال و بیان انفرادی،

اسکی حقیقت | عزائم کا سرشت میں ہر ایک اور کوکتے میں جس کا سلب ظاہر ہو اور خاص، خواہ وہ سبب منور ہو جیسے خاص خاص کمالات کا اور، باغیر محسوس چیزوں کا ہو، جیسے جنات و شیطاں کا اور، یا سرزمین میں، قربت خیالیہ کا اور، یا محسوسات کا ہر عنصر و محسوسات غنی ہوں، جیسے مقالمیں کی تکمیل کو بے گئے جیکہ مقالمیں نظروں سے پوشیدہ ہیں، یا داراؤں کا زنجیر کہ وہ دارائیں غنی ہوں، یا نجوم و دستورات کا اثر۔

اسی لئے جاو کی اقسام بہت ہیں، مگر صرف مامی، عوامی، جاو اور انجیلوں کو کہا جاتا ہے جن میں جنات و شیطاں کے عمل کا دخل ہوا، یا وقت یا جگہ یا غلط کامات کا مگر یہ کہ اس وقت غلط کامی ثابت ہے اور قیام و مشاہدہ سے بھی، اور قدیم و جدید غلط کامی اس کو تسلیم کرتے ہیں کہ حرمت و کمالات میں بھی بالخاصہ کچھ تاثیرات ہوتی ہیں، کہیں خاص حرمت یا حکم کو جس خاص قیود میں پڑنے یا گئے طریقوں سے خاص خاص تاثیرات کا مشاہدہ ہوتا ہے، یا ایسی تاثیرات جو کسی انسانی بارے یا انشور و غیروہ اعصاب، یا اس کے جسمانی کمزوری کے ساتھ کچھ دوسری چیزیں شامل کر کے پیدا کی جاتی ہیں جن کو صرف عامی، فزیک یا محسوس کہا جاتا ہے، اور جاو میں شامل ہوتا ہے۔

اور اصطلاح قرآن و سنت میں تحریر یا یہ عربیہ کہ کہا جاتا ہے جس میں شیطاں کی کوکوش کر کے ان کی مدد حاصل کی گئی ہو، یا شیطاں کو اس کرنے کی محنت ضرور میں ہیں، کہیں ایسے مغرضتیں بیان کئے جاتے ہیں جن میں کفر و شرک کے کمالات ہوں اور شیطاں کی مدد کی گئی ہو یا کوکب و نجوم کی عبادت اعتقاد کی گئی ہو، یا جس سے شیطاں خوش ہوتا ہے۔

کہیں ایسے اعمال یا جنات و کمالات کی حالت میں دینا، طہارت سے جہت سلب کرنا، وغیرہ۔

جو طہارت اللہ تعالیٰ کے پاک فرشتوں کی مدد، ان اقوال و افعال سے حاصل کی جاتی ہو، جن کو فرشتے پسند کرتے ہیں مثلاً تقویٰ، پاکیزگی، دینداری، اور پاکیزگی، دینداری و طہارت سے اعتقاد و ذکر اور اور اعمالی بخیر۔

اسی طرح شیطاں کی مدد ایسے اقوال و افعال سے حاصل ہوتی ہے جو شیطاں کو پسند ہیں یا اس لئے صرف ایسے ہی لوگوں کا کامیاب ہوتا ہے جو ان کے اور دوسری بھی، یا ان کو اللہ کے نام سے دور رہیں، جبکہ کاموں کے مدد ہوں، عرصہ میں، یا مصلحت میں یہ کام کرتی ہیں تو موزن ہوتا ہے، یا فی

شعبہ اور لوگنے یا اچھے جاو کی کے کام یا سرزمین وغیرہ ان کو جاو تحریر کہا جاتا ہے، اور روح انسانی، ہر سر کے اقسام | امام باقر علیہ السلام نے منقولات القرآن میں لکھے ہیں کہ ہر حرکت مختلف نہیں ہیں، ایک قسم تحریر منظر بند ہی اور تفصیل ہوتی ہے، ہر اس کی کوئی حقیقت واقعہ نہیں، جیسے منظر شہیدہ یا راجح یا فتح جلائی سے ایسے کام کہنے ہیں کہ عام لوگوں کی نظر میں اس کو دیکھنے سے قاصر رہتی ہیں یا قوت یا تاثیر سرزمین وغیرہ کے ذریعہ کسی کے ذریعہ پر ایسا اثر ڈالا جاتا ہے کہ وہ ایک جیسے نہ آسکھوں سے دیکھتے اور محسوس کرتا ہے، مگر اس کی کوئی حقیقت واقعہ نہیں ہوتی، کہیں یہ کام شیطاں کی کھلاش سے بھی ہو سکتا ہے، کہ کوکوش یا آنکھوں اور دماغ پر ایسا اثر ڈالا جاتا ہے جس سے وہ ایک فیصلی ہو کر حقیقت سمجھنے لگے، فرق انجیل میں سرسروانی ساروں کے جس سرسروا کر کہہ رہے ہیں، یہ قسم کا سر خوار، جیسا کہ ارشاد ہے:

مَنْ يَشْرِكْ بِاللَّهِ فَقَدْ افْتَرَىٰ كَذِبًا عَظِيمًا
الَّذِينَ يَدْعُونَ مِن دُونِهِ يَدْعُونَ
مَنْ يَدْعُ مَعَ اللَّهِ فَادْعُوا اللَّهَ حَزَنًا
الَّذِينَ يَدْعُونَ مَعَ اللَّهِ فَادْعُوا اللَّهَ حَزَنًا

اس میں، بدعتی کے لفظ سے یہ بتا دیا گیا کہ یہ شیطاں اور لا شیطاں جو ساروں نے ڈالی تھیں وہ شیطاں ہی، اور انھوں نے کوئی حرکت کی، بلکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قربت بخیر و شرف پر ان کے دور کرنے والے سانپ سمجھنے لگی۔

دوسری قسم اس طرح کی تفصیل اور نظر بند ہی ہے جو بعض اوقات شیطاں کے ر ہوتی ہو، جو قرآن مجید میں اس کے ارشاد سے معلوم ہوتی،

هَلْ أَتَىٰ عَلَى الْغَافِلِينَ
أَلَمْ يَجْعَلْ لَّكَ فِتْنَةً
الْبَشَرِ وَلَئِنَّ جَهَنَّمَ لَمَوْجِدَةٌ
بِأَنْفُسِهِمْ يُحَرِّقُونَ

نیز دوسری جگہ ارشاد ہے:

وَلَقَدْ أَتَىٰ عَلَى الْبَاقِينَ
لَقَدْ أَتَىٰ عَلَى الْبَاقِينَ
مَنْ يَدْعُ مَعَ اللَّهِ فَادْعُوا اللَّهَ حَزَنًا
الَّذِينَ يَدْعُونَ مَعَ اللَّهِ فَادْعُوا اللَّهَ حَزَنًا

جس میں ہم پر کچھ تحریر کر دیا ہے کہ ایک نے کی حقیقت یہی دہل جانے، جیسے کسی انسان یا جاندار کو چھو کر یا جاندار یا دماغ، امام باقر علیہ السلام، اور کچھ اس طریقہ حضرات نے اس سے انکار کیا ہے کہ تحریر کے واسطے کسی چیز کی حقیقت دہل جاتے، بلکہ کچھ کچھ صرف تفصیل یا اور نظر بند

ہیں بگ ہو سکتی، معزز کا بھی یہی قول ہے، مگر جو مردمان کی حقیقت یہ ہے کہ انقلاب اعلیٰ میں
ان کی عقل مضبوط ہے و شریعہ، مثلاً کوئی جسم چتریں جانتے، بالکے نور سے دوسری نور کی
طرف منتقل ہو جاتے۔

اور فلاسفہ کا جو یہ قول مشہور ہے کہ انقلاب خائف نہیں ہواں کی مولد خائف سے محال،
مکن، واجب کی حقیقت میں کہ ان میں انقلاب عقلاً ممکن نہیں، کو کوئی محال ممکن بن جاتے، یا
کوئی ممکن محال بن جاتے۔

اور قرآن و حدیث میں سورہی ساحروں کے معجزہ کو جو عقل خسار دیا ہے اس سے یہ لازم نہیں آتا
کہ ہر معجزہ عقل ہی سے ہوا ہے، تاہم اگر معجزہ اور بعض حضرات نے محسوس کیا انقلاب حقیقت
کے جواز پر حضرت کبار کی اس حدیث سے بھی استدلال کیا ہے جو مرقا، امام بالغ میں
برہانیت متفقہ پر مذکور ہے:

ولا کلمات اولہا لعلہا
البدو حسانہا

مگر حبانہ کے کلمات اولہا ہی طرہ پر جو قوت بنانے کے معنی میں بھی ہو سکتا ہے، مگر ضرورت
حقیقت کے معجزہ کو اگر نماز اور ایسا کچھ نہیں، اس لئے حقیقت اور نظاہری معلوم اس کا یہی ہے کہ اگر میں
یہ کلمات، روزانہ پابندی سے سن چڑھتا تو سہولت سے جادو کر کے جو کچھ چاہتا رہتا۔

اس سے کہ باہر ثابت ہوئی، ازل سے کہ جس کے ذریعہ انسان کو گدھا بنا دینے کا امکان ہو،
دوسرے یہ کہ کلمات وہ چارہ کر کے جسے ان کی تائید ہے کہ کوئی جادو و اثر نہیں کر سکتا، حضرت کبار جہاں
سے جب ان کوئی لے چکا وہ کلمات کہتے تو کب سے یہ کلمات نکلتے،

اَللّٰهُمَّ جَدِّدْ لِيْ فِىْ كُلِّ حَزَنٍ اَمْرًا
اَللّٰهُمَّ جَدِّدْ لِيْ فِىْ كُلِّ حَزَنٍ اَمْرًا
اَللّٰهُمَّ جَدِّدْ لِيْ فِىْ كُلِّ حَزَنٍ اَمْرًا
اَللّٰهُمَّ جَدِّدْ لِيْ فِىْ كُلِّ حَزَنٍ اَمْرًا
اَللّٰهُمَّ جَدِّدْ لِيْ فِىْ كُلِّ حَزَنٍ اَمْرًا
اَللّٰهُمَّ جَدِّدْ لِيْ فِىْ كُلِّ حَزَنٍ اَمْرًا
اَللّٰهُمَّ جَدِّدْ لِيْ فِىْ كُلِّ حَزَنٍ اَمْرًا
اَللّٰهُمَّ جَدِّدْ لِيْ فِىْ كُلِّ حَزَنٍ اَمْرًا
اَللّٰهُمَّ جَدِّدْ لِيْ فِىْ كُلِّ حَزَنٍ اَمْرًا
اَللّٰهُمَّ جَدِّدْ لِيْ فِىْ كُلِّ حَزَنٍ اَمْرًا

میں اللہ کی ہر چیز کو تازہ کر دے اور میں اس سے
کلی نہیں اور نہ پانچ پانچ کیوں اس کے کلمات
اللہ کی ہے کہ ان کی کلمات چاہتا ہے
پندرہ کلمات اور پانچ کلمات اور پانچ کلمات کے
نام لے کر جس کی کوئی نہیں جانتا ہے، اور
ہیں کہ جس کا نام پانچ کلمات اور پانچ کلمات کے
کوئی نہ خالی ہے کیا، اللہ اور جادو! اور
چاہتا ہے۔

بھلا ہونے میں فرق، اس طرح انبیاء علیہم السلام کے معجزات بالاولیٰ کی کرامات سے الگ واقعات
مشاہدہ میں آتے ہیں جو عادت نہیں ہو سکتے، اس لئے ان کو خرقی عادت کہا جاتا ہے، بظاہر محسوس اور
جائزہ بھی ایسے ہی، تاہم مشاہدہ میں آتے ہیں، بعض جاہلوں کو ان دونوں میں امتیاز
بھی ہو چکا ہے، بلکہ اس کی وجہ سے وہ جادو گرد کی تقلید و تکریم کرنے لگتے ہیں، اس لئے دونوں کا
فرق بیان کرنا ضروری ہے۔

سو یہ فرق ایک دراصل حقیقت کے اعتبار سے، جو اور ایک نظاہری اعتبار سے، مثلاً بارے،
حقیقت کا فرق تو کچھ عذر و جادو سے جو ہر چیز مشاہدہ میں آتی ہے وہ ان کے حساب سے الگ کر لی چیز
نہیں، فرق صرف اسباب کے طور و خطا کا ہے، چنانچہ اسباب ظاہر ہوتے ہیں، وہ آثار ان اسباب
کی طرف متوجہ کئے جاتے ہیں، اور کوئی تعجب کی چیز نہیں بھی جاتی، لیکن چنانچہ اسباب غنی
ہوں تو وہ تعجب کی چیز ہوتی ہے، اور عام اسباب کے نہ بننے کی وجہ سے اس کو خرقی عادت
کہہ گئے ہیں، بالکل وہ حقیقت عام جادو اور کی طرح کسی بھی حیوانات کے اثر سے ہوتی ہے،
ایک خط مشرقی بعد سے آج کا گدھا اور اچانک سامنے آکر گر گیا، تو دیکھنے والے اس کو خرقی عادت
کہیں گے، مادہ کائنات و مشاہدہ کو اپنے اعمال و افعال کی فوٹو دہرائی گئی ہے، ان کا ذریعہ معلوم ہو
تو ہر کوئی خرقی عادت نہیں رہتا، خلاصہ یہ ہے کہ محسوس ظاہر ہونے والے تمام آثار اسباب طبعیہ
کے عاقبت ہوتے ہیں، مگر اسباب کے معنی ہونے کے سبب ان کو کتنا لطیف عادت کہا جاتا ہے
فلان مجبور ہے کہ وہ بد واسطہ فعل میں تعالیٰ کا ہرگز ہے، اس میں اسباب طبعیہ کا کوئی دخل
نہیں ہوتا، حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لئے تردد کی آگ کہ حق تعالیٰ نے فرمایا کہ ابراہیم
علیہ السلام کے لئے عذری ہو جاتے، مگر شمشاد بھی انسانی نہ ہو جس سے تخلیق پہنچے، بلکہ جس سے
سوانح مائل ہوا، اس کی بات سے آگے شہری ہو گئی۔

تو کبھی جس کو کچھ بدوائیں سے متاثر کر کے آگ سے اندر چلے جاتے ہیں، وہ مجبور
نہیں بلکہ وہ ان کا اثر ہے، بدوائیں بھی ملنے سے لوگوں کو مصداق خرقی عادت کا ہو جاتا ہے۔
یہاں کہ مجبور، بلکہ راست حق تعالیٰ کا فعل ہوتا ہے، خود قرآن عزیز کی تصریح سے ثابت
ہے، بلکہ شامہ دیا،

وَمَا تَشَاءُ اَوْ اِذْ تَقَرَّبُ وَاِذْ تَقَرَّبُ
اَللّٰهُمَّ جَدِّدْ لِيْ فِىْ كُلِّ حَزَنٍ اَمْرًا

مگر یہ کہ کوئی شخص جو آپ نے چاہا،
وہ وقت اپنے نہیں بلکہ اللہ کے ہے،
مادر ہے کہ ایک شمع ٹانگ اور لکڑی کے سامنے بھی آ کر محسوس تک پہنچ جاتا اس میں کچھ عمل کو کوئی
دخل نہیں، یہ خاص حق تعالیٰ کا فعل ہے، یہ معجزہ و عذر میں بھی آتا تھا کہ آپ نے ایک شمع ٹانگ

خاصہ یہ کہ محسوس کی چیزیں ممکن الوقت ہیں۔

اس کو کسی ناجائز مقصد کے لئے استعمال نہ کیا جائے۔

مسئلہ اگر قرآن و حدیث کے کامائے نبی سے کام لیا جائے مگر ناجائز مقصد کے لئے استعمال کرے تو وہ بھی ناجائز نہیں مگر اس کی ضرورت پڑنے کے لئے کوئی حق کہا جائے یا طلبہ پر واجب ہے اگرچہ طلبہ اسرارِ آئینہ کی کتاب کا پورے میں جو قدرتی کامائے نبی اور

بَآيَها الَّذِيْنَ اٰمَنُوا لَا تَقُولُوْا اَرَا عَادُوْكُمْ لَوْ اَنَّظَرْتُمْ بَاوِا مَعْمُوْا

اے ایمان والو تم جو کچھ کہنا اور کہہ اظہار کرتے ہو

وَلَيْكُفْرِيْنَ عَدَاۤءُ الْاِيْمِ

اور کافروں کے خلاف ہے درونگ

خلاصہ تفسیر ایسی بیہودوں نے ایک شرارت ایجاد کر کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور میں اگر لفظ واعنا سے آپ کو خطاب کرتے ہیں کہ میں ان کی عزت زان میں ایک بد دعا ہے اور وہ اسی نسبت سے کہتے تھے، عزت زان کے معنی یہاں مصلحت کی رعایت فرمائیے کے ہیں، اس لئے عربی والی اس شرارت کو ہم کہہ سکتے تھے، اور اس اچھے معنی کے قصد سے اپنے مسلمان بھی حضور کو اس کلمہ سے خطاب کرنے لگے، اس سے ان شریروں کو اور گناہ پیش ملی، آپ میں پتھر پھینکتے تھے، کہ اب تک قرآن کو خفیہ ہی پڑھتے تھے، اب ظاہر کیجئے کہ عربی ایسی بات کہ ان کو مسلمان بھی اس میں شریک ہو گئے، حق تعالیٰ نے اس غیبا نش کے قطع کرنے کو مسلمانوں کو حکم دیا کہ اے ایمان والو تم لفظ واعنا سے گناہ کرنا اور یہی کلمہ پڑھنا اگر کوئی کہ اس لفظ کے معنی اور اعنا کے معنی عربی زبان میں ایک ہی ہیں، اعنا کہنے میں بیہودوں کی شرارت پائی ہے، اس لئے اس کو ترک کر کے دوسرا لفظ استعمال کرو، اور اس حکم کو بھی ملے، کتبہ نبوی اور یاد رکھو، اور دین کا قول کو توڑنا سے دور رکھو، جو دینی کی وجہ سے اصل اللہ علیہ وسلم کی شان میں ایسی مستفیاضی اور ہوجاؤ گی کے ساتھ کرتے ہیں۔

مسئلہ اس آیت سے یہ بات معلوم ہوئی کہ اگر آپ کسی جائز فعل سے دوسروں کو ناجائز کاموں کی گنجائش ملے معلوم ہو تو یہ ناجائز فعل بھی اس کے لئے جائز نہیں رہتا، جیسے اگر کوئی عام کے ناجائز فعل سے جائز کو مغلطہ میں پڑنے اور ناجائز کاموں میں مبتلا ہونے کا خطرہ ہو تو وہ غلط ہے کہ نے ناجائز فعل میں متوجہ ہو جائے گا، بیشک یہ فعل شرک یا حرام اور یا غیر شرعی میں سے نہ ہو، اس کی مثالیں مشرکانی رست میں ہیں، اس کی ایک دلیل وہ حدیث ہے جس میں ارشاد

کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تبت اللہ کی بیہودہ قریش نے فرمانِ نبایت میں کی تھی اس میں کوئی چیز نہ تھی، بلکہ یہی ہے غلط کر دی ہیں، یہاں پر اس کا منہ بند کر کے کہہ کرنا ناجائز ہے، اس کے مطابق بتاؤ، لیکن اس سے ناواقف عوام کے فتنہ میں مبتلا ہو جانے کا خطرہ ہے اس لئے انھیں ایسا نہیں کرنا دیا، احکام کا اصول ان کی اصلاح میں سزا دینے سے نہیں کرنا دیا، جو یہی فقہاء کے نزدیک مشرب ہے، خصوصاً حضرات خاں خاں کا زیادہ اہتمام کرتے ہیں قریشی،

مَا جُوْدَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَلَا الَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ

وہ ہیں جو بتائیں اور ان کو جو قریشی کتاب میں اور نہ مشرکوں میں اس بات کو

يُؤْتُوْنَ عَلَيْهِمْ مِنْ خَلِيْفَتَيْنِ تَرٰ بُكْرًا وَاللّٰهُ يَخْصُصُ بِيْرَحْمَتِهٖ

کہ ان سے تم پر کوئی تک بات نہیں دے گی، اور اللہ خاص کر رحمت ہے اپنی رحمت

مَنْ يَّسْتَعِذْ بِاللّٰهِ وَالْقَوْلُ الْعَظِيْمُ

کے ساتھ جو کہ ہے اور اللہ بڑے فضل والا ہے۔

خلاصہ تفسیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بیہودہ کا پورا کلمہ اور آپ کی نبایت میں بیان کیا گیا، اب اس آیت میں بیہودہ کا پورا کلمہ مسلمانوں کے ساتھ بیان کیا جا رہا ہے کہ اپنے بیہودہ بعض مسلمانوں سے کہنے لگے کہ ہذا میری سے تمہارے خیر خواہ ہیں اور ہذا جان سے پسند کرتے ہیں کہ تم کو دینی احکام دے دے، دینی احکام سے بہر نہایت ہوں تو ہم بھی ان کو قبول کریں، مگر کیا کیا جائے کہ تمہارا دین ہمارے دین سے اچھا ثابت نہیں ہوا، حق تعالیٰ اس وحی پر بھی ان کی تکذیب فرمائے، بلکہ اگر وہ اپنی پسند نہیں کرتے کہ اگر وہ خواہ ان اپنی کتاب میں سے وہاں اور خواہ بہر کہ میں سے، اس امر کو کہ تم کو تمہارے پروردگار کی طرف سے کسی طرح کی پیروی دینی کی سبب اور ان کے قصد سے کچھ بھی نہیں ہوگا، مگر اللہ تم اپنی رحمت اور نبایت کے ساتھ جسکو منظور ہوتا ہے خصوصاً فرماتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ بڑے فضل کرنے والے ہیں۔

خاتمہ ۱۱۔ بیہودوں کے دعوے تھے، ازل میں نبوت کا بہتر ہونا اسلام سے، دوسروں کا خیر اور ہونا، قوفوں دعوے کو تو یہ ثابت نہیں کر کے، فرمے دعوے سے کیا ہوتا ہے اور پھر بد عوی سے بھی فضول کی بات، کیونکہ جب ناح آتا ہے تو منوع ترک کر دیا جاتا ہے، انھیں طے انھیں کے فرق پر موقوف نہیں، بلکہ اگر وہ ظاہر اور کھلی بات ہوتے اس کے اسباب

شہرت اور کتاب کے بہت سے احکام کو ملحوظ کر کے نئے احکام جاری کئے، اور اسی سلسلہ میں ایک ہی بہت و شہرت میں آیا، ہزار بار کہ جو عرصہ تک ایک حکم جاری رہا، پھر نشانہ سے حکومت خوارزمی اس کو بدل کر دوسرا حکم نافذ کر دیا گیا، صحیح مسلم کی روایت میں ہے:

”فمن یسئو فی موتی یومئذ یحییٰ“

میں نے اس کو موتی کی بہت چھانسی تھی، لیکن فقط اظہارِ حقائق کے لئے۔

مسلم

میں نے اس کو موتی دیکھا اور وہ زندہ ہو گیا۔

چاہا دشتِ جہالت | اللہ کچھ جاہل یہودیوں نے اپنی جہالت سے احکامِ ہدایت کے نسخہ کو زبردستی اس کا لٹیر کر رکھا تھا۔ ان لوگوں نے جو حق سنا کہ جسے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر زبانِ طعن و دواس کی، اسی کے جواب میں یہ آیات نازل ہوئیں (ابن جریر) ابھی ذکر فرمادیا:

مسلمانوں میں سے فسق و معصرت کے بعض لوگوں نے شاید ان کا بغیر کسی طعن سے
 بچنے کی بداد خیالی کرنا کہ ان کا تہیہ میں کچھ ہونے کا امکان تو ہے، کوئی اور اس امکان کے لئے مانع
 نہیں، ایسی ہی فسق و معصرت میں کچھ کا وقوع کہیں نہیں ہوا، نہ کوئی آیت مانع ہے، نہ مندرجہ
 یہ قول ابومسلم اصفہانی کی طرف منسوب کیا جاتا ہے، جس پر علما باہمت نے ہمیشہ زور دیکر فرمایا،
 تعصیب و روج العالی میں ہے۔

تہذیب اور شریعت کا نسخہ کے جزا و موافقہ
دونوں پر اتفاق ہے، صرف یہ ردِ دلیل ہے
جزا سے سوئے کہ ان کا نسخہ کا نسخہ کیا ہو
اسلام اس دنیا کی ترقی و ترقی کا نسخہ ہے، وہ
کچھ کہہ کر نسخہ کا نسخہ نہیں کہیں کہیں
کس دن ہوا نہیں؟

اور امام قرظی نے اپنی تفسیر میں فرمایا
معرفۃ حق، الباب اکیس، و
فاشحة عظيمة لا تستغنى عن
معرفته العلماء ولا يتجزأ الا
الجهلة الاقياد، (دری مشہد)

فسترطی نے اس جگہ ایک واقعہ حضرت علیؓ کے ساتھ دیکھا کا بھی نقل کیا ہے کہ ایک مرتبہ وہ مسجد میں نشرِ شیعہ لانے کے قائل کو دیکھ کر کہہ رہا تھا، آپ کے دلوں کو تو میں سے پتہ چاہا کہ کیا آپ کے دلوں

نے کہا کہ وہ خط نصیر سے کر رہا ہے، کہہ نے فرمایا نہیں، یہ کوئی خط وصیت ہے، نہیں کرنا، کیونکہ
 کہنا چاہتا ہے کہ میں فلاں بن فلاں ہوں سوچا ہوا، جس شخص کو ملو کہ اس پر کیا حکم قرآن و حدیث
 کے کا مناسطہ صحیح احکام کر جائے جو اس نے کہا کہ نہیں میں نہیں جانتا، حضرت علی کریم اللہ وجہہ
 نے فرمایا کہ ہمارے حصے میں آج ہمارے ہمیں یہاں خط دو۔

فسر ان وقت میں لُح کے وجود کو نوع کے منطبق سمجھا گیا ہے جس کے اسے آثار و اقوال پر مبنی ہیں جن کو کائنات کا شکل ہے۔ فسر ان چیز، ان کی شکل و درغور و درغور میں اسناد تو یہ صوبہ کے ساتھ بھی بہت وراثت مذکور میں اور وراثت حیدر کا تو شمار نہیں۔

اسی لئے ذات میں پسند ہمیشہ اجتماعی رہا ہے، صرف ابوسلمہ اصحابی اور چند حضرات نے وقوع نوح کا انکار کیا ہے، جن پر امام ربانیؒ نے تفسیر کبیر میں شرح و بسط کے ساتھ رد کیا ہے۔ نوح کے منہم میں مقتدیہ و منافقہ پر چڑھنے کے مصطلحات یعنی نسب بدلی جھگے ہیں، انورہ نسب بدلی کی پہلے ہی میں مسنون جس طرح ایک حکم کو بالکل بد منسوخ کر کے اس کی جگہ دوسرا حکم لائے ہیں ہے جیسے بیت المقدس کے بجائے بیت اللہ کو قبلہ بنا دینا، اسی طرح کسی مطلق امام حکم میں کسی قید و شرط کو خیر عبادت بھی ایک قسم کی تبدیلی ہے، اسلاف امت نے نوح کو کسی حکم میں کسی قید و شرط لڑایا ہے، جس میں کسی حکم کی پوری تبدیلی نہیں، داخل ہے، اور جزوی تبدیلی کی قید شرط ہے، اور ظور کو بھی اس میں شامل ہے، اسی لئے مقتدیہ میں حضرات کے نزدیک قرآنی میں آیات منسوخہ بالوجہ شاکر کی گئی ہیں۔

حضرات مناخری نے نہ صرف انہیں تبدیلی کا نام لیخ رکھا ہے، جن کی پہلے عمر کے ساتھ بچوں کی طرح لطیفہ ہوئے، ظاہر ہے کہ اس اصطلاح کے مطابق آپات منور نوک کے تعداد بہت کثرت ہائے گی اس کا لازمی اثر ہر عساکر حقد میں نے تقریباً پانچ سو آیات قرآنی میں فیض ثابت کیا تھا، میں میں ہر معمولی سی تبدیلی قید و شرط ہاں ہستنا، وغیرہ کو بھی ثابت کیا تھا اور حضرت مناخری میں اسلام مدیوٹی ہائے صرف ہیں، آج کل کے منور و شاد و دلان کے بعد حضرت شاد و دلانہ محمد اشرف علی ہیں ان میں بھی تطہیر کی صورت پیدا کر کے صرف پانچ آیتوں کو منور و شاد فرمایا ہے، جن میں کوئی تطہیر لطیفہ تاویل مجید کے نہیں ہو سکتی، یا اس طرح لکھا ہے نفسی و کراہکام میں اصل جتنا بھم ہے، فیض طوفان اصل دواس نے جہاں کہتے کے معمول چاہوئے کی کوئی توجیہ ہو سکتی ہے، اس میں بلا ضرورت منور و شاد درست نہیں۔

لیکن اس تغلیل کا یہ منشا، ہرگز نہیں ہو سکتا کہ مسئلہ نسخ اسلام یا قرآن پر کوئی محجب ہو جس کے لڑائی کی کوشش چودہ سو برس تک ملحق رہی، آخری اکشاف حضرت شاہ ولی اللہ کا ہوا

عَلَىٰ كُلِّ نَفْسٍ مِّنْهُم مَّا رَزَقْنَاهَا حِطَّةً ۚ وَاتَّقُوا اللَّهَ ۚ إِنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ ۝

ہر چیز پر قادر ہے ۔ اور تمام رکوع نماز اور دینے دیو رکوع اور جو کچھ
فَقَدْ مَوَّالًا لِّنَفْسِكُمْ مِّنْ خَيْرٍ مِّمَّا كُنْتُمْ لَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ
آگے پیچھے دے اپنے واسطہ بھلائی پادشہ اس کو اللہ کے پاس ، بے شک اللہ

بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ۝

جو کچھ تم کرتے ہو سب دیکھتا ہے ۔

خلاصہ تفسیر | راہیں پیرو شہ روزِ قیامت تہذیبوں سے دوسری اور غیر خواہی کے لیے

ہیں مسلمانوں کو اسلام سے پھرنے کی کوشش نہ کیا کرتے تھے اور وہاں
اکامی کے اپنی کوس سے باز آتے تھے ، حق تعالیٰ نے مسلمانوں کو اس پر مہذب فرمایا کہ اپنی
سبب زمین پروردگار میں سے بہتر ہے دل سے یہ چاہتے ہیں کہ تم کو تمنا ہے کہ ان سے کچھ پیچھے
آواز کرنا نہیں اور وہ یہ چاہنا کچھ غیر غرض سے نہیں ایسا کہ وہ اللہ اور تم ہیں بلکہ انھیں حمد کی

وجہ سے جو کہ تمنا کی جانب سے کسی امر کے سبب پیدا نہیں ہوا ، بلکہ خود ان کے دلوں ہی سے
پرورش ہوتا ہے ، اور ہم بھی نہیں کہان کو حق واضح نہ ہوا ہو ، بلکہ حق واضح ہوتے ہی چھوڑ دیا
ہے ، اب اس پر مسلمانوں کو ان پر غصہ آنے کا عمل تھا ، اس نے ارشاد فرمایا کہ تم پر اس تو

سادہ کر دادر و گدگر جب تک حق تعالیٰ اس معاملہ سے متعلق ہے ، اپنے حکم رکھنا اور قانون ہے ، یہی
داشادہ بتلاؤ کہ ان کی کوشش کرتا کہ اس کا علاج قانون انتظام سے ، اس میں حق تعالیٰ وحسب سے ہم
ہلکے کرنے والے ہیں ، اس پر مسلمانوں کو اپنا ضعف اور ان کی قوت دیکھ کر اس قانون کے اجراء
کے متعلق تعجب ہو سکتا تھا ، اس نے ارشاد فرمایا کہ تم تعجب کیوں کرتے ہو کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز

وخواہ وہ معمولی پرخواہ عجیب ہو قادر ہیں ، اور دوسرے صورت ، نماز دینا یا بندگی سے بڑے ہمارے
اور ان پر رکوع فرض ہے ، رکوع دیتے ہمارے ، اور جب وہ قانون آجاتے ہیں ان اعمال صالحہ کے
اس کا بھی اعطاء کر لیتا ، اور یہ دیکھ کر جب تک چاہا کہ ہم نے ان سے صرف نماز روزے سے کچھ خواہ

ہیں کی دے گی ، نہیں ، بلکہ جو تک کلام بھی اپنی بھلائی کے واسطے دیکھتے رہے ، حق تعالیٰ
کے پاس دیکھ کر ، اس کو جو دیا و پادشہ سلطنت کے پادشہ کیونکہ اللہ تعالیٰ تمنا ہے سب کچھ ہوتے
کاموں کی دیکھ بھال کر دیتے ہیں ان میں کا ایک روزہ بھی ضائع نہ ہوئے پائے گا ،
فَاللَّهُ ، اس وقت کی حالت کا یہی مستحق تھا ، پھر حق تعالیٰ نے اس وعدے کو پورا فرمایا

اور حجاب کی آیات ، نازل ہوئیں ، جس کے بعد پیغمبر کے ساتھ بھی وہ قانون برپا کیا ، اور ان شاء اللہ
لوگوں کے ساتھ حسبِ مشیت ان کے شکوکے کو مٹا دیا ، ورنہ ہمارے پروردگار کا کیا ۔

وَقَالُوا لَن يَكُنَ لَكَ الْبَيْتُ إِلَّا مِنَ الْكَافِرِينَ ۚ قُلْ إِن كَانِ هُوَ دَاوُدَ أَوْ إِبْرَاهِيمَ ۚ

اور کہتے ہیں کہ ہرگز نہ جاری ہے جنت میں عمر جو میں ہے یہودی یا نصرانی ۔

بَلَىٰ ۚ أَمَّا يَتَذَكَّرُ ۚ لَن يَكُنَ لَكَ الْبَيْتُ إِلَّا مِنَ الْكَافِرِينَ ۚ قُلْ إِن كَانِ هُوَ دَاوُدَ أَوْ إِبْرَاهِيمَ ۚ

ہرگز نہیں ، بلکہ حق تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ آئندہ اپنی اگر تم چاہتے ہو ۔

بَلَىٰ ۚ أَمَّا يَتَذَكَّرُ ۚ لَن يَكُنَ لَكَ الْبَيْتُ إِلَّا مِنَ الْكَافِرِينَ ۚ قُلْ إِن كَانِ هُوَ دَاوُدَ أَوْ إِبْرَاهِيمَ ۚ

کہوں نہیں ، میں نے تاج کرنا نہیں ، اللہ اور وہی حکم کرنا ہے ، اور ان کے لیے اللہ تعالیٰ تعجب کے ہیں

وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ۚ وَقَالَتِ الْيَهُودُ ۚ

اور وہ تو یہ کہ ہر آدمی نہ وہ عقلمیں ہوں گے ، اور یہود تو کہتے ہیں کہ

لَيْسَتِ النَّصْرَةُ عَلَىٰ فَرِثٍ ۚ وَقَالَتِ النَّصْرَةُ لَيْسَتِ الْيَهُودُ ۚ

نصرانی نہیں کسی راہ پر اور نصاریٰ کہتے ہیں کہ یہود نہیں کسی راہ

عَلَىٰ شَيْءٍ ۚ وَهُمْ يَمُنُّونَ ۚ أَلَيْسَ لَكَ قَالَ الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ ۚ

ہر آدمی دیکر سب بڑھتے ہیں کتاب اسی طرح کہا ان لوگوں نے جو جاہل ہیں

وَمَثَلُ قَوْلِهِمْ قَالَهُ يَتَذَكَّرُ ۚ لَن يَكُنَ لَكَ الْبَيْتُ إِلَّا مِنَ الْكَافِرِينَ ۚ قُلْ إِن كَانِ هُوَ دَاوُدَ أَوْ إِبْرَاهِيمَ ۚ

انہی کی کس بات اب اللہ حکم کرے گا ان میں قیامت کے دن جس بات میں

يَتَذَكَّرُ ۚ لَن يَكُنَ لَكَ الْبَيْتُ إِلَّا مِنَ الْكَافِرِينَ ۚ

جھڑتے تھے ۔

خلاصہ تفسیر | یہود و مسلمانوں کے لیے ہرگز کوئی نہ جانے ہرگز ہرگز
ان لوگوں کے جو یہودی ہیں اور یہود کا قول ہے ، ایمان لوگوں کے جو نصرانی
ہوں یہ نصاریٰ کا قول ہے ، حق تعالیٰ ان کی توبہ فرماتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں کہ یہ نصرانی ،
دل پیوستہ کی باتیں ہیں اور حقیقت کچھ بھی نہیں ، آپ ان سے کہتے کہ انہی اپنی دلیل کو

دور و دوروں کی فہرست میں داخل ہے، اس کے برے اعمال کی سزا عموماً دنیا ہی میں دی جاتی ہے۔
 ایک آخرت کا وارڈ لکھا ہوا ہے۔ جملہات کا ذکر کے اس پر باطنیوں اور مشنوں کا قانون جاری ہے۔ وہ ایک
 بل کی سزاؤں سے ان کا نام مذاب لکھا نہیں گیا ہے۔ ان کو ایک گنہگار سبب میں پکڑا جائے گا۔
 رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سرشار کر کے اس کی مطلب جو کرنا ہوگا اس کے لئے خود خداوند قادر
 کے لئے جنت ہے۔

دوسری اہم بات مسلمانوں کے سنسزلی اور پریشانی اور فکارت کی ترقی و آرام کی ہے کہ ان کے
 بڑے کام کا اہل خاصہ نہ لکھا ہے۔ ایک عمل کرنے سے دوسرے عمل کے خواص حاصل نہیں ہو سکتے۔ مثلاً
 تجارت کا خاصہ ہر مال میں زیادتی، اور ایک خاصہ ہے بدن کی صحت، اب اگر کوئی شخص تجارت میں
 توری رات لگا دے یا کسی اور اس کے علاج کی طرف توجہ دے تو نقص تجارت کے سبب دور
 بیماری سے غارت نہیں ہو سکتا۔ اس طرح دور اور ایک استعمال کر کے تجارت کا نقصت مال کی زیادتی
 حاصل نہیں کر سکتا۔ فکارت کی ترقی اور مال و دولت کی فراوانی ان کے کام کا نتیجہ نہیں، جیسے مسلمان
 انفس و مریضانی اسلام کا نتیجہ نہیں، بلکہ کفار نے جب آخرت کی فکر چھوڑی اور دنیوی طرح دنیا کے
 مال و دولت اور پیش و آرام کی فکر میں لگ گئے، تجارت، صنعت و ترافع اور حکومت پرست
 کے مفہود استوں کو مستعد کیا، معطر طریقوں سے بچے، تو دنیا میں ترقی حاصل کر لی، اگر وہ بھی ہادری
 طرح صرف اپنے اپنے مذہب کا نام لے کر بچے ہاتھ لے کر دنیوی ترقی کر کے اس کے اصول کے
 مطابق جذبہ جدید فکر نے ان کا فکارت کر مال و دولت کا حکومت کا مانگ دیا تو کیا، پھر ہم یہ
 کہیں سمجھیں کہ بنیاد اسلام اور دینی حرفت نام کا، ہادری سادی فوجیات کے دو دانے کو نہ کھایا
 اسلام و ایمان اگر اکل صحیح اصول پر بھی ہو تو اس کا اصلی خاصہ اور ذخیرہ تجارت و حکومت اور جنت
 کی دائمی صحت ہی دنیا میں مال و دولت کی فراوانی، باطنی آرام کی وسعت، اس کے نتیجہ میں حاصل ہوا
 فریدی نہیں جنگ اس کے لئے اس کے مناسب چند وجہ دی جاتے۔

اور یہ بات قرآن مجید میں ثابت ہے کہ جہاں کہیں اور جہاں کوئی مسلمان تجارت و صنعت و حکومت
 سیاست کے اصول پر حکومت کران پر عمل پیرا ہو جائے، تو وہ بھی ان دنیوی طریق و نتائج کے
 عوام میں رہتا جو اس کا فروعی طور پر ہے۔

اس سے واضح ہو کر دنیا میں ہمارا افلاس و محتاج اور محتاج و محتاج و محتاج ہمارے اسلام کا
 نتیجہ نہیں بلکہ ایک طرف اسلامی اخلاق و اعمال جوڑنے کا اور دوسری طرف ان تمام کاموں سے
 شکر منانے کا نتیجہ ہے جن کے عمل میں لانے سے مال و دولت میں زیادتی ہو کر آتی ہے۔
 انفس سے کہیں جب یہ دہرے والوں کے ساتھ اختلاف کا اتفاق نہیں کیا تو ہم نے اس سے

صرف ان کا کمزور و آخرت سے غفلت اور بے حجابی و بلاغت کی فوسب سیکھ لی، لیکن ان کے وہ
 اعمال و نتیجہ کی وجہ سے دونوں کا مہاماب ان کے لئے پیرا جس مقصد کے لئے کھڑے ہیں اس کے
 پیچھے ان کے کوشش، مہاماب کی حجابی، بات کی پیمانی اور دنیا میں ان کے شرو و سرخ حاصل کرنے کے
 لئے نئے طریقے جو در حقیقت اسلامی کی اصلی تعلیمات میں ہم نے ان کو دیکھ کر بھی اس کی لغت
 اندر کے کوشش کی تو بغیر ہمارے اسلام کا ہے یا ہمارا یا قصور ہے۔

ان کے سنسزلی ان بات نے واضح کر دیا کہ اصل سبب اس کا نام دیکھ لینا کسی نتیجہ
 پر نہیں پہنچا سکتا، جب تک ایمان اور دینی صالح کو نقص مل رہا ہے تو دنیا و دنیا دار کا نام لیتے ہیں۔

وَمِنْ أَطْلَمَ مَنْ مَّنَعَ مَسْجِدَ اللَّهِ أَنْ يُبْنَى كَرَفِينَا أَسْمُهُ وَ

اور اس سے بڑا کمزور ہے جس نے مسجداں کو روک دیا جس کا نام دیا ہے اس کا نام
 مَسْجِدَ اللَّهِ كَرَفِينَا أَسْمُهُ وَ

لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خَيْرٌ وَلَهُمْ فِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيمٌ ۝۱۰

ان کے لئے دنیا میں بہت بات اور ان کے لئے آخرت میں بڑا عذاب ہے اور ان کے لئے
 الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ فَإِنَّمَا تَوَكَّلُوا عَلَى اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ

مشرق اور مغرب میں ملے تم تم کرو وہاں ہی متوجہ ہے اللہ بڑا

وَاللَّهُ عَزِيزٌ ۝۱۱

بہرہ تو سب کا حکم دے کے وقت طرح طرح کے اعتراض کر کے کہ ہم تو
 خلاصہ تفسیر کے دلوں میں مشیت پیدا کرتے تھے، اگر وہ مشیت عام طور پر غلبہ میں لڑ
 کرتے تو ان کا دنیا میں ایک اور ترک نہ ہو سکتا، اور ترک نہ ہونے کا لازمی ہے
 اور اگر یہودی اس طرح سے ترک نماز اور دینی اسباب خصوصاً مسجد نہیں بھی کر سکتے تھے، اور
 دہم کے بعض مسلمان جو افسانہ کے اسلام تھے، اور انسانی ان کے افعال کا انکار بھی نہ کرتے
 تھے مگر وہ بعضی دہم کی زمانے میں یہود مشام پر چڑھ گئے تھے، وطن و قتال میں ہوا اور اس
 وقت بعض جہلاء کے ہاتھ سے مسجد بیت المقدس کی بے عزتی بھی ہوئی اور باطنی کی وجہ سے اس میں

دور و مسکن کی فرست میں داخل ہے، اس کے بڑے اعمال کی سزا عموماً دنیا ہی میں دی جاتی ہے۔
 ان کا آخرت کا وارڈ لکھا ہوا ہے۔ جملہات کا ذکر کے اس پر باطنیوں اور مشنوں کا قانون جاری ہے۔ وہ ان کی
 ہل چل سناؤں سے ان کا نام مذہب لکھا نہیں جاتا، ان کو ایک گنہ گار نہ سمجھا جائے گا۔
 رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سرشار کرنا کرنا ہی مطلب ہے کہ ان کو انہوں نے خدایا داد وافر
 کے لئے جنت ہے۔

دوسری اہم بات مسلمانوں کے سنسزلی اور پریشانی اور فکارت کی ترقی و آرام کی ہے کہ انہوں نے
 بڑی کامیابی کا خاصہ نکتہ ہے۔ ایک عمل کرنے سے دوسرے عمل کے خواص حاصل نہیں ہو سکتے، مثلاً
 نماز کا خاصہ بر مال میں زیادتی، اور ان کا خاصہ ہے بدن کی صحت، اب اگر کوئی شخص نماز میں
 توری رات لگا کر بیٹھا رہے اور اس کے علاج کی طرف توجہ نہ دے تو بعض تجارت کے سبب در
 بیماری سے غارت نہیں ہو سکتا، اس طرح دروازہ کا استعمال کر کے تجارت کا فائدہ مال کی زیادتی
 حاصل نہیں کر سکتا۔ فکارت کی ترقی اور مال و دولت کی فراوانی ان کے کامیاب نہیں، جیسے مسلمان
 انفس و مریضانی اسلام کا نتیجہ نہیں، بلکہ کفار نے جب آخرت کی فکر چھوڑی اور دنیوی طرح دنیا کے
 مال و دولت اور پیش و آرام کی فکر میں لگ گئے، تجارت، صنعت و زراعت اور حکومت پرست
 کے مفید دستوں کو مستی و مفرط فحش سے بچے، تو دنیا میں ترقی حاصل کر لیں، اگر وہ بھی ہادری
 طرح صرف اپنے اپنے مذہب کا نام لے کر بیٹھ جائے تو دنیوی ترقی کے لئے اس کے اصول کے
 مطابق ہتھ دھبہ دھرتے تو ان کا کمزور کر مال و دولت کا حکومت کا مانگ نہ بنوایا، پھر ہم یہ
 کہتے سمجھ لیں کہ بنیاد اسلام اور وہ بھی صرف نام کا، ہادری ساری فوجات کے دو دانے کو نہ کھایا
 اسلام و ایمان اگر اکل صحیح اصول پر بھی ہو تو اس کا اصلی خاصہ اور ذخیرہ تجارت و دولت
 کی دائمی صحت ہی دنیا میں مال و دولت کی فراوانی، باطنی آرام کی وسعت، اس کے نتیجہ میں حاصل ہوا
 فریدی نہیں جنگ اس کے لئے اس کے مناسب چند وجہ دی جاتے۔

اور یہ بات قرآن مجید میں ثابت ہے کہ جہاں کہیں اور جب کوئی مسلمان تجارت و صنعت و حکومت
 سیاست کے اصول پر چلے گا تو یہ کامیاب ہو جائے گا۔ یہ تو دنیوی مال و دنیوی تجارت و دنیا کے
 عوام میں ہوتا ہے جو اس کا فروعی طور پر ہے۔

اس سے واضح ہو کر دنیا میں ہمارا افلاس و محتاجت اور محتاجت و محتاجت ہمارے اسلام کا
 نتیجہ نہیں بلکہ ایک طرف اسلامی اخلاق و اعمال جوڑنے کا اور دوسری طرف ان تمام کاموں سے
 شکر منانے کا نتیجہ ہے جن کے عمل میں لانے سے مال و دولت میں زیادتی ہو کر آتی ہے۔

افسوس ہے کہ ہمیں جب یہ دہرے والوں کے ساتھ اختلاف کا اتفاق نہیں آیا تو ہم نے اس سے

صرف ان کا کمزور و آخرت سے غفلت اور بے حجابی و بلاغت کی فوسب سمجھ لی، لیکن ان کے وہ
 اعمال و نتیجہ کی وجہ سے دونوں کا مہماب انہوں نے اپنا جس مقصد کے لئے کھڑے ہوئے ہیں اس کے
 پیچھے ان کے کوشش، مہماب کی حجابی، بات کی سچائی اور دنیا میں انہوں نے شروع حاصل کرنے کے
 لئے نئے طریقے جو دین اسلام ہی کی اصلی تعلیمات میں ہم نے ان کو دیکھ کر بھی اس کی نفی
 اندر کے کوشش کی تو بغیر ہمارے اسلام کا ہے یا ہمارا یا انہوں نے۔

انہوں نے ان بات کے واضح کر دیا کہ اصل سبب اسلیم اور اسلام کا نام دیکھ لیا کسی نتیجہ
 پر نہیں پہنچا سکتا، جب تک ایمان اور دینی صالح کو نقص مل رہا ہے تو دنیا و دنیا دار کا نام دیکھ لیا کسی نتیجہ

وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ مَنَعَ مَسْجِدَ اللَّهِ أَنْ يُذِينَ كَرْفِيْنَا اسْمُهُ وَ

اور اس سے بڑا ظالم کون ہے جس نے مسجد کو ایسا کر دیا جس کا نام اس کا اور

مَسْجِدِي خَرَّبَهُمَا وَذَلِكَ مَا كَانَ لَهُمْ أَنْ يَدْخُلُوهَا الْعَاقِبِينَ

موسطی کہ ان کے احباب نے ہیں، انہوں کو لاق نہیں کہ داخل ہوں ان میں مگر قدرتے ہوئے

لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَلَهُمْ فِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيمٌ ﴿۱۰﴾

ان کے لئے دنیا میں ذلت اور ان کے لئے آخرت میں بڑا عذاب ہے اور انہیں عذاب

الْمُسِيءِ وَالْمَعْيُوبِ فَإِنَّهُمْ كَانُوا أَكْثَرُ فَجَاءَهُمُ اللَّهُ

مشرق اور مغرب میں ملے تم مذکور وہاں ہی متوجہ ہے اللہ بڑا

وَإِنَّ عَذَابَهُ لَشَدِيدٌ ﴿۱۱﴾

یہ اللہ کا عذاب ہے اور اللہ کا عذاب

ظلالہ تفسیر کے دونوں میں مشابہت پیدا کرتے ہیں، اگر وہ مشابہت عام طور پر غلوپ میں لڑ

کرتے تو ان کا انہیں ایک اور رسالت اور ترک نماز، اور ترک نماز سے مسجد کی دہرائی لازم ہے

و اگر وہ یہودی اس طرح سے ترک نماز اور دینی اسباب خصوصاً مسجد نہیں بھی کر سکتا تھے، اور

روم کے بعض مسلمانوں جو اسلام تھے، اور انسانی ان کے افعال کا انکار بھی نہ کرتے

تھے مگر وہ نصرانی مذہب کی زمانے میں یہود مشابہت چھوڑ گئے تھے، وطن و قاتل بھی ہو یا دوس

وقت بعض جہلاء کے ہاتھ سے مسجد نبین القدس کی بے عزتی بھی ہوئی اور باطنی کی وجہ سے اس میں

مناز و طہر کا پتہ ہمیں نہ ہوا اس طرح ہر نصیحت کے اسلاف ترک نماز اور پرائیویس کے نالی ہوئے اور نصیحتیں بوجہ عدم افکار کا انکار اہم ہو گیا، اس پر شاہ کا نام چھٹیں صفحہ اور صفحہ دہائی کو ختم کیا اور ناگوار نہ تھا کہ اس میں بہبودی کی تبدیلی ہوئی تھی، اور یہ بہبود سے حلاوت رکھتے تھے۔ اور جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ سے پہلے جب مکہ معظمہ میں داخل ہو کر جو کہ علوم کا طواف اور نماز اور سفر مانی جاہلی تو مشرک پر یہ کہنے کو نہ جانے وہاں کیا تک کہ آپ اس سال وہاں نشر لائے گئے، تو اس طرح پیشہ مشرک بھی میں بہبود کر ام کی دریافت میں کو نشان ہوئے، اس میں کوئی حقانی نے سب سے عزم سے اس کی قیادت اور برائی ظاہر نہ فرمائی، میں نے اور اس شخص سے نہ بارہ اور کوئی کلام جو گا جو خدا تعالیٰ کی سب سے بڑی راہیں مکہ کی مسجد حرام مدینہ کی مسجد نبوت المقدس کی مسجد اور سب مسجدیں آگئیں ان کا کردار اور عادت، کئے جانے سے بندھ کر سے اور ان رسا ہد اسکے اور ان (اور وصل) ہوئے، اسکے بارے میں کوئی شکیں کرے، ان کو کوئی کو نہیں ہے بہت ناگوار دیکھا، جو کراں رسا ہد) میں خدمت میں نہ رکھنا چاہئے تھا، اور لکھ جاتے تو نہایت غفلت و حرمت مشائخ کے جاتے تھے جب دیکھا جو کراں رسا ہد نے فک کا امتحان نہیں تو اس کی چٹنگ حرمت کا بھی سب مل ہو، اس کو غلط فرمایا گیا، ان کو کوئی کو دنیا میں بھی رسوائی نہ سبب، اور ان کو آخرت میں بھی رسوائی غلط ہوگی

دوسرے قصبہ بل قلعہ کے حکیم پر اصرار میں کیا تھا کہ اسلئے اس جہت سے دوسری جہت کی طرف کیوں نہ گئے، اس کا جواب بن قلعہ والے دیتے جوئے فرماتے ہیں، لیکن اور اللہ کی مملوک ہیں وہ سب ہمیں بشرط بھی اور شرط بھی (دارودہ اس کا مکان نہیں)

پس جب وہ ملک میں جس جہت کو چاہیں قصبہ مفر کر دیں، کیونکہ کھنڈ قصبہ میں فلاں مشافہا ہے یہاں کا علاقہ بہت اور آجما ہے غلط ہے، اور حکومت میں جہت سے حاصل ہو سکتی ہے، جس کا حکم وہ ہیں وہی تھیں یہ وہاں کے، ان البتہ اگر مہم کوئی اور غرض داشت جہت خاص کے سامنے مقصد اور غرض نہ ہو، کہ وہ سے اس جہت میں عبادت بخنے کا استفسار فرما سکتا لیکن وہ ذات پاک کسی جہت کے ساتھ مقید و محدود نہیں جب یہ بات ہے، قرآن و کتب میں ہر جہت میں شکر و حمد و ثناء اللہ تعالیٰ کی ذات پاک ایک ایک طرح ہے، کیونکہ اس امتدادی روح میں جہات اور اسباب کو قبول ہیں، اگر صرف کا اسباب ان کی شان کے لائق ہے، ایسی باوجود عبادت و خیر و برے کے ہر جہت میں عبادت کو منقسم اس لئے فرما کہ وہ کامل نہیں ہیں، اگر ہر شے کے مصالح کو نوب جانتے ہیں، چنانچہ ان کے طریق پر تحقیق ہمیں مصالح سے کسی، اس لئے اس کا حکم دینا)

فوجاؤں ۱۔ ویرانی صاف، ہر گوشہ کی گھڑی، فوج و روانی بڑی کی کہ ساری قوتیں
اسلامی سلطنت کی رعایا اور راج گزار بنیں، اور مذہب آخرت کو فخر ہوئے کہ وہ
ظاہر ہوئے ہی اور ویرانی صاف ہر گوشہ کے سبب ہر مذہب اور ہر ملت رشہ ہو جائے گا،
اور ادھر کہ آیت میں ہر ایک تینوں مسروق کے حق میں ہے نہ کا دہلی مذکور ہوا تھا اس قصہ سے اسکی
قرہ کا ایک گوشہ مفہوم بھی ہو گیا، اگر ایسے ایسے افعال کر کے صاحب چنی ہوئے تبار عمومی بڑے مشہور کی
ہست ہے۔

۴۔ فیضیہ قبلہ کی جو ایک محکمہ بطور مثال ادب و بیان کی کمیٹی، اس سے بعض مخالفین استلام کا راجعہ لے کر مسلمانانِ محمدیہ پرست ہیں، بالکل باطل ہے۔

جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ وہ بات و پیش گوئی قرعہ اقبال کی ہے، ان کی عبارت کے تحت کوئی قلب کی ضرورت نہ ہو، نیز جہاں جس کی بہت جتنا عسکر کو بھی اس کی کٹوری میں داخل ہو کر جہاں جہر و خون لگے، جہر و مشاہدے ثابت ہو، اس کے اس کی کٹوری اور اذکار جہت بہت حاصل کرنے کے لئے کھینچیں جہت شروع ہوئی، واللہ اس امر واضح و مشہور ہے کہ کوئی محفل نہیں۔

اور اگر اس پر کوئی اپنی ہر بات کے لئے یہ دعویٰ کرے کہ ہم بھی جتنی گوساے اس سے قصد و غرض سے دیکھتے ہیں، تو توازن کو اپنی ہر بات کے دعوے سے مسلمانوں پر مذکورہ اعتراض میں نہیں رکھتا، وہ بدصور قلعہ راہ جو اس مقام پر منصوبہ واصل ہے۔

تائیداً، عام مسلمانوں اور عام کافروں کی حالت اغضب پیش کرنے سے ہر دم پر مسلمان کے دعوے ہیں مسلمانوں کا راستہ گم رہنا اور دوسروں کا دردناک گم رہنا ہر وقت ہر شخص کو معلوم ہو سکتا ہے۔

غیر ہے، علی سبیل القرض الی کہا جاتا ہے کہ اگر اس وجوہ کی سچائی مان لی جی کہ جیسے پھر بھی اس نمبریں اور تقبیل کے لئے کسی مفروضہ شریعت کا کھمبہ بنی کرنا لازم ہے، اور یہ بجز اہل اسلام کے دوسروں کے پاس مغفول ہے۔

اور جرّاد نے ہر کے منہ میں جہانِ محکمت کے لئے جو لفظ لکھا، اسناد دے گا یہی کہ نورس کی وجہ سے
ہر کہ ایک کام خداوندی کی نکتہ میں ہر مصلحتیں انصاف اور استنباط کے ساتھ کسی شخص سے اور ایک میں
نہیں آسکتیں سو اس شخص میں بھی ہر اور دل نکتہ میں پہل گی، ایک روز کے بعد جہان نے اسے اپنے
اور دوسروں کی فہم نہیں ہو سکتی۔

۳۔ اور یہ جزو فرمایا ہے کہ اگر حضرتی اللہ کا رخ ہے، اور اس طرح ہے جو فرمایا ہے کہ وہ بخیر ہو اور ایسے ہی جو مضامین ہوں ان سب میں زیادہ دیکھو کہ ہر مذکر کی چاہئے کیونکہ جس طرح اللہ فیضیاتی کی ذات کا ہر فرد اور ایک کسی بندہ سے ممکن نہیں اس طرح اس کی صفات کی حقیقت بھی اس سے خارج ہے۔

اسی سے، بھی معلوم ہو گیا کہ جس وقت لوگ نماز و تسبیح و تہجد میں مشغول ہوں مسجد میں اپنے لئے سوال کرنا کہیں، دینی کام کے لئے چندہ کرنا بھی ایسے وقت ممنوع ہے۔

میسر سسٹنہ نے معلوم ہوا کہ کوسمیک ڈیروال کی جتنی بھی سوزنی ہیں، سب حرام ہیں، اس میں جیسا کہ
 کھیلے ہو، جبکہ کوہنڈم اور دیوان کرنا داخل ہے، اسی طرح لینے کے سبب پیدا کی گئی اس میں داخل
 جو کہ جسے مسجد پرانہ ہوتا ہے، اور کوسمیک ڈیروال ہے کہ وہاں عمارت کے لئے لوگ رکنائیں، یا کہ
 ہوجائیں، نیز کوسمیک ڈیروال کا داخلہ اور دیروال کی ایسی نقش و نگار سے نہیں، بلکہ ان میں اندر
 آکر کر کے والوں سے ہے، اسی لئے فقہی شریعت میں ایک بگڑا شاعر ہے،

یہی اصل میں مسجد کی تباہی اور لوگوں سے
چھوڑا شدہ قتال پر ایمان لانے والی حدیث کا قیاسیہ
اور غلط فہم کر کے نیکو لوگوں کی جان و مال کا قتل
کے مساوی ہے۔

اسی لئے حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قرب قیامت میں مسلمانوں کی مسجدیں بظاہر آباد اور مزین و خوب صورت ہوں گی، مگر حقیقتاً و برہان ہوں گی کہ ان میں حاضر ہونے والے سازشی کمپو جائیں گے۔

[illegible]

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اس ارشاد میں مسعود بن کے لہا کر کے کا مطلب یہی ہو کہ وہاں خشوع و خضوع کے ساتھ حاضر بھی ہوں، اور وہاں حاضر ہو کر دیگر حکومت میں داخل ہوں، اب اس کے مقابلہ میں مسجد کی دیوار پی کی ہو گی کہ وہاں غازی نہ رہیں یا کم ہو جائیں یا ایسے اسباب جمع ہوں جو خشوع و خضوع میں خلل آتے۔

اور اگر کویت کا شافی نرمل واقعہ عدم شہر اور وسطیہ کویت کو مسلمانوں کا چھڑنے دے کر کہتا ہے تو اس سے پہلے سے بھی واضح ہو جائے گا کہ مسلمانوں کو ملنا صرف یہی نہیں کہ انھیں شہر کے مرکز یا چاروں طرف، بلکہ مساجد میں منعقدہ جلسے پر بلایا جاتی ہے یہی مسئلہ خازن اور ڈاکٹر انشد جب وہ مذہب کے چاکر ہو جائے تو مساجد و دیوانہ کھلے لیں گے۔

توئی فدا کی کشت! دوسری آیت میں رسولی پر کرم صلی اللہ علیہ وسلم کا نام بھی اللہ تعالیٰ کو قسطی دے دی جس سے کرم شکر میں بکے لے ارحم آپ کو شکر اور بہت الشکر سے بھرت کئے ہے جو کرم کا دانا اور مددگار ہے۔ انشاء فی زاد میں سورۃ سجدہ تک آپ کو بہت اللہ تعالیٰ کی طرف شکر کے ملا ہے آپ کا شکر دیا گیا، لیکن اس میں آپ کا کوئی نقصان نہیں، و آپ کے لئے کئے ہیں برے کی کوئی وجہ ہے جو کہ اللہ تعالیٰ کی ذات پاک کسی خاص سمت میں نہیں ہے اور جگہ پر، اس کے لئے مشرق و مغرب یکساں ہیں، کبھی کہہ کر غلابا نہیں، یا بہت اللہ تعالیٰ کو، دونوں میں کوئی ذاتی تفریق نہیں، بلکہ اہم آپ کی تشریف ہی دونوں جگہ سبب فعلیات ہے۔

دادن را قابلیت شرط نیست
بلکه شرطی قابلیت دارد

اس لئے جب محمدؐ کی طرف رخ کرے گا حکم غنائس میں فضیلت مثنیٰ و درجہ بہت اعلیٰ کا استقبال کرنے کا حکم ہو گا تو اس میں فضیلت ہے، آپؐ و غیرہ جنوں انشاء اللہ کی توجہ و دعا مانگوں میں کیساں ہے، جبکہ ہندو اس حکم کی تعمیل کر رہا ہے۔

چند بیٹوں کے لئے بہت مقدس کو قبلہ قرار دینے کا حکم دے کر ملک انور آپؑ نے فرمایا
اس بات کو راجع کر دیا کہ کسی خاص مکان یا سمت کو قبلہ قرار دینا اس وجہ سے نہیں کہ معاملہ اللہ
از تعالیٰ اس مکان یا سمت میں ہے، دوسری جگہیں جن میں بگڑا اللہ تعالیٰ ہر جگہ ہر سمت میں
یکساں توجہ کے ساتھ موجود ہے، کسی خاص سمت کو قبلہ عالم قرار دینا، دوسری جگہوں اور سمتوں
پر مبنی ہر ایک کو جب اللہ تعالیٰ کی توجہ کسی خاص سمت یا جگہ کے ساتھ متعین نہیں تو اب عمل کی ذمہ
صورتمیں ہر ممکن ہیں ایک ہر شخص کو اختیار دیا جائے کہ جس طرف چاہے رخ کرے کسی خاص
طرف سے، دوسرے یہ کہ سب کے لئے کوئی خاص سمت وجہت متعین کر دی جائے، مگر ہر ایک پہلے
صورت میں ایک قسمت وافرمان کا منظر سامنے آئے گا کہ حق تعالیٰ کا ارادہ ہے جس اور
ہر ایک کا رخ الگ الگ، اور ہر ایک کا قبلہ جو ارادہ ہے، اور دوسری صورت میں تقسیم ارعاد
کا علی سبب ملنے، ان جگہوں کی بناء ہر ایک عالم کا قبلہ ایک ایسی چیز کو بنانا اور مناسب ہر
لب و بہت المقدس جو ایک ہے، دونوں مقدس اور دیگر مقامات میں ہر قوم اور دین یا مذہب کے
مناسب اللہ تعالیٰ کی طرف سے احکام آتے ہیں، ایک زمانے تک بہت المقدس کو قبلہ بنایا گیا، پھر
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ کی اہل خباہش کے سلطان احسن حکم کو منسوب کر کے کعبہ کو
قبلہ عالم قرار دیا گیا، ارشاد دیکھا

قَدْ كَرِيسَ اَقْلَابِي وَجِيهِيكَ فِي السَّمَاءِ قُلْتُ لَوْ لَيْسَ بِكَ قِيْلَةُ تَرْضَاهَا

معنا میں تفصیل تھی، اس کو بار بار پھر بیان کرتے ہیں، جس کا مقصد ہے کہ جو شخص کا مقصد ہی معلوم ہو، اس کو ترغیب دینے کے لئے انعام عام و خاص کا یاد دلانا اور ترغیب کیلئے قیامت کو بھی نظر کرنا پڑے گا۔ مگر خوب ذہن نشین ہو جائے، دیگر کو مقصد و عظم کلیات ہوتے ہیں، جس کا کوئی خضار ان کے اختیار کو دے رہے ہیں اور آسان ہو جائے، اور پھر جامعیت اور انطباع کے ان کے ذرا حصے ہیں، جو جزئیات کا مضبوط نگاہ آسان ہو جائے، اور احادیث میں یہ طریق بیان بھی اعلیٰ اور درجہ کا سمجھا جاوے، جو کا مفضل اور مطلق بات کرنے سے پہلے ایک جمل قرآنی سے اس کی تقریر کر دی جائے، جس کا فخر و شکر کا نام تفصیل کے سمجھنے میں صحت و حد کا پورا ذخیرہ اس کے لئے ہے، اور آخر میں بطور خلاصہ اور تعریف تفصیل اسی جمل قرآنی کا پھر بارہ کر دیا جائے، مثلاً کہ اس کا ہے کہ کثیر پڑھی مفسر خصلت ہے، اس میں ایک مزید اور سراہہ، میرزا، دس، بیس مفسرین کیوں کہ پھر آخر میں کہہ دیا جائے کہ مفسر مفسر پڑھی مفسر خصلت ہے، اسی طرح کہ اس بات سے پہلے ہی کہ اس کا اعادہ فرمایا گیا ہے۔

اسے اٹھادینے کو جب علیؑ اس امر پر اصرار کیا تو اس نے کہا کہ میں تم کو بہت لوگوں پر ہمت دے سکتا ہوں، لیکن میں ان کو اپنے
 مخالفین کے ساتھ نہیں لے جاؤں گا۔ اگر تم کو کسی کی طرف سے دشمنی ہو تو میں اس کی طرف سے دشمنی
 نہیں کر سکتا۔ اگر تم کو کسی کی طرف سے دوستی ہو تو میں اس کی طرف سے دوستی نہیں کر سکتا۔
 اگر تم کو کسی کی طرف سے بیعت ہو تو میں اس کی طرف سے بیعت نہیں کر سکتا۔ اگر تم کو کسی کی طرف سے
 عداوت ہو تو میں اس کی طرف سے عداوت نہیں کر سکتا۔ اگر تم کو کسی کی طرف سے محبت ہو تو میں اس کی طرف سے محبت نہیں کر سکتا۔
 اگر تم کو کسی کی طرف سے نفرت ہو تو میں اس کی طرف سے نفرت نہیں کر سکتا۔ اگر تم کو کسی کی طرف سے
 دوستی ہو تو میں اس کی طرف سے دوستی نہیں کر سکتا۔ اگر تم کو کسی کی طرف سے بیعت ہو تو میں اس کی طرف سے بیعت نہیں کر سکتا۔
 اگر تم کو کسی کی طرف سے عداوت ہو تو میں اس کی طرف سے عداوت نہیں کر سکتا۔ اگر تم کو کسی کی طرف سے محبت ہو تو میں اس کی طرف سے محبت نہیں کر سکتا۔
 اگر تم کو کسی کی طرف سے نفرت ہو تو میں اس کی طرف سے نفرت نہیں کر سکتا۔ اگر تم کو کسی کی طرف سے دوستی ہو تو میں اس کی طرف سے دوستی نہیں کر سکتا۔

وَاِذْ ابْتَلٰٓ اِبْرٰهٖمَ رَّبُّهُ بِكَلِمٰتٍ مَّا قَالِ اِنِّىْ اَعْلَمُكَ
اور جب آزمایا ابراہیم کو کہ جس کے دیہے تھی بالین میں پھر اس نے فرمایا میں تم کو نہ کہتا ہوں
لننساہ اِنَّمَا مَا قَالِ وَمِنْ ذُرِّیَّتِیْ قَالَ لَا یَمٰنُ اَعٰہَدِیْ
سب کوں نہ کہتا، اور میری اولاد میں سے کسی نے فرمایا نہیں چھو گا میرا منہ

	الظليين	
	ظلمون	

اور جو وقت اٹھایا گیا حضرت ابراہیمؑ کا ایسے پروردگار نے چند باتوں میں (اپنے احکام میں ہے) اور وہ ایسی کوہرے طور سے بھلا ہے (اس وقت)

تو انسانی زندگی میں، غریب یا کرمین خود کو داس کے صلیب پر نبوت دے کر یا استبداد کو اٹھار کر
 طاقت و مابنائیں گا، انھوں نے غصے کیا اور میری (اور دوسرے) بھی کسی کی کو نبوت دینے،
 اور شاہد ہو کر آدھاپ کے وراثت منظور ہے، اٹھار کا مٹا باطل سے بچنے کی میزبان (عہدہ نبوت)
 مخلوق و دوزی و قانون کر کے (والوں کو مٹنے کا) دوسرا ایسے لوگوں کو قوصان جواب ہے، براہ راست
 کرنے والوں میں سے بعض کو نبوت دی جا سکتی ہے۔

معارف و مسائل

اس آیت میں اللہ تعالیٰ کی یہ خاص و منفرد خصوصیت اور اہم علامت اللہ کے مختلف استقامت نامہ میں ان کی ان کامیابی پر اس کے انعام و صلہ کا بیان ہے، اور جو یہ حضرت جناب خلیل اللہ ﷺ نے از خود شفقت اپنے والد کے لئے بھی اسے انعام کی درخواست کی تو انعام پانے کا ایک مناسب اور اشد ضروری کام تھا جس میں حضرت خلیل اللہ ﷺ کی درخواست کی منظور کی ضرورت میں بھی تھی، کہ یہ انعام آپ کی ذریت کو بھی ملے گا، پھر جو لوگ ذریت میں سے نامرمان اور ظالم ہوں گے وہ انعام نہ پاسکیں گے۔

سید علی اکبر علیہ السلام کی وفات کے بعد ان کے بیٹے نے ان کے جانشین کی حیثیت سے ان کے جگہ پر بیٹھ کر حکومت کی۔ ان کے بیٹے نے ان کے جگہ پر بیٹھ کر حکومت کی۔ ان کے بیٹے نے ان کے جگہ پر بیٹھ کر حکومت کی۔

تیسرے کہ کاسا کی کسی صورت اور کسی نوعیت کی رہی۔
چوتھے کہ انعام کیا دیا گیا اور اس کی حیثیت کیا ہے۔
آپ جی یہ کہ اس عالم کے لئے جو ضابطہ معتبر رہا گیا ہے اس کی کہ توضیح و تفصیل۔
اب اس غرض رسالت کے حاکمات ان تفصیل ملاحظہ فرماتے،

پہلے آتے کہ مکان کا مقصد اور تھا؛ پھر ان کے کلمہ لفظ و ترتیب نے اس کو مل کر دیا ہے کہ
 میں جو کیا گیا ہے کہ اس ہمتی کے معنی خود ارادیت مستانی ہیں اور ان کے ساتھ جتنی میں سے اس جگہ
 اللہ تعالیٰ کے واسطے کہ اس کی طرف اشارہ کر دیا گیا ہے، معنی میں بھی جیسے کہ آیت ہے کہ
 روح کلان کلمہ ہے۔

معتصب یہ ہوا کہ ابراہیم علیہ السلام کا یہ ابتداء و امتحان کسی حرم کی پاؤں میں یا نامعلوم قابلیت کا علم حاصل کرنے کے لئے نہیں، بلکہ شاہانِ حریت و دروہیت اس کا منشاء ہے، ان

[illegible]

دوسرا سوال کہ ایمان میں صفات سے دلچسپی کی وجہ سے اس کے متعلق دستِ آبی سرخ میں قیاسی حروف طعناات کا لفظ آیا ہے، اور اس لفظ کی تفسیر و تشریح میں حضراتِ معارفِ اربعہ کے مختلف اقوال ہیں، ہمیں نے احتیاطاً باتِ حق میں سے وزن چھین کر بیان کیا ہے، کسی نے یہ حق بتلائی ہے، اور کسی نے غور و فکر و تدبیر و دوسری چیزیں بتائیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان میں کچھ اختلاف نہیں، اور چیزیں سب کی سب ہی حضرت علیہ السلام کے مضامینِ ایمان سے ملتی ہیں، اور تفسیرِ اربعہ جہزہ اور ابن کثیر کی یہی رائے ہے۔

مشائے کمال کے نزدیک علی مرتضیٰ فیض ہے زیادہ ہے
 کی طرف سے ترقی و ترقی کی نسبت خود ہے
 اخلاق و قدروں کو علی نسبت تقدیر کی مدح ہے، اس سے معلوم ہوا کہ ہنگامہ غزوہ جمل میں جس قدر کہ
 قیمت ہے وہ علی مرتضیٰ فاضل جنس، بلکہ علی اور اس قدر برتری ہے۔

ابن حنفیہؒ نے اس شخص سے چند اہم چیزیں سیکھیں:

حنی ثقیانی کو منظر و خطا حضرت امیر اہم طریقہ اسلام کو اپنی غفلت کا خلعت خاص علما و فہمہ دیا جائے۔ اس نے ان کو سخت انتقامات دیے مگر اہل ایمان، پوری قوم کی قوم جن کو اپنا خاندان سب کے سب بہت پرستی میں مستحق سمجھتے تھے ان کے عقائد و رسوم سے مختلف ایک دین حنیف ان کو عطا کیا گیا، اور اس کی تبلیغ اور قوم کو اس کی طرف دعوت دینے کا بارگراں آپ پڑا لایا۔

قبیلے بنی نضیر اور جرأت و بہمت کے ساتھ بے خوف و خطر قوم کو خدا سے جدا و شریک لڑائی طوفان زدہ، مست بہرستی کی شرمناک و بدمعاشی خرابیاں مختلف عزائم سے بیان کی ہیں علیٰ طرز پر بڑے بڑے خلافت جہاد کیا، پوری قوم کی قوم کا مادہ جنگ و جدال ہو گئے، بارشاد وقت و زمانہ اور اس کی قوم نے آپ کو آگ میں ڈال کر زندہ جلادینے کا فیصلہ کر لیا، اللہ کے فضل سے اپنے عزا کی و جہانمندی کے لئے اسے سب ملایا پر راضی ہو کر آپ کو آگ میں ڈال دینے کے لئے پہل کر دیا، اللہ ثقیانی نے اپنے غلیل کو اس شخص سے کامیاب و آفرام کو چھوڑ دیا:

فَلَمَّا رَأَى الْمُرُورَ كَوْنَهُ مُرْدًا وَاقْتُلَا
عَلَى الْبُرْجِ حَسْرَةً (۶۱: ۶۶)

میں نے حکم دیا کہ اسے آگ لگا دی جائے
خٹکڑی اور زور سے اس کو مارا جائے

جس وقت جب حکم دیا کہ اسے مرنے کے لئے
آگ لگا دی جائے

کے عین کے حکم سے نہیں دیا گیا تھا، اس لئے یورپی دنیا میں جہاں کہیں آگ ہو جو تھو سی سب کچھ خوار و کد کاٹنے سے پہلے اپنی ہر چیز کو غصہ مند ہی بھرنی، اور وہ برسرِ رو بھی اس انداز پر کا فر یہاں کر خندنی چڑھتی، فتوے آؤں مغلطہ جنون کے ساتھ لکھا کرتا تھا اس نے فرمایا آپ کیا کسی چیز کی غصہ منگ دیا اعتدال سے بڑھ جائے تو وہ بھی بروقت کی طرح شکست دے گا۔ لیکن جو جانی ہے، اگر غلط سلوک ارشاد ہو تو نیکوں کے لئے آگ برت کی طرح ایسی شہنشاہی ہو جاتی جو بجائے تو خود ایک عذاب بن جاتی ہے جس میں ایک عذاب دوسرے کا بھی ہے۔

اس آسمان سے غلط ہو کر دوسرا آسمانی بہ لبا لبا کر اپنے اصل وطن کو چھوڑ کر شام کی طرف
 جھڑ کر تباہیں، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے رخصتا سے ملواندہ کی کی ترپ میں قوم دین وطن کو بھی
 غراؤ کہہ رہا، اور دنیا اہل دینال جیت کر کے شام میں چلے آئے !

آهنی که ترا شناخت جان را چه کند
فشر بود و عبال و غاشسان را چه کند

اب قوم روم کو چھوڑ کر ملک شام میں قیام کیا ہی تھا کہ جیسے حکم ملا کہ بی بی اجروہ نے شام
اور اسی کے شہر خوارا پہنچے حضرت اسبل علیہ السلام کو سامنے لے کر یہاں سے بھی کوچ کر بی بی اجروہ نے
جبریل علیہ السلام سے اور دونوں کو سامنے لے کر پہلے ہوا سے میں جہاں کوئی سرسبز جگہ آئی تو
حضرت خلیل فرماتے کہ یہاں ٹھہرا دیا جائے، جبریل فرماتے کہ یہاں کا حکم نہیں، منزل آگے بڑھے
جب وہ خشک جڑواں اور گرم و گھسانا آجائے یہاں آگے بھی وقت بہت اندک تھا تب اور شہر
نکدہ بنی سنانا معتد تھا، اس جگہ شام میں آپ کو آکر دیا جائے، اللہ تعالیٰ کے خلیل اپنے
پروردگار کی نجات میں مسرور و شگفتہ ہیں خلیل مہمان اور آپ و گویا بھٹل میں بی بی کو لے کر
چلے جاتے ہیں، لیکن یہ امتحان اسی پر ختم نہیں ہو جاتا، بلکہ اب حضرت، امایہ علیہ السلام کو حکم
ملا ہے کہ بی بی اور آپ کو تین چھوڑیں اور خود ملک شام کو واپس ہو جائیں، اللہ کا اعلیٰ حکم
پائے ہی اس کی تعمیل میں آگے نکلا، تو آپ نے، اور شام کی طرف روانہ ہو جاؤ، تب غنیل حکم میں
آئی، تاخیر سے گوارا نہیں کر سکی کہ یہ اطلاع ہی دے دے کہ جو حکم خدا کا ہے مطلقاً اس سے میں
جارا ہوں، حضرت اجروہ علیہ السلام جب آپ کو جاتے ہوئے دیکھتی ہیں تو فرماتی ہیں، مگر آپ
جواب نہیں دیتے، پھر پہنچتی ہیں اور دیکھتی ہیں کہ اس اسی دن میدان میں آپ چھوڑ کر یہاں جا کر بیوی
اس کا بھی جواب نہیں دیتے، شکر وہ بی بی بھی خلیل اللہ کی بی بی تھیں، پھر بھی حکم کہ سنا جائے،
اور کچھ گھس کر یہاں آپ کو اللہ تعالیٰ کا کوئی حکم ملا ہے آپ نے فرمایا کہ ہاں، حضرت اجروہ
علیہ السلام کو بھی جس کے خداوند کی کا علم ہو گیا، تو نہایت الحسان کے سامنے فرمایا کہ جاتے ہیں

ان کے دل میں استغیث اور دعا کیا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو یہاں بھیڑ کر رکھا ہے کہ اس کا حکم دے گا۔
تب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا کہ جسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم ملے۔
اس کو سب سے پہلے حضرت ابراہیم نے فرمایا کہ تم پر شرف سے چاہیے، میں نے آپ کو یہ حکم دیا کہ
وہ میں بھی ضائع نہ کرے گا۔ ابراہیم علیہ السلام نے حکم خداوندی کی تعمیل میں یہاں سے چل کر گئے ہرگز
مگر شیروان بھارہ اس کی والدہ کا خیال لگا ہوا تھا، جب راستہ کے ٹوڑے پہنچے جہاں سے حضرت
ابراہیم و یحییٰ علیہما السلام اور اللہ تعالیٰ سے یہ دعا فرمائی جو سورہ ابراہیم کی آیت نمبر ۳۵ء
میں اس طرح مذکور ہے

وَرَبِّ اجْعَلْ لِي آيَةً
وَأَجْعَلْ لِي قَوْلًا مِّنْ عِندِكَ
سورہ ابراہیم ۳۵

اے میرے پروردگار اس شہر کو اس والا
بنادے اور مجھ کو اللہ سے کلامی کلام
میں کی عبادت سے بھارت دے۔

پھر دعا میں عرض کیا
وَرَبِّ اجْعَلْ لِي آيَةً
وَأَجْعَلْ لِي قَوْلًا مِّنْ عِندِكَ
سورہ ابراہیم ۳۵

جس اے میرے رب میں اپنی اولاد کو
آپ کے عزت و شرف کے قریب ایک میدان میں
جوداوت کے قریب میں آکر رہا ہوں
اے میرے رب تاکہ وہ شہر کا نام نہ بنے
و آپ کو اللہ کے قلب میں ان کی طرف
مائل کر دے، اور ان کو یہاں کھانے کو کیجے
تاکہ وہ شہر نہ بنے۔

ساتھ حکم بھی کہ ہمارے پروردگار سے ہجرت کر کے حضرت اسماعیل علیہ السلام اور ان کی والدہ
میں آکر لایا جائے اور وہاں اس کا میرے شہر کو پاک رکھا، حضرت اسماعیل علیہ السلام نے
والت سلام جاتے تھے کہ پاک رکھنے سے ملاوٹ ہو کر اس کو لایا ہی کی غیاسات اور رنگ لے گئے یہی پاک
رکھا جائے اور اہل اہلسنت کو شرف سے لایا ہی میں مقصود ہے اس لئے یہاں شہر کو
ہو و مابین مسند و مابین میں آؤں تو اس کی طرف سے ہرگز نہ دے اور جاتے اس ہونے کی دعا
فرمائی میرے دعا کی کہجے اور میری دعا کو شرف و برکت سے بچائے کیونکہ حضرت اسماعیل علیہ السلام
علیہ السلام کو معرفت حق تعالیٰ کا اور مقام حاصل تھا میں ان شان کو پہنچا دینا کہ ان کو لایا جائے،
اپنے تمام افعال و اعمال اور اولاد کو یہ کہیں کہ ان کو سب پر حق تعالیٰ ہی کے قبضہ قدرت میں ہیں
اس کی شہادت و اقرار سے سب کا ہوتے ہیں اس لئے کہ شرف و شرف سے بیت اللہ کو پاک رکھنے

جو حکم ملا تھا، اس میں حق تعالیٰ ہی سے امداد و طلب کی اس دعا کے اندر کہ شرف و شرف سے محفوظ رہے
کی اجازت، میں ایک خاص ملاوٹ میں ہو سکتا ہو کہ جب بیت اللہ کی تعظیم و تکریم کا حکم ہوا تو یہ اجازت
میں تھا کہ آئندہ چل کر کوئی ناواقف اس بیت اللہ میں نہ ہو ورنہ بتائے، اور اس طرح شرف میں
مستحکم رہا جائے، اس لئے یہ دعا فرمائی کہ کہہ کر اور میری اولاد کو شرف سے محفوظ رکھا جائے،
اس کے بعد شیروان بھارہ اس کی والدہ پر شفقت کے چلنے نکلنے سے دعا فرمائی کہ میں نے
ان کو آپ کے حکم کے مطابق ملاوٹ آپ کے حکم میں رکھ کر پاس میں رکھا تو یہاں سے بھی یہ جگہ راحت کے
قابل بھی نہیں جہاں کوئی اپنی قسمت سے ضرورتاً بابت زندگی حاصل کرے، اس لئے آپ ہی اپنے
فضل سے ان کو یہاں کا رزق عطا فرمائی۔

پھر دعا کے کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام فرمائی، رطل شام کی طرف دروازہ ہو گئے، اور
حضرت ابراہیم کا کچھ وقت قریب تر شہر کا کچھ دورانی کے ساتھ کٹ گیا، جو حضرت اسماعیل علیہ السلام
تھے، اپنی خدمت ہونے کے بعد وہاں کے پاس سے یہاں اور شہر ابراہیم کی اس وقت پانی کی خوش
میں ان کا نکلتا اور کسی کو مصافحہ نہیں ہو ورنہ چارپنڈھنا اور ان دونوں کے درمیان دوڑوڑ کر
راستہ طے کرتا، تاکہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کے سامنے آجائے، مام مسلمانوں میں معروف ہے اور اس
میں مقام کے درمیان میں کرا آجنگ اس کی یادگار ہو۔

اس قسم کے آخر میں حضرت جبریل علیہ السلام نے کہا کہ یہ خداوندی دیاں پہنچا اور شہر، زون پہا جادی
کرنا اور قیام تہذیب و تہذیب کے چوکوں کا یہاں آکر مقیم رہا تا کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کے
جوان ہونے کے بعد قبیلہ جہرم کی ایک بی بی سے شادی ہو جائے، یہ سب سچ بھاری کی روایت
میں تفصیل کے ساتھ مذکور ہے، روایت حدیث کے مجموعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتدا و ابتدا
حق کی گیت میں جو بیت اللہ کو پاک رکھنے اور پاک صاف رکھنے کا حکم حضرت اسماعیل علیہ السلام
اس وقت اتنا ہی عمل مقصود تھا کہ اس جگہ کو حضرت اسماعیل علیہ السلام اور ابراہیم علیہ السلام کے ذریعہ
آباد کر دیا جائے، اس کے مقابلہ صرف حضرت ابراہیم علیہ السلام تھے، کیونکہ انھیں
علیہ السلام اہل شہر خراسانی کے عالم میں تھے، اس وقت بیت اللہ کی تعمیر ہر جگہ محو و ملامت
سورہ بتو کہ آیت جو اس وقت ذرا نظر سے دور تھی، تا کہ ان کی اولاد سے دعا ہو کہ ان کی اولاد
نیکوئی میں حضرت ابراہیم کے ساتھ حضرت اسماعیل علیہ السلام کو بھی نہ کر کے لایا جائے،
یہ کہ اس وقت کا ہے جب کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام جان اور تائی ہو چکے تھے، اس وقت
دونوں کو بیت اللہ کا حکم دیا گیا۔

صحیح بخاری کی روایت میں ہے کہ ایک روز حضرت ابراہیم علیہ السلام جب عبادت حضرت ابراہیم

اور جنہوں کی ملکات کے لئے نکاح کر دیا، جنہیں علیہ السلام ایک درخت کے نیچے بیٹھے ہوئے شریک رہے ہیں، اور اب وہ کونجا کھڑے ہوئے ہوئے، وفات کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے ایک کام کا حکم دیا ہے، کیا تم اس میں میری مدد کرو گے؟ انہی فرزند نے عرض کیا کہ بسم اللہ ہم کر دیں گے، اس پر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس ٹیڈ کی طرف اشارہ کیا، جہاں بیت اللہ تھا کہ جسے اس کی تعمیر کا حکم ہوا ہے، بیت اللہ کے دو دروازے تھے اللہ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بتلا دیے تھے، دو دروازے بزرگ اور اس کام میں گئے تو بیت اللہ کی قدیم بنیادی جیسی تھیں، انہی پر دونوں نے تعمیر شروع کر دی، اگلے آیت میں اس کا بیان ہے، وَلَیْسَ لَیْلَةُ الْاَضْحٰی مِنْ اَمْرِ الْاِسْلَامِ بَلْ اَمْرٌ اَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّکُمْ فَکَرِہٌ اِنَّ اَمْرَکُمْ لَفِی شَیْءٍ کَبِیْرٍ اور اسی طرف اشارہ ہو کر کہانی بیت اللہ اصل میں حضرت علیہ السلام کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بتلا دی تھی۔

ان تمام آیات پر غور کرنے سے دو حقیقتیں واضح ہو جاتی ہیں جو بعض روایات و حدیث اور تفسیر میں غور ہو کر بہت اہمیت اپنے لئے دیا ہیں، موجود تھا کہ یہ تمام آیات میں کہیں بیت اللہ کی تعمیر بتلا دیے کا ذکر ہو کہیں اس کو ایک صاف دیکھنے کا ذکر ہے، یہ کہیں مذکور نہیں کہ آج کوئی نیا تعمیر کرنا ہے اس کی تعمیر کریں، اس سے معلوم ہوا کہ بیت اللہ کا جو اس واقعہ سے پہلے موجود تھا، وہ نہایت قریب کے وقت منہدم ہو گیا یا اٹھایا گیا تھا، صرف بنیادی موجود نہیں، حضرت ابراہیم اور اسماعیل علیہما السلام کہ جس کے پہلے آئے تھیں، بلکہ بنائے، سابق کی بنیادوں پر جدید تعمیر کرنے کے اصولی ہوئی ہے۔

اس بات پر معائنہ کر کے پہلی تعمیر کرنے والے اور دوسرے قسٹ کی اس میں کوئی صحیح اور قوی روایت مدد بحث کی منتوی نہیں، اب تک کہ روایات میں ہیں سے معلوم ہوتا ہے کہ سب پہلے اس کی تعمیر کو ہم علیہ السلام کے اس زیاں کرنے سے پہلے ہی فرشتوں نے کی تھی، پھر آدم علیہ السلام نے اس کی تجدید فرمائی، یہ تعمیر فرنانے نور تک آئی، یہی مولانا نور محمد ہوجانے کے بعد سے ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ تک یہ ایک ٹیڈ کی صورت میں آئی تھی، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس پر تعمیر فرمائی، اس کے بعد اس میں عیسائیت و عیسائیت تو بہت ہوئی اور پھر منہدم نہیں ہوئی، اور حضرت علی علیہ السلام کی بدست قبل قرین مکہ نے اس کو منہدم کر کے از سر نو تعمیر کیا جس کی تعمیر میں انصاف علیہ السلام نے بھی خاص شرکت فرمائی۔

احکام و مسائل متعلقہ حرم محترم

۱۔ لفظ کتابت سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے بیت اللہ کو یہ خاص غنیمت بخشی ہو کہ وہ ہمیشہ

مروج مستطابق بنائے گا، اور لوگ بار بار اس کی طرف جاتے اور دیکھنے کے لئے نور مندرجہ ہیں، اللہ تعالیٰ حضرت کاہن نے فرمایا، اے جنہیں اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، میں کوئی آدمی اس کی زیارت سے کہیں میرے نہیں ہو گا کہ میرے پیٹے سے زبرداریات، رطوبات کا شوق نیکو فرمائے اور بعض علماء نے فرمایا کہ قبلہ کی جانب میں سے ہے کہ وہاں سے لوٹنے کے بعد مسجدوں میں جاتے ہیں، جہاں سے پہلے ہم طور میں اس کا مساجد کا کام ہے کہ پہلی مرتبہ جتنا شوق زیارت بیت اللہ کا ہوتا ہے دوسری مرتبہ کے لئے اس شوق میں اضافہ ہوتا ہے، اور وہی جوں بار بار زیارت کرتا رہتا ہے، سوئے اور بڑھتا رہتا ہے۔

یہ مجاز بہت اللہ ہی کی خصوصیت ہے، جو کہ ہے، اور دنیا کے بہتر سے بہتر مافوق الفسافی ایک اور درجہ دیکھ لینے کے بعد یہ سوچا ہے، اور باوجود اس بات کہ عیسائیوں نے بعد تو دیکھے کا وہاں میں نہیں آئے، اور وہاں تو کوئی خوش منظر مسجداں و مآبیاں ہیں، مگر آسمان سے بڑی اونچائی کا وہاں کی کوئی اہمیت نہ اس کے باوجود لوگوں کے دل میں اس کی شہرت ہمیشہ موجود رہی ہے، ہر اور کو یہ پھر خارج کر کے سینکڑوں فلسفین، جہاں کرانہ پیچھے کے مشائخ رہتے ہیں۔

۲۔ انشاء اللہ اس نگر مآثرین میں جاتے اس کے معنی میں، اور لفظ مہبت سے مراد صرف بیت اللہ میں خاصہ نہیں بلکہ پورا حرم دہلی ہے، فرقان کریم میں بیت اللہ اور کعبہ کا لفظ اول کر پورا حرم مراد لینے کے اور بھی خواہر ہو جو دنیا جیسے ارشاد ہے، عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ شَہِیْدٌ ۱۹۵۔ اس میں منظر کعبہ ہونے پر پورا حرم مراد لیا گیا ہے، کیونکہ اس میں دو قسم فرمائی کا ہے اور بیت کعبہ کے لئے تو قسم فرمائی نہیں ہوئی، اور وہاں منبر فرمائی کرنا جائز ہے، اس کے معنی آیت کے یہ ہو کہ ہم نے حرم مکہ کو جیسے اس بنایا ہے، اور جاتے اس بنایا ہے، سے مراد لوگوں کو یہ حکم دیا کہ حرم محرم کو عام قتل و قتل اور رافقہ سے بالاتر رکھیں (روایت فرمائی)

چنانچہ زائد ماہیت میں بھی عیون کے خاص میں مسلمان ہر ایسی چیز کو کہ آسمانی و مافوق الفسافی میں بھی تھا کہ حرم میں اپنے باب اور جہاں کا قائل کہیں کوئی استعمال نہیں لینے تھے، اور عام جنگ و قتال کو بھی حرم میں حرام کہتے تھے، نہ شہادت، اسلام میں بھی یہ حکم اس طرح دیا گیا، منہج کے لئے وقت صرف چند گھنٹوں کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطے اہل حرم میں قتال کو جائز کیا گیا تھا، اگر کسی وقت پھر پیشہ کے لئے حرام کر دیا گیا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے خطبہ میں اس کا اعلان فرمادیا، صحیح بخاری

اس بات پر مسئلہ کہ کوئی شخص حرم کے اندر کوئی ایسا جرم کرے جس پر حد و قصاص اسلامی طریقہ کی دوسرے مآخذ یا کتب کو حرم اس کو اس میں نہیں دے گا، بلکہ اس پر اجماع است

مردود و قصاص جاری کرنے جائیں گے (۱) احکام اللہ کو ان جہت میں و مستطیٰ کہو بخیر
قرآن کریم کا ارشاد ہے:

فِي الْيَمِينِ شَيْءٌ مَّا كُنْتُمْ لَآ تَعْلَمُونَ
فَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذَلِكَ مِنْكُمْ
فَعَسَىٰ أَمْرُهُ أَن تَسْكُنَ مِنْهُ عُقُوبَةُ اللَّهِ
(۱۵۲)

ایہ بیان ایک مسئلہ از جنہد میں میں خلعت فیہ ہو وہ یہ کہ کوئی شخص یا ہر سے جرم کر کے
حرم میں پناہ لینے قرآن کے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے گا اس میں بعض ائمہ اس پر جرم میں
حدود و قصاص کی سزا میں جاری کرنے کا حکم دینے میں اور امام اعظم ابو حنیفہ کے نزدیک اس کو
سزا سے چھوڑنا تو نہیں، کیونکہ اگر یہ کیا تو جرم کر کے سزا سے بچے گا یا نہ کھل جائے گا، اور امام
میں فساد برپا ہو جائے گا، اور حرم پر جرموں کا شکا کیا جائے گا، لیکن احترام حرم کے سبب حرم کے
اندرون میں جاری جانے والے اس کو یہ کیا ہو گا کہ وہ حرم سے باہر آئے، وہاں سے نکلے کہ بعد از جاری کی جائے گی۔

۳۔ ذَا لِحِجَّةٍ وَأَذِينَ لَمْ يَمْسَسُوا زَیْرَ جَسَدٍ مُّتَشَقِّقٍ، اس میں مقام ابراہیم سے مراد وہ تہر
ہو جس پر حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے قدم مبارک کا بطور تجرہ نشان چڑھا
تھا، اور میں کو تعمیر بیت اللہ کے وقت آئے پہنچاں کیا تھا شیخ بخاری،

حضرت انس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں نے اسی تہر میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے
قدم مبارک کا نقش دیکھا ہے، مگر لوگوں کے کثرت بخیر نے اور ہاتھ لگانے سے اب وہ نشان
بچا کر بچ گیا ہے۔ (قرطبی)۔ اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے مقام ابراہیم کی تفسیر میں یہ بھی
منقول ہے کہ پورا حرم مقام ابراہیم ہے، لیکن چونکہ اس سے ملا ہے جو طواف کے بعد کی دُور
رکعتیں ہیں کہ مقام ابراہیم پر چڑھنے کا حکم آیا ہے، اس لیے اس کی تعمیل ہونے پر حرم میں کسی
جگہ کسی یہ رکعتیں پڑھنے سے ہونا نہ لگے، اس پر کاشف غمات متفق ہیں۔

۴۔ آیت مذکورہ میں مقام ابراہیم کو معصیٰ بنانے کا حکم ہے اس کی وضاحت خود رسول اکرم
صلی اللہ علیہ وسلم نے بعد از اعراب میں اپنے قول و فعل سے اس طرح فرمادی کہ آپ طواف کے بعد
مقام ابراہیم کے پاس پہنچے جو بیت اللہ کے سامنے خوشے کے فاصلے سے دکھائی دے وہاں پہنچ کر
یہ آیت تلاوت فرمائی، ذَا لِحِجَّةٍ وَأَذِينَ لَمْ يَمْسَسُوا زَیْرَ جَسَدٍ مُّتَشَقِّقٍ، اور بعد مقام ابراہیم کے چلے
اس طرح دو رکعت نماز پڑھی کہ مقام ابراہیم کو درمیان میں رکھے ہوئے بیت اللہ کا استقبال ہو جائے
رہے شیخ اس لئے فقہاء است، نے فرمایا ہے کہ جس شخص کو مقام ابراہیم کے چلے متعلق جگہ نہ ملے وہ
کتنے ہی فاصلے پر بھی جب اس طرح کھڑا ہو کہ مقام ابراہیم کی اس کے سامنے رہے اور بیت اللہ کی
قرآن حکم کی تعمیل ہو جائے گی۔

۵۔ اس آیت سے ثابت ہو کہ طواف کے بعد کی دو رکعتیں واجب ہیں اور خاص و عام اس کے
ملاحظہ فرمائیے

ابن ابی شیبہ روایت کرتے ہیں کہ اس مقام ابراہیم کے چلے اور اگر اس وقت پورا حرم میں کسی دوسری جگہ
بھی اور اگر سے کوئی ایسا ہوگا، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ان رکعتوں کا بیت اللہ کے دروازے
سے متصل پڑنا سنا ہے، اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے بھی یہی خبر پہنچا منقول ہے، اور وہاں
اور صلی اللہ علیہ وسلم نے کتاب مناسک میں فرمایا ہے کہ یہ دو رکعت طواف تو واجب ہیں، اور مستحب
ہے کہ وہ مقام ابراہیم کے چلے اور اسی جگہ میں رکھی دوسری رکعت وہاں ادا کرے کہ پھر حرم میں یا حج
بمقام ابراہیم میں جس میں رسول اللہ نے واجب ادا ہونا نہ لگا، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ
چلا اور اعراب میں حضرت ام سلمہؓ کو ایسا ہی اتفاق ہوا کہ ان کو واجب طواف نماز پڑھنے کا وہاں موقع نہ ملا
تو مسجد حرام مکہ مکرمہ سے نکلے کہ بعد ازاں وہاں دو رکعت ختم سے پہلے ادا کرے پھر وہاں کے
نزدیک کوئی دوسری جگہ میں واجب نہیں ہونا، صرف امام اہل بیت واجب دہم کے قائل ہیں، وناک علی قالی
۱۔ تَلِیْقُ رَجُلٍ رَاجِلٍ، اس میں بیت اللہ کو چمک کرنے کا حکم ہے جس میں ظاہری غمات
اور گندگی سے طہارت بھی داخل ہے اور باطنی غمات کفو شرک اور غلطی و ذلہ منقض و حسل
حرم و حج و عمرہ و غرض اور یا، ونام و نمونہ سے پاک بھی شامل ہو اور اس میں طہارت کیلئے لفظ تلیق
میں اس طواف بھی اضافہ ہے کہ یہ حکم تمام مساجد کے لئے عام ہے، کیونکہ ساری مساجد بیت اللہ پر
ہیں کہ اور شاد ہے، (ابن ابی شیبہ) ذَا لِحِجَّةٍ وَأَذِينَ لَمْ يَمْسَسُوا زَیْرَ جَسَدٍ مُّتَشَقِّقٍ (۱۵۲، ۱۵۳)

حضرت فاروقی علیہ السلام نے مسجد میں ایک شخص کی آواز سنی، تو فرمایا: یہی خبر نہیں کہ تم کہاں
کھڑے ہو (قرطبی) لیکن چونکہ ارب و احرام چاہئے اس میں غیر مشروع آواز بلند نہیں کرنا چاہئے،
عالم ہے کہ اس آیت سے جس طرح بیت اللہ کا تمام ظاہری اور باطنی غمات سے پاک رکھنا
منزور ہے، اس طرح تمام مساجد کو بھی پاک رکھنا واجب ہے، یعنی مساجد میں داخل ہونے
والوں پر قدم سے کھارنے بدلت اور کپڑوں کو بھی تمام غمات اور بدلتی چیزوں سے پاک سان
بکسیں اور اپنے دونوں کمر و کمرک و لٹاف اور تمام اسلحہ و زلیہ و کمر حصہ، بعض حصہ و دیار و دیوار
کی غمات سے پاک کر کے داخل ہوں، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے روشا فرمایا ہے کہ کوئی
شخص یہاں پس و دیوار و پس و دیوار سے نہ جائے، اور مسجد کے کچلے اور دیواروں کو مسجدوں میں
داخل کرنے سے منع فرمایا ہے کہ ان سے غمات کا خلوہ نہ پائے۔

۷۔ بَشَّارًا مِّنْ ذَا الْفَلَاحِ، ذَا الْفَلَاحِ اللہ تعالیٰ کے لئے کلمات سے چند احکام و فرائض
مائل ہوئے، ازاں یہ کرنا، بیت اللہ کا قصد طواف، اعتکاف اور نماز ہے، اور سرے یہ طواف

تورات ہیں اس طرح شہادت تک نہیں میں تمام مزدورات زندگی داخل ہو جاتی ہیں اور حالات و
 واقعات کا مشاہدہ بھی یہ ثابت کرتا ہے کہ حق تعالیٰ نے اگرچہ اپنی حرم کو رکاوٹ کی زمین بنا جا کر
 منعکس رکھی کیکن دنیا تبصر میں سبب سونے والی اور بٹنے والی چیزیں ہیں عام طور پر عورتوں
 ہیں اور یہ بات شاید کچھ بھی کسی بڑے سے بڑے جبار کی یا صفی شہر کو حاصل نہ ہو کہ دنیا میں
 معنوعات کمزور و کمزور و داخل مل جاتی ہیں۔

سورة لقمان ۱۵ اس آیت میں جبکہ اہل مکہ کے لئے اس اور فریضہ کی دعا کی دعا کی ممتن، تو
 ان میں مومن کا فرض داخل ہے اور اس سے پہلے حضرت غلیل اللہ نے جب ایک دعا میں
 اپنی ہر ذریعہ کو بہرہ مستیلاز مومن کا فرض کیا تھا تو حق تعالیٰ کی طرف سے ہر شادانہ کا
 بدو یا مومن کے حق میں قبول ہے۔ حال میں مشرکوں کے حق میں قابل قبول نہیں، وہ دعا بھی آواز
 افتخار کی، حضرت غلیل اللہ علیہ السلام کو جو مقام غلت پر نازل اور خشیہ اللہ سے بہرہ نفعی اس
 جگہ کہ اب اتنی فراہمی دعا میں یہ قید رکھی کہ یہ دعا خوش حالی اور اس دعا کی دعا و عارضہ
 نورانی کے لئے کرتا ہوں حق تعالیٰ کی طرف سے اس خشیہ و رحمت جلد کی دعا کی دعا اور فرمایا
 تو منقشہ نہیں ہوں البتہ مومنوں کو یہ خوش حالی اور ادا فضلی فریضہ ہمیں اہل مکہ کو عطا کریں گے اگرچہ وہ
 ظالم مشرک کے کا فر ہیں ہوں البتہ مومنوں کو یہ خوش حالی میں طرح و دنیا میں دی جائے گی اس طرح
 آخرت میں بھی عطا ہوگی اور کافروں کو آخرت میں عذاب کے سوا کچھ نہیں۔

ابن جبہ جل جلالہ اور ابی نعیم نے کہا کہ حضرت غلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے حکم ربانی کی
 نعت دیکھ کر اپنے کی تعمیل میں ملک خاتم کے ہرے ہرے عیش منظر خط کو چھوڑ کر کھڑکھڑ
 کے خشک پہاڑوں کے دریاں اپنے اہل و عیال کو لڑا لڑا اور بیت اللہ کی تعمیر میں اپنی پوری امانت
 خرچ کی یہ موقع ایسا تھا کہ ایسے مجاہد کے دل میں غلب پیدا ہوتا تو وہ اپنے عمل کو
 بہت کمال میں فخر سمجھتا لیکن یہاں حضرت غلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام ہیں، وہ عورت کی
 باگ و عورت و عیال کو پہنچانے والے ہیں کہیں انسان سے اللہ تعالیٰ کے شاہان شان عبادت و اعلا
 کن نہیں ہر شخص اپنی قوت و رحمت کے مقصد سے کام کر لے گا جس نے ضرورت ہے کہ کوئی بھی
 بڑے سے بڑا عمل کرے تو اس پر نواز دکرے، بلکہ اہل مذاہب کے ساتھ دعا کرے کہ میرا یہ عمل
 قبول ہو جائے، جبکہ حضرت امام علیہ السلام نے بنا بہریت اللہ کے عمل کے متعلق یہ مافوقی
 کہ اسے ہائے پروردگار آپ جانے اس عمل کو قبول فرمائیں کیونکہ آپ کو سننے والے اور دیکھنے
 والے ہیں ہماری دعا کو سننے میں اور ہماری جنوں کو بابتے ہیں۔

وَلَقَدْ اَوْفَعَلْنَا لَكُم بُرْهَانًا ۚ يٰۤاٰدَمُ اَسْمِعْ اٰسِيَّ مَعْرُوفَ وَخِشْتَ كَاتِبًا ۖ يٰۤاٰدَمُ حُضْرَتُ غَلِيْلُ

کو مل جاتا تھا خاص و فرما نہر وادی کے بے مثال کارنامے سے پہلانے کے بعد بھی یہ دعا کہہ کر
 کہ ہم دونوں کو اپنا فرمانبردار بنا لیجئے وہ یہ کہ کہیں کسی کو حق تعالیٰ کی معرفت بڑھتی جاتی ہو
 انسان اس کا یہ احساس بڑھتا جاگے، کہہ سچ و داداری اور حق فرمانبردار ہی ہوا اور ان میں کر رہے
 وہ ہیں کہ نہیں کیا اس دعا میں بھی اپنی اولاد کو شریک فرمایا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ
 اللہ والے جو ان کی دعا میں اپنی جان اور دار و لاک و شہر اپنی پیش کرنے سے بھی روچہ نہیں لگاتے کہ
 اپنی اولاد کے حق میں قدرت ہو جاتی ہے، مگر اس بہت کے سمجھنا ضروری ہے کہ یہ دعا کہہ کر جسے
 عوام کی دعا میں نہیں علم تو اولاد کی صرف بہانی صحت و راحت کو کہتے ہیں، ان کی ساری خواہش
 راحت کسی کے کر دیکھتی ہے، مگر اللہ کے مقبول بندے جہاں سے زیادہ وہ دعا کی دعا اور نویری
 سے زیادہ آخری راحت کی فکر کرتے ہیں اس لئے دعا فرمائی کہ میری اولاد میں سے ایک بچہ
 کو میرا فرمانبردار بنا دیجئے، اپنی لذت کے لئے دعا میں ایک صحت اور بھی ہے کہ بچہ شادانہ
 کہہ لوگ قوم میں بڑے اٹھے جاتے ہیں ان کی اولاد اگر ان کے واسطے یہ قیام رہے تو عوام میں ان کی
 مقبولیت فخری ہو جاتی تو ان کی صلاحیت صلاح عوام کا دوزیہ بنتی ہے (بہر صحت)

حضرت غلیل اللہ کی دعا میں قبول ہو کر آپ کی لذت میں ہمیشہ ایسے لوگ موجود رہیں
 جو بچہ حق پر قائم اور اللہ کے فرمانبردار بننے سے جسے باہت خوب میں حکم رہی دیکھ کر
 خوب کر شکر دیت پرستی سے گھبراہٹ تھا اس وقت اولاد ہر آدم میں ہر شکر کہ لوگ عقیدہ و توحید کو
 سچے معتقد اور طاعت شمار دیکھیں، چاہے اپنی جاہلیت میں نہ دیکھیں عروسی لکھل اور کن میں ماضی
 دلوں کی برصی اعلیٰ و علم کے بڑے عبد العالی بن کرشم کے متعلق بھی ہیں روایت دیکھ کر
 بہت پرستی سے پڑا ہے (دیکھو)

اِنَّ كَاتِبًا يَتْلُو ۚ مَنَاسِكَ طَلَسْ كِي مَنَاسِكَ ۚ اَعْمَالِ كَلَامِ مَنَاسِكَ كَمَا جَاءَ بِهٖ بَارِدًا
 ج. وقت بیتی، مرد لکھ کر، میان دونوں مرد لکھنے میں اور دعا کا حاصل یہ کہ کہیں اعمال کا اور
 مقامات کا ہر طرح بھلائیے جسے اس لئے لفظ اَنْ تَاْتَا تَا لَنَسْرَا اِذَا هِيَ كَسَمْنِ يَنْتَ مَنَاسِكَ
 وہ دیکھا انھوں سے ہیں ہو سکتا ہے اور تفسیر بھی، چنانچہ مقامات کا کہ لکھ رہے ہیں اِنْ تَاْتَا
 حسین کہ یہ ایسا بار کا کام ہے کہ رائج تفسیر و تعلیم فرمادی گئی

وَيَاۤاٰدَمُ اَعْمِدْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا ۖ فَيَهْمُ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اَلْيَاۤتِ وَيَعْلَمُ
 اے آدمی کہ جو رخصتہ اور آدمی ان کی کتبوں کی دعا کر کے اللہ تعالیٰ کی آیتیں اور صحیفہ لکھ کر
 اَلْيَاۤتِ وَيَعْلَمُ وَيَقْرَأُ فِيْهِمْ مَا اَنْتَ اَنْتَ اَلْفِيْزُ اَلْحَكِيْمُ
 کتاب اور شکر کی چاہی اور پاک کرے ان کو جسک تو کی بہت اور دست برکی صحت والا

صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق ایک ہی معنوں ایک ہی طرح کے الفاظ ہیں آج سے جن میں ان حضرات صلی اللہ علیہ وسلم کے اس دنیا میں مقرریت لانے کے مقاصد آپ کے بعد نبوت و رسالت کے فرائض منصبی میں بیان کیے گئے ہیں آپ ایک مخلوق تھے، دوسرے تعلیم کتاب و حکمت و نبوت و رسول کا تزکیہ انسان و غیرہ۔

یہاں پہلی بات قابل غور کرنا کہ واقعہ الفاظ سے یہ قول بقیہ کا معانی ہے، یہاں مخلوق و تعلیم کو ایک ایک بیان کرنے سے یہ عمل ہو کر مشرک ان کریم میں جس طرح معانی مقصود ہیں اس کے الفاظ بھی متشکل مقصود ہیں، ان کی تلاوت و حفاظت قرآن اور اہم عبادت پر، یہاں یہ بات بھی قابل نظر ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بلا واسطہ شاگرد اور مخاطب خاص وہ حضرات تھے جو عرب و زمانہ کے مہارت جاننے والے بلکہ اس کے فصیح و بلیغ خطیب اور شاعر بھی تھے ان کے سامنے قرآن و علی کا ہذا جاسی تھا براہ کرم یہاں تک کہ ان کا دل چاہتا تھا کہ قرآن ہی کو نہایت ہی عزیز رکھیں اور اس کے بعد دوسرا مقصد رسالت قرآن دینے کی کیا ضرورت تھی، جبکہ محل کے اعتبار سے یہ دونوں مقصد ایک ہی ہو جاتے ہیں، اس میں خود یہاں سے خود و اہم نتیجہ آپ کے سامنے آئیں گے، اولیٰ یہ کہ مشرک ان کریم و دوسری کتابوں کی طرح ایک کتاب نہیں جس میں صرف معانی مقصود دہکتے ہیں الفاظ ایک ٹاٹری حیثیت رکھتے ہیں، ان میں اگر موزون و متوازن بھی ہو جائے تو کوئی حرج نہیں سمجھا جاتا، ان کے الفاظ بغیر معنی کیے ہوئے پڑھنے و سنانا بالکل لغو و فضول ہے بلکہ مشرک ان کریم جس طرح معانی مقصود ہیں اسی طرح الفاظ بھی مقصود ہیں، اور الفاظ قرآن کے ساتھ خاص خاص احکام مشرک جس متعلق ہیں، یہی وجہ ہے کہ اصولی فہم مشرک ان کریم کی یہ توفیق کی گئی ہے کہ وہ انظم و لاطیف جیسا ہیں مشرک ان نام سے الفاظ اور معنی دونوں کا ہی سے سلوک ہو گا اگر معانی مشرک ان کو الفاظ قرآن کے علاوہ دوسرے الفاظ اور دوسری زبان میں لکھا جائے تو وہ قرآن کہلانے کا مستحق نہیں، اگرچہ معانی بالکل صحیح و درست ہی ہوں، ان معانی پر فائدہ کو ہرے ہونے الفاظ میں کوئی شخص غامض نہیں پڑھے، تو سزاوارا ہوگی، اسی طرح وہ تمام احکام کو مشرک ان سے متعلق ہیں اس پر غامض نہیں ہوں گے، قرآن کریم کی تلاوت کا جو ثواب احادیث صحیحہ میں وارد ہے وہ چل ہوئی تو ان کا بدلہ ہونے الفاظ پر رتب نہیں ہوگا، اور اس لئے فقہائے اہل سنت نے قرآن کریم کا صرف ترجمہ بلا معنی مشرک ان کے لکھنے اور چھاپنے کو ممنوع فرما دیا ہے، جس کو عرب میں اردو کا مشرک ان یا انگریزی کا قرآن کہل جاتا ہے، یہ کوہ و حقیقت چر مشرک ان اور وہ انگریزی میں نقل کیا گیا وہ قرآن کہلانے کا مستحق نہیں۔

خلاصہ یہ کہ آیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرائض منصبی میں تعلیم کتاب

سے مقررہ تلاوت آیات کو ہذا کا فہم مشرک ان سے کہ اس کی طرف اشارہ کر دیا کہ مشرک ان کریم میں جس طرح اس کے معانی مقصود ہیں، اسی طرح اس کے الفاظ بھی مقصود ہیں، مگر ہذا تلاوت الفاظ کی ہوتی ہے، معانی کی نہیں، اس لئے جس طرح رسول کے فرائض میں معانی کی تعلیم اور اعلیٰ ہے، اہل قرآن الفاظ کی تلاوت اور حفاظت بھی ایک مستقل فہم ہے، اس میں شبہ نہیں کہ مشرک ان کریم کے نزول کا اصل مقصد اس کے بتائے ہوئے نظام مذہبی پر عمل کرنا اور اس کی تعلیمات کو پھیلانا اور پھیلانے، بعض اس کے الفاظ تلاوت لینے پر قناعت کر کے بیٹھ جانا قرآن کریم کی حقیقت سے بے خبری اور اس کی بے قدری ہے۔

قرآن کریم کے الفاظ اگر کچھ کیڑے جاہل ہیں، انہی اس کے ساتھ یہ بتا سکی ہر طرح ہمیں کہ جب بتا سکیں، مگر جوہر و اہم غلطی نہیں، ایک مشرک ان کریم کے الفاظ کے معانی نہ سمجھنے کی غلطی اس کے الفاظ کا بہت فضول ہے، یہ میں اس لئے واضح کر رہا ہوں کہ آجکل بہت سے حضرات قرآن کریم کو دوسری کتابوں پر فہم کر کے پڑھتے ہیں کہ جب تک ایک کتاب کے معنی نہ سمجھیں تو اس کے الفاظ کا پڑھنا پڑھنا نا وقت ضائع کرنا ہے، مگر قرآن کریم میں ان کا یہ خیال صحیح نہیں ہے، کیونکہ قرآنی الفاظ اور معنی دونوں کا نام ہے، جس طرح ان کے معانی کا سمجھنا اور اس کے دینے ہونے احکام پر عمل کرنا فرض اور اعلیٰ عبادت ہے اسی طرح اس کے الفاظ کی تلاوت بھی ایک مستقل عبادت اور ثواب غلطی ہے۔

دوسرا مقصد تعلیم کتاب جس دور ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ اور معانی مشرک ان کو مستحب سے زیادہ جاننے والے اور سمجھنے والے تھے، انہوں نے محض معنی سمجھنے اور مستقل کرنے کو کافی نہ سمجھا، سمجھنے اور ادراک کرنے کے لئے تو ایک مرتبہ پڑھ لینا کافی تھا، انہوں نے ساری عرصہ اپنی آن کو نہ جاننا سے رکھا، جسے معیار و زادہ ایک قرآن مجید ختم کرنے تھے، لیکن دونوں میں اور کچھ اجازت نہیں، دن میں پڑھ مشرک ان کے مادی تھے، اور ہر ہفتہ میں مشرک ان ختم کرنے کا تہیہ پوری اشت کا عمل رہا ہے، قرآن کریم کی سات منزلیں اسی ہفتہ واری حملوں کی علامت ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ کا یہ عمل بخیر و بکرم جس طرح قرآن کے معانی کا سمجھنا اور عمل کرنا اعلیٰ عبادت ہے، اسی طرح اس کے الفاظ کی تلاوت بھی عبادت و عبادت اور جوہر و اہم اور دیکھتے اور صرفانہ سعادت سمجھا ہے، اس لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرائض منصبی میں تلاوت آیات کو ایک مستقل حیثیت دی گئی، مقصد یہ کہ جو مسلمان فی الحال معانی مشرک ان کو نہیں سمجھتے وہ اس بد قسمتی میں مبتلا نہ ہو جائے کہ الفاظ کو فضول سمجھ کر اس سے بھی محروم ہو جائیں، کو شش کرنے و ہناظر وہی ہے کہ وہ

میں بہت سے لوگ افراد و گروہوں کی غلط روش میں چڑھ جاتے ہیں جن کا نتیجہ بھانے فالوہ اصطلاحات
فہمقان اور بھانے اصلاح کے منظر پر ہوتا ہے۔

بعض لوگ کتاب اللہ کو نظر انداز کر کے صرف علم، و مشائخ ہی کو قلیل مقصود بنالینے
اور ان کے متبع شریعت ہونے کی تحقیق نہیں کرتے، اور یہ اصلی مرض یہود و نصاریٰ کا ہے کہ
وَيَخْلُقُونَ فِئَ الْخَنَازِيرِ وَيَقُولُونَ خَيْرٌ مِّنْهَا قَوْلُهُمْ إِنَّ اللَّهَ لَغَنِيٌّ عَنِ الْعَالَمِينَ (۱۱۶) ”میں ان لوگوں نے اپنے علمائے
گمراہ سے سوا اپنا منہ اور قلیل مقصود بنالیا۔ ظاہر ہے کہ یہ راستہ شرک و کفر ہے، اور ان کو
انسان اس راستہ میں برادر ہونے، اور ہر وہ اس کے معاند میں باطن و وہ لوگ بھی ہیں جو
معلوم مشرک و حدیث کے حاصل کرنے میں کسی علم و عرفی کی ضرورت ہی نہیں سمجھتے، وہ کہتے ہیں
کہ ہمیں صرف اللہ کی کتاب کافی ہے، نہ ظاہر علم، نہ ضرورت، نہ تحقیق، نہ مشائخ کی حاجت
یہ دوسری گمراہی ہے، جس کا نتیجہ بدست سے اصل کو نشانہ افراط کا شکار ہوتا ہے، کیونکہ
ناہرین کی مادی و دماغیت کے بغیر کسی فی کا نتیجہ حاصل ہونا انسانی فطرت کے خلاف ہے، ایسا
کرنے والا قطعاً غلط ہے، اور یہ غلط فہمی بعض اوقات اس کو دین و ملت
سے بالکل نکال دیتی ہے۔

اس لئے ضرورت اس کی ہے کہ ان دو چیزوں کو اپنے اپنے مقامات اور حدود میں رکھ کر
ان سے فائدہ اٹھا جائے، یہ سمجھا جائے کہ حکم اصلی صرف ایک وحدہ لا شریک لہ کا ہے، اور
اطاعت اصل میں اسی کی ہے، رسول بھی اسی پر عمل کرنے اور کرنے کا ایک ذریعہ ہے، رسول
کی اطاعت بھی اصل میں فطرت ہی کی جاتی ہے، نہ کہ وہ لپیٹ اللہ جل جلالہ کی اطاعت ہے، ہاں
اس کے ساتھ قرآن و حدیث کے سمجھنے میں، اور ان کے احکام پر عمل کرنے میں جو عملی یا عملی مشکلات
ساختہ آئیں اس کے لئے انہیں کے قول و فعل سے امداد لینے کو سبب سعادۃ و نجات سمجھنا
ضروری ہے، آیت مذکورہ میں رسول قبول صلی اللہ علیہ وسلم کے فرائض میں بھی میں تعلیم کتاب کو داخل
فرمانے سے ایک دوسرا فائدہ بھی نکالنا چاہیے کہ جب قرآن جس کے لئے تعلیم رسول ضروری ہو تو اس کے سبب
شرک پر بھی عمل ناکنیں ہر وہ جو اس طرح قرآن قیامت تک محفوظ ہے اس کا ایک ایک ذریعہ ذریعہ
محفوظ ہے، ضروری ہے کہ تعلیمات رسول بھی جو شریعت سے قیامت تک باقی اور محفوظ رہیں،
درخص الفاظ و مشرک کے مفرد ہونے سے نزدیک مشرک ان کا اصلی مقصد پروردگار کا ہے، اور یہ بھی
ظاہر ہے کہ تعلیمات رسول صلی اللہ علیہ وسلم یہی ہیں جو کونست یا دینہ رسول کہا جاتا ہے، اس کی
حفاظت کا وعدہ اللہ جل جلالہ کی طرف سے اگرچہ اس درجہ میں نہیں ہے، جس درجہ کی حفاظت قرآن
کے لئے ضروری ہے۔

إِنَّا نَحْنُ مُرْسِلَتِ الْوَحْيِ كَرُورًا
لَهُ لَخَفِظُ قَوْلِهِ

ہم نے قرآن کو نازل کیا، اور ہم اس کی
حفاظت کر رہے ہیں

جس کا نتیجہ ہے کہ اس کے الفاظ اور ذریعہ رنگ بالکل محفوظ رہے ہیں، اور قیامت
تک اسی طرح محفوظ رہیں گے، منہج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ اگرچہ اس طرح
محفوظ نہیں ہیں مگر شریعت کے آپ کی تعلیمات کا محفوظ رہنا آیت مذکورہ کی قور سے لازمی ہے،
اور محمد اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ الفاظ بیان کی ہیں، جب کسی وقت سے اس میں خدائے الٰہی کی غلط روایات
کی کمی مرض کی گئی، انہیں منہج نے وہ دوسرا روایات کا بیان کیا، ان کو محمد کر رکھا، اور قیامت
تک یہ سلسلہ بھی اسی طرح رہے گا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میری امت میں قیامت
تک ایسی جماعت رہے گی جو قرآن کو محفوظ رکھے گی، اور قرآن کو حدیث کو صحیح طور پر محفوظ رکھے گی،
اور ان میں ڈالے گئے ہر شخص کی اصلاح کرتی ہے کہ

خدا صبر ہے کہ جب قرآن پر عمل کرنے کے لئے تعلیم رسول ضروری ہے، اور یہ بھی ظاہر ہے
کہ مشرک ان پر عمل قیامت تک فرض ہے، تو لازم ہے کہ قیامت تک تعلیمات رسول بھی باقی
اور محفوظ رہیں، اس لئے آیت میں تعلیمات رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے قیامت تک باقی اور محفوظ
رہنے کی بھی پیش گوئی موجود ہے، جس کو اللہ تعالیٰ نے صحابہ پر کلام کے لئے کراچ تک علم حدیث کے
باعطاف اور مشرکین کو ان کے ذریعہ محفوظ رکھا ہے، اس سے اس دلیل و ادعا کی محبت کھل جاتی
ہے جو کچھ جمل بعض لوگوں نے احکام اسلام سے جان بچانے کے لئے یہاں تو مشاہیر کو موجودہ و خفیہ
حدیث محفوظ رکھنا قابلِ تہلیل نہیں ہے، ان کو معلوم ہونا چاہیے کہ ذریعہ حدیث سے اعتقاد نہ پڑنے
قرآن پر بھی اعتقاد رکھنا کوئی راستہ نہیں دیتا۔

آیت مذکورہ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرائض میں ضروری قرار دیا ہے، قرآن کے
سم کے باقی حفاظت اور تحفظ میں سے پاک کرنا ہے، جن شرک و کفر و عداقتا سے دفعہ تفریق
اطلاق کلمہ حرص و طمع، بعض رسد و تحفظ حال و جادہ و خیریت سے پاک کرنا۔

معاذ اللہ! یہاں صرف تعلیم ہی کی ذمہ داری نہیں ہے، بلکہ اس میں مستحق مقصد و حالت اور رسول کا فرض
اور ایسی اخلاقی تربیت بھی ضروری ہے کہ
تعلیم کی تعلیم ہی جو کچھ تعلیم سے مادی اصلاح و اعتقاد نہیں ہوتی جب تک کسی قرابت یا
رہی کے ذریعہ فطری تربیت حاصل نہ کرے، کیونکہ تعلیم کا کام درحقیقت یہ ہے کہ راستہ
نکال دیتا ہے، مگر ظاہر ہے کہ منزل مقصود تک پہنچنے کے لئے بعض راستہ جان لینا تو کافی نہیں
جب تک جہت کر کے قدم نہ اٹھائے اور راستہ نہ چلے، اور بہت کا نتیجہ نذرانی بہت کی سمیت

نیکو سے سب غلطی باجھو گئے ہوئے تھے، حقیقت میں سب ہمہ پہن آفریں تھیں اور میں سب
اہل انبی اور دینِ فطرت کے مطابق تھی۔
خلاصہ کلام یہ ہو کر اللہ تعالیٰ شانہ کی طرف سے جتنے انبیاء علیہم السلام تشریف لائے
اور جن کا جس اور کس طرح نازل ہوا ہے ان سب کی دوح اسلام میں اطاعت تھی۔ جس کا
مطلب یہ ہے کہ نفسانی خواہشات کے مقابل میں نفس راہی کی اطاعت اور اطاعتِ ہنری کو جو ہرگز
اتباعِ ہنری کا باندی۔

افسوس ہے کہ کج اسلام کا نام لینے والے لکھنؤ مسلمان ہیں اس حقیقت سے بیگانہ ہو کر
اور وہی مذہب کے نام پر ہی اپنی خواہشات کا اتباع کرنا چاہتے ہیں، انھیں قرآن و حدیث
کی صرف وہ تفسیر و تفسیر بھی معلوم ہوتی ہے جو ان کی خواہش کے مطابق ہو ورنہ یہ کوشش کرتے ہیں
کہ جہادِ فطرت کو کچھ نہ مان کر کلیجہ سے نکال کر اپنی خواہش اور اوجامِ نفسانیت کے بتوں کا لباس پہنا کر
اللہ پیچھے میں دین مذہب کا اتباع نظر آئے، اگرچہ وہ حقیقت میں خالص اتباعِ ہنری اور خواہشات
کی پیروی ہی ہے۔

سورہ شرا و سجدہ و آلہ پشیمان پشانیہ

چند پروردگار سب وہی مسلمان ہیں ہم

نافل انسان یہ نہیں جانتا کہ ہر جملہ اور نامی مخلوق کے سامنے تو جہل بھی ہیں، اگرچہ ان
کے سامنے ہیں کا علم و ذوق کو محیط کر دینا ان کے لیے ہے جو انہوں نے جہل کو دیکھا اور
ہے اس کے آگے بجز خالص اطاعت کے کوئی چکر نہ گھومیں۔

کاوا با حشون آدمی جملہ راست

باعتدال و ترویر و حیدلہ کے راست

حقیق اسلام یہ ہے کہ اپنی خواہش اور خواہشات سے باطل غالی اللہ ہیں ہو کر انسان
کواس کی محاکم ہو کہ حضرت جہل سنانہ کی رضا کی کام میں ہے، اور اس کا قرآن میرے لئے کیا
وہ ایک فریاد و غلام کی طرح گوشِ برادرانہ ہے، اگر کسی طرف جلتے کا اور کسی کام کا حکم ہوتا ہے
اور اس کام کو کس انداز سے کیا جائے، اس سے وہ معذور ہوا اور یہ الگ دلائل جو اس کام کا علاج
ہندگی ہے۔

دور و حق و دوسرے اعزاز میں بیست

ہستہ دار و گوش را بہ پیام سرور واد

اس جذبہ اطاعت و محبت کا کمال انسان کی ترقی کا اتنی مقام ہے جس کو مقامِ عبودیت

کہا جاتا ہے، یہی وہ مقام ہے جہاں پہنچ کر حضرت ابراہیم علیہ السلام علیہ السلام کا خطاب پاتے
ہیں اور سب اہل رسل خاصاً انہوں نے اصل اللہ علیہ وسلم کو بتایا کہ اللہ کا خطاب ہے، اس حدیث کو
اطاعت کے ذریعہ رجا ہے راست کے اولیاء و اقطاب و ابدال کے و رحمت و انوار ہے، اس اور
حقیقی توحید ہے جس کے عمل ہونے پر انسان کی خوف و امید صرف ایک اللہ تعالیٰ شانہ کے ساتھ
لاستہ ہو جاتے ہیں۔

امید و ہراسش ہائستہ و کس

ہیں ست بناوی و حید و کس

غرض اسلام کے معنی اور حقیقت اطاعت تھی ہے، اور اس کا واسطہ صرف اتباعِ
وہی اللہ صلی اللہ علیہ وسلم و کلامِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہے جس کو قرآن کریم نے واضح الفاظ میں اس طرح ارشاد فرمایا

قُلْ أَطِيعُوا اللَّهَ أَطِيعُوا الرَّسُولَ

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّبِعُوا الصَّلَافَ

فَيُفْسِدُوا صَالِحَكُمْ وَاللَّهُ يَهْدِي الْقَوْمَ الْقَائِمَ

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّبِعُوا الصَّلَافَ

فَيُفْسِدُوا صَالِحَكُمْ وَاللَّهُ يَهْدِي الْقَوْمَ الْقَائِمَ

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّبِعُوا الصَّلَافَ

فَيُفْسِدُوا صَالِحَكُمْ وَاللَّهُ يَهْدِي الْقَوْمَ الْقَائِمَ

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّبِعُوا الصَّلَافَ

فَيُفْسِدُوا صَالِحَكُمْ وَاللَّهُ يَهْدِي الْقَوْمَ الْقَائِمَ

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّبِعُوا الصَّلَافَ

فَيُفْسِدُوا صَالِحَكُمْ وَاللَّهُ يَهْدِي الْقَوْمَ الْقَائِمَ

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّبِعُوا الصَّلَافَ

فَيُفْسِدُوا صَالِحَكُمْ وَاللَّهُ يَهْدِي الْقَوْمَ الْقَائِمَ

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّبِعُوا الصَّلَافَ

فَيُفْسِدُوا صَالِحَكُمْ وَاللَّهُ يَهْدِي الْقَوْمَ الْقَائِمَ

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّبِعُوا الصَّلَافَ

فَيُفْسِدُوا صَالِحَكُمْ وَاللَّهُ يَهْدِي الْقَوْمَ الْقَائِمَ

تجزیہ سب کی قسم وہی ہوں نہیں گئے

ہنگ و آہ کا پتہ نام انھوں نے معاملات

مرا بخیر و کرم اس اور کچھ دیکھ نہ گئے

دل علی سرور نہ کرے اور ذلیل نہ گئے

دل سے تسلیم نہ کرے یہ

مسئلہ آیت مذکورہ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی اولاد کو وصیت فرمائی،
اور ان سے یہ کہنا کہ اسلام کے سوا اور کسی طاقت اور کسی ملت پر درمنا، مراد اس کی یہ
ہو کہ اپنی زندگی میں اسلام اور اسلامی تعلیمات پر چلنے سے مل کر رہو، اور اگر اللہ تعالیٰ تعالیٰ
بھی اسلام ہی پر فرمائے، جیسا کہ ہمیں روایت میں ہے کہ ہم اپنی زندگی میں جس حالت کے پند
دہو گے، اسی حالت پر رضائے موت بھی ہوگی، اور اسی حالت میں عشر میں قائم ہو گے، اور انھوں نے
کی عادت میں ہے کہ ہر بندہ نیکی کا قصد کرتا ہے، اور اس کے لئے اپنے مفاد کے مطابق کوشش
کرتا ہے، وہ اللہ تعالیٰ اس کو نیکی کی توفیق دیتے ہیں، اور یہ کام اس کے لئے آسان کر دیتے ہیں،

اس معاملہ میں اس حدیث سے شبہ نہ کیا جائے جس میں ہاد ثا ہے کہ بعض آدمی جنت کے
کام اور اہل جنت کے عمل پر پیش کرنا چاہتے ہیں، جہاں تک کہ اس شخص اور جنت کے دیکھان صرف ایک
اتحاد کا مسئلہ رہ جاتا ہے، مگر جس کی تقدیر غالب آجاتی ہے، اللہ اپنی دوزخ کے سے کام کرنے لگتا
ہے اور انھیں کار و دوزخ میں جا کر، اسی طرح بعض آدمی دوزخ کے کام میں مشغول رہتا ہے،
یہاں تک کہ اس کے لئے دوزخ کے دہان صرف ایک اتحاد کا فاصلہ رہ جاتا ہے، مگر تقدیر غالب آتی
ہے اور انھیں اہل جنت کے کام کرنے لگتا ہے، اور جنت میں داخل ہو جاتا ہے۔

طرت نچ کرنا تو وہ بھی بے جا نہ ہوتا۔

لیکن ایک دوسری محنت اہلہ اس کی مفتضی ہوئی کہ تمام عبادت گزاروں کا رخ ایک ہی طرف ہونا چاہئے، اور وہ یہ ہے کہ عبادت کی مختلف قسمیں ہیں، بعض انفرادی ہیں، بعض اجتماعی، ذکر اللہ اور روزہ وغیرہ انفرادی عبادات ہیں جن کو خلوت میں اور انفرادی کے ساتھ ادا کیا جاسکتا ہے، اور نماز اور حج اجتماعی عبادات ہیں جن کو جماعت و اجتماع و اعلان کے ساتھ ادا کیا جاتا ہے، ان میں عبادت کے ساتھ مسلمانوں کو اجتماعی زندگی کے آداب کا بتلانا اور سکھانا بھی پیش نظر ہے، اور یہ بھی بالکل ظاہر ہے کہ اجتماعی نظام کا سب سے بڑا بنیادی اصولی افراد کثرت کی وحدت اور یک جہتی ہے، یہ وحدت عینی زیادہ قوی سے قوی ہوگی اتنا ہی اجتماعی نظام مستحکم اور مضبوط ہوگا، انفرادیت اور تشتت اجتماعی نظام کے لئے سبب قائل ہے، پھر نقطہ وحدت متعین کرنے میں ہر مکتب ہر زمانہ کے لوگوں کی مختلف راہیں رہی ہیں، کبھی قوم نے نسل اور نسب کو نقطہ وحدت قرار دیا، کسی نے وطن اور جغرافیائی خصوصیات کو، کسی نے رنگ اور زبان کو۔

لیکن دین الہی اور شرائع انبیاء علیہم السلام نے ان غیر اختیاری چیزوں کو نقطہ وحدت بنانے کے قابل نہیں سمجھا، اور نہ درحقیقت یہ چیزیں ایسی ہیں جو پورے افراد انسانی کو کسی ایک مرکز پر جمع کر سکیں، بلکہ جتنا غور کیا جائے یہ وحدتیں درحقیقت افراد انسانی کو بہت سی کثرتوں میں تقسیم کر ڈالنے اور آپس میں ٹکرات اور اختلافات کے اسباب ہیں۔

دین اسلام نے جو درحقیقت تمام انبیاء علیہم السلام کا دین ہے وحدت کا اصل نقطہ فکر و خیال اور عقیدہ کی وحدت کو متعارف دیا، اور کرداروں خداؤں کی پرستش میں بیٹی ہوئی دنیا کو ایک ذات حق وحدۃ لا شریک لہ کی عبادت اور اطاعت کی دعوت دی جس پر مشرق و مغرب اور ماضی و مستقبل کے تمام افراد انسانی جمع ہو سکتے ہیں، پھر اس حقیقی فکری اور فطری وحدت کو عملی صورت اور قوت دینے کے لئے کچھ ظاہری وحدتیں بھی ساتھ لگائی گئیں، مگر ان ظاہری وحدتوں میں بھی اصول یہ رکھا گیا کہ وہ عملی اور اختیاری ہوں، تاکہ تمام افراد انسانی ان کو اختیار کر کے ایک رشتہ اخوت میں منسلک ہو سکیں، نسب، وطن، زبان، رنگ وغیرہ اختیاری چیزیں نہیں ہیں جو شخص ایک خاندان کے اندر پیدا ہو چکا ہے وہ کسی طرح دوسرے خاندان میں پیدا نہیں ہو سکتا، جو پاکستان میں پیدا ہو چکا وہ انگلستان یا افریقہ میں پیدا نہیں ہو سکتا، جو کالا ہو وہ اپنے اختیار سے گورا، اور جو گورا ہے وہ اپنے اختیار سے کالا نہیں ہو سکتا۔

اب اگر ان چیزوں کو مرکز وحدت بنایا جائے تو انسانیت کا سیکڑوں بلکہ ہزاروں ٹکڑوں اور گروہوں میں تقسیم ہو جانا ناگزیر ہوگا، اس لئے دین اسلام نے ان چیزوں سے تمدنی

معاہدہ ابستہ ہیں ان کا برابر احترام رکھتے ہوئے ان کو وحدت انسانی کا مرکز نہیں بننے دیا، کبر و حدتیں افراد انسانی کو مختلف کثرتوں میں بانٹنے والی ہیں، ہاں خست یاری امور میں اس کی پوری رعایت کی کہ فکری وحدت کے ساتھ عمل اور صورتی وحدت بھی قائم ہو جائے، مگر اس میں بھی اس کا پورا لحاظ رکھا گیا کہ مرکز وحدت ایسی چیزیں بنائی جائیں جن کا اختیار کرنا ہر مرد و عورت کے لئے آسان اور ہر شہری اور دیہاتی امیر و غریب کو یکساں طور پر آسان ہو، وہی وجہ ہے کہ شریعت اسلام نے تمام دنیا کے لوگوں کو لباس اور مسکن کھانے اور پینے کے کسی ایک طریقہ کا پابند نہیں کیا، کہ ہر جگہ کے موسم اور لمبائے مختلف اور ان کی ضروریات مختلف ہیں، سب کو ایک ہی طرح کے لباس یا شعاہ یونیفارم کا پابند کر دیا جائے تو بہت سی مشکلات پیش آئیں گی، پھر اگر یونیفارم کم سے کم تجویز کر دیا جائے تو یہ اعتدال انسانی پر ظلم ہوگا، اور اللہ تعالیٰ کے دینے ہوئے عمدہ لباس اور عمدہ کپڑوں کی بے حرمتی ہوگی، اور اگر اس سے زائد کسی لباس کا پابند کیا جائے تو فریب مغلس لوگوں کو مشکلات پیش آئیں گی۔

اس لئے شریعت اسلام نے مسلمانوں کا کوئی ایک شعاہ یونیفارم مقرر نہیں کیا، بلکہ مختلف قوموں میں جو طریقے اور ادوار لباس کی رائج تھیں ان سب پر نظر کر کے ان میں سے جو صورتیں اسرار بجا یا نفع وغیرہ یا کسی غیر مسلم قوم کی قتالی پر مبنی تھیں صرف ان کو ممنوع قرار دے کر باقی چیزوں میں ہر فرد اور ہر قوم کو آزاد اور خود مختار رکھا، مرکز وحدت ایسی چیزوں کو بنایا گیا جو اختیاری ہیں ہوں اور آسان اور مستحسبی بھی، ان چیزوں میں جیسے جماعت نماز کی صف بندی، ایک امام کی فعل و حرکت کی عمل پابندی، حج میں لباس اور مسکن کا اشتراک وغیرہ ہیں۔

اسی طرح ایک اہم چیز سمت قبلہ کی وحدت بھی ہے، کہ اگرچہ الشعل شائد کی ذات پاک ہر سمت وجہت سے بالاتر ہے، اس کے لئے مشن جہت یکساں ہیں، لیکن نماز میں اجتماعی صورت اور وحدت پیدا کرنے کے لئے تمام دنیا کے انسانوں کا رخ کسی ایک ہی سمت وجہت کی طرف ہونا ایک بہترین اور آسان اور بے قیمت وحدت کا ذریعہ ہے، جس پر سارے مشرق و مغرب اور جنوب و شمال کے انسان آسانی سے جمع ہو سکتے ہیں، اب وہ ایک سمت وجہت کو کسی وجہ کی طرف ساری دنیا کا رخ پھیرا جائے، اس کا فیصلہ اگر انسانوں پر چھوڑا جائے تو یہی ایک سب سے بڑا اختلاف و نزاع بن جاتی ہے، اس لئے ضرور تھا کہ اس کا تعین خود حضرت حق جل و علا شائد کی طرف سے ہوتا، حضرت آدم علیہ السلام کو دنیا میں اتارا گیا، تو فرشتوں کے ذریعہ بیت اللہ کعبہ کی بنیاد پہلے ہی رکھ دی گئی تھی، حضرت آدم اور اولاد آدم علیہ السلام کا سب سے پہلا قبلہ یہی بیت اللہ اور خانہ کعبہ بنایا گیا

لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللَّهِ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

سب سے پہلا گھر جو لوگوں کے لئے بنایا گیا وہ گھر جو کہ میں ہر برکت والا، ہدایت والا چاند اور سورج

نوح علیہ السلام تک سب کا قبلہ ہی بیت اللہ تھا، مگر ان نوح علیہ السلام کے وقت پوری دنیا فرق ہو کر تباہ ہو گئی، بیت اللہ کی عمارت بھی مہدم ہو گئی اور ان کے بعد حضرت خلیل اللہ اور ابراہیم علیہما السلام نے دوبارہ مجسم خداوندی بیت اللہ کی تعمیر کی، اور یہی ان کا اور ان کی امت کا قبلہ رہا، اس کے بعد انبیاء بنی اسرائیل کے لئے بیت المقدس کو قبلہ قرار دیا گیا اور بقول ابوالعالیہ انبیاء سابقین جو بیت المقدس میں نماز پڑھتے تھے وہ بھی عمل ایسا کرتے تھے کہ معزۃً بیت المقدس بھی سامنے رہے اور بیت اللہ بھی۔ (ذکرہ القزلبی)

حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم پر جب نماز فرض کی گئی تو بقول بعض علماء ابتداء آپ کا قبلہ آپ کے جد امجد حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قبلہ یعنی خاند کعبہ ہی قرار دیا گیا، مکہ مکرمہ سے ہجرت کرنے اور مدینہ طیبہ میں قیام کرنے کے بعد اور بعض روایات کے اعتبار سے ہجرت مدینہ سے کچھ پہلے آپ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ حکم ہوا کہ آپ بیت المقدس کو اپنا قبلہ بنائیے، صبح بخاری کی روایت کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سولہ سترہ مہینے بیت المقدس کی طرف نماز ادا فرمائی مسجد نبوی میں آج تک اس کی علامات موجود ہیں، جہاں کھڑے ہو کر آپ نے بیت المقدس کی طرف نمازیں ادا فرمائی تھیں۔ (قرطبی)

حکم خداوندی کی تعمیل کے لئے ترستہ الرسل سزا پا اطااعت تھے، اور حکم خداوندی کے مطابق نمازیں بیت المقدس کی طرف ادا فرما رہے تھے، لیکن آپ کی طبعی رغبت اور دلی خواہش یہی تھی کہ آپ کا قبلہ پھر وہی آدم علیہ السلام اور ابراہیم علیہ السلام کا قبلہ مقرر دیدیا جائے، اور چونکہ عادتہ اللہ یہی ہے کہ وہ اپنے مقبول بندوں کی مراد اور خواہش و رغبت کو پورا فرماتے ہیں۔

تو چنان خواہی حشر را خواہد چشید

می دهد یزدان مرا در شفقتش

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی یہ امید تھی کہ آپ کی غمنا پوری کی جائے گی، اور اس لئے انتظار دہی میں آپ بار بار آسمان کی طرف نظروں اٹھا کر دیکھتے تھے، اسی کا بیان قرآن کی اس آیت میں ہے۔

مَنْ تَرَى قَلْبَ وَجْهِكَ فِي
السَّمَاءِ فَلْيُوَلِّسْنَاكَ قِبْلَةً تَرْضَاهَا
قَوْلِي وَجْهِكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ
الْحَرَامِ (١٢٢: ١)

”ہم دیکھ رہی ہیں آپ کا بارگاہِ انسان کی طرف
 نظر اٹھانا، سو ہم آپ کا قبلہ رہی بلا میں گئے
 جو آپ کو پسند ہو اس لئے آئندہ آپ نمازیں
 اپنا رخ مسجدِ حرام کی طرف کیا کریں“

اس آیت میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تمنا کا اظہار مفسر ماکر اس کو پورا کرنے کا حکم دے رہا گیا ہے، کہ آئندہ آپ مسجد حرام کی طرف رخ کیا کریں۔

نماز میں خاص بیت اللہ کا استقبال ضروری نہیں
اس کی سمت کا استقبال بھی پروردگار دنیا کیلئے کافی ہے۔

فرمایا گیا ہے، جس میں اشارہ ہے کہ بلاذریعہ کے رہنے والوں کے لئے یہ ضروری نہیں کہ عین بیت اللہ کی محاذات پائی جائے، بلکہ سمت بیت اللہ کی طرف رخ کر لینا کافی ہے، ہاں جو شخص مسجد حرام میں موجود ہے یا کسی شہر ہی پہاڑ پر بیت اللہ کو دیکھ رہا ہے، اس کے لئے خاص بیت اللہ ہی کی طرف رخ کرنا ضروری ہے، اگر بیت اللہ کی کوئی چیز بھی اُس کے چہرے کے محاذات میں نہ آئی تو اس کی نماز نہیں ہوتی، بخلاف ان لوگوں کے جن کے سامنے بیت اللہ نہیں کہ ان کے واسطے سمت بیت اللہ یا سمت مسجد حرام کی طرف رخ کر لینا کافی ہے۔

بہر حال ہجرت مدینہ سے سولہ ستر و چھ مہینے بعد پھر آپ کا اور مسلمانوں کا قبلہ بیت اللہ کو بنایا گیا اس پر جو اور بعض مشرکین و منافقین آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ پر یہ اعتراض کر لے گئے کہ ان کے دن کا بھی کوئی ٹھکانا نہیں، ان کا قبلہ بھی روز بروز بدلتا رہتا ہے۔

قرآن کریم نے ان کا یہ اعتراض آیت مذکورہ میں نقل فرمایا، مگر ساتھ ہی عنوان پر داکٹر یوسف لڑکے کا یہ اعتراض کرتے ہیں، اور ان کی بیوقوفی اس جواب سے واضح ہو گئی جو اس کے بعد ذکر فرمایا گیا ہے، ارشاد ہے، اَقْلُ يَتَّبِعُوا الشِّرْكَى وَالتَّغْيِبَاتِ هَؤُلَاءِ مَنْ لَمْ يَرْجُوا إِلَهًا إِلَّا اللَّهُ يُبَدِّلْ مَا شَاءَ اللَّهُ إِنَّ اللَّهَ لَهُ الْعِلْمُ الْيَوْمَ

"یعنی آپ فرمادیجئے کہ شرکی کے ہیں مشرق اور مغرب وہ جس کو چاہتا ہے سیدھی راہ چلا تا ہے"

اس میں استقبال قبلہ کی حقیقت کو واضح نہرا دیا کہ کعبہ اور بیت المقدس کی کوئی خصوصیت
بجز اس کے نہیں کہ حکم ربانی نے ان کو کوئی امتیاز دے کر قبلہ بنا دیا، وہ اگر چاہیں تو ان دونوں کے
علاوہ کسی تیسری چیز کو بھی قبلہ بنا سکتے ہیں، پھر جس کو قبلہ بنا دیا گیا اس کی طرف رخ کرنے میں
جو کچھ فضیلت اور ثواب ہر اس کی روح حکم حق جل شانہ کی اطاعت کے سوا کچھ نہیں، جو ان کی کعبہ
حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ملت کا بنیادی اصول ہے، اور اسی لئے دوسری آیت میں اور زیادہ
واضح فرمایا کہ :

لَيْسَ الْبِرَّ أَنْ تُوَلُّوا وُجُوهَكُمْ
قَبْلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَ
لَكِنَّ الْبِرَّ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ

(البقرة: ١٧٧)

”اس میں ذاتی کوئی نیکی اور ثواب نہیں کہ ہم
مشرق کی طرف رخ کرو یا مغرب کی طرف
نیکی اللہ پر ایمان لائے اور اس کی اطاعت
کرنے میں ہے۔“

اور ایک آیت میں فرمایا

فَاِتِمُّواْ شُرُكُوتَكُمْ وَحُبُّهُ
الَّذِي فِيْهِ (۱۵۱۲)

تین تم اللہ کے فرمان کے مطابق جس طرف
بھی رخ کرو اللہ تعالیٰ کی توجہ اسی طرف دے گی

ان آیات نے قبلہ اور استقبال قبلہ کی حقیقت کو بھی واضح فرمادیا کہ اس میں ان مقامات کی کوئی ذاتی خصوصیت نہیں، بلکہ ان میں فضیلت پیدا ہونے کا سبب یہ ہے کہ ان کو حق تعالیٰ نے قبلہ بنانے کے لئے خستہ یار فرمایا، اور اس کی طرف رخ کرنے میں ثواب کی وجہ بھی صرف یہی ہے، کہ حکم ربانی کی اطاعت ہے، اور شاید آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے قبلہ میں تغیر و تبدل منسرا نے کی یہ بھی حکمت ہو کہ عملی طور سے لوگوں پر یہ واضح ہو جائے کہ قبلہ کوئی ہت نہی، جس کی پرستش کی جائے، بلکہ اصل چیز حکم خداوندی ہے وہ بیت المقدس کی طرف رخ کرنے کا آگیا تو اس کی تعمیل کی، پھر جب کعبہ کی طرف رخ کرنے کا حکم مل گیا تو اس کی طرف رخ کرنا عبادت ہو گیا، اس کے بعد والی آیت میں خود قرآن کریم نے بھی اس حکمت کی طرف اشارہ کیا ہے جس میں فرمایا ہے:

وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِي كُنْتَ مَلِكًا
اِلَّا لِنُعَلِّمَ مَنْ يَشَاءُ الرِّسَالَ
مِمَّنْ يَنْعَلِبُ عَلٰى عَقْبَيْهِ (۱۲۳۱۲)

تین جس قبلہ پر آپ پہلے رہ چکے ہیں اس کو
قبلہ بنانا تو محض اس بات کو ظاہر کرنے کے
لئے تھا کہ کون رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا
اتباع کرتا ہوا اور کون پیچھے ہٹ جاتا ہے

اس حقیقت قبلہ کے بیان سے ان بیوقوف مخالفین کا بھی پورا جواب ہو گیا جو قبلہ کے بارے میں تغیر و تحول کو اصول اسلام کے منافی سمجھتے اور مسلمانوں کو طعن دیتے تھے، آخر میں ارشاد فرمایا:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ اِسْمِ بَلَدٍ يَّاسِجَ كِه سِيْدِي رَاہِی ہر کہ انسان
حکیم حق جان شائے کے لئے کربستہ منتظر رہے، جو حکم مل جائے اس پر بے چون و چرا عمل کرے اور
یہ سیدھی راہ اللہ تعالیٰ کے فضل سے مسلمانوں کو حاصل ہوئی۔

مسند احمد کی ایک حدیث میں حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اہل کتاب کو مسلمانوں کے ساتھ سب سے بڑا حسد تین چیزوں پر ہے: ایک یہ کہ ہفتہ میں ایک دن عبادت کے لئے مخصوص کرنے کا حکم ساری امتوں کو ملا تھا، یہود نے شیخ پر کا دن مقرر کر لیا، اور نصاریٰ نے اتوار کا، اور حقیقت میں عند اللہ وہ جمعہ کا دن تھا، جو مسلمانوں کے انتخاب میں آیا، دوسرے وہ قبلہ جو تحول کے بعد مسلمانوں کے لئے مقرر کیا گیا، اور کسی امت کو اس کی توفیق نہیں ہوئی، تیسرے امام کے پیچھے آئیں کہنا کہ یہ تینوں خصلتیں صرف مسلمانوں

کو بیشتر ہو گئیں اہل کتاب ان سے عذر دہیں۔

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَاكُمْ اُمَّةً وَسَطًا لِتَكُوْنُوْا اَشْهَادًا عَلٰى النَّاسِ وَتَكُوْنُ

اور اسی طرح کیا ہم نے تم کو امت معتدل تاکہ ہو تم گواہ لوگوں پر اور ہر رسول

الرَّسُوْلُ عَلَیْكُمْ شٰهِدٌ اَط

تم ہر گواہی دیتے والا۔

خلاصہ تفسیر

اور اسے متبعان محمد صلی اللہ علیہ وسلم، اسی طرح ہم نے تم کو ایسی ہی ایک جماعت بنادی ہے جو ہر پہلو سے (ہدایت اعتدال پر ہے، تاکہ دنیا میں شرف و امتیاز حاصل ہونے کے علاوہ آخرت میں بھی تمہارا بڑا شرف ظاہر ہو کہ تم ایک بڑے مقدمہ میں جس میں ایک فریق حضرات انبیاء علیہم السلام ہوں گے، اور فریق ثانی ان کی مخالفت قریں ہوں گی ان مخالف لوگوں کے مقابل میں گواہ (تجزیہ) ہو اور شرف بلائے شرف یہ ہوا کہ تمہارے (قابل شہادت اور مشہور ہونے کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم گواہ ہوں اور اس شہادت سے تمہاری شہادت معتبر ہونے کی تصدیق ہو، پھر تمہاری شہادت سے اس مقدمہ کا حضرات انبیاء علیہم السلام کے حق میں فیصلہ ہو اور مخالفین مجرم شرار پاکر سزا دیں ہوں، اور اس امر کا اعلیٰ درجہ کی عزت ہونا ظاہر ہے)

معارف مسائل

امت محمدیہ کا خاص اعتدال | لفظ وسط یعنی اوسط ہوا اور خیر الامور اور افضل الاشیاء کو وسط کہا جاتا ہے، ترمذی میں بروایت ابو سعید خدریؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے لفظ وسط کی تفسیر عدل سے کی گئی ہے، جو بہترین کے معنی میں آیا ہے (قرطبی) اس آیت میں امت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی ایک امتیازی فضیلت و خصوصیت کا ذکر ہے، کہ وہ ایک معتدل امت بنائی گئی، اس میں یہ بتلایا گیا ہے کہ جس طرح ہم نے مسلمانوں کو وہ قبلہ عطا کیا جو سب سے شرف و افضل ہو، اسی طرح ہم نے امت اسلامیہ کو ایک خاص امتیازی فضیلت یہ عطا کی ہے کہ اس کو ایک معتدل امت بنایا ہے، جس کے نتیجہ میں ان کو میدان چشم میں یہ امتیاز حاصل ہو گا کہ ساری انبیاء علیہم السلام کی امتیں جب اپنے انبیاء کی ہدایت و تبلیغ سے منکر جائیں گی، اور ان کو جھٹلا کر یہ کہیں گی کہ ہمارے پاس نہ کوئی کتاب آئی، نہ کسی نبی نے ہمیں کوئی ہدایت کی، اُس وقت امت محمدیہ انبیاء علیہم السلام کی طرف سے گواہی میں پیش

ہوگی اور یہ شہادت دے گی کہ انبیاء علیہم السلام نے ہر زمانے میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے لائی ہوئی ہدایت ان کو پہنچائیں، اور ان کو صحیح راستہ پر لانے کی متعدد و بھرپور سی کوشش کی، مدد علی علیہم امتیں امت محمدیہ کی گواہی پر جرح کریں گی کہ اس امت محمدیہ کا تو ہمارے زمانے میں وجود بھی نہ تھا، اس کو ہمارے معاملہ کی کیا خبر، اس کی گواہی ہمارے مقابلہ میں کیسے قبول کی جاسکتی ہے۔

امت محمدیہ اس جرح کا یہ جواب دے گی کہ بے شک ہم اس وقت موجود نہ تھے، مگر ان کے واقعات و حالات کی خبر میں ایک صادق مصدق رسول نے اور اللہ کی کتاب نے دی ہے، جس پر ہم ایمان لائے اور ان کی خبر کو اپنے معائنہ سے زیادہ وقیح اور سچا جانتے ہیں، اس لئے ہم اپنی شہادت میں حق بجانب اور سچے ہیں، اس وقت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پیش ہوں گے، اور ان گواہوں کا ترکیہ و توثیق کریں گے کہ بیشک انہوں نے جو کچھ کہا ہے وہ صحیح ہے، اللہ تعالیٰ کی کتاب اور میری تعلیم کے ذریعہ ان کو یہ صحیح حالات معلوم ہوئے۔

محشر کے اس واقعہ کی تفصیل صحیح بخاری، ترمذی، نسائی، اور مشاء احمد کی متعدد احادیث میں بخلاف اور مفصلاً مذکور ہے۔

الغرض آیت مذکورہ میں امت محمدیہ کی اعلیٰ فضیلت و شرف کا راز یہ بکلیا گیا ہے کہ یہ امت معتدل امت بنائی گئی ہے، اس لئے یہاں چند باتیں قابل غور ہیں۔

اعتدال امت کی حقیقت، اہمیت (۱) اعتدال کے معنی اور حقیقت کیا ہیں، (۲) وصف اعتدال کی نہایت اور اس کی کچھ تفصیل

الصلوۃ والسلام کے معتدل ہونے کا واقعات کی روش سے کیا ثبوت ہے، ترتیب لہران میں سوالوں کا جواب یہ ہے۔
۱۔ اعتدال کے لفظ معنی ہیں برابر ہونا، یہ لفظ عدل سے مشتق ہے، اس کے معنی بھی برابر کرنے کے ہیں۔

۲۔ وصف اعتدال کی یہ اہمیت کہ اس کو انسانی شرف و فضیلت کا معیار قرار دیا گیا، ذرا تفصیل طلب ہے، اس کو پہلے ایک محسوس مثال سے دیکھئے، دنیا کے جتنے تے اور پڑاے طریقے جہانی صحت و علاج کے لئے جاری ہیں، طبی یونانی، ویدک، ایلوپیتھک، ہومیو پیتھک وغیرہ سب کے سب اس پر متفق ہیں کہ بدن انسانی کی صحت اعتدالی مزاج سے ہے، اور جہاں یہ اعتدال کسی جانب سے خلل پذیر ہو رہی بدن انسانی کا مرض ہے، خصوصاً طلب یونانی کا تو بنیادی اصول ہی مزاج کی پہچان پر موقوف ہے، انسان کا بدن چار خلط خون، بلغم، سودا، صفراء سے مرکب اور انہی چاروں حسیلات سے پیدا شدہ چار کیفیات انسان کے بدن میں ضروری ہیں، گرمی، ٹھنڈک، خشکی اور ترری، جس وقت تک یہ چاروں کیفیات مزاج انسانی کے مناسب حدود کے اندر معتدل رہتی ہیں وہ بدن انسانی کی صحت تندرستی

کہلاتی ہے، اور جہاں ان میں سے کوئی کیفیت مزاج انسانی کی حد سے زیادہ ہو جائے یا گھٹ جائے وہی مرض ہے، اور اگر اس کی اصلاح و علاج نہ کیا جائے، تو ایک حد میں پہنچ کر وہی موت کا پیام ہو جاتا ہے اس محسوس مثال کے بداب روحانیت اور اخلاقیات کی طرف کیسے تو آپ کو معلوم ہو گا کہ ان میں بھی اعتدال اور بے اعتدالی کا یہی طریقہ جاری ہے، اس کے اعتدال کا نام روحانی صحت اور بے اعتدالی کا نام روحانی اور اخلاقی مرض ہے، اور اس مرض کا اگر علاج کر کے اعتدال پر نہ لایا جائے تو اس کا نتیجہ روحانی موت ہے، اور یہ بھی کسی صاحب بصیرت انسان پر محقق نہیں کہ جو ہر انسانی صحت جس کی وجہ سے انسان ساری مخلوقات کا حاکم اور مخدوم قرار دیا گیا ہے، وہ اس کا بدن یا بدن کے اجزاء و اخلاط یا ان کی کیفیات حرارت و برودت نہیں، کیونکہ ان اجزاء و کیفیات میں تو دنیا کے سارے جانور بھی انسانی صحت کے ساتھ شریک بلکہ انسانی صحت سے زیادہ صحت رکھتے والے ہیں۔

جو ہر انسانی صحت جس کی وجہ سے انسان اشرف المخلوقات اور آفت کے کائنات مانا گیا ہے، وہ اس کے گوشت پوست اور حرارت و برودت وغیرہ سے بالاتر کوئی چیز ہے، جو انسان میں کامل اور اکمل طور پر موجود ہے، دوسری مخلوقات کو اس کا وہ درجہ حاصل نہیں، اور اس کا معین کر لینا بھی کوئی باریک اور مشکل کام نہیں، کہ وہ انسان کا روحانی اور اخلاقی کمال ہے، جس نے اس کو صحت و بدن کائنات بنایا ہے، مولانا رومیؒ نے خوب فرمایا ہے

آدمیت لحم وشم و پوست نیست

آدمیت جسز رضاءے دوست نیست

اور اسی وجہ سے وہ انسان جو اپنے جوہر شرافت و فضیلت کی بے قدری کر کے اس کو ضائع کرتے ہیں ان کے لئے میں فرمایا ہے

ایستکم می بینی حنلاب آدم اند

نیستند آدم حنلاب آدم اند

اور جب یہ معلوم ہو گیا کہ انسان کا جوہر شرافت اور مدار فضیلت اس کے روحانی اور اخلاقی کالات ہیں، اور یہ پہلے معلوم ہو چکا ہے کہ بدن انسانی کی طرح روح انسانی بھی اعتدال و بے اعتدالی کا شکار ہوتی ہے، اور جس طرح بدن انسانی کی صحت، اس کے مزاج اور احتیاط کا اعتدال ہے، اسی طرح روح کی صحت بھی اور اس کے حسیلات کا اعتدال ہے، اس لئے انسان کا مل کہلائیگا مستحق صرف وہی شخص ہو سکتا ہے جو جسمانی اعتدال کے ساتھ روحانی اور اخلاقی اعتدال بھی رکھتا ہو، یہ کمال تمام انبیاء علیہم السلام کو خصوصیت کے ساتھ عطا ہوتا ہے، اور ہمارے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو انبیاء علیہم السلام میں بھی سب سے زیادہ یہ کمال حاصل تھا، اس لئے انسانی کامل کے اولین مصداق

آپ ہی ہیں، اور جس طرح جسمانی علاج معالجہ کے لئے ہر زمانہ اور ہر جگہ ہر پستی میں طبیب اور ڈاکٹر اور دواؤں اور آلات کا ایک حکم نظام حق تعالیٰ نے قائم فرمایا ہے، اسی طرح روحانی علاج اور قوموں میں جنسالاتی اعتدال پیدا کرنے کے لئے انبیاء علیہم السلام بھیجے گئے، ان کے ساتھ آسمانی ہدایات بھیجیں اور بہت ضرورت لازمی طاقتیں بھی عطا کی گئیں، جن کے ذریعہ وہ یہ قانون اعتدال دنیا میں نافذ کر سکیں، اسی مضمون کو قرآن کریم نے سورۃ حدید میں اس طرح بیان فرمایا ہے:

فَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنَاتِ وَأَنزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ وَالْمِيزَانَ لِيَقُومَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ وَأَنزَلْنَا الْحَدِيدَ فِيهِ بَأْسٌ شَدِيدٌ وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ (۲۵: ۵۷)

”ہم نے بھیجے ہیں اپنے رسول نشانیاں دے کر اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان تاکہ لوگ عدل و انصاف پر قائم ہو جائیں اور ہم نے انکار لوہا اس میں سخت لڑائی ہواؤں لوگوں کے کام چلتے ہیں۔“

اس میں انبیاء علیہم السلام کے بھیجے اور ان پر کتابیں نازل کرنے کی حکمت یہی بتلائی ہے کہ وہ ان کے ذریعہ لوگوں میں جنسالاتی اور عملی اعتدال پیدا کریں، کتاب، اخلاق، اور روحانی اعتدال پیدا کرنے کے لئے نازل کی گئی، اور ترادد معاملات لین دین میں علی اعتدال پیدا کرنے کے لئے، اور یہ بھی ممکن ہے کہ ترادد سے مراد ہر شیخیر کی شریعت ہو، جس کے ذریعہ اعتدالی حقیقی معلوم ہوتا ہے، اور عدل و انصاف قائم کیا جاسکتا ہے۔

اس تفصیل سے آپ نے یہ سمجھ لیا ہوگا کہ تمام انبیاء علیہم السلام کے بھیجے اور ان پر کتابیں نازل کرنے کی اصل غرض و حکمت یہی ہے کہ قوموں کو اخلاقی اور عملی اعتدال پر قائم کیا جائے، اور یہی قوموں کی صحت مندی اور تندرستی ہے۔

اب ہم یہ مضمون کہ اعتدال اس بیان کے اپنے یہ بھی معلوم کریں کہ امت محمدیہ علی ما جہا الصلوٰۃ والسلام کی جو فضیلت آیت مذکورہ میں بتلائی گئی، وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا یعنی ہم نے تمہیں ایک معتدل امت بنایا ہے، یہ ہونے اور رکھنے میں تو ایک لفظ ہے لیکن حقیقت کے اعتبار سے کسی قوم یا شخص میں جتنے کمالات اس دنیا میں ہو سکتے ہیں ان سب کے لئے حادی اور جامع ہے۔

اس میں امت محمدیہ کو امت وسط یعنی معتدل امت قرار دیا کہ انسان کا جو صبر شرافت و فضیلت ان میں بدرجہ کمال موجود ہے، اور جس غرض کیلئے یہ آسمان و زمین کا سارا نظام ہوا اور جس کے لئے انبیاء علیہم السلام اور آسمانی کتابیں بھیجی گئی ہیں، یہ امت اس میں ساری امتوں سے ممتاز اور افضل ہے۔

قرآن کریم نے اس امت کے متعلق اس خاص وصف فضیلت کا بیان مختلف آیات میں مختلف عنوانات سے کیا ہے، سورۃ اعراف کے آخر میں امت محمدیہ کے لئے ارشاد ہوا:-

وَمِمَّنْ جَعَلْنَا آئَةً يَّتَذَكَّرُ ۚ
بِالْحَقِّ قَوْلُهُ يَتَذَكَّرُ ۚ (۱۸۱: ۷)

یعنی ان لوگوں میں جن کو ہم نے پیدا کیا ہوا ایک ہی امت ہے جو بھی راہ ہتلائے ہیں اور اس کے موافق انصاف کرتے ہیں۔

اس میں امت محمدیہ کے اعتدال روحانی و اخلاقی کو واضح فرمایا ہے، کہ وہ اپنے ذاتی مفادات اور خواہشات کو چھوڑ کر آسمانی ہدایت کے مطابق خود بھی چلتے ہیں، اور دوسروں کو بھی چلانے کی کوشش کرتے ہیں، اور کسی معاملہ میں نزاع و اختلاف ہو جائے تو اس کا فیصلہ بھی اسی بے لاگ آسمانی قانون کے ذریعہ کرتے ہیں، جس میں کسی قوم یا شخص کے ناجائز مفاد کا کوئی خطرہ نہیں۔

اور سورۃ آل عمران میں امت محمدیہ کے اسی اعتدالی مزاج اور اعتدالی روحانی کے آثار کو ان الفاظ میں بیان فرمایا گیا ہے:

مُتَّعِمِينَ بِمُنَىٰ مِّنْهُمُ الْخَيْرِ لَئِيْلَ النَّاسِ تَأْمُرُ بِالسُّلْطَانِ
مُتَّعِمُونَ ۚ (۱۱۰: ۳)

”ہمیں ہم سب امتوں میں بہتر ہو جو عالم میں بھیجی گئی ہو، حکم کرتے ہو اچھے کاموں کا اور منع کرتے ہو بُرے کاموں سے اور اللہ پرست لائے ہو۔“

یعنی جس طرح ان کو رسول سب رسولوں میں افضل نصیب ہوئے، کتاب سب کتابوں میں جامع اور اکمل نصیب ہوئی، اسی طرح ان کو قوموں کا بہت شہداء مزاج اور اعتدال بھی اس اعلیٰ پیمانے پر نصیب ہوا کہ وہ سب امتوں میں بہتر امت قرار پائی، اس پر علوم و معارف کے دروازے کھول دیئے گئے ہیں، ایمان و عمل و تقویٰ کی تمام شاخیں ان کی فستریا ہوئی سے سرسبز شاداب ہوں گی، وہ کسی مخصوص ملک و اقلیم میں محصور نہ ہوں گی، بلکہ اس کا دائرہ عمل ساری عالم اور انسانی زندگی کے سارے شعبوں کو محیط ہو گا، اگرچہ اس کا وجود ہی اس لئے ہو گا کہ دوسروں کی خیر خواہی کرے، اور جس طرح ممکن ہو انہیں جنت کے دروازوں پر لاکھڑا کر دے، اُخْرٰی حَتَّٰی لِنُتَّاسِیْ مِنْ اَسْفَلِ الشَّرْءِ اِشَارَةً ۚ کہ یہ امت دوسروں کی خیر خواہی اور فائدہ کے لئے بنائی گئی ہے، اس کا فرض منصبی اور قومی نشان یہ ہے کہ لوگوں کو نیک کاموں کی ہدایت کرے، بُرے کاموں سے روکے۔

ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد اَلْاٰمَةُ الْاٰمَةُ الْاٰمَةُ کا یہی مطلب ہے کہ اس کا نام ہے، کہ سب ملانوں کی خیر خواہی کرے، پھر بُرے کاموں میں کفر و شرک

بدعات، رسوم قبیلہ، فتن و فجور اور ہر قسم کی بد اخلاقی اور نامعقول باتیں شامل ہیں، اُن سے روکنا بھی کسی طرح ہوگا، کہیں زبان سے کہیں ہاتھ سے، کہیں قلم سے، کہیں تلوار سے، غرض ہر قسم کا چارہ اس میں داخل ہوگا۔ یہ صفت جس قدر محسوس و اہتمام سے امت محمدیہ میں پائی گئی پہلی امتوں میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔

۳۔ اب دوسری بات غور طلب یہ رہ گئی کہ اس امت کے توسط و اعتدال کا واقعات سے ثبوت کیا ہے، اس کی تفصیل طویل اور تمام امتوں کے اعتقادات، اعمال و اخلاق اور کارناموں کا موازنہ کر کے بتلانے پر موقوف ہے، اس میں سے چند چیزیں بطور مثال ذکر کی جاتی ہیں۔

اعتقادی اعتدال: سب سے پہلے اعتقادی اور فطری اعتدال کو لے لیجئے، تو پہلی امتوں میں ایک طرف تو یہ نظر آئے گا کہ اللہ کے رسولوں کو اس کا بیٹا بنا لیا، اور ان کی عبادت اور پرستش کرنے لگے، وَقَالَتِ الْيَهُودُ عُزَيْرٌ ابْنُ اللَّهِ وَقَالَتِ النَّصَارَى الْمَسِيحُ ابْنُ اللَّهِ (۳۰، ۴۱)، اور دوسری طرف انہی قوموں کے دوسرے افراد کو یہ عالم بھی مشاہدہ میں آئے گا کہ رسول کے مسلسل معجزات دیکھنے اور برکتوں کے باوجود جب ان کا رسول ان کو کسی جنگ و جدوجہت دیتا ہے تو وہ کہتے ہیں قَدْ هَبَبْتُ أَنْتَ وَرَبِّكَ فَقَاتِلَا إِنَّا هَاهُنَا قَاعِدُونَ (۵۴، ۵۵) یعنی جیسے آپ اور آپ کا پروردگار وہی مخالفین سے قتال کریں، ہم تو یہاں بیٹھے ہیں، کہیں یہ بھی نظر آتا ہے کہ اپنے انبیاء کو خود ان کے ماننے والے طرح طرح کی ایذا میں پہنچاتے ہیں۔

اخلاقی امت محمدیہ کے کہ وہ ہر ستر ہر زمانے میں ایک طرف تو اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے وہ عشق و محبت رکھتے ہیں کہ اس کے آگے اپنی جان و مال اور اولاد و آبرو و سب کو قربان کر دیتے ہیں۔

سلام اُس پر کہ جس کے نام ابو ہریرہ ہیں

بڑھاپے میں بکھڑا سر فرشتی کے قلم میں

اور دوسری طرف یہ اعتدال کہ رسول کو رسول اور خدا کو خدا سمجھتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو با ایں ہمہ کمالات و فضائل عباد اللہ و رُسُلُہ ماننے اور کہتے ہیں، وہ آپ کے مدائح و مناقب میں بھی یہ بیان رکھتے ہیں، جو قصیدہ برترہ میں فرمایا ہے

لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ مُحَمَّدٌ عَبْدُهُ وَرَسُولُهُ

یعنی اس کلمہ کو جو جو درجہ نفاذی لے اپنے نبی کے ماننے میں کہہ دیا، کہ وہ معاذ اللہ خود

خدا یا خدا کے بیٹے ہیں، اس کے سوا آپ کی مدح و ثناء میں جو کچھ کہو وہ سب جی رنج ہے

جس کا خلاصہ کسی نے ایک مصرع میں اس طرح بیان کر دیا ہے

بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

عمل اور عبادت میں اعتدال: اعتقاد کے بعد عمل اور عبادت کا نمبر ہے، اس میں ملاحظہ فرمائیے پہلی امتوں میں ایک طرف تو یہ نظر آئے گا کہ اپنی شریعت کے احکام کو چند حکموں کے بدلے فروخت کیا جاتا ہے، ارشتریں لیکر آسانی کتاب میں ترمیم کی جاتی ہے، یا غلط فتوے دیئے جاتے ہیں اور طرح طرح کے جیلے پہانے کر کے شرعی احکام کو بدلا جاتا ہے، عبادت سے پیچھا چھڑایا جاتا ہے اور دوسری طرف عبادت خانوں میں آپ کو ایسے لوگ بھی نظر آئیں گے جنہوں نے ترک دنیا کر کے رہبانیت اختیار کر لی، وہ خدا کی دی ہوئی حلال نعمتوں سے بھی اپنے آپ کو محروم رکھتے اور سختیاں جھیلنے ہی کو عبادت و ثواب سمجھتے ہیں۔

امت محمدیہ نے اس کے خلاف ایک طرف رہبانیت کو انسانیت پر ظلم قرار دیا، اور دوسری طرف احکام خدا و رسول پر مرثیے کا جذبہ پیدا کیا، اور قیصر و کسری کے مختلف درجات کے مالک بن کر دنیا کو یہ دکھلا دیا کہ دیانت و سیاست میں یا دین و دنیا میں برتری نہیں، مذہب صرف مسجدوں یا خانقاہوں کے گوشوں کے لئے نہیں آیا بلکہ اس کی بکھرائی بازاروں اور دفتروں پر بھی ہے، اور وزارتوں اور اداروں پر بھی، اس نے بادشاہی میں فیکری اور فیکری میں بادشاہی سکھائی ہے

چو فقر اندر لباس شاہی آمد

ز تدبیر عیب اللہ آمد

معاشرتی اور تمدنی اعتدال: اس کے بعد معاشرت اور تمدن کو دیکھئے، تو پہلی امتوں میں آپ ایک طرف یہ بے اعتدالی دیکھیں گے کہ انسانی حقوق کی کوئی پرواہ نہیں، حق ناخن کی کوئی بحث نہیں، اپنی اغراض کے خلاف جس کو دیکھا اس کو کھل ڈالنا، قتل کر دینا، لوٹ لینا سب بڑا کمال ہے، ایک زمین کی چراگاہ میں کسی دوسرے کا اونٹ گھس گیا، اور وہاں کچھ نقصان کر دیا تو عرب کی مشہور جنگ حرب بنو سہل سے جاری ہوئی ہزاروں انسانوں کا خون ہوا، عورتوں کو انسانی حقوق دینا تو کجا زندہ رہنے کی اجازت نہیں دی جاتی، کہیں بچپن ہی میں ان کو زندہ درگور کر دینے کی رسم تھی، کہیں مردہ شوہروں کے ساتھ شعی کر کے جلا ڈالنے کا رواج تھا، اس کے بالمقابل دوسری طرف یہ سفیہ زہرا کی کیرے بکھڑوں کی ہتھیار کو حرام سمجھیں، جانوروں کے ذبیحہ کو حرام قرار دیں، خدا کھلائے ہوئے جانوروں کے گوشت و پوست سے نفع اٹھانے کو ظلم سمجھیں، امت محمدیہ اور اس کی شریعت نے ان سب بے اعتدالیوں کا خاتمہ کیا، ایک طرف انسان کو انسان کے حقوق بتلائے، اور نہ صرف صلح و دوستی کے وقت بلکہ عین میدان جنگ میں مخالفین کے حقوق کی حفاظت سکھائی، عورتوں کو مردوں کی طرح حقوق عطا فرمائے، اور دوسری طرف ہر چیز کی حد مقرر فرمائی، جس سے آگے بڑھنے اور پیچھے رہنے کو جرم قرار دیا، اور اپنے حقوق کے

معاشرہ میں درگزر اور عضو چشم پوشی کا سبق سکھلایا، اور دوسروں کے حقوق کا پورا اہتمام کرنے کے آداب سکھلائے۔

اقتصادی اور مالی اعتدال: اس کے بعد دنیا کی ہر قوم و ملت میں سب سے اہم مسئلہ معاشیات اور اقتصادیات کا ہے، اس میں بھی دوسری قوموں اور امتوں میں طرح طرح کی بے اعتدالی نظر آئیں گی، ایک طرف نظام سرمایہ داری ہے جس میں حلال و حرام کی قیود سے اور دوسرے لوگوں کی غرض حالی یا بد حالی سے آنکھیں بند کر کے زیادہ سے زیادہ دولت جمع کر لینا سب سے بڑی انسانی فضیلت سمجھی جاتی ہے، تو دوسری طرف شخصی اور انفرادی ملکیت ہی کو سرے سے جرم قرار دیا جاتا ہے، اور غور کرنے سے دونوں اقتصادی نظاموں کا حاصل مال و دولت کی پرستش اور اس کو مقصد زندگی سمجھنا اور اس کے لئے دوڑ دھوپ ہے۔

امت محمدیہ اور اس کی شریعت نے اس میں بھی اعتدال کی عجیب و غریب صورت پیدا کی، کہ ایک طرف تو دولت کو مقصد زندگی بنانے سے منع فرمایا، اور انسانی عزت و شرافت یا کسی منصب جہد کا مدار اس پر نہیں رکھا، اور دوسری طرف تقسیم دولت کے ایسے پاکیزہ اصول مقرر کئے جن سے کوئی انسان ضروریات زندگی سے محروم نہ رہے، اور کوئی فرد سادہ دولت کو نہ سمیٹ لے، قابل اشتراک چیزوں کو مشترک اور وقف عام رکھا، مخصوص چیزوں میں انفرادی ملکیت کا مکمل احترام کیا، حلال مال کی فضیلت اس کے رکھنے اور استعمال کرنے کے صحیح طریقے بتلاتے، اس کی تفصیل اس قدر طویل ہے کہ ایک مستقبل بیان کو چاہتی ہے، اس وقت بطور مثال چند نمونے اعتدال اور بے اعتدالی کے پیش کرتے تھے، اس کے لئے اتنا ہی کافی ہے جس سے آیت مذکورہ کا مضمون واضح ہو گیا، کہ امت محمدیہ ایک معتدل اور بہترین امت بنایا گیا ہے۔

اجماع کا حجت ہونا: قرطبی نے فرمایا کہ یہ آیت اجماع امت کے حجت ہونے پر ایک دلیل ہے، کیونکہ جب اس امت کو اللہ تعالیٰ نے شہداء مقرر کر دیے تو ان کے بالمقابل انکی بات کو حجت بنادیا، تو ثابت ہوا کہ اس امت کا اجماع حجت ہی اور عمل اس پر واجب ہے، اس طرح کہ صحابہ کا اجماع تابعین پر اور تابعین کا اجماع تبع تابعین پر حجت ہے۔

اور تفسیر منطوری میں ہے کہ اس آیت سے ثابت ہوا کہ اس امت کے جو افعال و اعمال متفق علیہ ہیں وہ سب محمود و مقبول ہیں، کیونکہ اگر سب کا اتفاق کسی خطا پر تسلیم کیا جائے تو پھر یہ کہنے کے کوئی معنی نہیں رہتے کہ یہ امت وسط اور عدل ہے۔

اور امام جصاص نے فرمایا کہ اس آیت میں اس کی دلیل ہے کہ ہر زمانے کے مسلمانوں کا اجماع معتبر ہے، اجماع کا حجت ہونا صرف قرن اول یا کسی خاص زمانے کے ساتھ مخصوص نہیں، کیونکہ آیت میں پوری امت کو خطاب ہے، اور امت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صرف وہ نہ تھے جو اس زمانے میں موجود تھے، بلکہ قیامت تک آنے والی نسلیں جو مسلمان ہیں وہ سب آپ کی امت ہیں تو ہر زمانے کے مسلمان شہداء اللہ ہو گئے، جن کا قول حجت ہے، وہ سب کسی خطا اور غلط پرستی نہیں ہو سکتے۔

وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِي كُنْتَ عَلَيْهَا إِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَتَّبِعِ

اور نہیں مقرر کیا تھا ہم نے قبلہ کو جس پر تو پہلے تھا مگر اس واسطے کہ معلوم کریں کہ کون تابع

الرَّسُولِ وَمَنْ يَنْقَلِبْ عَلَى عَقْبَيْهِ وَإِنْ كَانَتْ لَكَبِيرَةٌ إِلَّا عَلَى

رسول کا اور کون پھر جلتے گا آئے پاؤں اور بے شک یہ بات بھاری ہوتی عمر ان پر

الَّذِينَ هَدَى اللَّهُ وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُضِلَّ أَيْمَانَكُمْ إِنَّ اللَّهَ

جن کو راہ دکھائی اللہ نے اور اللہ ایسا نہیں کہ ضائع کرے تمہارا ایمان بیشک اللہ

بِالنَّاسِ لَرَوُّوفٌ شَرِيفٌ ۝۳۳

لوگوں پر بہت شفیق نہایت ہریان ہے

خلاصہ تفسیر: اور اصل میں تو شریعت محمدیہ کے لئے ہم نے کعبہ ہی قبلہ بنو کر رکھا تھا (اور جب سمت قبلہ پر آپ (چند روز قادم) رہ چکے ہیں (یعنی بیت المقدس) وہ تو محض

اس مصلحت کے لئے تھا کہ ہم کو ظاہری طور پر بھی معلوم ہو جاوے کہ اس کے مقرر ہونے سے یا بدلنے سے یہود اور غیر یہود میں سے کون تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع اختیار کرتا ہے اور کون پیچھے کو ہٹتا جاتا ہے (اور نفرت اور مخالفت کرتا ہے اس امتحان کے لئے اس عاجزی قبلہ کو مقرر کیا تھا، پھر اصلی قبلہ سے اس کو منسوخ کر دیا، اور یہ قبلہ کا بدلنا (مخوف لوگوں پر)

ہوا بڑا ثقیل رہا، مگر جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے وسیعہ طریق کی ہدایت فرمائی ہے، جس کا بیان اوپر آچکا ہے کہ احکام ایسے کو بے چون و چرا قبول کر لینا ان کو کچھ بھی گراں نہیں ہوا، جیسا پہلے اس کو خدا کا حکم سمجھتے تھے اب اس کو سمجھنے لگے، اور وہ ہم نے جو کہا ہے کہ بیت المقدس قبلہ غیر اصلی تھا، اس سے کوئی شخص یہ دوسرے دلائل سے توجہ نہ دے گا، جس توجہی نمازیں ادا کر رہے ہیں ان میں ثواب بھی کم لا ہوگا، کیونکہ اصلی قبلہ کی طرف نہ تھیں، سو اس دوسرے کو دل میں نہ لانا، کیونکہ اللہ تعالیٰ ایسے نہیں کہ تمہارے ایمان کے متعلق اعمال مثلاً نماز کے ثواب کو منہ سے راد و ناقص کر دیں (اور) واقعی اللہ تعالیٰ تو دلیجہ لوگوں پر بہت ہی شفیق (اور) مہربان ہیں تو ایسے شفیق مہربان پر یہ گمان کب ہو سکتا ہے، کیونکہ کسی قبلہ کا اصلی یا غیر اصلی ہونا تو ہم ہی جانتے ہیں، تم نے تو دونوں کو ہمارا حکم سمجھ کر قبول کیا، اس لئے ثواب بھی کسی کا کم نہ ہوگا۔

معارف و مسائل

کعبہ کے قبلہ نماز ہونے کی اس میں صحابہ و تابعین کا اختلاف ہو، کہ ہجرت سے پہلے مکہ مکرمہ میں ابتدا رکب ہوئی جب نماز فرض ہوئی اس وقت قبلہ بیت اللہ تھا، یا بیت المقدس حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا قول یہ ہے کہ اول ہی سے قبلہ بیت المقدس تھا، جن ہجرت کے بعد ہی سورہ ستروہ میں مکہ ابی رہا، اس کے بعد بیت اللہ کو قبلہ بنانے کے احکام نازل ہو گئے، البتہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل مکہ مکرمہ میں یہ رہا، کہ آپؐ حجرا سو را در رکن بنائی کے درمیان نماز پڑھتے تھے، تاکہ بیت اللہ بھی سامنے رہے اور بیت المقدس کا بھی استقبال ہو جائے، مدینہ منورہ پہنچنے کے بعد یہ ممکن نہ رہا، اس لئے تحویل قبلہ کا اشتیاق پیدا ہوا (ابن کثیر)

اور دوسرے حضرات نے فرمایا کہ جب نماز فرض ہوئی مکہ مکرمہ میں تو مسلمانوں کا ابتدائی قبلہ بیت اللہ ہی تھا، کیونکہ حضرت ابراہیمؑ و اسمعیل علیہما السلام کا قبلہ بھی بیت اللہ ہی رہا، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب مکہ مکرمہ میں مقیم رہے، بیت اللہ ہی کی طرف نماز پڑھتے رہے، پھر ہجرت کے بعد آپؐ کا قبلہ بیت المقدس قرار دیا گیا، اور مدینہ منورہ میں سورہ ستروہ میں اپنے بیت المقدس کی طرف نماز پڑھی، اس کے بعد پھر آپؐ کا جو پہلا قبلہ تھا یعنی بیت اللہ اس کی طرف نماز میں توجہ کرنے کا حکم آگیا، تفسیر شریطی میں بحوالہ ابو عمر اس کو اصح القولین قرار دیا ہے، اور حکمت اس کی یہ بیان کی جاتی ہے کہ مدینہ منورہ میں تشریف لانے کے بعد چونکہ قبائل یہود سے سابقہ پڑا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو مانوس کرنے کے لئے انہی کا قبلہ باذن حق اونڈی اختیار کر لیا، مگر پھر تجربہ سے ثابت ہوا کہ یہ لوگ اپنی ہیست دیکھ

سے باز آنے والے نہیں تو پھر آپؐ کو اپنے اصل قبلہ یعنی بیت اللہ کی طرف رخ کرنے کا حکم مل گیا، جو آپؐ کو اپنے آپا، ابراہیمؑ و اسمعیلؑ کا قبلہ ہونے کی وجہ سے طبعاً محبوب تھا۔

اور قرطبی نے ابو العالیہ ریاحی سے نقل کیا ہے کہ حضرت صالح علیہ السلام کی مسجد کا قبلہ بھی بیت اللہ کی طرف تھا، اور پھر ابو العالیہ نے نقل کیا ہے کہ ان کا ایک یہودی سے مناظرہ ہو گیا، یہودی نے کہا کہ موسیٰ علیہ السلام کا قبلہ صحفہ بیت المقدس تھا، ابو العالیہؒ نے کہا کہ نہیں، موسیٰ علیہ السلام صحفہ بیت المقدس کے پاس نماز پڑھتے تھے مگر آپؐ کا رخ بیت اللہ ہی کی طرف ہوا تھا، یہودی نے انکار کیا تو ابو العالیہؒ نے کہا کہ اچھا میرے تمہارے جھگڑے کا فیصلہ حضرت صالح علیہ السلام کی مسجد کر دے گی، جو بیت المقدس کے نیچے ایک پہاڑ پر ہے، دیکھا گیا تو اس کا قبلہ بیت اللہ کی طرف تھا۔

اور جن حضرات نے پہلا قول اختیار کیا ہے ان کے نزدیک بحکمت یہ تھی کہ مکہ مکرمہ میں تو مشرکین سے ہستیاں اور ان سے مخالفت کا اہتمام کرنا تھا، اس لئے ان کا قبلہ چھوڑ کر بیت المقدس کو قبلہ بنا دیا گیا، پھر ہجرت کے بعد مدینہ طیبہ میں یہود و نصاریٰ سے ہستیاں اور ان کی مخالفت کا اہتمام ضرور ہوا تو ان کا قبلہ بدل کر بیت اللہ کو قبلہ بنا دیا گیا، اسی اختلاف اقوال کی بناء پر آیت مذکورہ کی تفسیر میں بھی اختلاف ہو گیا، کہ الْقِبْلَةُ الَّتِي كُنْتُمْ عَلَيْهِ تَحْتَ مَا مَرَدَہ، قول اذل کی بناء پر اس سے مراد بیت المقدس ہے، جو آپؐ کا قبلہ اولیٰ تھا، اور قول ثانی کی بناء پر اس سے مراد کعبہ بھی ہو سکتا ہے کیونکہ یہی آپؐ کا پہلا قبلہ تھا۔

اور مفہوم آیت کا درنوں صورتوں میں یہ ہے کہ ہم نے تحویل قبلہ کو آپؐ کا اتباع کرنے والے مسلمانوں کے لئے ایک امتحان قرار دیا ہے، تاکہ ظاہر طور پر یہی معلوم ہو جائے کہ کون آپؐ کا صحیح فرمانبردار ہے اور کون اپنی رائے کے پیچھے چلتا ہے، چنانچہ تحویل قبلہ کا حکم نازل ہونے کے بعد بعض ضعیف الایمان یا وہ جن کے دلوں میں کجھ نفاق تھا اسلام سے پھر گئے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر الزام لگایا کہ یہ تو اپنی قوم کے دین کی طرف پھر گئے۔

بعض احکام متعلقہ

بہن سنت کو قرآن کے ذریعہ | جصاص نے احکام القرآن میں فرمایا کہ قرآن کریم میں کہیں اس کی تصریح بھی مشورہ کیا جاتا ہے | نہیں ہے، کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قبل از ہجرت یا بعد ہجرت بیت المقدس کی طرف رخ کرنے کا حکم دیا گیا تھا، بلکہ اس کا ثبوت صرف احادیث اور سنن نبویہ ہی سے ہے، تو جو چیز سنت کے ذریعہ ثابت ہوئی تھی اس آیت قرآن نے اس کو مشورہ کر کے

آپ کا قبلہ بیت اللہ کو بنا دیا۔

اس سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ حدیث رسول بھی ایک حیثیت سے قرآن ہی ہے، اور یہ کہ کچھ احکام وہ بھی ہیں جو شترآن میں مذکور نہیں، صرف حدیث سے ثابت ہیں، اور قرآن ان کی شرعی حیثیت کو تسلیم کرتا ہے، کیونکہ اسی آیت کے اخیر میں یہ بھی مذکور ہے کہ جو نمازیں باہر رسول صلی اللہ علیہ وسلم بیت المقدس کی طرف پڑھی گئیں وہ بھی معتبر اور مقبول عند اللہ ہیں۔

خبر واحد جبکہ شترآن تو یہ اس کے ثبوت پر موجود، بخاری و مسلم اور تمام معتبر کتب حدیث میں متعدد صحابہ کرامؓ ہوں اس سے شترآنی حکم منسوخ سمجھا جکتا ہے، کی روایت سے منقول ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر تخیل قبلہ کا حکم نازل ہوا، اور آپؐ نے عصر کی نماز جانب بیت اللہ پڑھی، اور بعض روایات میں اس جنگ عصر کے بجائے ظہر مذکور ہے (ابن کثیر) تو بعض صحابہ کرامؓ یہاں سے نماز پڑھ کر باہر گئے، اور دیکھا کہ قبیلہ بنی سہیلہ کے لوگ اپنی مسجد میں حسب سابق بیت المقدس کی طرف نماز پڑھ رہے ہیں تو انھوں نے آواز دے کر کہا کہ اب قبلہ بیت اللہ کی طرف ہو گیا ہے۔ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بجانب بیت اللہ نماز پڑھ کر آئے ہیں، ان لوگوں نے درمیان نماز ہی اپنا رخ بیت المقدس سے بیت اللہ کی طرف پھیر لیا، تو یہ سنت مسلم کی روایت میں ہے کہ اس وقت عمرؓ میں جو پھل صفوں میں تھیں آگے آگئیں اور مرد جو اگلی صفوں میں تھے پیچھے آگئے، اور جب رخ بیت اللہ کی طرف بدلا گیا تو مرد کی صفیں آگے اور عورتوں کی پیچھے ہو گئیں (ابن کثیر)

بنو سہیلہ کے لوگوں نے تو ظہر عصر ہی سے تخیل قبلہ کے حکم پر عمل کر دیا، مگر قبائے میں یہ خبر اگلے دن صبح کی نماز میں پہنچی، جیسا کہ بخاری و مسلم میں بڑا بیت ابن عمرؓ مذکور ہے، اہل قبائے نے بھی نماز ہی کے اندر اپنا رخ بیت المقدس سے بیت اللہ کی طرف پھیر لیا (ابن کثیر و جصاص)

امام جصاصؒ نے یہ متعدد روایات حدیث نقل کر کے فرمایا:

هذه اخبار صحيحة مستفيض في يدي	یعنی یہ حدیث اگرچہ اصل سے خبر واحد ہے
اهل العلم قد تلقوا بالقبول فصلا	مگر قرآن تو یہی کی وجہ سے اس نے درجہ نماز کا
في حيزا التواتر الموجب للعلم	حال کر دیا ہے، جو علم یقین کا موجب ہوتا ہے

مگر حنفیہ اور ان کے متفق فقہاء جن کا ضابطہ یہ ہے کہ خبر واحد سے کوئی قطع حکم منسوخ نہیں ہو سکتا، ان پر یہ سوال اب بھی باقی رہتا ہے کہ اس حدیث کی شہرت اور تلقی بالقبول تو بعد میں ہوئی، بنو سہیلہ اور اہل قبائے کو تو اچانک ایک ہی آدمی نے خبر دی تھی، اس وقت اس حدیث کو درجہ شہرت تو انرا حاصل نہیں تھا، انھوں نے اس پر کیا عمل کر لیا، جصاصؒ نے فرمایا کہ اصل بات یہ ہے کہ ان حضرات اور سب صحابہ کو پہلے سے یہ معلوم تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رہبست یہ ہے کہ آپؐ کا قبلہ بیت اللہ کو بنا دیا

اور آپؐ اس کے لئے دعا بھی کر رہے ہیں، اس رغبت و دعا کی وجہ سے ان حضرات کی نظر میں بیت المقدس کا حکم آئندہ باقی نہ رہنے کا احتمال ضرور پیدا ہو گیا تھا، اس احتمال کی وجہ سے بقائے قبلہ بیت المقدس غلطی ہو گیا تھا، اس کے منسوخ کرنے کے لئے پیغمبرؐ کا حکم کافی ہو گئی، ورنہ محض خبر واحد سے کوئی شترآنی قطع فیصلہ منسوخ ہو جانا مستعمل نہیں۔

آلہ مجر الصوت کی آواز پر نمازیں | جمع بخاری باب ما جاء في القبلة میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی حدیث میں نقل و حرکت مفسد نماز نہ ہو بلکہ لال | جو قبائے میں تخیل قبلہ کا حکم پہنچے اور ان لوگوں کے بحالت نماز بیت اللہ کی طرف پھر جانے کا واقعہ ذکر کیا، اس پر علامہ عینی حنفی نے تحریر فرمایا ہے:-

فيه جواز تعليم من ليس في	یعنی اس حدیث سے ثابت ہوا کہ جو شخص
الصلوة من هو فيها	نماز میں شریک نہیں وہ کسی نماز پڑھنے والے
(عدة القاری، ص ۱۴۸ ج ۳)	کو تعلیم و تلقین کر سکتا ہے

نیز علامہ عینی نے دوسری جگہ اس حدیث کے ذیل میں یہ الفاظ لکھے ہیں، وفيه استماع المتعلمي لكلام من ليس في الصلوة فلا يضر صلواته (الی) حکم الاستبطله الطحاوی (عدة القاری، ص ۲۲۲ ج ۱)

اور عام فقہاء حنفیہ نے جو حاج صلوٰۃ کسی شخص کی اقتداء اور اتباع کو مفسد نماز کہا ہے جو عام متون و شروح حنفیہ میں منقول ہے، اس کا منشاء یہ ہے کہ نماز میں غیر اللہ کے امر کا اتباع موجب فساد نماز ہے، لیکن اگر کوئی شخص اتباع امر الہی کا کرے مگر اس اتباع میں کوئی دوسرا شخص واسطہ بن جائے وہ موجب فساد نہیں۔

فقہاء نے جہاں یہ مسئلہ لکھا ہے کہ کوئی شخص جماعت میں شریک ہونے کے لئے ایسے وقت پہنچے کہ اگلی صف پوری ہو چکی ہے، اب پھل صف میں تہنارہ جاتا ہے تو اس کو چاہئے کہ اگلی صف میں کسی آدمی کو پیچھے کھینچ کر اپنے ساتھ ملا لے، اس میں بھی یہی سوال آتا ہے کہ اس کے کہنے سے جو پیچھے آجائے گا وہ نماز میں اتباع امر غیر اللہ کا کرے گا، اس لئے اس کی نماز فاسد ہو جانی چاہئے، لیکن درختار باب الامامة میں اس مسئلہ کے متعلق تحریر فرمایا قسم نقل تصحیح عدم الفساد فی مثلہ من جذا من الصف فتأخروا فیل شتم فخر فلیحذر، اس پر علامہ طحاویؒ نے تحریر فرمایا: لا تأخروا فتشکل أمر الله، یعنی اس صورت میں نماز فاسد نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ درحقیقت اس شخص نے آنیوالے کے حکم کا اتباع نہیں کیا، بلکہ امر الہی کا اتباع کیا ہے، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ اس کو پہنچا ہے، کہ جب ایسی صورت پیش آئے تو اگلی صف والے کو پیچھے آجانا چاہئے۔

اسی طرح شربلانیؒ نے شرح و ہدایہ میں اس مسئلہ کا ذکر کر کے پہلے فساد نماز کا قول نقل کیا

پھر اس کی تردید کی اس کے الفاظ یہ ہیں۔ (اِذَا قِيْلَ اٰمَنَّا قُلْ تَقَدَّمْتُمْ قَدَمًا رَاقِيًا) فسدات صلوٰتہ لانہ امتثل امر غیر اللہ فی الصلوٰۃ لان امتثالہ انما هو لا من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
فلا يضراہ

ان تمام روایات ثابت ہوا کہ اگر کوئی نمازی ایسے شخص کی آواز پر عمل کرے جو اس کی پیش نمازی میں شرکت میں تو اس کی وضو میں ایک ہر کہ خود اس شخص کی ولایت اور اتباع مقصود ہو یہ تو مفید نماز ہے، لیکن اگر اس نے کوئی حکم شرعی بتلایا اور اس کا اتباع نمازی نے کر لیا تو وہ درحقیقت امر الہی کا اتباع ہے، اس لئے مفید نماز نہیں ہوگا، اسی لئے طحاوی نے فیصلہ یہ کیا ہے کہ اقوال لوقیل بالتفصیل ہیں کو نہ امتثل امر الشارع فلا تضل بین کو نہ امتثل امر الداخل مراعاة لخالطہ من غلبہ نظر لا مراعاة الشارع فتفسد لکان حثا وطحاوی علی الدہ ص ۲۳۶ ج ۱

اب مسئلہ زیر بحث یعنی آلہ بحکمہ الصوت کا فیصلہ کر لینا آسان ہو گیا، کیونکہ وہاں اس آلے کے اتباع کا دور دور بھی وہم نہیں ہو سکتا، ظاہر ہے کہ اتباع رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس حکم کا ہونا ہے کہ جب امام رکوع کرے تو رکوع کر دے، جب سجدہ کرے تو سجدہ بھی سجدہ کر دے، اس آلہ سے شرع یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ اب امام رکوع میں گیا، یا سجدہ میں جا رہا ہے، اس علم کے بعد اتباع امام کا کرتا کہ نہ کہ اس آلے کے حکم کا، اور اتباع امام ایک حکم الہی ہے، اور یہ کلام اس بنیاد پر ہے کہ آلہ کبر الصوت کی آواز کو عین امام کی آواز نہ مانی جائے بلکہ اس کی نقل و حکایت قرار دیا جائے، اور اہل فن اس کی آواز کو عین آواز امام کہتے ہیں، ان کی تحقیق پر تو کوئی اشکال جواز صلوٰۃ میں نہیں ہے، اس مسئلہ کی تحقیق پر احقر کا ایک مستقل مسئلہ رسالہ بھی شائع شدہ ہے اس کو دیکھ لیا جائے، واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم۔

وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُضِلَّ اٰیْمَانًا تَلٰكُمُ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اسْعَوْا لِمَوٰجِدِ الْوَعْدِ الَّذِيْ لَكُمْ وَتَمْلِكُوْا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ
مطلب آیت کا یہ ہے کہ تخیل قبلہ پر جو بعض ہر وقت لوگوں کو یہ خیال پیدا ہوا کہ یہ دین سے بھٹ کر ہو گئے اور ان کا ایمان ہی ضائع ہو گیا، اس کا جواب دیا کہ اللہ تعالیٰ تمہارے ایمان کو ضائع کرنے والے نہیں ہے بے وقوف لوگوں کے کہنے پر کان نہ دھریں۔
اور بعض روایات حدیث اور اقوال سلف میں اس جگہ ایمان کی تفسیر نماز سے کی گئی ہے، اور معنی یہ ہیں کہ جو نمازی سابق قبلہ بیت المقدس کی طرف پڑھی گئی ہیں، اللہ تعالیٰ ان کو ضائع کرنے والا نہیں، وہ تو صحیح و مقبول ہو چکیں، تخیل قبلہ کے حکم کا پھیل نمازوں پر کوئی اثر نہیں ہوگا۔ صحیح بخاری میں بروایت ابن عازب، اور ترمذی میں بروایت ابن عباس منقول ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قبلہ بیت المقدس بنا دیا گیا تو لوگوں نے سوال کیا کہ جو مسلمان اس عمر میں انتقال کر گئے جب کہ نماز بیت المقدس کی طرف ہو کر کرتی تھی، اور بیت اللہ کی طرف نماز پڑھنا

ان کو نصیب نہیں ہوا ان کا کیا حال ہوگا، اس پر یہ آیت نازل ہوئی جس میں نماز کو ایمان کے لفظ سے تعبیر کر کے واضح کر دیا کہ ان کی نمازیں سب صحیح و مقبول ہو چکی ہیں، ان کے معاملہ میں تخیل قبلہ کا کوئی اثر نہیں پڑے گا۔

قَدْ نَرٰی تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِی السَّمَٰوٰتِ ۚ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰیہَا ۚ

بیشک ہم دیکھتے ہیں بار بار آٹھنا تیرے منہ کا آسمان کی طرف، سو اللہ پھر ہی گئے ہم تجھ کو جس قبلہ کی طرف چاہیں گے

قَوْلٍ وَجْهِكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۚ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا

اب پھر منہ اپنا طرف مسجد الحرام کے اور جس جگہ تم ہو کر رہو پھر منہ اس کی

وَجْهَكُمْ شَطْرَ ۚ وَاِنَّ الَّذِیْنَ اٰوْتُوا الْكِتٰبَ لَعٰلَمُوْنَ اَنَّهُ

طرف، اور جن کو لی ہے کتاب اللہ جانتے ہیں کہ یہی

الْحَقُّ مِنْ رَّبِّہُمْ ۚ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا یَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۲﴾

ٹھیک بران کے رب کی طرف سے اور اللہ بے خبر نہیں ان کاموں سے جو وہ کرتے ہیں۔

خلاصہ تفسیر آپ جو دل سے کعبہ کے قبلہ ہونے کی خواہش رکھتے ہیں، اور امید دہی میں بار بار آسمان کی طرف نظر اٹھا کر بھی دیکھتے ہیں کہ شاید فرشتہ حکم لے آوے ہو،

آپ کے منہ کا بار بار آسمان کی طرف اٹھنا ہم دیکھ رہے ہیں اور چونکہ میں آپ کی خوش پورا کرنا منظور ہے اس لئے وہم وعدہ کرتے ہیں کہ آپ کو اس قبلہ کی طرف متوجہ کر دیں گے، جو آپ کو پسند ہو (وہ پھر ہم حکم ہی دیتے ہیں کہ) آپ اپنا چہرہ نماز میں مسجد حرام کی طرف کیا کیجئے اور یہ حکم صرف آپ کے لئے مخصوص نہیں بلکہ سب لوگ پیغمبر بھی اور امتی بھی، جہاں کہیں موجود ہو (خواہ دینہ منورہ میں یا اور جگہ، یہاں تک کہ خود بیت المقدس میں بھی) اپنے چہرہ کو اس (مسجد حرام) کی طرف کیا کر دے اور اس قبلہ کے معترف ہونے کے متعلق، یہ اہل کتاب بھی بالعموم اپنی کتابوں کی پیشگوئی کی وجہ سے کہ نبی آخر الزماں کا قبلہ اس طرح ہوگا، یقیناً جانتے ہیں کہ یہ حکم بالکل ٹھیک ہے (اور ان کے پروردگار ہی کی طرف سے ہے) مگر عناد امانتے نہیں، اور اللہ تعالیٰ ان کی کارروائیوں سے کچھ بے خبر نہیں ہے۔

معارف مسائل

اس آیت کے پہلے جملہ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہشتیان کعبہ کا ذکر ہے، اس اشتیاق کی مختلف وجوہ بیان کی گئی ہیں اور سب میں کوئی تعارض نہیں وہ سب وجوہ ہو سکتی ہیں مثلاً یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نزول وحی اور عطاء نبوت سے پہلے اپنی طبیعت و فطرت سے ملتے ابراہیمی کے تالیاں کام کرتے تھے، اور نزول وحی کے بعد قرآن نے بھی آپ کی شریعت کو ملتے ابراہیم کے مطابق مسترار دیا، اور حضرت ابراہیم و حضرت اسمعیل علیہما السلام کا قبلہ بیت اللہ تھا، اس لئے آپ کی دلی خواہش یہی تھی کہ آپ کا اور مسلمانوں کا قبلہ بھی وہی کعبہ بیت اللہ قرار دیا جائے۔ یہ وجہ بھی تھی کہ قبائل عرب بھی چونکہ ملتے ابراہیمی کو کم از کم زبان سے مانستے تھے اور اس کی پیروی کے مدعی تھے، کعبہ کے قبلہ مسلمین ہو جانے سے ان کے اسلام کی طرف مائل ہو جانے کی توقع تھی، اور سابق قبلہ بیت المقدس میں جو منافقت اہل کتاب کی توقع کی جاسکتی تھی وہ سولہ سترہ مہینے کے عمل کے بعد منقطع ہو چکی تھی، کیونکہ یہود و عیسائیوں کو اس کی وجہ سے کوئی اسلام سے قرب ہونے کے بجائے بعد ہی بڑھا تھا۔

بہر حال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خواہش یہ تھی کہ مسلمانوں کا قبلہ بیت اللہ یعنی کعبہ کو قرار دیا جائے، اور چونکہ معتبران بارگاہ الہی انبیاء علیہم السلام اپنی کوئی خواہش اور کوئی درخواست حق تعالیٰ کی بارگاہ میں اُس وقت تک پیش نہیں کرتے جب تک اُن کو یہ درخواست پیش کرنے کی اجازت کا علم نہ ہو جائے، اس سے سمجھا جاتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ دعا کرنے کی اجازت پہلے مل چکی تھی، اور آپ اس کی دعا کر رہے تھے اور اس کی قبولیت کے امیدوار تھے، اس لئے بار بار آسان کی طرف نظر اٹھاتے تھے، کہ شاید کوئی فرشتہ حکم لے کر آجائے، آیت مذکورہ میں اس کیفیت کا بیان مشرکوں کے پہلے تو قبولیت دعا کا وعدہ فرمایا، فَلْيَتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ يَهْتَدُونَ اس کی طرف پھر دیں گے جو سمت آپ کو پسند ہو، اس کے فوراً بعد ہی یہ فرخ پھیرنے کا حکم بھی نازل فرمایا، فَوَيْلٌ لِلَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ يَوْمِهِمْ الَّذِي يَصْعَدُونَ فِي سَمُومٍ مُّهِمَّةٍ، اس طرز عمل میں ایک خاص لطف تھا، کہ پہلے وعدہ کی خوشی حاصل ہو، پھر ایسا وعدہ کی خوشی تند مکر ہو جائے (یہ سب مضمون قرطبی، جصاص، منہجی سے لیا گیا ہے)۔

مسئلہ ہتقبالی قبلہ | یہ تحقیق پہلے آپکی ہے کہ اللہ تعالیٰ جل شانہ کے اعتبار سے تو ساری سمتیں اور ساری جہات برابر ہیں، فَوَيْلٌ لِلَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ يَوْمِهِمْ الَّذِي يَصْعَدُونَ فِي سَمُومٍ مُّهِمَّةٍ، لیکن مصالح امت کے لئے بقائنا و تحکمت کسی ایک جہت کو تمام دنیا میں پھیلے ہوئے مسلمانوں کے لئے قبلہ بنا کر سب میں ایک دینی وحدت

کا عمل مظاہرہ مقصود تھا، وہ جہت بیت المقدس بھی ہو سکتی تھی، مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تمنا کے مطابق کعبہ کو قبلہ بنانا تجویز کر لیا گیا، اور اسی کا حکم اس آیت میں دیا گیا، اس کا مقتضی یہ تھا کہ اس جگہ فَوَيْلٌ لِلَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ يَوْمِهِمْ الَّذِي يَصْعَدُونَ فِي سَمُومٍ مُّهِمَّةٍ، مگر قرآن حکیم نے عیناً بدل کر شَطْرَ الْمَشْرِقِ الْأَمْرِيَّةِ کے الفاظ اختیار فرمائے، اس سے کئی اہم مسائل ہتقبالی قبلہ کے بارہ میں واضح ہو گئے۔

اول یہ کہ اگرچہ اصل قبلہ بیت اللہ ہے جس کو کعبہ کہا جاتا ہے، لیکن یہ ظاہر ہے کہ اصل بیت اللہ کا استقبال اس جگہ تک ہو سکتا ہے جہاں تک بیت اللہ نظر آتا ہے، جو لوگ وہاں سے دور ہیں، اور بیت اللہ ان کی نظروں سے غائب ہے اگر ان پر یہ پابندی عائد کی جائے کہ عین بیت اللہ کی طرف رخ کر دو تو اس کی تعمیل بہت دشوار ہو جائے، خاص آلات و رحاات کے ذریعہ بھی صبح سمت کا صحیح دور کے شہروں میں مشکل اور غیر یقین ہو جائے، اور شریعت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کا مدار سہولت و آسانی پر رکھا گیا ہے، اس لئے بجائے بیت اللہ یا کعبہ کے مسجد حرام کا لفظ رکھا گیا جو بہ نسبت بیت اللہ کے بہت زیادہ وسیع رقبہ پر مشتمل ہے، اس کی طرف رخ پھیر لینا دور دور تک لوگوں کے لئے آسان ہے۔

پھر ایک دوسری سہولت لفظ شَطْرِ اُخْتِیَارِ کے دیدی گئی، ورنہ اس سے مختصر لفظ اِلَى الْمَشْرِقِ اَلْمُرْتَمِیْنِ تھا، اس کو چھوڑ کر شَطْرَ الْمَشْرِقِ اَلْمُرْتَمِیْنِ فرمایا گیا، شَطْرُ دُشْمَنِ کے لئے ہتعمال ہوتا ہے، ایک نصیب ہے، دوسرے سمت ہے، باتفاق مفسرین اس جگہ شَطْر سے مراد سمت ہے، تو اس لفظ نے یہ بتلادیا کہ بلاد بعیدہ میں یہ بھی ضروری نہیں کہ خاص مسجد حرام ہی کی طرف ہر ایک کا رخ ہو جائے تو نماز درست ہو بلکہ سمت مسجد حرام کافی ہے (بحر محیط)۔

مثلاً مشرقی ممالک ہندوستان و پاکستان وغیرہ کے لئے جانب مغرب مسجد حرام کی سمت ہے تو مغرب کی جانب رخ کر لینے سے ہتقبالی قبلہ کا فرض ادا ہو جائے گا، اور چونکہ گرمی، سردی کے موسموں میں سمت مغرب میں بھی اختلاف ہوتا رہتا ہے، اس لئے فقہاء رحمہم اللہ نے اس سمت کو سمت مغرب و قبلہ مسترار دیا ہے، جو موسم گرمی و سرما کی دونوں خبروں کے درمیان ہے، اور قواعد ریاضی کے حساب سے یہ صورت ہوگی کہ مغرب ضعیف اور مغرب ہشتا کے درمیان ۳۸ ڈگری تک سمت قبلہ مسترار دی جائے گی، یعنی ۲۴ ڈگری تک بھی اگر دائیں یا بائیں مائل ہو جائے تو سمت قبلہ فوت نہیں ہوگی، نماز درست ہو جائے گی، ریاضی کی تدبیر اور مشہور کتاب شرح چغتائی باب رابع صفحہ ۶۱ میں دونوں معشرین کا فاصلہ بھی ۳۸ ڈگری قرار دیا ہے۔

۱۰ حضرت والد صاحب نے جو اہل فقہ میں فقہاء کا دوسرا قول ذکر کیا ہے کہ ۴۵ درجے دائیں یا بائیں مائل ہونے سے سمت قبلہ فوت نہیں ہوگی۔ محمد تقی

سمت قبلہ معلوم کرنے کے لئے اس سے ان لوگوں کی چہالت بھی واضح ہو گئی جنہوں نے ہندوستان د
شرقا آلات رمدیرہ اور جلیا پاکستان کی بہت سی مسجدوں کی سمت قبلہ میں معمولی سا فرق دو چار
ریاضیہ پر مدار نہیں ہے، اور بلاوجہ مسلمانوں میں تفریق و انتشار پیدا کرنا ہے۔

شرعیہ اسلام پر جو تک قیامت تک آنے والی فلسفوں کے لئے اور پوری دنیا کے مالک
کے لئے ہے، اس نے احکام شرعیہ کو ہر شعبہ میں اتنا آسان رکھا گیا ہے کہ ہر گاؤں، جنگل، پہاڑ،
جزیرہ میں بسنے والے مسلمان اس پر اپنے مشاہدہ سے عمل کر سکیں، کسی مرحلے میں حسابات، ریاضی، یا مہلک
وغیرہ آلات کی ضرورت نہ پڑے ۳۸۱ ڈگری تک کی وسیع سمت مغرب اہل مشرق کا قبلہ ہے، اس
میں پانچ دس ڈگری کا فرق ہو بھی جائے تو اس سے نمازوں پر کوئی اثر نہیں پڑتا، اور رسول کریم صلی اللہ علیہ
وسلم کی ایک حدیث سے اس کی اور وضاحت ہو جاتی ہے، جس کے الفاظ یہ ہیں: ما بین المشرق و
المغرب قبلۃ رسدہ اللہ فیہ من ابی ہریرۃؓ، یعنی مشرق و مغرب کے درمیان قبلہ ہے، آپ کا یہ
ارشاد مدینہ طیبہ والوں کے لئے تھا، کیونکہ ان کا قبلہ مشرق و مغرب کے درمیان جانب جنوب
واقع تھا، اس حدیث نے گویا خطۃ التوحید کے لفظ کی تشریح کر دی کہ مسجد حرام کی سمت کافی
البتہ بناؤ مسجد کے وقت اس کی کو شش بہتر ہے کہ ٹھیک بیت اللہ کے رخ سے جتنا قریب ہو سکے
وہ کر لیا جائے، صحابہ و تابعین اور سلف صالحین کا طریقہ تو اس دریافت کے لئے سیدھا سادہ یہ تھا
کہ جس جگہ صحابہ کرام کی بنائی ہوئی کوئی مسجد ہوئی اس سے اس کے قرب و جوار کی مسجدوں کا رخ سیدھا
کر لیا، پھر ان کے قرب و جوار کا ان کے ذریعہ، اسی طرح تمام عالم میں مساجد کا رخ تجویز کیا گیا ہے،
اس لئے بلاد بعیدہ میں سمت قبلہ معلوم کرنے کا صحیح طریقہ جہت سے چلا آتا ہے یہ ہے کہ جن بلاد میں
مساجد قدیمہ موجود ہیں ان کا اتباع کیا جائے، کیونکہ اکثر بلاد میں فوج حضرات صحابہ و تابعین نے مساجد
کی بنیادیں ڈالی ہیں، اور سمت قبلہ متعین فرمائی ہے، اور پھر انھیں دیکھ کر دوسری بیٹیوں میں سلفین
نے اپنی اپنی مساجد بنائی ہیں۔

اس لئے یہ سب مساجد مسلمین سمت قبلہ معلوم کرنے کے لئے کافی و کافی ہیں، ان میں بلاوجہ
شبہات فلسفہ کا لاشرکاء ضروری نہیں، بلکہ مذہب اور موجب توثیق ہو، بلکہ بسا اوقات ان توثیقات
میں پڑنے کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ حضرات صحابہ و تابعین اور عاتہ المسلمین پر ہر گمانی ہو جاتی ہے، کہ
ان کی نمازیں اور قبلہ درست نہیں، حالانکہ یہ باطل محض اور سخت جسارت ہے، انھوں نے صدی
ہجری کے مشہور و معروف عالم ابن رجب خلیلؒ اسی بناء پر سمت قبلہ میں آلات رمدیرہ اور دقیقاً
ریاضیہ میں پڑنے کو منع فرماتے ہیں، و لفظ

واما علمہ التیسیر فاذا تعلم منہ ما
بحتاج الیہ للاستہلال و معرفۃ
القبلۃ والطریق کان جائزاً عند
الجمہور و ما نرا علیہ فلا حرج
الیہ و ہر یخل عما ہر اہم منہ
و ربما اذی التذقیق فیہ الی اساقۃ
الفلن بمتحابیب المسلمین امثالہم
کما وقع فی ذلک اکثر من اہل ہذا
العلم قد یما وحد یثا و ذلک بغضی
الاعتقاد غلط الصغایہ والذالین
فی صلوۃ اتسم فی کثیر من الامصار
و ہر ما حل و قد انکر الامام احمد
الاستدلال بالعین و قال اتسا
در ما بین المشرق و المغرب قبلۃ
فرما یا کہ حدیث شریف میں درمت، ما بین المشرق و المغرب قبلہ آیا ہے، یعنی مشرق و مغرب کے
کے درمیان پوری جہت قبلہ ہے۔

لیکن علم تیسیر پر اس کو اس قدر محال کرنا چاہیو
کے نزدیک جائز ہے جس سے راہ یابی اور قبلہ
اور رستوں کی شناخت ہو سکے، اس سے
زیادہ کی ضرورت نہیں کہ وہ زمین زیادہ کھجما
امور ضروریہ کا غافل نہ ہو، اور بعض مرتبہ
تحقیقات فلکیہ میں پڑنا عادت بلادر اسلام
میں جو مسلمانوں کی مسجدیں ہیں ان کے متعلق گمانی
پیدا کر دینا بڑا اس فتن میں مشغول ہو نہ والوں کو
ہمیشہ اس قسم کے شبہات پیش آتے ہیں اس پر
یہ بھی اعتقاد پیدا ہو گا کہ بہت شہروں میں صحابہ
تابعین کی نمازیں غلط طریقہ پر تھیں اور یہ بالکل
فہم و باطل ہے، امام احمدؒ نے (سنن) میں
ذکر کیا ہے بلادر میں قطب کہتے ہیں سمت
قبلہ میں اس سے استدلال کرنے کو منع کیا، اور
کے درمیان پوری جہت قبلہ ہے۔

اور جن جگہات یا نوآبادیات وغیرہ میں صاحب قدیمہ موجود نہ ہوں وہاں شرعی طریقہ جہت
صحابہ و تابعین سے ثابت ہے یہ ہو کہ شمس و قمر اور قطب وغیرہ کے مشہور و معروف ذرائع سے اندازہ قائم
کر کے سمت قبلہ متعین کر لی جائے، اگر اس میں معمولی انحراف و میلان بھی ہے تو اس کو نظر انداز کیا جاوے
کیونکہ حسب تعریج صاحب بدائع ان بلاد بعیدہ میں تحری اور اندازہ سے قائم کردہ جہت ہی قائم مقام
کعبہ کے ہے، اور اسی پر احکام دائر ہیں، جیسے شریعت نے یثد کو قائم مقام خروج بیچ کا قرار دے کر اسی پر
نقص وضو کا حکم کر دیا، یا سفر کو قائم مقام مشقت کا استدلال کر مطلقاً سفر پر رخصتیں مرتب کر دیں
حقیقت مشقت ہر یا نہ ہو، اسی طرح بلاد بعیدہ میں مشہور و معروف نشانات و علامات کے ذریعہ جو
سمت قبلہ تحری و اندازہ سے قائم کی جائے گی وہی شرعاً قائم مقام کعبہ کے ہوگی، علامہ محمد اعظمی
رسائل الارکان میں اس مضمون کو بالفاظ ذیل بیان کیا ہے:

والشہد و قیاس المسامۃ علی حسب | اور استقبال قبلہ میں شرط ضروری صرف یہ

ما یبری المصلیٰ و یجی غیر مأمورین
بالمسامتۃ علی ما یکلم بہ الا
المرصدیۃ و لہذا افتوان الاخر
المفسد ان یتجاوز المشرق و
المغرب (وسائل الارکان ص ۵۳)

ہر کہ نمازی کی رات اور اندازہ کے موافق کہہ
کے ساتھ مسامتہ (معاذات) واقع ہو جائے
اور ہم اس کے مکلف نہیں کہ وہ درجہ
و معاذات کا پیدا کریں جو آلات و مسد یہ
کے ذریعہ حاصل کیا جاسکتا ہے اس لئے کہ
ملاک کا فتویٰ ہے کہ انحراف مفسد و مصلوق وہ ہے جس میں مشرق و مغرب کا تفاوت ہو جائے

اس مسئلہ کی عملی تشریح اور حسابات کے ذریعہ استخراج قبلہ کے مختلف طریقے اور ان کی شرعی
حیثیت پر مفصل کلام میرے رسالے "سمت قبلہ میں دیکھا جاسکتا ہے۔

وَلَیِّنُ آتِیَتْ الذِّیْنَ اَوْثُوا الْكِتَابَ بِكُلِّ آیَةٍ مَا تَبِعُوا قِبْلَتَكَ

اور اگر تولاے اہل کتاب کے پاس ساری نشانیاں تو بھی نہ مانیں گے تیرے قبلہ کو

وَمَا اَنْتَ بِتَابِعٍ قِبْلَتِهِمْ وَ مَا بَعْضُهُمْ بِتَابِعٍ قِبْلَتِهِ بَعْضٌ وَلَیِّنُ

اور نہ تیرے ان کا قبلہ اور نہ ان میں ایک دوسرے کا قبلہ اور اگر تو چلا

اتَّبَعْتَ اَهْوَاءَهُمْ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ اِنَّكَ اِذَا لَیِّنَ

ان کی خواہشوں پر بعد اس علم کے جو تجھ کو پہنچا تو بیشک تو بھی ہر ان

الظَّالِمِیْنَ ﴿۵﴾

بے انصافوں میں۔

خلاصہ تفسیر اور (باجردان لوگوں کے سب کچھ سمجھنے کے ان کی ضد کی یہ حالت تھی کہ اگر آپ

جب بھی کہیں، آپ کے قبلہ کو قبول نہ کریں اور ان کی موافقت کی امید اس لئے نہ رکھیں چاہے کہ
آپ کا قبلہ بھی منسوخ ہونے والا نہیں، اس لئے آپ بھی ان کے قبلہ کو قبول نہیں کر سکتے، پس
کوئی صورت موافقت کی باقی نہیں رہی اور جیسا ان اہل کتاب کو آپ سے ضد ہے ان میں باہم
بھی موافقت نہیں کیونکہ ان کا کوئی (فریق) بھی دوسرے (فریق) کے قبلہ کو قبول نہیں کرتا،
مثلاً یہود نے بیت المقدس لے رکھا تھا اور نصاریٰ نے مشرق کی سمت کو قبلہ بنا رکھا تھا اور

خدا خواستہ آپ تو کسی طرح ان کے قبلہ منسوخ غیر مشروع کر لے ہی نہیں سکتے، کیونکہ اگر آپ
ان کے (ان) نفسانی خیالات کو (مگر وہ اصل میں ہم آسانی رہے ہوں لیکن اب جو منسوخ ہونے
کے ان پر عمل کرنا محض نفسانی تعصب ہو، سو اگر آپ ایسے خیالات کو اختیار کر لیں (اور وہ بھی)
آپ کے پاس علم و قطعی یقین ہی (اسے پیچھے، تو یقیناً آپ (نعم و باللہ) ظالموں میں شمار ہونے لگیں
رہیں تاکہ ہمیں حکم دیں، اور آپ کا ظالم ہونا جو بد معصوم ہونے کے محال ہے، اس لئے یہ بھی محال ہے
کہ آپ ان کے خیالات کو جن میں سے ان کا قبلہ بھی ہے قبول کر لیں۔

معارف مسائل

وَمَا اَنْتَ بِتَابِعٍ قِبْلَتِهِمْ میں یہ اعلان کر دیا گیا کہ اب قیامت تک کے لئے آپ کا قبلہ
بیت اللہ ہی رہے گا، اس سے یہود و نصاریٰ کے ان خیالات کا قطع کرنا مقصود تھا کہ مسلمانوں کے
قبلہ کو تو کوئی تشرع نہیں، پہلے بیت اللہ تھا، پھر بیت المقدس ہو گیا، پھر بیت اللہ ہو گیا، اب
بھی ممکن ہے کہ پھر دوبارہ بیت المقدس ہی کو قبلہ بنالیں۔ (بحسرحیط)

وَلَیِّنُ آتِیَتْ الذِّیْنَ اَوْثُوا الْكِتَابَ میں یہ خطاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بارہ فرسخ محال کے ہے
جس کے وقوع کا کوئی احتمال نہیں، اور دراصل سننا نا امت محمدیہ کو ہے، کہ اس کی خلافت و زری
ایسی چسپور کہ خود رسول بھی بغرض محال ایسا کریں تو وہ بھی ظالم قرار پائیں۔

الَّذِیْنَ اتَّبَعُوا الْكِتَابَ یَعْرِفُوْنَهُ كَمَا یَعْرِفُوْنَ اَبْنَاءَهُمْ

جن کو ہم نے دی ہے کتاب پہناتے ہیں اس کو جیسے پہناتے ہیں اپنے بیٹوں کو

ذَٰلَکَ فَرِیْقًا مِّنْهُمْ لَیَّکْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَهُمْ یَعْلَمُوْنَ ﴿۶﴾ الْحَقُّ

اور بیشک ایک فرقہ ان میں سے چھاتے ہیں حق کو جان کر، حق وہی ہے

مِنْ سَرِّکَ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُنْکَرِیْنَ ﴿۷﴾

جو تیرا رب کہے پھر تو نہ ہو مشک لانے والا۔

خلاصہ تفسیر اس سے پہلے آیت میں اہل کتاب کا قبلہ مسلمین کو دل میں حق جاننے اور زبانی

سے نہ ماننے کا ذکر تھا، اس آیت میں اپنی اہل کتاب کا صاحب قبلہ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس طرح دل میں حق جاننے اور زبان سے نہ ماننے کا بیان ہے

جن لوگوں کو ہم نے کتاب و توراۃ و انجیل دی ہے وہ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

کو (تورات و انجیل میں آئی ہوئی بشارت کی بناء پر بحیثیت رسالت) ایسا رہے شک و شبہ پہچانتے ہیں جس طرح اپنے بیٹوں کو (ان کی صورت سے) پہچانتے ہیں، رکہ بیٹے کی صورت دیکھ کر بھی شبہ نہیں ہوتا کہ یہ کون شخص ہے، مگر پہچان کر بھی سب مسلمان نہیں ہوتے، بلکہ بعض تو ایسا ہی لے آئے اور بعض ان میں سے (ایسے ہیں کہ اس) امر واقعی کو باوجودیکہ خوب جانتے ہیں (مگر) اختفاء کرتے ہیں (حالانکہ) یہ امر واقعی من جانب اللہ (ثابت ہو چکا) ہے سو ایسے امر واقعی ثابت من اللہ میں ہر فرد کو کہا جاسکتا ہے کہ ہرگز شک و شبہ لانے والوں میں شمار نہ ہونا۔

معارف مسائل

اس آیت میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بحیثیت رسول پہچاننے کی تشبیہ اپنے بیٹوں کو پہچاننے کے ساتھ دی گئی ہے کہ یہ لوگ جس طرح اپنے بیٹوں کو پوری طرح پہچانتے ہیں، ان میں بھی شبہ و شبہا نہیں ہوتا، اسی طرح تورات و انجیل میں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارت اور آپ کی واضح علامات و نشانات کا ذکر آیا ہے اس کے ذریعہ یہ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی یقینی طور سے جانتے پہچانتے ہیں، ان کا انکار محض عناد اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے ہے۔

یہاں یہ بات قابل نظر ہو کہ پوری طرح پہچاننے کے لئے بیٹوں کی مثال دی گئی ہو یا باپ کی مثال نہیں دی حالانکہ آدمی اپنے ماں باپ کو بھی عادتاً خوب پہچانتا ہے، وجہ یہ ہے کہ بیٹوں کی پہچان ماں باپ کی پہچان کی نسبت بہت زیادہ ہے، کیونکہ انسان اپنے بیٹوں کو ابتداً پیدائش سے اپنے ہاتھوں میں پالتا ہے، اس کے بدن کا کوئی حصہ ایسا نہیں ہوتا جو ماں باپ کی نظر سے اوچھل رہا ہو، بخلاف ماں باپ کے کہ ان کے اعضاء مستورہ پر اولاد کی کہیں نظر نہیں ہوتی۔

اس بیان سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ یہاں بیٹوں کو بیٹا ہونے کی حیثیت سے پہچاننا مراد نہیں، کیونکہ اس نسبت تو انسان پر مشتبہ ہو سکتی ہو کہ ممکن ہے کہ بیوی نے خیانت کی ہو اور یہ بیٹا اپنا نہ ہو، بلکہ مراد ان کی شکل و صورت وغیرہ کا پہچانا ہو کہ بیشائی الواقع اپنا ہو یا نہ ہو، مگر جس کو بحیثیت بیٹے کے انسان پالتا ہے اس کی شکل و صورت کے پہچاننے میں کسی اشتباہ نہیں ہوتا۔

وَلِكُلٍّ وِجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّئُهَا فَاسْتَذِقُوا الْخَيْرَاتِ أَيْنَ مَا تَكُونُوا

اور ہر کسی کے واسطے ایک جانب ہو یعنی قبلہ کر، مگر نہ اس طرف سو مت ہفت کرو دیکھو میں جہاں کہیں تم

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿۱۵۰﴾ وَمِنْ

ہم کہہ کرانے کا تم کو اکٹھا، بیشک اللہ ہر چیز کو مسکتا ہے، اور جس جگہ سے

حَيْثُ خَرَجْتَ قَوْلٍ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ طَوَّافَةٌ

لنکلے سرگرم کر اپنا مسجد حرام کی طرف اور بے شک یہی حق ہے

لَلْحَقِّ مِنْ رَبِّكَ طَوَّافَةٌ مَا لِلَّهِ بَغَافِلٌ عَمَّا تَعْمَلُونَ ﴿۱۵۱﴾ وَمِنْ حَيْثُ

برہے رب کی طرف سے اور اللہ ہے خبر نہیں تمہارے کاموں سے، اور جہاں سے تو

خَرَجْتَ قَوْلٍ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ طَوَّافَةٌ مَا كُنْتُمْ

انکلے مٹہ کر اپنا مسجد حرام کی طرف، اور جس جگہ تم ہوا کرو مٹہ کر

قَوْلُوا رُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ لِأَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ حُجَّةٌ إِلَّا

اسی کی طرف تاکہ نہ رہے لوگوں کو تم سے جھڑنے کا موقع مگر جو

الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْهُمْ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِي ذَلِكُمْ لَعْنَتِي

ان میں سے انصاف ہیں اسرار سے لینی انکے اعتراضوں سے، نہ ڈرو اور مجھ سے ڈرو اور اس واسطے کہ کمال

عَلَيْكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ ﴿۱۵۲﴾

کروں تم پر نفع اپنا اور تاکہ تم پاؤ راہ سیدھی۔

اور (دوسری حکمت توحیل قبلہ میں یہ ہے کہ مادۃ اللہ جاری ہو کہ) ہر مذہب نے اپنے

شخص کے واسطے ایک ایک قبلہ رکھا ہے، جس کی طرف وہ (عبادت میں) مٹہ کرتا

رہا ہے، چونکہ شریعت محمدیہ میں ایک مستقل دین ہے، اس کا قبلہ بھی ایک خاص ہو گیا، جب حکمت

سب پر ظاہر ہو چکی، سو مسلمانوں کو تمام دینوں کو چھوڑ کر اپنے دین کے، نیک کاموں میں آگے

بڑھنے کی کوشش کرو، کیونکہ ایک روز اپنے مالک سے سابقہ پڑنا ہے، چنانچہ تم خواہ کہیں ہو گے

(لیکن) اللہ تعالیٰ تم سب کو اپنے اجلاس میں حاضر کر دیں گے (اس وقت نیکوں پر جزا اور اعمال

بد پر سزا ہوگی اور) بالیقین اللہ تعالیٰ ہر امر پر پوری قدرت رکھتے ہیں، اور اس حکمت کا مقتضار بھی

یہی ہے کہ جس طرح حضرت کعبہ کی طرف رخ ہوتا ہے اسی طرح اگر مدینہ سے یا اور کہیں سے) جس جگہ سے بھی (کہیں سفر میں) آپ باہر جاویں تو (بھی) اپنا چہرہ (سناڑ میں) مسجد حرام کی طرف رکھ لیجئے، (غرض حضور و مسافر سب حالتوں کا یہی قبلہ ہے) اور یہ (حکم عام قبلہ کا) بالکل حق (اور صحیح) ہے (اور)

من جانب اللہ (ہے) اور اللہ تعالیٰ تمہارے کئے ہوئے کاموں سے ذرا بخیر نہیں۔

تو یہ قبلہ کی تیسری حکمت (اور دیکھ رہے کیا جاتا ہے کہ) آپ جس جگہ سے بھی (سفر میں) باہر جاویں (اور

حضرت بدر جہاؤنی، اپنا چہرہ (نماز میں) مسجد حرام کی طرف رکھتے، اور اسی طرح سب مسلمان بھی
 کئے ہیں کہ تم لوگ چنان کہیں (موجود) ہوا پنا چہرہ (نماز میں) اسی (مسجد حرام) کی طرف دکھا کر واد
 یہ حکم اس لئے مقرر کیا جاتا ہے تاکہ ان مخالفت (لوگوں کو تمنائے مقابلہ میں (اس) گفتگو کی مجال
 نہ ہے، (کہ اگر محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم وہی نبی موجود آخر الزماں ہوتے تو ان کی علامات میں قریہ
 بھی ہے کہ ان کا اصل قبلہ کعبہ ہوگا، اور یہ قریبت القدس کی طرف نماز پڑھتے ہیں، یہ تیسری حکمت
 ہے توہل قبلہ کی، ان (مکرمین میں جو (بالکل ہی) بے انصاف ہیں وہ اب بھی کٹھ جھتی بھالیں گے،
 کہ یہ کیسے نہیں ہیں جو اتنے نبیوں کے خلاف کعبہ کی طرف نماز پڑھتے ہیں، لیکن جب ایسے مہل اعترافوں
 سے دین حق کو کوئی ضرر نہیں پہنچ سکتا، تو ایسے لوگوں سے (ذرا) اندیشہ نہ کرو اور ان کے
 اعتراضوں کے جواب کی فکر میں مت پڑو اور کچھ سے ڈرتے رہو کہ میرے احکام کی مخالفت
 نہ ہونے پائے کہ یہی مخالفت البتہ ہم کو مضرب (اور ہم نے ان سب احکام مذکورہ پر عمل کرنے
 کی توفیق بھی دی) تاکہ تم پر جو کچھ (میرا انعام) (اکرام متوجہ) ہے (تم کو آخرت میں داخل بہشت
 کر کے، اس کی تکمیل کر دو اور تاکہ (دنیا میں) تم راہ (حق) پر زمین اسلام پر قائم رہنے والو
 میں (رہو جس پر وہ تکمیل نعمت مرثب ہوتی ہے)

معارف مسائل

تحويل قبلہ کی حکمتیں [مذکورہ آیات میں تحويل قبلہ کیلئے الفاظ قرآن و جہلک شطۃ المسجد الحرام میں
 مرتبہ آئے ہیں اور حینما کنتم کوکوا و جہلک شطۃ و در مرتبہ اس تکرار کی ایک عام وجہ تو یہ
 ہے کہ تحويل قبلہ کا حکم مخالفین کے لئے تو شور و شب کا ذریعہ تھا اسی اخذ مسلمانوں کے لئے بھی
 عبادت کا ایک عظیم انقلاب تھا، اگر یہ حکم تاکیدات کے ساتھ جکرار نہ لایا جاتا تو قلوب کا اطمینان
 و سکون آسان نہ ہوتا، اس لئے اس حکم کو بار بار دہرایا گیا، جس میں اس کی طرف بھی اشارہ کیا گیا
 کہ یہ تحويل آخری اور قطعی ہے، اب اس کی تبدیلی کا کوئی امکان نہیں۔

بیان قرآنی کے علامہ تفسیر میں جو تعلیق کی مشورہ کی ہے تو قرطبی بھی اسکی ایک ایسی تفسیر نقل کی ہیں جس سے مراد یہ ہے
 فرمایا کہ پہلی مرتبہ جو حکم آیا قرآن و جہلک شطۃ المسجد الحرام و حینما کنتم کوکوا و جہلک شطۃ
 شطۃ یہ حکم حالت حضر کا ہے، کہ جب آپ اپنی جگہ مغیر میں تو آپ مسجد حرام کی طرف رخ کیا کریں
 اور پھر فری امت کو اسی کا حکم دیا گیا، اور حینما کنتم کوکوا کا مفہوم اس تقریر پر یہ ہوگا کہ اپنے وطن اور
 شہر میں جس جگہ بھی ہوں استقبال بیت اللہ ہی کا کرنا ہے، یہ حکم صرف مسجد نبوی کے ساتھ مخصوص نہیں۔

پھر دوسری مرتبہ ہوا اپنی الفاظ کے ساتھ حکم آیا اس سے پہلے میں حینما کنتم کوکوا کے الفاظ
 نے یہ واضح کر دیا کہ یہ حکم وطن سے نکلنے اور سفر کی حالت کے لئے ہے، اور چونکہ سفر کے حالات
 بھی مختلف ہوتے ہیں، کبھی چند روز کے لئے کسی بستی میں قیام کیا جاتا ہے، کبھی سفر قطع کر لے گا سلسلہ
 ہوتا ہے، ان دونوں حالتوں کو عام کر کے لئے تیسری مرتبہ پھر ان الفاظ کے ساتھ و حینما کنتم کوکوا
 کا اضافہ کر کے بتلادیا کہ سفر کی کوئی بھی حالت ہو ہر حال میں استقبال مسجد حرام ہی کا کرنا ہے اس
 تیسری مرتبہ کے اضافہ کے ساتھ تحويل قبلہ کی ایک حکمت کا بھی جوڑ لگا دیا گیا کہ مخالفین کو یہ کہے کہ کافق
 نہ ملے کہ نبی آخر الزماں کا قبلہ تو قرأت و انجیل کی تصریحات کے مطابق کعبہ ہونا چاہئے، اور یہ رسول
 کعبہ کے بجائے بیت المقدس کا استقبال کرتے ہیں۔

و لکن و جہلک شطۃ المسجد الحرام و حینما کنتم کوکوا کے معنی لغوی، جس چیز کی طرف رخ کیا جا
 حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ اس سے مراد قبلہ اور حضرت ابن بن کعبؓ کی قدرت میں اس جگہ
 (جہت) کی بجائے قبلہ بھی منقول ہے، مراد آیت کی چھوڑ مغیر میں کے نزدیک یہ ہے کہ ہر قوم کا قبلہ جس کی
 طرف وہ عبادت میں رخ کرتے ہیں مختلف ہے، خواہ منجانب اللہ ان کو ایسا ہی حکم ملا ہے یا انھوں نے
 خود کوئی جانب مقرر کر لی ہے، ہر حال یہ امر واقعہ ہے کہ مختلف قوموں کے قبلے مختلف ہوتے چلے
 آئے ہیں، تو اسی حالت میں اگر نبی اُمی صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے کوئی خاص قبلہ معسر کر دیا گیا تو
 انکار و تعجب کی کیا بات ہے۔

مذہبی مسائل میں فضول بحثوں [فاسْتَبْشِرُوا الْخَيْرَاتِ۔ اس سے پہلے جملہ میں یہ فرمایا تھا کہ مختلف قوموں
 سے اجتناب کی مسابقت کے مختلف قبلے ہیں، کوئی ایک دوسرے کے قبلہ کو تسلیم نہیں کرتا، اس کو
 اپنے قبلہ کے حق ہونے پر ان لوگوں سے بحث فضول ہے، اس جملے کا حاصل یہ ہے کہ جب یہ معلوم ہو
 کہ اس بحث سے ان لوگوں کو کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا، تو پھر اس فضول بحث کو چھوڑ کر اپنے
 اصلی کام میں لگ جانا چاہئے، اور وہ کام ہے نیک کاموں میں درود دھوپ اور آگے بڑھنے کی کوشش
 اور چونکہ فضول بحثوں میں وقت ضائع کرنا اور مسابقت الی الخیرات میں شمشتی کرنا عموماً آخرت سے
 غفلت کے سبب ہوتے ہیں، جس کو اپنی آخرت اور انجام کی فکر و تپش ہو وہ کبھی فضول بحثوں میں
 نہیں الجھتا، اپنی منزل طے کرنے کی فکر میں رہتا ہے، اس لئے اگلے جملے میں آخرت کی یاد دلانے کے
 لئے ارشاد فرمایا، آئِدَمَا تَكُونُوا آيَاتٍ يَكُونُ اللَّهُ جَوِيضًا، جس کا مطلب یہ ہے کہ بحثوں میں
 ارجحیت اور لوگوں کے اعتراضات سے بچنے کی فکر سب چند روزہ دنیا کے لئے ہو اور عنقریب وہ
 دن آنے والا ہے جس میں اللہ تعالیٰ تمام اقوام عالم کو ایک جگہ جمع کر کے حساب لیں گے، عقلمند
 کا کام یہ ہے کہ اپنے اوقات اس کی فکر میں صرف کرے۔

ایک نعمت قبلہ کی پھر دوسری نعمت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی سبذول فرمائی ہو
ایں ہی نعمت ذکر اللہ بھی ہے، ان سب نعمتوں کا شکر ادا کرو، تاکہ یہ نعمتیں اور زیادہ ہو جائیں
قرآن نے فرمایا کہ تم آگے بڑھنا کہات یہاں ایسا ہی ہے جیسے سورۃ انفال میں تمنا آخرت کے
اور سورۃ حجر کے آخر میں تمنا آخرت کے آگے بالمشیقین آیا ہے۔

قَدْ كُنْتُمْ فِي آذُنْكُمْ، ذکر کے اصل معنی یاد کرنے کے ہیں جن کا تعلق قلب سے ہے، زبان
سے ذکر کرنے کو بھی ذکر اس لئے کہا جاتا ہے کہ زبان فرجبان قلب ہے، اس سے معلوم ہوا کہ ذکر زبانی
وہی معتبر ہے جس کے ساتھ دل میں بھی اللہ کی یاد ہو مولانا رحمہ اللہ نے اس کے متعلق فرمایا ہے
بر زبان تسبیح در دل گھاؤ منسر
ایں چنین تسبیح کے دارد اثر

لیکن اس کے ساتھ یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ اگر کوئی شخص زبان سے ذکر و تسبیح میں مشغول
ہو مگر اس کا دل حاضر نہ ہو اور ذکر میں نہ لگے تو وہ بھی فائدہ سے خالی نہیں، حضرت ابو عثمانؓ سے کسی
ایسی ہی حالت کی شکایت کی کہ ہم زبان سے ذکر کرتے ہیں، مگر قلوب میں اس کی کوئی حلاوت محسوس
نہیں کرتے، آپ نے فرمایا اس پر بھی اللہ تعالیٰ کا شکر کرو کہ اس نے تمہارے ایک عضو یعنی زبان
کو تو اپنی طاعت میں لگایا (شرطی)

ذکر اللہ کے فضائل بے شمار ہیں، اور یہی ایک فضیلت کچھ کم نہیں ہو کہ جو بندہ اللہ تعالیٰ کو یاد کرتا
ہے تو اللہ تعالیٰ بھی اسے یاد فرماتے ہیں، ابو عثمانؓ ہندیؓ نے کہا کہ میں اس وقت کو جانتا ہوں جس
وقت اللہ تعالیٰ ہمیں یاد فرماتے ہیں، لوگوں نے کہا کہ آپ کو یہ کیسے معلوم ہو سکتا ہے، منسرایا
اس لئے کہ قرآن کریم کے مدد سے کے مطابق جب کوئی بندہ مومن اللہ تعالیٰ کو یاد کرتا ہے تو اللہ
تعالیٰ بھی اسے یاد کرتے ہیں، اس لئے سب کو یہ سمجھ لینا آسان ہے کہ جس وقت ہم اللہ کی یاد میں
مشغول ہوں گے تو اللہ تعالیٰ بھی یاد فرمائیں گے۔

اور معنی آیت کے یہ ہیں کہ تم مجھے اطاعت احکام کے ساتھ یاد کرو تو میں تمہیں ثواب
اور مغفرت کے ساتھ یاد کروں گا، حضرت سعید بن جبیرؓ نے ذکر اللہ کی تفسیر ہی طاعت و فرمانبرداری
سے کی ہے وہ فرماتے ہیں:

فمن لم يطيع الله لم يسمع كلامه
كثير صلواته وتسبيحه

یعنی جس نے اللہ تعالیٰ کے احکام کی پیروی
نہ کی اس نے اللہ کو یاد نہیں کیا، اگرچہ ظاہر میں
اس کی نماز اور تسبیح کتنی بھی ہو

ذکر اللہ کی اصل حقیقت قرطبی نے بحوالہ احکام القرآن ابن خوزیمہؒ سے ایک حدیث بھی اس معنوں کی نقل کی ہے

جس کا ترجمہ یہ ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی، یعنی
اس کے احکام مطاع و حرام کا اتباع کیا اس نے اللہ کو یاد کیا، اگرچہ اس کی رنفل، نماز روزہ وغیرہ
کم ہوں، اور جس نے احکام خداوندی کی خلاف ورزی کی اس نے اللہ کو بھلا دیا، اگرچہ (بظاہر)
اس کی نماز، روزہ، تسبیحات وغیرہ زیادہ ہوں۔

حضرت ذوالنون مصریؒ نے فرمایا کہ جو شخص حقیقی طور پر اللہ کو یاد کرتا ہے وہ اس کے مقابلے
میں ساری چیزوں کو بھول جاتا ہے، اور اس کے بدلے میں اللہ تعالیٰ خود اس کے لئے ساری چیزوں
کی حفاظت کرتے ہیں، اور تمام چیزوں کا عوض اس کو عطا کر دیتے ہیں۔

اور حضرت معاذؓ نے فرمایا کہ انسان کا کوئی عمل اس کو خدا تعالیٰ کے مذاہب نجات دلانے
میں ذکر اللہ کے برابر نہیں، اور ایک حدیث مذہبی بروایت ابو ہریرہؓ میں ہے کہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں
میں اپنے بندے کے ساتھ ہوتا ہوں جب تک وہ مجھے یاد کرتا ہے، اور میرے ذکر میں اس کے ہوش
ہوتے رہیں، ذکر اللہ کے فضائل بے شمار ہیں، ان کا مختصر خلاصہ احقر نے اپنے رسالہ ذکر اللہ میں جمع کر دیا کہ

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ إِنَّ اللَّهَ مَعَ

اے مسلمانو! مدد لو صبر اور نماز سے، بیشک اللہ صبر

الصَّبْرِ ۝۵۳

کرنے والوں کے ساتھ ہو

رابطہ، تحویل قبلہ پر جو مخالفین کی طرف سے اعتراض تھا، اس کے دواثر تھے، ایک مذہب اسلام
پر جو اعتراض سے مذہب کی حقانیت میں شبہ پیدا کیا جا یا کرتا ہے، اور ہر کی آیتوں میں اس اعتراض
کا جواب دے کر اس اثر کا دفع کرنا مقصود تھا، دوسرا اثر طبائع اہل اسلام پر کہ اعتراض سے بالخصوص
جواب دینے کے بعد بھی اس پر بے جا اصرار کرنے سے قلب میں بچ اور صدمہ پیدا ہوتا ہے، آیت
آئندہ میں تخفیف حزن کا طریقہ کہ صبر و صلوٰۃ ہے، بتلا کر اس دوسرے اثر کو زائل فرماتے ہیں۔

اسے ایمان والوں، طبیعتوں میں عمیق ہکا کرنے کے واسطے میں، صبر اور نماز سے سہارا
اور مدد حاصل کرو، بلاشبہ حق تعالیٰ (ہر طرح سے) صبر کرنے والوں کے

ساتھ رہتے ہیں، زار نماز پڑھنے والوں کے ساتھ تو بدرجہ اولیٰ، وجہ یہ کہ نماز سب سے بڑی عبادت
ہو، جب صبر میں یہ وعدہ ہے تو نماز جو اس سے بڑھ کر ہے اس میں تو بدرجہ اولیٰ یہ بشارت ہوگی۔

ایک نعمت قبلہ کی پھر دوسری نعمت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی سبذول فرمائی ہو
ایں ہی نعمت ذکر اللہ بھی ہے، ان سب نعمتوں کا شکر ادا کرو، تاکہ یہ نعمتیں اور زیادہ ہو جائیں
قرآن نے فرمایا کہ تم آگے بڑھنا کہات یہاں ایسا ہی ہے جیسے سورۃ انفال میں تمنا آخرت کے
اور سورۃ حجر کے آخر میں تمنا آخرت کے آگے بالمشیقین آیا ہے۔

قَدْ كُنْتُمْ فِي آذُنْكُمْ، ذکر کے اصل معنی یاد کرنے کے ہیں جن کا تعلق قلب سے ہے، زبان
سے ذکر کرنے کو بھی ذکر اس لئے کہا جاتا ہے کہ زبان فرجبان قلب ہے، اس سے معلوم ہوا کہ ذکر زبانی
وہی معتبر ہے جس کے ساتھ دل میں بھی اللہ کی یاد ہو مولانا رحمہ اللہ نے اس کے متعلق فرمایا ہے
بر زبان تسبیح در دل گھاؤ منسر
ایں چنین تسبیح کے دارد اثر

لیکن اس کے ساتھ یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ اگر کوئی شخص زبان سے ذکر و تسبیح میں مشغول
ہو مگر اس کا دل حاضر نہ ہو اور ذکر میں نہ لگے تو وہ بھی فائدہ سے خالی نہیں، حضرت ابو عثمانؓ سے کسی
ایسی ہی حالت کی شکایت کی کہ ہم زبان سے ذکر کرتے ہیں، مگر قلوب میں اس کی کوئی حلاوت محسوس
نہیں کرتے، آپ نے فرمایا اس پر بھی اللہ تعالیٰ کا شکر کرو کہ اس نے تمہارے ایک عضو یعنی زبان
کو تو اپنی طاعت میں لگایا (شرطی)

ذکر اللہ کے فضائل بے شمار ہیں، اور یہی ایک فضیلت کچھ کم نہیں ہو کہ جو بندہ اللہ تعالیٰ کو یاد کرتا
ہے تو اللہ تعالیٰ بھی اسے یاد فرماتے ہیں، ابو عثمانؓ ہندیؓ نے کہا کہ میں اس وقت کو جانتا ہوں جس
وقت اللہ تعالیٰ ہمیں یاد فرماتے ہیں، لوگوں نے کہا کہ آپ کو یہ کیسے معلوم ہو سکتا ہے، منسرایا
اس لئے کہ قرآن کریم کے مدد سے کے مطابق جب کوئی بندہ مومن اللہ تعالیٰ کو یاد کرتا ہے تو اللہ
تعالیٰ بھی اسے یاد کرتے ہیں، اس لئے سب کو یہ سمجھ لینا آسان ہے کہ جس وقت ہم اللہ کی یاد میں
مشغول ہوں گے تو اللہ تعالیٰ بھی یاد فرمائیں گے۔

اور معنی آیت کے یہ ہیں کہ تم مجھے اطاعت احکام کے ساتھ یاد کرو تو میں تمہیں ثواب
اور مغفرت کے ساتھ یاد کروں گا، حضرت سعید بن جبیرؓ نے ذکر اللہ کی تفسیر ہی طاعت و فرمانبرداری
سے کی ہے وہ فرماتے ہیں:

فمن لم يطيع الله لم يسمع كلامه
كثير صلواته وتسبيحه

یعنی جس نے اللہ تعالیٰ کے احکام کی پیروی
نہ کی اس نے اللہ کو یاد نہیں کیا، اگرچہ ظاہر میں
اس کی نماز اور تسبیح کتنی بھی ہو

ذکر اللہ کی اصل حقیقت قرطبی نے بحوالہ احکام القرآن ابن خوزیمہؒ از ایک حدیث بھی اس معنوں کی نقل کی ہے

جس کا ترجمہ یہ ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی، یعنی
اس کے احکام مطاع و حرام کا اتباع کیا اس نے اللہ کو یاد کیا، اگرچہ اس کی رنفل، نماز روزہ وغیرہ
کم ہوں، اور جس نے احکام خداوندی کی خلاف ورزی کی اس نے اللہ کو بھلا دیا، اگرچہ (بظاہر)
اس کی نماز، روزہ، تسبیحات وغیرہ زیادہ ہوں۔

حضرت ذوالنون مصریؒ نے فرمایا کہ جو شخص حقیقی طور پر اللہ کو یاد کرتا ہے وہ اس کے مقابلے
میں ساری چیزوں کو بھول جاتا ہے، اور اس کے بدلے میں اللہ تعالیٰ خود اس کے لئے ساری چیزوں
کی حفاظت کرتے ہیں، اور تمام چیزوں کا عوض اس کو عطا کر دیتے ہیں۔

اور حضرت معاذؓ نے فرمایا کہ انسان کا کوئی عمل اس کو خدا تعالیٰ کے مذاہب نجات دلانے
میں ذکر اللہ کے برابر نہیں، اور ایک حدیث مذہبی بروایت ابو ہریرہؓ میں ہے کہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں
میں اپنے بندے کے ساتھ ہوتا ہوں جب تک وہ مجھے یاد کرتا ہے، اور میرے ذکر میں اس کے ہوش
ہوتے رہیں، ذکر اللہ کے فضائل بے شمار ہیں، ان کا مختصر خلاصہ احقر نے اپنے رسالہ ذکر اللہ میں جمع کر دیا کہ

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ إِنَّ اللَّهَ مَعَ

اے مسلمانو! مدد لو صبر اور نماز سے، بیشک اللہ صبر

الصَّبْرِ ۝۵۳

کرنے والوں کے ساتھ ہو

رابطہ، تحویل قبلہ پر جو مخالفین کی طرف سے اعتراض تھا، اس کے دواثر تھے، ایک مذہب اسلام
پر جو اعتراض سے مذہب کی حقانیت میں شبہ پیدا کیا جا یا کرتا ہے، اور دوسری آیتوں میں اس اعتراض
کا جواب دے کر اس اثر کا دفع کرنا مقصود تھا، دوسرا اثر طابع اہل اسلام پر کہ اعتراض سے بالخصوص
جواب دینے کے بعد بھی اس پر بے جا اصرار کرنے سے قلب میں بچ اور صدمہ پیدا ہوتا ہے، آیت
آئندہ میں تخفیف حزن کا طریقہ کہ صبر و صلوٰۃ ہے، بتلا کر اس دوسرے اثر کو زائل فرماتے ہیں۔

اسے ایمان والوں، طبیعتوں میں عمیق ہکا کرنے کے واسطے میں صبر اور نماز سے سہارا
اور مدد حاصل کرو، بلاشبہ حق تعالیٰ (ہر طرح سے) صبر کرنے والوں کے

ساتھ رہتے ہیں، زار نماز پڑھنے والوں کے ساتھ تو بدرجہ اولیٰ، وجہ یہ کہ نماز سب سے بڑی عبادت
ہو، جب صبر میں یہ وعدہ ہے تو نماز جو اس سے بڑھ کر ہے اس میں تو بدرجہ اولیٰ یہ بشارت ہوگی۔

معارف مسائل

مبراہ نماز ہر شکل کامل | اِشْتَعَيْنَا بِالصَّلٰوةِ الصَّلٰوةَ، اس آیت میں یہ ہدایت ہے کہ انسان کی اور ہر تکلیف کا علاج میں تمام حوائج و ضروریات کے پورا کرنے اور تمام آفات و مصائب کا علاج کو دور کرنے کا نسخہ اکسیر و دوا ہے۔ مرکب ہے ایک مبراہ دوسرے نماز، اور اس نسخہ کے تمام حوائج اور تمام مصائب کے لئے عام ہونے کی طرف قرآن عظیم نے اس طرح سے اشارہ کر دیا ہے کہ اِشْتَعَيْنَا کو عام سمجھو لے، کوئی خاص چیز ذکر نہیں فرمائی، کہ فلاں کام میں ان دونوں چیزوں سے مدد حاصل کرو۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ دو چیزیں ایسی ہیں کہ ان سے انسان کی ہر ضرورت میں مدد حاصل کی جاسکتی ہو، تفسیر منظر ہی میں اس عموم کو واضح کر دیا ہے، اب اس درجہ کی نفع کے دونوں اجزاء کو سمجھ لیجئے۔

مبرک اصل حقیقت | مبرک اصل معنی اپنی نفس کو روکنے اور اس پر قابو پانے کے ہیں، قرآن و سنت کی اصطلاح میں مبرک کے معنی شیعہ ہیں، ایک اپنے نفس کو حرام و ناجائز چیزوں سے روکنا، دوسرے طاعات و عبادت کی پابندی پر مجبور کرنا، عیسائی کے مصائب و آفات پر صبر کرنا، یعنی جو مصیبت آگئی اس کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے سمجھنا، اور اس کے ثواب کا امیدوار ہونا، اس کے ساتھ اگر تکلیف و پریشانی کے اظہار کا کوئی حکم بھی منہ سے نکل جائے تو وہ صبر کے منافی نہیں۔ (ذکرہ ابن کثیر عن سعید بن جبیر)

یہ تینوں صبر کے فرائض میں داخل ہیں، ہر مسلمان پر یہ پابندی عائد ہے کہ تینوں طرح کے صبر کا پابند ہو، عوام کے نزدیک صرف تیسرے شیعہ کو تو صبر کہا جاتا ہے، دوسرے جو صبر کی اصل اور بنیاد میں عام طور پر ان کو صبر میں داخل ہی نہیں سمجھا جاتا۔

قرآن و حدیث کی اصطلاح میں صابرین انھیں لوگوں کا لقب ہے جو تینوں طرح کے صبر میں ثابت قدم ہوں، بعض روایات میں ہے کہ عشر میں نماز کی جائے گی کہ صابرین کہاں ہیں؟ تو وہ لوگ جو تینوں طرح کے صبر پر قائم رہ کر زندگی سے گزرے ہیں وہ کھڑے ہو جائیں گے، اور ان کو بلا حتما جنت میں داخلہ کی اجازت دی جاتی جائے گی، ابن کثیر نے اس روایت کو نقل کر کے فرمایا کہ آیت قرآن اِنَّمَا يَتَذَكَّرُ الْمُتَذَكِّرُونَ اَجْرُهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ (۱۰۴) سے بھی اس طرف اشارہ ہوتا ہے۔

نماز، دوسرا جز اس نسخہ کا جو تمام انسانی ضروریات کو پورا کرنے اور تمام پریشانیوں اور آفتوں سے نجات دلانے میں اکسیر ہے نماز ہے، صبر کی جو تفسیر ابھی لکھی گئی ہے اس سے معلوم ہو گیا ہے کہ درحقیقت نماز اور تمام عبادات صبر ہی کے جزئیات ہیں، مگر نماز کو جدا گانہ بیان اس لئے کر دیا کہ تمام عبادات میں سے نماز ایک ایسی عبادت ہے جو صبر کا مکمل نمونہ ہے، کیونکہ نماز کی حالت میں نفس کو عبادت و طاعت پر مجبور بھی کیا جاتا ہے، اور تمام معاصی و مکروہات سے

بلکہ بہت سے مباحات سے بھی نفس کو بحالت نماز روکا جاتا ہے، اس لئے صبر جس کے معنی نفس کو اپنے قابو میں رکھ کر تمام طاعات کا پیرو اور تمام معاصی سے مجتنب و بیزار بنانا ہے، نماز اس کی ایک عملی تمثیل ہے۔

اس کے علاوہ نماز کو انسان کی تمام حاجات کے پورا کرنے اور تمام آفتوں و مصیبتوں سے نجات دلانے میں ایک خاص تاثیر بھی ہے، گو اس کی وجہ اور سبب معلوم نہ ہو، جیسے دواؤں میں بہت سی ادویات کو مؤثر بالخاصہ تسلیم کیا جاتا ہے، یعنی کیفیات حرارت و برودت کے حساب سے جیسے کسی خاص مرض کے ازالہ کے لئے بعض دوائیں بالخاصہ مؤثر ہوتی ہیں، جیسے درد گردہ کے لئے فرنگی دانہ کو یا تھ یا تھ میں رکھنا، اور بہت سے امراض کے لئے عود صلیب وغیرہ کو گلے میں ڈالنا، مؤثر بالخاصہ ہے، سبب نامعلوم ہے، لوہے کو کھینچنے میں مقناطیس مؤثر بالخاصہ ہے، وجہ معلوم نہیں اس طرح نماز تمام انسانی ضروریات کی کفالت اور تمام مصائب سے نجات دلانے میں مؤثر بالخاصہ ہے، بشرطیکہ نماز کو نماز کی طرح آداب اور خشوع خضوع کے ساتھ پڑھا جائے، ہماری جو نمازیں غیر مؤثر نظر آتی ہیں، اس کا سبب ہمارا قصور ہے کہ نماز کے آداب اور خشوع و خضوع میں کوتاہی ہوتی ہے، ورنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت شریفہ یہ تھی کہ جب کوئی ہم پیش آتی تو نماز کی طرف رجوع فرماتے تھے، اور اس کی برکت اللہ تعالیٰ اس ہم کو پورا فرمادیتے تھے، حدیث میں ہے:

اِذَا حُزِبَ مِنْ رُفْعِ اِلَى الصَّلٰوةِ | یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب کوئی منور

پیش آتی تو نماز کی طرف رجوع فرما کرتے تھے،

مبراہ نماز تمام مشکلات و مصائب | اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ، اس کلمہ میں اس کا راز بتلادیا گیا ہے کہ صبر نجات کا سبب اس لئے ہے کہ مبراہ حل مشکلات اور دفع مصائب کا سبب کیسے بنتا ہے، ارشاد کا حامل اللہ تعالیٰ کی معیت نصیب ہوتی ہے، یہ ہے کہ صبر کے نتیجہ میں انسان کو حق تعالیٰ کی معیت نصیب ہوتی ہے اور یہ ظاہر ہے کہ جس شخص کے ساتھ رب العزت کی طاقت ہو اس کا کوئی کام رک سکتا ہے اور کوئی مصیبت اس کو عاجز کر سکتی ہے۔

وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ بَلْ اَحْيَاءٌ وَلٰكِنْ

اور نہ کہو ان کو جو مارے گئے خدا کی راہ میں کہ مرے ہیں بلکہ وہ زندہ ہیں لیکن

لَا تَشْعُرُوْنَ ۝ وَكُنْتُمْ لَشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصِ

تم کو خبر نہیں، اور البتہ ہم آزمائشیں گئے تم کو خوف سے ڈر سے اور بھوک سے اور نقصانوں سے

مِنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنْفُسِ وَالشَّمْرِسِ وَبَنِي الشَّيْطَانِ ۝۱۵۷ الدِّينِ

ان کے اور جانوں کے اور میروں کے اور خوش خیزی دے مہر کرنے والوں کو کہ جب

إِذَا أَصَابَتْهُمْ مُصِيبَةٌ قَالُوا إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ ۝۱۵۸ أُولَٰئِكَ

پہنچے ان کو مصیبت تو کہیں ہم تو اللہ ہی کا مال ہیں اور ہم اس کی طرف لوٹ کر جا رہے ہیں ایسے ہی

عَلَيْهِمْ صَلَواتٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ ۝۱۵۹ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ ۝۱۶۰

لوگوں پر عنایتیں ہیں اپنے رب کی اور ہرانی اور وہی ہیں سیدھی راہ پر۔

رابطہ اور ایک خاص انوار واقعہ میں صبر کی تعلیم اور صابرین کی فضیلت بیان فرمائی تھی آیات آئندہ میں اور بھی بعض واقعات غلامیہ طبع کی تفصیل اور اس میں صبر کی ترغیب اور فضیلت بیان فرماتے ہیں جن میں قتل و قتال مع الکفار کا مضمون مقدم فرماتے ہیں، اور وجہ سے اول بوجہ اعظم ہونے کے کہ اعظم پر صبر کرنے والا اصغر پر بدرجہ اولیٰ صبر کرے گا، دوسرے خاص طور پر مناسب مقام ہونے کی وجہ سے، کیونکہ معترضین مذکورین کے ساتھ یہ معاملہ پیش آتا تھا،

خلاصہ تفسیر اور جو لوگ اللہ کی راہ میں دین کے واسطے قتل کئے جاتے ہیں ان کی ایسی فضیلت ہو کہ ان کی نسبت یوں بھی مست کہو کہ وہ معمولی مردوں کی طرح

مُردے ہیں، بلکہ وہ لوگ ایک ممتاز حیات کے ساتھ زندہ ہیں، لیکن تم (اپنے موجودہ) حواس سے (اس حیات کا) ادراک نہیں کر سکتے، اور دیکھو، ہم (صفت رضا و تسلیم میں جو کہ مقتضای ایمان کا ہے) تمہارا امتحان کریں گے کسی قدر خوف سے (جو کہ ہجوم مخالفین یا نزول حوادث و شدائد سے پیش آوے) اور (کسی قدر فقر و) فقر سے اور (کسی قدر) مال اور جان اور بھلوں کی کمی سے (مثلاً مویشی مرگے یا کوئی آدمی مر گیا یا بیمار ہو گیا یا پھل اور کھیتی کی پیداوار تلف ہو گئی، پس تم صبر کرنا) اور جو لوگ ان امتحانوں میں پورے اتر آویں اور مستقل رہیں تو آپ ایسے صابرین کو بشارت سنا دیجئے (جن کی یہ عادت ہے کہ ان پر جب کوئی مصیبت پڑتی ہے تو وہ ردل سے سمجھ کر یوں کہتے ہیں کہ ہم تو (مع مال و اولاد و حقیقتہ) اللہ تعالیٰ ہی کی ملک میں (اور مالک حقیقی کو اپنی ملک میں ہر طرح کے تصرف کا اختیار حاصل ہے، اس سے ملوک کا تنگ ہونا کیا معنی) اور ہم سب (دنیا) اللہ تعالیٰ ہی کے پاس جاسنے والے ہیں، سو یہاں کے نقصانوں کا بدلہ وہاں جاکر مل رہے گا، اور جو مضمون بشارت کا ان کو سنایا جائے گا وہ یہ ہے کہ ان لوگوں پر (جدا جدا) خاص خاص رحمتیں بھی ان کے پروردگار کی طرف سے (مہذول) ہوں گی اور (سب پر بالاشترک) عام رحمت بھی ہوگی، اور یہی لوگ ہیں جن کی حقیقت حال تک، رسائی ہو گئی کہ حق تعالیٰ کو ہر چیز کا مالک اور نقصان کا تدارک کر دینے والا سمجھ گئے۔

معارف مسائل

شہداء اور انبیاء کی حیات برزخی یہ قوسب کو معلوم ہے کہ اسلامی روایات کی روش سے ہر مرنے والے کو اور اس کے درجات میں تفاضل برزخ میں ایک خاص قسم کی حیات ملتی ہے جس سے وہ خیر کے عذاب یا ثواب کو محسوس کرتا ہے، اس میں مومن و کافر یا صالح و فاسق میں کوئی تفریق نہیں، لیکن اس حیات برزخی کے مختلف درجات ہیں ایک درجہ قوسب کو عام اور شامل ہے، کچھ مخصوص درجہ انبیاء و صالحین کے لئے مخصوص ہیں، اور ان میں بھی باہمی تفاضل ہے، اس مسئلہ کی تحقیق پر علماء کے مقالات و تحقیقات بے شمار ہیں، لیکن ان میں سے جو بات اقرب الی الکتاب والسنۃ اور شبہات سے پاک ہو، اس کو سیدی حضرت بحیم الامت تھانویؒ نے بیان القرآن میں واضح فرمایا ہے، اس جگہ اس کو نقل کرنا کافی معلوم ہوا۔

فت: ایسے مقتول کو جو اللہ کی راہ میں قتل کیا جائے شہید کہتے ہیں، اور اس کی نسبت گو یہ کہنا کہ وہ مر گیا صحیح اور جائز ہے، لیکن اس کی موت کو دوسرے مردوں کی سی موت سمجھنے کی نفی کی گئی ہے، وجہ اس کی یہ ہے کہ بعد مرنے کے گو برزخی حیات ہر شخص کی روح کو حاصل ہے، اور اسی سے جزاء و سزا کا ادراک ہوتا ہے، لیکن شہید کو اس حیات میں اور مردوں سے ایک گونہ امتیاز، جو اور وہ امتیاز یہ ہو کہ اس کی یہ حیات آثار میں اور دونوں سے قوی ہے، جیسے انگلیوں کے اگلے پورے اور ایڑی، اگرچہ دونوں میں حیات ہے، اور حیات کے آثار بھی دونوں میں موجود ہیں، لیکن انگلیوں کے پوروں میں حیات کے آثار احساس وغیرہ بہ نسبت ایڑی کے زیادہ ہیں، اسی طرح شہداء میں آثار حیات عام مردوں سے بہت زیادہ ہیں، حتیٰ کہ شہید کی اس حیات کی قوت کا ایک اثر برخلات معمولی مردوں کے اس کے جسد ظاہری تک بھی پہنچا ہے، کہ اس کا جسم باوجود مجموعہ گوشت و پوست ہونے کے خاک سے متاثر نہیں ہوتا، اور مثل جسم زندہ کے صیغ سالم رہتا ہے، جیسا کہ احادیث اور مشاہدات شاہد ہیں، پس اس امتیاز کی وجہ سے شہداء کو احیاء کہا گیا، اور انکو دوسرے اموات کے برابر اموات کہنے کی مانعت کی گئی، مگر احکام ظاہرہ میں وہ عام مردوں کی طرح ہیں، ان کی میراث تقسیم ہوتی ہے، اور ان کی بیویاں دوسروں سے نکاح کر سکتی ہیں، اور یہی حیات ہے جس میں حضرات انبیاء علیہم السلام شہداء سے بھی زیادہ امتیاز اور قوت رکھتے ہیں، یہاں تک کہ سلامت جسم کے علاوہ اس حیات برزخی کے کچھ آثار ظاہری احکام پر بھی پڑتے ہیں، مثلاً ان کی میراث تقسیم نہیں ہوتی، ان کی ازدواج دوسروں کے نکاح میں نہیں آ سکتیں۔

پس اس حیات میں سب قوی تر انبیاء علیہم السلام ہیں، پھر شہداء پھر اور معمولی مردے،

البتہ بعض احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض اولیاء و صالحین بھی اس شہداء کے شریک ہیں، سو جبکہ نفس میں مرنے کو بھی حق شہادت میں داخل سمجھیں گے، اس طور پر وہ بھی شہداء ہونگے، یا یوں کہا جاوے کہ آیت میں شہداء کی تخصیص عام مسردوں کے اعتبار سے ہے، شہداء کے ہر تہہ و دو سرے لوگ صالحین و صدیقین کے اعتبار سے نہیں۔

اور اگر کسی شخص نے کسی شہید کی لاش کو خاک خوردہ پایا ہو تو سمجھ لے کہ ممکن ہے اس کی نیت خالص نہ ہو، جس پر دوسرے قتل کے شہادت ہونے کا، اور صرف قتل شہادت نہیں ہو اور اگر فحشا ایسا شہید خاک خوردہ پایا جاوے جس کا قتل فی سبیل اللہ اور اس کا جامع شرائط شہاد ہو، تاویل قطعی تو اثر وغیرہ سے ثابت ہو، جس کا شبہ صاحب روح المعانی کو ہو گیا ہے، تو اس کی وجہ میں کہا جاوے گا کہ حدیث میں جس چیز کی تصریح ہے وہ یہ کہ انبیاء و شہداء کے جسم کو زمین نہیں کھائی، یعنی مٹی ان کے جسم کو خراب نہیں کر سکتی، اجزاء ارضیہ مٹی وغیرہ کے علاوہ کسی دوسری چیز سے ان کے جسم کا متاثر ہو کر فنا ہو جانا پھر بھی ممکن ہے، کیونکہ زمین میں اور بھی بہت سی اقسام اور انواع کی وحاشیں اور ان کے اجزاء اللہ تعالیٰ نے رکھ دیئے ہیں، اگر ان کی وجہ سے کسی شہید کا جسم متاثر ہو جائے تو اس آیت کے منافی نہیں۔

چنانچہ دوسرے اجسام مرکبہ مثل اسلحہ و ادویہ و اغذیہ و اغلاط و اجسام بیہلہ مثل آب آتش و باد کی تاثیر انبیاء علیہم السلام کے اجساد میں بھی ثابت ہے، اور شہداء کی حیات بعد المات انبیاء کی حیات قبل المات سے اتنی نہیں، اور بعض حصّہ ارض میں بعض اجزاء غیر ارضیہ بھی شامل ہو جاتے ہیں، جس طرح دوسرے عناصر میں بھی مختلف عناصر شامل ہو جاتے ہیں، سو اگر ان اجزاء غیر ارضیہ سے ان کے اجساد متاثر ہو جائیں تو اس سے ان احادیث پر اشکال نہیں ہوتا، جن میں حرمت اجساد علی الارض وارد ہے۔

اور ایک جواب یہ ہو کہ اعتناء از اجساد شہداء کے لئے یہ کافی ہے کہ دوسری اموات زیادہ مرتبت تک ان کے اجساد خاک سے متاثر نہ ہوں، گو کسی وقت میں ہو جائیں، اور احادیث سے یہی امر مقصود کہا جائے کہ ان کی محفوظیت اجساد کی خارجی عادت ہے، اور خرق عادت کی دونوں صورتیں ہیں، حفظ و تبدل و حفظ طویل، اور چونکہ عالم برزخ حواس یعنی آنکھ، کان، ناک، ہاتھ وغیرہ سے مرکب نہیں ہوتا اس لئے لا شعور کن فرمایا گیا کہ تم ان کی حیات کی حقیقت کو نہیں سمجھ سکتے۔

معنا یہ ہے کہ آسان ف، اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو بندوں کا امتحان ہوتا ہے، اس کی حقیقت کرنے کی خاص تدبیر آیت وَاِذَا ابْتُلِيَ اِبْرٰهٖمَ رَبُّہٗ بِالْحَقِّ لَیْسَ فِیْہِ شَیْءٌ مِّنْ غَدَرٍ ہے، اور حوادث کے واقع ہونے سے پہلے ان کی خبر دینے میں یہ فائدہ ہوا کہ صبر آسان ہو جاتا ہے، ورنہ دقت کوئی مسئلہ

پڑنے سے زیادہ پریشانی ہوتی ہے، اور یہ خطاب ساری امت کو ہے تو سب کو کچھ لینا چاہئے کہ دنیا دارا لہن ہے، یعنی محنتوں اور تکلیفوں کی جگہ ہے، اس لئے بیان کے حوادث کو عجیب اور بعید نہ سمجھا جائے تو بے صبری نہ ہوگی، اور چونکہ یہ لوگ نفس عمل صبر میں سبب شریک ہیں، اس لئے اس کا حاصل مشترکہ تو عام رحمت ہو، جو نفس صبر پر موعود ہے، اور چونکہ مقدار اور شان اور خصوصیت ہر صابر کے صبر کی جدا ہے، اس لئے ان خصوصیات کا حاصل جدا جدا خاص غنائتوں سے ہوگا، جو ان خاص خصوصیات پر موعود ہیں، جیسے دنیا میں مواقع انعام پر دعوت طعام تو عام ہوتی ہے، پھر روپے اور جوڑے ہر ایک کو مل سکتے ہیں، قدر اعلیٰ و الخیریت و الخیریت دینے جاتے ہیں۔

مصیبت میں اتنا بردبار نہ ہو کہ کچھ نہ کرے | صابرین کی طرف نسبت کر کے جو یہ فرمایا ہے کہ وہ مصیبت کے تو تکلیف طلب کا بہترین علاج ہے | وقت ان اللہ و اتالیقہ را چون کہا کرتے ہیں، حقیقت میں مقصود اس کی تعلیم سے یہ ہو کہ مصیبت و انوں کو ایسا ہنسنا چاہئے، کیونکہ ایسا کہنے میں ثواب بھی بڑا ہے، اور اگر دل سے کچھ کرے الفاظ کہ جائیں تو غم درخ کے دور کرنے اور قلب کو تسلی دینے کے معاملہ میں بھی اسیر کا حکم رکھتے ہیں۔

اِنَّ الصَّافِیْنَ الْمَرْوۃَ مِنْ شَعَابِرِ اللّٰہِ فَمَنْ حَجَّ الْبَیۡتَ اَوْ اعَمَرَ

بے شک صفا اور مروہ نشانیوں میں سے ہیں اللہ کی سوچ کوئی حج کرے بیت اللہ کا یا عمرہ

فَلَا جُنَاحَ عَلَیْہِ اَنْ یَّطُوۡفَ بِہِمَا وَاَوْ مِنْ تَطَوُّعٍ خَیۡرًا وَّ اِنَّ اللّٰہَ

تو کچھ گناہ نہیں اس کو کہ طواف کرے ان دونوں میں اور جو کوئی اپنی خوشی سے کرے کچھ نیکی تو اللہ

شَاکِرٌ عَلَیۡہِۭ ۝۱۵۹

قدردان ہے سب کچھ جانتے والا

رابط آیات متقدمہ میں وَاِذَا ابْتُلِيَ اِبْرٰهٖمَ رَبُّہٗ سے درر تک خانہ کعبہ کا فضل ذکر ہوا، جو چہ کے اوّل میں خانہ کعبہ کے جائے عبادت ہونے کا بیان تھا، اور اس کے آگے دعائے ابراہیم کی حکایت تھی کہ انھوں نے یہ درخواست کی تھی کہ ہمیں احکام مناسک سکھلا دیئے جاویں، اور مناسک میں حج و عمرہ بھی داخل ہو، پس بیت اللہ کا مقصد ہونا جیسے اس کے قبلہ نماز بنانے سے ظاہر کیا گیا اسی طرح حج و عمرہ میں بیت اللہ کو مقصد بنا کر اس کی اہمیت کو واضح کیا گیا۔

اب آیت آئندہ میں اس کے مقصد حج و عمرہ بننے کے مطلق ایک مضمون کا بیان ہے، وہ یہ کہ

صفاد مردہ دو پہاڑیاں مکہ میں ہیں، حج و عمرہ میں کعبہ کا طواف کر کے ان کے درمیان میں دوڑتے چلتے ہیں، جس کو سعی کہتے ہیں، چونکہ زمانہ جاہلیت میں بھی یہی جڑی تھی، اور اس وقت صفاد مردہ پر کچھ مورتیاں رکھی تھیں، اس لئے بعض مسلمانوں کو شبہ پڑ گیا کہ شاید یہ رسوم جاہلیت سے ہو، اور موجب گناہ ہو، اور بعض جاہلیت میں ہی اس کو گناہ سمجھتے تھے، ان کو یہ شبہ ہو کہ شاید اسلام میں بھی گناہ ہو، اللہ تعالیٰ کو یہ شبہ دفع فرمایا مقصود ہے، پس مضمون سابق میں کعبہ کے قبلہ نماز ہونے پر اعتراض کفار کا دفع کرنا مقصود تھا، اور مضمون لاحق میں کعبہ کے مقصد حج و عمرہ ہونے کے متعلق ایک امر یعنی صفاد مردہ کی سعی پر خود مسلمانوں کے شبہ کا ازالہ فرمایا مقصود ہے، یہ وجہ دونوں مضمونوں میں ربط کی ہے۔

خلاصہ تفسیر | صفاد مردہ کی سعی میں کوئی شبہ نہ کر رہا کیونکہ تحقیقاً صفاد مردہ داران کے درمیان میں سعی کرنا منجملہ یادگار (دین) خداوندی ہیں، سو جو شخص حج کرے بیت اللہ کا یا اس کا عمرہ کرے اس پر ذرا بھی گناہ نہیں (جیسا تم کو شبہ ہو گیا) ان دونوں کے درمیان سعی کے محدود طریقہ کے مطابق آمد و رفت کرنے میں (جس کا نام سعی ہے) اور گناہ کیا بلکہ ثواب ہوتا ہے کیونکہ یہ سعی تو شرعاً امر خیر ہے، اور رہائے میاں کا ضابطہ ہو کہ جو شخص خوشی سے کوئی امر خیر کرے تو حق تعالیٰ اس کی بڑی قدر دانی کرتے ہیں اور اس خیر کرنے والے کی نیت و غلوں خوب جانتے ہیں، پس اس ضابطہ کی نوسہ سعی کرنے والے کو بمقدار اخلاص ثواب عنایت ہوگا۔

معارف مسائل

بعض لغات کی تحقیق | شاعر پر اللہ، شاعر جمع ہے شعیرہ کی، جس کے معنی علامت کے ہیں، شاعر اللہ سے مراد وہ اعمال ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے دین کی علامتیں قرار دیے ہیں، حج کے لفظی معنی قصد کرنے کے ہیں، اور اصطلاح قرآن و سنت میں خاص خاد کعبہ کا قصد کرنے اور وہاں افعال مخصوصہ کے ادا کرنے کو حج کہا جاتا ہے، عمرہ کے لفظی معنی زیارت کے ہیں اور اصطلاح شرع میں مسجد حرام کی حاضری اور طواف سعی کو کہا جاتا ہے۔

صفاد مردہ کے درمیان حج اور عمرہ اور سعی کا طریقہ فقہ کی کتابوں میں مذکور ہے، اور یہی امام احمد کے سن واجب ہر نزدیک سنت مستحب ہے، اور مالک اور شافعی کے نزدیک فرض ہے، اور امام ابو حنیفہ کے نزدیک واجب ہے، کہ ترک سے ایک بکری ذبح کرنا پڑتی ہے۔

آیت مذکورہ کے الفاظ سے پر شبہ نہ کرنا چاہئے کہ اس آیت میں تو صفاد مردہ کے درمیان سعی کرنے کے متعلق صرف اتنا فرمایا گیا ہے کہ وہ گناہ نہیں، اس سے تو زیادہ سے زیادہ یہ ثابت

ہو اگر سعی با عات میں سے ایک مباح ہے، وجہ یہ ہے کہ اس جگہ عنوان لا یجتاح کا سوال کی مشابہت سے رکھا گیا ہے، سوال اسی کا تھا کہ صفاد مردہ پر بتوں کی عورتیں رکھی تھیں اور اہل جاہلیت انہی کی پوجا پاٹ کے لئے صفاد مردہ کے درمیان سعی کرتے تھے، اس لئے یہ عمل حرام ہونا چاہئے، اس کے جواب میں فرمایا کہ اس میں کوئی گناہ نہیں، چونکہ یہ دراصل سنت ابراہیمی ہے کسی کے جاہلانہ عمل سے کوئی گناہ نہیں ہو جاتا، یہ فرمانا اس کے واجب ہونے کے منافی نہیں۔

إِنَّ الَّذِينَ يَكْتُمُونَ مَا أَنزَلْنَا مِنَ الْكِتَابِ وَالْهُدَىٰ مِنْ

بے شک جو لوگ چھپاتے ہیں جو کچھ ہم نے انارے سات حکم اور ہدایت کی باتیں بعد اس کے

تَعْلَىٰ مَا بَشَرٌ لِّلنَّاسِ فِي الْكِتَابِ أُولَٰئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللَّهُ وَيَلْعَنُهُمُ

کہ ہم ان کو کھول چکے لوگوں کے واسطے کتاب میں ان پر لعنت کرتا ہے اللہ اور لعنت کرتے ہیں

الْعَالَمُونَ ۝ إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا وَأَصْلَحُوا وَبَيَّنَّوْا أَنَّهُمْ كُفَرُوا

ان پر لعنت کرنا چاہئے، مگر جنہوں نے توبہ کی اور درست کیا اپنے کلام کو اور میان کر دیا حق بات کو قرآن کریم

عَلَيْهِمْ وَأَنَا التَّوَّابُ الرَّحِيمُ ۝ إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَمَاتُوا

کرتا ہوں اور میں ہوں پڑا سات کرنا لا ہدایت ہر ان، بے شک جو لوگ کافر ہوئے اور مرتے

وَهُمْ كُفَرُوا أُولَٰئِكَ عَلَيْهِمُ لَعْنَةُ اللَّهِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالنَّاسِ

کافر ہیں انہی پر لعنت ہے اللہ کی اور فرشتوں اور لوگوں کی

أَجْمَعِينَ ۝ خُلِدَ لِنِ فِيهَا لَا يَخْفَىٰ عَنْهُمْ الْعَذَابُ وَ

سب کی، ہمیشہ رہیں گے اسی لعنت میں نہ ہٹا ہوگا ان پر ہے عذاب اور

لَا هُمْ يُنظَرُونَ ۝

نہ ان کو ہمت ملے گی۔

ربط | اور پر بحث قبلہ کے ضمن میں صاحب قبلہ کی نبوت کے متعلق اہل کتاب کی حق پوشی کا مضمون مذکور تھا، اس آیت میں الَّذِينَ اقْبَلُوا الْكِتَابَ یعنی قوم اللہ الیٰی وَلَا يَكْتُمُونَ الْحَقَّ آئے اس مضمون کی تکمیل کے واسطے حق کو چھپانے والوں کی اور کتمان حق پر اصرار کرنے والوں کی وعید اور توبہ کرنے پر دعائی کا وعدہ ارشاد فرماتے ہیں۔

خلاصہ تفسیر

جو لوگ اخفاء کرتے ہیں ان مضامین کا جن کو ہم نے نازل کیا ہے جو کہ (اپنی ذات میں) واضح ہیں اور (دوسروں کے لئے) ہادی ہیں (اور اخفاء بھی) اس (حالت) کے بعد کہ ہم ان مضامین کو کتاب (والہی توراۃ و انجیل) میں نازل فرما کر عام لوگوں پر ظاہر کر چکے ہوں ایسے لوگوں پر اللہ تعالیٰ بھی لعنت فرماتے ہیں (کہ اپنی رحمت خاصہ سے ان کو بعید کر دیتے ہیں) اور (دوسرے بہتر سے) لعنت کرنے والے بھی (جن کو اس فعل سے نفرت ہی ان پر لعنت بھیجتے ہیں) کہ ان پر بددعا کرتے ہیں (ہاں) مگر جو لوگ (ان اخفاء کرنے والوں میں) اپنی اس حرکت سے (توبہ) یعنی حق تعالیٰ کے رو بروئے شہر سے معذرت کر لیں اور (جو کچھ ان کے اس فعل سے خرابی ہو گئی تھی) آئندہ کے لئے اس کی اصلاح کر دیں (اور اس اصلاح کا طریقہ یہ ہے کہ ان اخفاء کئے ہوئے مضامین کو عام طور پر) ظاہر کر دیں (تاکہ سب کو اطلاع ہو جائے) اور ان پر لوگوں کو گمراہ کرنے کا بار نہ رہے اور اظہار معتبر عند الشرع یہ ہے کہ اسلام کو قبول کر لیں، کیونکہ اسلام نہ لانے میں نبوت محمدیہ کے متعلق عوام پر بھی حق مخفی رہے گا، وہ یہی سمجھیں گے کہ اگر نبوت حق ہوتی تو یہ کتاب جاننے والے لوگ کیوں نہ ایمان لاتے، خلاصہ یہ کہ یہ لوگ مسلمان ہو جاویں، تو ایسے لوگوں (کے حال) پر میں (عنایت سے) متوجہ ہو جاتا ہوں (اور ان کی خطا معاف کر دیتا ہوں) اور میری تو بکثرت عادت ہے کہ توبہ قبول کر لینا، اور مہربانی فرمانا (کوئی توبہ کرنے والا ہونا چاہئے) البتہ جو لوگ (ان میں سے) اسلام نہ لادیں، اور اسی حالت غیر اسلام پر مر جاویں ایسے لوگوں پر (وہ) لعنت (مذکورہ) اللہ تعالیٰ کی اور فرشتوں اور آدمیوں کی بھی سب کی (ایسے طور پر برسا کرے گی کہ) وہ ہمیشہ ہمیشہ کو اسی راستہ میں رہیں گے (جہنم میں رہیں گے) اور ہمیشہ کے لئے داخل ہوں گے، اور ہمیشہ کا جہنم میں رہنے والا ہمیشہ ہی خدا کی خاص رحمت سے دور بھی رہے گا اور ہمیشہ ملعون رہنا ہی ہو، اور ہمیشگی لعنت کے ساتھ یہ بھی ہے کہ داخل ہونے کے بعد کسی وقت (ان پر) سے (جہنم کا) عذاب ہلکا (بھی) نہ ہونے پاوے گا اور نہ (داخل ہونے کے قبل) ان کو (کسی میعاد تک) ہلکت دی جائے گی (کیونکہ میعاد اس وقت دی جاتی ہے، جب کہ مقدمہ میں گنجائش ہو اور گنجائش نہ ہونے پر ازل ہی پیش میں حکم سزا ہو جاتا ہے)۔

معارف مسائل

علم دین کا اظہار اور پھیلا نا واجب | آیت مذکورہ میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اور اس کا چھپانا سخت حرام ہے | جو ہدایات و نجات نازل کی گئی ہیں ان کا لوگوں سے چھپانا ناشائستہ

بڑا جرم عظیم ہے کہ اس پر اللہ تعالیٰ بھی لعنت کرتے ہیں اور تمام مخلوق لعنت بھیجتی ہے، اس سے چند احکام حاصل ہوئے :-

اول یہ کہ جن علم کے اظہار اور پھیلانے کی ضرورت ہے اس کا چھپانا حرام ہے، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

مَنْ سَتَلَ عَنْ عِلْمٍ يَكْتُمُهُ فَكَلَّمَهُ	یعنی جو شخص دین کے کسی حکم کا علم رکھتا ہو
الْجَمْعَةُ النَّفَقَةُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ	اور اس سے وہ حکم دریافت کیا جائے اگر وہ
يَلْتَجِئُ إِلَى النَّارِ (رواہ ابوہریرہ)	اس کو چھپا کر قیامت کے روز اس کے منہ میں
وَمَنْ بَيَّنَّ الْعِلْمَ أَخْرَجَهُ ابْنُ مَرْثَدَةَ (ازنہ)	اللہ تعالیٰ آگ کا نظام ڈالیں گے۔

حضرات فقہاء نے فرمایا کہ یہ وعید اس صورت میں ہے جب کہ اس کے سوا کوئی دوسرا آدمی مسئلہ کا بیان کرنے والا وہاں موجود نہ ہو، اور اگر دوسرے علماء بھی موجود ہوں تو گنجائش ہے کہ یہ کہہ دے کہ دوسرے علماء سے دریافت کر لو (قرطبی، جصاص) دوسری بات اس سے یہ معلوم ہوئی کہ جس کو خود صحیح علم حاصل نہیں اس کو مسائل و احکام بتانے کی جرأت نہیں کرنا چاہئے۔

تیسرا مسئلہ یہ معلوم ہوا کہ علم کو چھپانے کی یہ سخت وعید انہیں علوم و مسائل سے متعلق ہے، جو قرآن و سنت میں واضح بیان کئے گئے ہیں اور جن کے ظاہر کرنے اور پھیلانے کی ضرورت ہو وہ باریک اور دقیق مسائل جو عوام نہ سمجھ سکیں بلکہ خطرہ ہو کہ وہ کسی غلط فہمی میں مبتلا ہو جائیں گے تو ایسے مسائل و احکام کا عوام کے سامنے بیان نہ کرنا ہی بہتر ہے، اور وہ کتاب علم کے حکم میں نہیں جو آیت مذکورہ میں لفظ **مِنَ الْبَيِّنَاتِ وَالْهُدَىٰ** سے اس کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے، ایسے ہی مسائل کے متعلق حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ نے فرمایا کہ تم اگر عوام کو ایسی حدیثیں سناتے ہو جن کو وہ پوری طرح نہ سمجھ سکیں تو ان کو فتنہ میں مبتلا کر دو گے (قرطبی)۔

اسی طرح صحیح بخاری میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے منقول ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ عوام لوگوں کے سامنے صرف اتنے ہی علم کا اظہار کر دو جس کو ان کی عقل و فہم برداشت کر سکے، کیا تم یہ چاہتے ہو کہ لوگ اللہ اور اس کے رسولؐ کی تکذیب کریں، کیونکہ جو بات ان کی سمجھ سے باہر ہوگی، ان کے دلوں میں اس سے شبہات و خدشات پیدا ہوں گے، اور ممکن ہے کہ اس سے انکار کر دیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ عالم کی یہ بھی ذمہ داری ہے کہ مخاطب کے حالات کا اندازہ لگا کر حکام کرے، جس شخص کے غلط فہمی میں مبتلا ہونے کا خطرہ ہو اس کے سامنے ایسے مسائل بیان ہی کر دو اسی لئے حضرات فقہاء بہت سے مسائل کے بیان کے بعد کہتے ہیں **هَذَا أَوْشَا يُغَرِّى وَلَا يُغَرِّى**

یعنی یہ مسئلہ ایسا جو کراہی علم کو خود تو سمجھ لینا چاہئے مگر عوام میں پھیلا نا چاہئے۔

ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لَا تَسْتَعْمُوا الْحِكْمَةَ أَهْلَهَا
فَتُظْلِمُوا هَمًّا وَلَا تَقْصُوا هَاتِي
عَائِرَ أَهْلِهَا فَتُظْلِمُوا هَمًّا

یعنی حکمت کی بات کو ایسے لوگوں سے نہ دو کہ
جو اس بات کے اہل ہوں اگر تم نے ایسا کیا تو ان
لوگوں پر ظلم ہوگا اور جو اہل نہیں ہیں ان کے

سامنے حکمت کی باتیں نہ دکھو کیونکہ اس صورت میں اس حکمت پر ظلم ہوگا۔

امام قرطبی نے فرمایا کہ اس تفصیل سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ کس کافر کو جو مسلمانوں کے مقابلہ میں مناظرے کرتا ہو یا کوئی مبتدع گمراہ جو لوگوں کو اپنے غلط خیالات کی طرف دعوت دیتا ہو اس کو علم دین سکھانا اُس وقت تک جائز نہیں جب تک یہ ظن غالب ہو جائے کہ علم سکھانے سے اس کے خیالات درست ہو جائیں گے۔

اسی طرح کس بادشاہ یا حاکم وقت کو ایسے مسائل بتلانا جن کے ذریعہ وہ رحمت پر ظلم کرنے کا راستہ نکال لیں جائز نہیں، اسی طرح عوام کے سامنے احکام دین میں رخصتیں اور جیلوں کی صورتیں بلا ضرورت بیان نہ کرنا چاہئے، جس کی وجہ سے وہ احکام دین پر عمل کرنے میں حیلہ چوٹی کے مادی بن جائیں (قرطبی)۔

حدیث رسول بھی قرآن مجید بخاری میں حضرت ابو ہریرہؓ سے منقول ہو کر انھوں نے فرمایا اگر قرآن کی حکمت میں ہے ۱۱۱ یہ آیت نہ ہوتی تو میں تم سے کوئی حدیث بیان نہ کرتا، آیت سے مراد یہی آیت ہے جس میں کمان علم پر لعنت کی وعید شدید مذکور ہو، ایسے ہی بعض دوسرے صحابہؓ نے بھی بعض روایات حدیث کے ذکر کرنے کے ساتھ ایسے ہی الفاظ فرمائے کہ اگر قرآن کریم کی یہ آیت کمان علم کے بارے میں نہ ہوتی تو میں یہ حدیث بیان نہ کرتا۔

ان روایات سے معلوم ہوا کہ صحابہ کرامؓ کے نزدیک حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم قرآن ہی کے حکم میں ہے، کیونکہ آیت میں تو کمان کی وعید ان لوگوں کے لئے آئی ہے جو قرآن میں نازل شدہ ہدایات و بینات کو چھپائیں، اس میں حدیث کا صراحت ذکر نہیں، لیکن صحابہ کرامؓ نے حدیث رسول کو بھی قرآن ہی کے حکم میں سمجھا کر اس کے انکار کرنے کو اس وعید کا سبب سمجھا بعض گناہوں کا وبال ایسا ہوتا ہے **وَيَلْعَنُ اللَّهُ الْفٰسِقِينَ** میں شران کریم نے لعنت کرنے والوں کو اس پر ماری مخلوق لعنت کرتی ہو کہ متعین نہیں کیا کہ کون لوگ لعنت کرنے میں، امام تفسیر مجاہدؒ اور مکرّمؒ نے فرمایا کہ اس عدم تعین سے اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ دنیا کی ہر چیز اور ہر مخلوق ان پر لعنت کرتی ہے، یہاں تک کہ تمام جانور اور وحشرات الارض بھی ان پر لعنت

کرتے ہیں، کیونکہ ان کی بد اعمالی سے ان سب مخلوقات کو نقصان پہنچتا ہے، حضرت ہر ابن عازبؓ کی حدیث سے اس کی تائید ہوتی ہے، جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ **الْفٰسِقُونَ** سے مراد تمام زمین پر چلنے والے جانور ہیں (قرطبی بحوالہ ابن ماجہ باسناد حسن)۔

کسی شخص پر لعنت اس وقت تک جائز **وَمَا كُنَّا اَوْ هُمْ وَلَا نُنَادِيهِمْ** کے لفظ سے جنہاں اور قرطبی وغیرہ نے نہیں جب تک اس کے کفر پر نہ کاغذ ہو یہ استنباط کیا ہے کہ جس کافر کے کفر کی حالت میں دوسرے کا تعین نہ ہو اس پر لعنت کرنا جائز نہیں اور چونکہ ہمیں کسی شخص کے خاصہ کا تعین علم ہونے کا اب کوئی ذریعہ نہیں اس لئے کسی کافر کا نام لے کر اس پر لعنت کرنا جائز نہیں، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جن کافروں پر نام لے کر لعنت کی ہے آپ کو ان کی موت علی الکفر کا منہا نب اللہ علم ہو گیا تھا، البتہ عام کافروں، ظالموں پر بغیر تعین کے لعنت کرنا درست ہے۔

اس سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ جب لعنت کا معاملہ اتنا شدید ہو کہ کسی کافر پر بھی ہاتھ نہ جائز نہیں جب تک اس کا یقین نہ ہو جائے کہ اس کی بدعت کفر ہی پر ہوگی، تو کبھی مسلمان پر یا کسی حالور پر لعنت کیسے جائز ہو سکتی ہے، اور عوام اس سے بالکل غفلت میں ہیں خصوصاً عمرتیں کہ بہت بات پر لعنت کے الفاظ اپنے متعلقین کے متعلق استعمال کرتی رہتی ہیں، اور لعنت صرف لفظ لعنت ہی کے کہنے سے نہیں ہوتی، بلکہ اس کے ہم معنی جو الفاظ ہیں وہ بھی لعنت ہی کے حکم میں ہیں، لعنت کے اصل معنی خدا تعالیٰ کی رحمت سے دور کرنے کے ہیں، اس لئے کسی کو مردود و راندہ و رگلائے شمار اور غیرہ کے الفاظ کہنا بھی لعنت ہی کے حکم میں ہے۔

وَالْحُكْمُ لِلَّهِ وَاحِدٌ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الرَّحْمَنُ الرَّحِيمُ

اور مہود و مسمیٰ کا ایک ہی معبود ہے کوئی معبود نہیں اس کے سوا بڑا مہربان ہے نہایت رحم والا

إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاختِلَافِ النُّجُوْمِ وَالنَّهَارِ

بے شک آسمان اور زمین کے پیدا کرنے میں اور رات اور دن کے بدلنے رہنے میں

وَالْفُلْكِ الَّتِي تَجْرِي فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ وَمَا أَنْزَلَ

اور کشتیوں میں جو کہنے کر چلتی ہیں دریا میں لوگوں کے کما کی چیزیں اور پانی میں جس کو کہنا آنا

اللَّهُ مِنَ السَّمَاءِ مِنْ مَّاءٍ فَأَخْيَارُهُ الْأَرْضِ بَعْدَ مَوْتِهَا وَ

اشارے آسمان سے پھر چلایا اس سے زمین کو اس کے مرچنے پیچھے اور

بَشَّ فِيهَا مِنْ كُلِّ دَابَّةٍ مِّنْ ذَاتِ نَفْسٍ زَلَّيجٍ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ

بھیلائے اس میں سب قسم کے جانور اور ہواؤں کے بدلنے میں جو کہ تابعدار ہے

بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ لَا يَبْتَغِي لِقَوْمٍ يَعْقِلُونَ ﴿۲۰۶﴾

اس کے حکم کا درمیان آسمان و زمین کے، بیشک ان سب چیزوں میں نشانیاں برآئین عقل پر پیلے

رابطہ | مشرکین مریئے جو آیت وَاللَّهُكُمُ إِلَهٌُ وَاحِدٌ اپنے عقیدہ کے خلاف سن تو توجہ سے کہنے لگے کہ ہمیں سائے جہان کا ایک معبود بھی ہو سکتا ہے، اور اگر یہ دعویٰ صحیح ہے تو کوئی دلیل پیش کرنا چاہئے، حق تعالیٰ آگے دلیل بیان فرماتے ہیں۔

اور (ایسا معبود) جو تم سب کے معبود بننے کا مستحق رہ تو ایک ہی معبود (حق) خلاصہ تفسیر | ہر اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں، وہی رحمن ہے، رحیم ہے،

راور کوئی ان صفات میں کامل نہیں، اور بدین کمال صفات معبودیت کا استحقاق باطل ہو پس جو سب معبود حقیقی کے کوئی اور مستحق عبادت نہ ہوا، بلاشبہ آسمانوں کے اور زمین کے بنائے ہیں اور بجے بعد و بگریسے رات اور دن کے آنے میں اور جہازوں کے چلنے میں جو کہ سمندر میں چلتے ہیں آدمیوں کے نفع کی چیزیں راور اسباب ہلے کرو اور بارش کے، پانی میں جس کو اللہ تم نے آسمان سے برسایا، پھر اس (پانی) سے زمین کو تر و تازہ کیا، اس کے خشک ہونے پیچھے پھنی

اس میں نباتات پیدا کئے، اور ان نباتات سے ہر قسم کے حیوانات اس (زمین) میں پھیلا دیے کیونکہ حیوانات کی زندگی اور تولید و تناسل اس غذائے نباتی کی بدولت ہے، اور ہواؤں کی (رحمتیں اور کیفیتیں) بدلنے میں رکہ کبھی پر داسے کبھی بچھا کبھی گرم ہے کبھی سرد، اور ابر کے (وچنے میں جو زمین و آسمان کے درمیان مقید (اور معلق) رہتا ہے (ان تمام چیزوں میں) دلائل (توحید کے موجود ہیں) ان لوگوں کے (استدلال کے) لئے جو عقل (سلیم) رکھتے ہیں۔

معارف مسائل

توحید کا وسیع مفہوم | وَاللَّهُكُمُ إِلَهٌُ وَاحِدٌ۔ اللہ تعالیٰ کی توحید متعدد اور مختلف حیثیتوں سے ثابت ہے۔ مثلاً وہ ایک ہے، یعنی کائنات میں کوئی اس کی نظیر و شبیہ نہیں، نہ کوئی اس کا ہمسر و برابر ہے، اس لئے وہ اس کا مستحق ہے کہ اس کو واحد کہا جائے۔

دوسرے یہ کہ وہ ایک ہر تحقیق عبادت میں یعنی اس کے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں۔ تیسرے یہ کہ وہ ایک یعنی ذی اجزاء نہیں، وہ اجزاء و اعضاء سے پاک ہر ذی اجزاء کا

تجزیہ و تقسیم ہو سکتی ہے۔

جو تھے یہ کہ وہ ایک ہی یعنی اپنے وجود ازلی ابدی میں ایک ہی وہ اس وقت بھی موجود تھا، جب کوئی چیز موجود نہ تھی، اور اُس وقت بھی موجود رہی گا جب کوئی چیز موجود نہ رہے گی، اس لئے وہ اس کا مستحق ہے کہ اس کو واحد کہا جائے، لفظ واحد میں یہ تمام حقیقتیں توحید کے ملحوظ ہیں (جہاں) اس کے بعد حق تعالیٰ کے واضح حقیقی ہونے پر ٹکونی علامات و دلائل بتلائے گئے ہیں جنکو ہر عالم و جاہل سمجھ سکتا ہے، کہ آسمان و زمین کی تخلیق اور رات دن کے دائمی انقلاب اس کی قدرت کاملہ اور توحید کے واضح دلائل ہیں، اگر ان چیزوں کی پیدائش اور بقاء میں کسی دوسری ہستی کا کوئی دخل نہیں۔

اس طرح پانی پر کشتیوں کا چلنا ایک بڑی آیت قدرت ہے، کہ پانی کو حق تعالیٰ نے ایسا جو ہر سال بنا دیا کہ زمین اور سیال ہونے لگے، اور اسکی پیچھے پر لاکھوں وزن کے جہاز بڑے بڑے وزن کو لے کر مشرق سے مغرب تک منتقل کر دیتے ہیں، اور ان کو حرکت میں لانے کے لئے ہواؤں کا چلانا اور پھر پانی حکمت کے ساتھ ان کے تھجہ بدلتے رہنا یہ سب اس کا پتہ دیتے ہیں کہ ان چیزوں کا پیدا کرنا اور چلانے والا کوئی بڑا عظیم و خیر اور حکیم ہے، اگر پانی کا مادہ سیال نہ ہو تو یہ کام نہیں ہو سکتا، اور مادہ سیال بھی ہو تو جب تک ہوائیں نہ چلیں جو ان جہازوں کو حرکت میں لاتی ہیں، جہازوں کا لمبی لمبی مسافے طے کرنا ممکن نہیں، قرآن کریم نے اس مضمون کو فرمایا،

إِن يَشَأْ يُسْكِنِ الرِّيحَ فَيَظْلَلْنَ رَوَاكِبَ عَلَيْهَا ظُهُورُهُنَّ (۲۰۷: ۲۰۸)
اگر اللہ تعالیٰ چاہیں تو ہواؤں کو ساکن کر دینا
اور یہ جہاز سمندر کی پشت پر کھڑے کھڑے رہ جائیں۔

یسا یُفْعَلُ النَّاسُ کے لفظ میں اشارہ کر دیا گیا کہ بحری جہازوں کے ذریعہ ایک ملک کا سامان دوسرے ملک میں درآمد و برآمد کرنے کے ذریعہ عام انسانوں کے بے شمار فائدے ہیں جن کو شمار بھی نہیں کیا جاسکتا، اور یہ فائدے ہر زمانے ہر ملک میں نئی نئی صورتیں پیدا کر دیتے ہیں۔

اسی طرح آسمان سے پانی کو قطرہ قطرہ کر کے اس طرح نازل کرنا کہ اس سے کسی چیز کو نقصان نہ پہونچے، اگر سیلاب کی طرح آتا تو کوئی آدمی جانور، سامان کچھ نہ رہتا، پھر پانی برسنے کے بعد اس کا زمین پر محفوظ رکھنا، انسان کے بس کا نہیں، اگر کہہ دیا جاتا کہ چھ مہینہ کے پانی کا کوڑا اپنا اپنا ہر شخص رکھ لے، تو ہر شخص اس کے رکھنے کا کیا انتظام کرتا، اور کسی طرح رکھ بھی لیتا تو اس کو سڑنے اور خراب ہوجانے سے کیسے بچاتا، قدرت نے یہ سب انتظامات خود فرمائیے

ارشاد فرمایا:

فَأَشْرَقَتْنِي فِي الدُّمُومِ وَأَنَا لَمْ يَكُنْ فِيهَا نَبِيٌّ
لَقَدْ كَرِهَ اللَّهُ (۱۸: ۲۳)

میں نے ہی پانی کو زمین کے اندر ٹھہرا دیا،
اگرچہ میں اس کی بھی قدرت تھی کہ بارش کا
برسنے کے بعد بہہ کر ختم ہو جاتا۔

مگر قدرت نے پانی کو اہل زمین انسان اور جانوروں کے لئے کہیں کھلے طور پر تالابوں اور
حوضوں میں جمع کر دیا، کہیں پہاڑوں کی زمین میں پھیلی ہوئی رگوں کے ذریعہ زمین کے اندر تار دیا اور
پھر ایک غیر مومن پائپ لائن ساری زمین میں بچا دی، ہر شخص جہاں چاہے کھود کر پانی نکال لیتا اور
اور اسی پانی کا ایک بہت بڑا ذخیرہ بحر منجمد بنا کر برت کی صورت میں پہاڑوں کے اوپر لا دیا جو
سڑنے اور خراب ہونے سے بھی محفوظ ہے، اور آہستہ آہستہ پھیل کر زمین کے اندر تدریجی
پائپ لائن کے ذریعہ پورے عالم میں پہنچتا ہے، غرض آیت مذکورہ میں قدرت کا ملہ کے چند مظاہر
کا بیان کر کے توحید کو ثابت کیا گیا، علماء مفسرین نے ان تمام چیزوں پر تفصیلی بحث کی ہے،
دیکھتے جہاں، قریبی وغیرہ۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَتَّخِذُ مِنْ دُونِ اللَّهِ أَندَادًا يُحِبُّونَهُمْ

اور بعض لوگ وہ ہیں جو بناتے ہیں اللہ کے برابر اوروں کو ان کی محبت ایسے رکھتے ہیں جیسے

كُحِبِّ اللَّهُ وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدَّ حُبًّا لِلَّهِ وَلَوْ يَرَى الَّذِينَ

محبت اللہ کی اور ایمان والوں کو ان سے زیادہ تر ہے محبت اللہ کی، اور اگر دیکھ لیں یہ

ظَلَمُوا أَذْيَرُونَ الْعَذَابَ إِنَّ الْقُوَّةَ لِلَّهِ جَمِيعًا وَإِنَّ اللَّهَ

ظالم اس وقت کہ جبکہ دیکھیں گے عذاب کہ قوت ساری اللہ ہی کے لئے ہے اور یہ کہ اللہ

شَدِيدُ الْعَذَابِ ۝۱۹

کا عذاب سخت ہے۔

رابطہ | اوپر کی آیات میں توحید کا اثبات تھا، آگے مشرکین کی غلطی اور وعید کا بیان فرماتے ہیں۔

خلاصہ تفسیر | اور ایک آدمی وہ (بھی) ہیں جو علاوہ خدا تعالیٰ کے اوروں کو بھی شریک

(خدا تعالیٰ) تشرار دیتے ہیں (اور ان کو اپنا کارساز سمجھتے ہیں اور) ان سے ایسی محبت رکھتے ہیں جیسی محبت
اللہ سے رکھنا ضروری ہے، (یہ حالت تو مشرکین کی ہے) اور جو مومن ہیں ان کو (صرف) اللہ تعالیٰ
کے ساتھ نہایت قوی محبت ہے، (کیونکہ اگر کسی مشرک کو یہ ثابت ہو جاوے کہ میرے معبود سے
بھگ پر کوئی ضرر چڑے گا تو فوراً محبت منقطع ہو جاوے، اور مومن باوجود اس کے کہ نافع و ضار
حق تعالیٰ ہی کو اعتقاد کرتا ہے، لیکن پھر بھی محبت و رضا اس کی پائی رہتی ہے، و نیز اکثر مشرکین
معیبت شدیدہ کے وقت اپنے شرکار کو چھوڑ دیتے ہیں، اور مومنین من حیث الایمان
معیبت میں بھی خدا کو نہ چھوڑتے تھے، اور محاررات میں اپنے قضایا باعتبار حالت غالبہ کے
بھی صادق ہوتے ہیں) اور کیا خوب ہوتا اگر یہ ظالم (مشرکین) جب (دنیا میں) کسی معیبت
کو دیکھتے تو (اس کے وقوع میں غور کر کے) یہ سمجھ لیا کرتے کہ سب قوت حق تعالیٰ ہی کو ہے،
اور دوسرے سب اس کے سامنے عاجز ہیں، چنانچہ اس معیبت کو نہ کوئی روک سکا نہ ٹال سکا
اور نہ ایسے وقت میں اود کوئی یاد رہا، اور اس معیبت کی شدت میں غور کر کے یہ سمجھ لیا کرتے،
کہ اللہ تعالیٰ کا عذاب (آخرت میں) کہارا ہوا ہے اور بھی سخت ہوگا، (تو اس طرح غور کرنے
سے تراشیدہ معبودوں کا عز اور حق تعالیٰ کی قدرت و عظمت مشکشف ہو کر توحید و ایمان اختیار
کر لیتے)

إِذْ تَبَرَّأَ الَّذِينَ اتَّبَعُوا مِنَ الَّذِينَ اتَّبَعُوا وَرَأَوْا الْعَذَابَ

جب کہ ہزار ہوا دیں گے وہ کہ جن کی پیروی کی تھی ان سے جو کہ ان کے پیرو ہوتے تھے اور دیکھیں گے عذاب

وَتَقَطَّعَتْ بِهِمُ الْأَسْبَابُ ۝۲۰ وَقَالَ الَّذِينَ اتَّبَعُوا لَوْ أَنَّا

اور منقطع ہو جاویں گے ان کے سب علاقے، اور کہیں گے پیرو کیا اچھا ہوتا جو ہم کو دنیا کی طرف

كُرِّهَ فَنَتَبَّرَ آمَنَهُمْ كَمَا تَبَرَّعُوا وَمَا كُنَّا لَكَ بِرُحْمَةٍ

لوٹ جانا بل جانا تو ہر ہم میں ہزار ہوا جانے لگے جیسے یہ ہم سے ہزار ہوا گئے، اسی طرح یہ دکھائے گا اللہ

أَعْمَالَهُمْ حَسَرَاتٍ عَلَيْهِمْ وَمَا هُمْ بِخَارِجِينَ مِنَ النَّارِ ۝۲۱

ان کو ان کے کام حسرت دلانے کو اور وہ ہرگز نکلنے والے نہیں تار سے۔

رابطہ | اوپر عذاب آخرت کو سخت فرمایا ہے آگے اس سخن کی کیفیت کا بیان فرماتے ہیں۔

خلاصہ تفسیر

(وہ سختی عذاب کی اس وقت معلوم ہوگی) جب کہ ان مشرکین میں سے (وہ زندگی) لوگ جن کے کہنے پر دوسرے (عوام) چلتے تھے، ان (عام) لوگوں سے صاف الگ ہو جاویں گے جو ان کے کہنے پر پڑے تھے اور سب (عوام و عوام) عذاب کا مشاہدہ کر لیں گے اور باہم ان میں جو تعلقات تھے وہ ایک تاج تھا اور سراسر متبوع تھا وغیرہ وغیرہ اس وقت سب قطع ہو جاویں گے (جیسے دنیا میں بھی دیکھا جاتا ہے کہ جرم میں سب شریک و متفق ہوتے ہیں اور نتیجہ معذرت کے وقت سب الگ الگ پچھا چاہتے ہیں، حتیٰ کہ باہدگر مشناخت تک کے منکر ہو جاتے ہیں) اور (جب) یہ تاج ٹوٹ (متبوعین کی یہ طوطا پٹنی دیکھیں گے تو بڑے جھجھا دیں گے، اور تو کچھ نہ ہوئے) مگر جلا کر ایدیں کہنے لگیں گے کسی طرح ہم سب کو (دنیا میں) بس ذرا ایک دفعہ جانا میل جا رہے تو ہم بھی ان سے (اتنا بدلہ تو لیں کہ اگر یہ پھر ہم کو اپنے تاج ہونے کی ترغیب دیں تو ہم بھی ان سے صاف (محکما) جواب دے کر) الگ ہو جاویں جیسا یہ ہم سے (اس وقت) صاف الگ ہو بیٹھے (اور کہیں کہ جناب آپ دیں کہ عین موقع پر بے رخی کی تھی اب ہم سے کیا غرض، حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ان تجویزوں اور سوچ بچاروں سے کیا ہاتھ آئے گا فقط) اللہ تعالیٰ یوں ہی انکی بد اعمالیوں کو خالی ارباب (کے پیرائے میں) کر کے ان کو دکھلا دیں گے اور ان (تابعین و متبوعین سب) کو درخ سے نکالنا ہمیں نصیب ہوگا (کیونکہ شرک کی سزا خداوندی النار ہے)

يَا أَيُّهَا النَّاسُ كُلُوا مِن مَّا فِي الْأَرْضِ حَلَالًا طَيِّبًا وَلَا تَتَّبِعُوا خُلُوعَ الشَّيْطَانِ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِينٌ ١٦٩

اے لوگو! کھاؤ زمین کی چیزوں میں سے حلال پاکیزہ اور پیردی نہ کرد شیطان

الشیطان انہ لکم عدو مبین ۱۶۹

کی بیشک وہ تمہارا دشمن ہے صریح، وہ تو ہمیں حکم کرے گا کہ بڑے کام اور جیانی کرو

وَأَن تَقُولُوا عَلَى اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ ١٧٠

اور کہو اللہ پر وہ باتیں جن کو تم نہیں جانتے۔

خلاصہ تفسیر

(بعض مشرکین جنوں کے نام جانور چھوڑتے تھے، اور ان سے منتفع ہونے کو باعث) ان کی تعلیم کے حرام سمجھتے تھے اور اپنے اس فعل کو حکم الہی اور موجب رضائے حق و وسیلہ تقرب الی اللہ بواسلہ شفاعت ان بتوں کے سمجھتے تھے، حق تعالیٰ اس باب میں خطاب فرماتے ہیں کہ) اے لوگو! جو چیزیں زمین میں موجود ہیں ان میں سے (شرعی، حلال

پاک چیزوں کی نسبت اجازت، کہ ان کو کھاؤ (برقو) اور ان میں سے کسی حلال چیز سے یہ کچھ کر پرہیز کرنا کہ اس سے اثر راضی ہوگا یہ سب شیطانی خیالات ہیں تم شیطان کے قدم قدم مت چلو، فی الواقع وہ (شیطان) تمہارا صریح دشمن ہے وہ اپنے اپنے خیالات و خیالات سے تم کو خسران ابدی میں گرفتار کر رکھا ہے اور دشمن ہونے کی وجہ سے) وہ تم کو انہی باتوں کی تعلیم کرے گا جو کہ (مشرک، بڑی اور گندی ہیں، اور یہ بھی تعلیم کرے گا) کہ اللہ کے ذمہ وہ باتیں لگاؤ جن کی تم سند بھی نہیں رکھتے (مثلاً یہی کہ ہم کو خدا تعالیٰ کا اس طرح حکم ہے)۔

معارف و مسائل

حل اللغات

حَلَّالٌ طَيِّبًا، لفظ حَلَّی کے اصل معنی گرہ کھولنے کے ہیں، جو چیز انسان کے لئے حلال کر دی گئی گویا ایک گرہ کھول دی گئی اور پابندی ہٹا دی گئی، حضرت سہل بن عبد اللہ فرماتے ہیں کہ نجات تین چیزوں میں منحصر ہے، حلال کھانا، فراغت ادا کرنا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کا اتباع کرنا، اور لفظ طیب کے معنی ہیں پاکیزہ جس میں شرعی حلال ہونا بھی داخل ہو اور طبعی مرغوب ہونا بھی۔

خُلُوعُ، خلوہ کی جمع ہے، اتنی مقدار کو خلوہ کہتے ہیں جو دونوں قدموں کے درمیان کا فاصلہ ہے، خلوات شیطان سے مراد شیطانی اعمال و افعال ہیں۔

الشَّيْطَانُ الْعَنَّاوُ، سورہ وہ چیز جس کو دیکھ کر عقلمند شریف آدمی کو دکھ ہو، فحشاء، بے حیائی کا کام، بعض حضرات نے فرمایا کہ اس جگہ سورہ سے مراد مطلق معصیت اور فحشاء سے مراد کبر و جبروت ہے، انشأ یا مؤکمہ شیطان کے امر اور حکم کرنے سے مراد دل میں دوسوہ ڈالنا ہے، جیسا حضرت عبد اللہ بن مسعود کی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ آدم کے بیٹے کے قلب میں ایک شیطانی ابھام داخل ہوتا ہے اور دوسرا فرشتہ کی طرف سے، شیطانی دوسوہ کا اثر ہوتا ہے کہ بڑے کام کرنے کے فوائد اور مصالح سامنے آتی ہیں، اور حق کو جھٹلانے کی راہیں کھلتی ہیں، اور ابھام فرشتہ کا اثر خیر اور نیکی پر انعام و فلاح کا وعدہ اور حق کی تصدیق پر قلب کا مطمئن ہونا ہوتا ہے۔

مسئلہ: ساند وغیرہ جو بتوں کے نام پر پھوڑ دیئے جاتے ہیں، یا اور کوئی جانور عرفاء، بکرا وغیرہ کسی بزرگ یا اور کسی غیر اللہ کے نام زد کر دیا جاتا ہے، اس کا حرام ہونا بھی چار آیتوں کے بعد و مَا أَهْلُ بَيْتِ اللَّهِ يَخْتَلِفُ فِيهِ تَحْتَ آتِ الرَّالِ، اس آیت یَا أَيُّهَا النَّاسُ میں ایسے جانور کے حرام ہونے کی نفی کرنا منظور نہیں، جیسا کہ بعضوں کو شبہ ہو گیا بلکہ مقدس اس فعل کی حرمت و ممانعت ہے کہ

غیر اللہ کے تقرب کے لئے جانوروں کو چھوڑ دینا اور اس عمل کو موجب برکت و تقرب سمجھنا، اور ان جانوروں کو اپنے اوپر حرام کر لینے کا معاہدہ کر لینا اس کو دائمی سمجھنا یہ سب افعال ناجائز اور انکار کرنا گناہ ہے۔

تو حاصل مطلب آیت کا یہ ہو کہ جن جانوروں کو اللہ تعالیٰ نے حلال بنایا ہے ان کو بہتوں کے نام کر کے حرام نہ بناؤ، بلکہ اپنی حالت پر چھوڑ کر رکھاؤ، اور اگر ایسی حرکت چہالت سے ہو جائے تو اصلاح نیست کے ساتھ تجدید ایمان اور توبہ کر کے اس حرمت کو ختم کرو، اس طرح ان جانوروں کو قطعاً حرام قرار دینا تو گناہ ہوا، مگر غیر اللہ کے نام پر کر دینے سے یہ مردار درجن کے حکم میں ہو گیا، نجاست کی وجہ سے حرمت ثابت ہو گئی۔

مسئلہ: اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اگر کسی شخص نے چہالت یا عقلیت سے کسی جانور کو کسی غیر اللہ کے ساتھ نامزد کر کے چھوڑ دیا تو اس کی توبہ یہی ہے کہ اپنے اس خیال حرام سے رجوع کرے اور اس فعل سے توبہ کرے، تو پھر اس کا گوشت حلال ہو جائے گا، واللہ اعلم۔

وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ اتَّبِعُوا مَا أَنْزَلَ اللَّهُ قَالُوا بَلْ نَتَّبِعُ مَا آَلْفَيْنَا

اور جب کوئی ان سے کہے کہ کتابعداری کرو اس حکم کی جرک نازل فرمایا اللہ نے تو کہتے ہیں ہرگز نہیں ہم تو ابعداری

عَلَيْهِ آبَاءُ نَاوَلُواكَانَ آبَاؤُهُمْ لَا يَعْقِلُونَ شَيْئًا وَلَا يَهْتَدُونَ

کرجہ انکی جس پر دیکھا ہم نے اپنے باپے ادوں کو بھلا اگرچہ ان کے باپے انے نہ کہتے ہرگز بھی اور نہ جانتے ہوں سیدھی راہ،

وَمِثْلَ الَّذِينَ كَفَرُوا كَمَثَلِ الَّذِينَ يَبْعُثُونَ بِمَا لَا يَمَعُ إِلَّا دُعَاءٌ

اور مثال ان کافروں کی ایسی ہر جیسے بکارت کوئی شخص ایسی چیز کو جو کچھ نہ تھے سوائے پکارنے

وَنِدَاءٌ مُدْمُومٌ غَسِيٌّ فَهُمْ لَا يَعْقِلُونَ

اور پکارنے کے بہرے گھٹے اندھے ہیں سورہ کچھ نہیں سمجھتے۔

خلاصہ تفسیر اور جب کوئی ان (مشرک) لوگوں سے کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو حکم (اپنے پیغمبر

کے پاس) بھیجا ہے اس پر چلو تو جواب میں کہتے ہیں (کہ نہیں) بلکہ ہم تو اسی (طریقہ) پر چلیں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے (کیونکہ وہ لوگ اس طریقہ کے اختصار کرنے میں مامور من اللہ تھے، حق تعالیٰ ان پر تو فرماتے ہیں) کیا ہر حالت میں یہ لوگ اپنے باپ دادا ہی کے طریقہ پر چلیں گے)

اگرچہ ان کا پادار (دین کی) نہ کچھ سمجھتے ہوں اور نہ کسی آسان کتاب کی ہدایت رکھتے ہوں، وَمِثْلَ الَّذِينَ كَفَرُوا كَمَثَلِ الَّذِينَ يَبْعُثُونَ بِمَا لَا يَمَعُ إِلَّا دُعَاءٌ وَنِدَاءٌ مُدْمُومٌ غَسِيٌّ فَهُمْ لَا يَعْقِلُونَ، اور ان کافروں کی کیفیت (دافنی میں) اس (جانور) کی کیفیت کے مثل ہے (جس کا ذکر اس مثال میں کیا جاتا ہے) کہ ایک شخص ہے وہ ایسے (جانور) کے پیچھے چلا رہا ہے، جو بجز بلائے اور پکارنے کے کوئی (پرہیز) بات نہیں سنتا (اسی طرح) یہ کفار (بھی) ظاہری بات چیت تو سنتے ہیں، لیکن کام کی بات باطل، بہرے میں (مگر) استغابی نہیں) گونگے ہیں (کہ کبھی ایسی بات زبان ہی پر نہیں آتی) اندھے ہیں (کہ کبھی نفع نقصان نظری نہیں آتا) سو (جب سارے ہی جو اس شخص میں تو) سمجھتے (سمجھاتے) کچھ نہیں۔

معارف مسائل

اس آیت سے جس طرح باپ دادوں کی اندس تقلید و اتباع کی مذمت ثابت ہوئی اس طرح جائز تقلید و اتباع کے شرائط اور ایک ضابطہ بھی معلوم ہو گیا، جس کی طرف دو غفلتوں میں اشارہ فرمایا ہے لَا يَعْقِلُونَ اور لَا يَعْقِلُونَ، کیونکہ اس سے معلوم ہوا کہ ان آباء و اجداد کی تقلید و اتباع کو اس لئے منع کیا گیا ہے کہ انھیں عقل تھی نہ ہدایت، ہدایت سے مراد وہ احکام ہیں جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے صریح طور پر نازل کئے گئے، اور عقل سے مراد وہ جو بذریعہ اجتہاد و تعویض شرعی سے مستنبط کئے گئے۔

تو وہ ان کے اتباع و تقلید کے حرم جواز کی یہ ہے کہ نہ ان کے پاس اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوئے احکام ہیں اور نہ اس کی صلاحیت کہ اللہ تعالیٰ کے فرمان سے احکام نکال سکیں، اس میں اشارہ پایا گیا کہ جس عالم کے متعلق یہ اطمینان ہو جائے کہ اس کے پاس مشرک و سنت کا علم ہو، اور اس کو درجہ اجتہاد بھی حاصل ہے کہ جو احکام صراحت قرآن و سنت میں نہ ہوں ان کو تفویض قرآن و سنت سے بذریعہ قیاس نکال سکتا ہے، تو ایسے عالم مجتہد کی تقلید و اتباع جائز ہے، نہ اس لئے کہ اس کا حکم ماننا اور اس کا اتباع کرنا ہے، بلکہ اس لئے کہ حکم اللہ کا ماننا اور اسی کا اتباع کرنا ہے، مگر چونکہ ہم براہ راست اللہ کے حکم سے واقف نہیں ہو سکتے، اس لئے کسی عالم مجتہد کا اتباع کرتے ہیں تاکہ اللہ تعالیٰ کے احکام پر عمل ہو سکے۔

جاہلانہ تقلید اور اند مجتہدین اس سے معلوم ہوا کہ جو لوگ مطلق تقلید ائمہ مجتہدین کے خلاف کی تقلید میں فرق اس طرح کی آیات پڑھ دیتے ہیں وہ خود ان آیات کے صیح مدلول سے واقف نہیں۔

امام مشرطی نے اسی آیت کی تفسیر میں فرمایا ہے کہ اس آیت میں تقلید آباء کے منوع ہونے

کا جو ذکر اس سے مراد باطل عقائد و اعمال میں آباء و اجداد کی تقلید کرنا ہے، عقائد صحیحہ و اعمال صالحہ میں تقلید اس میں داخل نہیں، جیسا کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے کلام میں ان دونوں چیزوں کی وضاحت سورۃ یوسف میں اس طرح آئی ہے:

إِنِّي نَزَّيْتُ وَلِيَّةَ قَوْمٍ لَا يَفْقَهُونَ
بِاللَّهِ وَهُمْ بِالْآخِرَةِ هُمْ غَافِلُونَ
وَ أَتَّبَعْتُ وَلِيَّةَ آبَائِي إِذْ هُمْ هَادُونَ
إِسْلَافًا وَيَقْتُولُونَ (۱۲: ۲۸-۳۰)

اس میں پوری وضاحت سے ثابت ہو گیا کہ آباء کی تقلید باطل میں حرام ہے، حتیٰ میں جائز بلکہ مستحسن ہے۔

امام سترلین نے اسی آیت کے ذیل میں ائمہ مجتہدین کی تقلید کے متعلق بھی مسائل و احکام بیان کئے ہیں اور فرمایا ہے،

تعلق قوم بہن والایۃ فی ذم التقلید
والی، وھذا فی الباطل صحیح امتا
التقلید فی الحق فاضل من اصول
الدین و عصمتہ من عہد المسابین
یلجاء الیھا الجاہل المقصر عن
درک النظر
(قطبی ص ۱۹۳ ۲۳۷)

کچھ لوگوں نے اس آیت کو تقلید کی مذمت میں پیش کیا ہے اور یہ باطل کے معاملہ میں تو صحیح ہے، لیکن حق کے معاملہ میں تقلید سے اس کا کوئی تعلق نہیں حق میں تقلید کرنا تو دین کے اصول میں سے ایک مستقل بنیاد ہے اور مسلمانوں کے دین کی حفاظت کا بہت بڑا ذریعہ ہے کہ جو شخص اجتہاد کی صلاحیت نہیں رکھتا وہ دین کے معاملہ سے تقلید ہی پر اعتماد کرتا ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُلُوا مِن طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ وَاشْكُرُوا

اے ایمان والو! کھاؤ پاکیزہ چیزیں جو روزی دی ہم نے تم کو اور شکر کرو اللہ کا

يَلَهُ إِنَّ كُنتُم تَعْبُدُونَهُ ۚ إِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَ

اگر تم اسی کے بندے ہو ۔ اس نے تم پر بھی حرام کیا ہے مردہ جانور اور

الدَّمَ وَلَحْمَ الْخَيْزِرِ وَمَا أَهْلَ بِهِ لغيرِ اللَّهِ فَمَن اضْطُرَّ غَيْرَ

پرو اور گوشت سور کا اور جس جانور پر ناپاکار جائے اللہ کے سوا کسی اور کا پھر کوئی بے اختیار ہو جائے

بَاغٍ وَلَا عَادٍ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ۝۱۴۳

ذوقا فرماں کرو اور زیادتی نہ اس پر کچھ گناہ نہیں بیشک اللہ بڑا بخشنے والا نہایت مہربان

خلاصہ تفسیر اور پر اکل طہیات کے معاملہ میں مشرکین کی غلطی بتلا کر ان کی اصلاح کے لئے اہل ایمان کو اس بات سے متنبہ کیا گیا ہے کہ وہ اس غلطی میں مشرکین کی موافقت نہ کرنے لگیں اس کے ضمن میں اہل ایمان کو اپنے انعامات کا ذکر اور اس پر ادا سے شکر کی تعلیم بھی ہے۔

لئے ایمان والو! (ہماری طرف سے تم کو اجازت ہو کہ) جو شرع کی رو سے پاک چیزیں ہم نے تم کو مرحمت فرمائی ہیں ان میں سے (جو چاہو) کھاؤ (بر تو) اور (اس اجازت کے ساتھ) پیو (جو کہ) حق تعالیٰ کی شکر گزاری کرو، (زبان سے بھی ہاتھ پاؤں سے خدمت و طاعت بجالا کر بھی اور دل سے ان نعمتوں کو منجانب اللہ سمجھ کر بھی) اگر تم خاص ان کے ساتھ غلامی کا تعلق رکھتے ہو (اور یہ تعلق ہو نامسلم اور ظاہری پس و پیش شکر بھی ثابت ہے)۔

رابطہ اور پر تو اس کا بیان تھا کہ حلال کو حرام مت کرو، آگے یہ مذکور ہوتا ہے کہ حرام کو حلال مت سمجھو، جیسا کہ مشرکین اس میں مبتلا تھے، مثلاً مردار جانور اور ایسے جانور جن کو غیر اللہ کے نام پر ذبح کیا گیا ہو، مشرکین ان کو کھایا کرتے تھے، اس سے منع کیا گیا، اسی کے ضمن میں یہ بھی بتلا دیا کہ اللہ کے نزدیک فلاں فلاں جانور حرام ہیں، ان کے سوا دوسرے جانور دن کو اپنی طرف سے حرام قرار دینا غلطی ہے، اس سے بچنے والوں کی تائید ہو گئی۔

اللہ تعالیٰ نے تم پر صرف (ان چیزوں کو) حرام کیا ہے اور ان چیزوں کو حرام نہیں کیا جن کو تم اپنی طرف سے حرام کر رہے ہو، جیسا کہ گذرا یعنی (مردار جانور) کو (جو باوجود واجب الذبح ہونے کے بلا ذبح شرعی مر جاوے) اور خون کو (جو بہتا ہو) اور خنزیر کے گوشت کو (اسی طرح اس کے سب اجزاء کو بھی) اور ایسے جانور کو جو (بقصد تقرب) غیر اللہ کے نام پر ذبح کر دیا گیا ہو (ان سب کو بیشک حرام کیا ہے) پھر بھی (اس میں اتنی آسانی رکھی ہے کہ) جو شخص (جو کسے بہت ہی) بیتاب ہو جائے، بشرطیکہ نہ قور کھانے میں) طالب لذت ہو، اور نہ (قدر ضرورت و حاجت سے) تجاوز کرنے والا ہو تو (اس حالت میں ان چیزوں سے کھانے میں بھی) اس شخص پر کچھ گناہ نہیں ہوتا، واقعی اللہ تعالیٰ پس بڑے غفور رحیم کہ ایسے وقت میں یہ رحمت فرمائی کہ گناہ کی چیز میں بھی گناہ (نہا دیا)

معارف و مسائل

حلال کھانے کی برکت اور | آیات مذکورہ میں جیسے حرام کھانے کی ممانعت کی گئی ہے اسی طرح حرام کھانے کی نغوت | حلال طیب چیزوں کے کھانے اور اس پر شکر گزار ہونے کی ترغیب بھی ہے، کیونکہ جس طرح حرام کھانے سے اخلاق و ذلیہ پیدا ہوتے ہیں، عبادت کا ذوق جاگرتا ہے، دعا قبول نہیں ہوتی، اسی طرح حلال کھانے سے ایک نور پیدا ہوتا ہے، اخلاق و ذلیہ سے نفرت، اخلاق فاضلہ کی رغبت پیدا ہوتی ہے، عبادت میں دل لگتا ہے، گناہ سے دل گھبراتا ہے، دعا قبول ہوتی ہے، اس لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے سب رسولوں کو یہ ہدایت فرمائی ہے،

يَا أَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوا مِنَ الطَّيِّبَاتِ
وَاَعْمَلُوا الصَّالِحَاتِ (۵۱:۱۳۳)

اور نیک عمل کرو۔

اس میں اشارہ ہے کہ نیک عمل کرنے میں رزق حلال کو بڑا دخل ہے، اسی طرح قبول دعائیں حلال کھانا معین اور حرام مانع قبول ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بہت سے لوگ طویل سفر پریشان حال اللہ کے سامنے دعا کے لئے ہاتھ پھیلاتے ہیں، اور یا رب یا رب کہتے ہیں، مگر کھانا ان کا حرام، پینا ان کا حرام، لباس ان کا حرام، غذا ان کی حرام، ان حالات میں ان کی دعا کہاں قبول ہو سکتی ہے (صحیح مسلم، ترمذی، از ابن کثیر)۔

إِنَّمَا حَرَّمَ، کلمہ انشا صر کے لئے آتا ہے، اس لئے آیت کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے صرف وہ چیزیں حرام کی ہیں، جن کا آگے ذکر کیا جاتا ہے، اس کے سوا کچھ حرام نہیں، اس آیت میں تو لفظ انشا سے اس کی طرف اشارہ ہوا، اور دوسری آیت میں اس سے زیادہ صراحت کے ساتھ یہ بھی آیا ہے، قُلْ لَا أَجِدُ فِتْنَةً أَوْذَىٰ، وَإِنِّي مُعَذِّبُ عَلَىٰ طَاعَةٍ (۱۲۵:۷) اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے یہ حکم دیا گیا ہے کہ آپ اعلان کر دیں کہ میری وحی میں بجز ان چند چیزوں کے جن کا ذکر آگے کیا گیا ہے، اور کوئی چیز حرام نہیں۔

مگر اس پر اشکال یہ ہو کہ دوسری آیات قرآنہ اور احادیث نبویہ سے ان چند چیزوں کے علاوہ اور بھی بہت سی چیزوں کی حرمت ثابت ہے، تو یہ صر اور حرمت نامہ وحی کی نفی کیسے درست ہوگی؟

جواب یہ ہو کہ یہاں مطلق حلال و حرام کا بیان نہیں، بلکہ ان مخصوص جانوروں کی حالت و حرمت کا بیان ہے جن کے بارے میں مشرکین مگر اپنے مشرکانہ عقائد کی غلطیاں کیا کرتے تھے، پھر آیت میں اس کی وضاحت آچکی ہے کہ بہت سے حلال جانوروں کو مشرکین حرام سمجھ لیتے

تھے، یا اپنے اور پر حرام کر لیتے تھے، اس کی مخالفت کی گئی تھی، اس کے بالمقابل یہاں یہ بتلایا گیا کہ اللہ کے نزدیک فلاں فلاں جانور حرام ہیں جن سے تم جہتنباب نہیں کرتے، اور جو اللہ کے نزدیک حلال ہیں ان سے پرہیز نہ کرتے ہو، اس لئے اس جگہ صر مطلق نہیں، بلکہ اضافی ہے مشرکانہ عقائد کے بالمقابل۔

آگے اس آیت میں جن چیزوں کو حرام قرار دیا گیا ہے، وہ چار چیزیں یہ ہیں: **میتہ** (مردار)، خون، لحم خنزیر، وہ جانور جس پر غیر اللہ کا نام لیا گیا ہو، پھر چاروں چیزوں کی مزید تشریحات خود قرآن کریم کی دوسری آیات اور احادیث صحیحہ میں آئی ہیں جن کو ملائے کے بعد ان چاروں چیزوں کے احکام حسب ذیل ہیں، ان کو کسی قدر تفصیل سے لکھا جاتا ہے۔

میتہ جس کو اردو میں مردار کہتے ہیں، اس سے مراد وہ جانور ہے جس کے حلال ہونے کے لئے از روئے شرع ذبح کرنا ضروری ہے، مگر وہ بغیر ذبح کے خود بخود مر جائے، یا گلا گھونٹ کر یا کسی دوسری طرح چوٹ مار کر مار دیا جائے تو وہ مردار اور حرام ہو، لیکن خود قرآن کریم کی دوسری آیت أُجِلَّ تَكْفُفُهُ الذَّبْحُ (۹۱:۵) سے معلوم ہوا کہ دریائی جانور کے لئے ذبح کرنا شرط نہیں، وہ بلا ذبح بھی جائز ہے، اس بناء پر احادیث صحیحہ میں مچھلی اور مڈی کو میتہ کے مستثنیٰ قرار دے کر حلال کیا گیا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، ہمارے لئے دو مردار حلال کر دیئے گئے، ایک مچھلی دوسرے مڈی، اور دو خون حلال کر دیئے گئے، جگر اور طحال (ابن کثیر، از احمد ابن ماجہ، دار قطنی)۔

معلوم ہوا کہ جانوروں میں سے مچھلی اور مڈی بغیر ذبح کے حلال ہیں، خواہ وہ خود مر جائیں یا کسی کے مارنے سے مر جائیں، البتہ جو مچھلی سڑ جانے کی وجہ سے خود پانی کے اوپر آ جائے وہ حرام ہے (رحماص)۔

اسی طرح وہ شکاری جانور جو قابو میں نہیں کہ ذبح کر لیا جائے اور اس کو بھی بسم اللہ پڑھ کر تیردغیر و دھار دار چیز سے زخم لگا دیں تو بغیر ذبح کے حلال ہو جاتا ہے، مطلقاً زخمی ہو جاتا کافی نہیں، کسی آلہ جارح تیز دھار سے زخمی ہونا شرط ہے۔

مسئلہ: ہندو کی گولی سے شکار ہندو کی گولی سے کوئی جانور زخمی ہو کر قبل ذبح مر جائے تو وہ ایسا ہے جیسے پتھر یا لٹھی مارنے سے مر جائے، جس کو قرآن کریم کی درجہ

آیت میں مَوْقُودٌ کہا گیا ہے، اور حرام قرار دیا ہے، ہاں مرنے سے پہلے اس کو ذبح کر لیا جائے تو حلال ہو جائیگا۔ **مسئلہ: آجکل ہندو کی ایک گولی نوکدار بنائی گئی ہے، اس کے متعلق بعض ماہر کا خیال ہے کہ تیر کے حکم میں ہے، مگر جمہور علماء کے نزدیک یہ بھی تیر کی طرح آلہ جارح نہیں**

بلکہ غارتگر جس سے بارود کی طاقت کے ذریعہ گوشت پھٹ جاتا ہے، در نہ خود اس میں کوئی دھار نہیں جس سے جانور زخمی ہو جائے اس لئے ایسی گولی کا شکار بھی بغیر ذبح کے جائز نہیں۔
مسئلہ: آیت مذکورہ میں مطلقاً میتہ کو حرام قرار دیا ہے، اس لئے جس طرح اس کا گوشت کھانا حرام ہے اس کی خرید و فروخت بھی حرام ہے، یہی حکم تمام نجاسات کا ہے کہ جیسے ان کا استعمال حرام ہے اُن کی خرید و فروخت اور ان سے نفع اٹھانا بھی حرام ہے۔ یہاں تک مردار جانور یا ناپاک کوئی چیز یا اختیار خود جانور کو کھلانا بھی جائز نہیں، ہاں ایسی جگہ رکھ دے جہاں سے کوئی کتابی خود کھالے، یہ جائز ہے، مگر خود اٹھا کر ان کو کھلانا جائز نہیں۔
 (جصاص، قرطبی وغیرہ)

مسئلہ: اس آیت میں میتہ کے حرام ہونے کا حکم عام معلوم ہوتا ہے، جس میں میتہ کے تمام اجزاء شامل ہیں، لیکن دوسری آیت میں اس کی تشریح علی غلایہ قطعہ کے الفاظ کر دی گئی ہے جس سے معلوم ہوا کہ مردار جانور کے وہ اجزاء حرام ہیں جو کھانے کے قابل ہیں، اس لئے مردار جانور کی ہڈی، بال جو کھانے کی چیز نہیں وہ پاک ہیں، اور ان کا استعمال جائز ہے، آیت قرآن کریم میں اَصْنُوا ذِئْبًا وَبَارِعًا وَشَعَارَهَا أَثَانًا وَمَتَاعًا إِلَىٰ حَبْلِ (۸۰: ۱۶) میں اُن جانوروں کے بالوں کو مطلقاً جائز الانتفاع قرار دیا ہے ذبیحہ کی شرط نہیں (جصاص)۔ کھال پر چونکہ خون وغیرہ کی نجاست لگی ہوتی ہے اس لئے وہ دباغت سے پہلے حرام ہے، مگر دباغت دینے کے بعد حلال اور جائز ہے، احادیث صحیحہ میں اس کی مزید تصریح موجود ہے (جصاص)۔
مسئلہ: مردار جانور کی چربی اور اس سے بنائی ہوئی چیزیں بھی حرام ہیں، ان کا استعمال کسی طرح سے جائز نہیں، اور خرید و فروخت بھی حرام ہے۔

مسئلہ: یورپ وغیرہ سے آئی ہوئی چیزیں مابون وغیرہ جن میں چربی استعمال ہوتی ہے، ان سے پرہیز کرنا احتیاط ہے، مگر مردار کی چربی ہونے کا علم یقینی نہ ہونے کی وجہ سے گنجائش ہے، نیز اس وجہ سے بھی کہ بعض صحابہ کرام ابن عمر، ابو سعید خدری، ابو موسیٰ اشعری نے مردار کی چربی کا صرف کھانے میں استعمال حرام قرار دیا ہے، خارجی استعمال کی اجازت دی ہے، اس لئے اس کی خرید و فروخت کو بھی جائز رکھا ہے۔ (جصاص)

مسئلہ: دودھ کا پیر بنانے میں ایک چیز استعمال کی جاتی ہے، جس کو عربی زبان میں انفر کہا جاتا ہے، یہ جانور کے پیٹ سے نکالی جاتی ہے، اس کو دودھ میں شامل کرنے سے دودھ جم جاتا ہے، اب اگر یہ جانور اللہ کے نام پر ذبح کیا ہو تو اس کے استعمال میں کوئی مضائقہ نہیں، مذبح جانور کا گوشت چربی وغیرہ سب حلال ہیں، لیکن غیر مذبح جانور کے پیٹ سے لیا جائے تو اس

میں فقہاء کا اختلاف ہے، امام عظیم ابو حنیفہ اور امام مالک اس کو پاک قرار دیتے ہیں، لیکن صاحبین امام ابو یوسف و محمد اور ثوری وغیرہ اس کو ناپاک کہتے ہیں۔ (جصاص، قرطبی)
 یورپ اور روس کے غیر اسلامی ملکوں سے جو پیر بنا ہوا آتا ہے اس میں غیر مذبح جانور کا انفر استعمال ہونے کا احتمال غالب ہے، اس لئے جمہور فقہاء کے قول پر اس سے پرہیز کرنا چاہئے۔ امام عظیم اور امام مالک کے قول پر گنجائش ہے، ہاں یورپ سے آئے ہوئے بعض غیر ایسے بھی ہیں جن میں خنزیر کی چربی استعمال ہوتی ہے، اور ذبیحہ پر لکھا ہوا ہوتا ہے، وہ قطعاً حرام اور نجس ہیں۔

خون کے مسئلہ: دوسری چیز جو آیت مذکورہ میں حرام قرار دی گئی ہے وہ خون ہے لفظ دم بمعنی خون شامل اس آیت میں اگرچہ مطلق ہے، مگر سورۃ انعام کی آیت میں اس کے ساتھ مَشْفُوح یعنی پینے والا ہونے کی شرط ہے، اَوْ ذَمًا مَشْفُوحًا (۱۴۵: ۱۴۵) اس لئے باتفاق فقہاء خون منجھ جیسے گردہ، تلی وغیرہ وہ حلال اور پاک ہیں۔

مسئلہ: جب کہ حرام صرف پینے والا خون ہے تو جو خون ذبح کے بعد گوشت میں لگا رہ جاتا ہے وہ پاک ہے، فقہاء و صحابہ و تابعین اور امت کا اس پر اتفاق ہے، اسی طرح بھرا، مکھی، مکمل وغیرہ کا خون بھی ناپاک نہیں، لیکن زیادہ ہو جائے تو اس کو کھانا دھونا چاہئے (جصاص)۔
مسئلہ: جس طرح خون کا کھانا پینا حرام ہے، اسی طرح اس کا خار بھی استعمال بھی حرام ہے، اور جس طرح تمام نجاسات کی خرید و فروخت بھی اور اس سے نفع اٹھانا حرام ہے، اسی طرح خون کی خرید و فروخت بھی حرام ہے، اس سے حاصل کی ہوئی آمدنی بھی حرام ہے، کیونکہ الفاظ قرآنی میں مطلقاً دم کو حرام فرمایا ہے، جس میں اس کے استعمال کی تمام صورتیں شامل ہیں۔

رہین کو دوسرے کا خون: تحقیق اس مسئلہ کی یہ کہ انسان کا خون کا جز ہے، اور جب پل دینے کا مسئلہ سے نکال لیا جائے تو وہ نجس بھی ہے، اس کا اصل تقاضا تو یہی ہے کہ ایک انسان کا خون دوسرے کے بدن میں داخل کرنا درودجہ سے حرام ہے، اول اس لئے کہ اعضاء انسانی کا احترام واجب ہے، اور یہ اس احترام کے منافی ہے، دوسرے اس لئے کہ خون نجاست غلیظہ ہے اور نجس چیزوں کا استعمال ناجائز ہے۔

لیکن خطاری حالات اور عام معالجات میں شریعت اسلام کی دی ہوئی ہولتوں میں غور کرنے سے امور ذیل ثابت ہوتے ہیں۔

اول یہ کہ خون اگرچہ جزء انسانی ہے، مگر اس کو کسی دوسرے انسان کے بدن میں منتقل

کرنے کے لئے اعضاء انسانی میں کاٹ چھانٹ اور آپریشن کی ضرورت پیش نہیں آتی، بجائے کے ذریعہ خون نکالا اور دوسرے کے بدن میں ڈالا جاتا ہے، اس لئے اس کی مثال دودھ کی سی ہو گئی جو بدن انسانی سے بغیر کسی کاٹ چھانٹ کے نکلتا اور دوسرا انسان کا جز بنتا ہے اور شریعت اسلام نے بچہ کی ضرورت کے پیش نظر انسانی دودھ ہی کو اس کی غذا قرار دیا ہے، اور ماں پر اپنے بچوں کو دودھ پلانا واجب کیا، جب تک وہ بچوں کے باپ کے نکاح میں رہے طلاق کے بعد ماں کو دودھ پلانے پر مجبور نہیں کیا جاسکتا، بچوں کا رزق ہیا کرنا باپ کی ذمہ داری ہے، وہ کسی دوسری عورت سے دودھ پلاوے، یا ان کی ماں ہی کو معاوضہ دیکر اس سے دودھ پلاوے، قرآن کریم میں اس کی واضح تصریح موجود ہے:

فَإِنْ أَرْضَعْنَ لَكُمْ فَارْزُقُوهُنَّ
أَجْرَهُنَّ كَمَا لِلْأَوْلَادِ

غلا صد یہ کہ دودھ جزیرہ انسانی ہونے کے باوجود بوجہ ضرورت اس کے استعمال کی اجازت بچوں کے لئے دی گئی ہے، اور علاج کے طور پر بڑوں کے لئے بھی، جیسا کہ عالمگیری میں ہے:

وَلَا يَأْتِي بَأْسٌ بِأَنْ يُمْسَخَ الرَّجُلُ
بِلَبَنِ الْمَرْأَةِ وَيُشْرَبَ بِهِ لِلدَّاءِ

اور معنی ابن تدامہ میں اس مسئلہ کی مزید تفصیل مذکور ہے (معنی کتاب الصيد ص ۹۲) اگر خون کو دودھ پر قیاس کیا جائے تو کچھ بعید از قیاس نہیں، کیونکہ دودھ بھی خون کی بدلی ہوئی صورت ہے، اور جزیرہ انسان ہونے میں مشترک ہے، فرق صرف یہ ہے کہ دودھ پاک ہو اور خون ناپاک، توجرت کی پہلی وجہ یعنی جزیرہ انسانی ہونا تو یہاں وجہ ممانعت نہ رہی، صرف نجاست کا معاملہ رہ گیا، علاج دودھ کے معاملہ میں بعض فقہاء نے خون کے استعمال کی بھی اجازت دی ہے۔

اس لئے انسان کا خون دوسرے کے بدن میں منتقل کرنے کا شرعی حکم یہ معلوم ہوتا ہے کہ عام حالات میں تو جائز نہیں، مگر علاج دودھ کے طور پر اس کا استعمال اضطراری حالت میں بلاشبہ جائز ہے، اضطراری حالت سے مراد یہ کہ مریض کی جان کا خطرہ ہو اور کوئی دوسری دوا اس کی جان بچانے کے لئے مؤثر یا موجود نہ ہو، اور خون دینے سے اس کی جان بچے گا، غالب ہوا ان مشروطوں کے ساتھ خون دینا تو اس نفس بشری کی مدد سے جائز ہے، جس میں نقص

کے لئے مردار جانور کھا کر جان بچانے کی اجازت صراحت مذکور ہے، اور اگر اضطراری حالت نہ ہو یا دوسری دوا میں بھی کام کر سکتی ہوں تو ایسی حالت میں مسئلہ مختلف تھا ہے، بعض فقہاء کے نزدیک جائز ہے، بعض ناجائز کہتے ہیں، جس کی تفصیل کتب فقہ بحث مداوی بالحریم میں مذکور ہے، واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم، اس کا ایک مستقل رسالہ بھی اس موضوع پر شائع ہو گیا ہے، جس کا نام ہے "اعضائے انسانی کی پیوندکاری" اس کو ملاحظہ فرمایا جائے۔

تحريم خنزير تیسری چیز جو اس آیت میں حرام کی گئی ہے وہ لحم خنزیر ہے، آیت میں حرمت لحم یعنی گوشت کی تخصیص نہیں، بلکہ اس کے تمام اجزاء ہڈی، کھال، بال، چٹھے سب ہی باجماع امت حرام ہیں، لیکن لفظ لحم بڑھا کر اشارہ اس طرف ہے کہ خنزیر دوسرے حرام جانوروں کی طرح نہیں ہے، کہ وہ ذبح کرنے سے پاک ہو سکتے ہیں، اگرچہ کھانا حرام ہی ہے، کیونکہ خنزیر کا گوشت ذبح کرنے سے بھی پاک نہیں ہوتا، کہ وہ نجس العین بھی ہے حرام بھی، صرف جڑا سنے کے لئے اس کے بال کا استعمال حدیث میں جائز قرار دیا ہے (جصاص، قرطبی)

مَا أَهْلَ بِهِ لَعْنَةُ اللَّهِ جو نئی چیز جس کو آیت میں حرام قرار دیا گیا ہے وہ جانور ہے جو کی تین صورتیں غیر اللہ کے لئے نامزد کر دیا گیا ہو، جس کی تین صورتیں متعارف ہیں اول یہ کہ کسی جانور کو غیر اللہ کے تقرب کے لئے ذبح کیا جائے، اور بوقت ذبح اسی غیر اللہ کا نام لیا جائے، یہ صورت باتفاق و باجماع امت حرام ہے، اور یہ جانور میتہ ہے، اس کے کسی جسز سے انتفاع جائز نہیں، کیونکہ یہ صورت آیت مَا أَهْلَ بِهِ لَعْنَةُ اللَّهِ کا مدلول صریح ہے جس میں کسی کا اختلاف نہیں۔

دوسری صورت یہ کہ کسی جانور کو تقرب الی غیر اللہ کے لئے ذبح کیا جائے، یعنی اس کا خون بہانے سے تقرب الی غیر اللہ مقصود ہو، لیکن بوقت ذبح اس پر نام اللہ ہی کا لیا جائے جیسے بہت سے نادان مسلمان بزرگوں پیروں کے نام پر ان کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے بکرے، مرغے وغیرہ ذبح کرتے ہیں، لیکن ذبح کے وقت اس پر نام اللہ ہی کا پکارتے ہیں، یہ صورت بھی باتفاق فقہاء حرام اور مذکورہ مردار ہے۔

مگر تخریج دلیل میں کچھ اختلاف ہے، بعض حضرات مفسرین رفتار نے اس کو بھی مَا أَهْلَ بِهِ لَعْنَةُ اللَّهِ کا مدلول صریح قرار دیا ہے، جیسا کہ حاشی بیضاوی میں ہے:

فَكُلْ مَا تَدْرِي عَلَيْهِ يَفْئِدُ اسْمِهِ
اللَّهُ فَهُوَ حَرَامٌ وَإِنْ دُرِيَ

ہر وہ جانور جس کو غیر اللہ کے نام کر دیا گیا
وہ حرام ہے، اگرچہ بوقت ذبح اللہ ہی کا

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ حَيْثُ أَجَمْتُم
الْعَلَّامَاتُ لَكُمْ أَنْ تُسَلِّمُوا بِهِ
ذِي بَيْعَةٍ وَرَفَعَهُ بَيْنَ يَدَيْهِ
التَّقَرُّبَ إِلَى اللَّهِ يَوْمَئِذٍ هَئِلَ
مُرْكُزًا وَذِي بَيْعَتِهِ ذِي بَيْعَتِهِ مَرْكُزًا

نیز در مختار کتاب النکاح میں ہے:

ذِي بَيْعٍ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ
مَّا أَجْمَعْتُمْ لَكُمْ أَنْ تُسَلِّمُوا بِهِ
لَا تَهْلُ أَهْلًا بِهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ
ذِي بَيْعَتِهِ مَرْكُزًا وَذِي بَيْعَتِهِ مَرْكُزًا

نام لیا ہوا اس کو کہ ملازم فقہاء کا اتفاق ہو
کہ کسی جانور کو غیر اللہ کے تقرب کے لئے
اگر کوئی مسلمان ذبح کرے تو وہ مرتد
ہو جاوے گا، اور اس کا ذبیحہ مرتد کا
ذبیحہ کہلاتے گا۔

کبھی امیر یا بڑے کے آگے جانور ذبح کیا
تو وہ حرام ہو گا، کیونکہ وہ مالاہل بہ بغیر اللہ
اللہ میں داخل ہے، اگرچہ بوقت ذبح
اللہ ہی کا نام لیا ہو۔ اور سب اس نے

اور بعض حضرات نے اس صورت کو مآہل بہ بغیر اللہ کا مدلول صریح قرار نہیں دیا
کیونکہ وہ ہمیشہ عربیت تکلف سے خالی نہیں، مگر بوجہ اشتراک علت یعنی تقرب الی غیر اللہ کی
نیست کے اس کو بھی مآہل بہ بغیر اللہ کے ساتھ ملحق کر کے حرام قرار دیا ہے، احتیاط کے
نزدیک یہی وجہ احتیاط اور اسلم ہے۔

نیز اس صورت کی حرمت کے لئے ایک مستقل آیت بھی دلیل ہے، یعنی وَمَا ذُبِحَ
عَلَى النُّصُبِ نُصْبُ اِنْ تَمَامَ حَيْسَرْدَلِ كُوْكَبَا جَانَا هِ، جن کی باطل طور پر پرستش کی جاتی ہے
یعنی یہ ہیں کہ وہ جانور جس کو معبودات باطلہ کے لئے ذبح کیا گیا ہے، اس سے پہلے وَمَا أَهْلًا
بِهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ کا ذکر ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مآہل بہ کا مدلول صریح تو وہی جانور ہے
جس پر بوقت ذبح غیر اللہ کا نام لیا گیا، اور ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ (۳۵) کے بالمقابل آیا ہے جس میں
غیر اللہ کے نام لینے کا ذکر نہیں، صرف بتوں وغیرہ کی خوشنودی کی نیست سے ذبح کرنا مراد ہے،
اس میں وہ جانور بھی داخل ہیں جن کو ذبح تو کیا گیا ہے غیر اللہ کے تقرب کے لئے مگر بوقت ذبح

عندہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر بعض ذبح کے عمل سے کسی بڑے کی تعظیم مقصود ہو تو یہ حرام ہے، لیکن اگر مقصد یہاں کرنا
ہو اور اس یہاں کیلئے جانور ذبح کیا جائے، یعنی اس کا گوشت یہاں کو کھلانا مقصود ہو، بعض ذبح کے عمل سے تعظیم مقصود
نہ ہو تو یہ سنت ضیافت ہے اور جائز ہے، اور دونوں صورتوں میں فرق یہ ہے کہ دوسری صورت میں ہیزائی کیلئے گوشت کا حصول
ہوتا ہے اور پہلی صورت میں تعظیم کی ملامت کے طور پر جانور کو ذبح کرنا مقصود ہوتا ہے، قطع نظر اس سے کہ اس کا گوشت
کھا یا جائے گا یا نہیں؟ چنانچہ فقہاء میں آگے ہی وضاحت کی گئی ہے: وَلَوْ ذُبِحَ لِلضَّيْفِ لَا يَحِلُّ لِمَا لَمْ يَكُنْ مَنِ الْمَنَافِعِ
وَالضَّيْفِ الْكِرَامِ اللَّهُ تَعَالَى. وَالْقَائِدُ أَنَّهُ إِنْ قَدْ مَهَّلَ كُلَّ مَنَافِعِ الْكَانِ الذَّبْحُ لِلَّهِ وَالْمَنَافِعُ لِلضَّيْفِ
أَوَّلُ لَوْلِيَاهُ أَوَّلُ لَوْلِيَاهُ وَإِنْ لَمْ يَكُنْ مَنَافِعُ الْكَانِ الذَّبْحُ لِلَّهِ لَمْ يَكُنْ لَتَعْظِيمِ غَيْرِ اللَّهِ تَعَالَى
علامہ شامی نے اس کی شرح میں مزید تشریح فرمادی ہے (رد المحتار ص ۲۰۹ و ۲۱۰) مجتہدین ثنائی و ذہبی

اس پر اللہ کا نام لیا گیا ہے۔ (افادہ شریعی حکم الامت)

امام قرطبی نے اپنی تفسیر میں اسی کو سخت سیار کیا ہے، اُن کی عبارت یہ ہے:

وَجَزَتْ عَادَةُ الْعَرَبِ بِالْقَبِيحِ
يَا أَيُّهَا الْمُتَّقُونَ بِاللَّهِ بَيْعَتُهُمْ
ذَلِكَ فِي أَسْبَغَتِهِمْ حَتَّى غَبَرَ
بِهِ عَنِ الشَّيْءِ الَّذِي رَمَوْا
التَّخْرِيمِ (تفسیر قرطبی ص ۲۵۸)

تقرب کی عادت تھی کہ جس پہلے ذبح کرنا مقصود
ہوتا ذبح کر کے وقت اس کا نام بلند آواز سے
پکارتے اور یہ واقع ان میں عام تھا یہاں تک کہ
اس آیت میں تقرب الی غیر اللہ کو جو کہ اصل مطلب
قریم ہوا اہل کے لفظ سے تعبیر کر دیا۔

امام سبکی نے اپنی اس تحقیق کی بنیاد صحابہ کرام میں سے دو حضرات حضرت علی مرتضیٰ
رضی اللہ عنہ اور حضرت صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے فتاویٰ پر رکھی ہے۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے زمانہ میں فرزدق شاعر کے رباب غالب نے ایک اونٹ ذبح
کیا تھا، جس پر کسی غیر اللہ کا نام لینے کا کوئی ذکر نہیں، مگر حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اس کو بھی
مآہل بہ بغیر اللہ کے نام لینے کا حرام فرمایا، اور سب صحابہ کرام نے اس کو قبول
کیا، اسی طرح امام مسلم کے شیخ یحییٰ بن یحییٰ کی سند سے صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی ایک طویل حدیث
نقل کی جس کے آخر میں ہے کہ ایک عورت نے حضرت صدیقہ سے سوال کیا کہ اُمّ المؤمنین! ہمارے
ہمارے کچھ رضاعی رشتہ دار بھی لوگوں میں سے ہیں، اور ان کے یہاں تو روز روز کوئی نہ کوئی تہوار
ہوتا رہتا ہے، یہ اپنے تہواروں کے دن کچھ ہدیہ تحفہ ہمارے پاس بھی بھیج دیتے ہیں، ہم اس کو کھائیں
یا نہیں؟ اس پر صدیقہ عائشہ نے فرمایا:

أَمَّا مَا ذُبِحَ لِلذِّكْرِ الْيَتِيمِ فَلَا
تَأْكُلُوهُ وَلَكِنْ تَكُلُوا مِنْ أَكْبَارِهِمْ
(تفسیر قرطبی ص ۲۵۸)

جو جانور اس عید کے دن کے لئے ذبح کیا گیا
وہ نہ کھاؤ، لیکن اُن کے درختوں کے پھل
وغیرہ کھا سکتے ہو۔

الغرض یہ صورت ثانیہ جس میں نیست تو تقرب الی غیر اللہ کی ہو مگر ذبح کے وقت اللہ کا
نام لیا جائے، اول تو اشتراک علت یعنی نیست تقرب الی غیر اللہ کی وجہ سے مآہل بہ بغیر اللہ
اللہ کے حکم میں ہو، دوسرے آیت وَمَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ کا بھی مدلول ہے اس لئے یہ بھی حرام ہے۔
تیسری صورت یہ ہو کہ کسی جانور کو کان کاٹ کر یا کوئی دوسری ملامت لگا کر تقرب الی
غیر اللہ اور تعظیم غیر اللہ کے لئے چھوڑ دیا جائے، نہ اس سے کام لیں اور نہ اس کے ذبح کرنے
کا قصد ہو، بلکہ اس کے ذبح کرنے کو حرام جانیں، یہ جانور مآہل بہ بغیر اللہ اور مآہل بہ
عَلَى النُّصُبِ دونوں میں داخل نہیں، بلکہ اس قسم کے جانور کو بھیرہ یا سائبہ وغیرہ کہا جاتا ہے،
اور حکم ان کا یہ ہو کہ یہ فعل تو نہیں مستحکم حرام ہے، جیسا کہ آیت مَا جَعَلَ اللَّهُ مِنْ تَحْتِهَا

وَلَا تَسْكَبُ عَلَيْهِ (۴۳:۵) میں انشاء اللہ تعالیٰ آئے گا۔

مگر ان کے اس حرام عمل سے اور اس جانور کو حرام سمجھنے کے عقیدہ سے یہ جانور حرام نہیں ہو جاتا بلکہ اس کو حرام سمجھنے میں تو ان کے عقیدہ، باطلہ کی تائید و تقویت ہوتی ہے، اس لئے یہ جانور عام جانوروں کی طرح حلال ہے۔

مگر شرعی اصول کے مطابق یہ جانور اپنے مالک کی ملک سے خارج نہیں ہوا، اسی کا ملوک ہے، اگرچہ وہ اپنے غلط عقیدہ سے یہ سمجھتا ہے کہ میری ملک سے نکل کر غیر اللہ کے لئے وقف ہو گیا، مگر شرعاً اس کا یہ عقیدہ باطل ہے، وہ جانور بدستور اس کی ملک میں ہے۔ اب اگر وہ شخص خود اس جانور کو کسی کے ہاتھ فروخت کر دے یا ہبہ کر دے تو اس کے لئے یہ جانور حلال ہے، جیسا بکثرت ہندو اپنے دیوتاؤں کے نام پر لگانے وغیرہ کر دیتے ہیں کہ جڑی پھوس، بڑے بڑے درخت، پھل وغیرہ جو چاہیں کریں، یہ ہندوؤں کے بھاری اُن کو مسلمانوں کے ہاتھ بھی فروخت کر دیتے ہیں۔

یہ اسی طرح بعض جاہل مسلمان بھی بعض مزارات پر ایسا ہی عمل کرتے ہیں کہ بکرا، بامرغا چھوڑ دیتے ہیں، اور مزارات کے مجاورین کو خستیاں دیتے ہیں وہ ان کو فروخت کر دیتے ہیں، تو جو لوگ ان جانوروں کو اُن لوگوں سے خرید لیں جن کو اصل مالک نے اختیار دیا ہے ان کے لئے ان خریدنا اور ذبح کر کے کھانا اور فروخت کرنا حلال ہے۔

نذر غیر اللہ کا مسئلہ یہاں ایک چوتھی صورت اور ہے جس کا تعلق حیوانات کے علاوہ دوسری چیزوں سے ہے، مثلاً مثالی کھانا وغیرہ جن کو غیر اللہ کے نام پر نذر (منّت) کے طور سے، ہندو لوگ بتوں پر اور جاہل مسلمان بزرگوں کے مزار پر چڑھاتے ہیں، حضرات فقہار نے اس کو بھی اشتراکِ علت یعنی تقرب الی غیر اللہ کی وجہ سے مَنّ اُھلِہِ بِہِ یَغْبِرُ اللہ کے حکم میں مسترد کر دیا ہے، اور اس کے کھانے پینے، دوسروں کو کھلانے اور بیچنے خریدنے سب کو حرام کہا ہے، کتب فقہ بحر الرائق وغیرہ میں اس کی تفصیلات مذکور ہیں، یہ مسئلہ قیاسی ہے جس کو نص شرعی متعلقہ حیوانات پر قیاس کیا گیا ہے، واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم۔

اضطرار و مجبوری کے احکام آیت مذکورہ میں چار چیزوں کو حرام قرار دینے کے بعد ایک حکم ہشتمی مذکور ہے فَتَمِنَ اضْطُرَّ غَیْرُ بَاطِلٍ وَلَا عَادٍ فَلَا اِشْرَکَ عَلَیْہِ اِنَّ اللہَ غَفُورٌ رَّحِیْمٌ اس حکم میں اتنی آسانی کر دی گئی ہے کہ جو شخص بھوک سے بہت ہی بیتاب ہو جائے، بشرطیکہ نہ تو کھانے میں طالب لذت ہو اور نہ قد و ضرورت سے تجاوز کرنے والا ہو تو اس حالت میں اُن حرام چیزوں کو کھالینے سے بھی

اس شخص کو کوئی گناہ نہیں ہوتا، بے شک اللہ تعالیٰ میں بڑے غفور و رحیم۔ اس میں مضطر کے لئے جان بچانے کے واسطے دو شرطوں کے ساتھ ان حرام چیزوں کے کھالینے سے بھی گناہ اٹھا دیا گیا ہے۔

مضطر، شرعی اصطلاح میں اس شخص کو کہا جاتا ہے جس کی جان خطرہ میں ہو، معمولی تکلیف یا ضرورت سے مضطر نہیں کہا جاسکتا، تو جو شخص بھوک سے ایسی حالت پر پہنچ گیا کہ اگر کچھ نہ کھائے تو جان جاتی ہے گی، اس کے لئے دو شرطوں کے ساتھ یہ حرام چیزیں کھالینے کی گنجائش دی گئی ہے، ایک شرط یہ ہے کہ مقصود جان بچانا ہو کھانے کی لذت حاصل کرنا مقصود نہ ہو، دوسری شرط یہ ہے کہ صرف اتنی مقدار کھائے جو جان بچانے کے لئے کافی ہو، پیٹ بھر کر کھانا یا قدر ضرورت سے زائد کھانا اس وقت بھی حرام ہے۔

اہم قاعدہ یہاں قرآن عزیز نے اضطرار کی حالت میں بھی حرام چیزوں کے کھالے کو حلال نہیں فرمایا، بلکہ لَا اِشْرَکَ عَلَیْہِ فرمایا، جس کا مطلب یہ ہے کہ یہ چیزیں تو اب بھی اپنی جگہ حرام ہی ہیں، مگر اس کھانے والے سے بوجہ اضطرار کے استعمال حرام کا گناہ معاف کر دیا گیا، حلال ہو جانے اور گناہ معاف کر دینے میں بڑا فرق ہے، اگر اضطراری حالت میں ان چیزوں کو حلال کر دینا مقصود ہوتا تو حرمت سے صرف استثناء کر دینا کافی ہوتا، مگر یہاں صرف استثناء پر اکتفا کر دینے کے بجائے لَا اِشْرَکَ عَلَیْہِ کا اضافہ فرما کر اس نکتہ کی طرف اشارہ کر دیا کہ حرام تو اپنی جگہ حرام ہی ہے، اور اس کا استعمال گناہ ہے، مگر مضطر سے یہ گناہ معاف کر دیا گیا۔

حالت اضطرار میں دوا کے آیت مذکورہ سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ جس شخص کی جان خطرہ میں ہو وہ حرام چیزوں کا استعمال جان بچانے کے لئے بطور دوا کے حرام چیزوں کو استعمال کر سکتا ہے، مگر آیت مذکورہ ہی کے اشارہ سے اس میں چند شرطیں معلوم ہوتی ہیں،

اول یہ کہ حالت اضطرار کی ہو، خطرہ جان جانے کا ہو، معمولی تکلیف و بیماری کا حکم نہیں ہے، دوسرے یہ کہ بجز حرام چیز کے اور کوئی چیز علاج و دوا کے لئے مؤثر نہ ہو یا موجود نہ ہو، جیسے شدید بھوک کی حالت میں استثناء اُسی وقت ہی جب کہ کوئی دوسری حلال غذا موجود و مقدور نہ ہو، تیسرے یہ کہ اس حرام کے استعمال کرنے سے جان بچ جانا یقینی ہو جیسے بھوک سے مضطر کے لئے ایک دو نعم حرام گوشت کا کھالینا عادتہً اس کی جان بچانے کا یقینی سامان ہے، اگر کوئی دوا ایسی ہے کہ اس کا استعمال مفید تو معلوم ہوتا ہے مگر اس سے شفا یقینی نہیں تو اس دوا حرام کا استعمال آیت مذکورہ کے استثنائی حکم میں داخل نہ ہو کر جائز نہیں ہو گا، اس کے ساتھ مزید دو شرطیں آیت قرآنی میں منصوص ہیں، کہ اس کے

استعمال سے لذت حاصل کرنا مقصود نہ ہو اور قدر ضرورت سے زائد استعمال نہ کرے۔
آیت مذکورہ کی تصریح اور اشارات سے جو قیود و شرائط حاصل ہوئے ان شرائط کے ساتھ
ہر حرام دوا پاک دوا کا استعمال خواہ کھانے پینے میں ہو یا خارجی استعمال میں باقائے فقہاء امت
جائز ہے، ان شرائط کا خلاصہ پانچ چیزیں ہیں۔

(۱) حالت اضطراب کی ہو یعنی جان کا خطرہ ہو (۲) دوسری کوئی حلال دوا کارگر نہ ہو
یا موجود نہ ہو (۳) اس دوا سے مرض کا ازالہ عاۃً یقینی ہو (۴) اس کے استعمال سے لذت
حاصل کرنا مقصود نہ ہو (۵) قدر ضرورت سے زائد اس کو استعمال نہ کیا جائے۔

غیر اضطرابی حالت میں عام علاج اور اضطرابی حالت کا مسئلہ تو شرائط مذکورہ کے ساتھ نص قرآن
دوا کے لئے حرام چیز کا استعمال سے ثابت اور احجامی حکم ہے، لیکن عام بیماریوں میں بھی کسی
ناپاک یا حرام دوا کا استعمال جائز ہے یا نہیں، اس مسئلہ میں فقہاء کا اختلاف ہے، اکثر
فقہاء نے فرمایا کہ بغیر اضطراب اور ان تمام شرائط کے جو اوپر مذکور ہوئیں حرام دوا کا استعمال جائز
نہیں، کیونکہ حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ: "اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان
کے لئے حرام میں شفاء نہیں رکھی (بخاری شریف)"

بعض دوسرے فقہاء نے ایک خاص واقعہ حدیث سے استدلال کر کے جائز قرار دیا،
وہ واقعہ عزیٰ بن کعب کا ہے، جو تمام کتب حدیث میں مذکور ہے، کہ کچھ گاؤں والے لوگ آنحضرت
صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے وہ مختلف بیماریوں میں مبتلا تھے، آنحضرت
صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو ادویہ کا دودھ اور پشیاں استعمال کرنے کی اجازت دی جس سے
ان کو شفاء ہو گئی۔

مگر اس واقعہ میں متعدد احتمالات ہیں جن سے حرام چیز کا استعمال مشکوک ہو جاتا ہو،
اس لئے اصل حکم تو یہی ہے کہ عام بیماریوں میں جب تک شرائط اضطراب مذکورہ موجود نہ ہوں حرام
دوا کا استعمال جائز نہیں۔

لیکن فقہاء متاخرین نے موجودہ زمانے میں حرام دوا پاک دواؤں کی کثرت اور ابتلا
عام اور عوام کے ضعف پر نظر کر کے اس شرط کے ساتھ اجازت دی ہے کہ کوئی دوسری
حلال اور پاک دوا اس مرض کے لئے کارگر نہ ہو یا موجود نہ ہو۔

کما فی الدار المختار قبیل فصلی البیہ

ترغیبات میں فصل ہر سے پہلے مذکور ہو

حرام چیزوں کو بطور دوا استعمال کرنے

میں اختلاف ہے، اور ظاہر مذہب میں اس

رضاع البحر و لکن نقل المصنف
ثم و همنا عن العادری قیل
بیرخص اذا عیلم فیہ الشفاء
ولم یعلم دواء اخر کماتخص
فی الخمر للعطشان و علیہ
الفتویٰ و مثله فی العالم کثیر
ص ۳۵۵ ج ۵

کی مانعت آتی ہے، جیسا کہ بحر الرائق کتاب
الرضاع میں مذکور ہو، لیکن مصنف تنویر
نے اس جگہ رضاع میں بھی اور یہاں بھی
حادی قدسی سے نقل کیا ہے کہ بعض علما
نے فرمایا دوا و علاج کے لئے حرام چیزوں
کا استعمال اس شرط سے جائز ہے کہ اس
دوا کے استعمال سے شفاء ہو جانا عاۃً
یعنی ہو، اور کوئی حلال دوا اس کا بدل نہ ہو سکے، جیسا کہ پیاسے کے لئے شراب کا گھونٹ
پینے کی اجازت دی گئی ہے۔

مسئلہ: تفصیل مذکور سے ان تمام انگریزی دواؤں کا حکم معلوم ہو گیا جو روپ
وغیرہ سے آتی ہیں، جن میں شراب وغیرہ نجس اشیاء کا ہونا معلوم و یقینی ہو، اور جن دواؤں میں
حرام و نجس اجزاء کا وجود مشکوک ہو ان کے استعمال میں اور زیادہ گنجائش ہے، اور احتیاط
بہر حال احتیاط ہے، خصوصاً جبکہ کوئی شدید ضرورت بھی نہ ہو و اللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم۔

إِنَّ الَّذِينَ يَكْفُرُونَ مَا أَنْزَلَ اللَّهُ مِنَ الْكِتَابِ وَيَشْتَرُونَ

بے شک جو لوگ چھپاتے ہیں جو کچھ نازل کی اللہ نے کتاب اور لیتے ہیں اس پر

بِهِ ثَمَنًا قَلِيلًا أُولَٰئِكَ مَا يَكُونُونَ فِي بُطُونِهِمْ إِلَّا النَّارُ وَلَا

تھوڑا سا مال وہ نہیں بھرتے اپنے پیٹ میں مگر آگ اور نہ بات

يَكْتُمُهُمُ اللَّهُ يَوْمَ الْقِيَمَةِ وَلَا يُزَكِّيهِمْ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ

کریگا ان سے اللہ قیامت کے دن اور نہ پاک کرے گا ان کو اور ان کے لئے ہے

أَلِيمٌ ۚ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ اشْتَرُوا الضَّلَالَةَ بِالْهُدَىٰ وَالْعَالَمِ

عذاب دردناک، یہی ہیں جنہوں نے خرید لیا گمراہی کو بدلے ہدایت کے اور عذاب

بِالْمَغْفِرَةِ ۚ فَمَا أَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ ۚ ذَٰلِكَ بِأَنَّ اللَّهَ نَزَلَ

برے بخشش کے، مگر کس قدر صبر کر رہے ہیں دوزخ پر، یہ اس واسطے کہ اللہ نے نازل فرمایا

استعمال سے لذت حاصل کرنا مقصود نہ ہو اور قدر ضرورت سے زائد استعمال نہ کرے۔
آیت مذکورہ کی تصریح اور اشارات سے جو قیود و شرائط حاصل ہوئے ان شرائط کے ساتھ
ہر حرام دوا پاک دوا کا استعمال خواہ کھانے پینے میں ہو یا خارجی استعمال میں باقی فقہاء مت
جائز ہے، ان شرائط کا خلاصہ پانچ چیزیں ہیں۔

(۱) حالت اضطراب کی ہو یعنی جان کا خطرہ ہو (۲) دوسری کوئی حلال دوا کارگر نہ ہو
یا موجود نہ ہو (۳) اس دوا سے مرض کا ازالہ عاۃً یقینی ہو (۴) اس کے استعمال سے لذت
حاصل کرنا مقصود نہ ہو (۵) قدر ضرورت سے زائد اس کو استعمال نہ کیا جائے۔

غیر اضطرابی حالت میں عام علاج اور اضطرابی حالت کا مسئلہ تو شرائط مذکورہ کے ساتھ نص قرآن
دوا کے لئے حرام چیز کا استعمال سے ثابت اور احب عامی حکم ہے، لیکن عام بیماریوں میں بھی کسی
ناپاک یا حرام دوا کا استعمال جائز ہے یا نہیں، اس مسئلہ میں فقہاء کا اختلاف ہے، اکثر
فقہاء نے فرمایا کہ بغیر اضطراب اور ان تمام شرائط کے جو اوپر مذکور ہوئیں حرام دوا کا استعمال جائز
نہیں، کیونکہ حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ: "اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان
کے لئے حرام میں شفاء نہیں رکھی (بخاری شریف)"

بعض دوسرے فقہاء نے ایک خاص واقعہ حدیث سے استدلال کر کے جائز قرار دیا،
وہ واقعہ عروہ بن مسعود کا ہے، جو تمام کتب حدیث میں مذکور ہے، کہ کچھ گاؤں والے لوگ آنحضرت
صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے وہ مختلف بیماریوں میں مبتلا تھے، آنحضرت
صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو ادویہ کا دودھ اور پشیا استعمال کرنے کی اجازت دی جس سے
ان کو شفاء ہو گئی۔

مگر اس واقعہ میں متعدد احتمالات ہیں جن سے حرام چیز کا استعمال مشکوک ہو جاتا ہو،
اس لئے اصل حکم تو یہی ہے کہ عام بیماریوں میں جب تک شرائط اضطراب مذکورہ موجود نہ ہوں حرام
دوا کا استعمال جائز نہیں۔

لیکن فقہاء متاخرین نے موجودہ زمانے میں حرام دوا پاک دواؤں کی کثرت اور ابتلا
عام اور عوام کے ضعف پر نظر کر کے اس شرط کے ساتھ اجازت دی ہے کہ کوئی دوسری
حلال اور پاک دوا اس مرض کے لئے کارگر نہ ہو یا موجود نہ ہو۔

کما فی الدار المختار قبیل فصلی البیہ

اختلاف فی التداوی بالمحرم و

ظاہر الذہب المنہ کما فی

در مختار میں فصل ہر سے پہلے مذکور ہے

حرام چیزوں کو بطور دوا استعمال کرنے

میں اختلاف ہے، اور ظاہر مذہب میں اس

رضاع البحر و لکن نقل المصنف
ثم و همنا عن العادری قیل
بیرخص اذا عیلم فیہ الشفاء
ولم یعلم دواء اخر کما رخص
فی الخمر للعطشان و علیہ
الفتویٰ و مثله فی العالم کثیر
ص ۳۵۵

کی مانعت آتی ہے، جیسا کہ بحر الرائق کتاب
الرضاع میں مذکور ہے، لیکن مصنف تنویر
نے اس جگہ رضاع میں بھی اور یہاں بھی
حادی قدسی سے نقل کیا ہے کہ بعض علما
نے فرمایا دوا و علاج کے لئے حرام چیزوں
کا استعمال اس شرط سے جائز ہے کہ اس
دوا کے استعمال سے شفاء ہو جانا عاۃً
یعنی ہو، اور کوئی حلال دوا اس کا بدل نہ ہو سکے، جیسا کہ پیاسے کے لئے شراب کا گھونٹ
پینے کی اجازت دی گئی ہے۔

مسئلہ: تفصیل مذکور سے ان تمام انگریزی دواؤں کا حکم معلوم ہو گیا جو روپ
وغیرہ سے آتی ہیں، جن میں شراب وغیرہ نجس اشیا کا ہونا معلوم و یقینی ہو، اور جن دواؤں میں
حرام و نجس اجزاء کا وجود مشکوک ہو ان کے استعمال میں اور زیادہ گنجائش ہے، اور احتیاط
بہر حال احتیاط ہے، خصوصاً جبکہ کوئی شدید ضرورت بھی نہ ہو و اللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم۔

إِنَّ الَّذِينَ يَكْفُرُونَ مَا أَنْزَلَ اللَّهُ مِنَ الْكِتَابِ وَيَسْتُرُونَ

بجانب جو لوگ چھپاتے ہیں جو کچھ نازل کی اللہ نے کتاب اور لپتے ہیں اس پر

بِهِ ثَمَنًا قَلِيلًا أُولَٰئِكَ مَا يَأْكُلُونَ فِي بُطُونِهِمْ إِلَّا النَّارَ وَلَا

تھوڑا سا مال وہ نہیں بھرتے اپنے پیٹ میں مگر آگ اور نہ بات

يَكَلِمُهُمُ اللَّهُ يَوْمَ الْقِيَمَةِ وَلَا يُزَكِّيهِمْ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ

کرے گا ان سے اللہ قیامت کے دن اور نہ پاک کرے گا ان کو اور ان کے لئے ہے

أَلِيمٌ ۝ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ اسْتَرَوْا الضَّلَالَةَ بِالْهُدَىٰ وَالْعَلَىٰ

عذاب دردناک، یہی ہیں جنہوں نے خرید اگرا یہی کو بدلے ہدایت کے اور عذاب

بِالْمَغْفِرَةِ ۚ فَمَا أَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ ۝ ذَٰلِكَ بِأَنَّ اللَّهَ نَزَلَ

بدلے بخشش کے، مگر کس قدر صبر کر رہے ہیں دوزخ پر، یہ اس واسطے کہ اللہ نے نازل فرمایا

پ

پ

الْكِتَابَ بِالْحَقِّ، وَإِنَّ الَّذِينَ اخْتَلَفُوا فِي الْكِتَابِ لَفِي شِقَاقٍ

متراب سبھی ، اور جنھوں نے اختلاف ڈالا کتاب میں وہ بے شک ہمدیں

يَعْنِي

دور جا پڑے

خلاصہ تفسیر و ربط آیات | اس سے پہلی آیات میں اُن حرام چیزوں کا ذکر تھا جو محسوسات میں سے ہیں، اگلی آیات میں ایسے حرام کاموں کا ذکر جو محسوس نہیں بلکہ باطنی اور ظاہری اعمالِ شہرہ ہیں، مثلاً علمائے یہود میں یہ مرض تھا کہ عوام سے رشوت لیکر اُن کے مطلب کے موافق غلط فتوے دیدیتے تھے، اور توراتیت کی آیات میں تعریف کر کے اُن کے مطلب کے موافق بناتے تھے، اس میں امتِ محمدیہ کے علماء کو بھی تنبیہ ہو کہ وہ ایسے انعال سے اجتناب کریں، کسی نفسانی غرض سے احکامِ حق کے اظہار میں کوتاہی نہ کریں۔

دین فردوسی کی سند | اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کی ہمیں ہوتی کتاب (کے معنی) کا اہتمام کرتے ہیں اور اس (دھیانت) کے معاوضہ میں (دنیا کی) متاعِ قلیل وصول کرتے ہیں ایسے لوگ اور کچھ نہیں اپنے پیٹ میں آگ (کے انگارے) بھر رہے ہیں، اور اللہ تعالیٰ ان سے بذوقیت میں (لطف کے ساتھ) کلام کریں گے اور (دعنا معاف کرے) ان کی صفائی کریں گے، اور ان کو سزا سے (دردناک ہوگی) یہ ایسے لوگ ہیں جنہوں نے (دنیا میں تو) ہدایت چھوڑ کر ضلالت اختیار کی اور (آخرت میں) مغفرت چھوڑ کر عذاب (سر رہا) سو (شاہانِ ہوا کی ہمت کو) دوزخ (میں جانے) کے لئے کیسے باہمت ہیں (اور) یہ (ساری مذکورہ) سزائیں (ان کو) اس وجہ سے ہیں کہ حق تعالیٰ نے (اس) کتاب کو ٹھیک ٹھیک بھیجا تھا، اور جو لوگ (ایسی ٹھیک ٹھیک سمجھی ہوئی کتاب میں بے راہی اختیار) کریں، وہ ظاہر ہے کہ بڑی دور (دوراز) کی خلافت (دورزی) میں (مبتلا) ہوں گے (اور ایسی خلافت دورزی پر ضرور ایسی ہی سخت سزاؤں کا استحقاق ہوگا)۔

معارف و مسائل

مسئلہ: آیات مذکورہ سے معلوم ہوا کہ جو شخص مال کے لالچ سے حکیم شرعی کو بدل دے، وہ جو یہ مال حرام کھاتا ہے گویا اپنے پیٹ میں جہنم کے انگٹے بھر رہا ہے، کیونکہ اس عمل کا انجام یہی ہے، اور بعض محقق علماء نے فرمایا کہ مال حرام درحقیقت جہنم کی آگ ہی ہے،

اگرچہ اس کا آگ ہذا دنیا میں محسوس نہیں ہوتا، مگر مرنے کے بعد اس کا یہ عمل آگ کی شکل میں سامنے آجائے گا۔

لَيْسَ الْبِرَّ أَنْ تُولُوا وَجُوهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ

نیکی کچھ ہی نہیں کہ جس کو اپنا مشرق کی طرف یا مغرب کی

وَلَكِنَّ الْيُزْمَ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالْكِتَابِ

لیکن بڑی نیکی تو یہ ہے کہ جو کئی ایمان لائے، اللہ پر اور قیامت کے دن پر اور فرشتوں پر اور

وَالْبَيْتِ ۚ وَالْأَمَالِ عَلَىٰ حُبِّهِ ذَوِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَ

سب کماؤں پر اور سلیمنوں پر اور فی مال اس کی محبت پر رشتہ داروں کو اور یتیموں کو اور

المَسْكِينِ وَابْنِ السَّبِيلِ وَالسَّائِلِينَ وَفِي الرِّقَابِ وَأَقَامَ

مجاہدوں کو اور مسافروں کو اور مانگنے والوں کو اور گردیں چمڑے میں اور قائم رکھے

الصَّلَاةَ وَالْإِتْيَانَ إِلَى الزَّكَاةِ، وَالْمُؤْتُونَ بِعَهْدِهِمْ إِذَا عَاهَدُوا

سماں اور دیا کرے دلوں اور پورا کرے دالے اپنے اقرار کو جب عہد کریں ،

وَالصَّبْرُ فِي الْبِئْسَاءِ وَالضَّرَاءِ وَحِينَ الْبِئْسِ أَوْلِيكَ

اور سب سے بڑے واسطے سہی میں اور حکیت میں اور رازی کے دوست بھی لکھ

الَّذِينَ صَدَقُوا بِأَوْلِيَّتِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ ﴿١٠٤﴾

شماره مسلسل: ۱۰۰۰۰۰۰۰۰۰

ربط از بیان بشاران

کی حیثیت کا اثبات کیا، اس ضمن میں اس کے ماننے والے اور نہ ماننے والے فسرقوں کا ذکر

کيا، پھر وحید درسات کو ثابت کیا، پھر اولاد ابراہیم علیہ السلام پر انعامات و احسانات کو

ابو اسحق ابراہیمؒ بیان فرمایا: وہاں سے قبل ہی بحث چلی، اور اس کو بیان کر کے صفحہ

میرزا کی بہت پرہیزگاری تھی۔

پھر پھر سے اس بات کے بعد سر کے انمول ذمہ دارانہ اہتمام لیا، اور یہاں تک پہنچا

بیان ہوا، اور ان سب مقامین میں ظاہر ہے کہ منکرین کو زیادہ تنبیہ ہو، اور غمنا کوئی خطاب مسلمانوں کو ہر جانا اور بات ہو۔

اب آیات آئندہ میں کہ بقیہ تقریباً سورۃ بقرہ کا نصف ہے، زیادہ تر مقصود مسلمانوں کو بعض اصول و فروع کی تعلیم کرنا ہے، گو ضمناً غیر مسلمین کو بھی کوئی خطاب ہو جاوے، اور یہ مضمون ختم سورۃ تک چلا گیا ہے جس کو شروع کیا گیا ہے ایک مجمل عنوان ہے، لفظ پڑکھو الباء عربی زبان میں مطلبی خیر کے معنی میں ہے، جو تمام ظاہری اور باطنی طاعات و خیرات کو جامع ہے، اور اول آیات میں الفاظ جامعہ سے کلی اور اصولی تعلیم دی گئی ہے، مثلاً ایمان بالکتاب و ایقانہ مال و دقار، عہد و صبر، عین البأس و غیرہ، جس میں سرآئی تمام احکام کے بنیادی اصول آگئے، کیوں کہ شریعت کے کل احکام کا حاصل تین چیزیں ہیں، عقائد، اعمال، اخلاق، باقی تمام جزئیات انہیں کلیات کے تحت میں داخل ہیں، اور اس آیت میں ان تینوں قسم کے بڑے بڑے شعبے آگئے۔

آگے اس بڑ کی تفصیل چلی ہے، جس میں سے بہت سے احکام باقتضائے وقت و مقام
مثل قصاص و وصیت و روزہ و جہاد و حج و النفاق و حیض و ایلاء و یتیم و طلاق و نکاح و عدت
و تہر و تکرار ذکر جہاد و النفاق فی سبیل اللہ و بعض معاملات بیع و شراء و شہادت بقدر ضرورت
بیان نشر ما کر بشارت و دعوہ رحمت و مغفرت پر ختم فرمادیا، سبحان اللہ! کیا بلیغ تر قییب ہوا
پس چونکہ ان مضامین کا حاصل بڑ کا بیان ہے اجمالاً و تفصیلاً، اس لئے اگر اس مجبورہ کا لقب
ابواب الیز رکھا جاوے تو نہایت زیبا ہے، واللہ الموفق۔

خلاصہ تفسیر

ابواب الشیر | کچھ سارا کمال اسی میں نہیں (آگیا) کہ تم اپنا منہ مشرق کو کرو،
یا مغرب کو (دکرو) لیکن (اصلی) کمال قویہ ہے کہ کوئی شخص اللہ
تعالیٰ کی ذات و صفات پر یقین رکھے، اور (اسی طرح) قیامت کے دن (آنے) پر (بھی)
اور فرشتوں پر (بھی) کہ وہ اللہ کے فرمانبردار بندے ہیں، اور سے بنے ہیں، غناء سے معصوم ہیں،
کھانے پینے اور انسانی شہوات سے پاک ہیں) اور (سب) کتب (ساویہ) پر (بھی) اور (سب)
پیغمبروں پر (بھی) اور (وہ شخص) مال دیتا ہو اللہ کی محبت میں (اپنے حاجت مند) رشتہ داروں کو
اور (نادار) یتیموں کو (یعنی جن بچوں کو ان کا باپ نابالغ چھوڑ کر گیا ہو) اور (دوسرے غریب)
علاجوں کو (بھی) اور (بے خرچ) مسافروں کو اور (لا چاری میں) سوال کرنے والوں کو اور
(قیدی اور غلاموں کی) اگر دن چھڑائے میں (بھی) مال خرچ کرتا ہو) اور (وہ شخص) نماز کی پابندی

(بھی) رکھتا ہو اور (مقررہ) نفل بھی ادا کرتا ہو اور جو اشخاص رک ان عقائد و اعمال کے ساتھ اپنے نفل
 بھی رکھتے ہوں کہ) اپنے عہد دل کو پورا کرنے والے ہوں جب (کسی امر جائز کا) عہد کر لیں اور
 اس صفت کو خصوصیت کے ساتھ کہوں گا کہ) وہ لوگ (ان مواقع میں) مستقل (مرزا ج)
 رہنے والے ہوں (ایک تو) تنگدستی میں اور (دوسرے) بیماری میں اور (تیسرے معرکہ) قتال
 (کفار) میں (یعنی پریشان اور کم ہمت نہ ہوں) یہ لوگ ہیں جو سچے کمال کے ساتھ موصوف
 ہیں اور یہی لوگ ہیں جو (سچے) متقی (رہے جاسکتے ہیں) (غرض اصلی مقاصد و کمالات دین کے یہ ہیں نماز
 کسی سمت کو نہ کرنا اپنی کمالات ذکرہ میں سے ایک کمال خاص یعنی اتامہ صلوٰۃ کے قرائع اور شرائط میں سے ہے اور
 اس کے جسے اس میں بھی حسن آگیا اور نہ اگر نماز ہوتی تو کسی خاص سمت کو نہ کرنا بھی عبادت نہ ہوتا

معارف و مسائل

جب مسلمانوں کا قبلہ بیت المقدس کے بجائے بیت اللہ کر دیا گیا تو یہود و نصاریٰ اور مشرکین جو اسلام اور مسلمانوں میں عیب جوئی کا فکر میں رہتے تھے ان میں بڑا شور و شغب ہوا اور طرح طرح سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلام پر اعتراضات کا سلسلہ جاری کر دیا، جس کے جوابات پچھل آیات میں بڑی توضیح و تفصیل کے ساتھ ذکر کئے گئے ہیں۔

ان آیات میں ایک خاص انداز سے اس بحث کو ختم کر دیا گیا ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ تم نے سارا دین صرف اس بات میں منحصر کر دیا ہے کہ نماز میں انسان کا رخ مغرب کی طرف ہو یا مشرق کی مراد اس سے مطلق چہات اور سمتیں ہیں، یعنی تم نے صرف سمت و جہت کو دین کا مقصد بنالیا، اور ساری بحثیں اسی میں دائر ہو گئیں، گو یا شریعت کا کوئی اور حکم ہی نہیں ہے۔

اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس آیت کا خطاب یہود و نصاریٰ اور مسلمان سب کیلئے ہو، اور مراد یہ ہو کہ اصل ہزار اور ثواب اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں ہے وہ جس طرف رُخ کرنے کا حکم دیں، وہی ثواب و صواب ہو جاتا ہے، اپنی ذات کے اعتبار سے مشرق و مغرب یا کوئی جانب رجحیت نہ کوئی اہمیت رکھتی ہے، نہ ثواب، بلکہ ثواب دراصل اطاعتِ عظمیٰ کا ہے، جس جانب بھی حکم ہر جائے، جب تک بیت المقدس کی طرف رُخ کرنے کا حکم تھا وہ ثواب تھا، اور جب بیت اللہ کی طرف رُخ کرنے کا ارشاد ہوا تو اب وہی ثواب ہے۔

جیسا کہ بسلسلہ ربط آیات بیان ہو چکا ہے، کہ اس آیت سے سورۃ بقرہ کا مکمل نیا باب شروع ہوا، جو جس میں مسلمانوں کے لئے تعلیمات و ہدایات اصل ہیں، مخالفین

کے جوابات ضمنی، اسی لئے اس آیت کو احکام اسلامیہ کی ایک نہایت جامع آیت کہا گیا ہے۔ اس کے بعد بعترہ کے ختم تک تقریباً اسی آیت کی مزید تشریحات ہیں، اس آیت میں اصولی طور سے تمام احکام شرعیہ، اعتقادات، عبادات، معاملات، اخلاق کا اجمالی ذکر آ گیا ہے۔

پہلی چیز اعتقادات ہیں، اس کا ذکر مَنْ آمَنَ بِاللهِ میں مفصل آ گیا، دوسری چیز اعمال یعنی عبادات اور معاملات ہیں، ان میں سے عبادات کا ذکر وَالَّذِي آتَى الزَّكَاةَ تک آ گیا، پھر معاملات کا ذکر وَالَّذِينَ يُؤْتُونَ بِعَهْدِ عَهْدٍ سے کیا گیا، پھر اخلاق کا ذکر وَالصَّابِرِينَ سے کیا گیا، آخر میں بتلادیا کہ سچے مومن وہی لوگ ہیں جو ان تمام احکام کی پیروی مکمل کریں اور انہی کو تقویٰ شعار کہا جاسکتا ہے۔

ان احکام کے بیان کرنے میں بہت سے بلیغ اشارات ہیں، مثلاً مال کو حشر چ کرنے میں غلے خجّہ کی قید لگا دی، جس میں تین احتمال ہیں، ایک یہ کہ خجّہ کی ضمیر اللہ تعالیٰ کی طرف راجع ہو تو معنی یہ ہوں گے کہ مال خرچ کرنے میں کوئی نفسانی غرض نام دغور کی شامل نہ ہو، بلکہ اخلاص کامل کے ساتھ صرف اللہ جل شانہ کے ساتھ محبت اس حشر چ کرنے کا داعیہ ہو۔

دوسرا احتمال یہ ہے کہ یہ ضمیر مال کی طرف راجع ہو تو مراد یہ ہوگی کہ اللہ کی راہ میں وہ مال خرچ کرنا موجب ثواب ہو جو انسان کو محبوب ہو، بیکار چیزیں جو پھینکنے کی تھیں ان کو دے کر صدقہ کا نام کرنا کوئی صدقہ نہیں، اگرچہ پھینکنے کی نسبت سے بہتر یہی ہے کہ کسی کے کام آسکے، تو اس کو دیدے۔

تیسرا احتمال یہ ہے کہ لفظ آتَى میں جو اس کا مصدر آیا۔ مفہوم ہوتا ہے اس کی طرف ضمیر راجع ہو، اور معنی یہ ہوں کہ وہ اپنے خرچ کرنے پر دل سے راضی ہو، یہ نہ ہو کہ حشر چ تو کر رہا ہے مگر اندر سے دل ذکر رہا ہے۔

امام جصاصؒ نے فرمایا کہ ممکن ہے کہ تینوں ہی چیزیں مراد میں داخل ہوں، پھر اس جگہ مال کے خرچ کرنے کی دو صورتیں مقدم بیان کر دیں، جو زکوٰۃ کے علاوہ ہیں، زکوٰۃ کا ذکر اس کے بعد کیا، شاید تقدیم کی وجہ یہ ہو کہ عام طور سے ان حقوق میں غفلت اور کوتاہی برتی جاتی ہے، صرف زکوٰۃ ادا کر دینے کو کافی سمجھ لیا جاتا ہے۔

مسئلہ: اسی سے یہ بات بھی ثابت ہو گئی کہ مالی فرض صرف زکوٰۃ سے پورا نہیں ہوتا ہے، زکوٰۃ کے علاوہ بھی بہت جگہ پر مال خرچ کرنا فرض و واجب ہوتا ہے (جصاص قرطبی)

جیسے رشتہ داروں پر خرچ کرنا کہ جب وہ کمانے سے معذور ہوں تو نفقہ ادا کرنا واجب ہوتا ہے، کوئی مسکین غریب مر رہا ہے اور آپ اپنی زکوٰۃ ادا کر چکے ہیں، مگر اس وقت مال خرچ کر کے اس کی جان بچانا فرض ہے۔

اسی طرح ضرورت کی جگہ مسجد بنانا یا دینی تعلیم کے لئے مدارس و مکاتب بنانا یہ سب فرائض مالی میں داخل ہیں، فرق اتنا ہے کہ زکوٰۃ کا ایک خاص قانون ہے اس کے مطابق ہر حال میں زکوٰۃ کا ادا کرنا ضروری ہے، اور یہ دوسرے مصارف ضرورت و حاجت پروقوف ہیں، جہاں ضرورت ہو خرچ کرنا فرض ہو جائے گا جہاں نہ ہو فرض نہیں ہوگا۔

جن لوگوں پر مال خرچ کرنا ہے، مثلاً زوی القربی، مساکین، مسافر، سوال کرنے والے فقیر، ان سب کو تو ایک انداز سے بیان فرمایا، پھر وَالَّذِينَ آمَنُوا میں، حرت فی

بڑھاکر اشارہ کر دیا کہ ملوک غلاموں کو مال کا مالک بنانا مقصود نہیں، بلکہ ان کے مالک کے خرید کر ان کے آزاد کرنے پر خرچ کیا جائے، اس کے بعد وَالَّذِينَ آمَنُوا کا ذکر بھی

اسی طریق پر آیا، جیسے دوسری چیزوں کا ذکر ہے، آگے معاملات کا باب بیان کرنا تھا اس میں اسلوب (طریق) بدل کر بجائے صیغہ ماضی استعمال کرنے کے وَالَّذِينَ آمَنُوا صیغہ اسم فاعل استعمال کیا، اس میں اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ اس میں ایثار، عہد کی عادت رانمی ہونا چاہی، اتفاقی طور پر کوئی معاہدہ پورا کر دے تو یہ ہر کار فرما جبر بھی کہیں نہ کہیں کرتا ہے، اس کا اعتبار نہیں اسی طرح معاملات کے باب میں صرف ایثار عہد کا ذکر کیا گیا، کیونکہ اگر غور کیا جائے تو تمام معاملات بیع و شراء، اجارہ، شرکت سب ہی کی روح ایثار معاہدہ ہے۔

اسی طرح آگے اخلاق یعنی اعمال باطنہ کا ذکر کرنا تھا، ان میں سے صرف صبر کو بیان کیا گیا، کیونکہ صبر کے معنی ہیں نفس کو قابو میں رکھنے اور برائیوں سے بچانے کے، اگر غور کیا جا تو تمام اعمال باطنہ کی اصل روح صبر ہی ہے، اسی کے ذریعہ اخلاق فاضلہ حاصل کئے جاسکتے ہیں، اور اسی کے ذریعہ اخلاق رذیلہ سے نجات حاصل کی جاسکتی ہے۔

ایک اور تغیر اسلوب بیان میں یہاں یہ کیا گیا کہ پہلے وَالَّذِينَ آمَنُوا ذکر کیا تھا یہاں وَالصَّابِرِينَ نہیں بلکہ وَالصَّابِرِينَ فرمایا، حضرات مفسرین نے فرمایا کہ یہ نصب علی المدح ہے، جس کی مراد ہے کہ اس جگہ لفظ مدح مقدر ہو اور صابرین اس کا مفعول ہو، یعنی ان سب نیکو کار لوگوں میں خصوصیت سے قابل مدح صابرین ہیں، کیونکہ صبر ہی ایک ایسا ملکہ اور ایسی قوت ہے جس سے تمام اعمال مذکورہ میں مدد ملی جاسکتی ہے، اس طرح آیت مذکورہ میں دین کے تمام شعبوں کے اہم اصول بھی آ گئے ہیں، اور بلیغ اشارات سے ہر ایک کی اہمیت کا درجہ بھی معلوم ہو گیا۔

آیت میں آزاد کے مقابل آزاد اور عورت کے مقابل عورت کا جو ذکر آیا ہے یہ اس خاص واقعہ کی بناء پر ہے جس میں یہ آیت نازل ہوئی ہے۔

ابن کثیرؒ نے باسناد ابن ابی حاتم نقل کیا ہے کہ زمانہ اسلام سے کچھ پہلے دو عرب قبیلوں میں جنگ ہو گئی، طرفین کے بہت سے آدمی آزاد اور غلام مرد اور عورتیں قتل ہو گئے، ابھی ان کے معاملہ کا تصفیہ ہونے نہیں پایا تھا کہ زمانہ اسلام شروع ہو گیا، اور یہ دونوں قبیلے اسلام میں داخل ہو گئے، اسلام لانے کے بعد اپنے اپنے مقتولوں کا قصاص لینے کی گفتگو شروع ہوئی، تو ایک قبیلہ جو قوت و شوکت والا تھا، اس نے کہا کہ ہم اس وقت تک راضی نہ ہوں گے جب تک ہمارے غلام کے بدلے میں تمہارا آزاد آدمی اور عورت کے بدلے میں مرد قتل نہ کیا جائے۔

ان کے جہلانہ اور ظالمانہ مطالبہ کی تردید کرنے کیلئے آیت نازل ہوئی **الْحُرُّ بِالنَّحْرِ وَالْعَبْدُ بِالنَّحْرِ وَالْأَنْثَى** جس کا حاصل ان کے مطالبہ کو رد کرنا تھا کہ

غلام کے بدلے آزاد کو اور عورت کے بدلے مرد کو قتل کیا جائے اگرچہ وہ قاتل نہ ہو، اسلام نے اپنا عادلانہ قانون یہ نافذ کر دیا کہ جس نے قتل کیا ہے وہی قصاص میں قتل کیا جائے، اگر عورت قاتل ہے تو کسی بے گناہ مرد کو اس کے بدلے میں قتل کرنا اسی طرح قاتل اگر غلام ہے تو اس کے بدلے میں کسی بے گناہ آزاد کو قتل کرنا ظلم عظیم ہے، جو اسلام میں قطعاً برداشت نہیں کیا جاسکتا۔

اس سے معلوم ہوا کہ آیت کا حاصل اس کے سوا نہیں کہ جس نے قتل کیا ہے وہی قصاص میں قتل کیا جائے گا، عورت ہو یا غلام، قاتل عورت اور غلام کے بجائے بے گناہ مرد یا آزاد کو قتل کرنا جائز نہیں۔

آیت کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ عورت کوئی مرد قتل کرے یا غلام کو کوئی آزاد قتل کر دے تو اس سے قصص نہیں لیا جائے گا، مشرآن مجید کی اسی آیت کے شرع میں **أَنْقَصَاصٍ فِي الْقَتْلِ** اس عموم کی واضح دلیل ہے، اور دوسری آیات میں اس سے بھی زیادہ وضاحت ہے، مثلاً **أَنْفُسٌ بِالنَّفْسِ** وغیرہ۔

مسئلہ: اگر قاتل عہد میں قاتل کو پوری معافی دیدی جائے، مثلاً مقتول کے وارث صرف اس کے دوستوں سے، اور ان دونوں نے اپنا حق معاف کر دیا، تو قاتل پر کوئی مطالبہ نہیں رہا، اور اگر پوری معافی نہ ہو مثلاً صورت مذکورہ میں دو بیٹوں میں سے ایک نے معاف کیا دوسرے نے معاف نہیں کیا، تو سزا کے قصاص سے تو قاتل بری ہو گیا، لیکن معاف

ذکر نے والے کو نصف دیت (خونیا) دلایا جاوے گا، اور دیت یعنی خوں بہا شریعت میں سوانٹ یا ہزار دینار یا دس ہزار درہم ہوتے ہیں، اور درہم آجکل کے درجہ وزن کے اعتبار سے تقریباً ساڑھے تین ماشہ چاندی کا ہوتا ہے، تو پوری دیت دو ہزار نو سو سولہ تولے ۸ ماشہ چاندی ہوگی، یعنی ۳۶ سیر ۲۶ تولے ۸ ماشے۔

مسئلہ: جس طرح ناقص معافی سے مال واجب ہو جاتا ہے اسی طرح اگر باہم کسی قدر مال پر مصالحت ہو جائے تب بھی قصاص ساقط ہو کر مال واجب ہو جاتا ہے، لیکن اس میں کچھ شرائط ہیں جو کتب فقہ میں مذکور ہیں۔

مسئلہ: مقتول کے جتنے شرعی وارث ہیں وہی قصاص اور دیت کے مالک بقدر اپنے حصہ میراث کے ہوں گے، اگر دیت یعنی خوں بہا لیا گیا تو مال ان وارثوں میں بھٹا وراثت تقسیم ہوگا، اور قصاص کا فیملہ ہر حق قصاص کا حق بھی سب میں مشترک ہوگا، مگر چونکہ قصاص ناقابل تقسیم ہے، اس لئے کوئی اولیٰ درجہ کا حق رکھنے والا بھی اپنا حق قصاص معاف کر دیا تو دوسرے وارثوں کا حق قصاص بھی معاف ہو جائے گا، ہاں انکو دیت (خونیا) کی رقم حسب حصہ ملے گی۔

مسئلہ: قصاص لینے کا حق اگرچہ اولیاء مقتول کا ہے، مگر باجماع امت ان کو اپنا یہ حق خود وصول کرنے کا اختیار نہیں، کہ خود ہی قاتل کو مار ڈالیں بلکہ اس حق کے حاصل کرنے کے لئے حکم سلطان مسلم یا اس کے کسی نائب کا ضروری ہے، کیونکہ قصاص کس صورت میں واجب ہوتا ہے کس میں نہیں اس کی جسزئیات بھی دقیق ہیں جن کو ہر شخص معلوم نہیں کر سکتا، اس کے علاوہ اولیاء مقتول اپنے غصہ میں مغلوب ہو کر کوئی زیادتی بھی کر سکتے ہیں، اس لئے باتفاق علماء امت حق قصاص حاصل کرنے کے لئے اسلامی حکومت کی طرف رجوع کرنا ضروری ہے (قرطبی)

كُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ إِنْ تَرَكَ خَيْرًا

فرمان کیا گیا تم پر جب حاضر ہو کسی کو تم میں موت بشرطیکہ چھوڑے کچھ مال

الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ بِالْمَعْرُوفِ ۚ حَقًّا عَلَى

وصیت کرنا ان باپ کے واسطے اور رشتہ داروں کے لئے انصاف کے ساتھ یہ حکم لازم ہے

الْمُتَّقِينَ ۚ فَمَنْ بَدَّلَهُ بَعْدَ مَا سَمِعَكَ فَإِنَّمَا إِثْمُكَ عَلَى

پرہیزگاروں پر، پھر جو کوئی بدل ڈالے وصیت کو بعد اس کے کہ جو سن چکا تو اس کا گناہ اپنی پر

الَّذِينَ يَبْدِلُونَهُ إِنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿۱۸۸﴾ فَمَنْ خَافَ مِنْ مُّوْصٍ

ہے جنہوں نے اس کو بے لایک شریعت والا جاننے والا ہے ۔ پھر جو کوئی خوف کرے وصیت کرنے

جَنَافًا أَوْ إِثْمًا فَأَصْلَحَ بَيْنَهُمْ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ إِنَّ اللَّهَ

دالے سے طرفداری کا یگانہ کا پھر ان میں باہم صلح کرانے تو اس پر کچھ گناہ نہیں بیشک اللہ

غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿۱۸۹﴾

بڑا بخشنے والا نہایت مہربان ہو

رَبِطِ آيَاتٍ وَخُلَاصَةُ تَفْسِيرِ

حکم دوم از ابواب البتر وصیت ہر اس چیز کو کہا جاتا ہے جس کے کرنے کا حکم دیا جائے خواہ زندگی میں یا بعد الموت ، لیکن عرف میں اس کام کو کہا جاتا ہے جس کے کرنے کا حکم بعد الموت ہو۔

تحریر لفظ خیر کے بہت سے معانی میں سے ایک معنی مال کے بھی آتے ہیں ، جیسے قرآن میں ہے ، قُلْ إِنَّهُ يُحِبُّ الْخَيْرَ لَشَدِيدٌ (۸۱۱۰) اس جگہ اتفاق مفسرین خیر سے مراد مال ہے ۔ شروع اسلام میں جب تک میراث کے حقے شرع سے مقرر نہ ہوئے تھے ، حکم تھا کہ ترکہ کے ایک ثلث میں مرنے والا اپنے والدین اور دوسرے رشتہ داروں کے لئے جتنا جتنا مناسب سمجھے وصیت کر دے ، اتنا تو ان لوگوں کو حق تھا ، باقی جو کچھ رہتا وہ سب اولاد کا حق ہوتا تھا ، اس آیت میں یہ حکم مذکور ہو یعنی :-

تم پر فرض کیا جاتا ہے کہ جب کسی کو (آثار سے) موت نزدیک معلوم ہونے لگے بشرطیکہ کچھ مال بھی ترکہ میں چھوڑا ہو تو (اپنے) والدین اور دیگر اقارب کے لئے معقول طور پر (کہ مجموعہ ایک ثلث سے زیادہ نہ ہو) کچھ کچھ بتلا جائے (اس کا نام وصیت ہی) جن کو خدا کا خوف ہے ان کے ذمہ یہ ضروری دیکھا جاتا ہے ، پھر جن لوگوں نے اس وصیت کو سنا ہو ان میں سے جو شخص زہمی (سن لینے کے بعد اس کے مضمون) کو تبدیل کرے گا اور باہمی تقسیم و فیصلہ کے وقت غلط اظہار دے گا ، اور اس کے موافق فیصلہ ہونے سے کسی کا حق تلف ہو جاوے گا ، تو اس (حق تلفی) کا گناہ انہی لوگوں کو ہوگا جو اس (مضمون) کو تبدیل کریں گے (حاکم عدالت یا ثالث کو یا مرنے والے کو گناہ نہ ہوگا ، کیونکہ) اللہ تعالیٰ تو یقیناً سنا سنتے جانتے ہیں (تو تبدیل کرنے والے کے اظہار بھی سنتے ہیں اور حاکم کا بے خبر اور حذ در ہونا بھی جانتے ہیں) ، ہاں (ایک طرح کی

تبدیل کی اہازت بھی ہے وہ یہ کہ جس شخص کو وصیت کرنے والے کی جانب سے وصیت کے بارے میں کسی غلطی کی یا قصداً قانون وصیت کے کسی دفعہ کی خلاف ورزی کے کسی جرم کے ارتکاب کی تحقیق ہوئی ہو اور اس بے ضابطہ وصیت کی وجہ سے اس میت کے پسماندہ مستحقان ترکہ مستحقان مال وصیت میں نزاع کا خطرہ یا دفریق معلوم ہو) پھر یہ شخص ان میں باہم مصالحت کر لے (مگر وہ مصالحت اس مضمون وصیت کے خلاف ہو جو ظاہراً تبدیل وصیت ہی) تو اس شخص پر کوئی دباہ گناہ نہیں ہے (اور) واقعی اللہ تعالیٰ تو (خود گناہوں کے) مسامحت فرمانے والے ہیں اور دیکھنا کہ پرہیزگار مرنے والے ہیں اور اس شخص نے تو کوئی گناہ نہیں کیا کیونکہ وصیت میں تبدیلی اصلاح کے لئے کی ہو ، تو اس پر کیوں نہ رحمت ہوگی)

مَعَارِفُ مَسَائِلِ

اس آیت میں جو وصیت کرنا اس مرنے والے پر فرض کیا ہو جو کچھ مال چھوڑ کر مر رہا ہو اس حکم کے عین جسز ہیں ، ایک یہ کہ مرنے والے کے ترکہ میں اولاد کے سوا کسی دوسرے وارث کے حقے مقرر نہیں ہیں ، ان کے حصوں کا تعین مرنے والے کی وصیت کی بنیاد پر ہوگا ۔ دوسرے یہ کہ ایسے اقارب کے لئے وصیت کرنا مرنے والے پر فرض ہے ۔ تیسرے یہ کہ ایک تہائی مال سے زیادہ کی وصیت جائز نہیں ۔

ان تین احکام میں سے پہلا حکم تراکض صوابہ ونا بعینہ کے نزدیک آیت میراث سے منسوخ ہو گیا ، ابن کثیر نے تصحیح حاکم وغیرہ حضرت عبداللہ بن عباس سے نقل کیا ہے کہ اس حکم کو آیت میراث نے منسوخ کر دیا ، یعنی وَلِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ أَوْ كَثُرَ نَصِيبًا مَّفْرُوضًا (۴۱۴) اور حضرت عبداللہ بن عباس کی ایک دوسری روایت میں اس کی یہ تفصیل ہے کہ آیت میراث نے ان لوگوں کی وصیت کو منسوخ کر دیا جن کا میراث میں حصہ مقرر ہی ، دوسرے رشتہ دار جن کا میراث میں حصہ نہیں ، ان کے لئے حکم وصیت اب بھی باقی ہے (جصاص ، قرطبی) یہی باجماع امت یہ ظاہر ہے کہ جن رشتہ داروں کا میراث میں کوئی حصہ مقرر نہیں ، ان کے لئے میت پر وصیت کرنا کوئی فرض و لازم نہیں ، اس لئے فرضیت وصیت ان کے حق میں بھی منسوخ ہی ہوگی (جصاص ، قرطبی) یعنی بشرط ضرورت صرف مستحب رہ جائے گی ۔

دوسرا حکم وصیت کا فرض ہونا یہ بھی باجماع امت منسوخ ہے ، اور نسخ اس کا وہ شد متواتر ہے جس کا اعلان رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع

کے خطبہ میں تقریباً ڈیڑھ لاکھ صحابہ کے سامنے فرمایا۔

إِنَّ اللَّهَ أَعْطَىٰ كُلَّ نَفْسٍ بِحَسَنَتِهَا
فَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَىٰ ۚ
أُولَٰئِكَ الَّذِينَ يَدْعُونَ إِلَىٰ الْحَدِيثِ
حَسَنٌ صَحِيحٌ

اسی حدیث میں بروایت ابن عباسؓ یہ الفاظ بھی منقول ہیں:
لَا وَصِيَّةَ لِرَسُولٍ إِلَّا أَنْ
تُحْيِيَ نَفْسَهُ أَوْ رَحْمَةً
(جصاص)
اس لئے مصل اس حدیث کا یہ ہو کہ اللہ تعالیٰ نے داروں کے حصے خود مسترر
فرمادیے ہیں، اس لئے اسے وصیت کرنے کی ضرورت نہیں، بلکہ وارث کے حق میں وصیت
کرنے کی اجازت بھی نہیں، ہاں اگر دوسرے ورثہ اس وصیت کی اجازت دیدیں تو جائز ہے
امام جصاص نے فرمایا کہ یہ حدیث ایک جماعت صحابہؓ سے منقول ہے، اور فقہاء
امت نے باتفاق اس کو قبول کیا ہے، اس لئے بحکم متواتر ہے، جس سے آیت شریعت کا
نسخ جائز ہے۔

اور امام قرطبیؒ نے فرمایا کہ یہ بات علماء امت میں متفق علیہ ہو کہ جب کوئی حکم
رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانی یقیناً طور پر معلوم ہو جائے جیسے خبر متواتر مشہور وغیرہ
میں ہوتا ہے، تو وہ بالکل بحکم قرآن ہے، اور وہ بھی درحقیقت اللہ تعالیٰ ہی کا فرمان ہے،
اس لئے ایسی حدیث سے کسی آیت قرآن کا منسوخ ہو جانا کوئی محل شبہ نہیں، پھر سنایا
کہ اگرچہ یہ حدیث ہم تک خبر واحد ہی کے طریق پر پہنچی ہو، مگر اس کے ساتھ حجۃ الوداع کے
سب سے بڑے اجتماع میں ایک لاکھ سے زائد صحابہؓ کے سامنے اس کا اعلان فرمانا اور اس پر اجماع صحابہؓ
اور اجماع امت نے یہ واضح کر دیا کہ یہ حدیث ان حضرات کے نزدیک قطعی الثبوت ہے،
ورنہ شک و شبہ کی گنجائش ہوتے ہوئے اس کی وجہ سے آیت قرآن کے حکم کو چھوڑ کر اس پر
اجماع نہ کرتے۔

تیسرا حکم، وصیت ایک ہتائی
مال سے زیادہ کی جائز نہیں
یہ باتفاق امت اب بھی باقی ہے، ہاں وارثوں کی اجازت
سے ایک ہتائی سے زائد کی بلکہ پورے مال کی بھی وصیت
جائز اور قابل قبول ہے۔

تفصیل مذکور سے یہ واضح ہو چکا کہ اب جن رشتہ داروں کے حصے قرآن کریم نے
مسئلہ: خود مسترر کر دیئے ہیں ان کے لئے اب وصیت واجب نہیں، بلکہ ہر وارث
اجازت دوسرے وارثوں کے جائز بھی نہیں، البتہ جو رشتہ دار شرعی وارث نہیں ان کے لئے
وصیت کرنے کی اجازت ایک ہتائی مال تک ہو۔

مسئلہ: اس آیت میں ذکر ایک خاص وصیت کا تھا، جو مرنے والا اپنے مت و مکہ
مال کے متعلق کرتا تھا، جو منسوخ ہو گیا، لیکن جس شخص کے ذمے دوسرے لوگوں کے حقوق واجب
ہوں یا اس کے پاس کسی کی امانت رکھی ہو اس پر ان تمام چیزوں کی ادائیگی کے لئے وصیت
واجب ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں فرمایا کہ جس شخص کے ذمہ کچھ لوگوں
کے حقوق ہوں اس پر تین راتیں ایسی نہ گزرنی چاہئیں کہ اس کی وصیت لکھی ہوئی اس کے
پاس موجود نہ ہو۔

مسئلہ: آدمی کو جو ایک ہتائی مال میں وصیت کرنے کا حق دیا گیا ہے اپنی زندگی
میں اس کو یہ بھی حق رہتا ہے کہ اس وصیت میں کچھ تبدیلی کر دے یا بالکل ختم کر دے (جصاص)

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَىٰ

اے ایمان والو فرض کیا گیا تم پر روزہ جیسے فرض کیا گیا تھا تم سے

الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ﴿۱۸۴﴾ أَيَّامًا مَّعْدُودَاتٍ

انگوٹوں پر تاکہ تم پر ہنسنا کار ہو جاؤ، چند روز ہیں گنتی کے

فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِنْ أَيَّامٍ أُخَرَ

پھر جو کوئی تم میں سے بیمار ہو یا مسافر تو ان پر ان کی گنتی ہے اور دنوں سے

وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِينٍ فَمَنْ تَطَوَّعَ

اور جن کو طاقت ہے روزہ کی ان کے ذمہ بدلہ ہے ایک فقیر کا کھانا، پھر جو کون خوشی سے کرو

خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَهُ وَأَنْ تَصُومُوا خَيْرٌ لَّكُمْ إِنْ كُنْتُمْ

نیکی تو اچھا ہے اس کے واسطے اور روزہ رکھو تو بہتر ہے تمہارے لئے اگر تم

تَعْلَمُونَ ﴿۱۸۵﴾

سمجھ رکھتے ہو۔

خلاصہ تفسیر

حکمِ صوم

اے ایمان والو تم پر روزہ فرض کیا گیا جس طرح تم سے پہلے (امتوں کے) لوگوں پر فرض کیا گیا تھا، اس موقع پر کہ تم روزہ کی بدولت رفتہ رفتہ تقویٰ بن جاؤ (کیونکہ روزہ رکھنے سے عادت پڑے گی نفس کو اس کے متعدد تقاضوں سے روکنے کی اور اسی عادت کی پیشگی بنیاد تقویٰ کی سو) تھوڑے دنوں روزہ رکھ لیا کرو (ان تھوڑے دنوں سے مراد رمضان ہی، جیسا اگلی آیت میں آتا ہے) پھر اس میں بھی اتنی آسانی ہے کہ جو شخص تم میں (ایسا) پیار ہو (جس کو روزہ رکھنا مشکل یا مضر ہو) یا شرعی (سفر میں ہو تو) اس کو رمضان میں روزہ نہ رکھنے کی اجازت ہو، اور بجائے رمضان کے (دوسرا ایام کالاتناہی) شمار کر کے ان میں روزہ رکھنا (اس پر واجب) ہے، اور دوسری آسانی جو بعد میں منسوخ ہو گئی یہ کہ جو لوگ روزے کی طاقت رکھتے ہوں (اور پھر روزہ رکھنے کو دل نہ چاہو تو) ان کے ذمہ صرف روزے کا (فدیہ یعنی بدلہ) ہے کہ وہ ایک غریب کا کھانا (کھلا دینا یا دیدینا) ہے اور جو شخص خوش سے (زیادہ) خیر (خیرات) کرے (کہ زیادہ فدیہ دیدے) تو یہ اس شخص کے لئے اور بہتر ہے اور (مگر ہم نے آسانی کے لئے ان حالتوں میں روزہ نہ رکھنے کی اجازت دیدی ہے، لیکن تمھارا روزہ رکھنا اس حالت میں بھی زیادہ بہتر ہے اگر تم کچھ روزے کی فضیلت کی) خبر رکھتے ہو۔

معارف و مسائل

صوم کے لفظی معنی امساک یعنی نہ کھانے اور نہ پینے کے ہیں، اور اصطلاح شرع میں کھانے پینے اور عورت سے مباشرت کرنے سے نہ کھانے اور نہ پینے کا نام صوم ہے، بشرطیکہ وہ طلبِ حاجت صادق سے نہ کر غریب آفتاب تک مسلسل نہ کار ہو، اور نیت روزہ کی بھی ہو، اس لئے اگر غریب آفتاب تک ایک منٹ پہلے بھی کچھ کھانی لیا تو روزہ نہیں ہوا، اسی طرح اگر ان تمام چیزوں سے پرہیز تو پورے دن پوری احتیاط سے کیا، مگر نیت روزہ کی نہیں کی تو بھی روزہ نہیں ہوا۔

صوم یعنی روزہ ان عبادات میں سے ہے جن کو اسلام کے عہد اور شعائر قرار دیا گیا ہو، اس کے فضائل بے شمار ہیں جن کے تفصیلی بیان کا یہ موقع نہیں۔

پہلی امتوں میں روزہ کا حکم دیا گیا ہے، حکم کے ساتھ یہ بھی ذکر فرمایا کہ یہ روزے کی

فرضیت کچھ تھا جسے ساتھ خاص نہیں، پہلی امتوں پر بھی روزے فرض کئے گئے تھے، اس سے روزے کی خاص اہمیت بھی معلوم ہوتی، اور مسلمانوں کی دلچسپی کا بھی انتظام کیا گیا کہ روزہ اگرچہ مشقت کی چیز ہے، مگر یہ مشقت تم سے پہلے بھی سب لوگ اٹھاتے آئے ہیں، طبعی بات یہ کہ مشقت میں بہت سے لوگ مبتلا ہوں تو وہ بالکل معلوم ہونے لگتی ہے (روح المعانی) قرآن کریم کے الفاظ **الَّذِينَ يَتَّبِعُونَ قُلُوبَهُمْ** عام ہیں، حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم تک کی تمام شریعتوں اور امتوں کو شامل ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ جس طرح نماز کی عبادت سے کوئی مشریت اور کوئی امت خالی نہیں رہی اسی طرح روزہ بھی ہر شریعت میں فرض رہا ہے۔

جن حضرات نے فرمایا ہے کہ **مَنْ قَبِلَ كَفَّ** سے اس جگہ نصاریٰ مراد ہیں وہ بطور ایک مثال کے ہو، اس سے دوسری امتوں کی نفی نہیں ہوتی (روح)

آیت میں صرف اتنا بتلایا گیا ہے کہ روزے جس طرح مسلمانوں پر فرض کئے گئے پہلی امتوں میں بھی فرض کئے گئے، اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ پہلی امتوں کے روزے تمام حالات و صفات میں مسلمانوں ہی کے روزوں کے برابر ہوں، مثلاً روزوں کی تعداد، روزوں کے ارتقا کی تحدید، اور یہ کہ کن ایام میں رکھے جائیں، ان امور میں اختلاف ہو سکتا ہے، چنانچہ واقعہ بھی ایسا ہی ہوا کہ تعداد میں بھی کمی بیشی ہوتی رہی، اور روزے کے ایام اور اوقات میں فرق ہوتا رہا ہے (روح)

تَعْلَمُ تَعْلَمُونَ میں اشارہ ہے کہ تقویٰ کی قوت حاصل کرنے میں روزہ کو بڑا دخل ہے، کیونکہ روزہ سے اپنی خواہشات کو قابو میں رکھنے کا ایک ملکہ پیدا ہوتا ہے، وہی تقویٰ کی بنیاد ہے۔

مَرِيضٌ كَارِزٌ مریض کا روزہ مریض سے مراد وہ مریض ہے جس کو روزہ رکھنے سے ناقابل برداشت تکلیف پہنچے، یا مرض بڑھ جانے کا قری اندیشہ ہو، بعد کی آیت **وَلَا يَزِيدُ فِي كَمَرِ الْعُسْرِ** میں اس طرف اشارہ موجود ہے، مہجور فقہاء امت کا یہی مسلک ہے۔

مَسَافِرٌ كَارِزٌ مسافر کا روزہ مسافر کے بجائے علی سفر کا لفظ احتیاطاً فرمایا، کئی اہم مسائل کی طرف اشارہ فرمادیا:

اول یہ کہ مطلقاً لغوی سفر یعنی اپنے گھر اور وطن سے باہر نکل جانا روزہ میں رخصت سفر کے لئے کافی نہیں، بلکہ سفر کچھ طویل ہونا چاہئے، کیونکہ لفظ **سَفَرٌ** کا مفہوم یہ ہے کہ

وہ سفر پر سوار ہو جس سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ گھر سے دس پانچ میل چلے جانا مراد نہیں، مگر یہ تحدید کہ سفر کتنا طویل ہو قرآن کے الفاظ میں مذکور نہیں، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان اور صحابہ کے تعامل سے امام اعظم ابو حنیفہ اور بہت سے فقہاء نے اس کی مقدار تین منزل یعنی وہ مسافت جس کو پیادہ سفر کرنے والا آسانی میں روز میں طے کر سکے، قرار دی ہے، اور بعض کے فقہاء نے میلوں کے حساب سے اڑتالیس میل لکھے ہیں۔

دوسرا مسئلہ اسی لفظ علیٰ سفیر سے یہ نکلا کہ وطن سے نکل جانے والا مسافر اسی وقت تک رخصت سفر کا حق ہے جب تک اس کے سفر کا سلسلہ جاری ہے، اور یہ ظاہر ہے کہ آرام کرنے یا کچھ کام کرنے کے لئے کسی جگہ ٹھہر جانا مطلقاً اس کے سلسلہ سفر کو ختم نہیں کر دیتا، جب تک کوئی معتد بہ مقدار قیام نہ ہو، اور اسی معتد بہ قیام کی مدت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان سے ثابت ہوئی کہ پندرہ دن ہیں، جو شخص کسی ایک مقام پر پندرہ دن ٹھہرنے کی نیت کرے تو وہ علیٰ سفیر نہیں کہلاتا، اس لئے وہ رخصت سفر کا بھی مستحق نہیں۔ مسئلہ: اسی سے یہ بھی نکل آیا کہ کوئی شخص پندرہ دن کے قیام کی نیت ایک جگہ نہیں بلکہ متفرق مقامات شہروں اور بستیوں میں کرے تو وہ بدستور مسافر کے حکم میں رہ کر رخصت سفر کا حق رہے گا، کیونکہ وہ علیٰ سفیر کی حالت میں ہے۔

روزہ کی قضا قَوْلُهُ يَوْمَ آيَاتٍ أُخْرَىٰ یعنی مریض و مسافر کو اپنے فوت شدہ روزوں کی گنتی کے مطابق دوسرے دنوں میں روزے رکھنا واجب ہے اس میں بتلانا تو یہ منظور تھا کہ مریض یا سفر کی مجبوری سے جو روزے چھوڑے گئے ہیں ان کی قضا مان لوگوں پر واجب ہے جس کے لئے قَوْلُهُ يَوْمَ آيَاتٍ أُخْرَىٰ کا مختصر جملہ بھی کافی تھا، مگر اس کے بجائے قَوْلُهُ يَوْمَ آيَاتٍ أُخْرَىٰ سے مراد اشارہ کر دیا گیا کہ مریض و مسافر پر فوت شدہ روزوں کی قضا صرف اس صورت میں واجب ہوگی، جب کہ مریض صحت کے بعد اور مسافر معتمہ ہونے کے بعد اتنے دنوں کی ہمدت پائے، جنہیں قضا کر سکے، تو اگر کوئی شخص اتنے دن کے پہلے ہی مر گیا تو اس پر قضا یا وصیت فدیہ لازم نہیں ہوگی۔

مسئلہ: قَوْلُهُ يَوْمَ آيَاتٍ أُخْرَىٰ میں جو کہ اس کی کوئی قید نہیں کہ ترتیب وار رکھو، یا غیر مسلسل رکھے، بلکہ عام اختیاریہ، اس لئے اگر کوئی شخص جس کے رمضان کے ابتدائی دس روزے قضا ہو گئے ہوں وہ دسویں یا نویں روزے کی قضا پہلے کرے اور ابتدائی روزوں کی قضا بعد میں تو اس میں بھی مضائقہ نہیں، اسی طرح متفرق کر کے قضا روزے رکھے، تو یہ بھی جائز ہے، کیوں کہ قَوْلُهُ يَوْمَ آيَاتٍ أُخْرَىٰ میں اس کی گنجائش ہے۔

روزہ کا فدیہ

قَوْلُهُ الَّذِي يَنْتَظِرُ الْفَيْدَةَ، اس آیت کے بے تکلف معنی وہی ہیں جو خلاصہ تفسیر میں بتلائے گئے ہیں، کہ جو لوگ مریض یا مسافر کی طرح روزہ رکھنے سے مجبور نہیں بلکہ روزے کی طاقت تو رکھتے ہیں، مگر کسی وجہ سے دل نہیں چاہتا تو ان کے لئے بھی یہ گنجائش ہے کہ وہ روزے کے بجائے روزے کا فدیہ بصورت صدقہ ادا کر دیں، اسکے ساتھ اتنا فرما دیا کہ قَوْلُهُ مَنْ أَصْلَحَ لَكُمْ، یعنی تمہارے لئے بہتر یہی ہے کہ روزہ ہی رکھو۔ پر حکم شروع اسلام میں تھا جب لوگوں کو روزے کا خوگر کرنا مقصود تھا، اس کے بعد جو آیت آنے والی ہے یعنی مَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ، اس سے یہ حکم عام لوگوں کے حق میں منسوخ کر دیا گیا، صرف ایسے لوگوں کے حق میں اب بھی باجماع امت باقی رہ گیا جو بہت بوڑھے ہوں (جصاص) یا ایسے بیمار ہوں کہ اب صحت کی امید ہی نہیں رہی، جو پورے عمارت و تابعین کا یہی قول ہے (جصاص، منظری)۔

یحییٰ بخاری و مسلم و ابوداؤد، نسائی، ترمذی، طبرانی وغیرہ تمام ائمہ حدیث نے حضرت سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ جب یہ آیت قَوْلُهُ الَّذِي يَنْتَظِرُ الْفَيْدَةَ نازل ہوئی تو ہمیں خستیاں دیدیا گیا تھا کہ جس کا جی چاہے روزے رکھے جس کا جی چاہے ہر روزے کا فدیہ دیدے، پھر جب دوسری آیت مَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ نازل ہوئی تو یہ اختیار ختم ہو کر طاقت والوں پر صرف روزہ ہی رکھنا لازم ہو گیا۔

مسند احمد میں حضرت معاذ بن جبلؓ کی ایک طویل حدیث میں ہے کہ نماز کے معاملات میں بھی ابتدائے اسلام میں تین تغیرات ہوئے اور روزے کے معاملہ میں بھی تین تبدیلیاں ہوئیں، روزے کی تین تبدیلیاں یہ ہیں کہ:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ طیبہ میں تشریف لائے تو ہر مہینہ میں تین روزی اور ایک روزہ یوم عاشوراء یعنی دسویں محرم کا رکھتے تھے، پھر رمضان کی فرضیت نازل ہو گئی، گیتب تَحْلِيكُمْ الْعِيَّانُ تو حکم یہ تھا کہ ہر شخص کو خستیاں دے کہ روزہ رکھ لے یا فدیہ دیدے، اور روزہ رکھنا بہتر اور افضل ہے، پھر اللہ تعالیٰ نے دوسری آیت مَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ نازل فرمادی، اس آیت نے متندرست قوی کے لئے یہ اختیار ختم کر کے صرف روزہ رکھنا لازم کر دیا، مگر بہت بوڑھے آدمی کے لئے یہ حکم باقی رہا کہ وہ چاہے تو فدیہ ادا کر دے۔

یہ تو دو تبدیلیاں ہوئیں، تیسری تبدیلی یہ ہوئی کہ شروع میں افطار کے بعد کھانے پینے اور اپنی خواہش پورا کرنے کی اجازت صرف اس وقت تک تھی جب تک آدمی سوئے نہیں، جب سو گیا تو دوسرا روزہ شروع ہو گیا، کھانا پینا وغیرہ ممنوع ہو گیا، پھر اللہ تعالیٰ نے آیت

أَجِنَ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ الَّذِي نَازَلَ مِنْهُ مَا كَرِهَ آسَانِي عِلَافَرَادِي كَرِ الْكَلَمِ دَلِ كِي صَح
صَادِقِ كَمَا نَافِيَا وَغَيْرِهِ سَبَّ جَائِزِ هِيَ، سَوَكْرَ أَتْلُفْنِي كَعْبِدُ سَحَرِي كَحَانِي كُوَسْنَتِ قَسْرَارِ
وَيَدِيَا كَلِيَا، صَحِّحْ بَخَارِي، سَلَمُ الْبُورَادِ دَمِي هَبِي اسْ مَضْرُونِ كِي احَادِيثِ آتِي هِي (ابن كثير)

ایک روزہ کا فدیہ نصف صاع گندم یا اس کی قیمت ہے، نصف
فدیہ کی مقدار اور متعلقہ مسائل

کو مال کا نہ طور پر دیدینا ایک روزہ کا فدیہ ہے، بشرطیکہ کسی مجذوم کی خدمت کے عوارض پیش نہ ہوں۔
مسئلہ: ایک روزہ کے فدیہ کو دو آدمیوں میں تقسیم کرنا یا چند روزوں کے فدیہ کو
ایک ہی شخص کو ایک تاریخ میں دینا درست نہیں، جیسا کہ شامی نے بحوالہ بجزاز قنیہ نقل کیا ہے
اور بیان العشرین میں اس کو نقل کیا گیا ہے، مگر حضرت نے امداد الفتاویٰ میں فتویٰ اس پر نقل
کیا ہے کہ یہ دونوں صورتیں جائز ہیں، شامی نے بھی فتویٰ اس پر نقل کیا ہے، البتہ امداد الفتاویٰ
میں ہے کہ احتیاطاً اس میں ہے کہ کسی روزوں کا فدیہ ایک تاریخ میں ایک کو نہ دے، لیکن دیدینے
میں گنجائش بھی ہے، یہ فتویٰ مورخہ ۱۶ جمادی الاخریٰ ۱۳۵۳ھ امداد الفتاویٰ جلد دوم صفحہ ۱۵۰ میں منقول ہے
مسئلہ: اگر کسی کو فدیہ ادا کرنے کی بھی وسعت نہ ہو تو وہ فقط استغفار کرے اور
دل میں نیت رکھے کہ جب ہو سکے گا ادا کروں گا (بیان القرآن)

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي أُنْزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ هُدًى لِلنَّاسِ وَ

ہینہ رمضان کا ہے جس میں نازل ہوا قرآن ہدایت ہے واسطہ لوگوں کے

بَيِّنَاتٍ مِّنَ الْهُدَى وَالْفُرْقَانِ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ

اور دلیلیں روشنی راہ پلنے کی اور حق کو باطل سے جدا کرنے کی سوچ کوئی پائے تم میں سے اس ہینہ کو

فَلْيَصُمْهُ وَمَنْ كَانَ مَرِيضًا أَوْ عَلَى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ

تو ضرور فستے رکھے اس کے اور جو کوئی ہو بیمار یا مسافر تو اس کی گنتی پوری کرتی چاہئے اور

يُرِيدُ اللَّهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ

اللہ چاہتا ہے تم پر آسانی اور نہیں چاہتا تم پر دشواری اور اس واسطے کہ تم پوری کرو گنتی

وَلِتُكْمِلُوا اللَّهَ عَلَى مَا هَدَاكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ

اور تاکہ بڑائی کرو اللہ کی اس بات پر کہ تم کو ہدایت کی اور تاکہ تم احسان مانو۔

خلاصہ تفسیر اور ربط آیات

تعیین ایام صیام اور پرارشاد ہوا تھا کہ تھوڑے روزہ رکھ لیا کرو، آگے ان تھوڑے دنوں کا بیان ہے

روہ تھوڑے ایام جن میں روزے کا حکم ہوا ہے، ماہ رمضان ہی جس میں ایسی برکت ہے کہ اس کے ایک خاص حصہ یعنی شب قدر میں، قرآن مجید (لوح محفوظ سے آسان دنیا پر) بھیجا گیا ہے، جس کا ایک (وصف یہ ہے کہ لوگوں کے لئے ذریعہ) ہدایت ہے، اور (دوسرا وصف یہ ہے کہ) ہدایت کے طریقے بتلانے میں اس کا جزو جزو، واضح الدلالة ہے، اور ان دونوں وصفوں میں

منجملہ ان کتب (ساویہ) کے (ہے) جو کہ انہی دو وصفوں سے موصوف ہیں یعنی ذریعہ) ہدایت (بھی) ہیں اور (دوسرے) دلالت کی وجہ سے حق و باطل کے درمیان، فیصلہ کرنے والی (بھی) ہیں،

سو جو شخص اس ماہ میں موجود ہو اس کو ضرور اس میں روزہ رکھنا چاہئے (اور وہ فدیہ کی اجازت جو) اور پر مذکور تھی منسوخ و موقوف ہوئی) اور (مریض اور مسافر کے لئے جو ادا پر قانون تھا وہ البتہ

اب بھی اسی طرح باقی ہے کہ جو شخص (بیمار ہو) جس میں روزہ رکھنا مشکل یا مضرب ہو) یا (شرعی) سفر میں ہو تو اس کو رمضان میں روزہ نہ رکھنے کی اجازت ہے اور بجائے ایام رمضان

کے، (دوسرے ایام کا راتنا ہی) شمار کر کے ان میں روزہ رکھنا اس پر واجب ہے، اللہ تعالیٰ کو تمہارے ساتھ (احکام میں) آسانی (کی رعایت) کرنا منظور ہے (اس لئے ایسے احکام معسر

کئے جن کو تم آسانی سے بجالا سکو، چنانچہ سفر اور مرض میں کیسا آسان قانون مقرر کر دیا، اور تمہارے ساتھ احکام و قوانین مقرر کرنے میں) دشواری منظور نہیں (کہ سخت احکام بخیر کر دیتے) اور

یہ احکام مذکورہ ہم نے خاص خاص مصلحتوں سے مقرر کئے، چنانچہ اولاً روزہ ادا رکھنے کا اور

کسی شرعی عذر سے وہ جاری ہے تو دوسرے ایام میں قضا کرنے کا حکم تو اس لئے کیا، تاکہ تم لوگ (ایام ادا یا قضا کی) شمار کی تکمیل کر لیا کرو، (تاکہ ثواب میں کمی نہ رہے) اور (خود قضا رکھنے کا

حکم اس لئے کیا، تاکہ تم لوگ اللہ تعالیٰ کی بزرگی (اور ثناء) بیان کیا کرو اس پر کہ تم کو (ایک ایسا) طریقہ بتلا دیا (جس سے تم برکات و منکرات صیام سے محروم نہ رہو، ورنہ اگر قضا

واجب نہ ہوتی تو کون اتنے روزے رکھ کر ثواب حاصل کرتا، اور (عذر سے خاص رمضان میں روزہ نہ رکھنے کی اجازت اس لئے دیدی) تاکہ تم لوگ (اس نعمت آسانی پر اللہ تعالیٰ کا) شکر

ادا کیا کرو (ورنہ اگر یہ اجازت نہ ہوتی تو سخت مشقت ہو جاتی)

معارف و مسائل

اس آیت میں پچھلی جمل آیت کا بیان بھی ہے اور ماہ رمضان کی اعلیٰ فضیلت کا ذکر بھی بیان اس لئے کہ پچھلی آیات میں آیات ثانیہ کا لفظ بھل ہے جس کی شرح اس آیت نے کر دی کہ وہ پورے ماہ رمضان کے ایام ہیں، اور فضیلت یہ بیان کی گئی کہ اللہ تعالیٰ نے اس مہینہ کو اپنی دہی اور آسانی کتابیں نازل کرنے کے لئے منتخب کر رکھا ہے، چنانچہ قرآن بھی اسی ماہ میں نازل ہوا، مسند احمد میں حضرت دائرہ بن قیس سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے صحیفے رمضان کی پہلی تاریخ میں نازل ہوئے، اور تورات چھ رمضان میں، انجیل تیرہ رمضان اور قرآن چوبیس رمضان میں نازل ہوا، اور حضرت جابرؓ کی روایت میں یہ بھی ہے کہ زبور بارہ رمضان میں، انجیل اٹھارہ رمضان میں نازل ہوئی (ابن کثیر)

حدیث مذکور میں پچھلی کتابوں کا نزول جس تاریخ میں ذکر کیا گیا ہے اسی تاریخ میں وہ کتابیں پوری کی پوری انبیاء پر نازل کر دی گئی ہیں، قرآن کریم کی یہ خصوصیت ہے کہ یہ رمضان کی ایک رات میں پورا کا پورا لوح محفوظ سے سا بنیاد پر نازل کر دیا گیا، مگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر اس کا نزول تینیس سال میں رفتہ رفتہ ہوا۔

رمضان کی وہ رات جس میں قرآن نازل ہوا قرآن ہی کی تصریح کے مطابق شقیہ تھی **إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةِ الْقَدْرِ**، مذکور الصدر حدیث میں اس کو ۲۳ رمضان کی شب بتلایا ہے، اور حضرت حسنؓ کے نزدیک چوبیسویں شب شب قدر ہوتی ہے، اس طرح یہ حدیث آیت قرآن کے مطابق ہو جاتی ہے، اور اگر یہ مطابقت نہ تسلیم کی جائے تو بہر حال قرآن کریم کی تصریح سب پر مقدم ہے جو رات بھی شب قدر ہو وہی اس کی مراد ہوگی۔

مَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ۔ اس ایک جملہ میں روزے کے متعلق بہت سے احکام و مسائل کی طرف اشارات ہیں، لفظ شہد شہد شہد سے بنا ہے، جس کے معنی حضور یعنی حاضر و موجود ہونے کے ہیں، اور اللہ ہی عربی لغت میں مہینہ کے معنی میں آتا ہے، مراد اس سے مہینہ رمضان کا ہے، جس کا ذکر اوپر آیا ہے، اس لئے معنی اس جملے کے یہ ہو گئے کہ تم میں سے جو شخص ماہ رمضان میں حاضر یعنی موجود ہو اس پر لازم ہے کہ پورے مہینے کے روزے رکھے،

روزہ کے بجائے فدیہ دینے کا عام اختیار جو اس سے پہلی آیت میں مذکور ہے اس جملے نے ملحوظ کر کے روزہ ہی رکھنا لازم کر دیا ہے۔

ماہ رمضان میں حاضر و موجود ہونے کا مفہوم یہی ہے کہ وہ ماہ رمضان کو ایسی حالت میں پاس کرے کہ اس میں روزہ رکھنے کی صلاحیت موجود ہو یعنی مسلمان، عاقل، بالغ، مقیم، حیض و نفاس سے پاک ہو۔

اسی لئے جس شخص کا پورا رمضان ایسی حالت میں گزر گیا کہ اس میں روزہ رکھنے کی مطلق صلاحیت ہی نہیں جیسے کافر، نابالغ، مجنون، توہر لوگ اس حکم کے مخاطب ہی نہیں، اس لئے ان پر گزشتہ رمضان کے روزے فرض ہی نہیں ہوئے، اور جن میں صلاحیت ذاتی طور پر موجود ہو مگر کسی وقت عذر کی وجہ سے مجبور ہو گئے، جیسے حیض و نفاس والی عورت یا مریض اور مسافر، قرآن میں نے ایک چثیت سے ماہ رمضان بمثلت صلاحیت پایا، اس لئے حکم آیت کا ان کے حق میں ثابت ہو گیا، مگر وقتی عذر کے سبب اس وقت روزہ معاف ہے، البتہ بعد میں قضاء لازم ہے، جیسا کہ اس کے بعد تفصیل آئے گی۔

مسئلہ: اس آیت سے معلوم ہوا کہ رمضان کے روزے فرض ہونے کے لئے ماہ رمضان کا بمثلت صلاحیت پالینا شرط ہے، اس لئے جس نے پورا رمضان پالیا اس پر پورے رمضان کے روزے فرض ہو گئے، جس نے کچھ کم پایا اس پر اتنے ہی دن کے روزے فرض ہو کر جتنے دن رمضان کے پاسے، اس لئے وسط رمضان میں جو کافر مسلمان ہوا یا نابالغ بالغ ہوا اس پر صرف آٹھ دن کے روزے لازم ہوں گے، گزشتہ ایام رمضان کی قضاء لازم نہ ہوگی، البتہ مجنون مسلمان اور بالغ ہونے کے اعتبار سے ذاتی صلاحیت رکھتا ہے، وہ اگر رمضان کے کسی حصہ میں ہوش میں آجائے تو گزشتہ ایام رمضان کی قضاء بھی اس پر لازم ہو جائے گی، اسی طرح حیض و نفاس والی عورت، وسط رمضان میں پاک ہو جائے یا مریض تندرست ہو جائے یا مسافر مقیم ہو جائے تو گزشتہ ایام کی قضاء لازم ہوگی۔

مسئلہ: ماہ رمضان کا پالینا شرعاً عین طریقوں سے ثابت ہوتا ہے، ایک یہ کہ خود رمضان کا پاند دیکھ لے، دوسرے یہ کہ کسی معتبر شہادت سے چاند دیکھنا ثابت ہو جائے، اور جب یہ دونوں صورتیں نہ پائی جائیں تو شعبان کے تیس روز پورے کرنے کے بعد ماہ رمضان شروع ہو جائے گا۔

مسئلہ: شعبان کی انیسویں تاریخ کی شام کو اگر بار و غیرہ کے سبب چاند نظر نہ آئے اور کوئی شرعی شہادت بھی چاند دیکھنے کی نہ پہنچے تو اگلے روز یوم الشک کہلاتا ہے، کیونکہ

اُس میں یہ بھی احتمال ہے کہ حقیقت چاند ہو گیا ہو، مگر مطلع صاف نہ ہونے کی وجہ سے نظر نہ آیا ہو، اور یہ بھی ممکن ہو کہ آج چاند ہی مطلع پر نہ آیا ہو، اُس روز میں چونکہ شہر یعنی رمضان کا پالینا صادق نہیں آتا، اس لئے اُس دن کا روزہ رکھنا واجب نہیں بلکہ مکروہ ہے، حدیث میں اس کی مانعت آئی ہے تاکہ فرض اور نفل میں اختلاط اور استباس نہ پیدا ہو جائے (رجصاص)

مسئلہ: جن ملکوں میں رات دن کئی کئی مہینوں کے طویل ہوتے ہیں وہاں شہر کہ یعنی رمضان کا پالینا بظاہر صادق نہیں آتا، اس کا معنی یہ ہے کہ اُن پر روزے فرض نہیں ہوں، فقہائے حنفیہ میں سے حلوئی اور قبائی وغیرہ نے نماز کے متعلق قواسی پر فتویٰ دیا ہے کہ ان لوگوں پر اپنے ہی دن رات کے اعتبار سے نماز کا حکم عائد ہو گا، مثلاً جس ملک میں مغرب کے فوراً بعد صبح صادق ہو جاتی ہے وہاں نماز عشاء فرض ہی نہیں دشائی، اس کا معنی یہ ہو کہ جہاں چھ مہینے کا دن ہو وہاں چھ مہینے میں صرف پانچ نمازیں ہوں گی اور رمضان وہاں آئے گا ہی نہیں، اس لئے روزے بھی فرض نہ ہوں گے، حضرت حکیم الامت تھانویؒ نے ادا والفتاویٰ میں روزے کے متعلق اسی قول کو اختیار فرمایا ہے۔

مَنْ كَانَ مِنْكُمْ غَيْرَ مُعْتَادًا عَلَى شَيْءٍ مِنْ آيَاتِ الْحَجَرِ، اس میں مریض اور مسافر کو رخصت دی گئی ہے کہ وہ اُس وقت روزہ نہ رکھیں، تندرستی ہونے پر اور سفر ختم ہونے پر اتنے دنوں کی قضاء کر لیں، یہ حکم اگرچہ پچھلی آیت میں بھی آچکا تھا، مگر جب اس آیت میں روزہ کے بجائے ذبیہ دینے کا اختیار منسوخ کیا گیا ہے تو یہ شبہ ہو سکتا تھا کہ شاید مریض اور مسافر کی رخصت بھی منسوخ ہو گئی ہو اس لئے دوبارہ اس کا اعادہ کر دیا گیا۔

وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِي عَنِّي فَإِنِّي قَرِيبٌ ۚ أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ

اور جب تم سے بد چھیں میرے بندے مجھ کو میں تو قریب ہوں قبول کرتا ہوں مارا گئے والے کی دعا

إِذَا دَعَا ۚ فَلَيْسَ جَلِيلٌ أَلِيٌّ وَلِيُوْمِنُوْا بِآيَاتِ الْحَقِّ ۚ

جبکہ سے دعا مانگے تو چاہئے کہ وہ حکم مابین میرا اور یقین لائیں مجھ پر تاکہ ایک راہ پر آئیں۔

خلاصہ تفسیر مع ربط آیات

پچھلی تین آیتوں میں روزہ اور رمضان کے احکام اور فضائل کا ذکر تھا، اور اس کے

بعد بھی ایک طویل آیت میں روزہ اور اعتکاف کے احکام کی تفصیل ہو، درمیان کی اس مختصر آیت میں بندوں کے حال پر حق تعالیٰ کی خاص عنایت، ان کی دعائیں سننے اور قبول کرنے کا ذکر و نشر اور اطاعت احکام کی ترغیب دی گئی ہے، کیونکہ روزہ کی عبادت میں رخصتوں اور سہولتوں کے باوجود کسی قدر مشقت ہے، اس کو سہل کرنے کے لئے اپنی مخصوص عنایت کا ذکر فرمایا کہ میں اپنے بندوں سے قریب ہی ہوں جب بھی وہ دعا مانگتے ہیں میں اُن کی دعائیں قبول کرتا ہوں اور ان کی حاجات کو پورا کر دیتا ہوں۔

ان حالات میں بندوں کو بھی چاہئے کہ میرے احکام کی تعمیل میں کچھ مشقت بھی ہو تو برداشت کریں، اور امام ابن کثیرؒ نے اس درمیان جملہ ترغیب دعا کی یہ حکمت بتلائی ہے کہ اس آیت نے اشارہ کر دیا کہ روزہ کے بعد دعا قبول ہوتی ہے، اس لئے دعا کا خاص اہتمام کرنا چاہئے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

إِنَّمَا بَشَرٌ عَشِيٌّ فُطِرَ بِدَعْوَةٍ ۖ
مُسْتَجَابَةٍ ۖ (ابوداؤد طحاوی)

یعنی روزہ افطار کرنے کے وقت روزہ کی دعا مقبول ہے۔

بروایت عبد اللہ بن عمرؓ
اسی لئے حضرت عبد اللہ بن عمرؓ افطار کے وقت سب گھر والوں کو جمع کر کے دعا کیا کرتے تھے تفسیر آیت کی یہ ہے:

اور ولے محمد صلی اللہ علیہ وسلم جب آپ سے میرے بندے میرے متعلق دریافت کریں تو میں ان سے قریب ہوں یا دور (تو میری طرف سے اُن سے فرما دیجئے کہ) میں قریب ہی ہوں اور یا مستثناء نامناسب درخواست کے منظور کر لیتا ہوں (ہر عرضی درخواست کرنے والے کی جب کہ وہ میرے حضور میں درخواست ہے، سو جس طرح میں اُن کی عرض محروض کو منظور کر لیتا ہوں) ان کو چاہئے کہ میرے احکام کو (بجا آوری کے ساتھ) قبول کیا کریں اور چونکہ ان احکام میں کوئی حکم نامناسب نہیں اس لئے اس میں استثناء ممکن نہیں) اور مجھ پر یقین رکھیں (یعنی میری ہستی پر بھی میرے حاکم ہونے پر بھی مجھ پر اور رحمت و مصالح پر بھی اس طرح) امید ہو کہ وہ لوگ رشد و فلاح حاصل کر سکیں گے۔

مسئلہ: اس آیت میں (إِنِّي قَرِيبٌ) فرما کر اس طرف بھی اشارہ کر دیا کہ دعا مانگنا آسان اور خفیہ کرنا چاہئے، دعا میں آواز بلند کرنا پسند نہیں، ابن کثیرؒ نے آیت کا شان نزول یہی ذکر کیا ہے کہ کبھی گاؤں والے نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ ہمارا رب اگر ہم سے قریب ہو تو ہم دعا آہستہ آواز سے مانگا کریں، اور وہ تو بلند آواز سے پکارا کریں اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

أَحِلَّ لَكُمْ كَيْلََةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ إِلَى نِسَائِكُمْ هُنَّ لِبَاسٌ لَكُمْ

حلال ہوا تم کو روزہ کی رات میں بے حجاب ہونا اپنی عورتوں سے وہ پوشاک ہیں تمہاری

وَأَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ مَا عَلِمَ اللَّهُ أَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُون أَنْفُسَكُمْ

اور تم پوشاک ہو ان کی اللہ کو معلوم ہو کہ تم خیانت کرتے تھے اپنی جانوں سے

فَقَاتِبْ عَلَيْكُمْ وَعَفَا عَنْكُمْ فَالْآنَ بَاشِرُوهُنَّ وَابْتَغُوا مِمَّا كَتَبَ

سرمعات کیا تم کو اور درگزر کی تم سے پھر ملو اپنی عورتوں سے اور طلب کرو اس کو جو لکھ دیا ہو

اللَّهُ لَكُمْ مِمَّا كُنْتُمْ تُكْفِرُونَ وَأَشْرَبُوا حَتَّى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْأَبْيَضُ

اللہ نے تمہارے لئے اور کھاؤ اور پیاؤ جب تک کہ صاف نظر آئے تم کو دھاری صبح کی جدا دھاری

مِنَ الْخَيْطِ الْأَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ثُمَّ أَتُمُوا الصِّيَامَ إِلَى الْاِيلِ

سیاہ سے پھر پورا کرو روزہ کو رات تک

وَلَا بَاشِرُوهُنَّ وَأَنْتُمْ عَاكِفُونَ فِي الْمَسَاجِدِ تِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ

اور نہ ملو عورتوں سے جب تک کہ تم اعتکاف کرو مسجدوں میں یہ حدیں باندھیں ہوئی ہیں اللہ کی

فَلَا تَقْرَبُوهَا كَذَلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ آيَاتِهِ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ

سو ان کے نزدیک نہ جاؤ اسی طرح بیان فرماتا ہے اللہ اپنی آیتیں لوگوں کے واسطے تاکہ وہ بچے رہیں

خلاصہ تفسیر

حکم چہارم، رمضان کی راتوں میں جماع | اس آیت میں روزہ کے بقیہ احکام کی کچھ تفسیر مذکور ہے

تم لوگوں کے واسطے روزہ کی شب میں اپنی بیویوں

سے مشغول ہونا حلال کر دیا گیا اور پہلے جو اس سے مانعت تھی وہ موقوف کی گئی (کیونکہ بوجہ قرب و اتصال

کے وہ تمہارے (بھائے) اور بھینے سمجھنے کے) ہیں اور تم ان کے (بھائے) اور بھینے سمجھنے کے) ہو، اللہ تعالیٰ

کو اس کی خبر تھی کہ تم (اس علم انہی میں) خیانت (کر) کے گناہ میں اپنے کو مبتلا کر رہے تھے (مگر) خیر (جب

تم معذرت سے پیش آئے تو) اللہ تعالیٰ نے تم پر عنایت نسمائی اور تم سے گناہ کو دھو دیا، سو

(جب اجازت ہو گئی تو) اب ان سے ملو ملاؤ اور جو (قانون اجازت) تمہارے لئے تجویز کر دیا ہو

(بے تکلف) اس کا سامان کرو اور (جس طرح شب صیام میں بی بی سے ہمبستری کی اجازت ہو

اسی طرح یہ بھی اجازت ہو کہ تمام رات میں جب چاہو) کھاؤ (بھی) اور پیو (بھی) اس وقت تک

کہ صبح کو سفید خط صبح (صادق کی روشنی) کا متمیز ہو جاوے سیاہ خط سے (یعنی رات کی تاریکی سے)

تو پھر (صبح صادق سے) رات (آگے) تک روزہ کو پورا کیا کرو۔

صبح کی سفیدی کا سفید خط رات کی تاریکی کے سیاہ خط سے متمیز ہو جانے سے مراد یہ ہے

کہ صبح صادق یقینی طور سے ثابت ہو جائے۔

اور ان بیبیوں کے بدن سے اپنا بدن بھی (شہوت کے ساتھ) مت ملنے

دو جس زمانے میں کہ تم لوگ اعتکاف والے ہو (جو کہ) مسجدوں میں

(ہوا کرتا ہے) یہ سب احکام مذکورہ) خداوندی ضابطے ہیں، سو ان (ضابطوں) سے (بچنا تو کیسا)

بچنے کے نزدیک بھی مت ہونا (اور جس طرح اللہ تعالیٰ نے یہ احکام بیان کئے ہیں) اسی طرح

اللہ تعالیٰ اپنے (اور) احکام (بھی) لوگوں (کی اصلاح) کے واسطے بیان فرمایا کرتے ہیں، اس

امید پر کہ وہ لوگ احکام پر مطلع ہو کر ان احکام کے خلاف نہ کریں گے) پر مبنی رکھیں۔

معارف و مسائل

أَحِلَّ لَكُمْ کے لفظ سے معلوم ہوا کہ جو چیز اس آیت کے ذریعہ حلال کی گئی ہے وہ

اس سے پہلے حرام تھی، صبح بخاری وغیرہ میں بروایت براہ بن عازب مذکور ہے کہ ابتداء میں

جب رمضان کے روزے فرض کئے گئے تو انظار کے بعد کھانے پینے اور بیبیوں کے ساتھ

اختلاط کی صرف اُس وقت تک اجازت تھی جب تک سو نہ جاتے، سو جانے کے بعد یہ سب

چیزیں حرام ہو جاتی تھیں، بعض صحابہ کرام کو اس میں مشکلات پیش آئیں، قیس بن صرمہ انصاری

دن بھر مزدوری کر کے انظار کے وقت گھر پہنچے تو گھر میں کھانے کے لئے کچھ نہ تھا، پوری نے

کہا کہ میں کہیں سے کچھ انتظام کر کے لاتی ہوں جب وہ واپس آئی تو دن بھر کے بھوکے بچوں کی وجہ سے

ان کی آنکھ لگ گئی، اب بیدار ہوئے تو کھانا حرام ہو چکا تھا، اگلے دن اسی طرح روزہ رکھا،

دو پہر کو ضعف سے بیہوش ہو گئے، (ابن کثیر) اسی طرح بعض صحابہ سونے کے بعد اپنی بیبیوں

کے ساتھ اختلاط میں مبتلا ہو کر پریشان ہوئے، ان واقعات کے بعد یہ آیت نازل ہوئی

جس میں پہلا حکم منسوخ کر کے غروب آفتاب کے بعد سے طلوع صبح صادق تک پوری رات

میں کھانے پینے اور مباشرت کی اجازت دیدی گئی، اگرچہ پورا کھانے کے بعد ہو، بلکہ سو کر اٹھنے

کے بعد آخر شب میں سحری کھانا سنت قرار دیا گیا، جس کا ذکر روایات حدیث میں واضح ہے، اس آیت میں اسی حکم کا بیان کیا گیا ہے۔

رُفَعَ کے لفظی معنی اگرچہ عام ہیں، ایک مرد بی بی سے اپنی خواہش پر ادا کرنے کے لئے جو کچھ کرنا چاہتا ہے وہ سب اس میں شامل ہے لیکن اتفاقاً سنت اس جگہ اس سے مراد چھٹا شربت احکام شروع کرنے کے لئے اس آیت نے جس حکم کو منسوخ کیا ہے، یعنی سو جانے کے بعد کھانے، پینے وغیرہ کی حرمت کو، یہ حکم شترآن میں کہیں مذکور نہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تعلیم سے صحابہ کرام اس حکم پر عمل کرتے تھے، ان کا وہ احادیث، ان کی اس آیت پر عمل کی قرار دیکر منسوخ کیا اس آیت میں پہلے حکم کو حکم ابھی شترآر دیا گیا، اور پھر آسانی کے لئے اس کو منسوخ کیا گیا، اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ سنت سے ثابت شدہ بعض احکام کو قرآن کے ذریعہ بھی منسوخ کیا جاسکتا ہے۔ (بعض خاص وغیرہ)

سحری کھانے کا آخری وقت

تحقیق یتبیین نکھڑ الفیظ الک فیض، اس آیت میں رات کی تاریکی کو سیاہ خط اور صبح کی روشنی کو سفید خط کی مثال سے بتلا کر روزہ شروع ہونے اور کھانا پینا حرام ہو جانے کا صحیح وقت متعین فرما دیا، اور اس میں افراط و تفریط کے احتمالات کو ختم کرنے کے لئے تحقیق یتبیین کا لفظ بڑھا دیا جس میں یہ بتلایا گیا ہے کہ نہ تو وہی مزاج لوگوں کی طرح صبح صادق سے کچھ پہلے ہی کھانے پینے وغیرہ کو حرام سمجھو، اور نہ ایسی بے فکری اختیار کر دو کہ صبح کی روشنی کا یقین ہو جانے کے بعد جو کھانا پیتے رہو، بلکہ کھانے پینے اور روزہ کے درمیان حد فاصل صبح صادق کا یقین ہے، اس یقین سے پہلے کھانے پینے کو حرام سمجھنا درست نہیں، اور یقین کے بعد کھانے پینے میں مشغول رہنا بھی حرام اور روزے کے لئے مفسد ہے، اگرچہ ایک ہی منٹ کے لئے ہو، سحری کھانے میں وسعت اور عجائز صرف اسی وقت تک ہر جب تک صبح صادق کا یقین نہ ہو، بعض صحابہ کرام کے ایسے واقعات کو بعض کہنے والوں نے اس طرح بیان کیا کہ سحری کھاتے ہوئے صبح ہو گئی اور وہ بے پردائی سے کھاتے رہے، یا اسی پر مبنی تھا کہ صبح کا یقین نہیں ہوا تھا اس لئے کہنے والوں کی جلد بازی سے متاثر نہیں ہوئے۔

ایک حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ حضرت بلالؓ کی اذان تمہیں سحری کھانے سے مانع نہ ہونی چاہئے، کیونکہ وہ رات سے اذان دیدیتے ہیں، اس لئے تم بلالؓ کی اذان سنکر بھی اُس وقت تک کھاتے پیتے رہو جب تک اہل تم کو سحری کی اذان نہ سنو، کیونکہ وہ ٹھیک طلوع صبح صادق پر اذان دیتے ہیں (بخاری و مسلم)

اس حدیث کے ناتمام نقل کرنے سے بعض معاصرین کو یہ غلط فہمی پیدا ہو گئی کہ اذان فجر کے بعد بھی کچھ دیر کھایا پیا جائے تو مضائقہ نہیں، اور جس شخص کی آنکھ دیر میں کھلی کہ صبح کی اذان ہو رہی تھی اس کے لئے جائز کر دیا کہ وہ جلدی جلدی کچھ کھالے، حالانکہ اسی حدیث میں واضح طور پر بتلادیا گیا ہے کہ اذان ابن ام مکتومؓ جو ٹھیک طلوع فجر کے ساتھ ہوتی تھی اس پر کھانے سے رک جانا ضروری ہے، اس کے علاوہ شترآن کریم نے خود جو حد بندی فرمادی ہے وہ طلوع صبح کا یقین پر اس کے بعد ایک منٹ کے لئے بھی کھالے پینے کی اجازت دینا نص شترآن کی خلاف ورزی ہوا صحابہ کرامؓ اور اسلاف امت سے جو افطار و سحری مسابقت کی روایات منقول ہیں ان سب کا عمل نص شترآن کے مطابق ہی ہو سکتا ہے کہ یقین صبح صادق سے پہلے زیادہ احتیاطی تنگی اختیار نہ کی جائے، امام ابن کثیرؒ نے بھی ان روایات کو اسی بات پر محمول فرمایا ہے، ورنہ نص شترآنی کی صریح مخالفت کو کون مسلمان برداشت کر سکتا ہے، اور صحابہ کرامؓ سے تو اس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا خصوصاً جبکہ قرآن کریم نے اسی آیت کے اخیر میں تِلَاقُ لَحْنٍ ذِکْرُ اللّٰهِ کے ساتھ فَلَا تَقْرَءُوهَا فرما کر خاص احتیاط کی تاکید بھی فرمادی ہے۔

مسئلہ: یہ سب کلام ان لوگوں کے بارے میں ہے جو ایسے مقام پر ہیں جہاں سے صبح صادق کو ہمیشہ خود دیکھ کر یقین حاصل کر سکتے ہیں، اور مطلع بھی صاف ہے، اور وہ صبح صادق کی ابتدائی روشنی کی پہچان بھی رکھتے ہیں، تو ان کو لازم ہے کہ براہ راست افق کو دیکھ کر عمل کریں، اور جہاں یہ صورت نہ ہو مثلاً کھلا ہوا افق سامنے نہیں یا مطلع صاف نہیں، یا اس کو صبح صادق کی پہچان نہیں، اس لئے وہ دوسرے آثار و علامات یا ریاضی حسابات کے ذریعہ وقت کا تعین کرتے ہیں، ظاہر ہے کہ ان کے لئے کچھ وقت ایسا کئے گا کہ صبح صادق کا ہو جانا مشکوک ہو یقین نہ ہو، ایسے لوگوں کو مشکوک حالت میں کیا کرنا چاہئے، اس کے متعلق امام جصاصؒ نے احکام القرآن میں فرمایا کہ اس حالت میں اصل تو یہی ہے کہ کھانے پینے پر اقدام نہ کرے، لیکن مشکوک حالت میں صبح صادق کا یقین ہونے سے پہلے پہلے کسی نے کچھ کھالی لیا تو گناہگار نہیں ہوگا، لیکن اگر بعد میں تحقیق سے یہ ثابت ہو گیا کہ اُس وقت صبح ہو چکی تھی تو قضاء اس کے ذمہ لازم ہے، جیسے شروع رمضان میں چاند نظر نہ آیا اور لوگوں نے روزہ نہیں رکھا، مگر بعد میں شہادت سے ۲۹ کا چاند ثابت ہو گیا، تو جن لوگوں نے اس دن کو شعبان کی تیسویں تاریخ سمجھ کر روزہ نہیں رکھا تھا، وہ گناہگار تو نہیں ہوئے، مگر اس روزے کی قضاء ان پر باقائ لازم ہے، اس طرح بادل کے دن میں غروب کے گمان پر روزہ افطار کر لیا، بعد میں آفتاب نکل آیا، تو یہ شخص گناہگار تو نہیں مگر قضاء اس پر واجب ہے۔

امام جصاصؒ کے اس بیان سے یہ بات واضح ہو گئی کہ جس شخص کی آنکھ دیر میں کھلی اور عام طور پر صبح کی اذان ہوئی تھی جس سے صبح ہونے کا یقین لازمی ہے، وہ جان بوجھ کر اس وقت کچھ کھینکا تو وہ گناہگار بھی ہوگا اور قضا بھی اس پر لازم ہوگی، اور مشک کو ک حالت میں کھائے گا تو گناہ قسط ہو جائے گا، مگر قضا ساقط نہ ہوگی، اور کسی نہ کسی درجہ میں کراہت بھی ہوگی۔

اعتکاف اور اعتکاف کے لغوی معنی کسی جگہ ٹھہرنے کے ہیں، اور اصطلاح قرآن و سنت اس کے مسائل میں خاص شرائط کے ساتھ مسجد میں ٹھہرنے اور قیام کرنے کا نام اعتکاف ہے، لفظی التماسی کے عموم سے ثابت ہوا کہ اعتکاف ہر مسجد میں ہو سکتا ہے، حضرات فقہاء نے جو یہ شرط بیان کی ہے کہ اعتکاف صرف اُس مسجد میں ہو سکتا ہے جس میں جماعت ہوتی ہو غیر آباد مسجد جہاں جماعت نہ ہوتی ہو اس میں اعتکاف درست نہیں، یہ شرط درحقیقت مسجد کے مفہوم ہی سے مستفاد ہے، کیونکہ مساجد کے بنانے کا اصل مقصد جماعت کی نماز ہے، ورنہ تنہا نماز تو ہر جگہ دکان مکان وغیرہ میں ہو سکتی ہے۔

مسئلہ: روزے کی رات میں کھانا، پینا، بی بی سے مباشرت سب کا حلال ہونا اور پر بیان ہوا ہے، حالت اعتکاف میں کھانے پینے کا تو وہی حکم ہے جو سب کے لئے ہے، مگر مباشرت نساء کے معاملہ میں الگ ہے، کہ وہ رات میں بھی جائز نہیں، اس لئے اس آیت میں اسی کا حکم بتایا گیا ہے۔

مسئلہ: اعتکاف کے دو سکر مسائل کہ اس کے ساتھ روزہ شرط ہے، اور یہ کہ اعتکاف میں مسجد بنکنا بغیر حاجت طبعی یا شرعی کے جائز نہیں، کچھ اسی لفظ اعتکاف سے مستفاد ہیں کچھ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قول و فعل سے۔

آخر آیت میں تِلْكَ آيَةُ الْيَوْمِ لَا تَعْلَمُونَ کہا، فرما کر اشارہ کر دیا کہ روزے میں کھانے پینے اور مباشرت کی جبرماعت ہے یہ اللہ کے حدود ہیں ان کے قریب بھی مت جاؤ، کیونکہ قریب جانے سے حد شکنی کا احتمال ہے، اسی لئے روزہ کی حالت میں کلی کرنے میں مبالغہ کرنا مکروہ ہے، جس سے پانی اندر جانے کا خطرہ ہو، منہ کے اندر کوئی دوا استعمال کرنا مکروہ ہے، بی بی سے بوس کتنا مکروہ ہے، اسی طرح سحری کھانے میں احتیاطاً وقت ختم ہونے سے دو چار منٹ پہلے ختم کرنا اور افطار میں دو تین منٹ مزخر کرنا بہتر ہے، اس میں بے پروائی اور سہل انگاری اس ارشادِ خداوندی کے خلاف ہے۔

وَلَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدُّوا بِهَا إِلَى الْحُكَّامِ

اور نہ کھاؤ مال ایک دوسرے کا آپس میں ناحق اور نہ پہچاؤ اُن کے جانوروں تک کہ

لَتَأْكُلُوا مِنْ ثَمَرِهِمْ يَوْمَ قِيَامِهِمْ ذَلِكَ جَزَاءُ الَّذِينَ هُمْ عَلَىٰ أَعْيُنِنَا ۖ وَالَّذِينَ هُمْ عَنْ آلِهِمْ وَنَسَبِهِمْ غَافِلِينَ ۝١٧٠

لکھا جاؤ کون حصہ لوگوں کے مال میں سے ظلم کر کے (ناحق) اور ہم کو معلوم ہے ۔

رابط آیات و خلاصہ تفسیر

پچھلی آیتوں میں روزے کے احکام مذکور تھے، جس میں حلال چیزوں کے استعمال کو ایک معین زمانے میں اور معتین وقت میں حرام کر دیا گیا ہے، اس کے بعد مالِ حرام حاصل کرنے اور اس کے استعمال کرنے کی ممانعت اسی مناسبت سے ذکر کی گئی کہ عبادتِ صوم کا اصل منشاء یہی ہے کہ انسان کچھ عرصے حلال چیزوں سے بھی صبر کا تو گر ہو جائے گا، تو حرام چیزوں سے بچنا آسان ہو جائے گا، نیز یہ مناسبت بھی ہو کہ جب روزہ ختم ہوا فطار کے لئے مالی عطالی ہٹا کرنا چاہئے، جس نے دن بھر روزہ رکھا شام کو مالِ حرام سے افطار کیا اس کا روزہ اللہ کے نزدیک قبول نہیں۔

حکم ششم، مالِ حرام سے بچنا اور آپس میں ایک دوسرے کے مالِ ناحق مت کھاؤ اور ان (کے جھوٹے مقدمہ) کو حکام کے یہاں اس غرض سے رجحامت کرو کہ (اس کے ذریعہ سے) لوگوں کے مالوں کا ایک حصہ بطریقِ گناہ (یعنی ظلم) کے کھا جاؤ، جبکہ تم کو (اپنے جھوٹ اور ظلم کا) علم بھی ہو۔

معارف ومسائل

اس آیت میں حرام طریقوں سے مال حاصل کرنے اور استعمال کرنے کی ممانعت ہے، جس طرح اس سے پہلے اسی سورۃ بقرہ کی آیت نمبر ۱۶۸ میں حلال طریقہ پر حاصل کرنے اور استعمال کرنے کی اجازت کا بیان گزر چکا ہے، جس میں ارشاد ہے:

”یعنی اسے لوگوں کا دُور زمین کی چیزوں میں سے

يَا أَيُّهَا النَّاسُ كُلُوا مِن ثَمَرِي إِذَا بُرِي

جو چیزیں حلال اور مستحکم ہیں اور شیطان کے

حَلَّالِطَبَّارٌ وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوبَاتِ

امام جصاصؒ کے اس بیان سے یہ بات واضح ہو گئی کہ جس شخص کی آنکھ دیر میں کھلی اور عام طور پر صبح کی اذان ہوئی تھی جس سے صبح ہونے کا یقین لازمی ہے، وہ جان بوجھ کر اس وقت کچھ کھائے گا تو وہ گناہگار بھی ہوگا اور قضاء بھی اس پر لازم ہوگی، اور مشکوک حالت میں کھائے گا تو گناہ ساقط ہو جائے گا، مگر قضاء ساقط نہ ہوگی، اور کسی نہ کسی درجہ میں کراہت بھی ہوگی۔

اعتکاف اور اعتکاف کے لغوی معنی کسی جگہ ٹھہرنے کے ہیں، اور اصطلاح قرآن و سنت اس کے مسائل میں خاص شرائط کے ساتھ مسجد میں ٹھہرنے اور قیام کرنے کا نام اعتکاف ہے، لفظی التماجد کے عموم سے ثابت ہوا کہ اعتکاف ہر مسجد میں ہو سکتا ہے، حضرات فقہاء نے جو یہ شرط بیان کی ہو کہ اعتکاف صرف اُس مسجد میں ہو سکتا ہے جس میں جماعت ہوتی ہو غیر آبا مسجد جہاں جماعت نہ ہوتی ہو اس میں اعتکاف درست نہیں، یہ شرط درحقیقت مسجد کے مفہوم ہی سے مستفاد ہو گیا کیونکہ مساجد کے بنانے کا اصل مقصد جماعت کی نماز ہے، ورنہ تنہا نماز تو ہر جگہ دکان مکان وغیرہ میں ہو سکتی ہے۔

مسئلہ: روزے کی رات میں کھانا، پینا، بی بی سے مباشرت سب کا حلال ہونا اور پر بیان ہوا ہے، حالت اعتکاف میں کھانے پینے کا تو وہی حکم ہو جو سب کے لئے ہے، مگر مباشرت نساء کے معاملہ میں الگ ہے، کہ وہ رات میں بھی جائز نہیں اس لئے اس آیت میں اسی کا حکم بتایا گیا ہے۔

مسئلہ: اعتکاف کے دو سکر مسائل کہ اس کے ساتھ روزہ شرط ہے، اور یہ کہ اعتکاف میں مسجد رکھنا بغیر حاجت طبعی یا شرعی کے جائز نہیں، کچھ اسی لفظ اعتکاف سے مستفاد ہیں کچھ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قول و فعل سے۔

آخر آیت میں یَلْقَىٰ مُحَمَّدٌ ذُو الشَّوْكَ فَكَانَ نَفَرًا بَوَّهًا، فرما کر اشارہ کر دیا کہ روزے میں کھانے پینے اور مباشرت کی ہر ممانعت ہے یہ اللہ کے حدود ہیں ان کے قریب بھی مت جاؤ، کیونکہ قریب جانے سے حد شکنی کا احتمال ہے، اسی لئے روزہ کی حالت میں کلی کرنے میں مباح نہ کرنا مکروہ ہے، جس سے پانی اندر جانے کا خطرہ ہو، منہ کے اندر کوئی دوا استعمال کرنا مکروہ ہے، بی بی سے بوس کنا مکروہ ہے، اسی طرح سحری کھانے میں احتیاطاً وقت ختم ہونے سے دو چار منٹ پہلے ختم کرنا اور افطار میں دو تین منٹ مؤخر کرنا، بہتر ہے، اس میں بے پردائی اور سہل انگاری اس ارشاد خدا ربی کے خلاف ہے۔

وَلَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدُّوا بِهَا إِلَى الْحُكَّامِ

اور نہ کھاؤ مال ایک دوسرے کا آپس میں باحق اور نہ پہنچاؤ ان حکاموں تک کہ

لِتَأْكُلُوا فَرِيقًا مِّنْ أَمْوَالِ النَّاسِ بِالْإِثْمِ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿۱۸۵﴾

کھا جاؤ کوئی حصہ لوگوں کے مال میں سے ظلم کر کے (ناحق) اور تم کو معلوم ہے۔

ربط آیات خلاصہ تفسیر

پچھلی آیتوں میں روزے کے احکام مذکور تھے، جس میں حلال چیزوں کے استعمال کو ایک معین زمانے میں اور معین وقت میں حرام کر دیا گیا ہے، اس کے بعد مال حرام حاصل کرنے اور اس کے استعمال کرنے کی ممانعت اسی مناسبت سے ذکر کی گئی کہ عبارت صوم کا اصل منشاء یہی ہے کہ انسان کچھ عرصے حلال چیزوں سے بھی صبر کا خوگر ہو جائے گا، تو حرام چیزوں سے بچنا آسان ہو جائے گا، نیز یہ مناسبت بھی ہو کہ جب روزہ ختم ہوا فطار کے لئے مالی حلال ہٹا کر نا چاہئے، جس نے دن بھر روزہ رکھا شام کو مال حرام سے افطار کیا اس کا روزہ اللہ کے نزدیک قبول نہیں۔

حکم ششم، مال حرام سے بچنا اور آپس میں ایک دوسرے کے مال ناحق مت کھاؤ اور ان (کے جھوٹے مقدمہ) کو حکام کے یہاں اس غرض سے رجوع مت کرو کہ (اس کے ذریعہ سے) لوگوں کے مالوں کا ایک حصہ بطریق گناہ (یعنی ظلم) کے کھا جاؤ، جبکہ تم کو (اپنے جھوٹ اور ظلم کا) علم بھی ہو۔

معارف و مسائل

اس آیت میں حرام طریقوں سے مال حاصل کرنے اور استعمال کرنے کی ممانعت ہے، جس طرح اس سے پہلے اسی سورۃ بقرہ کی آیت نمبر ۱۶۸ میں حلال طریقہ پر حاصل کرنے اور استعمال کرنے کی اجازت کا بیان گزر چکا ہے، جس میں ارشاد ہے:

”میں اسے لوگوں کا دوزخ میں کی چیزوں میں سے جو چیزیں حلال اور حلال ہیں اور شیطان کے قدم پر نہ چلو کیونکہ وہ تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے“

يَا أَيُّهَا النَّاسُ كُلُوا مِمَّا فِي الْأَرْضِ حَلَالًا طَيِّبًا وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِينٌ

اور سورۃ نمل آیت ۱۸ میں ارشاد فرمایا۔

كُنْتُمْ اَوَّلَ مَا خَلَقْنَا ثُمَّ كُنْتُمْ اٰخِرًا
ثُمَّ كُنْتُمْ بَيْنَ يَدَيْنَا وَثُمَّ كُنْتُمْ
اٰخِرًا ثُمَّ كُنْتُمْ بَيْنَ يَدَيْنَا وَثُمَّ
كُنْتُمْ اٰخِرًا ثُمَّ كُنْتُمْ بَيْنَ يَدَيْنَا

یعنی کھاؤ جو روزی دی تم کو اللہ تعالیٰ نے
ملائی اور پاک اور شکر کر اللہ کے احسان
کا اگر تم اس کی عبادت کرتے ہو۔

کسب مال کے اچھے برے ذرائع
اور اچھائی بُرائی کا معیار

جس طرح مال کی ضرورت اور مدار زندگی ہونے پر
ساری دنیا اور اس کی ہر قوم و ملت کا اتفاق ہے،
اسی طرح اس پر بھی اتفاق ہے کہ اس کی تحصیل کے

کچھ ذرائع پسندیدہ اور جائز ہیں، کچھ ناپسند اور منوع ہیں، چوری، ڈاکہ، دھوکہ، فریب کو ساری ہی
دنیا برا سمجھتی ہے، لیکن ان ذرائع کے جائز یا ناجائز ہونے کا کوئی صحیح معیار عام طور پر لوگوں کے ہاتھ میں
نہیں، اور ہر بھی نہیں سکتا، کیونکہ اس کا تعلق پوری دنیا کے انسانوں کی صلاح و فلاح سے ہے اور
پورا عالم انسانیت اس سے متاثر ہوتا ہے، اس کا صحیح اور معقول معیار صرف وہی ہو سکتا ہے جو
رب العالمین کی طرف سے بذریعہ وحی بھیجا گیا ہو، ورنہ اگر خود انسان اس کا معیار بنائے گا اختیار ہو
تو جو لوگ اس کا قانون بنائیں گے وہ اپنی قوم یا اپنے وطن یا اپنی ملت کے بارے میں جو کچھ چاہیں
وہ عام عادت کے مطابق اس سے مختلف ہوگا جو دوسری قومیں اور وطنوں کے متعلق سوچا جائے گا۔
اور بین الاقوامی کانفرنسوں کی صورت میں پوری دنیا کی نمائندگی کی جائے تو تجربہ شاہد ہو کہ وہ بھی
ساری مخلوق کو مطمئن کرنے کا ذریعہ نہیں بن سکتی، جس کا نتیجہ یہ ہو کہ یہ قانونی نا انصافی انجام کار
جنگ و جدل اور فساد کی صورت اختیار کرے گی۔

اسلامی نظام معاش پر شریعت اسلام نے حلال و حرام اور جائز و ناجائز کا جو قانون بتایا ہے وہ ضرور وحی الہی
دنیا میں قائم کر سکتا ہے۔ یہی بات مسند فقہاء اور وہی ایک ایسا معقول فطری و جمیع قانونی جو ہر قوم و ملت
اور ہر ملک و وطن میں چل سکتا ہے، اور امن و امان کا ضامن ہو سکتا ہے، کیونکہ اس قانون الہی میں قابل
اشتراک چیزوں کو مشترک اور وقف عام رکھا گیا ہے، جس میں تمام انسان مساوی حق رکھتے ہیں جیسے
ہوا پانی، خورد و گھاس، آگ کی حرارت اور غیر ملوک جنگلات اور غیر آباد زمینیں جی جنگلات کی پیداوار
وغیرہ کہ ان میں سب انسانوں کا مشترک حق ہے، کسی کو ان پر مالکانہ قبضہ جائز نہیں اور جن چیزوں
کے اشتراک میں انسانی معاشرت میں خلل پیدا ہوتا ہے، یا نزاع و جدل کی صورتیں پیدا ہوتی ہیں
ان میں انفرادی ملکیت کا قانون جاری فرمایا گیا، کسی زمین یا اس کی پیداوار پر ابتدائی ملکیت
کا قانون جہاں ہے، اور پھر انتقال ملکیت کا جہاں اس قانون کی ہر دفعہ میں اس کا لحاظ رکھا گیا ہو کہ کوئی
انسان ضروریات زندگی سے محروم نہ رہے، بشرطیکہ وہ اپنی جدوجہد ان کی تحصیل میں خرچ کرے،

اور کوئی انسان دوسروں کے حقوق غصب کر کے یا دوسروں کو نقصان پہنچا کر سرمایہ کو جمع و افراد میں
مقبول نہ کرے، انتقال ملکیت خواہ بعد الموت وراثت کے قانون الہی کے مطابق ہو، یا پھر بیع و شرا
وغیرہ کے ذریعہ فریقین کی رضامندی سے ہو، مزدوری ہو یا کسی مال کا معاوضہ دونوں میں اس کو
ضروری قرار دیا گیا کہ معاملہ میں کوئی دھوکہ، فریب، یا تلبیس نہ ہو، اور کوئی ایسا ابہام اور اجمال
نہ رہے جس کی وجہ سے باہمی منازعت کی فوجت آئے۔

یہ اس کی بھی رعایت رکھی گئی ہے کہ فریقین جو رضامندی دے رہے ہیں وہ حقیقی رضامندی
ہو، کسی انسان پر دباؤ ڈال کر کوئی رضامندی نہ لی گئی ہو، شریعت اسلام میں جتنے معاملات ہل یا
فاسد اور گناہ کہلاتے ہیں ان سب کی وجہ یہی ہوتی ہے کہ ان میں وجوہ مذکور ہیں کسی وجہ سے
خلل ہوتا ہے، کہیں دھوکہ فریب ہوتا ہے، کہیں نامعلوم چیز یا نامعلوم عمل کا معاوضہ ہوتا ہے،
کہیں کسی کا حق غصب ہوتا ہے، کہیں کسی کو نقصان پہنچا کر اپنا نفع کیا جاتا ہے، کہیں حقوق عامہ
میں ناجائز تصرف ہوتا ہے، سو، قمار وغیرہ کو حرام قرار دینے کی اہم وجہ یہ ہے کہ وہ حقوق عامہ
کے لئے مضری ہیں، ان کے نتیجہ میں چند افراد پلتے پڑتے ہیں، اور پوری ملت مفلس ہوتی ہے،
ایسے معاملات فریقین کی رضامندی سے بھی اس لئے حلال نہیں کہ وہ پوری ملت کے خلاف
ایک جرم ہے، اہمیت مذکورہ ان تمام ناجائز صورتوں پر حاوی ہے، ارشاد ہے، وَلَا تَكُنْ مِنَ الْاٰخِلَاقِ
الَّتِي لَا تَحِلُّ لَهَا اَمْوَالُ الْاٰخِلَاقِ
بِئْسَ الْاٰخِلَاقُ، یعنی نہ کھاؤ ایک دوسرے کا مال ناجائز طریق پر، اس میں ایک بات تو یہ قابل
غور ہو کہ قرآن کریم کے الفاظ میں اَمْوَالُ الْاٰخِلَاقِ آیا ہے جس کے اصلی معنی ہیں اپنے اموال جن
میں اس کی طرف اشارہ کیا گیا کہ تم جو کسی دوسرے کے مال میں ناجائز تصرف کرتے ہو تو یہ غور
کر دو کہ دوسرے شخص کو بھی اپنے مال سے ایسی ہی محبت اور تعلق ہوگا جیسا تمہیں اپنے مال
سے ہے، اگر وہ تمہارے مال میں ایسا ناجائز تصرف کرتا تو تمہیں جو دکھ پہنچاؤں گا اس کا اس وقت بھی
ایسا ہی احساس کرو کہ گویا وہ تمہارا مال ہو۔

اس کے علاوہ اشارہ اس طرف بھی ہو سکتا ہے کہ جب ایک شخص دوسرے کے مال میں
کوئی ناجائز تصرف کرتا ہے تو اس کا فطری نتیجہ یہ ہے کہ اگر یہ رسم چل پڑی تو دوسرے اس کے
مال میں ایسا ہی تصرف کریں گے، اس حیثیت سے کسی شخص کے مال میں ناجائز تصرف حقیقت
اپنے مال میں ناجائز تصرف کے لئے راستہ ہموار کرنا ہے، غور کیجئے اسباب ضرورت میں ملاوٹ
کی رسم چل جائے، کوئی گھی میں تیل یا چربی ملا کر تاد پیسے حاصل کرے، تو اس کو جب دودھ خریدنے
کی ضرورت پڑے گی دودھ والا اس میں پانی ملا کر دے گا، مسالہ کی ضرورت ہوگی اس میں ملاوٹ
ہوگی، دوا کی ضرورت ہوگی اس میں بھی یہی منظر سامنے آئے گا، تو جتنے پیسے ایک شخص نے ملاوٹ

مر کے زائد حاصل کرنے اور سرفادسی وہ ہے اس کی جیب نکال لیتا ہے، اسی طرح دوسرے کے بچے میسر نکال لیتا اور یہ بیوقوف اپنی جگہ بیسیوں کی زیادتی شمار کر کے خوش ہوتا ہے، مگر انجام نہیں دیکھتا کہ اس کے پاس کیا ہو، تو جو کوئی دوسرے کے مال کو غلط طریقے سے حاصل کرتا ہے وہ حقیقت وہ اپنے مال کے ناجائز تصرف کا دروازہ کھولتا ہے۔

دوسری بات قابل غور یہ ہے کہ اس ارشاد خداوندی کے الفاظ عام ہیں کہ باطل اور ناجائز طریقے سے کسی کا مال نہ کھاؤ، اس میں کسی کا مال غصب کر لینا بھی داخل ہو، چوری اور لوٹا کہ بھی، جن میں دوسرے پر ظلم کر کے جبراً مال چھین لیا جاتا ہے، اور سود، قمار، رشوت اور تمام بیع فاسدہ اور معاملات فاسدہ بھی جو از روئے شرع جائز نہیں، اگرچہ منسرفین کی رضا مندی بھی متحقق ہو، جھوٹ بول کر یا جھوٹی قسم کھا کر کوئی مال حاصل کر لینا یا ایسی کمانی جس کو شریعت اسلام نے ممنوع قرار دیا ہے، اگرچہ اپنی جان کی محنت ہی سے حاصل کی گئی ہو وہ سب حرام اور باطل ہیں، اور قرآن کے الفاظ میں اگرچہ صراحت کھانے کی ممانعت مذکور ہو، لیکن مراد اس جگہ صرف کھانا ہی نہیں بلکہ مطلقاً استعمال کرنا ہو، خواہ کھالی کرو یا پیہن کر یا دوسرے طریقہ کے استعمال سے، مگر محاورات میں ان سب قسم کے ہتھمالوں کو کھالینا ہی بولا جاتا ہے، کہ فلاں آدمی فلاں کا مال کھا گیا، اگرچہ وہ مال کھانے پینے کے لائق نہ ہو۔

شانِ فزول | آیت ایک خاص واقعہ میں نازل ہوئی، اور واقعہ یہ ہے کہ حضرت صحابہ کرام میں سے دو صحابہ جو
کا آپس میں ایک زمین پر جھگڑا ہوا، معتدہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدالت میں پیش ہوا، مدعی
کے پاس گولہ نہ تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے شرعی ضابطہ کے مطابق مدعا علیہ کو حلف کر کے
عہم دیا، وہ حلف پر آمادہ ہو گیا، اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بطور نصیحت اُن کو یہ
آیت سنائی: إِنَّ أَوَّلَ بَيْتٍ يَبْعَثُ اللَّهُ رَسُولًا مِنْكُمْ لِيُخَوِّفَ بِهِ قُلُوبَكُمْ وَتَعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ مَعِ الصَّادِقِينَ (۱۱۰:۳) جس میں قسم
کھا کر کوئی مالی حاصل کرنے پر رُوئے بند کو رہے، صحابی نے جب یہ آیت سنی تو قسم کھانے کو ترک کر دیا
اور زمین مدعی کے حوالہ کر دی۔ (روح المعانی)

اس واقعہ میں یہ آیت نازل ہوئی، جس میں ناجائز طریق پر کسی کا مال کھانے یا حاصل کرنے کو حرام قرار دیا ہے، اور اس کے آخر میں خاص طور پر جھوٹا مقدمہ بنانے اور جھوٹی قسم کھانے اور جھوٹی شہادت دینے اور دلولے کی سخت ممانعت اور اس پر وعید آئی ہے، ارشاد ہے: وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذَلِكَ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ اِنی انکھلام لیتا ہوں۔ اُن کو قاتل قاتل اُموال الناس بِالْاِثْمِ وَآثْمُهُمْ تَغْلُمُونَ۔ یعنی نہ لے جاؤ احوال کے مقدمات تک، تاکہ ان کے ذریعہ تم لوگوں کے اموال کا کوئی حصہ کھا جاؤ بطریق گناہ جب کہ تم جانتے بھی ہو کہ اس میں تمہارا کوئی حق نہیں، تم جھوٹا مقدمہ بنا رہے ہو، وَآثْمُهُمْ تَغْلُمُونَ سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص کسی معاملہ کی بنا پر اس چیز کو اپنا حق سمجھتا ہے، وہ اگر عدالت میں

دعویٰ دائر کر کے اس کو حاصل کرنے کی کوششیں کرے تو وہ اس وعید میں داخل نہیں، اسی جیسے ایک واقعہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا،

إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ وَأَنَا مِثْلُكُمْ فَخُذُوا حِذْرًا
إِنِّي وَتَعَالَى بَعْضُكُمْ أَن يَكُذِّبَ
أَلْعَنَ يَحْيَىٰ مِنْ بَنِي إِدْرِيسَ
لَهُ عَلَىٰ نَحْوِ مَا أَسْمَىٰ مِنْهُ قَسَمٌ
قَسَمْتُ لَهُ بِئْسَ مِنْ خَلْقٍ أَجْهَلٍ
فَلَا يَأْخُذُ بِهِ فَنَاهَا أَفْطَمَ لَهُ
يَطْلَعُ مِنَ النَّارِ (رواه البخاري
ومسلم عن أم سلمة)

”یعنی میں ایک افسانہ ہوں اور تم میرے پاس اپنے مقدمات لاتے ہو، اس میں یہ ہو سکتا ہے کہ کوئی شخص اپنے معاملہ کو زبان رنگ آمیزی کے ساتھ پیش کرے، اور میں اسی سے مطمئن ہو کر اس کے حق میں فیصلہ کر دوں تو زیادہ رکھو کہ حقیقت حال تو عجب معاملہ کو خود معلوم ہوتی ہے، اگر فی الواقعہ وہ اس کا حق نہیں ہے تو اس کو لینا نہیں

چاہئے کیونکہ اس صورت میں جو کچھ میں اس کو دونوں محاکمہ کا ایک قطعہ ہو گا ۱۰

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس ارشاد میں واضح فرمادیا کہ اگر امام یا قاضی یا امام المسلمین کسی مغالطہ کی وجہ سے کوئی فیصلہ کر دے جس میں ایک کا حق و دوسرے کو ناجائز طور پر مل رہا ہو، تو اس مغالطہ فیصلہ کی وجہ سے وہ اس کے لئے حلال نہیں ہو جاتا، اور جس کے لئے حلال ہو اس کے لئے حرام نہیں ہو جاتا، الغرض عدالت کا فیصلہ کسی حلال کو حرام یا حرام کو حلال نہیں بناتا، اگر کوئی شخص دعویٰ فرمے یا جھوٹی شہادت یا جھوٹی قسم کے ذریعہ کسی کا مال یا دینیہ عدالت نے لے، تو اس کا وبال اس کی گردن پر رہے گا اس کو چاہئے کہ آخرت کے حساب کتاب اور عظیم و خیر کی عدالت میں پیشی کا خیال کر کے اس کو چھوڑ دے۔

امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک جن معاملات میں کوئی عقد یا فیخ ہوتا ہو اور جن میں قاضی یا جج کو بھی شرعاً اختیارات حاصل ہوتے ہیں، ایسے معاملات میں اگر جھوٹی قسم یا جھوٹی شہادت کی بناء پر بھی کوئی فیصلہ قاضی نے صادر کر دیا تو شرعاً وہ عقد یا فیخ صحیح ہو جائے گا، اور حلال و حرام کے احکام اس پر عائد ہو جائیں گے، اگرچہ جھوٹ بولنے اور جھوٹی شہادت دلوانے کا دہال اس کی گردن پر ہے گا۔

مالِ حلال کی برکات اور حرام کی نحوست | حرام سے بچنے اور حلال کے حاصل کرنے کے لئے قرآن کریم نے مختلف مقامات میں مختلف عنوانات سے تاکیدیں فرمائی ہیں، ایک آیت میں اس کی طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ انسان کے اعمال و اخلاق میں بہت بڑا دخل حلال کھانے کو ہے، اگر اس کا کھانا پینا حلال نہیں تو اس سے اخلاقی حمید اور

اعمال صالحہ کا صدور شکل ہو، ارشاد ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّخِذُوا الصَّلَاةَ أَصْلًا لَكُمْ وَأَتُوا مَالَكُمْ بِالْعِلَّةِ وَالْحَقِيقَةِ

”یعنی اے گروہ انبیاءِ حلال اور پاک چیزیں
کھاؤ، اور نیک عمل کرو، میں تمہارے اعمال
کی حقیقت سے واقف ہوں“

اس آیت میں حلال کھانے کے ساتھ عمل صالح کا حکم مشرک اشارہ کر دیا ہے کہ اعمالِ صالحہ کا صدور جب ہی ہو سکتا ہے جبکہ انسان کا کھانا پینا حلال ہو، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں یہ بھی واضح فرما دیا کہ اس آیت میں اگرچہ خطاب انبیاء علیہم السلام کو ہے، مگر یہ حکم کچھ انھیں کے ساتھ مخصوص نہیں، بلکہ سب مسلمان اس کے مامور ہیں، اس حدیث کے آخر میں آپ نے یہ بھی فرمایا کہ حرام مال کھانے والے کی رعاء قبول نہیں ہوتی، بہت سے آدمی عبادت وغیرہ میں مشقت اٹھاتے ہیں پھر اللہ تعالیٰ کے سامنے ہاتھ دعا کے لئے پھیلاتے ہیں، اور یارب یارب پکارتے ہیں، مگر کھانا ان کا حرام، پینا ان کا حرام، لباس ان کا حرام ہے تو ان کی یہ دعا کہاں قبول ہو سکتی ہے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کا ایک بہت بڑا حصہ اسی کام کے لئے وقف رہا ہے کہ امت کو حرام سے بچانے اور حلال کے استعمال کرنے کی ہدایتیں دیں۔

ایک حدیث میں ارشاد فرمایا کہ جس شخص نے حلال کھایا اور سنت کے مطابق عمل کیا اور لوگ اس کی ایذاؤں سے محفوظ رہے وہ جنت میں جائے گا، صحابہ کرامؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ! آجکل تو یہ حالات آپ کی امت میں عام ہیں، بیشتر مسلمان ان کے پابند ہیں، آپ نے فرمایا: ہاں! آئندہ بھی ہر زمانہ میں ایسے لوگ رہیں گے جو ان احکام کے پابند ہوں گے (یہ حدیث ترمذی نے روایت کی ہے، اور اس کو صحیح فرمایا ہے)۔

ایک دوسری حدیث میں ارشاد ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے فرمایا کہ چار خصلتیں ایسی ہیں جب وہ تمہارے اندر موجود ہوں تو پھر دنیا میں کچھ بھی حاصل نہ ہو تو تمہارے لئے کافی ہیں، وہ چار خصلتیں یہ ہیں کہ ایک امانت کی حفاظت، دوسرے سچ بولنا، تیسرے حسن خلق، چوتھے کھانے میں حلال کا اہتمام۔

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ میرے لئے یہ دعا فرمادیجئے کہ میں مستحب الی دعا ہو جاؤں، ہو دعا کیا کروں قبول ہو کرے، آپ نے فرمایا اے سعد اپنا کھانا حلال اور پاک بنا، لو، شجاب الدعوات ہو جاؤ گے، اور قسم ہو اس ذات کی جس کے قبضہ میں محمدؐ کی جان ہے بندہ جب اپنے پیٹ میں حرام لقمہ ڈالتا ہے تو

چالیس روز تک اس کا کوئی عمل قبول نہیں ہوتا، اور جس شخص کا گوشت حرام مال سے بنا ہو اس گوشت کے لئے قہر میں آگ ہی لائق ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کہ قسم ہو اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے کہ کوئی بندہ آئندہ تک مسلمان نہیں ہوتا جب تک اس کا قلب اور زبانِ مسلم نہ ہو جائے، اور جب تک اس کے پڑوسی اس کی ایذاؤں سے محفوظ نہ ہو جائیں، اور جب کوئی بندہ مالِ حرام کا تکبے پھر اس کو صدقہ کرتا ہے تو وہ قبول نہیں ہوتا، اور اگر اس میں سے خرچ کرتا ہے تو برکت نہیں ہوتی، اور اگر اس کو اپنے وارثوں کے لئے چھوڑ جاتا ہے تو وہ جہنم کی طرف جانے کے لئے اس کا توشہ ہوتا ہے، بیشک اللہ تعالیٰ بڑی چیز سے بڑے عمل کو نہیں پسند دھرتے، ہاں اچھے عمل سے بڑے عمل کو دھرتے ہیں۔

مشرکین ہر انسان کا پنج ہم سنا اور حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

مَا تَزَالُ قَدْ مَا قَبْلَ يَوْمِ الْقِيَامَةِ
تَحْتَ سَائِلٍ مَنْ أَمَرَ عَنْ عَمَلِهِ فَيَسْأَلُ
مَا كُنَّا وَنَحْنُ مُشَابِهَةٌ فَيَسْأَلُ أَبْلَاكَ
وَعَنْ تَالِيَةِ أُمَّتٍ أَلْتَسَبَّهُ وَفَيَسْأَلُ
أَنفَعَهُ وَعَنْ عَمَلِهِ مَاذَا عَمِلَ
فَيَسْأَلُ (البیہقی، مرغیب)

”قیامت کے روز عرش میں کوئی بندہ اپنی
جگہ سے سرک نہ سکے گا، جب تک اس سے چار
سوالوں کا جواب نہ لیا جائے، ایک یہ کہ اس
اپنی عمر کس کام میں فنا کی اور دوسرے یہ کہ اپنی
ہوائی کس شغل میں برباد کی، تیسرے یہ کہ اپنا
مال کہاں سے کمایا، اور کہاں خرچ کیا، اور چوتھے
یہ کہ اپنے علم پر کہاں تک عمل کیا“

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ خطبہ دیا، جس میں فرمایا کہ اے جماعت ہا جریں، پانچ خصلتیں ہیں جن کے متعلق میں اللہ تعالیٰ ہے پناہ مانگتا ہوں کہ وہ تمہارے اندر پیدا ہو جائیں، ایک یہ کہ جب کسی قوم میں بے حیائی پھیلنے لگے تو ان پر طاعون اور وبایں اور ایسے نئے نئے امراض مسلط کر دیئے جاتے ہیں جو ان کے آباء و اجداد نے کئے تھے، اور دوسرے یہ کہ جب کسی قوم میں ناپ تول کے اندر کمی کرنے کا مرض پیدا ہو جائے تو ان پر قحط اور گرانی اور مشقت و محنت اور حکام کے مظالم مسلط کر دیئے جاتے ہیں، اور تیسرے یہ کہ جب کوئی قوم زکوٰۃ ادا نہ کرے تو بارش بند کر دی جاتی ہے، اور چوتھے یہ کہ جب کوئی قوم اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے عہد کو توڑ ڈالے تو اللہ تعالیٰ ان پر اپنی دشمنی مسلط فرمادیتے ہیں، جو ان کے مال بغیر کسی حق کے پھین لیتا ہے، اور پانچویں یہ کہ جب کسی قوم کے اربابِ اقامت دار کتاب اللہ کے قانون پر فیصلہ نہ کریں، اور اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ احکام ان کے دل کو نہ لگیں تو

عہ معنی رذالت میں پلٹ جائے گا، اے اس میں مال کے دو سوالوں کی ایک شکار ہوگا

اللہ تعالیٰ اُن کے آپس میں منافرت اور لڑائی جھگڑے ڈال دینے ہیں۔ یہ روایت ابن ماجہ اور ترمذی وغیرہ نے نقل کی ہے، اور حاکم نے اس کو صحیح علی شرط مسلم فرمایا ہے۔

اللہ تعالیٰ ہم کو اور سب مسلمانوں کو ان آفات سے محفوظ رہنے کی توفیق مکمل عطا فرمائیں!

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

يَسْأَلُونَكَ عَنِ الْآهِلَةِ كُلِّ هِيَ مَوَاقِفُ لِلنَّاسِ وَالْحَجَّ طَوَّلَيْسَ

نکسے پر چنے ہیں حال نئے چاند کا کہہ دے کہ میادقات مفورہ ہیں تو گون کیواسطے اور حج کے واسطے اور

الْبُرَّانَ تَأْتُوا الْبُيُوتَ مِنْ ظُهُورِهَا وَلَكِنَّ الْبُرَّانَ مِنَ النَّاسِ وَ

یہ نہیں کہ غمروں میں آؤ ان کی پشت کی طرف سے اور کہیں نیکی یہ کہ جو کوئی ڈرے اللہ سے اور

أَتُوا الْبُيُوتَ مِنْ أَبْوَابِهَا وَأَتَقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ﴿٨٧﴾

محمد دل میں آؤ دروازوں سے اور اللہ سے ڈرتے رہو تاکہ تم اپنی مراد کو پہنچو۔

وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُوكُمْ وَلَا تَعْتَدُوا لَهُمْ

اور بطور اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے جو لڑتے ہیں تم سے اور کسی پر زیادتی مت کر دینیک

اللَّهُ لَا يَجِبُ الْمُعْتَدِينَ ۝ ١٩ ۝ وَأَقْتُلُواهُمْ حَيْثُ تَقِفُوهُمْ

اللہ تعالیٰ ناپسند کرتا ہے زیادتی کرنے والوں کو، اور ارڈالوں کو جس جگہ پاؤ اور

أَخْرِجُوهُمْ مِنْ حَيْثُ أَخْرَجُوا كُومًا ۚ الْفِئْتَةُ أَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ ۚ

نکال دو ان کو جہاں سے انہوں نے تم کو نکالا اور دین سے بچلانا مار ڈالنے سے بھی زیادہ سخت ہے۔

وَلَا تُقَاتِلُوهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتَّى يُقَاتِلُوكُمْ فِيهِ فَإِنْ

اور نہ لطوآن سے مسجد الحرام کے پاس جب تک کہ وہ نہ لڑیں تم سے اس جگہ پھر اگر وہ

فَاتَّكُمُ فَاتَّكُوهُمْ مَا كَذَلِكَ جَزَاءُ الْكَافِرِينَ ﴿١٧﴾

خود ہی لڑیں تم سے تو ان کو مار دے یہی ہے ستر کا اندر کی ۔

رَبُّ آيَات اے تیس الیہ کے تحت بیان ہو چکا ہے کہ اس کے بعد آخر سورہ بقرہ تک

ابواب الہر کا بیان ہو گا جو ہم احکام شرعیہ پر مشقی ہیں، ان میں پہلا حکم قصاص کا دو سرا وصیت کا، تیسرا اور چوتھا صوم اور اس کے متعلق مسائل کا، پانچواں اعتکاف کا، چھٹا مال حرام سے بچنے کا تھا، مذکورہ قصود دو آیتوں میں حج اور جہاد کے احکام و مسائل کا بیان ہے، اور حج کے حکم سے پہلے یہ بتلایا گیا کہ روزہ اور حج وغیرہ میں قمری ہینوں اور دنوں کا اعتبار ہو گا۔

لغاست! آہلہ، ہلال کی جمع ہے، قمری مہینہ کی ابتدائی چند راتوں کے چاند کو ہلال کہا جاتا ہے، مَوَاقِیْتُ، میقات کی جمع ہے، جس کے معنی مطلق وقت یا منہجہ وقت کے آئے ہیں (مذہب)

خلاصہ تفسیر

حکمِ مہتمم، اعتبارِ حساب | (یعنی آدمی، آپ سے (ان) چاندوں کے (ہر) مہینہ گھٹنے بڑھنے کی، حالت (اور اس میں جو فائدہ ہے اس فائدہ) کی تحقیقات کرتے ہیں)

قرنی درج وغیرہ آپ فرما دیجئے کہ لافائدہ اس کا یہ ہو کہ وہ چاند دہنے اس گھنٹے اور بڑھنے کے اعتبار سے لڑوٹا یا سہولت (آلہ مشناخت اوقات ہیں لوگوں کے) اختیار کی معاملات مثل مدت و مطالبہ حقوق کے لئے اور (غیر اختیاری عبادات مثل حج روزکوۃ روزہ وغیرہ) کے لئے۔

حکم ہشتم، اصلاحِ رسمِ جاہلیت

بعض لوگ قبل اسلام کے اگر حج کا احرام باندھنے کے بعد کسی ضرورت سے گھر جانا چاہتے تھے، تو دروازہ سے جانا ممنوع

جانتے تھے، اس لئے پشت کی دیوار میں نقب دے کر اس میں سے اندر جاتے تھے، اور اس عمل کو فضیلت سمجھتے تھے حق تعالیٰ اس کے متعلق بعد ذکر کرم کے ارشاد فرماتے ہیں) اور اس میں کوئی فضیلت نہیں کہ گھروں میں ان کی پشت کی طرف سے آیا کر دے، ہاں لیکن فضیلت یہ ہو کہ کوئی شخص حرام (رجسینزوں) سے بچے اور (چونکہ گھروں میں دروازہ کی طرف سے آنا حرام نہیں ہے اس لئے اس سے بچنا بھی ضروری نہیں) سو اگر آنا چاہو تو، گھروں میں اُن کے دروازوں سے آؤ اور (اصل الاصول تو یہ ہو کہ) خدا تعالیٰ سے ڈرتے رہو (اس سے البتہ امید ہے کہ تم راہین میں کامیاب ہو۔

حکمِ شہم، قتالِ کفار

تشریف لاکر عمرہ ادا فرمادیں، چنانچہ ذی قعدہ ۸۳۵ھ میں پھر آپ اسی قصد سے تشریف لے چلے، لیکن آپ کے ساتھی مسلمانوں کو یہ اندیشہ ہوا کہ شاید مشرکین اپنا معاہدہ پورا نہ کریں اور آمادۂ مقابلہ و مقابلہ نہ ہو جاویں، تو ایسی حالت میں نہ سکوت مصلحت ہے، اور اگر مقابلہ کیا جاوے تو ذی قعدہ میں قتال لازم آتا ہے، اور یہ مہینہ منجملہ اُن چار مہینوں کے ہے جن کو اُشہر حُرّم کہا جاتا ہے، ان چاروں مہینوں میں اُس وقت تک قتل و قتال حرام و ممنوع تھا، یہ چار مہینے ذیقعدہ، ذی الحجہ، محرم اور رجب تھے، غرض مسلمان اس تردد سے پریشان تھے، حق تعالیٰ نے یہ آیتیں نازل فرمائی کہ ان خاص معاہدہ کرنے والوں کے ساتھ بوجہ باہمی معاہدہ کے تم کو اپنی جانب سے ابتداء قتال کرنے کی اجازت نہیں، لیکن اگر وہ لوگ خود عہد شکنی کریں اور تم سے لڑنے کو آمادہ ہو جاویں تو اُس وقت تم کسی طرح کا اندیشہ دل میں مت لاؤ، اور (بے تکلف) تم رہیں، لڑو! اللہ کی راہ میں یعنی اس نیت سے کہ یہ لوگ دین کی مخالفت کرتے ہیں، ان لوگوں کے ساتھ دفع جہد کر کے، تمہارے ساتھ لڑنے لگیں اور (از خود) حد و معاہدہ سے مست نکلا، (کہ عہد شکنی کر کے لڑنے لگو)، واقعی اللہ تعالیٰ حد و قانون شرعی سے بچنے والوں کو پسند نہیں کرتے اور (جس حالت میں وہ خود عہد شکنی کریں تو اس وقت دل کھول کر خواہ) ان کو قتل کرو جاں ان کو پاؤ اور (خواہ) ان کو زندہ نکال باہر کرو جاں سے انہوں نے تم کو (تنگ کر کے اور ایذا میں پہنچا کر) بچنے اور ہجرت کرنے پر مجبور کیا ہے، اور تمہارے اس قتل و خراج کے بعد بھی عقلاً الزام انہیں پر رہے گا، کیونکہ عہد شکنی جو ان سے واقع ہوگی، بڑی شرارت کی بات ہے اور ایسی شرارت (ضرر میں) قتل و خراج سے بھی سخت تر ہے (کیونکہ اس قتل و خراج کی نسبت اس شرارت ہی کی بدولت پہنچی ہے)، اور (علاوہ معاہدہ کے ان کے ساتھ ابتداء قتال کرنے سے ایک اور امر بھی منہ پورہ یہ کہ حرم شریف یعنی مکہ اور اس کا گرد اگر دایک واجب الاحترام جگہ ہے، اور اس میں قتال کرنا اس کے احترام کے خلاف ہے، اس لئے بھی حکم دیا جاتا ہے کہ) ان کے ساتھ مسجد حرام کے قرب (فواح) میں (جو حرم کہلاتا ہے) قتال مت کرو جب تک کہ وہ لوگ وہاں تم سے خود نہ لڑیں، ہاں اگر وہ (کفار) خود ہی لڑنے کا سامان کر لے لگیں تو اس وقت پھر تم کو بھی اجازت ہے کہ تم (بھی) ان کو مارو (و حارثہ) ایسے کافروں کی (جو حرم میں لڑنے لگیں) ایسی ہی سسر ہے۔

معارف و مسائل

پہلی آیت میں صحابہ کرام کا ایک سوال اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کا جواب نقل کیا گیا ہے، امام المفسرین حضرت عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ

کی ایک خاص شان ہو، کہ انہوں نے بوجہ عظمت و معیت کے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے سوالات بہت کم کئے ہیں، بخلاف پچھلے امتوں کے کہ جنہوں نے بکثرت سوالات کئے اور اس ادب کو ملحوظ نہیں رکھا، حضرت ابن عباس نے فرمایا کہ صحابہ کرام کے سوالات جن کا ذکر قرآن میں آیا ہے کل چودہ ہیں جن میں سے ایک سوال ابھی اور ہرگز رہا ہے، **وَاَسْأَلُكَ جِبَادِي**، دوسرا سوال یہ ہے، اور ان کے بعد سورۃ بقرہ ہی میں چھ سوال اور مذکور ہیں، اور باقی چھ سوالات مختلف سورتوں میں آئے ہیں۔

آیت مذکورہ میں ذکر یہ ہے کہ صحابہ کرام نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے آہلۃ یعنی شروع پہنچنے کے چاند کے متعلق سوال کیا کہ اس کی صورت آفتاب سے مختلف ہے، کہ وہ بھی باریک ہلالی شکل میں ہوتا ہے پھر آہستہ آہستہ بڑھتا ہے، پھر پورا دائرہ ہو جاتا ہے، پھر اس میں تدریجی کمی اسی طرح آتی ہے، اس کی حقیقت دریافت کی یا حکمت و مصلحت کا سوال کیا، دونوں احوال ہیں، مگر جو جواب دیا گیا اس میں حکمت و مصلحت کا بیان ہے، اگر سوال ہی یہ تھا کہ چاند کے گھٹنے بڑھنے میں حکمت و مصلحت کیا ہے، تب تو جواب اس کے مطابق ہو ہی گیا، اور اگر سوال سے اس گھٹنے بڑھنے کی حقیقت دریافت کرنا مقصود تھا جو صحابہ کرام کی شان سے بعید ہے تو پھر جواب تبجا حقیقت کے حکمت و مصلحت بیان کرنے سے اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ اجرام سماویہ کے حقائق دریافت کرنا انسان کے بس میں بھی نہیں، اور ان کا کوئی دینی یا دنیوی کام اس حقیقت کے علم پر موقوف بھی نہیں، اس لئے حقیقت کا سوال فضول ہے، پوچھنے اور بتلانے کی بات یہ ہے کہ چاند کے اس طرح گھٹنے بڑھنے چھپنے اور طلوع ہونے سے ہمارے کون سے مصالح وابستہ ہیں، اس لئے جواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ارشاد فرمایا کہ آپ ان سے کہہ دیں کہ تمہاری مصالح جو چاند سے وابستہ ہیں یہ ہیں کہ اس کے ذریعہ تمہیں اپنے معاملات اور معاہدوں کی میعاد مقرر کرنا اور حج کے ایام معلوم کرنا آسان ہو جائے گا۔

قری اور ٹیسی حساب | اس آیت سے قرائن معلوم ہوا کہ چاند کے ذریعہ تمہیں تاریخوں اور مہینوں کا شرعی حیثیت حساب معلوم ہو جائے گا، جس پر تمہارے معاملات اور عبادات حج وغیرہ کی بنیاد ہے، اسی مضمون کو سورۃ یونس کی آیت ۵ میں اس عنوان سے بیان فرمایا ہے، **وَقَدْ تَرَكْنَا مِثَالِهَا** یعنی اُن کے لئے مِثَالِهَا (یونس) جس سے معلوم ہوا کہ چاند کو مختلف منزلوں اور مختلف حالات سے گزارنے کا فائدہ یہ ہے کہ اس کے ذریعہ سال اور مہینوں اور تاریخوں کا حساب معلوم ہو سکے، مگر سورۃ بنی اسرائیل کی آیت ۵ میں اس حساب کا تعلق آفتاب سے بھی بتلایا گیا ہے وہ یہ ہے:

فَتَعْلَمُونَ آيَةَ النَّبِيِّ وَجَعَلْنَا آيَةَ الْفَخَّارِ

”پھر تمہاری راہ کا نمونہ اور بنیادوں کا

مُنْهِيَةً لِّقَبِيضَاتٍ فِى صَلَاتٍ
تَرْتَكُمُ وَتَخْلَعُونَ عَنْكُمْ
وَالْحِسَابُ ۝ (۱۲: ۱۹۱)

اسی میری آیت سے اگرچہ یہ ثابت ہوا کہ سال اور مہینوں وغیرہ کا حساب آفتاب سے بھی لگایا جاسکتا ہے رکما ذکرہ فی روح المعانی

لیکن چاند کے معاملہ میں جو الفاظ قرآن کریم نے استعمال کئے ان سے واضح اشارہ اس طرف نکلتا ہے کہ شریعت اسلام میں حساب چاند ہی کا متعلق ہے، خصوصاً ان عبارات میں جن کا تعلق کسی خاص مہینے اور اس کی تاریخوں سے ہے، جیسے روزہ رمضان، حج کے مہینے، حج کے ایام، محرم، شہر برأت وغیرہ جو احکام متعلق ہیں وہ سب رویت ہلال سے متعلق کئے گئے ہیں کیونکہ اس آیت میں بھی مَوْاقِیْتُ لِلنَّاسِ قَالِیْجِجْ فرما کر بتلادیا کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک حساب چاند ہی کا معتبر ہے، اگرچہ یہ حساب آفتاب سے بھی معلوم ہو سکتا ہے۔

شریعت اسلام نے چاند کے حساب کو اس لئے اختیار فرمایا کہ اس کو ہر آنکھوں والا فنی پر دیکھ کر معلوم کر سکتا ہے، عالم جاہل، دیہاتی، جزیروں، پہاڑوں کے رہنے والے جنگلی سب کو اس کا علم آسان ہے، بخلاف شمسی حساب کے کہ وہ آلات رصدیہ اور قواعد ریاضیہ پر موقوف ہے جس کو ہر شخص آسانی سے معلوم نہیں کر سکتا، پھر عبادات کے معاملہ میں قمری حساب کو بطور فرض متعین کر دیا، اور عام معاملات تجارت وغیرہ میں بھی اسی کو پسند کیا، جو عبادت اسلامی کا طریقہ اور ایک طرح کا اسلامی شعار ہو، اگرچہ شمسی حساب کو بھی ناجائز قرار نہیں دیا، شرط یہ ہے کہ اس کا رواج اتنا عام نہ ہو جائے کہ لوگ قمری حساب کو بالکل بھلا دیں، کیونکہ ایسا کرنے میں عبادات، روزہ، حج وغیرہ میں غلطی لازم آتا ہے، جیسا اس زمانے میں عام دفتروں اور کاروباری اداروں بلکہ نجی اور شخصی کتابت میں بھی شمسی حساب کا ایسا رواج ہو گیا ہے کہ بہت سے لوگوں کو اسلامی مہینے بھی پتہ نہ یاد نہیں رہے، یہ شرعی حیثیت کے علاوہ غیرت قومی و ملی کا بھی دیوالیہ پن ہے، اگر دفتری معاملات میں جن کا تعلق غیر مسلموں سے بھی ہے ان میں صرف شمسی حساب رکھیں، باقی نجی خط و کتابت اور روزمرہ کی ضروریات میں قمری اسلامی تاریخوں کا استعمال کریں تو اس میں فرض کفایہ کی ادائیگی کا ثواب بھی ہوگا، اور اپنا قومی شعار بھی محفوظ رہے گا۔

مسئلہ: لَقَدْ اَنزَلْنَا اَنۡكَاحَ الْکَیۡنُوۡتِ وَتَرۡکَیۡنَ عَلَیۡہِہَا، اس آیت سے یہ مسئلہ بھی محل آیا کہ جس چیز کو شریعت اسلام نے ضروری یا عبادت نہ سمجھا ہو اس کو اپنی طرف سے ضروری اور عبادت سمجھ لینا ناجائز نہیں، اسی طرح جو چیز شرعاً جائز ہو اس کو گناہ سمجھنا بھی گناہ ہے، ان

لوگوں نے ایسا ہی کر رکھا تھا کہ گھر کے دروازوں سے داخل ہونا جو شرعاً جائز تھا اس کو گناہ قرار دیا، اور مکان کی پشت سے دیوار توڑ کر آجوشرما ضروری نہیں تھا اس کو ضروری سمجھا، اسی پر ان لوگوں کو تنبیہ کی گئی، بدعات کے ناجائز ہونے کی بڑی وجہ یہی ہے کہ غیر ضروری چیزوں کو فرض و واجب کی طرح ضروری سمجھ لیا جاتا ہے، یا بعض جائز چیزوں کو حرام دنا جائز قرار دیا جاتا ہے، اس آیت سے ایسا کرنے کی ممانعت واضح طور پر ثابت ہو گئی جس سے ہزاروں اعمال کا حکم معلوم ہو گیا۔

حکم نہم جہاد و قتال

اس پر ساری امت کا اتفاق ہے کہ ہجرت مدینہ سے پہلے کفار کے ساتھ جہاد و قتال ممنوع تھا، اس وقت کی تمام آیات قرآنی میں مسلمانوں کو کفار کی ایذاؤں پر صبر اور عفو و درگزر کی ہدایت تھی، ہجرت مدینہ کے بعد سے پہلے اس آیت میں قتال کفار کا حکم آیا، وقال الریح بن الحش وغیرہ اور صدیق اکبر سے ایک روایت یہ بھی ہو کہ قتال کفار کے متعلق پہلی آیت یہ ہے: اَوۡدِیۡتَ بِالَّذِیۡنَ یُفۡسِقُوۡنَ فَاَنۡفَعُ ظَلَمَۃُکُمۡ (۲۹: ۱۲۲)، مگر اگر حضرات صحابہ و تابعین کے نزدیک پہلی آیت سورۃ بقرہ کی آیت مذکورہ ہی ہو اور صدیق اکبر نے جس کو پہلی فرمایا ہے وہ بھی ابتدائی آیتوں میں ہونے کے سبب پہلی ہی جاسکتی ہے۔

اس آیت میں حکم یہ ہو کہ مسلمان صرف ان کافروں سے قتال کریں جو ان کے مقابلہ پر قتال کے لئے آویں، اس سے مراد یہ ہے کہ عورتیں، بچے، بہت بوڑھے اور اپنے مذہب میں شغل میں دنیا سے یکسر ہٹ کر رہنے والے عبادت گزار راہب، پادری وغیرہ اور ایسے ہی اپاہج و معذور لوگ یا وہ لوگ جو کافروں کے یہاں محنت مزدوری کا کام کرتے ہیں ان کے ساتھ جنگ میں شریک نہیں ہوتے ایسے لوگوں کو جہاد میں قتل کرنا ناجائز نہیں، کیونکہ حکم آیت کا صرف ان لوگوں سے قتال کرنے کا ہو، جو مسلمانوں کے مقابلہ میں قتال کریں، اور مذکورہ قسم کے سب افراد قتال کرنے والے نہیں اس لئے فقہاء رحمہم اللہ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ اگر کوئی عورت یا بولہ یا مذہبی آدمی وغیرہ کفار کی طرف سے قتال میں شریک ہوں یا مسلمانوں کے بالمقابل جنگ میں ان کی مدد کسی طرح سے کر رہے ہوں ان کا قتل جائز ہے، کیونکہ وہ اَلَّذِیۡنَ یَقَاتِلُوۡکُمْ فَاَکْثَرُہُمۡ فِی الدِّیۡنِ (مظہری، قرطبی، جصاص)

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات جو مجاہدین اسلام کو بوقت جہاد دی جاتی تھیں، ان میں اس حکم کی واضح تشریحات مذکور ہیں، صحیح بخاری و مسلم میں ہر روایت حضرت عبداللہ بن عمرؓ ایک حدیث میں ہے:

تَعْلٰی رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ
وَسَلَّمَ عَنْ قَتْلِ الْقِسَاةِ وَالْعَبْدَانِ

تین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں
اور بچوں کے قتل سے منع فرمایا ہے۔

اور ابو داؤد میں بروایت انسؓ جہاد پر جانے والے صحابہ کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت منقول ہیں، تم اللہ کے نام پر اور رسول اللہ کی ملت پر جہاد کے لئے جاؤ کسی بوڑھے ضعیف کو اور چھوٹے بچے کو یا کسی عورت کو قتل نہ کرو (منظری)

حضرت صدیق اکبرؓ نے جب یزید بن ابی سفیان کو ملک شام بھیجا تو ان کو یہی ہدایت دی، اس میں یہ بھی مذکور ہے کہ عبادت گزار اور راہبوں کو اور کافروں کی مزدوری کرنے والوں کو بھی قتل نہ کریں جبکہ وہ قتال میں حصہ نہ لیں (قرطبی)

آیت کے آخر میں قَوْلًا تَعَسُّدُ ذَا کا بھی جہور مفسرین کے نزدیک ہی مطلب ہے کہ قتال میں حد سے تجاوز نہ کرو کہ عورتوں بچوں وغیرہ کو قتل کرنے لگو۔

وَأَقْتُلُوا الْمُشْرِكِينَ لَيْسَ لَهُمْ عَقْرٌ وَأَمْوَالُهُمْ مَّا تَرَكَوا فَمَنْ قَتَلَ أَحَدًا بِحَقِّ قَتْلِهِ فَلَهُ مَا تَرَكْتُمْ وَلَاحْتِمْ وَأَمَّا السَّامِيُّ فَمَنْ قَتَلَ

میں بیان ہو چکا کہ یہ آیت واقعہ حدیبیہ کے بعد اس وقت نازل ہوئی ہے جب صلح حدیبیہ کی شرط کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرامؓ کے ساتھ اس عمرہ کی قضاء کے لئے سفر کا ارادہ کیا جس سے اس سے پہلے سال میں کفار مکہ نے روک دیا تھا، صحابہ کرامؓ کو اس سفر کے وقت یہ خیال ہو رہا تھا کہ کفار کی صلح اور معاہدہ کا کچھ بھروسہ نہیں، اگر وہ لوگ اس سال بھی آمادہ پیکار ہو گئے تو ہمیں کیا کرنا چاہئے، اس پر آیت مذکورہ کے الفاظ نے ان کو اجازت دیدی کہ اگر وہ قتال کرنے لگیں تو تمہیں بھی اجازت ہے کہ جہاں پاؤں کو قتل کرو اور اگر قدرت میں ہو تو جس طرح انھوں نے مسلمانوں کو مکہ مکرمہ سے نکال دیا تھا تم بھی ان کو مکہ سے نکال دو۔

اور پوری مکی زندگی میں جو مسلمانوں کو کفار کے ساتھ مقابلہ سے روکا ہوا تھا، اور ہمیشہ عفو و درگزر کی تلقین ہوتی رہی تھی، اس لئے صحابہ کرامؓ کو اس آیت کے نازل ہونے سے یہی خیال تھا کہ کسی کافر کو قتل کرنا برا اور ممنوع ہے، اس خیال کے ازالہ کے لئے فرمایا وَالْقَتْلُ أَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ، یعنی یہ بات اپنی جگہ صحیح ہے کہ کسی کو قتل کرنا سخت برا کام ہے، مگر کفار مکہ کا اپنے کفر و مشرک پر جہار ہونا اور مسلمانوں کو ادائے عبادت حج و عمرہ سے روکنا اس سے زیادہ سخت و شدید ہے، اس سے بچنے کے لئے ان کو قتل کرنے کی اجازت دیدی گئی ہے، آیت میں لفظ فتنہ سے کفر و مشرک اور مسلمانوں کو ادائے عبادت سے روکنا ہی مراد ہے (جصاص قرطبی وغیرہ)

البتہ اس آیت کے عموم سے جو یہ سمجھا جاسکتا تھا کہ کفار جہاں کہیں ہوں ان کا قتل کرنا جائز ہے، اس عموم کی ایک تخصیص آیت کے اگلے جملے میں اس طرح کر دی گئی وَلَا تَقْتُلُوا هُمُومًا

الْمُسْلِمِينَ الْحَرَامُ حَتَّى يُقْتَلُوا كُفْرًا فَيُكْفَرُوا، یعنی مسجد حرام کے آس پاس جس سے مراد پورا حرم مکہ ہے اس میں تم ان لوگوں سے اس وقت تک قتال نہ کرو جب تک وہ خود قتال کی ابتداء نہ کریں۔

مسئلہ: حرم مکہ میں انسان کیا کس شکاری جانور کو بھی قتل کرنا جائز نہیں، لیکن اس آیت سے معلوم ہوا کہ اگر حرم محترم میں کوئی آدمی دوسرے کو قتل کرنے لگے تو اس کو بھی ممانعت میں قتال کرنا جائز ہے، اس پر جہور فقہاء کا اتفاق ہے۔

مسئلہ: اسی آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ابتداء جہاد و قتال کی ممانعت صرف مسجد حرام کے آس پاس حرم مکہ کے ساتھ مخصوص ہے، دوسرے مقامات میں جیسے دفاعی جہاد و ضروری ہر اسی طرح ابتدائی جہاد و قتال بھی درست ہے۔

فَإِنْ أَنْتَهَوْا فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ۝۱۱

پھر اگر وہ باز آئیں تو بیشک اللہ بہت بخشنے والا نہایت مہربان ہے، اور لاواں سے یہاں تک کہ

فِتْنَةٌ وَيَكُونَنَّ الَّذِينَ يَنْتَهُوا فَإِنْ أَنْتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ عَلَيَّ

نہایتی رہے فساد اور حکم پر خدا تعالیٰ کا پھر اگر وہ باز آئیں تو کسی پر زیادتی نہیں مگر

الظَّالِمِينَ ۝۱۲

ظالموں پر، حرمت والا جہنم بدلہ (مقابلہ) حرمت الی جہنم کے اور ادا بے کفری بدلہ ہے،

فَمَنْ اعْتَدَى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدَى عَلَيْكُمْ

پھر جس نے تم پر زیادتی کی تم اس پر زیادتی کرو جیسی اس نے زیادتی کی تم پر

وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ مَعَ الصَّادِقِينَ ۝۱۳

اور ڈرتے رہو اللہ سے اور جان لو کہ اللہ ساتھ ہے پرہیزگاروں کے، اور خرچ کرو اللہ

سَبِّحْ لِلَّهِ مَا تَرَىٰ وَلَا تَلْقُوا بِأَيْدِيكُمْ إِلَى التَّمَكُّكِ ۝۱۴

کی راہ میں اور نہ ڈالو اپنی جان کو ہلاکت میں، اور نیکی کرو

إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ ۝۱۵

بیشک اللہ دوست رکھتا ہے نیکی کرنے والوں کو

خلاصہ تفسیر | پھر اگر بعد شروع قتال کے بھی وہ لوگ (یعنی مشرکین مکہ اپنے کفر سے) باز نہ آجائیں

اور اسلام قبول کر لیں، تو ران کا اسلام بے قدر نہ سمجھا جاوے گا بلکہ اللہ تعالیٰ ران کے گزشتہ کفر کو بخش دے گا اور مغفرت کے علاوہ بے شمار نعمتیں دے کر ان پر ہر باتیں رکھے، فرادہ گئے اور اگر وہ لوگ اسلام نہ لائیں تو اگرچہ دوسرے کفار کے لئے اسلامی قانون یہ ہے کہ وہ اپنے مذہب پر رہتے ہوئے بھی اگر اسلامی حکومت کی اطاعت اور جزیہ دینے کا اقرار کر لیں تو ان کا قتل جائز نہیں رہتا، بلکہ ان کے حقوق کی حفاظت اسلامی حکومت پر لازم ہو جاتی ہے، مگر یہ خاص کفار چنانکہ اہل عرب ہیں، ان کے لئے قانون جزیہ نہیں، بلکہ ان کے لئے صورت دوائے ہی اسلام یا قتل اس واسطے، ان کے ساتھ اس حد تک لڑو کہ ران میں فساد عقیدہ (یعنی شرک) نہ رہے اور ران کا (دین) خالص (الشری) کا ہو جائے اور کسی کا دین و مذہب کا خالص اللہ کے لئے ہو جانا معروف ہے، قبول اسلام پر، تو حاصل یہ ہوا کہ شرک چھوڑ کر اسلام اختیار کر لیں، اور اگر وہ لوگ (کفر سے) باز آجائیں (جس کا ذکر ابھی ہوا بھی ہے) تو آخرت میں مغفرت و رحمت کے مستحق ہونے کے ساتھ دنیا میں ان کے لئے ستم کو یہ قانون بتلایا جاتا ہے کہ سزا کی سختی کسی پر نہیں ہو کر لی، بجز بے انصافی کرنے والوں کے (جو براہ بے انصافی خدائی احسانات کو قبول کر کفر و شرک کرنے لگیں اور جب یہ لوگ اسلام لے آئے تو بے انصاف نہ ہے، لہذا ان پر سزا سے قتل کی سختی نہ رہی اور مسلمانوں کو جو یہ خیال ہے کہ کفار مکہ اگر اپنے عہد پر قائم نہ رہے تو شہر حرام یعنی ذی قعدہ میں ان سے لڑنا پڑے گا، سو اس سے بھی بے فکر رہو کیونکہ حرمت والاہینہ (تم کو قتال کفار سے مانع ہو سکتا) ہے بعض (اس کے کہ اس) حرمت والے مہینہ کے (سبب وہ بھی تم سے قتال نہ کریں) اور (جو یہ ہے کہ) یہ حرمتیں تو عوض معاوضہ کی چیزیں ہیں (سو جو تمہارے ساتھ ان حرمتوں کی رعایت کرے تو تم بھی رعایت رکھو اور) جو تم پر ایسی حرمتوں کی رعایت نہ کرے (نہ زیادتی کرے تو تم بھی اس پر زیادتی کرو) جیسی اس نے تم پر زیادتی کی ہے اور ران سب احکام مذکورہ کے برتاؤ میں اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو کہ کسی امر میں حد قانونی سے تجاوز نہ ہونے پادے) اور یقین کر لو کہ اللہ تعالیٰ اپنی عنایت و رحمت سے، ان ڈرے والوں کے ساتھ ہوتے ہیں۔

حکم دہم انفاق فی الجہاد اور ستم لوگ (جان کے ساتھ مال بھی) خرچ کیا کرو اللہ کی راہ میں جہاد میں اور اپنے آپ کو اپنے ہاتھوں تباہی میں مت ڈالو کہ ایسے مواقع میں جان و مال خرچ کرنے سے جبن یا بخل کرنے لگو، جس کا نتیجہ تمہارا ضعیف اور محالان کا قوی ہو جانا ہے، جو کہ عین تباہی ہے (اور رجو) کام (کرد) اچھی طرح کیا کرو (مثلاً اس فتح پر خرچ کرنا بادل کھول کر خوشی سے اچھی نیت کی گستاخرچ کرو، بلاشبہ اللہ تعالیٰ پسند کرتے ہیں اچھی طرح

کام کر لے والوں کو۔

معارف مسائل

مسئلہ جاری میں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صلح حدیبیہ کے قانون کے مطابق فوت شدہ عمرہ ادا کرنے کے لئے یہ معیت صحابہ مکہ کے سفر کا ارادہ کیا تو صحابہ کرام جانتے تھے کہ ان کفار کے معاہدوں اور صلح کا کچھ اعتبار نہیں ممکن ہو کہ وہ جنگ کرنے لگیں، تو اس جنگ میں صحابہ کے لئے ایک اشکال تو یہ تھا کہ حرم مکہ میں جنگ کی توہمت آئے گی، جو اسلام میں ناجائز ہو، اس کا جواب پچھل آیت میں درج کیا گیا کہ حرم مکہ کی حرمت مسلمانوں پر ضرور لازم ہے، لیکن اگر کفار حد و حرم میں ہی مسلمانوں سے جنگ کرنے لگیں تو ان کو بھی مدافعت میں جنگ کرنا جائز ہو دوسرا اشکال یہ تھا کہ یہ مہینہ ذیقعدہ کا ہے جو ان چار مہینوں میں سے ہے، جن کو اشہر حرم کہا جاتا ہے اور ان میں کسی سے کسی جگہ جنگ کرنا جائز نہیں، تو اگر مشرکین مکہ نے ہمارے خلاف جنگ شروع کر دی تو ہم اس مہینے میں دفاعی جنگ کیسے کر سکتے ہیں، اس کے جواب میں یہ آیت نازل ہوئی، کہ جیسے حرم مکہ کی حرمت سے حالت دفاع مستثنیٰ ہے، اسی طرح اگر اشہر حرم میں کافر ہم سے قتال کرنے لگیں تو ہم کو بھی ان سے دفاعی جنگ لڑنا جائز ہے۔

مسئلہ: اشہر حرم چار مہینے ہیں، ذیقعدہ، ذی الحجہ، محرم یہ تین ماہ تو مسلسل ہیں، چوتھا مہینہ رجب کا ہے، اسلام سے پہلے بھی ان چار مہینوں میں جنگ کو حرام سمجھا جاتا تھا، اور مشرکین مکہ بھی اس کے پابند تھے، ابتداء اسلام میں بھی سب سے جاری تک یہی قانون نافذ تھا، اسی لئے صحابہ کرام کو اشکال پیش آیا، اس کے بعد یہ حرمت قتال منسوخ کر کے عام قتال کی اجازت باجماع امت دیدی گئی مگر افضل اب بھی یہی ہے کہ ان چار مہینوں میں ابتداء بالقتال نہ کی جائے، صرف مدافعت کی ضرورت سے قتال کیا جائے، اس لحاظ سے یہ کہنا بھی فی الجملہ درست ہو کہ اشہر حرم کی حرمت منسوخ نہیں باقی ہے، جیسے حرم مکہ میں قتال کی اجازت بغیر ضرورت مدافعت دینے سے حرم مکہ کی حرمت منسوخ نہیں ہوئی، بلکہ صرف ایک استثنائی صورت پر عمل ہوا۔

دسواں حکم جہاد کے لئے مال خرچ کرنا

وَأَقِمْ وَفِي سَبِيلِ اللَّهِ، اس میں مسلمانوں پر لازم کیا گیا ہے کہ جہاد کے لئے بقدر ضرورت اپنے اموال بھی اللہ کی راہ میں خرچ کریں، اس سے فقہاء نے یہ حکم بھی نکالا ہے کہ مسلمانوں پر زکوٰۃ فرض کے علاوہ بھی دوسرے حقوق فرض ہیں، مگر وہ نہ دانی ہیں اور نہ ان کے لئے کوئی نصاب اور مقدار

معیّن ہوا بلکہ جب اور جتنی ضرورت ہو اس کا انتظام کرنا سب مسلمانوں پر فرض ہے، اور ضرورت نہ ہو تو کچھ فرض نہیں، جہاد کا خرچ بھی اسی میں داخل ہے۔

وَلَا تُلْغُوا بِاَيِّدِيْكُمْ فِى الْكُفْرِ اِلَّا اَلْكُفْرَ الَّذِى كُنْتُمْ عَلَيْهِ قَبْلَ هٰذَا اِنَّكُمْ كُنْتُمْ عَلٰى شَاكِرٍ اَوْ اَكْفَرٍ
ہلاکت میں ڈالنے کی ممانعت بیان فرمائی ہے، اب یہ بات کہ ہلاکت میں ڈالنے سے اس جگہ کیا مراد ہے؟ اس میں حضرات مفسرین کے اقوال مختلف ہیں، اور اتمام جہاد کی رازی نے فرمایا کہ ان سب اقوال میں کوئی تضاد نہیں سب میں مراد ہو سکتے ہیں، حضرت ابو ایوب انصاریؓ نے فرمایا کہ یہ آیت ہلے ہی ہائے میں نازل ہوئی ہے ہم اس کی تفسیر بخوبی جانتے ہیں، بات یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے اسلام کو غلبہ اور قوت عطا فرمادیا تو ہم میں یہ گفتگو ہوئی کہ اب جہاد کی کیا ضرورت ہے؟ ہم اپنے وطن میں ٹھہر کر اپنے مال و جائیداد کی خبر گیری کریں، اس پر یہ آیت نازل ہوئی، جس نے یہ بتلادیا کہ ہلاکت سے مراد اس جگہ ترک جہاد ہے، اور اس سے ثابت ہوا کہ ترک جہاد مسلمانوں کی ہلاکت و بربادی کا سبب ہے، اسی لئے حضرت ابو ایوب انصاریؓ نے عمر بھر جہاد میں مصروف کر دی، یہاں تک کہ آخر میں قسطنطنیہ میں وفات پا کر وہیں مدفون ہوئے۔

حضرت عباسؓ، حذیفہؓ، قتادہؓ، جابرؓ، غمکؓ ائمہ تفسیر سے بھی یہی مضمون منقول ہے۔ حضرت براہ بن عازبؓ نے فرمایا کہ گناہوں کی وجہ سے اللہ کی رحمت اور مغفرت سے مایوس ہو جانا اپنے آپ کو اپنے ہاتھوں ہلاکت میں ڈالنا ہے، اس لئے مغفرت سے مایوس ہونا حرام ہے۔

بعض حضرات نے فرمایا کہ اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنے میں حد سے تجاوز کرنا کہ بیوی بچوں کے حقوق ضائع ہو جائیں، یہ اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنا ہے، ایسا اسراء جائز نہیں۔ بعض حضرات نے فرمایا کہ ایسی صورت میں قتال کے لئے اقدام کرنا اپنے کو ہلاکت میں ڈالنا ہے، جبکہ یہ اندازہ ظاہر ہے کہ دشمن کا کچھ نہ بگاڑ سکیں گے، خود ہلاک ہو جائیں گے، ایسی صورت میں اقدام قتال اس آیت کی بناء پر ناجائز ہے۔

اور جہاد میں اس آیت کے مطابق یہ سب ہی احکام اس آیت سے مستفاد ہوتے ہیں
وَاَتِمُّوا اِلَیَّ الدِّیْنَ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اِنْ کُنْتُمْ حُبِّیْطَیْنِیْ۔ اس جملے میں ہر کام کو اچھی طرح کرنے کی ترغیب ہے، اور کام کو اچھی طرح کرنا جس کو قرآن میں احسان کے لفظ سے تعبیر کیا ہے، اور طرح کا ہے، ایک عبادت میں دوسرے آپس کے معاملات و معاشرت میں، عبادت میں احسان کی تفسیر حدیث جبریلؑ میں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمائی ہے کہ ایسی طرح عبادت کر دیجیے تم خدا کو دیکھ رہے ہو، اور اگر یہ درجہ حاصل نہ ہو تو کم از کم یہ تو اعتقاد لازم ہے

ہو کہ خدا تعالیٰ تمہیں دیکھ رہے ہیں۔

اور معاملات و معاشرت میں احسان کی تفسیر مسند احمد میں روایت حضرت معاذؓ حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمائی ہے کہ تم سب لوگوں کے لئے وہی پسند کرو جو اپنے لئے پسند کرتے ہو اور جس چیز کو تم اپنے لئے برا سمجھتے ہو وہ دوسروں کے لئے بھی برا سمجھو۔ (منظہری)

وَاتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلّٰهِ اِنْ اُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ وَلَا تَحْلِفُوْا رُءُوسُکُمْ حَتّٰی یَبْلُغَ الْهَدٰی مَحَلَّہٗ فَمَنْ

اور پورا کرو حج اور عمرہ اللہ کے واسطے پھر اگر تم روک دیے جاؤ تو تم پر ہے جو کچھ کہ میسر ہو

الْهَدٰی وَلَا تَحْلِفُوْا رُءُوسُکُمْ حَتّٰی یَبْلُغَ الْهَدٰی مَحَلَّہٗ فَمَنْ

سترہ ہانی سے اور حجامت نہ کرو اپنے سروں کی جب تک نہ ہو پنج پچکے قربانی ابو تمھارے پر پھر ہو

کَانَ مِنْکُمْ مَّرِیضًا اَوْ بِیْہِ اَذٰی مِنْ رَّاسِہٖ فَفِدَیْہٖ مِنْ صِیَامٍ

کونئی تم میں سے بیمار ہو یا اس کو تکلیف ہو سر کی تو بدلہ دیوے روزے یا خیرات

اَوْ صَدَقَۃٍ اَوْ نُسْکًا فَاِذَا اُمِّسْتُمْ فَتَمَتُّوْا بِالْعُمْرَةِ الَّتِیْ لَکُمْ

یا سترہ ہانی، پھر جب تمہاری خاطر جمع ہو تو جو کوئی فائدہ اٹھاوے عمرہ ملا کر

الْحَجَّ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدٰی فَمَنْ لَّمْ یَجِدْ فِیْ صِیَامٍ ثَلَاثَ

حج کے ساتھ تو اس پر ہے جو کچھ میسر ہو سترہ ہانی سے پھر جس کو قربانی نہ ملے تو روزے رکھے تین

اَیَّامٍ فِی الْحَجِّ وَسَبْعَۃٍ اِذَا رَجَعْتُمْ اِلَیَّکُمْ اَشْہَرُ کَامِلَہٗ اُولٰٓئِکَ

حج کے دنوں میں اور سات روزے جب لوگوں یہ دس روزے ہوئے ہوں یہ حکم

لِمَنْ لَّمْ یَکُنْ اَہْلُہٗ حَاضِرًا لِّلْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَالْقَوَا اللّٰہُ وَ

اس کے لئے ہے جس کے گھر والے نہ رہتے ہوں مسجد الحرام کے پاس اور ڈرتے رہو اللہ سے اور

اَعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰہَ شَدِیْدُ الْعِقَابِ ۝ الْحَجَّ اَشْہَرُ مَعْلُوْمَتٍ ۝

جان لو کہ بیشک اللہ کا عذاب سخت ہے، حج کے چند ہیچنے ہیں معلوم،

فَمَنْ فَرَضَ فِیْہِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْۤیَ وَلَا جِدَالَ فِی

پھر جس شخص نے لازم کر لیا ان میں حج تو بے عجب ہو جائز نہیں عورت کے اور گناہ کرنا اور نہ جھگڑا کرنا

الْحَيِّجْ مَا تَفْعَلُوا مِنْ خَيْرٍ يَعْلَمُهُ اللَّهُ وَتَرَوْدُوا فَإِنْ خَيْرٌ

جائے کے زمانے میں اور جو کچھ تم کرتے ہو نیکی اللہ اس کو جانتا ہے اور زاد راہ لے لیا کرو کہ بیشک بہتر

الزَّادِ الْقَوْمِيَّ وَاتَّقُوا يَا أُولِيَ الْأَلْبَابِ ۝ لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ

فانہ زاد راہ کا پہنا ہوا سوال ہے اور محمد سے ڈرتے رہو اسے عقلمند، کچھ گناہ نہیں تم پر کہ

أَنْ تَبْتَغُوا أَفْضَلًا مِنْ رَبِّكُمْ فَإِذَا أَفَضْتُمْ مِنْ عَرَفَاتٍ فَاذْكُرُوا

تلاش کرو فضل اپنے رب کا پھر جب ملوات کے لئے لوتو عرفات سے تو یاد کرو

اللَّهُ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ ۝ وَادْكُرُوا هَذَا بَيْنَكُمْ ۝ وَإِنْ كُنْتُمْ

اللہ کو نزدیک مشعر الحرام کے اور اس کو یاد کرو جس طرح تم کو سکھایا اور بیشک تم سے

مِنْ قَبْلِهِ لَيْسَ الضَّالِّينَ ۝ ثُمَّ أَفِيضُوا مِنْ حَيْثُ أَفَاضَ النَّاسُ

اس سے پہلے نادان ، پھر ملوات کے لئے پھر جہاں سے سب لوگ پھریں،

وَأَسْتَغْفِرُوا لِلَّهِ إِنَّ اللَّهَ عَفُوٌّ رَحِيمٌ ۝ فَإِذَا أَقْضَيْتُمْ

اور مغفرت چاہو اللہ سے بے شک اللہ تعالیٰ بخشنے والا ہے ہر بان، پھر جب پورے کر چکو

مَنَاسِكَكُمْ فَاذْكُرُوا اللَّهَ كَذِكْرِكُمْ آبَاءَكُمْ وَأَشْذِذُوا لَهُ

اپنے حج کے کام کو یاد کرو اللہ کو جیسے تم یاد کرتے تھے اپنے باپ دادوں کو بلکہ اس سے بھی زیادہ یاد کرو

فَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَقُولُ رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا وَمَا لَهُ فِي الْآخِرَةِ

پھر کہ آدمی تو کہتا ہے اے رب ہمارے دے ہم کو دنیا میں اور اس کے لئے آخرت میں کچھ

مِنْ خَلْقٍ ۝ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَقُولُ رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً

حصہ نہیں، اور کوئی ان میں کہتا ہے اے رب ہمارے دے ہم کو دنیا میں خیر اور

وَفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۝ أُولَٰئِكَ لَهُمْ نُصِيبُ

آخرت میں خیر اور بچاؤ ہم کو دوزخ کے عذاب سے، انہی لوگوں کے واسطے حصہ ہے

مِمَّا كَسَبُوا ۝ وَاللَّهُ سَرِيعُ الْحِسَابِ ۝ وَادْكُرُوا اللَّهَ فِي آيَاتِهِ

اپنی کمائی سے اور اللہ جلد حساب لینے والا ہے، اور یاد کرو اللہ کو نعمتی کے چند

تَعْدُوا ذٰلِكَ فَمَنْ تَعَجَّلَ فِي يَوْمَيْنِ فَلَا اِثْمَ عَلَيْهِ وَمَنْ تَاَخَّرَ

دونوں میں پھر جو کوئی جلدی چلا گیا وہ بھی دین میں تو اس پر گناہ نہیں اور جو کوئی روک گیا

فَلَا اِثْمَ عَلَيْهِ لِمَنِ الْاَثْمُ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّكُمْ لَیْسَ

تو اس پر بھی کچھ گناہ نہیں جو کہڑتا ہو اور ڈرتے رہو اللہ سے اور جانی لو بیشک تم سب

تَحْشَرُونَ ۝

اسی کے پاس جمع ہونگے۔

خلاصہ تفسیر

گیارہواں حکم متعلق حج و عمرہ

اور رجب حج یا عمرہ کرنا ہر تو اس حج اور عمرہ کو اللہ تعالیٰ کے راضی کرنے کے واسطے

پورا پورا اور کیا کرو ذکر اعمال و آداب بھی سب بجالاؤ اور نیت بھی خالص ثواب ہی کی ہو پھر

اگر کسی دشمن کی جانب سے یا کسی مرض کے سبب سے حج و عمرہ کے پورا کرنے سے روک دیا جائے

تو اس حالت میں یہ حکم ہے کہ قربانی کا جانور جو کچھ میسر ہو روزیہ کرے اور حج و عمرہ کی جو وضع

اختیار کر رکھی تھی موقوف کرے اس کو احرام کھولنا کہتے ہیں جس کا طریقہ شرع میں سر منڈی

ہو، اور بال کشا دینے کا بھی یہی اثر ہے، اور یہ نہیں کہ فوراً رک ٹوک کے ساتھ ہی تم کو احرام

کھولنا درست ہو جائے، بلکہ اپنے سروں کو احرام کھولنے کی غرض سے، اس وقت تک مت

منڈاؤ جب تک کہ (رہ) قربانی کا جانور جس کے ذبح کا اس حالت میں حکم تھا، اپنے موقع

پر نہ پہنچ جائے اور وہ موقع حرم ہے کہ اس قربانی کا جانور عدد و حرم ہی میں ذبح کیا جاسکتا کہ

وہاں اگر خود نہ جاسکے، تو کسی کے ہاتھ بھیج کر ذبح کرایا جائے جب جانور ذبح ہو جائے اس وقت

احرام کھولنا جائز ہوگا، البتہ اگر کوئی تم میں سے رکھے، بیمار ہو یا اس کے سر میں کچھ زخم یا درد

یا جو درد وغیرہ کی تکلیف ہو اور اس بیماری یا تکلیف کی وجہ سے پہلے ہی سر منڈانے کی ضرورت

پڑے (تو اس کو اجازت ہو کہ وہ سر منڈا کر) قدیم (یعنی اس کا شرعی بدلہ) دیدے (یعنی خواہ مخواہ)

دو تھپے سے یا رچھ مسکینوں کو فی مسکین صدقہ فطر کے برابر یعنی نصف صاع گیہوں (خیرات

دے کے طوطا دیدینے سے یا ایک بکری) ذبح کر دینے سے پھر جب تم امن کی حالت میں ہو (خواہ

نہ پہلے ہی سے کوئی خوف و مزاحمت پیش نہیں آیا، یا ہو کر جا مارا) تو اس صورت میں حج و عمرہ

کے متعلق قرآنی کرنا ہر ایک کے ذمہ نہیں ہو بلکہ خاص (جو شخص عمرو سے اس کو حج کے ساتھ مل کر ملتفق ہوا) یعنی ایسا ہج میں عمرو بھی کیا ہو) تو نقطہ اس پر واجب ہے کہ جو کچھ شرابی میسر ہو (ذبح کرے اور جس نے صرف عمرو کیا ہو یا صرف حج کیا ہو اس پر حج یا عمرہ کے متعلق کوئی مشربانی نہیں) پھر (ایام حج میں حج و عمرہ کو جمع کرنے والوں میں سے) جس شخص کو مشربانی کا جانور میسر نہ ہو (مثلاً غریب ہے) تو اس کے ذمہ بجائے قربانی کے (تین دن کے روزے ہیں (ایام حج میں رکھ کر آخر ان ایام کا نوین تاریخ ذی الحجہ ہو) اور سات (دن کے روزے) ہیں، جبکہ حج سے ٹھکانے لوٹنے کا وقت آجائے (یعنی حج کر چکے خواہ لوٹنا ہو یا کہ وہیں رہنا ہو) یہ پورے دس (دن کے روزے) ہو کر (اور یہ بھی یاد رکھو کہ ابھی حج و عمرہ کے ملانے کا حکم ہوا ہے) یہ (ملانا ہر ایک کو درست نہیں) بلکہ خاص (اس شخص کے لئے (درست) ہے جس کے اہل (و عیال) (مجد حرام (یعنی کعبہ) کے قرب (نواح) میں نہ رہتے ہوں (یعنی حدود حرم مکہ میں ان کا وطن نہ ہو) اور ان سب احکام کی بجا آوری میں اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو کہ کسی امر میں خلافت نہ ہو جائے) اور (خوب) جان لو کہ بلاشبہ اللہ تعالیٰ درپیک اور مخالفت کرنے والوں کو سزائے سخت دیتے ہیں۔

(زمانہ افعال) حج (کا) چند مہینے ہیں جو (مشہور) معلوم ہیں (ایک شوال، و دسرا ذی قعدہ تیسرا دس تاریخ ذی الحجہ) سو جو شخص ان (ایام) میں (اپنے ذمہ) حج مقرر کر لے (حج کا احرام باندھ لے) تو پھر (اس شخص کو) نہ کوئی غرض بات (جائز ہے اور نہ کوئی بے حکمی (درست) ہے) اور نہ کسی قسم کا نزاع (دشمنی) زیبا ہے، بلکہ اس کو چاہئے کہ ہر وقت نیک ہی کاموں میں لگا رہے اور جو نیک کام کرو گے خدا تعالیٰ کو اس کی اطلاع ہوتی ہے (سو اس کا ثمرہ تم کو عنایت ہوگا) اور (جب حج کو جانے لگو تو) خرچ ضرور (ساتھ) لے لیا کرو، سب سے بڑی بات (اور خوبی) خرچ میں رکھو (یہ ہے) بھار ہنا ہے اور اے ذی عقل لوگو! ان احکام کی تعمیل میں (مجھ سے ڈرتے رہو) اور کسی حکم کے خلاف مت کرو۔

(اور اگر حج میں کچھ اسباب تجارت بہرہ لجانا مصلحت سمجھو) تم کو اس میں ذرا بھی گناہ نہیں کہ حج میں (معاش کی تلاش کرو جو (تمہاری قسمت میں) تمہارے پروردگار کی طرف سے (دھی) ہے، پھر جب تم لوگ عرفات میں ٹھہر کر وہاں سے واپس آئے (تو گو کہ مشعر حرام کے پاس (یعنی مزدلفہ میں) اگر شب کو وہاں قیام کر کے) خدا تعالیٰ کی یاد کرو اور یاد کرنے کے طریقہ میں اپنی رائے کو دخل مت دو، بلکہ اس طرح یاد کرو جس طرح تم کو اللہ تعالیٰ نے بتلا رکھا ہے، اور حقیقت میں قبل اس (بتلانے) کے تم محض ہی نادانقت تھے، پھر اس میں اور بھی بات یاد رکھو کہ جیسا قریش نے دستور رکھا تھا کہ تمام حجاج تو عرفات میں ہو کر پھر وہاں سے مزدلفہ کو آتے تھے اور یہ مزدلفہ ہی

میں رہ جاتے تھے، عرفات نہ جاتے تھے، یہ جائز نہیں، بلکہ تم سب کو (خواہ قریش ہوں یا غیر قریش) ضروری ہے کہ اسی جگہ ہو کر واپس آؤ، جہاں اور لوگ جا کر وہاں سے واپس آتے ہیں اور (احکام حج میں قرآنی رسموں پر عمل کرنے سے) خدا تعالیٰ کے سامنے توبہ کرو، یقیناً اللہ تعالیٰ معاف کر دے گا اور ہر بات فرمادیں گے۔

(جاہلیت میں بعضوں کی توبہ عادت تھی کہ حج سے فایز ہو کر مٹی میں جم جھو کر اپنے آباء و اجداد کے مغاور و نصاب میں بیان کیا کرتے، حق تعالیٰ بجائے اس بیہودہ شغل کے اپنے ذکر کی تعلیم کے لئے فرماتے ہیں کہ) پھر جب تم اپنے اعمال حج پر سے کر چکا کرو تو حق تعالیٰ کا (شکر و عظمت کے ساتھ) ذکر کیا کرو جس طرح تم اپنے آباء (و اجداد) کا ذکر کیا کرتے ہو بلکہ یہ ذکر اس سے (بہتر) بڑھ کر ہو (نا چاہئے اور بعضوں کی عادت تھی کہ حج میں ذکر تو اللہ تعالیٰ ہی کا کرتے تھے لیکن چونکہ آخرت کے قائل نہ تھے، لہذا تادم ذکر ان کا صرف دنیا کے لئے دعاء مانگنا ہوتا تھا، حق تعالیٰ صرف دنیا طلبی کی مذمت بیان فرما کر بجائے اس کے خیر دارین طلب کرنے کی ترغیب دینے کے لئے فرماتے ہیں) سو بیٹھے آدمی (جو کہ کافر ہیں) ایسے ہیں جو (دعا میں یوں) کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! ہم کو (جو کچھ دینا ہو) دنیا میں دیدیجئے واپس (سو ان کو جو کچھ ملنا ہو گا دنیا ہی میں مل رہے گا) اور ایسے شخص کو آخرت میں (بوجہ انکار آخرت کے) کوئی حصہ نہ ملے گا، اور بیٹھے آدمی (جو کہ مومن ہیں) ایسے ہیں جو (دعا میں یوں) کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! ہم کو دنیا میں بھی بہتری عنایت کیجئے، اور آخرت میں بھی بہتری دیدیجئے، اور ہم کو عذاب و دوزخ سے بچائیے (سو یہ لوگ اور ہر کے لوگوں کی طرح بے بہرہ نہیں بلکہ) ایسے لوگوں کو (دو دنوں جہان میں) بڑا حصہ ملے گا، بدولت ان کے اس عمل (یعنی طلب خیر دارین) کے اور اللہ تعالیٰ جلدی ہی حساب لینے والے ہیں (کیونکہ قیامت میں حساب ہوگا، اور قیامت نزدیک آتی جاتی ہے) جب حساب جلدی ہونے والا ہے تو وہاں کی بہتری کو مست بھولو، اور (یعنی میں خاص طریقہ سے بھی) اللہ تعالیٰ کا ذکر کرو، کئی روز تک (وہ خاص طریقہ کنکریوں کا خاص تین پتھروں پر مارنا ہے، اور وہ کئی روز دسویں گیارہویں یا چوبیس تاریخ ذی الحجہ کی ہیں، یا تیرہویں بھی کہ ان میں کنکریاں ماری جاتی ہیں) پھر جو شخص کنکریاں مار کر دسویں تاریخ کے بعد (دو دن میں) ملے واپس آنے میں (تجیل کرے) اس پر بھی کچھ گناہ نہیں، اور جو شخص (ان) (دو دن میں) واپس ملے میں (تاخیر کرے) (یعنی بارہویں کو نہ آئے) بلکہ تیرہویں کو (آوی) اس پر بھی کچھ گناہ نہیں (اور یہ سب باتیں) اس شخص کے واسطے (ہیں) جو (خدا سے) ڈرتے (اور نہ ڈرنے والے کو گناہ ثواب ہی سے غرض نہیں) اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو اور خوب یقین رکھو کہ تم سب کو خدا ہی کے پاس جمع ہونا ہے۔

معارف و مسائل

احکام حج و عمرہ | ابراہیم بن کثیر کے بیان کا سلسلہ نصف سورۃ بقرہ سے چل رہا ہے ان میں سے اس لئے اس کے متعلقہ کچھ مسائل قرآن کے بیان میں ضمنی طور پر سورۃ بقرہ کی آیات ۱۲۵ سے ۲۸ تک **وَلَا جَعَلْنَا الْكِبَیَّةَ مَشَاقَّةً** سے شروع ہو کر **وَأَنیَّامُنَا لَیْسَ لَکُمَا نَکَمٌ** ذکر میں آگئے ہیں، پھر بحث قبلہ کے ختم پر ایک آیت ۵۸ **إِنِیَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِن مَّعَامِرِهِ** کے درمیان سعی کرنے کا حکم بھی ضمنی طور پر بیان ہو چکا ہے، اب آیت نمبر ۱۹۶ سے آیت نمبر ۲۰۳ تک **أَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلَّهِ** سے شروع ہو کر **فَمَن تَعَجَّلَ فِیْ یَوْمَئِذَیْنِ الزَّکَمَ** آٹھ آیات مسلسل حج و عمرہ کے احکام و مسائل سے متعلق ہیں۔

حج باجماع امت اسلام کے ارکان میں سے ایک رکن اور فرائض اسلام میں سے ایک اہم فرض ہے جس کی تاکید و اہمیت قرآن کریم کی بہت سی آیات اور بے شمار احادیث صحیحہ میں وارد ہوئی ہے۔ ہجر کے قول کے مطابق حج کی فرضیت ہجرت کے تیسرے یعنی غزوہ احد کے سال میں سورۃ آل عمران کی اس آیت سے ہوتی ہے: **وَذَلَّلْنَاهُ عَلَى النَّاسِ مِجَا الْكِبَیَّةِ** (آیت دین بشر) اسی آیت میں فرضیت حج کی شرائط کا بیان اور باوجود قدرت ہونے کے حج نہ کرنے پر سخت وعید مذکور ہے۔ مذکورہ صدر آٹھ آیتوں میں سے پہلی آیت **أَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلَّهِ**، باتفاق مغتفرین قصہ مدیبنہ میں نازل ہوئی، جو سترہ صریح واقع ہوا ہے، اسی سے یہ معلوم ہو گیا کہ اس آیت کا مقصد حج کی فرضیت بتلانا نہیں بلکہ بتلانی جا چکی ہے بلکہ اس جگہ حج و عمرہ کے کچھ خاص احکام بتلانا مقصود ہے۔ عمرہ کا حکم اور چونکہ سورۃ آل عمران جس میں حج کا فرض ہونا مذکور ہے اس میں صرف حج ہی کا ذکر ہے عمرہ کا نہیں، اور یہ آیت جس میں عمرہ کا ذکر ہے اس میں اصل وجوب و فرضیت کا بیان نہیں بلکہ ذکر اس کا ہے کہ جب کوئی شخص حج یا عمرہ کو بندید احرام شروع کرنے تو اس کا پورا کرنا واجب ہو جاتا ہے، جیسا امام غزالی نماز اور روزہ کا بھی حکم یہی ہے کہ شروع کرنے سے واجب ہو جاتے ہیں، اس لئے اس آیت سے یہ مسئلہ معلوم نہیں ہوتا کہ عمرہ واجب ہو یا نہیں، صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی شروع کرنے تو اس کا پورا کرنا واجب ہو جاتا ہے۔

ابن کثیر نے بحوالہ ترمذی، احمد، بیہقی حضرت عمار بن زید سے نقل کیا ہے کہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ عمرہ واجب ہے، آپ نے فرمایا واجب تو نہیں، لیکن کر لو تو بہتر و افضل ہے، وقال الترمذی هذا حدیث حسن صحیح، اس وجہ سے امام اعظم ابو حنیفہ،

مالک وغیرہ کے نزدیک عمرہ واجب نہیں، سنت ہے، آیت مذکورہ میں جب یہ بیان ہوا کہ حج یا عمرہ کا احرام باندھ لیں تو ان کا پورا کرنا واجب ہو جاتا ہے، تو اب یہ سوال پیدا ہوا کہ اگر احرام باندھنے کے بعد کوئی مجبوری پیش آجائے، حج و عمرہ ادا نہ کر سکیں تو کیا کریں، اس کا بیان بعد کے جملہ میں **وَأَنیَّامُنَا لَیْسَ لَکُمَا نَکَمٌ** سے فرمایا۔

احرام کے بعد کوئی مجبوری پیش آجائے | یہ آیت چونکہ واقعہ مدیبنہ میں نازل ہوئی ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام حج و عمرہ کا احرام باندھا ہوا تھا، انھار نے مکہ میں داخل ہونے اور عمرہ ادا کرنے سے روک دیا، اس پر یہ حکم نازل ہوا کہ احرام کا منہ سے ایک قربانی دینا ہے، بکری، گائے، اونٹ وغیرہ کی جو آسان ہو، قربانی دے کر احرام کھول دیں، مگر ساتھ ہی اگلے جملے **وَلَا تَحْلِفُوا أَسْرًا** میں یہ بھی بتلایا کہ احرام کھولنا جس کی شرعی صورت سر کے بال منڈوانا یا کٹوانا ہے اس وقت تک جائز نہیں، جب تک تحریم کی قربانی اپنے موقع پر پہنچ کر ذبح نہ ہو جاتے۔

موقع پر پہنچنے سے مراد امام اعظم ابو حنیفہ کے نزدیک یہ ہے کہ حسد و حریم میں پہنچ کر ذبح کی جائے، خود نہ کر سکیں تو کسی دوسرے سے کرا دیں، اس آیت میں مجبوری کی یہ صورت کہ کوئی دشمن حائل ہو جائے صراحت مذکور ہے، امام اعظم ابو حنیفہ اور بعض دوسرے ائمہ نے بیماری وغیرہ کی مجبوری کو بھی اس میں با شتر اک علت داخل قرار دیا ہے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل بیان سے یہ امر بھی ثابت ہو گیا کہ مجبوری کی حالت میں قربانی دے کر احرام کھول دینا جائز ہے مگر بعد میں قضاء کرنا واجب ہے، جیسا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ نے اگلے سال عمرہ کی قضا کی ہے اس آیت میں سر منڈانے کو احرام کھولنے کی علامت قرار دیا گیا، جس سے ثابت ہوا کہ احرام میں سر منڈاننا یا بال کٹوانا منوع ہے، اس کی مناسبت سے اگلا حکم یہ بتلایا گیا کہ جو شخص حج و عمرہ کے افعال ادا کرنے سے توجہ نہ کرے، مگر حالت احرام میں کوئی مجبوری سر کے بال منڈانے یا کٹوانے کی پیش آجائے تو وہ کیا کرے۔

حالت احرام میں بال منڈالے | نعمت گانہ **یَسْتَحْضِرُ نَحْمًا** آؤیہ **آذِیْ ذَنْبًا** میں ارشاد فرمایا کہ اگر کسی بیماری کے سبب سر یا بدن کے کسی دوسرے حصہ کے بال منڈانے کی مجبوری ہو یا سر میں بخودیں پیدا ہو کر تکلیف دے رہی ہو تو ایسی صورت میں بال منڈاننا بقدر ضرورت جائز ہے، مگر اس کا ذیہ اور بدلہ یہ ہے کہ روزے رکھے، یا صدقہ دے یا قربانی کرے، قربانی کے لئے تو حد و حریم کی جگہ متعین ہے، روزے اور صدقہ کے لئے کوئی جگہ متعین نہیں، ہر جگہ ادا کر سکتا ہے، قرآن کے الفاظ میں صیام کا کوئی عدد اور صدقہ کی کوئی مقدار مذکور

نہیں ہی مگر حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت کعب بن عجرہ صحابی کی ایسی ہی حالت میں یہ فرمایا کہ تین روزے رکھیں یا چھ مسکینوں کو آدھا صاع گندم کا بطور صدقہ دیدیں (صحیح بخاری) آدھا صاع ہمارے انٹی تولہ کے سیر کے حساب سے تقریباً پونے دو سیر گندم ہوتے ہیں، ان کی قیمت صدقہ کر دینا بھی کافی ہے۔

حج کے مہینوں میں حج و عمرہ کو اسلام سے پہلے عربیہ جاہلیت کا خیال تھا کہ جب حج کے مہینے شروع ہو جائیں یعنی ماہ شوال شروع ہو جائے تو ان ایام میں حج و عمرہ کا جمع کرنا سخت گناہ ہے، اس آیت کے آخری حصے میں ان کے اس خیال کی اصلاح اس طرح کر دی گئی کہ حدیث میقات کے اندر رہنے والوں کے لئے تو حج و عمرہ دونوں کو اٹھریج میں جمع کرنا ممنوع رکھا گیا، کیونکہ ان کو اٹھریج کے دوبارہ عمرہ کے لئے سفر کرنا مشکل نہیں، لیکن حدیث میقات کے باہر سے آنے والوں کے لئے جمع کرنے کو جائز قرار دیا، کہ دور دراز سے عمرہ کے لئے مستقل سفر کرنا ان کے لئے آسان نہیں میقات وہ مہین مقامات ہیں جو اطراف عالم سے مکہ میں آنے والوں کے ہر راستہ پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے متعین ہیں کہ جب بقصد مکہ آنے والا مسافر یہاں پہنچے تو یہاں سے حج یا عمرہ کی نیت سے احرام باندھنا لازم ہے بغیر احرام کے یہاں سے لگے بڑھنا جرم و گناہ ہے، **لَمَنْ لَّمْ يَكُنْ أَهْلَهُ حَاضِرًا** ائمہ حج و عمرہ کا یہی مفہوم ہے، کہ جس شخص کے اہل و عیال مسجد حرام کے قریب و جوار یعنی حدود میقات کے اندر نہیں رہتے، مقصد یہ ہے کہ اس کا وطن حدود میقات کے اندر نہیں ہے اس کیلئے حج و عمرہ کو اٹھریج میں جمع کرنا جائز ہے۔

البتہ جو حج و عمرہ کو اٹھریج میں جمع کریں ان پر واجب ہے کہ دونوں عبادتوں کو جمع کرنے کا شکر ادا کریں، وہ یہ کہ جس کو قربانی دینے کی قدرت ہو وہ ایک قربانی دے، بکری، گائے، اونٹ جو اس کے لئے آسان ہو، لیکن جس شخص کی مالی حیثیت قربانی ادا کرنے کے قابل نہیں اس پر دس روزے اس طرح واجب ہیں کہ تین روزے تو ایام حج کے اندر ہی رکھے یعنی نویں ذی الحجہ تک پورے کر دے، باقی سات روزے حج سے خارج ہو کر جہاں چاہے اور جب چاہے رکھے، وہیں مکہ مکرمہ میں رہ کر پورے کرے یا گھر واپس آکر، اختیار ہے، اگر کوئی شخص تین روزے ایام حج میں نہ رکھ سکا تو پھر ایام ابو حنیفہ اور اکابر صحابہؓ کے نزدیک اس کے لئے قربانی کرنا ہی متعین ہے، جب قدرت ہو کسی کے ذریعہ حرم میں قربانی کرائے (جصاص)

تمتع وستران اٹھریج میں حج کے ساتھ عمرہ کو جمع کرنے کی دو صورتیں ہیں، ایک یہ کہ میقات سے ہی حج اور عمرہ دونوں کا احرام ایک ساتھ باندھ لے اس کو اصطلاح حدیث میں قرآن کہا گیا ہے اس کا احرام حج کے احرام کے ساتھ کھلتا ہے، آخر ایام

حج تک اس کو احرام ہی کی حالت میں رہنا پڑتا ہے، دوسرے یہ کہ میقات سے صرف عمرہ کا احرام باندھ لے اور مکہ مکرمہ پہنچ کر عمرہ کے افعال ادا کر کے احرام کھول دے، پھر اٹھریج تاریخ ذی الحجہ کو منیٰ جانے کے وقت حج کا احرام حرم شریف کے اندر ہی باندھ لے، اس کو اصطلاح میں تمتع کہا جاتا ہے، اور لغتی معنی کے اعتبار سے لغت تمتع دونوں صورتوں پر حاوی ہے، کیونکہ اس کے معنی ہیں حج و عمرہ کو جمع کر کے نفع اٹھانا اور وہ دونوں صورتوں میں برابر ہے، قرآن کی آیت مذکورہ میں **فَمَنْ تَمَتَّعَ** اسی عام معنی میں ہے۔

احکام حج و عمرہ میں خلافت و رزی آخر آیت میں ازل تقویٰ اختیار کرنے کا حکم دیا جس کے معنی ہیں اور کوتاہی موجب عذاب ہے اللہ تعالیٰ کے احکام کی خلاف ورزی سے ڈرنے اور پہنچنے کے، اس کے بعد فرمایا: **وَأَمَّا لَكُمْ أَنْ تَدْعُوا مَشْرِيقًا أَوْ مَغْرِبًا**، یعنی جو شخص جان بوجہ کہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی خلاف ورزی کرتا ہے اس کے لئے اللہ تعالیٰ کا عذاب سخت ہے، آجکل حج و عمرہ کو جانے والے بکثرت اس سے غافل ہیں، ازل تو حج و عمرہ کے احکام معلوم کرنے ہی کی پوری کوشش نہیں کرتے، پھر معلوم بھی ہو تو بکثرت ان کے مطابق عمل نہیں کرتے، غلط کاموں اور ساختیوں کی بے پردائی سے بہت سے واجبات تک چھوٹ جاتے ہیں، اور آداب و سنن کا تو کہنا کیا، اللہ تعالیٰ سب کو اصلاح عمل کی توفیق عطا فرمادیں۔

احکام حج کی آیتوں میں سے **الْحَجَّ أَشْهَرُ مَنَاسِكٍ**، اٹھریج کی حج ہے جس کے معنی ہیں دوسری آیت اور اس کے مساں مہینہ، پھل آیت میں بتلایا گیا تھا کہ جو کوئی حج یا عمرہ کا احرام باندھ لے، تو اس پر لازم آتا ہے کہ اس کے احکام پورے ادا کرے، ان دونوں میں عمرہ کے لئے تو کوئی تاریخ اور مہینہ معین نہیں، سال بھر میں جب چاہیں کر سکتے ہیں، لیکن حج کے لئے مہینہ اور اس کے افعال و اعمال کے لئے خاص تاریخیں اور اوقات مقرر ہیں، اس لئے اس آیت کے شروع میں یہ بتلادیا کہ حج کا معاملہ عمرہ کی طرح نہیں ہے، اس کے لئے کچھ مہینے مقرر ہیں، جو معروف و مشہور ہیں، جاہلیت عرب کے لیکر زمانہ اسلام تک یہی مہینے حج کے مقرر رہے ہیں، وہ مہینے شوال ذیقعدہ اور دس روز ذی الحجہ کے ہیں، جیسا کہ حدیث میں بروایت ابوامامہؓ و ابن عمرؓ منقول ہے (منظری) شوال سے حج کے مہینے شروع ہونے کا حاصل یہ ہے کہ اس سے پہلے حج کا احرام باندھنا جائز نہیں، بعض ائمہ کے نزدیک تو قبسل شوال کے احرام سے حج کی ادائیگی ہی نہیں ہو سکتی، امام اعظم ابو حنیفہؒ کے نزدیک اس احرام سے حج تو ادا ہو جائے گا مگر مکروہ ہوگا (منظری)

فَمَنْ تَمَتَّعَ فلا تَرَکَ وَلَا تَسُوِّغَ الیٰ فِی الْحَجِّ، اس میں حج کا احرام باندھنے والے کے لئے کچھ منفی آداب و احکام کا بیان ہے، جن سے حالت احرام میں

پہن کر لازم و واجب ہو، وہ تین چیزیں ہیں: رفت، فسق، جدال۔

رفت ایک لفظ جامع ہے جس میں عورت سے مباشرت اور اس کے مقدمات یہاں تک کہ زبان سے عورت کے ساتھ اس کی مکمل گفتگو بھی داخل ہے، محرم کو حالت احرام میں یہ سب چیزیں حرام ہیں، تعریض و کناہ کا مضائقہ نہیں۔

فسق کے لفظی معنی خروج کے ہیں، اصطلاح قرآن میں عدول بھی اور ناسرمانی کو فسق کہا جاتا ہے جو اپنے عام معنی کے اعتبار سے سب گناہوں کو شامل ہے، اسی لئے بعض حضرات نے اس جگہ عام معنی ہی مراد لئے ہیں، مگر حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے اس جگہ فسق کی تفسیر مخطورات احرام سے فرمائی ہے، یعنی وہ کام جو حالت احرام میں ممنوع و ناجائز ہیں اور یہ ظاہر ہے کہ اس مقام کے مناسب یہی تفسیر ہے، کیونکہ عام گناہوں کی مانعت احرام کے ساتھ خاص نہیں ہر حال میں حرام ہیں۔

وہ چیزیں جو اصل سے گناہ نہیں مگر احرام کی وجہ سے ناجائز ہو جاتی ہیں چھ چیزیں ہیں: اول عورت کے ساتھ مباشرت اور اس کے تمام متعلقات یہاں تک کہ مکمل گفتگو بھی، دوسرے بڑی جانوروں کا شکار، خود کرنا یا شکاری کو بتلانا، تیسرے بال یا ناخن کٹوانا، چوتھے خوشبو کا استعمال یہ چار چیزیں تو مرد و عورت دونوں کے لئے حالت احرام میں ناجائز ہیں، باقی دو چیزیں مردوں کے ساتھ خاص ہیں، یعنی بٹے بٹے کپڑے پہننا، اور سر اور چہرے کو ڈھانپنا، امام اعظم ابوحنیفہؒ و مالکؒ کے نزدیک چہرہ کو ڈھانپنا حالت احرام میں عورت کے لئے بھی ناجائز ہے، اس لئے یہ بھی مشترک مخطورات احرام میں شامل ہے۔

ان چھ چیزوں میں پہلی یعنی عورت سے مباشرت وغیرہ اگرچہ فسق میں داخل ہے لیکن اس کو فسق سے پہلے الگ کر کے لفظ رفت سے اس لئے بتلادیا کہ احرام میں اس سے اجتناب سب سے زیادہ اہم ہے، کیونکہ دوسرے مخطورات احرام کا تو کوئی بدل اور کفارہ بھی ہو جاتا ہے، اور مباشرت کی بعض صورتیں ایسی بھی ہیں کہ اگر ان میں کوئی مسببلا ہو جائے تو حج ہی فاسد ہو جاتا ہے اس کا کوئی کفارہ بھی نہیں ہو سکتا، مثلاً دقوت عرفات سے پہلے بی بی سے صحبت کر لی، تو حج فاسد ہو گیا، اور اس کا جبرانہ بھی گھاسے یا اونٹ کی قربانی سے دینا پڑے گا، اور اگلے سال پھر حج کرنا پڑے گا، اس مزید اہمیت کی بنا پر اس کو خلافت ذق کے لفظ سے مستقلاً بیان فرمادیا۔

جدال کے معنی ایک دوسرے کو پھپھانے کی کوشش کے ہیں، اس لئے سخت قسم کے جھگڑے کو جدال کہا جاتا ہے، یہ لفظ بھی بہت عام ہے، اور بعض حضرات مفسرین نے عام ہی معنی مراد لئے ہیں، اور بعض حضرات نے مقام حج و احرام کی مناسبت سے اس جگہ جدال کے معنی یہ

لئے ہیں، کہ جاہلیت عرب کے لوگ مقام دقوت میں باختلاف رکھتے تھے، کچھ لوگ عرفات میں دقوت کرنا ضروری سمجھتے تھے جیسا کہ حقیقت ہے، اور کچھ مزدلفہ میں دقوت ضروری کہتے تھے، عرفات میں جانے کو ضروری نہیں سمجھتے تھے، اور اسی کو موقع ابراہیم علیہ السلام قرار دیتے تھے، اسی طرح اوقات حج کے معاملہ میں بھی اختلاف تھا، کچھ لوگ ذی الحجہ میں حج کرتے تھے، اور کچھ ذیقعدہ ہی میں کر لیتے تھے، اور پھر ان معاملات میں باہمی نزاعات اور جھگڑے ہوتے تھے، ایک دوسرے کو گمراہ کہتا تھا، قرآن کریم نے لاجچہ الیٰ فرما کر ان جھگڑوں کا خاتمہ فرمایا، اور جو بات حق تھی کہ دقوت فرض عرفات میں اور پھر دقوت واجب مزدلفہ میں کیا جائے، اور حج صرف ذی الحجہ کے ایام میں کیا جائے، اس کا اعلان کر کے اس کے خلاف جھگڑا کرنے کو ممنوع کر دیا۔

اس تفسیر و تقریر کے لحاظ سے اس آیت میں صرف مخطورات احرام کا بیان ہوا اگرچہ فی نفسہ جائز ہیں، مگر احرام کی وجہ سے ممنوع کر دی گئی ہیں، جیسے نماز روزہ کی حالت میں کھانا پینا، کلام کرنا وغیرہ جائز چیزیں کہ منع کر دیا گیا ہے۔

اور بعض حضرات نے اس جگہ فسق و جدال کو عام معنی میں لیکر مقصد یہ بتلادیا کہ اگرچہ فسق و گناہ اسی طرح اہم جدال و خلاف ہر جگہ ہر حال میں مذموم و گناہ ہے، لیکن حالت احرام میں اس کا گناہ اور زیادہ شدید ہو جاتا ہے، مبارک ایام اور مقدس سرزمین میں جہاں صرف اللہ کے لئے عبادت کے واسطے آتے ہیں، اور بے نیکی بے نیکی پکار رہے ہیں، احرام کا لباس ان کو ہر وقت اس کی یاد دہانی کر رہا ہے کہ تم اس وقت عبادت میں ہو، ایسی حالت میں فسق و فجور اور نزاع و جدال انتہائی پیاکی اور اسشد ترین گناہ ہو جاتا ہے۔

اس عام معنی کے اعتبار سے اس جگہ رفت، فسق، جدال سے روکنے اور ان کی حرمت کو بیان کرنے میں ایک حکمت یہ بھی ہر صحت ہے کہ مقام حج اور زمانہ حج کے حالات ایسے ہیں کہ ان میں انسان کو ان تینوں چیزوں میں ابتلا کے مواقع بہت پیش آتے ہیں، حالت احرام میں اکثر اپنے اہل و عیال سے ایک طویل مدت تک علیحدہ رہنا پڑتا ہے، اور پھر مطاف و منیٰ، عرفات، مزدلفہ منیٰ کے اجتماعات میں کتنی بھی احتیاط برتی جائے عورتوں مردوں کا اختلاط ہو ہی جاتا ہے، ایسی حالت میں نفس پر قابو پانا آسان نہیں، اس لئے سب سے پہلے رفت کی حرمت کا بیان فرمادیا، اس طرح اس عظیم الشان اجتماع میں چوری وغیرہ دوسرے گناہوں کے مواقع بھی بے شمار پیش آتے ہیں، اس لئے لاجچہ الیٰ کی ہدایت فرمادی، اسی طرح سفر حج میں اول سے آخر تک بے شمار مواقع اس کے بھی پیش آتے ہیں کہ رقاء سفر اور دوسرے لوگوں سے جگہ کی تنگی اور دوسرے اسباب کی بنا پر جھگڑا والی ہو جائے، اس لئے لاجچہ الیٰ کا حکم دیا گیا۔

بلاغت قرآن

بلاغت قرآن

اس آیت فَلَا تَهْتَفُوا بِمَا مَنَعُوا آلَهُمْ جَعَلْتُمُ الْكُفْرَ وَالْكَفَارَةَ أَكْبَرُ مِنْ دِينِ اللَّهِ الَّذِي فَتَنَكُمْ ۚ وَاللَّهُ يَخْتَارُ ۚ کے الفاظ نفی کے الفاظ ہیں کہ یہ سب چیزیں حج میں نہیں ہیں، حالانکہ مقصود ان چیزوں سے ہنسی اور مالت کرنا ہے، جس کا مقصد یہ تھا کہ لا تَهْتَفُوا وَلَا تَقْسَمُوا وَلَا تَجَادِلُوا کہا جاتا، مگر یہاں نفی کی جگہ نفی کے الفاظ رکھ کر اس طرف اشارہ فرمادیا کہ ان افعال کی حج میں کوئی گنجائش اور تصویب نہیں۔

وَمَا تَلْعَلُوا مِنْ خَيْرٍ يَعْلَمْهُ اللَّهُ۔ محظورات و منوعات احرام بیان فرمائے کے بعد آخر میں اس جملے میں یہ ہدایت دی گئی کہ حج کے مبارک ایام اور مقدس مقامات میں تو صرف یہ نہیں کہ محظورات اور گناہوں سے بچو، بلکہ غلیمت جان کر عبادت و ذکر اللہ اور نیک کاموں میں لگے رہو، اتم جو بھی نیک کام کرو گے وہ اللہ کے علم میں ہو اور تمہیں اس پر بڑے انعامات ملیں گے۔

ذکرِ رَدِّ اِذَا كَانَ خَيْرَ الْمَرَادِ النَّفْسِي۔ اس میں ان لوگوں کی اصلاح ہے جو حج و عمرہ کے لئے بے سر سامانی کے ساتھ تکل کھڑے ہوتے ہیں، اور دعویٰ یہ کرتے ہیں کہ ہم اللہ پر توکل کرتے ہیں، پھر راستہ میں بھیک مانگنا پڑتی ہے، یا خود بھی تکلیف اٹھاتے ہیں اور دوسروں کو بھی پریشان کرتے ہیں، اُن کی ہدایت کے لئے حکم ہوا کہ سفر حج کے لئے ضروریات سفر ساتھ لینا چاہئے، یہ توکل کے منافی نہیں، بلکہ توکل کی حقیقت یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے دیئے ہوئے اسباب و وسائل کو اپنے معتدور کے مطابق حاصل اور جمع کرے، پھر اللہ پر توکل کرے، رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے توکل کی یہی تفسیر منقول ہے بالکل ترکِ اسباب کا نام توکل رکھنا چالت ہے۔

سفر حج میں تجارت یا مزدوری کرنا کیسا ہے؟

لَيْسَ عَلَيْهِمْ جُنَاحٌ أَنْ يَتَّبِعُوا فَضْلًا مِمَّا دَرَسُوا، یعنی تم پر اس میں کوئی گناہ نہیں کہ تم سفر حج میں تجارت یا مزدوری کے ذریعے کچھ مزدوری کما لو اور اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا رزق حاصل کرو۔ واقعہ نزول اس آیت کا یہ ہے کہ زمانہ جاہلیت میں اہل عرب جس طرح تمام عبادات و معاملات کو منج کر کے طرح طرح کی بیہودہ رسمیں ان میں شامل کر دی تھیں، اور عبادات کو بھی مکمل تماشہ بنا دیا تھا، اسی طرح افعال حج میں بھی طرح طرح کی بیہودگیاں کرتے تھے، منیٰ کے عظیم حبیبار میں ان کے خاص خاص بازار لگتے تھے، سناٹس ہوتی تھیں، تجارتوں کے فروغ کے ذرائع لگائے جاتے تھے، اسلام آیا، اور حج مسلمانوں پر فرض کیا گیا تو ان تمام بیہودہ رسموں کا قلع قمع کیا گیا، صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین جو اللہ تعالیٰ کی رضا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات پر عمل جانے والے تھے، اب ان کو یہ خیال ہوا کہ ایام حج میں تجارت کرنا یا مزدوری کر کے کچھ کما لینا یہ بھی جاہلیت کی پیداوار ہے، شاید اسلام میں اس کی مطلقاً حرمت و مانعت ہو جائے، یہاں تک کہ ایک صاحب حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے

یاس آئے، اور یہ سوال کیا کہ ہمارا پیشہ پہلے سے یہ ہے کہ ہم اونٹ کرایہ پر چلاتے ہیں، کچھ لوگ پہلے سے اونٹ چج کے لئے کرایہ پر لے جاتے ہیں۔ ہم اُن کے ساتھ جاتے ہیں اور چج کرتے ہیں، کیا ہمارا چج نہیں ہو گا، حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے فرمایا کہ ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تھا، اور آپؐ وہی سوال کیا تھا، جو تم مجھ سے کر رہو ہو، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو اس وقت کوئی جواب نہ دیا، یہاں تک کہ یہ آیت نازل ہوئی: لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُواْ اَفْضَلًا مِّنْهُنَّ بِكُمُ، اَسْ وقت آپؐ نے اس شخص کو بلوایا اور فرمایا کہ ہاں تمہارا چج صحیح ہے۔

الغرض اس آیت نے یہ واضح کر دیا کہ اگر کوئی شخص روزانہ حج میں کوئی بیع و شرا یا مزدوری کرے جس سے کچھ نفع ہو جائے تو اس میں کوئی گناہ نہیں، ہاں کفار عرب نے جو حج کو تجارت کی منڈی اور منافق حکماء بنا لیا تھا اس کی اصلاح قرآن کے دو لفظوں سے کر دی گئی، ایک تو یہ کہ جو کچھ کمائیں اس کو اللہ تعالیٰ کا فضل اور عطا سمجھ کر حاصل کریں، شکر گزار ہوں، محض سرمایہ سیٹھا مقصد نہ ہو، فَضْلًا مِّنْ رَبِّكَمْ میں اسی کی طرف اشارہ ہے، دوسرے فَبِئْسَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ کے لفظ نے یہ بتلادیا کہ اس کمائی میں تم پر کوئی گناہ نہیں، جس میں ایک اشارہ اس طرف ہو کہ اگر اس سے بھی اجتناب کیا جائے تو بہتر ہے، کیونکہ اخلاص کامل میں فرق آتا ہے، اور حقیقت مسئلہ کی یہ کہ اس کا مدار اصل نیت پر ہے، اگر کسی شخص کی نیت اصل میں دنیوی نفع تجارت یا مزدوری ہے اور ضمنی طور پر حج کا بھی قصد کر لیا، یا نفع تجارت اور قصد حج دونوں مساوی صورت میں ہیں تب تو یہ اخلاص کے خلاف ہی، حج کا ثواب اس سے کم ہو جائیگا اور برکات حج جیسی عین ہونی چاہئے وہ حاصل نہ ہوں گی، اور اگر اصل نیت حج کی ہے اسی کے شوق میں نکلا ہے، لیکن مصارف حج میں یا گھر کی ضروریات میں تنگی ہو، اس کو پورا کرنے کے لئے کوئی معمولی تجارت یا مزدوری کر لی یہ اخلاص کے بالکل منافی نہیں، ہاں اس میں بھی بہتر یہ ہے، کہ خاص ان پانچ ایام میں جن میں حج کے افعال ادا ہوتے ہیں ان میں کوئی مشغلہ تجارت یا مزدوری کا نہ رکھے، بلکہ ان ایام کو خالص عبادت و ذکر میں گزارے، اسی وجہ سے بعض علماء نے خاص ان ایام میں تجارت و مزدوری کو ممنوع بھی فرمایا ہے۔

عرفات میں وقوف اور اس کے بعد مزدلفہ کا وقوف

اس کے بعد اسی آیت میں ارشاد ہے، **فَإِذَا أَقَضْتُمْ مِنْ عَرَفَاتٍ**
فَإِذْ كُنتُمْ وَاللَّهُ عِنْدَ الْمُشْعِيِّ الْحَرَامِ وَإِذْ كُنتُمْ لَمَّا هَدَّيْنَاكُمْ
لِرَاسِ الْكُوفَةِ مِنْ بَيْنِ الْأُغْدِيِّينَ ”پھر جب تم عرفات سے واپس آنے لگو تو مشعر
 حرام کے پاس خدا تعالیٰ کی یاد کرو، اور اس طرح یاد کرو جس طرح تم کو بتلا رکھا ہے اور حقیقت
 میں اللہ تعالیٰ کے بتلانے سے پہلے تم محض ہی نادان تھے، اس میں بتلا یا گیا ہے کہ عرفات

سے واپس میں رات کو مزدلفہ میں قیام اور اس کا خاص ذکر واجب ہیں۔

عرفات، لفظ آج ہے، اور ایک خاص میدان کا نام ہے جس کے حدود اور بجمہ معروف و مشہور ہیں، یہ میدان حرم سے خارج واقع ہوا ہے، حجاج کو اس میں پہنچنا اور زوالی آفتاب مغرب تک یہاں قیام کرنا حج کا اہم ترین فرض ہے جس کے فوت ہونے کا کوئی کفارہ اور ذبیہ نہیں ہو سکتا۔

عرفات کو عرفات کہنے کی بہت سی وجہ بتلائی جاتی ہیں، ان میں واضح یہ ہے کہ اس میدان میں انسان اپنے رب کی معرفت اور بذریعہ عبادت و ذکر اللہ تعالیٰ کا تقرب حاصل کرتا ہے، نیز مشرق و مغرب کے مسلمانوں کو آپس میں تعارف کا ایک موقع ملتا ہے، ارشاد قرآنی میں اس کی تاکید فرمائی ہے کہ عرفہ کے دن بعد مغرب عرفات سے واپس آتے ہوئے مشعر حرام کے پاس ٹھہرنا چاہئے، مشعر حرام ایک پہاڑ کا نام ہے، جو مزدلفہ میں واقع ہے، مشعر کے معنی شمار اور علامت کے ہیں اور حرام بمعنی محترم و مقدس کے ہے، معنی یہ ہیں کہ پہاڑ شمار اسلام کے اظہار کے لئے ایک مقدس مقام ہے، اس کے آس پاس کے میدان کو مزدلفہ کہتے ہیں، اس میدان میں رات گزارنا اور مغرب و عشاء دونوں نمازوں کو ایک وقت میں مزدلفہ میں پڑھنا واجب ہے، مشعر حرام کے پاس اللہ تعالیٰ کو یاد کرنا، اگرچہ ہر طرح کے ذکر اللہ کو شامل ہے، مگر خصوصیت کے دونوں نمازوں کو ایک وقت میں مغرب کو عشاء کے ساتھ ادا کرنا اس جگہ کی مخصوص عبادت ہے۔

آیت کے جملہ **وَاذْكُرُوا اللّٰهَ عِنْدَ الْمَذَارِجِ** میں شاید اس کی طرف اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی یاد اور ذکر کے لئے جو طریقہ بتلایا ہے اسی طرح اس کو یاد کرو، اپنی راستے اور قیاس کو اس میں دخل نہ کیونکہ راستے اور قیاس کا مقصد ہی تو یہ تھا کہ مغرب کی نماز مغرب کے وقت میں پڑھی جاتی، عشاء کی عشاء کے وقت میں، لیکن اس روز اس مقام پر حق تعالیٰ کو یہی پسند ہو کہ مغرب کی نماز مؤخر کی جائے، اس کو عشاء کے ساتھ پڑھا جائے، ارشاد قرآنی **وَاذْكُرُوا اللّٰهَ عِنْدَ الْمَذَارِجِ** سے ایک اور بھی اصولی مسئلہ نکل آیا، کہ ذکر اللہ اور عبادت میں آدمی خود مختار نہیں کہ اللہ تعالیٰ کو جس طرح چاہے یاد کرے، اور جس طرح چاہے اس کی عبادت کرے، بلکہ ذکر اللہ اور ہر عبادت کے خاص آداب ہیں، ان کے موافق ادا کرنا ہی عبادت ہے، اس کے خلاف کرنا جائز نہیں، اور اس میں کمی بیشی یا مقدم مؤخر کرنا خواہ اس میں ذکر اللہ کی کچھ زیادتی بھی ہو وہ اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں، لہذا عبادت اور صدقہ و خیرات وغیرہ میں جو لوگ بلا دلیل شرعی اپنی طرف کچھ خصوصیت اور اضافے کر لیتے ہیں، اور ان کی پابندی کو ضروری سمجھ لیتے ہیں، حالانکہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو ضروری قرار نہیں دیا، اور ان افعال کے نہ کرنے والوں کو خطا وار سمجھتے ہیں

اس آیت نے ان کی غلطی کو واضح کر دیا کہ وہ اہل جاہلیت کی سی عبادت ہے، کہ اپنی راستے و قیاس سے عبادت کی صورتیں گھڑ رکھی تھیں، اور چند رسوم کا نام عبادت رکھ لیا تھا۔

اس کے بعد دوسری آیت میں ارشاد ہے، **ثُمَّ أَفِيضُوا مِنْ حَيْثُ أَفَاضَ النَّاسُ وَاسْتَغْفِرُوا لِلّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ** یعنی پھر تم سب کو ضروری ہے کہ اسی جگہ ہو کر واپس آؤ جہاں اور لوگ جا کر واپس آتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ کے سامنے توبہ کرو، یقیناً اللہ تعالیٰ معاف کر دیں گے اور مہربانی فرما دیں گے۔

اس جگہ کا شان نزول یہ ہو کہ قریش عرب جو بیت اللہ کے محافظ و مجاور تھے اور سائے عرب میں ان کا اقتدار مسلم تھا، اور ان کی ایک ممتاز حیثیت تھی، زمانہ جاہلیت میں وہ اپنی امتیاز شان بنانے کے لئے یہ حرکت کرتے تھے، اور سب لوگ تو عرفات کو جاتے اور وہاں وقوف کر کے واپس آتے تھے، یہ لوگ راستہ میں مزدلفہ کے اندر ہی ٹھہر جاتے تھے، اور کہتے تھے کہ ہم چونکہ بیت اللہ اور حرم کے مجاور ہیں، اس لئے حدود حرم سے باہر جانا ہمارے لئے مناسب نہیں، مزدلفہ حدود حرم کے اندر ہے، اور عرفات سے خارج ہے، یہ پہاڑ کے مزدلفہ ہی میں قیام کر لیتے، اور وہیں سے واپس آ جاتا کرتے تھے، اور درحقیقت وجہ اس جیلہ پہاڑ کی اپنا فخر و غرور اور عام لوگوں سے ممتاز ہو کر رہنا تھا، حق تعالیٰ نے ان کی غلط کاری واضح فرمادی، اور ان کو حکم دیا کہ تم بھی وہیں جاؤ جہاں سب لوگ جاتے ہیں، یعنی عرفات میں اور پھر وہیں سے سب کے ساتھ واپس آؤ۔ اول تو عام انسانوں سے اپنے آپ کو ممتاز کر کے رکھنا خود ایک ٹھکانہ فعل ہے جس سے ہمیشہ ہی پرہیز لازم ہے، خصوصاً حج کے ایام میں جہاں لباس حرام اور پھر قیام و مقام کی ایک کٹی کے ذریعہ اسی کا سبق دینا ہے کہ انسان سب برابر ہیں، امیر و غریب یا عالم و جاہل یا بڑے چھوٹے کا یہاں کوئی امتیاز نہیں، حالت احرام میں یہ امتیاز ہی شان بنانا اور بھی زیادہ جرم ہے۔

انسانی مساوات کا زریں سبق | اس ارشاد قرآنی سے اصولی معاشرت کی ایک اہم بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ انسانوں کی بہتری علی صورت قیام و مقام میں بڑوں کو چاہئے کہ چھوٹوں سے الگ ممتاز ہو کر نہ رہیں بلکہ مل جل کر رہیں، کہ اس میں باہمی اخوت و ہمدردی اور محبت و تعلق پیدا ہوتا ہے، اور امیر و غریب کی تعزین ملتی ہے، مزدور و سرمایہ دار کی جنگ ختم ہو جاتی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے آخری حج کے خطبہ میں اس کو خوب واضح کر کے ارشاد فرمایا، کہ کسی عربی کو بھی پر یا گورے کو کالے پر کوئی فضیلت نہیں، فضیلت کا مسد ر تقویٰ اور اطاعت خداوندی پر ہے، اسی لئے جو لوگ ان کے خلاف مزدلفہ میں قیام کر کے اپنی ممتاز حیثیت بنانا چاہتے تھے، ان کے اس فعل کو گناہ قرار دے کر ان پر لازم کیا کہ اپنے اس گناہ سے توبہ استغفار کریں کہ اللہ تعالیٰ ان کی خطائیں

معاف فرادیں اور اپنی رحمت فرادیں۔

رسوم جاہلیت کی اصلاح بتائی میں | ہر قسمی پانچویں اور چھٹی آیات میں چند رسوم جاہلیت کی اصلاح کی گئی
نفل و اجتماعات کی ممانعت | ہر ایک تو یہ کہ عرب زمانہ جاہلیت میں عرفات و مزدلفہ اور طواف
و قربانی سے فارغ ہو کر جب منیٰ میں قیام کرتے تھے قرآن کی مجلسیں صرف اس کام کے لئے ہوتی
تھیں کہ مشاعرے منعقد کریں، اور ان میں اپنے مفاخر اور اپنے آباء و اجداد کے مفاخر اور کارناموں
کا بیان کریں، ان کی مجلسیں ذکر اللہ سے یکسر خالی ہوتی تھیں، ان مبارک ایام کو ایسی اغوار و نفول
جیسندوں میں ضائع کرتے تھے، اس لئے ارشاد ہوا کہ جب تم اپنے افعال احرام کو پورا کر چکو اور
منیٰ میں قیام کرو، تو وہاں رہ کر اللہ تعالیٰ کو یاد کرو، اپنے آباء و اجداد کو یاد کرنا اور مخصوص
ان کے جھوٹے بچے مفاخر اور کارناموں کو بیان کرنا چھوڑ دو، جتنا تم ان کو یاد کرتے ہو اس کی جگہ
بلکہ اس سے زیادہ خدا تعالیٰ کو یاد کرو، اور ذکر اللہ میں مشغول رہو، قرآن کی اس آیت نے عرب کی
ایک جاہلانہ رسم کو مٹا کر مسلمانوں کو یہ ہدایت کی کہ یہ ایام اور یہ مقام عبادت اور ذکر اللہ
کے لئے مخصوص ہیں، ان میں ذکر اللہ و عبادت کے جو فضائل و برکات ہیں وہ پھر ہاتھ نہ آئیں گے
ان کو غلبت جانتا جاتے۔

علامہ ازہر ج ایک ایسی عبادت ہے جو عموماً سفر طویل کی مشقت، اہل و عیال کی مفارقت
کاروبار کو ترک کرنے اور ہزاروں روپے اور بہت سا وقت خرچ کرنے کے بعد حاصل ہوتی ہو
اس میں حواشی کا پیش آجانا کچھ بعید نہیں کہ آدمی باوجود کوشش کے اپنے مقصد ج
میں کامیاب نہ ہو سکے، جب اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے تمام موانع ہٹا کر آپ کے مقصد میں
کامیاب فرمایا اور فرائض ج پورے ہو گئے، تو یہ مقام شکر ہے، جس کا اقتضایہ یہ ہے کہ اور
زیادہ اللہ تعالیٰ کے ذکر میں مشغول رہو، ان اوقات کو فضول و اجتماعات اور نفول کام یا کلام میں
ضائع نہ کرو، اہل جاہلیت ان اوقات میں اپنے آباء و اجداد کے تذکرے کرتے تھے، جن کا کوئی نفع
دین و دنیا میں نہ تھا، تم اس کی جگہ اللہ کا ذکر کرو جو نور ہی نور اور نفع ہی نفع ہے، دنیا کے لئے
بھی آخرت کے لئے بھی، ابھل اگرچہ مسلمانوں میں وہ رسم جاہلیت تو نہیں رہی، کہ مشاعرے
قائم کریں اور آباء و اجداد کے تذکرے کریں، لیکن آج بھی ہزاروں مسلمان ہیں جو ان ایام کو نفول
اجتماعات میں فضول و عورتوں اور تفریحات میں صرف کرتے ہیں، یہ آیت ان کی تنبیہ کے لئے
کافی ہے۔

بعض حضرات مفسرین نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا کہ تم اللہ تعالیٰ کو ایسا یاد کرو جیسے
بچپن میں اپنے باپ کو یاد کرتے ہیں کہ ان کا سب پہلا اور سب سے زیادہ کلام یا آیت یا آیت ہوتا ہو

تم اب بالغ ہو، جوان ہو، مائل ہو، یا آیت یا آیت کی جگہ یا آیت یا آیت کو اختیار کرو، اور اس پر نظر ڈالو
کہ بچہ اپنے باپ کو اس لئے پکارتا ہے کہ وہ اپنے تمام کاموں میں اپنے آپ کو باپ کا محتاج سمجھتا ہے،
انسان اگر ذرا غور کرے تو وہ ہر وقت ہر حال میں اللہ تعالیٰ کا محتاج اس سے زیادہ ہے، جیسا بچہ اپنے
باپ کا محتاج ہے، نیز بعض اوقات کچھ لوگ اپنے باپ کا ذکر نثر بھی کیا کرتے ہیں، جیسے اہل جاہلیت
کرتے تھے تو اس آیت نے یہ بھی ہدایت کر دی کہ خود عزت کے لئے بھی ذکر اللہ سے زیادہ کوئی چیز
مؤثر نہیں (روح البیان)

ایک اور رسم جاہلیت کی اصلاح دین | جس طرح جاہلیت کی یہ رسم بیہودہ تھی کہ ان مبارک ایام کو اپنے باپ
دنیا کی طلب میں اسلامی اعتدال | دادوں کے تذکروں اور مشاعروں میں گذاریں، اسی طرح کچھ
لوگوں کی یہ عادت تھی کہ اگرچہ ایام حج میں مشغول تو ذکر اللہ اور دعاؤں ہی کا رکھتے تھے، مگر ان کی
تمام دعائیں صرف دنیوی حاجات اور دنیا کی راحت و عزت یا دولت کے لئے ہوتی تھیں آخرت
کی طرف کوئی دھیان نہ ہوتا تھا، ان کی اصلاح کے لئے اس آیت کے آخر میں فرمایا کہ بعض لوگ
وہ ہیں جو حج میں دعا بھی مانگتے ہیں تو صرف دنیا کی بھلائی مانگتے ہیں، آخرت کی فکر نہیں کرتے،
ایسے لوگوں کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں، کیونکہ ان کے اس طرز عمل سے معلوم ہوا کہ سر لختہ حج بھی
انہوں نے محض رہنماؤں کیلئے یا دنیا میں فخر و جاہت حاصل کرنے کے لئے کیا ہے، اللہ تعالیٰ
کو راضی کرنا اور آخرت میں نجات حاصل کرنا ان کے پیش نظر ہے ہی نہیں۔

اس جگہ یہ بات بھی قابلِ نظر ہے کہ صرف دنیاوی دعا مانگنے والوں کا ذکر اس آیت میں
اس طرح کیا گیا ہے کہ وہ کہتے رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا اس کے ساتھ حَسَنَةً کا لفظ مذکور نہیں
جس میں اشارہ اس کی طرف ہو کہ وہ دنیا کے لئے بھی حسنہ کے طلبگار نہیں، بلکہ اغراض دنیویہ میں
ایسے مست و سرشار ہیں کہ ان کی طلب یہ رہ گئی ہے کہ اپنی خواہش کسی طرح پوری ہو، خواہ وہ
اچھی ہو یا بُری اور اچھے طریقہ سے حاصل ہو یا بُرے راستہ سے، لوگ ان کو اچھا کہیں یا بُرا۔

اس آیت میں ان مسلمانوں کے لئے بھی بڑی تنبیہ ہے جو موسم حج اور مقامات مقدسہ
میں بھی دعاؤں میں اپنی اغراض دنیویہ ہی کو ترجیح دیتے ہیں، اور بیشتر اوقات انہیں کے لئے
صرف کرتے ہیں، اور اگر ہلکے حالات کا جائزہ لیا جائے تو ثابت ہوگا کہ بہت سے دو تہند لوگ
یہاں بھی جو وظائف اور دعائیں کرتے ہیں یا بزرگوں سے کراتے ہیں ان میں بکثرت لوگ ایسے
ہیں کہ ان کی غرض ان تمام وظائف و دعاؤں سے بھی صرف دولت کی ترقی و تجارت میں برکت
اغراض دنیویہ میں کامیابی ہوتی ہے وہ بہت سے وظائف اور فرائض پڑھ کر یہ بھی سمجھ گئے ہیں
کہ ہم بہت عبادت گزار ہیں، لیکن وہ حقیقت میں ایک طرح کی دنیا پرستی ہوتی ہے، بہت حضرات

زندہ بزرگوں سے اور وفات یافتہ اولیاء اللہ سے بڑا تعلق رکھتے ہیں، لیکن اس تعلق کا بھی بڑا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ان کی دعا یا تعویذ سے ہمارے کام نکلیں گے، دنیا کی آفات دور ہوں گی، مال میں برکت ہوگی، ایسے لوگوں کے لئے بھی اس آیت میں خاص ہدایت ہو، معاملہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہے جو علیم وخبیر ہے، ہر شخص کو اپنے اعمال کا جائزہ لینا چاہئے، کہ ظلمات و لوائفل اور دمار و درود سے اور حج و زیارت سے اس کی نیت کیا ہے۔ اس آیت کے آخری حصہ میں کم نصیب محروم القسمہ لوگوں کا تذکرہ کرنے کے بعد حق تعالیٰ نے نیک اور مقبول بندوں کا ذکر اس طرح فرمایا ہے:

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَقُولُ رَبَّنَا آتِنَا فِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً وَقِيَامًا ابْنِ الْاٰثَارِ۔ یعنی ان میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو اپنی دعاؤں میں اللہ تعالیٰ سے دنیا کی بھلائی اور بہتری بھی مانگتے ہیں اور آخرت کی بہتری بھی اور عذاب جہنم سے پناہ مانگتے ہیں۔

اس میں لفظ حسنہ تمام ظاہری اور باطنی خوبیوں اور بھلائیوں کو شامل ہے، مثلاً دنیا کی حسنہ میں بدن کی صحت، اہل و عیال کی صحت، رزق حلال میں وسعت و برکت و نیروی سب ضروریات کا پورا ہونا اعمال صالحہ، احسان و محمودہ علم نافع، عزت و وجاہت، عقائد کی درستی، صراطِ مستقیم کی ہدایت، عبادات میں اخلاص کامل سب داخل ہیں، اور آخرت کی حسنہ میں جنت اور اس کی بے شمار اور لازوال نعمتیں اور حق تعالیٰ کی رضا اور اس کا دیدار یہ سب چیزیں شامل ہیں۔

الغرض یہ دعا ایک ایسی جامع ہے کہ اس میں انسان کے تمام دنیوی اور دینی مقاصد آجاتے ہیں، دنیا و آخرت دونوں جہان میں راحت و سکون عیدتر آتا ہے، آخر میں خاص طور پر جہنم کی آگ سے پناہ کا بھی ذکر ہے، یہی وجہ ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم بکثرت یہ دعا مانگا کرتے تھے رَبَّنَا آتِنَا فِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً وَقِيَامًا ابْنِ الْاٰثَارِ، اور حالت طواف میں خصوصیت کے ساتھ یہ دعا مینوں ہے، اس آیت میں ان جاہل درویشوں کی بھی اصلاح کی گئی ہے جو صرف آخرت ہی کی دعا مانگتے کہ عبادت جانتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمیں دنیا کی کوئی پرواہ نہیں ہے، کیونکہ درحقیقت یہ ان کا دعویٰ غلط اور خیال خام ہو، انسان اپنے رجو اور بقا اور عبادت و طاعت سب میں ضروریات دنیوی کا محتاج ہے، وہ نہ ہوں تو دین کا بھی کوئی کام کرنا مشکل ہے، اس لئے انبیاء علیہم السلام کی سنت یہ ہے کہ جس طرح وہ آخرت کی بھلائی اور بہتری اللہ تعالیٰ سے مانگتے ہیں اسی طرح دنیا کی بھلائی اور آسائش بھی طلب کرتے ہیں، جو شخص دنیوی حاجات کے لئے دعا مانگے کہ زہد و بزرگی کے غلات سمجھے وہ مقام انبیاء سے بے خبر اور جاہل ہے، ہاں صرف دنیوی حاجات ہی کو مقصد زندگی نہ بنائے،

اس سے زیادہ آخرت کی فکر کرے اور اس کے لئے دعا مانگے۔

آیت کے آخر میں اسی دوسرے طبقہ کا جو کہ اپنی دعاؤں میں دنیا و آخرت دونوں کی بھلائی مانگتا ہو، انجام ذکر کیا گیا ہے کہ ان کے اس صحیح اور نیک عمل اور دعاؤں کا نتیجہ ان کو دنیا و آخرت میں ملے گا، اس کے بعد ارشاد ہے وَاللّٰهُ سَرِيعُ الْحِسَابِ، یعنی اللہ جلد حساب لینے والا ہے، کیونکہ اس کا علم محیط اور قدرت کاملہ کے لئے ساری مخلوقات کے ایک ایک فرد اور پھر اس کی عمر بھر کے اعمال کا حساب لینے میں ان آلات و ذرائع کی ضرورت نہیں جن کا انسان محتاج ہے، اس لئے وہ بہت جلد ساری مخلوقات کا حساب لے لیں گے، اور ان پر جزاء و سزا مرتب فرمائیں گے۔

مٹی میں دو باہن دن کا قیام آٹھویں آیت جو اس جگہ احکام حج کی آخری آیت ہو اس میں حجاج کو ذکر اللہ اور ذکر اللہ کی تاکید کی طرف متوجہ کر کے ان کے مقصد حج کی تکمیل اور آئندہ زندگی کو درست رکھنے

کی ہدایت اس طرح فرمائی گئی ہے، وَاذْكُرُوا اللّٰهَ فِيْ اَيَّامٍ مَّعْدُوْدَاتٍ، یعنی اللہ کو یاد کرو غنتی کے چند دنوں میں، ان چند دنوں سے مراد ایام تشریق ہیں، جن میں ہر نماز کے بعد تکبیر کہنا واجب ہے۔ آگے ایک مسئلہ کی وضاحت کی گئی کہ مٹی میں قیام اور حجرات پر کھڑکیاں مارنا کب تک ضروری ہے، اس میں اہل جاہلیت کا اختلاف رہا کرتا تھا، بعض لوگ تیس ہویں تاریخ ذی الحجہ تک مٹی میں قیام اور حجرات پر رہی کرنے کو ضروری سمجھتے تھے، اس سے پہلے بارہویں کو واپس آجانے کو ناجائز اور ایسا کرنے والوں کو گنہگار کہا کرتے تھے، اس طرح دوسرے لوگ بارہویں تاریخ کو چلے آنا ضروری سمجھتے، اور تیسروں تک ٹھہرنے کو گناہ جانتے تھے، اس آیت میں ان دونوں کی اصلاح اس طرح کی گئی، کہ قَمْعًا تَعْتَجِلْ فِيْ يَوْمَيْنِ فَلَا اِثْمَ عَلَيْكَ، وَمَنْ تَأَخَّرَ فَلَا اِثْمَ عَلَيْكَ، یعنی جو شخص عید کے بعد صرف دو دن مٹی میں قیام کر کے واپس آجائے، اس پر بھی کوئی گناہ نہیں، اور جو تیسرے دن تک مؤخر کرے اس پر بھی کوئی گناہ نہیں، یہ دونوں فریق جو ایک دوسرے کو گنہگار کہتے ہیں غلو اور غلطی میں مبتلا ہیں۔

حج یہ ہے کہ حجاج کو دونوں صورتوں میں اختیار ہے جس پر چاہیں عمل کریں، ہاں افضل اولیٰ یہی ہے کہ تیسرے دن تک ٹھہریں، فقہاء نے فرمایا ہے کہ جو شخص دوسرے دن غروب آفتاب سے پہلے مٹی سے چلا آیا اس پر تیسرے دن کی ری واجب نہیں، لیکن اگر آفتاب مٹی میں غروب ہو گیا پھر تیسرے دن کی ری کرنے سے پہلے وہاں سے واپس آجانا جائز نہیں رہتا، البتہ تیسرے دن کی ری میں یہ رعایت رکھی گئی ہے کہ وہ زوال آفتاب سے پہلے صبح کے بعد بھی ہو سکتی ہے۔

مٹی سے واپس آکر اس میں حجاج کو اخصت پار دینے کا ذکر فرمانے کے بعد جو کچھ کہا گیا کہ دو دن واپس آجائے تو کچھ گناہ نہیں، اور تیسرے دن واپس آجائے تو کچھ گناہ نہیں، یہ سب اس شخص

کے لئے ہے جو اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والا اور اس کے احکام کی پابندی کرنے والا ہے، کیونکہ درحقیقت حج اسی کا ہے، جیسا قرآن میں دوسری جگہ ارشاد ہے، **إِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللَّهُ مِنَ الْمُتَّقِينَ** (۲: ۱۷۷) یعنی اللہ تعالیٰ عبادت انہی کی قبول کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والے اور اطاعت شعار بندے ہیں، اور جو شخص حج سے پہلے بھی گناہوں میں ملوث تھا، اور حج کے اندر بھی بے پروائی سے کام لیتا رہا، حج کے بعد بھی گناہوں سے پرہیز نہ کیا تو اس کو اس کا حج کوئی فائدہ نہ دے گا، اگرچہ اس کا حج فرض ادا ہو گیا، ترک حج کا جرم نہیں رہا۔

آخر میں ارشاد فرمایا **وَاتَّقُوا اللَّهَ تَرَوْا كَيْفَ تَخْشَوْنَ -** یعنی ڈرتے رہو اللہ تعالیٰ سے اور یقین کر دو کہ تم سب اللہ کے پاس جمع ہونے والے ہو، وہ تمہارے کھیلے ہوئے اور چھپے ہوئے اعمال کا حساب لیں گے، اور ان پر جزا و سزا دیں گے، احکام حج جو ادھر کی آیات میں بیان کئے گئے ہیں یہ جملہ درحقیقت ان سب کی روح ہے، اس کے معنی یہ ہیں کہ جس ایام حج میں جب کہ اعمال حج میں مشغول ہو، اس وقت بھی اللہ تعالیٰ سے ڈرو، احکام حج میں کوئی کوتاہی نہ کرو اور بعد میں بھی اپنے حج پر معسرور نہ ہو، بلکہ اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو، اور گناہوں سے اجتناب کرو، کیونکہ دوزخ اعمال کے وقت انسان کے گناہ اس کے نیک اعمال کو کھٹا جائیں گے، نیک اعمال کا اثر اور دوزخ ظاہر نہ ہونے دیں گے، عبادت حج کے متعلق حدیث میں ہے کہ جب انسان حج سے فارغ ہو کر آتا ہے تو اپنے سابقہ گناہوں سے ایسا پاک صاف ہو جاتا ہے جیسے وہ ماں کے پیٹ سے آج پیدا ہوا ہے، اس لئے خاص طور سے حجاج کو آئندہ کے لئے تقویٰ کی ہدایت کی گئی کہ پچھلے گناہوں سے پاک ہو چکے ہو، آگے احتیاط رکھو، تو دنیا و آخرت کی بھلائی تمہارے لئے ہو، ورنہ جو شخص حج کے بعد پھر گناہوں میں مبتلا ہو گیا تو پچھلے گناہوں کی معافی اس کو کوئی خاص کام نہ آوے گی، بلکہ علمائے فرمایا ہے کہ حج مقبول کی علامت یہ ہے کہ اپنے حج سے اس طرح واپس آئے کہ اس کا دل دنیا کی محبت سے فارغ اور آخرت کی طرف مایوس ہو، ایسے شخص کا حج مقبول اور گناہ معاف ہیں، اور دعا، اس کی مقبول ہے، دوران حج میں جگہ جگہ انسان اللہ تعالیٰ سے اطاعت فرما ہر داری کا معاہدہ اس کے بیت کے سامنے کرتا ہے، اگر حج کرنے والے اس کا دھیان رکھیں تو اس معاہدہ کے پورا کرنے کا آئندہ اہتمام میسر آ سکتا ہے۔

ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ میں حج سے واپس آیا تو اتفاقاً میرے دل میں ایک گناہ کا دوسرا پیدا ہوا، مجھے غیب سے ایک آواز آئی کہ کیا کرنے حج نہیں کیا؟ کیا تو نے حج نہیں کیا؟ یہ آواز میرے اور اس گناہ کے درمیان ایک دیوار بن گئی، اللہ تعالیٰ نے مجھے محفوظ فرما دیا۔ ایک ترک بزرگ جو مولانا جامی رحمۃ اللہ علیہ کے مريد تھے ان کا حال یہ تھا کہ ہمیشہ اپنے سر پر

ایک نور کا شادہ کیا کرتے تھے، وہ حج کر گئے اور فارغ ہو کر واپس آئے تو یہ کیفیت بھلے بڑھنے کے بالکل سلب ہو گئی، اپنے مرشد مولانا جامی سے اس کا تذکرہ کیا تو انھوں نے فرمایا کہ حج سے پہلے تمہارا اندر تواضع و انکسار تھا، اپنے آپ کو گھنگار سمجھ کر اللہ تعالیٰ کے سامنے الحاج دراز کی کرتے تھے، حج کے بعد تم اپنے آپ کو نیک اور بزرگ سمجھنے لگے، اس لئے یہ حج ہی تمہارے لئے غرور کا سبب بن گیا، اسی وجہ سے یہ کیفیت زائل ہو گئی۔

احکام حج کے ختم پر تقویٰ کی تاکید میں ایک راز یہ بھی ہے کہ حج ایک بڑی عبادت ہو، اس کے ادا کرنے کے بعد شیطان عموماً انسان کے دل میں اپنی بڑائی اور بزرگی کا خیال ڈالتا ہے، جو اس کے تمام عمل کو بیکار کر دینے والا ہے، اس لئے خاتمہ کلام میں فرمایا کہ جس طرح حج سے پہلے اور حج کے اندر اللہ تعالیٰ سے ڈرنا اور اس کی اطاعت لازم ہے اسی طرح حج کے بعد اس سے زیادہ اللہ تعالیٰ سے ڈرنے اور گناہوں سے پرہیز کا اہتمام کرتے رہو کہ کہیں یہ کی کرائی عبادت ضائع نہ ہو جائے۔ **وَتَقُوا اللَّهَ مَعَ تَضَعُوا مِنْ الْقَوْلِ وَالْفِعْلِ وَالنِّيَّةِ -**

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُحِبُّ قَوْلَهُ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَيُشْهَدُ اللَّهُ

اور ایسا آدمی وہ ہے کہ پسند آتی ہو تجھ کو اس کی بات دنیا کی زندگیوں کے کاموں میں اور گواہ کرنا ہو

عَلَى مَا فِي قَلْبِهِ وَهُوَ أَلَدُّ الْخِصَامِ ۖ وَإِذَا تَوَلَّى سَعَى فِي الْأَرْضِ

اللہ کو اپنے دل کی بات پر اور وہ سخت جھگڑا رہے، اور جب پھرے پھرے پاس سے تو دوڑتا پھرے ملک

لِيُفْسِدَ فِيهَا وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ ۗ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ الْفَاسِدَ ۖ

میں تاکہ اس میں خرابی ڈالے اور تباہ کرے کھیتیاں اور جانیں اور اللہ ناپسند کرتا ہے فساد کو

وَلَا إِقْبَلَ لَهُ اتِّقَ اللَّهُ أَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْإِثْمِ فَحَسْبُهُ جَهَنَّمُ

اور جب اس سے کہا جائے کہ اللہ سے ڈرو تو آدھ کرے اس کو غرور گناہ پر سوکانی ہے اس کو دوزخ

وَلَيْسَ الْبِرَّ بِمَا كَسَبَ ۖ وَالنَّاسُ مِنْ شَرِّ نَفْسِهِ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ

اور وہی ملک جو تمہارا ہو، اور لوگوں میں ایک شخص وہ ہو کہ بچتا ہے اپنی جان کو اللہ کی رضا جوئی

اللَّهُ ط وَاللَّهُ رَؤُوفٌ بِالْعِبَادِ ۖ

میں، اور اللہ نہایت مہربان ہے اپنے بندوں پر

کے لئے ہے جو اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والا اور اس کے احکام کی پابندی کرنے والا ہے، کیونکہ درحقیقت حج اسی کا ہے، جیسا قرآن میں دوسری جگہ ارشاد ہے، **إِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللَّهُ مِنَ الْمُتَّقِينَ (۲۰۵)** "یعنی اللہ تعالیٰ عبادت انہی کی قبول کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والے اور اطاعت شعائر بندے ہیں" اور جو شخص حج سے پہلے بھی گناہوں میں ملوث تھا، اور حج کے اندر بھی بے پروائی سے کام لیتا رہا، حج کے بعد بھی گناہوں سے پرہیز نہ کیا تو اس کو اس کا حج کوئی فائدہ نہ دے گا، اگرچہ اس کا حج فرض ادا ہو گیا، ترک حج کا جرم نہیں رہا۔

آخر میں ارشاد فرمایا **وَاتَّقُوا اللَّهَ تَرَوْا كَيْفَ تَخْشَوْنَ -** "یعنی ڈرتے رہو اللہ تعالیٰ سے اور یقین کر دو کہ تم سب اللہ کے پاس جمع ہونے والے ہو، وہ تمہارے کھیلے ہوئے اور چھپے ہوئے اعمال کا حساب لیں گے، اور ان پر جزا و سزا دیں گے، احکام حج جو ادھر کی آیات میں بیان کئے گئے ہیں یہ جملہ درحقیقت ان سب کی روح ہے، اس کے معنی یہ ہیں کہ جس ایام حج میں جب کہ اعمال حج میں مشغول ہو، اس وقت بھی اللہ تعالیٰ سے ڈرو، احکام حج میں کوئی کوتاہی نہ کرو اور بعد میں بھی اپنے حج پر معسرور نہ ہو، بلکہ اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو، اور گناہوں سے اجتناب کرو، کیونکہ دوزخ اعمال کے وقت انسان کے گناہ اس کے نیک اعمال کو کھٹا جائیں گے، نیک اعمال کا اثر اور دوزخ ظاہر نہ ہونے دیں گے، عبادت حج کے متعلق حدیث میں ہے کہ جب انسان حج سے فارغ ہو کر آتا ہے تو اپنے سابقہ گناہوں سے ایسا پاک صاف ہو جاتا ہے جیسے وہ ماں کے پیٹ سے آج پیدا ہوا ہے، اس لئے خاص طور سے حجاج کو آئندہ کے لئے تقویٰ کی ہدایت کی گئی کہ پچھلے گناہوں سے پاک ہو چکے ہو، آگے احتیاط رکھو، تو دنیا و آخرت کی بھلائی تمہارے لئے ہو، ورنہ جو شخص حج کے بعد پھر گناہوں میں مبتلا ہو گیا تو پچھلے گناہوں کی معافی اس کو کوئی خاص کام نہ آوے گی، بلکہ علمائے فرمایا ہے کہ حج مقبول کی علامت یہ ہے کہ اپنے حج سے اس طرح واپس آئے کہ اس کا دل دنیا کی محبت سے فارغ اور آخرت کی طرف مایوس ہو، ایسے شخص کا حج مقبول اور گناہ معاف ہیں، اور دعا، اس کی مقبول ہے، دوران حج میں جگہ جگہ انسان اللہ تعالیٰ سے اطاعت فرما ہر داری کا معاہدہ اس کے بیت کے سامنے کرتا ہے، اگر حج کرنے والے اس کا دھیان رکھیں تو اس معاہدہ کے پورا کرنے کا آئندہ اہتمام میسر آ سکتا ہے۔

ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ میں حج سے واپس آیا تو اتفاقاً میرے دل میں ایک گناہ کا دوسرا پیدا ہوا، مجھے غیب سے ایک آواز آئی کہ کیا کرنے حج نہیں کیا؟ کیا تو نے حج نہیں کیا؟ یہ آواز میرے اور اس گناہ کے درمیان ایک دیوار بن گئی، اللہ تعالیٰ نے مجھے محفوظ فرما دیا۔
ایک ترک بزرگ جو مولانا جامی رحمۃ اللہ علیہ کے مريد تھے ان کا حال یہ تھا کہ ہمیشہ اپنے سر پر

ایک نور کا شادہ کیا کرتے تھے، وہ حج کر گئے اور فارغ ہو کر واپس آئے تو یہ کیفیت بھلے بڑھنے کے بالکل سلب ہو گئی، اپنے مرشد مولانا جامی سے اس کا تذکرہ کیا تو انھوں نے فرمایا کہ حج سے پہلے تمہارا اندر تواضع و انکسار تھا، اپنے آپ کو گھنگار سمجھ کر اللہ تعالیٰ کے سامنے الحاج دراز کی کرتے تھے، حج کے بعد تم اپنے آپ کو نیک اور بزرگ سمجھنے لگے، اس لئے یہ حج ہی تمہارے لئے غرور کا سبب بن گیا، اسی وجہ سے یہ کیفیت زائل ہو گئی۔

احکام حج کے ختم پر تقویٰ کی تاکید میں ایک راز یہ بھی ہے کہ حج ایک بڑی عبادت ہو، اس کے ادا کرنے کے بعد شیطان عموماً انسان کے دل میں اپنی بڑائی اور بزرگی کا خیال ڈالتا ہے، جو اس کے تمام عمل کو بیکار کر دینے والا ہے، اس لئے خاتمہ کلام میں فرمایا کہ جس طرح حج سے پہلے اور حج کے اندر اللہ تعالیٰ سے ڈرنا اور اس کی اطاعت لازم ہے اسی طرح حج کے بعد اس سے زیادہ اللہ تعالیٰ سے ڈرنے اور گناہوں سے پرہیز کا اہتمام کرتے رہو کہ کہیں یہ کی کرائی عبادت ضائع نہ ہو جائے۔ **وَتَقُوا اللَّهَ مَعَ تَرْضَى مِنَ الْقَوْلِ وَالْفَعْلِ وَالنِّيَّةِ -**

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُحِبُّ قَوْلَهُ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَ يَشْهَدُ اللَّهُ

اور ایسا آدمی وہ ہے کہ پسند آتی ہو تجھ کو اس کی بات دنیا کی زندگیوں کے کاموں میں اور گواہ کرنا ہو

عَلَى مَا فِي قَلْبِهِ وَهُوَ أَلَدُّ الْخِصَامِ ۖ وَإِذَا تَوَلَّى سَعَى فِي الْأَرْضِ

اللہ کو اپنے دل کی بات پر اور وہ سخت جھگڑا رہے، اور جب پھرے تیرے پاس سے تو دوڑتا پھرے ملک

لِيُفْسِدَ فِيهَا وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ ۗ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ الْفُسَادَ ۖ

میں تاکہ اس میں خرابی ڈالے اور تباہ کرے کھیتیاں اور جانیں اور اللہ ناپسند کرتا ہے فساد کو

وَلَا إِقْبَلَ لَهُ اتِّقَ اللَّهُ أَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْإِثْمِ فَحَسْبُهُ جَهَنَّمُ ۖ

اور جب اس سے کہا جائے کہ اللہ سے ڈر تو آدھ کرے اس کو غرور گناہ پر سوکانی ہے اس کو دوزخ

وَلَيْسَ الْبِرَّ بِمَا كَسَبَ ۖ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُشْرِي نَفْسَهُ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتٍ

اور وہ ملک بڑا ٹھکانا ہو، اور لوگوں میں ایک شخص وہ ہو کہ بیچتا ہے اپنی جان کو اللہ کی رضا جوئی

اللَّهُ ط وَاللَّهُ رَؤُوفٌ بِالْعِبَادِ ۖ

میں، اور اللہ نہایت مہربان ہے اپنے بندوں پر

ربط آیات اوپر کی آیتوں میں دہرایا گئے والے آدمیوں کی دو قسمیں ٹھہرائی گئیں، ایک کافر کہ مستکر آخرت ہو، اس نے صرف دنیا مانگنا ہے، دوسرا مؤمن کہ محققہ آخرت ہو، دنیا کی بھلائی کے ساتھ آخرت کی بھلائی بھی مانگتا ہے، اب اہل آیت میں اسی طرح کی تقسیم نفاق و اخلاص کے اعتبار سے فرماتے ہیں کہ بعض منافق ہوتے ہیں اور بعض غلط ہیں۔

خلاصہ تفسیر اگر کوئی شخص تھا افسوس بن ستر بن، بڑا فصیح و بلیغ، وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آکر نہیں کھاکھا کر دعویٰ اسلام کیا کرتا اور مجلس سے اٹھ کر جاتا تو فساد و شرارت و اذہار رسائی فتن میں لگ جاتا، اس منافق کے باب میں فرماتے ہیں، اور بعض آدمی ایسا بھی ہے کہ آپ کو اس کی گفتگو جو شخص و نبی غرض سے ہوتی ہے، دیکھ کر انہیں اسلام سے مسلمانوں کی طرح قریب خصوصیت کے ساتھ رہوں گا، اس کی نصاحت و بلاغت کی وجہ سے مزہ دار معلوم ہوتی ہے، اور وہ اپنا اعتبار بڑھانے کو، اللہ تعالیٰ کو گمراہ بناتا ہے اپنے دل کی سچائی پر حالانکہ بالکل جھوٹا ہے، کیونکہ واقع میں، وہ (آپ کی) مخالفت میں رہنایت ہدیہ ہے، اور جس طرح آپ کا مخالفت ہو اس طرح اور مسلمانوں کو بھی ایذا پہنچاتا ہو چنانچہ جب (آپ کی مجلس) پیچیدہ پھیلتا ہے تو اس دور و صوب میں پھرتا رہتا ہو کہ شہر میں (کوئی) فساد کرے اور (کسی کی) حکیمیت اور موافقت کو تلف کرے، چنانچہ ایک مسلمان کا اس طرح نقصان کر دیا، اور اللہ تعالیٰ فساد کی باتوں کو پسند نہیں فرماتے، اور اس مخالفت و اذہار کے ساتھ مغرور اس درجہ ہو کہ جب اس سے کوئی کہتا ہے خدا سے ڈر تو (اور زیادہ) آواز کر دیتا ہے اس کو طرد و گناہ پر، سو ایسے شخص کی کافی سزا ہے جہنم، اور وہ بڑا شکاک ہے، اور بعض آدمی ایسے بھی ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کے بدلہ میں اپنی جان تک بیچ ڈالتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ایسے ہندوں کے حال پر نہایت مہربان ہیں۔

معارف و مسائل

آیت کا آخری حصہ جس میں مؤمن و مخلص کا یہ حال بیان کیا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرنے کے لئے اپنی جان کی بھی بازی لگا دیتا ہے، یہ ان مخلص صحابہ کرام کی شان میں نازل ہوئی ہو جنہوں نے بے مثال شہداء بنائے اللہ کی راہ میں پیش کی ہیں، مستدرک حاکم، ابن جریر، مسند ابن ابی حاتم وغیرہ میں بسند صحیح منقول ہے کہ یہ آیت حضرت حبیب ردی رضی اللہ عنہ کے اس واقعہ میں نازل ہوئی ہو کہ جب وہ مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ کے لئے روانہ ہوئے تو راستہ میں کفار قریش کی ایک جماعت

نے راستہ روک لیا یہ دیکھ کر حضرت حبیب ردی اپنی سواری سے اتر کر کھڑے ہو گئے، اور ان کے ترکش میں جتنے تیرھے سب نکال لئے، اور قریش کی اس جماعت سے خطاب کیا کہ اے قبیلہ قریش تم سب سچے ہو کہ میں تیرا اندازی میں تم سے زیادہ ماہر ہوں، میرا تیرے کی خطا نہیں کرتا، اور اب میں اللہ کی قسم کھاتا ہوں کہ تم میرے پاس اس وقت تک نہ پہنچ سکو گے جب تک میرے ترکش میں ایک تیر بھی باقی ہے، اور تیروں کے بعد میں تلوار سے کام لوں گا جب تک مجھ میں دم رہے گا، پھر جو تم چاہو کر لینا، اور اگر تم رفع کا سودا چاہتے ہو تو میں نہیں اپنے مال کا پتہ دیتا ہوں جو مکہ مکرمہ میں رکھا ہے، تم وہ مال لے لو، اور میرا سستہ چھوڑ دو، اس پر قریش کی جماعت راضی ہو گئی، اور حضرت حبیب ردی نے صحیح سالم انحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچ کر واقعہ سنایا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسرے فرمایا

رَبِّيعُ النَّبِيِّ اَبَا بَكْرٍ رَّبِّيعُ النَّبِيِّ

تمہارا بڑا رفیع بخش راہ، تمہاری بیج رفیع بخش

اَبَا بَكْرٍ

دیکھا

اس واقعہ میں آیت مذکورہ کے نزول نے اس کلام کی تصدیق کر دی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے نکلا تھا۔

اور بعض حضرات مفسرین نے کچھ دوسرے صحابہ کرام کے ایسے ہی واقعات کو آیت کا نشانہ نزول بتلایا ہے (منہجی)۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ادْخُلُوا فِي السِّلْمِ كَافَّةً ۖ وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ

لے ایمان والو داخل برجواز اسلام میں پورے اور ملت چلو قدموں پر

الشَّيْطَانِ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِينٌ ۖ فَإِنْ تَرَكْتُمُ مِنْ بَعْدِ مَا

شیطان کے بیشک وہ تمہارا صریح دشمن ہے، پھر اگر تم بچنے لگو بعد اس کے کہ پہنچ چکے

جَاءَ تَكُمْ الْبَيْتُ فَأَعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ۖ هَلْ

تم کو صاف حکم تو جان رکھو کہ بیشک اللہ زبردست ہے حکمت والا، کیا وہ

يَنْظُرُونَ إِلَّا أَنْ يَأْتِيَهُمُ اللَّهُ فِي ظُلُلٍ مِنَ الْغَمَامِ وَالْمَلَائِكَةُ

اس کی راہ دیکھتے ہیں کہ آدے ان پر اللہ ابر کے ساتباؤں میں اور فرشتے

وَقَضَى الْأَمْرَ إِلَى اللَّهِ تُرْجَعُ الْأُمُورُ ۖ

اور طے ہو جائے قعدہ اور اللہ ہی کی طرف لوٹیں گے سب کام

رابط آیات

اور پھر خلاص کی مدح تھی، بعض اوقات اس اخلاص میں غلطی سے نظر اور انفراد ہر جائزہ سے متجاوز ہوتی ہے، اس کو بدعت کہتے ہیں، چنانچہ حضرت عبداللہ بن سلام وغیرہ جو پہلے علماء یہودی تھے، اور اس مذہب میں ہفتہ کار ورمعظم تھا، اور اونٹ کا گوشت حرام تھا، ان صاحبوں کو بعد اسلام کے یہ خیال ہوا کہ شریعت موسوی میں ہفتہ کی تعظیم واجب تھی، اور شریعت محمدیہ میں اس کی تعظیم واجب نہیں، اسی طرح شریعت موسویہ میں اونٹ کا گوشت کھانا حرام تھا اور شریعت محمدیہ میں اس کا کھانا فرض نہیں، سو اگر ہم بدستور ہفتہ کی تعظیم کرتے رہیں اور اونٹ کا گوشت باوجود حلال اعتقاد رکھنے کے صرف عملاً ترک کر دیں تو شریعت موسویہ کی بھی رعایت ہو جائے اور شریعت محمدیہ کے بھی خلاف نہ ہوگا، اور اس میں خدا تعالیٰ کی زیادہ اطاعت اور دین کی زیادہ رعایت معلوم ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اس خیال کی اصلاح آیت آئندہ میں بھی قدر اہتمام سے فرماتے ہیں، ہمیں کا حاصل یہ ہے کہ اسلام کامل فرض ہے اور اس کا کامل ہونا واجب ہے کہ جو امر اسلام میں قابل رعایت نہ ہو اس کی رعایت دین ہونے کی حیثیت سے نہ کی جائے، اور ایسے امر کو دین سمجھنا ایک شیطانی لغزش ہے، اور یہ نسبت ظاہری معاصی کے اس کا عذاب زیادہ سخت ہونے کا خطرہ ہے۔

خلاصہ تفسیر

اے ایمان والو! اسلام میں پورے پورے داخل ہو رہے نہیں کہ کچھ یہودیت کی بھی رعایت کرو، اور دایہ خیالات میں پڑ کر شیطان کے قدم بقدم مت چلو، واقعی وہ تمہارا کھلا دشمن ہو رہا ہے، پڑا دشمن ہے کہ ظاہر میں تو مسلمانوں میں معلوم ہو اور فی الحقیقت بالکل دین کے خلاف، پھر اگر تم بعد اس کے کہ تم کو واضح دلائل (احکام و شرائع اسلام کی) پہنچ چکی ہیں، پھر بھی مراکتبہم سے لغزش کرنے لگو تو یقین رکھو کہ حق تعالیٰ (بڑے) زبردست ہیں (سخت سزا دینے اور کچھ دنوں تک سزا دینے تو اس سے دھوکہ مت کھانا کیونکہ وہ) حکمت والے (ہیں) ہیں کسی حکمت و مصلحت سے کبھی سزا میں دیر بھی کر دیتے ہیں معلوم ہوتا ہے، یہ لوگ (جو کہ بعد وضوح دلائل حق کے کج راہی اختیار کرتے ہیں) صرف اس امر کے منتظر ہیں کہ حق تعالیٰ اور فرشتے بادل کے سائبانوں میں ان کے پاس (سزا دینے کے لئے) آویں اور سارا قصہ ہی ختم ہو جاوے یعنی کیا اس وقت امر حق قبول کریں گے جس وقت کا قبول کرنا مقبول بھی نہ ہوگا، اور یہ سائے (جزا و سزا کے) مقدمات اللہ تعالیٰ ہی کی طرف رجوع کئے جا دیں گے (کوئی دوسرا صاحب اختیار نہ ہوگا، سوائے زبردست کے ساتھ مخالفت کرنے کا انجام بجز خرابی کے کیا ہو سکتا ہے)۔

معارف و مسائل

اَذْكُمُوْا اِنِّي الْيَسِيْمُ كَاذِبٌ، سلم بالکسر: بابتخ و مدعی کے لئے استعمال ہوتا ہے، ایک صلح دوسری اسلام، اس جگہ جمہور صحابہ و تابعین کے نزدیک اسلام مراد ہے (ابن کثیر) لفظ کاذبہ: جیسا اور عامۃ کے معنی میں آتا ہے، یہ لفظ اس جگہ ترکیب میں قائل واقع ہوا ہے، جس میں دو احتمال ہیں، ایک یہ کہ ضمیر اَوَكُمُوْا کا قائل مسترار دیا جائے، دوسرے یہ کہ سلم بمعنی اسلام کا قائل ہو، پہلی صورت میں ترجمہ یہ ہوگا کہ تم پورے پورے اسلام میں داخل ہو جاؤ، یعنی تمہارے ہاتھ پاؤں، آنکھ، کان، دل اور دماغ سب کا سب دائرۃ اسلام و اطاعت اہلبیت کے اندر داخل ہونا چاہئے، ایسا نہ ہو کہ ہاتھ پاؤں سے تو احکام اسلام بجا لاد کر جو مکرول و نارغ اس پر مطلق نہیں یا دل و دماغ سے تو اس پر مطلق ہو مگر ہاتھ پاؤں اور اعضاء و جوارح کا عمل اس سے باہر ہے۔

اور دوسری صورت میں ترجمہ یہ ہوگا کہ تم داخل ہو جاؤ مکمل اور پورے اسلام میں، یعنی ایسا نہ ہو کہ اسلام کے بعض احکام کو تو قبول کرو بعض میں پس و پیش ہے، اور چونکہ اسلام نام ہے اس مکمل نظام حیات کا جو قرآن و سنت میں بیان ہوا ہے خواہ اس کا تعلق عقائد و عبادات سے ہو، یا معاملات و معاشرت سے، حکومت و سیاست سے اس کا تعلق ہو یا تجارت و صنعت وغیرہ سے اسلام کا جو مکمل نظام حیات، ہر قسم سب اس پورے نظام میں داخل ہو جاؤ۔

خلاصہ دونوں صورتوں کا قریب قریب یہی ہے کہ احکام اسلام خواہ وہ کسی شعبہ زندگی سے متعلق ہوں اور اعضاء ظاہری سے متعلق ہوں یا قلب و باطن سے ان کا تعلق ہو، جب تک ان تمام احکام کو سچے دل سے قبول نہ کر دو گے مسلمان کہلانے کے مستحق نہیں ہو گے۔

اس آیت کا شان نزول جو اوپر بیان ہوا ہے اس کا بھی حاصل یہی ہے کہ صرف اسلام ہی کی تعلیمات تمہارا مصلح نظر ہونا چاہئے، اس کو پورا پورا اختیار کر لو تو وہ تمہیں سائے خواہب و ملل سے بے نیاز کر دے گا۔

تنبیہ: ۱۔ اس میں آن لوگوں کے لئے بڑی تنبیہ ہے جنہوں نے اسلام کو صرف مسجد اور عبادت کے ساتھ مخصوص کر رکھا ہے، معاملات اور معاشرت کے احکام کو گو با دین کا جزو ہی نہیں سمجھتے، اصطلاحی دینداروں میں یہ غفلت عام ہے، حقوق و معاملات اور خصوصاً حقوق معاشرت سے بالکل بیگانہ ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان احکام کو وہ اسلام کے احکام ہی نہیں سمجھتے، نہ ان کے معلوم کرنے یا سمجھنے کا اہتمام کرتے ہیں نہ ان پر عمل کرنے کا، نعوذ باللہ انکم محقر، سالہ آداب معاشرت حضرت سیدی حکیم الامت کا ہر مسلمان مرد و عورت کو ضرور پڑھ لینا چاہئے۔

اور یہ واقعہ اللہ تعالیٰ اور فرشتے بادل کے ساتھ ان میں ان کے پاس آجائیں قیامت میں پہلی آئے گا، اور اللہ تعالیٰ کا اس طرح آنا مشابہات میں سے ہے جس کے متعلق جہور صحابہؓ و تابعینؓ اور اسلاف امت کا طریقہ یہ ہے کہ اس کے معنوں کے حق و صحیح ہونے کا اعتقاد یقین رکھے، اور کیفیت کہ کس طرح یہ کام ہوگا اس کی دریافت کی فکر میں نہ پڑے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ کی ذات اور تمام صفات کی حقیقت اور کیفیت کا معلوم کرنا انسان کی عقل سے بالاتر ہے یہ بھی اسی میں داخل ہے۔

سَلِّ بَنِي إِسْرَءِيلَ كَمَا أَتَيْنَهُمْ مِّنْ آيَةٍ بَيِّنَةٍ وَمَنْ يُبَدِّلْ

یوحنا بن اسرائیل سے کس قدر عنایت کہ ہم نے ان کو نشانیاں کھلی ہوئی، اور جو کوئی بدل ڈالے

نِعْمَةً اَللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَاءَتْهُۥ فَاِنَّ اِلٰهَ شَدِيْدَ الْعِقَابِ ۝۱۱

اللہ کی نعمت بعد اس کے کہ پہنچا چکی ہو وہ نعمت اس کو تو اللہ کا عذاب سخت ہے،

زَيْنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيَسْخَرُوْنَ مِنَ الَّذِيْنَ

فریفتہ کیا، کافروں کو دنیا کی زندگی پر اور ہنسٹے ہیں ایمان والوں

اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ اٰتَقَوْا۟ اٰخِرَ۟هُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَاللّٰهُ يَزْنِيْ۟

سے اور جو پرہیزگار ہیں وہ ان کافروں کو بالاتر ہوں گے قیامت کے دن اور اللہ روزی

مَنْ يَّشَاءُۢ مِۡلَاحِۡسَابٍ ۝۱۲

دیتا ہے جس کو چاہے بے شمار

رابط آیات | اوپر فرمایا تھا کہ بعد دلائل واضعہ آجانے کے حق کی مخالفت کرنا موجب سزا ہے،

پہلی آیت میں اس کی دلیل بیان فرماتے ہیں کہ جیسے بعض بنی اسرائیل کو ایسی ہی مخالفت

پر سزا دی گئی: خلاصہ تفسیر | آپ (علاء) بنی اسرائیل سے (دُعا) پوچھتے (تو یہی) ہم نے ان کو دینی ان کے

بزدلوں کو) کتنی واضح دلیل دی تھیں مگر ان لوگوں نے بجاے اس کے کہ

اس سے ہدایت حاصل کرتے اور الٹی گرا ہی پر کمر باندھی پھر دیکھو سزائیں بھی جھٹکتیں مثلاً توبہ اعلیٰ،

چاہئے توبہ تھا کہ اس کو قبول کرتے، مگر انکار کیا، آخر کوہ طور گرانے کی ان کو دھکی دی گئی، اور مثلاً

حق تعالیٰ کا کلام سنا، چاہو تھا سزا محکموں پر رکھتے مگر شہادت نکالے آخر بکلی سے ہلاک ہوئے اور مثلاً

دریا میں شگاف کر کے فرعون سے نجات دی گئی، احسان مانتے مگر گوسالہ پرستی شروع کی، جس پر

سزائے قتل دی گئی، اور مثلاً حق و سلائی نازل ہوا شکر کرنا چاہئے تھا، اناسرائیلی کی وہ سزائے لگا، اور اس سے نفرت ظاہر کی تو وہ معروف ہو گیا، اور کھیتی کی معیبت سر پر پڑی، اور مثلاً انبیاء علیہم السلام کا سلسلہ ان میں جاری رہا، غیبت سمجھنے ان کو قتل کرنا شروع کر دیا، جس پر یہ سزا دی گئی کہ ان سے حکومت و سلطنت چھین لی گئی، اعلیٰ حد مذہبیت سے معاملات اسی سورہ بقرہ کے شروع میں بھی مذکور ہو چکے ہیں، اور دہارا قانون ہی یہ ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کی (ایسی بڑی) نعمت (دلائل واضعہ) کو بدلتا ہے، اس کے پاس پہنچنے کے بعد (یعنی) بہاتے اس کے کہ اس سے ہدایت حاصل کرے اور اٹا گمراہ بنائے، تو یقیناً حق تعالیٰ (ایسے شخص کو) سخت سزا دیتے ہیں۔

(دوسری آیت میں مخالفت حق کی اصل علت اکثر یہ بیان فرماتے ہیں کہ وہ دنیا کی محبت ہو

جس کے آثار میں سے اہل دین کو حقیر سمجھنا بھی ہے، کیونکہ جب دنیا کا غلبہ ہوتا ہے دین کی طلب نہیں

رہتی، بلکہ دین کو اپنی دنیوی اغراض کے خلاف دیکھ کر ترک کر بیٹھتا ہے، اور دوسرے طالبان دین پر

ہنسنا ہی، چنانچہ بعض رؤسائے بنی اسرائیل اور چہلا سے مشرکین غریب مسلمانوں کے ساتھ

باستہزا پیش آیا کرتے تھے، ان لوگوں کا بیان فرماتے ہیں کہ دنیوی معاشی کفار کو آراستہ پہرہ

معلوم ہوتی ہے اور (اسی وجہ سے) ان مسلمانوں سے تمسخر کرتے ہیں حالانکہ یہ (مسلمان) جو کفر و شرک

سے بچتے ہیں ان کافروں سے اعلیٰ درجہ رک حالت، میں ہوں گے قیامت کے روز کیونکہ کفار جہنم میں

ہوں گے اور مسلمان جنت میں) اور (آدمی کو محض معاشی رصعت پر مغرور نہ ہونا چاہئے، کیونکہ

روزی تو اللہ تعالیٰ جس کو چاہتے ہیں بے انداز (یعنی بکثرت) دیدیتے ہیں پس اس کا مدار قسمت

پر ہے نہ کمال اور مقبولیت پر، سو یہ ضرور نہیں کہ جو روزی میں بڑا ہو وہ اللہ کے نزدیک بڑا

معزز ہو اور بڑی عزت ہی جو اللہ کے نزدیک معتبر ہو پھر محض اس کے اوپر اپنے کو معزز اور دوسرے کو ذلیل

سمجھا جو قوی ہے)۔

مَعَارِف وَّمَسَائِل

دنیا کے مال و دولت اور عزت و جاہ پر مغرور ہونے اور غریب لوگوں کا استہزاء کرنے کی

حقیقت قیامت کے روز انھوں کے سامنے آجائے گی۔

حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جو شخص کسی مومن مرد یا عورت کو اس کے

فقر و فاقہ کی وجہ سے ذلیل و حقیر سمجھتا ہے اللہ تعالیٰ قیامت کے روز اس کو اولین و آخرین کے مجمع میں

دروا اور ذلیل کریں گے، اور جو شخص کسی مسلمان مرد یا عورت پر بہتان باندھتا ہے اور کوئی ایسا

جب اس کی طرف غصہ کرتا ہے جو اس میں نہیں ہے، اللہ تعالیٰ قیامت کے روز اس کو آگ

کے ایک اونچے ٹیلہ پر کھڑا کریں گے جب تک کہ وہ خود اپنی تکذیب نہ کرے۔

(ذکر الحدیث القریبی)

كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً فَبَعَثَ اللَّهُ النَّبِيِّنَ مُبَشِّرِينَ وَ

تھے سب لوگ ایک دین پر پھر بھیجے اللہ نے پیغمبر خوش خبری سنانے والے اور

مُنذِرِينَ ۚ وَأَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِيُحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ

ڈرانے والے اور اناری اُن کے ساتھ کتاب بھی کہ فیصلہ کرے لوگوں میں جس پر

فِيمَا اخْتَلَفُوا فِيهِ ۚ وَمَا اخْتَلَفَ فِيهِ إِلَّا الَّذِينَ أُوتُوهُ مِنْ بَعْدِ

میں وہ جھگڑا کریں، اور نہیں جھگڑاؤ الا کتاب میں مگر انہی لوگوں نے جن کو کتاب ملی تھی اس

مَا جَاءَهُمْ مِنَ الْبَيِّنَاتِ بَغْيًا بَلْ يَكُنْهُمْ قَهْدَىٰ ۚ إِنَّ اللَّهَ الَّذِي أَنْزَلَ

کے بعد کہ ان کو پہنچ چکے صاف حکم آپس کی ضد سے پھر اب ہدایت کی اللہ نے ایمان والوں کو

لِمَا اخْتَلَفُوا فِيهِ مِنَ الْحَقِّ بِآذِينِهِ ۚ وَاللَّهُ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ إِلَىٰ

اسی سچی بات کی جس میں وہ جھگڑا کر رہے تھے اپنے حکم سے اور اللہ بتلاتا ہے جسکو چاہے

صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ ﴿۱۳﴾

سیدھا راستہ۔

ربط آیات اور دین حق سے اختلاف کرنے کی علت حجت دنیا کو بتایا ہے، آگے اسی مضمون

کی تائید فرماتے ہیں کہ مذمت سے ہیں قصہ چلا آ رہا ہے کہ ہم دلائل واضعہ دین حق

پر قائم کرتے ہیں، اور طالبان دنیا اپنی دنیوی اغراض کے سبب اس سے خلافت کرتے رہے۔

خلاصہ تفسیر (ایک زمانہ میں) سب آدمی ایک ہی طریق پر تھے دیکھو کہ اول دنیا میں حضرت

آدم علیہ السلام مع اپنی بی بی کے تشریف لائے اور جو اولاد ہوئی یعنی ان کو

دین حق کی تعلیم فرماتے رہے اور وہ ان کی تعلیم پر عمل کرتے رہے ایک مدت اسی حالت میں

گزر گئی، پھر اختلاف طبائع سے اغراض میں اختلاف ہوا شروع ہوا حتیٰ کہ ایک عرصہ کے بعد

اعمال و عقائد میں اختلاف کی فزیت آ گئی، پھر اس اختلاف کے رفع کرنے کو اللہ تعالیٰ نے

(مختلف پیغمبروں کو بھیجا جو کہ حق ماننے والوں کو) خوشی دے دے، سناتے تھے اور (نمانے

والوں کو مذاہب، ڈراتے تھے، اور ان پیغمبروں کی جمعی جماعت) کے ساتھ آسانی کتابیں بھی

ٹھیک طور پر نازل فرمائیں اور ان پیغمبروں کا بھیجنا اور کتابوں کا نازل فرمانا اس غرض سے تھا کہ

اللہ تعالیٰ راہِ رسل و کتب کے ذریعہ سے اختلاف کرنے والے لوگوں میں ان کے امور اختلافیہ

رہنہ میں فیصلہ سرمدیں دیکھو کہ رسل و کتب امر واقعی کا انہماک دیتے ہیں اور امر واقعی کے متعین

ہونے سے ظاہر ہے کہ غیر واقعی کا غلط ہو جانا معلوم ہو جاتا ہے، اور یہی فیصلہ ہی، اور ان پیغمبروں کے

ساتھ کتاب اللہ آنے سے چاہئے تھا کہ اس کتاب کو قبول کرتے، اور اس پر مدار کار رکھ کر اپنے سب

اختلافات مٹاتے، مگر بعضوں نے خود اس کتاب ہی کو نہ مانا، اور خود اسی میں اختلاف کرنا شروع

کر دیا، اور اس کتاب میں (یہ) اختلاف اور کسی نے نہیں کیا، مگر صرف ان لوگوں نے جن کو اول

وہ کتاب ملی تھی (یعنی اہل علم و اہل فہم نے) کہ اول مخاطب وہی لوگ ہوتے ہیں، دوسرے عوام اُن کے

ساتھ لگ لیا کرتے ہیں، اور اختلاف بھی کیسے وقت کیا، بعد اس کے کہ ان کے پاس دلائل واضح

پہنچ چکے تھے (یعنی ان کے ذہن نشین ہو چکے تھے، اور اختلاف کیا کس وجہ سے صرف، باہمی

مذاہدگی کی وجہ سے) اور اصل وجہ مذاہدگی کی حجت دنیا ہوتی ہے، حجت مال ہو یا حجت جاہ، پس

مدار علت مخالفت حق کا وہی حجت دنیا ٹھہری اور یہی مضمون تھا سابق میں، پھر یہ اختلاف کفار کا

کسی اہل ایمان کو مضرب نہیں ہوا، بلکہ اللہ تعالیٰ نے ہمیشہ ایمان والوں کو وہ امر حق جس میں اختلاف

اختلاف کیا کرتے تھے بفضلہ تعالیٰ (رسولوں اور کتابوں پر ایمان لانے کی بدولت) بتلادیا اور اللہ

تعالیٰ جس کو چاہتے ہیں اسی کو راہِ راست بتلا دیتے ہیں۔

معارف و مسائل

اس آیت میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ کسی زمانہ میں تمام انسان ایک ہی مذہب و ملت اور

تفہیم خیال پر تھے جو ملت حق اور دین فطرت تھی، پھر انہیں مزاج و ذوق اور رائے فکر کے اختلاف بہت مختلف خیالات

و عقائد پیدا ہو گئے، جن میں یہ بہت سی از کرنا دشوار تھا کہ ان میں حق کونسا ہے اور باطل کونسا، حق کو

واضح کرنے اور صحیح راہ حق بتلانے کے لئے اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام بھیجے، اور ان پر کتابیں

اور وحی نازل فرمائی، انبیاء علیہم السلام کی جدوجہد اور تبلیغ و اصلاح کے بعد انسان دو گروہوں

میں منقسم ہو گئے، ایک وہ جنہوں نے اللہ تعالیٰ کی بھیجی ہوئی ہدایات کو قبول کیا اور انبیاء علیہم السلام

کے متبع ہو گئے، جن کو مؤمن کہا جاتا ہے، دوسرے وہ جنہوں نے آسانی ہدایات اور انبیاء علیہم السلام

کو جھٹلایا، ان کی بات نہ مانی، یہ لوگ کافر کہلاتے ہیں، اس آیت کے پہلے جملہ میں ارشاد ہے: كَانَ

النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً، امام راغب اصفہانی نے مفردات القرآن میں فرمایا ہے کہ لفظ "أُمَّة"

عرب لغت کے اعتبار سے ہر ایسی جماعت کو کہا جاتا ہے جس میں کسی وجہ سے رابطہ و اتحاد اور وحدت

قائم ہو، خواہ یہ وحدت نظریات و عقائد کی ہو یا ایک زمانہ میں یا کسی ایک خطہ ملک میں جمع ہونے کی، یا کسی دوسرے علاقہ یعنی نسب، زبان، رنگ و غیرہ کی، مفہوم اس جملہ کا یہ ہے کہ کسی زمانہ میں تمام انسان باہم متفق و متحد ایک جماعت تھے، اس میں دو باتیں قابل غور ہیں،

اول یہ کہ اس جگہ وحدت سے کس قسم کی وحدت مراد ہے، دوسرے یہ کہ وحدت کس زمانہ میں تھی، امر اول کا فیصلہ تو اسی آیت کے آخری جملہ نے کر دیا جس میں اس وحدت کے بعد اختلاف واقع ہونے کا اور مختلف راہوں میں حق متعین کرنے کے لئے انبیاء علیہم السلام کے بھیجے کا ذکر ہے، کیونکہ یہ اختلافات جس میں فیصلہ کرنے کے لئے انبیاء علیہم السلام اور آسمانی کتابیں بھیجی گئی ہیں، ظاہر ہے کہ وہ نسب یا زبان یا رنگ یا وطن اور زمانہ کا اختلاف نہ تھا، بلکہ نظریات اور عقائد و خیالات کا اختلاف تھا، اس کے مقابلے سے معلوم ہوا کہ اس آیت میں وحدت سے بھی وحدت فکر و خیال اور وحدت عقیدہ و مسلک مراد ہے۔

تو اب مفہوم آیت کا یہ ہو گیا کہ ایک زمانہ ایسا تھا جب کہ تمام افراد انسانی صرف ایک ہی عقیدہ و خیال اور ایک ہی مذہب و مسلک رکھتے تھے، وہ عقیدہ و مسلک کیا تھا، اس میں دراحتمال ہیں، ایک یہ کہ سب عقیدہ توحید و ایمان پر متفق تھے، دوسرے یہ کہ سب کفر و ضلال پر متحد تھے۔ مگر جمہور مفتقرین کے نزدیک رائج یہ ہے کہ مراد عقائد صحیحہ توحید و ایمان پر سب کا متحد ہونا ہے، سورہ یونس میں بھی اسی مضمون کی ایک آیت آئی ہے،

وَمَا كَانَ النَّاسُ إِلَّا أُمَّةً وَاحِدَةً
فَاخْتَلَفُوا ۚ وَلَوْلَا كِتَابُ رَبِّكَ
لَفُتِنُوا بِهِمْ ثُمَّ إِنَّهُمْ لَخُلُوفُ
شَجَرَةٍ وَتَلَافُفُونَ ۝ (۱۰: ۱۹)

جملہ لوگوں کا ایسا فیصلہ کر دینا کہ جن سے اختلاف کرنے والوں کا نام ہی نہ رہتا۔

اور سورہ انبیاء میں فرمایا:

إِنَّ هَذِهِ أُمَّتُكُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً
وَأَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُونِ ۝ (۲۱: ۹۲)

اسی طرح سورہ مؤمنون میں فرمایا:

وَأَنَّ هَذِهِ أُمَّتُكُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً
وَأَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُونِ ۝ (۲۳: ۵۲)

یہ تھوڑی جماعت ایک ہی جماعت ہو اور میں تمھارا رب ہوں، اس لئے سب میری ہی عبادت کرتے ہو۔

یعنی یہ تھوڑی جماعت ایک ہی جماعت ہو اور میں تمھارا رب ہوں، اس لئے تمھارے ہی ڈرنے والے ہوں۔

ان تمام آیات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس جگہ وحدت سے عقیدہ و مسلک کی وحدت اور دین حق توحید و ایمان میں سب کا متحد ہونا مراد ہے۔

اب یہ دیکھنا کہ یہ دین حق اسلام و ایمان پر تمام انسانوں کا اتفاق و اتحاد کس زمانہ کا واقعہ ہے، یہ وحدت کہاں تک قائم رہی؟ مفتقرین صحابہؓ میں سے حضرت ابی بن کعبؓ اور ابن زیدؓ نے فرمایا کہ یہ واقعہ عالم ازل کا ہے، جب تمام انسانوں کی ارواح کو پیدا کر کے ان سے سوال کیا گیا تھا اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ۔ یعنی کیا میں تمھارا رب نہیں ہوں؟ اور سب نے بلا استثناء یہ جواب دیا تھا کہ بلیک آپ ہمارے رب اور پروردگار ہیں، اس وقت تمام افراد سالانہ ایک ہی عقیدہ حق پر قائم تھے جس کا نام ایمان و اسلام ہے (قرطبی)

اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے فرمایا کہ یہ وحدت عقیدہ کا واقعہ اس وقت کا ہو جبکہ آدم علیہ السلام مع اپنی زوجہ حواء کے دنیا میں تشریف لائے، اور آپ کی اولاد ہوئی اور پہلی گئی، وہ سب کے سب حضرت آدم علیہ السلام کے دین اور اپنی کی تعلیم و تلقین کے تابع توحید کے قائل تھے، اور سب کے سب باستثناء قابیل وغیرہ شریعت و فرمانبردار تھے۔

مسند بزار میں حضرت ابن عباسؓ کے اس قول کے ساتھ یہ بھی مذکور ہے کہ وحدت عقیدہ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت ادریس علیہ السلام تک قائم رہی، اس وقت تک سب کے سب علم اور توحید کے معتقد تھے، اور آدم علیہ السلام اور ادریس علیہ السلام کے درمیان زمانہ دس قرن ہے، بظاہر قرن سے ایک صدی مراد ہو تو کل زمانہ ایک ہزار سال کا ہو گیا۔

اور بعض حضرات نے یہ بھی فرمایا کہ یہ وحدت عقیدہ کا زمانہ وہ ہے جب کہ نوح علیہ السلام کی بددعا سے دنیا میں طوفان آیا، اور جب زرگن لوگوں کے جو نوح علیہ السلام کے ساتھ کشتی میں سوار ہو گئے تھے، باقی ساری دنیا غرق ہو گئی تھی، طوفان ختم ہونے کے بعد جتنے آدمی اُس دنیا میں رہے وہ سب سلمان مومن اور دین حق کے پیرو تھے۔

اور درحقیقت ان تینوں اقوال میں کوئی اختلاف نہیں، یہ تینوں زمانے ایسے ہی تھے جن میں سارے انسان ملت واحدہ اور امت واحدہ بنے ہوئے دین حق پر قائم تھے۔

آیت کے دوسرے جملہ میں ارشاد ہے، فَبَعَثْنَا إِلَيْكَ الرُّسُلَ مُبَشِّرِينَ وَمُنْذِرِينَ
وَأَنزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيمَا اخْتَلَفُوا فِيهِ ۚ إِنَّهُمْ
كَانُوا قَوْمًا فَاسِقِينَ ۝ (۲: ۲۱۳)

یہاں یہ بات غور طلب ہے کہ اوپر کے جملہ میں تمام انسانوں کا امت واحد اور ملت واحد ہونا بیان کیا تھا، اور اس جملہ میں اس پر تفسیر کی گئی ہے کہ ہم نے انبیاء اور کتابیں بھی تاکہ اختلاف کا فیصلہ کیا جائے، ان دونوں جملوں میں بظاہر جوڑ نہیں معلوم ہوتا، کیونکہ انبیاء اور کتابوں کے پیچھے کی ملت لوگوں کا اختلاف ہے، اور اختلاف اس وقت تھا نہیں مگر جواب بالکل واضح ہے کہ مراد آیت مذکورہ کی یہ ہے کہ ابتداء عالم میں تمام انسان ایک ہی عقیدہ حق کے قائل اور پابند تھے، پھر رفتہ رفتہ اختلافات پیدا ہو گئے، اختلافات پیدا ہونے کے بعد انبیاء علیہم السلام اور کتابیں بھیجنے کی ضرورت پیش آئی۔

اب ایک بات رہ جاتی ہے کہ اوپر صرف امت واحد ہونے کا ذکر کیا گیا، اختلاف پیدا ہونے کا ذکر کیوں نہیں کیا گیا، جو لوگ قرآن کریم کے اسلوب حکیم پر کچھ نظر رکھتے ہیں، ان کے لئے اس کا جواب مشکل نہیں کہ قرآن کریم احوال ماضیہ کے بیان میں قصہ کہانی یا تاریخ کی کتابوں کے سائے قصہ کو کہیں نقل نہیں کرتا، بلکہ درمیان سے وہ حصہ حذف کر دیتا ہے جو اس سیاق کلام سے خود بخود سمجھا جاسکے، جیسے حضرت یوسف علیہ السلام کے قصہ میں جو قیدی رہا ہو کر آیا اور خواب کی تعبیر حاصل کرنے کے لئے اس نے بادشاہ سے کہا کہ مجھے یوسف علیہ السلام کے پاس بھیجو، تو قرآن میں اس قیدی کی تجویز نقل کرنے کے بعد بات یہاں سے شروع ہوتی ہے، یوسفُ اٰیۃً للٰہِ الْبَیِّنٰتِ یعنی اس کا ذکر نہیں کیا کہ بادشاہ نے اس کی تجویز کو پسند کیا، اور اس کو جیل خانہ میں حضرت یوسف علیہ السلام کے پاس بھیجا، وہ وہاں پہنچ کر ان سے مخاطب ہوا، کیونکہ پہلے اور اگلے جملوں کے ملانے سے یہ ساری باتیں خود بخود سمجھ میں آ جاتی ہیں۔

اسی طرح اس آیت میں وحدت ملت کے بعد اختلاف واقع ہونے کا تذکرہ اس لئے ضروری نہیں سمجھا گیا کہ اختلافات کا وقوع تو ساری دنیا جانتی ہے، ہر وقت مشاہدہ میں آتا ہے، ضرورت اس امر کے اظہار کی تھی کہ ان اختلافات کثیرہ سے پہلے ایک زمانہ ایسا بھی گذر چکا ہے جس میں سارے انسان ایک ہی مذہب و ملت اور ایک ہی دین حق کے پیرو تھے، اسی کو بیان فرمایا، پھر جو اختلاف دنیا میں پہلے ہوئے اور سب کے مشاہدہ میں آتے ہیں ان کے وقوع کا بیان کرنے کی ضرورت تھی، ان یہ بتلایا گیا کہ ان اختلافات میں راہ حق کی ہدایت اور رہنمائی کا سامان حق تعالیٰ نے کیا فرمایا، اس کے متعلق ارشاد ہوا فَتَعَلَّمَ اَللّٰہُ الْبَیِّنٰتِ یعنی حق تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام کو بھیجا جو دین حق کا اقرار کرنے والوں کو دائمی آرام و راحت کی خوش خبری اور اس سے اعراض کرنے والوں کو عذاب جہنم کی دھمک سنادیں، اور ان کے ساتھ اپنی وحی اور کتابیں بھیجی جو مختلف عقائد و خیالات میں سے صحیح اور حق کو واضح کر کے بتلا دیں، اس کے بعد یہ ارشاد فرمایا کہ انبیاء

رسل اور آسمانی کتابوں کے کھلے ہوئے فیصلوں کے بعد بھی یہ دنیا دو گروہوں میں تقسیم ہو گئی، کچھ لوگوں نے ان ہدایات واضحہ کو قبول نہ کیا، اور تعجب کی بات یہ ہے کہ قبول نہ کرنے والے اول وہی لوگ ہوئے جن کے پاس یہ انبیاء اور آیات الہیہ بھی گئی تھیں، یعنی اہل کتاب یہود و نصاریٰ، اور اس سے زیادہ تعجب کی بات یہ ہے کہ آسمانی کتابوں میں کوئی استنباط یا القباس کی گنجائش نہ تھی، اگر ان کی سمجھ میں نہ آئے یا غلط فہمی کا شکار ہو جائیں، بلکہ حقیقت یہ تھی کہ جاننے والے جسے کے باوجود ان لوگوں نے محض ضد اور ہٹ دھرمی سے انکار کیا۔

اور دوسرا گروہ وہ ہوا جن کو اللہ تعالیٰ نے راہ ہدایت پر لگادیا اور جس نے انبیاء و رسل اور آسمانی کتابوں کے فیصلے ٹھنڈے دل سے تسلیم کئے، انھیں دونوں گروہوں کا بیان قرآن کریم نے سورۃ تہا میں اس طرح فرمایا ہے:

خَلَقْنٰكُمْ فَمِنْكُمْ كَافِرٌ ۙ
بَنٰكُمْ ثُمَّ مَوْنٰكُمْ وَدَرٰكُمْ
فَمِنْكُمْ مُّشْرِكٌ ۚ
فَمِنْكُمْ مُّسْلِمٌ ۚ

تین اللہ تعالیٰ نے تم کو پیدا کیا پھر تم میں سے کچھ کافر و مشرک ہو گئے کچھ مومن و مسلم

علامہ معمر بن آیت حاتم الثاقب اُمّیّہؒ فرماتے ہیں کہ پہلے دنیا کے سب انسان دین حق پر قائم تھے، پھر اختلاف طبائع سے اغراض میں اختلاف ہونا شروع ہوا، ایک عرصہ کے بعد اعمال و عقائد میں اختلاف کی فہم آ گئی، یہاں تک کہ حق و باطل میں القباس ہونے لگا، تو اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام اور اپنی کتابیں راہ حق کی ہدایت کرنے کے لئے اور اسی دین حق پر دوبارہ قائم ہو جانے کے لئے بھیجی جس پر سب انسان پہلے قائم تھے، لیکن ان سب ہدایات واضحہ اور آیات بینات کے ہوتے ہوئے کچھ لوگوں نے مانا اور کچھ لوگوں نے ضد اور عناد سے انکار و انحراف کی راہ اختیار کر لی۔

مسائل

مسئلہ: اس آیت سے چند باتیں معلوم ہوتی ہیں، اول یہ کہ اللہ تعالیٰ نے جو بہت سے انبیاء اور کتابیں بھیجیں یہ سب اس واسطے تھیں کہ یہ لوگ جو دین حق کی ملت واحدہ کو چھوڑ کر مختلف فرقوں میں بٹ گئے ہیں پھر ان کو اسی ملت واحدہ پر قائم کر دیں، انبیاء کا یہ سلسلہ یوں ہی چلتا آتا کہ جب لوگ اس راہ حق سے پچھلے تو ان کی ہدایت کے لئے اللہ تعالیٰ نے کوئی نئی بھیجا، اور کتاب اتاری کہ اس کے موافق چلیں، پھر کبھی بچے خود دوسرا نبی اور کتاب اللہ تعالیٰ نے اس راہ حق پر قائم کرنے کے لئے بھیج دیا، اس کی مثال ایسی ہے جیسے تندرستی ایک بیمار پر بیماریاں بے شمار، جب ایک مرض پیدا ہوا تو اس کے موافق دوا اور دوا پر ہیز مقرر فرمایا، جب دوسرا مرض پیدا ہوا تو دوسری دوا

اور پرہیز اس کے موافق بتلایا، اب آخر میں ایسا جامع نسخہ تجویز فرمایا جو ساری بیماریوں سے بچنے میں اس وقت تک کے لئے کامیاب ثابت ہو جب تک اس عالم کو باقی رکھنا منظور ہو، یہ مکمل اور جامع نسخہ، ایک جامع اصول علاج سب پچھلے نسخوں کے قائم مقام اور آئندہ سے بے نیاز کرنے والا ہو، اور وہ نسخہ جامع اسلام ہے، جس کے لئے خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن مجید گئے، اور کئی کتابوں میں تحریر ہو کر پچھلے انبیاء کی تعلیمات ضائع اور گم ہو جانے کا سلسلہ ادھر سے چلا آیا تھا جس کے سبب نبی اور نبی کتاب کی ضرورت پیش آتی تھی، اس کا یہ انتظام فرمایا گیا کہ قرآن کریم کے تحریر سے محفوظ رہنے کا ذمہ خود حق تعالیٰ نے لے لیا اور قرآن کریم کی تعلیمات کو قیامت تک ان کی اصلی صورت میں قائم اور باقی رکھنے کے لئے اللہ جل شانہ نے امت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں تاقیامت ایک ایسی جماعت قائم رکھنے کا وعدہ فرمایا جو ہمیشہ دین حق پر قائم رہ کر کتاب و سنت کی صحیح تعلیم مسلمانوں میں مشائع کرتی رہے گی، کسی کی مخالفت و عداوت اُن پر اثر انداز نہ ہوگی، اس لئے اس کے بعد دروازہ نبوت اور دہی کا بند ہو جانا ناگزیر امر تھا، آخر ختم نبوت کا اعلان کر دیا گیا۔

خلاصہ یہ کہ مختلف زمانوں میں مختلف انبیاء اور ان کی مختلف کتابیں آنے سے کوئی اس دور میں نہ بڑ جائے کہ انبیاء کو رکھیں لوگوں کو مختلف فرقوں میں تقسیم کرنے اور افتراق پیدا کرنے کے لئے نازل کی گئی ہیں، بلکہ منشاء ان سب انبیاء اور کتابوں کا یہ ہے کہ جس طرح پہلے سارے انسان ایک ہی دین حق کے پیرو ہو کر ملت واحدہ تھے، اسی طرح پھر اُسی دین حق پر سب جمع ہو جائیں۔

مسئلہ: دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ مذہب کی بنا، بر قومیت کی تقسیم مسلم و غیر مسلم کا در قوی نظریہ میں منشاء قرآنی کے مطابق ہر آیت **فَبَنَیْکُمْ کَافًۢرًا وَبَنَیْکُمْ مُّؤْمِنًا** اس پر شاہد ہوا اس کے ساتھ ہی یہ بھی واضح ہو گیا کہ اسلام میں اس در قوی نظریے کی اصل بنیاد و حقیقت صحیح متحدہ قومیت پیدا کرنے پر ہے جو ابتداء آفرینش میں قائم تھی، جس کی بنیاد وطنیت پر تھی بلکہ عقیدہ حق اور دین حق کی پیروی پر تھی، ارشاد قرآنی **اِنَّ اِنْسَانَ لِرَبِّہٖ لَکَافٍ** بتلایا کہ ابتداء عالم میں اعتقاد صحیح اور دین حق کی پیروی کے اعتبار سے ایک صحیح اور حقیقی وحدت قوی قائم تھی، بعد میں لوگوں نے اختلافات پیدا کئے، انبیاء نے لوگوں کو اسی اصلی وحدت کی طرف بلایا، جنہوں نے ان کی دعوت کو قبول نہ کیا، وہ اس متحدہ قومیت سے کٹ گئے اور جدا گانہ قوم قرار دیئے گئے۔

مسئلہ: تیسری بات اس آیت سے یہ معلوم ہوئی کہ ازل سے سنت اللہ یہی جاری ہے کہ بڑے لوگ ہر نبی مبعوث کے خلاف اور ہر کتاب الہی سے اختلاف کو پسند کرتے رہے اور ان کے مقابلہ و مخالفت میں پورا زور و خرچ کرنے کے لئے آمادہ رہے ہیں، تو اب اہل ایمان کو ان کی بدسلوکی اور فساد سے متکفل نہ ہونا چاہئے، جس طرح کفار نے اپنے بڑوں کا طریقہ کفر و عناد اور انبیاء کی مخالفت

کا اختیار کیا، اسی طرح مؤمنین صالحین کو چاہئے کہ وہ اپنے بزرگوں کا یعنی انبیاء علیہم السلام کا وظیفہ اختیار کریں، کہ اُن لوگوں کی ایذاؤں اور مخالفتوں پر صبر کریں، اور حکمت و موعظت اور نرمی کے ساتھ ان کو دین حق کی طرف بلائے دیں، اور شاید اس مناسبت سے اہل آیت میں مسلمانوں کو مصائب و آفات، ہر عمل اور صبر کی تلقین کی گئی ہے۔

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَأْتِكُمْ مَثَلُ

کہ تم کو یہ خیال ہے کہ جنت میں چلے جاؤ گے حالانکہ تم پر نہیں گزرے حالات اُن

الَّذِينَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ مَسَّتْهُمُ الْبَاسَاءُ وَالضَّرَآءُ وَ

وگوں کے جیسے جو ہو چکے تم سے پہلے کہ پہنچی ان کو سختی اور تکلیف اور

رَزَزُوا حَتَّى يَقُولَ الرَّسُولُ وَالَّذِينَ اٰمَنُوْا مَعَهُ مَتٰی

بھڑ بھڑائے گئے یہاں تک کہ کہنے لگا رسول اور جو اُس کے ساتھ ایمان لائے کب آدے گی

تَصْرَافُ الْاٰرَآءُ اِنْ تَصَرَافُ الْاٰرَآءُ قَرِیْبًا

اللہ کی مدد، میں رکھو اللہ کی مدد قریب ہے۔

اور ہر کی آیت میں کفار کا ہمیشہ سے انبیاء و مؤمنین کے ساتھ اختلاف اور مخالفت ربط آیات کرتے رہنا مذکور تھا، جس میں ایک گونہ مسلمانوں کو اس طور پر تسلی دینا بھی مقصود تھا جن کو سہ تنہا کفار سے ایذا ہوتی تھی، کہ یہ خلاف تمہارے ساتھ نیا نہیں ہے ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے، آگے ان کفار مخالفین سے انبیاء و مؤمنین کو انواع الفواعل کی ایذا میں اور شکار پیچنے کی حکایت بیان فرماتے ہیں، اور اس سے بھی مسلمانوں کو تسلی دلاتے ہیں کہ تم کو بھی کفار سے جو ایذا میں پہنچتی ہیں اُن پر صبر کرنا چاہئے، کیونکہ کامل راحت تو آخرت کی محنت ہی اٹھانے سے ہے۔

خلاصہ تفسیر (دوسری بات سنو گویا تمہارا یہ خیال ہے کہ جنت میں (بے مشقت) جاؤ گے حالانکہ (ابھی) کچھ مشقت تو اٹھانی ہی نہیں، کیونکہ) تم کو ہوندا ان

مسلمان، لوگوں کا سا لمحہ و پل نہیں آیا جو تم سے پہلے ہو گزرے ہیں، ان پر (مخالفین کے سبب) ایسی ایسی مشکی اور سختی واقع ہوئی اور (مصائب سے) ان کو یہاں تک جنبشیں

ہو نہیں کہ اس زمانہ کے پیغمبر تک اور جو ان کے ہمراہ اہل ایمان تھے (بے قرار ہو کر) بول اٹھے کہ اللہ تعالیٰ کی امداد و موعود کب ہوگی (جس پر ان کو جوابی تسلی کی گئی کہ) یاد رکھو بیشک اللہ تعالیٰ کی امداد و بہت (نزدیک رہنے والی) ہے۔

معارف و مسائل

اس آیت میں چند باتیں قابل غور ہیں:

اول یہ کہ اس آیت سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ بغیر مشقت و محنت کے اور بغیر مصائب و آفات میں مستلا ہوئے کوئی شخص جنت میں نہ جائے گا، حالانکہ ارشادات قرآنی اور ارشادات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے کہ بہت سے گنہگار محض اللہ تعالیٰ کے لطف و کرم اور مغفرت سے جنت میں داخل ہوں گے، ان پر کوئی مشقت بھی نہ ہوگی، وجہ یہ ہے کہ مشقت و محنت کے درجات مختلف ہیں، اولیٰ درجہ نفس و شیطان سے مزاحمت کر کے یا دین حق کے مخالفین کے ساتھ مخالفت کر کے اپنے عقائد کا درست کرنا ہے، اور یہ ہر مؤمن کو حاصل ہے، آگے اوسط اور اعلیٰ درجات ہیں، جس درجہ کی محنت و مشقت ہوگی اسی درجہ کا دخول جنت ہوگا اس طرح محنت و مشقت خالی کوئی نہ رہا، ایک حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-

أَشَقُّ النَّاسِ بِلَادَ الْأَشْيَاءِ

ثُمَّ الْأَمْثَلُ فَالْأَمْثَلُ

صحیح

مسب سے زیادہ سخت بلائیں اور مصیبتیں

انبیاء علیہم السلام کو پہنچتی ہیں، ان کے بعد جو

ان کے قریب تر ہیں۔

دوسری بات یہاں قابلِ نظر یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام اور ان کے ساتھیوں کا یہ عرض کرنا کہ اللہ تعالیٰ کی مدد کب آئے گی کسی شک و شبہ کی وجہ سے نہ تھا جو ان کی شان کے خلاف ہے بلکہ اس سوال کا منشا یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اگرچہ مدد کا وعدہ فرمایا ہے، مگر اس کا وقت اور مقام متعین نہیں منسرایا، اس لئے حالتِ خطر میں ایسے الفاظ عرض کرنے کا مطلب یہ تھا کہ مدد جلد بھیج جائے، اور ایسی دعا کرنا تو مکمل یا منصب نبوت کے منافی نہیں، بلکہ حق تعالیٰ اپنے بندوں کی الحاج و زاری کو پسند فرماتے ہیں، اس لئے انبیاء اور صلحاء امت اس کے سب سے زیادہ مستحق ہیں۔

يَسْأَلُونَكَ مَاذَا يُنفِقُونَ قُلْ مَا أَنفَقْتُ مِنْ خَيْرٍ قَلِيلًا وَلَكِن

تجھ سے پوچھنے ہیں کیا چیز خرچ کریں کہہ دو کہ جو کچھ تم خرچ کرو مالِ سراں باپ کے لئے

وَالَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هُمْ قَائِلُونَ وَالَّذِينَ هُمْ قَائِلُونَ وَمَا

اور قرابت والوں کے اور پیغمبروں کے اور مخالفوں کے اور مسافروں کے اور جو کچھ

تَفْعَلُوا مِنْ خَيْرٍ فَإِنَّ اللَّهَ بِهِ عَلِيمٌ ﴿۲۱۵﴾

کرو گے تم بھلائی سودہ ہے شک اللہ کو خوب معلوم ہے۔

خلاصہ تفسیر

بارہواں حکم صدقہ کے مصارف

لوگ آپ سے پوچھتے ہیں کہ ثواب کے واسطے کیا چیز خرچ کیا کریں (اور کس موقع پر صرف کیا کریں) آپ فرمادیجئے کہ جو مال تم کو صرف کرنا ہو سو اس کی تعیین تو تمہاری ہمت پر ہے، مگر ہاں موقع ہم بتلائے دیتے ہیں کہ ماں باپ کا حق ہے اور قرابت داروں اور بے باپ کے بچوں کا اور مخالفوں کا اور مسافروں کا اور جو سائیک کام کرو گے (خواہ براہِ خدا میں خرچ کرنا ہو یا اور کچھ ہو) سوائے اللہ تعالیٰ کو اس کی خوب خبر ہے (وہ اس پر ثواب دیں گے)۔

معارف و مسائل

اس سے پہلی آیتوں میں مجموعی حیثیت سے یہ مضمون بہت تاکید کے ساتھ بیان ہوا ہے، کہ کفر و فحاشی کو چھوڑ دو اور اسلام میں پوری طرح داخل ہو جاؤ، حکم الہی کے مقابل میں کسی کی بات مت سنو، اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے جان اور مال خرچ کیا کرو، اور ہر طرح کی شدت اور تکلیف پر تحمل کرو، اب یہاں سے اسی حالت و فرمانبرداری اور اللہ کی راہ میں جان و مال خرچ کرنے کے متعلق کچھ جزئیات کی تفصیل بیان ہوتی ہے جو کہ مال اور جان اور دیگر معاملات میں نکاح و طلاق وغیرہ کے متعلق ہیں، اور اوپر سے جو سلسلہ احکام (ابواب) جاری ہے اس میں داخل ہیں۔ اور ان جزئیات کا بیان بھی ایک خاص نوعیت رکھتا ہے کہ اکثر ان میں سے وہ ہیں جن کے متعلق صحابہ کرامؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا، ان کے استفتاء اور سوالات کا جواب براہِ راست عرشِ رحمت سے براہِ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم دیا گیا، اس کو اگر یوں سمجھا جائے کہ حق تعالیٰ نے خود فتویٰ دیا تو یہ بھی صحیح ہے اور قرآن کریم کی آیت قُلْ اللَّهُ يُفَقِّهُ فِيمَا يَشَاءُ میں صراحتاً حق تعالیٰ نے فتویٰ دینے کی نسبت اپنی طرف فرمائی ہے، اس لئے اس نسبت میں کوئی استبعاد بھی نہیں۔

اور یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ یہ فتاویٰ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہیں جو آپ کو بذریعہ وحی تلقین کئے گئے ہیں، بہر حال اس رکن میں جو احکام شرعیہ صحابہ کرامؓ کے چند سوالات کے جواب میں بیان ہوئے ہیں، وہ ایک خاص اہمیت رکھتے ہیں، پورے قرآن میں اس طرح سوال و جواب کے انداز سے خاص احکام تقریباً سترہ جگہ میں آئے ہیں، جن میں سے ساٹھ تو اسی جگہ سورۃ بقرہ میں

ہیں ایک سورۃ مائدہ میں ایک سورۃ انفال میں یہ نو سوالات تو صحابہ کرام کی طرف سے ہیں، سورۃ اہزاب میں دو اور سورۃ بنی اسرائیل سورۃ کہف سورۃ لقہ سورۃ نازعات میں ایک ایک یہ کل چھ سوال کفار کی طرف سے ہیں، جن کا جواب قرآن میں جواب کے عنوان سے دیا گیا ہے۔

مفسر اعتراف حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ میں نے کوئی جماعت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ سے بہتر نہیں دیکھی کہ دین کے ساتھ انتہائی شغف اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ انتہائی محبت و تعلق کے باوجود انھوں نے سوالات بہت کم کئے کل تیرہ سوالات میں سوال کیا ہے، جن کا جواب قرآن میں دیا گیا ہے، کیونکہ یہ حضرات بھڑکتے سوال نہ کرتے تھے (قریبی) مذکورہ بالا آیات میں سے پہلی آیت میں صحابہ کرام کا استفادہ یعنی سوال ان الفاظ سے نقل فرمایا گیا ہے، يَسْأَلُونَكَ مَاذَا آتَيْنَاهُم، یعنی لوگ آپ سے پوچھتے ہیں کہ کیا خرچ کریں، یہی سوال اس رکوع میں تین آیتوں کے بعد پھر اپنی الفاظ کے ساتھ دہرایا گیا، وَيَسْأَلُونَكَ مَاذَا آتَيْنَاهُم، لیکن اس ایک ہی سوال کا جواب آیت مستذکرہ میں کچھ اور دیا گیا ہے، اور تین آیتوں کے بعد آنے والے سوال کا جواب اور ہے۔

اس لئے پہلے یہ سمجھنا ضروری ہے کہ ایک ہی سوال کے دو مختلف جواب کس حکمت پر مبنی ہیں یہ ملکیت ان حالات و واقعات میں خود کرنے سے واضح ہو جاتی ہیں یہ آیات نازل ہوئی ہیں مثلاً آیت مستذکرہ کا شان نزول یہ ہے کہ عربین جو حج نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ سوال کیا تھا کہ مَا شَيْئٌ مِنْ أَمْوَالِنَا وَآيَاتِنَا نَكْتُمُهَا (اگرچہ ابن السکون مٹھری) یعنی ہم اپنے اموال سے کیا خرچ کریں اور کہاں خرچ کریں؟ اور ابن جریر کی روایت کے موافق یہ سوال تنہا عربین جو حج کا نہیں تھا، بلکہ عام مسلمانوں کا سوال تھا، اس سوال کے دو جز ہیں، ایک یہ کہ مال میں سے کیا اور کتنا خرچ کریں، دوسرے یہ کہ اس کا مصروف کیا ہو کر لوگوں کو دیں۔

اور دوسری آیت جو دو آیتوں کے بعد اسی سوال پر مشتمل ہے اس کا شان نزول ہر دو ابی حاتمؒ یہ ہے کہ جب قرآن میں مسلمانوں کو اس کا حکم دیا گیا کہ اپنے مال اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کریں، تو چند صحابہ کرامؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور عرض کیا کہ اتفاقاً فی سبیل اللہ کا جو حکم ہمیں ملا ہے ہم اس کی وضاحت چاہتے ہیں، کہ کیا مال اور کوئی چیز اللہ کی راہ میں خرچ کیا کریں، اس سوال میں صرف ایک ہی جز ہے، یعنی کیا خرچ کریں، اس طرح ان دونوں سوالوں کی نوعیت کچھ مختلف ہو گئی کہ پہلے سوال میں کیا خرچ کریں اور کہاں خرچ کریں، اس سوال تھا، اور دوسرے میں صرف کیا خرچ کریں کا سوال ہے، اور پہلے سوال کے جواب میں جو کچھ قرآن میں ارشاد فرمایا گیا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سوال کے دوسرے جز کو یعنی کہاں

خرچ کریں زیادہ اہمیت دے کر اس کا جواب تو صریح طور پر دیا گیا، اور پہلے جز یعنی کیا خرچ کریں کا جواب ضمنی طور پر دینا کافی سمجھا گیا، اب الفاظ متشراتی میں دونوں احزاب پر نظر فرمائیں، پہلے جز یعنی کہاں خرچ کریں کے متعلق ارشاد ہوا کہ مَنْ أَفْعَفَ مِمَّنْ تَحْيِيهِ قُلُوبُ الْإِنِّ وَالْأَفْئِدَةُ وَالْأَبْصَارُ وَالْأَبْصَارُ وَالْأَبْصَارُ، یعنی جو کچھ بھی تم کو اللہ کے لئے خرچ کرنا ہو اس کے مستحق مال باپ اور رشتہ دار اور بے باپ کے بچے اور مساکین اور مسافروں۔

اور دوسرے جز یعنی کیا خرچ کریں کا جواب ضمنی طور پر ان الفاظ سے دیا گیا وَمَا تَنْفَعُكُمْ مِنْ تَحْيِيهِ قُلُوبُ الْإِنِّ وَالْأَفْئِدَةُ وَالْأَبْصَارُ، یعنی تم جو کچھ بھلائی کر دے اللہ تعالیٰ کو اس کی خوب خبر ہو، اشارہ اس بات کی طرف ہو کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تم پر کوئی تحدید اور پابندی نہیں کہ مال کی اتنی ہی مقدار صرف کر دو، بلکہ کچھ بھی اپنی استطاعت کے موافق خرچ کر دے اللہ تعالیٰ کے پاس اس کا اجر و ثواب پائے گا۔

انفرض پہلی آیت میں شاید سوال کرنے والوں کے پیش نظر زیادہ اہمیت اسی سوال کی ہو کہ ہم جو مال خرچ کریں، اس کا مصروف کیا ہو کہاں خرچ کریں، اسی لئے اس کے جواب میں اہمیت کے ساتھ مصارف بیان فرمائے گئے، اور کیا خرچ کریں اس سوال کا جواب ضمنی طور پر دینا کافی سمجھا گیا، اور بعد دلی آیت میں سوال صرف اتنا ہی تھا کہ ہم کیا چیز اور کیا مال خرچ کریں، اس لئے اس کا جواب ارشاد ہوا ثَلَاثُ أَفْعَفَ، یعنی آپ فرمادیں کہ جو کچھ بچے اپنی ضروریات سے وہ خرچ کیا کریں، ان دونوں آیتوں سے اللہ تعالیٰ کے راستہ میں مال خرچ کرنے کے متعلق چند ہدایات و مسائل معلوم ہوئے۔

مسئلہ اول: یہ کہ دونوں آیتیں زکوٰۃ فرض کے متعلق نہیں، کیونکہ زکوٰۃ فرض کے لئے تو نصاب مال بھی معسر ہو اور اس میں جتنی مقدار خرچ کرنا فرض ہے، وہ بھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ پوری طرح متعین و مقرر فرمادی گئی ہے، ان دونوں آیتوں میں نہ کسی نصاب مال کی قید ہے نہ خرچ کرنے کی مقدار بتلائی گئی ہے، اس سے معلوم ہوا کہ یہ دونوں آیتیں صدقات نافلہ کے متعلق ہیں، اس سے یہ شبہ بھی رفع ہو گیا کہ پہلی آیت میں خرچ کا مصروف والدین کو بھی مشرر دیا گیا ہے، حالانکہ مال باپ کو زکوٰۃ دینا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کے مطابق جائز نہیں، کیونکہ ان آیتوں کا تعلق فریضہ زکوٰۃ سے ہے ہی نہیں۔

مسئلہ دوم: دوسری ہدایت اس آیت سے یہ حاصل ہوئی کہ مال باپ اور دوسرے اعداء و شرار کو جو کچھ بطور ہدیہ دیا یا کھلایا جاتا ہے اگر اس میں بھی اللہ تعالیٰ کا حکم بجالانے کی نیت ہو تو وہ بھی موجب اجر و ثواب اور انفاق فی سبیل اللہ میں داخل ہے۔

مسئلہ: ہمیری ہدایت یہ حاصل ہوئی کہ نفل صدقات میں اس کی رعایت ضروری ہے، کہ جو مال اپنی ضروریات سے زائد ہو وہی خرچ کیا جائے، اپنے اہل و عیال کو تنگ میں ڈال کر اور ان کے حقوق کو تلف کر کے خرچ کرنا ثواب نہیں، اسی طرح جس کے ذمہ کسی کا قرض ہے قرضخواہ کو ادا نہ کرے اور نفل صدقات و خیرات میں اڑائے یہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک پسندیدہ نہیں، پھر ضروریات سے زائد مال کے خرچ کرنے کا جو ارشاد اس آیت میں ہے اس کو حضرت ابوذر غفاریؓ اور بعض دیگر حضرات نے حکم و حجت قرار دیا، کہ اپنی ضروریات سے زائد مال زکوٰۃ اور تمام حقوق ادا کر کے بعد بھی اپنی ملک میں جمع رکھنا جائز نہیں ضروریات سے زائد جو کچھ ہے سب کا صدقہ کر دینا واجب ہے، مگر جمہور صحابہؓ و تابعینؓ اور ائمہ دینؓ اس پر ہیں کہ ارشاد شریعی کا مطلب یہ ہے کہ جو کچھ اللہ کی راہ میں خرچ کرنا ہو وہ ضروریات سے زائد ہونا چاہئے، یہ نہیں کہ ضرورت سے زائد جو کچھ ہو اس کو صدقہ کر دینا ضروری یا واجب ہے، ہر صحابہ کرامؓ کے تعامل سے یہی ثابت ہوتا ہے۔

کُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهُ لَكُمْ وَعَسَىٰ أَنْ تَكْرَهُوا

فرض ہوئی تم پر لڑائی اور وہ بری لگتی ہے تم کو اور شاید کہ بری لگے تم کو

شَيْئًا وَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَعَسَىٰ أَنْ تُحِبُّوا شَيْئًا وَهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ

ایک چیز اور وہ بہتر ہو تمھارے حق میں اور شاید تم کو چل لگے ایک چیز اور وہ بُری ہو تمھارے حق میں

وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ ﴿۲۱۸﴾ يَسْأَلُونَكَ عَنِ الشَّهْرِ

اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے، تم سے پوچھتے ہیں مہینہ حرام کو

الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيهِ قُلْ فِيهِ كَيْدٌ مِّنْ وَصَلٌ عَنْ سَبِيلِ

کراس میں لڑنا کیسا، کہہ دے اس میں لڑائی بڑا گناہ ہے، اور روکنا اللہ کی راہ سے

اللَّهِ وَكُفْرٌ بِهِ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَإِخْرَاجُ أَهْلِهِ مِنْهُ

اور اس کو نہ ماننا اور مسجد الحرام سے روکنا اور نکال دینا اس کے لوگوں کو وہاں سے

أَكْبَرُ عِنْدَ اللَّهِ وَالْفِتْنَةُ أَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ وَلَا يَزَالُونَ

اس سے بھی زیادہ گناہ ہے اللہ کے نزدیک اور لوگوں کو دین سے بھلانا قتل سے بھی بڑھ کر ہے اور کفار حق ہمیشہ تم سے

يَقَاتِلُوكُمْ مَّعَىٰ يَرُدُّوكُمْ عَنْ دِينِكُمْ إِنِ اسْتَطَاعُوا وَمَنْ

لڑتے ہیں تم سے یہاں تک کہ تم کو پھر دین تمھارے دین سے اگر قابو پا دیں، اور جو کوئی

يُرْتَدُّ مِنْكُمْ عَنْ دِينِهِ فَيَمُتْ وَهُوَ كَافِرٌ فَأُولَٰئِكَ حَبِطَتْ

پھر تم میں سے اپنے دین سے پھر مر جادے حالت کفر ہی میں تو ایسوں کے منافع ہوتے

أَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَأُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ

عمل دنیا اور آخرت میں، اور وہ لوگ رہنے والے ہیں دوزخ میں وہ اس میں

فِيهَا خَالِدُونَ ﴿۲۱۹﴾ إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَاجَرُوا وَجْهَهُمُ

ہمیشہ رہیں گے، بیشک جو لوگ ایمان لائے اور جنھوں نے ہجرت کی اور لڑے

فِي سَبِيلِ اللَّهِ أُولَٰئِكَ يَرْجُونَ رَحْمَتَ اللَّهِ وَاللَّهُ غَفُورٌ

اللہ کی راہ میں وہ امید دار ہیں اللہ کی رحمت کے اور اللہ بخشنے والا

رَحِيمٌ ﴿۲۲۰﴾

مہربان ہے۔

خلاصہ تفسیر

تیرہواں حکم فرضیت جہاد جہاد کرنا تم پر فرض کیا گیا ہے اور وہ تم کو ملے گا (معلوم ہوتا)

ہو، اور یہ بات ممکن ہے کہ تم کسی بات کو گراں سمجھو اور (واقع میں) وہ

تمھارے حق میں خیر (اور مصلحت) ہو اور یہ (بھی) ممکن ہے کہ تم کسی امر کو مرغوب سمجھو اور (واقع میں) وہ

تمھارے حق میں (باعث) خرابی (کا) ہو اور (ہر شے کی حقیقت حال کو) اللہ تعالیٰ جانتے ہیں، اور تم

(پورا پورا) نہیں جانتے (اچھے بُرے کا فیصلہ اپنی خواہش کی بنیاد پر نہ کر دو کچھ اللہ کا حکم ہو جائے، یہی

سوچا جالا مصلحت سمجھ کر اس پر کاربند رہا کرو)

چودھواں حکم تحقیق قتال در شہر حرام (حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چند صحابہ کا ایک سفر میں اتفاق سے کفار کے ساتھ مقابلہ ہو گیا، ایک کافر

ان کے ہاتھ سے مارا گیا، اور جس روز یہ قصہ ہوا جب کی پہلی تاریخ تھی، مگر صحابہؓ اس کو جادوی الاخریٰ

کی سیس سمجھتے تھے، اور جب شہر حرم میں سے ہے کفار نے اس واقعہ پر طعن کیا کہ مسلمانوں نے

شہر حرام کی حرمت کا بھی خیال نہیں کیا، مسلمانوں کو اس کی فکر ہوئی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے

پوچھا اور بعض روایات میں ہے کہ خود بعض کفار تشریف لے گئے بھی حاضر ہو کر اعتراضا سوال کیا،

اس کا جواب ارشاد ہوتا ہے)۔

لوگ آپ سے شہر حرام میں قتال کرنے کے متعلق سوال کرتے ہیں آپ فرمادیجئے کہ اس میں خاص طور پر (یعنی عدا) قتال کرنا جرم عظیم ہے مگر مسلمانوں سے یہ فعل بالقصد صادر نہیں ہوا، بلکہ تاریخ کی تحقیق نہ ہونے کے بسبب غلط سے ایسا ہو گیا یہ تو تحقیقی جواب ہے، اور الزامی جواب یہ ہے کہ کفار و مشرکین کا تو کس طرح نہ ہی نہیں مسلمانوں پر اعتراض کرنے کا، کیونکہ اگرچہ شہر حرام میں لڑنا جرم عظیم ہے، لیکن ان کفار کی جو حرکتیں ہیں یعنی اللہ تعالیٰ کی راہ (دین) سے (لوگوں کو) روک ٹوک کر زار دین مسلمان ہونے پر تکلیفیں پہنچانا کہ ڈر کے مارے لوگ مسلمان نہ ہوں، اور اللہ تعالیٰ کے حق کو گناہ اور مجرم حرام (یعنی کبیر) کے ساتھ کفر کرنا کہ وہاں بہت سے بیت رکھ چھوڑے تھے، اور بچائے خدا کی عبادت کے ان کی عبادت اور طواف کرتے تھے، اور جو لوگ مسجد حرام کے اہل تھے (یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور دس مومنین) ان کو (تنگ اور پریشان کر کے) اس (مسجد حرام) سے خارج (ہونے پر مجبور) کر دینا جس سے فوجت ہجرت لین ترک وطن کی پہنچی، سو یہ حرکتیں شہر حرام میں قتال کرنے سے بھی زیادہ جرم عظیم ہیں، اللہ تعالیٰ کے نزدیک (کیونکہ یہ حرکتیں دین حق کے اندر فتنہ پروازی کرنا ہے) اور (ایسی) فتنہ پروازی کرنا (اس) قتل (خاص) سے (جو مسلمانوں سے صادر ہوا) بدرجہا (قباحت میں) بڑھ کر ہے (کیونکہ اس قتل سے دین حق کو تو کوئی مضرت نہیں پہنچی بہت سے بہت اگر کوئی جان کر کرے، خود ہی گنہگار ہوگا اور ان حرکتوں سے تو دین حق کو ضرر پہنچا ہے کہ اس کی ترقی رکتی ہے) اور یہ کفار تمھارے ساتھ ہمیشہ جنگ و جدال کا سلسلہ جاری ہی رکھیں گے، اس فرض سے کہ اگر (خدا نہ کرے) قابو پا دیں تو تم کو تمھارے دین (اسلام) سے پھیر دیں (ان کے اس فعل سے دین کی مزاحمت ظاہر ہے)۔

انجمل ارتداد اور جو شخص تم میں سے اپنے دین (اسلام) سے پھر جائے، پھر کافر ہی ہونے کی حالت میں مرجائے تو ایسے لوگوں کے (نیک) اعمال دنیا اور آخرت میں سب غارت ہو جاتے ہیں، (اور) یہ لوگ دوزخ میں ہمیشہ رہیں گے۔

شہر حرام میں قتال کرنے کے بارے میں مسلمانوں کو جواب مذکور منکر گناہ نہ ہونے کا تو اطمینان ہو گیا تھا، مگر اس خیال سے دل شکستہ تھے کہ ثواب تو ہوا ہی نہ ہوگا، آگے اس میں تسلی کی گئی۔

وعدۃ ثواب اخلاص نیت حقیقتہً جو لوگ ایمان لائے ہوں اور جن لوگوں نے ماہ خدا میں جو دین کیا ہو اور جہاد کیا ہو، ایسے لوگ تو رحمت خداوندی کے امیدوار ہو کر رہتے ہیں، (اور) تم لوگوں میں یہ صفات علی سبیل منع الخلو موجود ہیں، چنانچہ ایمان اور ہجرت تو ظاہر ہے، اور اس جہاد خاص میں شبہ ہو سکتا ہے، سو چونکہ تمھاری نیت تو جہاد ہی کی تھی، لہذا ہمارے نزدیک وہ بھی جہاد ہی میں شمار ہے، پھر ان صفات کے ہوتے ہوئے تم کیوں نا امید

ہوتے ہو، اور اللہ تعالیٰ (اس غلطی کو) معاف کر دیں گے اور ایمان و جہاد و ہجرت کی وجہ سے تم پر رحمت کریں گے۔

معارف و مسائل

بعض احکام جہاد مسئلہ ۱۔ مذکور الصدر آیات میں سے پہلی آیت میں جہاد کے فرض ہونے کا حکم ان الفاظ کے ساتھ آیا ہے کَتَبْنَا عَلَيْكُمْ الْقِتَالَ، یعنی تم پر جہاد فرض کیا گیا، ان الفاظ سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ جہاد ہر ملک پر ہر حالت میں فرض ہے، بعض آیات قرآن اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ فریضہ مسلمانین کے طور پر ہر مسلمان پر عائد نہیں، بلکہ فرض کفایہ ہے کہ مسلمان کی ایک جماعت اس فرض کو ادا کرے تو باقی مسلمان سبکدوش بھی جاتے ہیں گے، ہاں کسی زمانہ یا کسی ملک میں کوئی جماعت بھی فریضہ جہاد ادا کرنے والی نہ ہے تو سب مسلمان ترک فرض کے گنہگار ہو جائیں گے، حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد اَلْجِهَادُ مَآجِنٌ اِلٰی يَوْمِ اَقِيَّتِ مَنَاحِیْہِ کا یہ مطلب ہو کہ قیامت تک ایسی جماعت کا موجود نہ ضروری ہے جو فریضہ جہاد ادا کرتی ہے، قرآن مجید کی دوسری آیت میں ارشاد ہے:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا جَاهِدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَعَلَّكُمْ تُكَلِّمُوْنَ اللّٰهَ كَلٰمًا قَلِيْلًا وَّعَلَّآ وَعَدَ اللّٰهُ الْخَشِيْعَ (۹۵:۴)

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا جَاهِدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَعَلَّكُمْ تُكَلِّمُوْنَ اللّٰهَ كَلٰمًا قَلِيْلًا وَّعَلَّآ وَعَدَ اللّٰهُ الْخَشِيْعَ (۹۵:۴)

اس میں ایسے لوگوں سے جو کسی عذر کے سبب یا کسی دوسری دینی خدمت میں مشغول ہو کر جہاد میں شریک نہ ہوں ان سے بھی بھلائی کا وعدہ مذکور ہے، ظاہر ہے کہ اگر جہاد ہر فرد مسلم پر فرض میں ہوتا تو اس کے چھوڑنے والوں سے وعدہ خوشی یعنی بھلائی کا وعدہ ہونے کی صورت تھی، اسی طرح ایک دوسری آیت میں ہے:

اَلَّذِيْنَ يَخْرُجْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يَحْتَسِبْ اَنْ يَّجْزِيَ اللّٰهُ مِنْهُ جُزْءًا كَلِيْلًا (۹۵:۴)

اَلَّذِيْنَ يَخْرُجْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يَحْتَسِبْ اَنْ يَّجْزِيَ اللّٰهُ مِنْهُ جُزْءًا كَلِيْلًا (۹۵:۴)

اس میں خود قرآن کریم نے یہ تقسیم عمل پیش فرمائی کہ کچھ مسلمان جہاد کا کام کریں اور کچھ تعلیم دین میں مشغول رہیں، اور یہ جیسی ہو سکتا ہے جبکہ جہاد فرض عین نہ ہو بلکہ فرض کفایہ ہو۔ نیز صحیح بخاری و مسلم کی حدیث ہے کہ ایک شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے شرکت جہاد کی اجازت چاہی تو آپ نے اس سے دریافت کیا کہ کیا تمھارے ماں باپ زندہ ہیں

اس نے عرض کیا کہ ان زندہ ہیں آپ نے فرمایا کہ پھر جاؤ، ان باپ کی خدمت کر کے جہاد کا ثواب حاصل کرو۔ اس سے بھی یہ معلوم ہوا کہ جہاد فرض کفایہ ہے، جب مسلمانوں کی ایک جماعت فریضہ جہاد کو قائم کئے ہوئے ہو تو باقی مسلمان دوسری خدمتوں اور کاموں میں لگ سکتے ہیں، ہاں اگر کسی وقت امام المسلمین ضرورت سمجھ کر بغیر عام کا حکم دے اور سب مسلمانوں کو شرکت جہاد کی دعوت دے تو پھر جہاد سب پر فرض عین ہو جاتا ہے، قرآن حکم یہ ہے سورۃ توبہ میں ارشاد فرمایا:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّا جَعَلْنَا لَكُمُ الْغُرُوبَ وَآفِئَةً فِي سَبِيلِ اللَّهِ
إِذَا قَاتَلْتُمُ ۖ (۲۸: ۱۹)

اے مسلمانو! تمہیں کیا ہو گیا کہ جب تم سے کہا جاتا ہے کہ اللہ کی راہ میں نکلو تو تم بچیں بن جاتے ہو

اس آیت میں اسی بغیر عام کا حکم مذکور ہے، اسی طرح اگر خدا نخواستہ کسی وقت کفار کسی اسلامی ملک پر حملہ آور ہوں اور ممانعت کرنے والی جماعت ان کی ممانعت کو ہی طرح قادر اور کافی نہ ہو تو اس وقت بھی یہ فریضہ اس جماعت سے متعدی ہو کر پاس والے سب مسلمانوں پر عائد ہو جاتا ہے اور اگر وہ بھی عاجز نہ ہوں تو ان کے پاس والے مسلمانوں پر یہاں تک کہ پوری دنیا کے ہر ہر فرد مسلم پر ایسے وقت جہاد فرض عین ہو جاتا ہے، قرآن مجید کی مذکورہ بالا تمام آیات کے مطالعہ سے مجبور فقہاء و محدثین نے یہ حکم قرار دیا ہے کہ عام حالات میں جہاد فرض کفایہ ہے۔

مسئلہ: اسی لئے جب تک جہاد فرض کفایہ ہوا و لا د کو بغیر ماں باپ کی اجازت کے جہاد میں جانا جائز نہیں۔

مسئلہ: جس شخص کے ذمہ کسی کا قرض ہو اس کے لئے جب تک قرض ادا نہ کر دے اس فرض کفایہ میں حصہ لینا درست نہیں، ہاں اگر کسی وقت بغیر عام کے سبب یا کفار کے نزعہ بے پشت جہاد سب پر فرض عین ہو جائے تو اس وقت نہ والدین کی اجازت شرط ہے نہ شوہر کی اور نہ شتر خواہ کی، اس آیت کے آخر میں جہاد کی ترغیب کے لئے ارشاد فرمایا ہے کہ جہاد اگرچہ طبعی طور پر تمہیں بھاری معلوم ہو، لیکن خوب یاد رکھو کہ انسانی بصیرت و دانشمندی اور تدبیر و محنت عواقب و نتائج کے بارے میں بکثرت فیمل ہوتی ہے، کسی مفید کو مضریامضری کو مفید سمجھ لینا بڑے سے بڑے ہوشیاری و عقلمندی سے بھی مستبعد نہیں، ہر انسان اگر اپنی عمر میں پیش آنے والے نتائج پر نظر ڈالے تو اپنی ہی زندگی میں اس کو بہت سے واقعات ایسے نظر آئیں گے کہ وہ کسی چیز کو نہایت مفید سمجھ کر حاصل کر رہے ہوتے، اور انجام کار یہ معلوم ہوا کہ وہ انتہائی مضرتیں یا کسی چیز کو نہایت مضرت سمجھ کر اس سے چھیننا کر رہے ہوتے، اور انجام کار یہ معلوم ہوا کہ وہ نہایت مفید تھی، انسانی عقل و تدبیر کی رسوائی اس معاملہ میں بکثرت مشاہدہ میں آتی رہتی ہے

خوبش را در دم در سوالی خویش

اس لئے فرمایا کہ جہاد قتال میں اگرچہ بظاہر مال اور جان کا نقصان نظر آتا ہے، لیکن جب حقائق سامنے آئیں گے تو کھلے گا کہ نقصان ہرگز نقصان نہ تھا بلکہ سرسرفیع اور دائمی راحت کسماں تھا۔ آیات مذکورہ میں سے دوسری آیت اس پر شاہد ہے کہ اشہر حرم اشہر حرم میں قتال کا حکم یعنی چار جیسے رجب، ذیقعدہ، ذی الحجہ، محرم میں قتال حرام ہوا اسی طرح قرآن کریم کی متعدد آیتوں میں پوری تصریح کے ساتھ اشہر حرم میں قتال کی ممانعت آتی ہے، مثلاً وَمِنْهَا أَرْبَعَةٌ حُرُمٌ ذَٰلِكَ الْيَمِينُ الْقَيُّمُ اور حجۃ الوداع کے معروف و مشہور خطبہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا منها اربعۃ حرم ثلاث متوالیات و رجب مضمر۔

ان آیات و روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ مذکورہ چار مہینوں میں قتال حرام ہے، اور یہ حرمت ہمیشہ کے لئے ہے۔

اور امام تفسیر عطاء بن ابی رباح قسم کھا کر فرماتے تھے کہ یہ حکم ہمیشہ کے لئے باقی ہے، اور بھی متعدد حضرات تابعین اس حکم کو ثابت غیر منسوخ قرار دیتے ہیں مگر مجبور فقہاء کے نزدیک اور بقول جصاص امام فقہاء اصحاب کے مسلک پر یہ حکم منسوخ ہے، اب کسی مہینہ میں قتال ممنوع نہیں۔ اب رہا یہ سوال کہ اس کا ناسخ کوئی آیت ہے، اس میں فقہاء کے مختلف اقوال ہیں یعنی نے فرمایا کہ آیت کریمہ قَاتِلُوا الْمُشْرِكِينَ كَآفَّةً (۲۱: ۹) اس کی ناسخ ہے، اور اکثر حضرات نے آیت قَاتِلُوا الْمُشْرِكِينَ حَتَّى تَكُونَ دِیْنُكُمْ وَتَكُونَ لَكُمُ الْيَمِیْنُ (۵: ۹) کو ناسخ قرار دیا ہے، اور لفظ حیث کو اس جنگ زمانے کے معنی میں لیا ہے، کہ مشرکین کو جس مہینہ اور جس زمانے میں پاؤ قتل کرو اور بعض حضرات نے فرمایا کہ اس حکم کا ناسخ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنا عمل ہے کہ خود آپ نے طائف کا محاصرہ اشہر حرم میں فرمایا، اور حضرت عامر اشعری کو اشہر حرم ہی میں ارطاس کے جہاد کے لئے بھیجا، اسی بناء پر عائد فقہاء اس حکم کو منسوخ قرار دیتے ہیں، جصاص نے فرمایا دھوقول فقہاء الا مصابرو روح المعانی نے اسی آیت کے تحت میں اور بیضاوی نے سورۃ برأت کے پہلے رکوع کی تفسیر میں اشہر حرم میں حرمت قتال کے منسوخ ہونے پر اجماع اقامت نقل کیا ہے، بیان القرآن، مگر تفسیر مظہری میں مذکورہ تمام دلائل کا جواب یہ دیا ہے کہ اشہر حرم کی حرمت کی تصریح خود اس آیت میں موجود ہے، جس کو آیت التیغ کہا جاتا ہے، یعنی اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُورِ حُرُمٌ (۲: ۱۹) یہ آیت آیات قتال فی کتاب اللہ یَوْمَ تَخْلَقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَنَحْنُ اَرْبَعَةٌ حُرُمٌ (۲: ۱۹) یہ آیت آیات قتال میں سب سے آخر میں نازل ہوئی ہے، اور خطبہ حجۃ الوداع جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے صرف اتنی روز پہلے ہوا ہے اس میں بھی اشہر حرم کی حرمت کی تصریح موجود ہے، اس لئے آیات

مذکورہ کو اس کا نسخہ نہیں کہا جاسکتا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خاصہ طاقت زد القعدہ میں نہیں، مثال میں ہوسے اس لئے اس کو بھی نسخہ نہیں کہہ سکتے، البتہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ اشہر حرم میں قتال کی حرمت مطلقہ جو مذکورہ آیات سے معلوم ہوتی ہے، اس میں سے وہ صورت مستثنیٰ کر دی گئی ہے کہ خود کفار ان ہینوں میں مسلمانوں سے قتال کرنے لگیں تو جوابی حملہ اور دفاع مسلمانوں کے لئے بھی جائز ہے، اتنے حصہ کو منسوخ کہا جاسکتا ہے جس کی تصریح اس آیت میں ہے، **الشَّعْرُ الْخَرَامُ بِالشَّعْرِ الْخَرَامِ** الآیہ - (۱۶۴:۲)

توضیح یہ ہوا کہ ابتداً قتال تو ان ہینوں میں ہمیشہ کے لئے حرام ہے، مگر جب کفار ان ہینوں میں حملہ آور ہوں تو مدافعتاً قتال کی مسلمانوں کو بھی اجازت ہے، جیسا کہ امام جصاص نے بروایت حضرت جابر بن عبد اللہ نقل کیا ہے، کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کسی شہر حرام میں اس وقت تک قتال نہ کرتے تھے جب تک قتال کی ابتدا کفار کی طرف سے نہ ہو جائے۔

انجام ارتداد آیت مذکورہ **يَسْأَلُونَكَ عَنِ الشَّعْرِ الْخَرَامِ** کے آخر میں مسلمان ہونے کے بعد کفر و ارتداد اختیار کرنے کا یہ حکم ذکر فرمایا ہے کہ **يَحْتَطَّتْ أَعْتَاكُمُ فِي النَّبَاِ وَالْآخِرَةِ** یعنی ان لوگوں کے اعمال دنیا و آخرت میں سب غارت ہو جائیں گے۔

مسئلہ دنیا میں اعمال کا ضائع ہونا یہ ہو کہ اس کی بی بی نکاح سے بچل جاتی ہے، اگر اس کا کوئی مورث مسلمان مرے اس شخص کو میراث کا حصہ نہیں ملتا، عالیت اسلام میں نماز روزہ جو کچھ کیا تھا سب کا عدم ہو جاتا ہے، مرنے کے بعد جنازے کی نماز نہیں پڑھی جاتی، مسلمانوں کے مقابر میں دفن نہیں ہوتا۔

اور آخرت میں ضائع ہونا یہ ہے کہ عبادات میں ثواب نہیں ملتا، ابدال آباد کے لئے دوزخ میں داخل ہوتا ہے۔

مسئلہ اگر یہ شخص پھر مسلمان ہو جائے تو آخرت میں دوزخ سے بچے اور دنیا میں آئندہ کے لئے احکام اسلام کا جاری ہونا تو یقینی ہے، لیکن دنیا میں اگر کچھ کر چکا تو بشرط وسعت دوبارہ اس کا فرض ہونا نہ ہونا اور آخرت میں پچھلے نماز روزہ کے ثواب کا عود کرنا نہ کرنا اس میں اختلاف ہے، امام ابو حنیفہ دوبارہ حج کو فرض کہتے ہیں، اور گزشتہ نماز روزہ پر ثواب ملنے کے قائل نہیں اور امام شافعی دونوں امر میں اختلاف کرتے ہیں۔

مسئلہ لیکن جو کافر اصلی ہو اور اس حالت میں کوئی نیک کام کرے اس کا ثواب ملتا رہتا ہے، اگر کبھی اسلام لے آیا سب پر ثواب ملتا ہے، اور اگر کفر پر مگر تو سب بیکار جاتا ہے، حدیث میں اسلمت علی ما اسلفت من خیر اسی معنی میں وارد ہے۔

مسئلہ، فحش مرتد کی حالت کا فرائض سے بدتر ہے، اسی واسطے کافر اصلی سے جو قبول ہو سکتا ہے، اور مرتد اگر اسلام نہ لادے اگر مرد ہے قتل کر دیا جاتا ہے، اگر عورت ہو تو دوام جس کی سزا دی جاتی ہے، کیونکہ اس سے اسلام کی امانت ہوتی ہے، سرکاری امانت اسی سزا کے لائق ہے۔

يَسْأَلُونَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ قُلْ فِيهِمَا آثَمُ كَبِيرٌ وَمَنَافِعُ

تجھے پوچھتے ہیں علم شراب کا اور جوئے کا کہہ لے ان دونوں میں بڑا گناہ ہے اور فائدہ

لِلنَّاسِ وَآثَمُ مِمَّا أَكْبَرُ مِنْ نُّفُوعِهِمَا

بہی لوگوں کو اور ان کا گناہ بہت بڑا ہے ان کے فائدے سے۔

خلاصہ تفسیر

پندرہواں حکم لوگ آپ سے شراب اور قمار کی نسبت دریافت کرتے ہیں، آپ فرمادیں کہ ان دونوں چیزوں کے ہستمال میں گناہ کی بڑی بڑی بائیں بھی رسید ہو جاتی ہیں اور لوگوں کو (بیٹھے) فائدے بھی ہیں اور (دوہ) گناہ کی بائیں ان فائدوں سے زیادہ بڑی ہوتی ہیں اس لئے دونوں قابل ترک ہیں۔

معارف و مسائل

صحابہ کرامؓ کے سوالات اور ان کے جوابات کا جو سلسلہ اس سورت میں بیان ہو رہا ہے، اس میں یہ آیت بھی ہے، اس میں شراب اور جوئے کے متعلق صحابہ کرامؓ کا سوال اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے جواب ہوا یہ دونوں مسئلے نہایت اہم ہیں، اس لئے کسی قدر تفصیل کے ساتھ ان کی پوری حقیقت اور احکام سنئے۔

حرمت شراب اور اس کے متعلقہ اعمال

ابتداءً اسلام میں عام رسوم جاہلیت کی طرح شراب خوری بھی عام تھی، جب رسول کریم صلی اللہ

مذکورہ کو اس کا نسخہ نہیں کہا جاسکتا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خاصہ طاقت زد القعدہ میں نہیں، مثال میں ہوسے اس لئے اس کو بھی نسخہ نہیں کہہ سکتے، البتہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ اشہر حرم میں قتال کی حرمت مطلقہ جو مذکورہ آیات سے معلوم ہوتی ہے، اس میں سے وہ صورت مستثنیٰ کر دی گئی ہے کہ خود کفار ان ہینوں میں مسلمانوں سے قتال کرنے لگیں تو جوابی حملہ اور دفاع مسلمانوں کے لئے بھی جائز ہے، اتنے حصہ کو منسوخ کہا جاسکتا ہے جس کی تصریح اس آیت میں ہے، **الشَّعْرُ الْخَرَامُ بِالشَّعْرِ الْخَرَامِ** الآیہ - (۱۶۴:۲)

توضیح یہ ہوا کہ ابتداً قتال تو ان ہینوں میں ہمیشہ کے لئے حرام ہے، مگر جب کفار ان ہینوں میں حملہ آور ہوں تو مدافعتاً قتال کی مسلمانوں کو بھی اجازت ہے، جیسا کہ امام جصاص نے بروایت حضرت جابر بن عبد اللہ نقل کیا ہے، کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کسی شہر حرام میں اس وقت تک قتال نہ کرتے تھے جب تک قتال کی ابتدا کفار کی طرف سے نہ ہو جائے۔

انجام ارتداد آیت مذکورہ **يَسْأَلُونَكَ عَنِ الشَّعْرِ الْخَرَامِ** کے آخر میں مسلمان ہونے کے بعد کفر و ارتداد اختیار کرنے کا یہ حکم ذکر فرمایا ہے کہ **يَحْتَطَّتْ أَعْتَاكُمُ فِي النَّبَاِ وَالْآخِرَةِ** یعنی ان لوگوں کے اعمال دنیا و آخرت میں سب غارت ہو جائیں گے۔

مسئلہ دنیا میں اعمال کا ضائع ہونا یہ ہو کہ اس کی بی بی نکاح سے بچل جاتی ہے، اگر اس کا کوئی مورث مسلمان مرے اس شخص کو میراث کا حصہ نہیں ملتا، عالیت اسلام میں نماز روزہ جو کچھ کیا تھا سب کا عدم ہو جاتا ہے، مرنے کے بعد جنازے کی نماز نہیں پڑھی جاتی، مسلمانوں کے مقابر میں دفن نہیں ہوتا۔

اور آخرت میں ضائع ہونا یہ ہے کہ عبادات میں ثواب نہیں ملتا، ابدال آباد کے لئے دوزخ میں داخل ہوتا ہے۔

مسئلہ اگر یہ شخص پھر مسلمان ہو جائے تو آخرت میں دوزخ سے بچے اور دنیا میں آئندہ کے لئے احکام اسلام کا جاری ہونا تو یقینی ہے، لیکن دنیا میں اگر کچھ کر چکا تو بشرط وسعت دوبارہ اس کا فرض ہونا نہ ہونا اور آخرت میں پچھلے نماز روزہ کے ثواب کا عود کرنا اس میں اختلاف ہے، امام ابو حنیفہ دوبارہ حج کو فرض کہتے ہیں، اور گزشتہ نماز روزہ پر ثواب ملنے کے قائل نہیں اور امام شافعی دونوں امر میں اختلاف کرتے ہیں۔

مسئلہ لیکن جو کافر اصلی ہو اور اس حالت میں کوئی نیک کام کرے اس کا ثواب ملتا رہتا ہے، اگر کبھی اسلام لے آیا سب پر ثواب ملتا ہے، اور اگر کفر پر مگر تو سب بیکار جاتا ہے، حدیث میں اسلقت علی ما اسلفت من خیر اسی معنی میں وارد ہے۔

مسئلہ، فحش مرتد کی حالت کا فرائض سے بدتر ہے، اسی واسطے کافر اصلی سے جو قبول ہو سکتا ہے، اور مرتد اگر اسلام نہ لادے اگر مرد ہے قتل کر دیا جاتا ہے، اگر عورت ہو تو دوام جس کی سزا دی جاتی ہے، کیونکہ اس سے اسلام کی امانت ہوتی ہے، سرکاری امانت اسی سزا کے لائق ہے۔

يَسْأَلُونَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ قُلْ فِيهِمَا آثَمُ كَبِيرٌ وَمَنَافِعُ

تجھے پوچھتے ہیں علم شراب کا اور جوئے کا کہہ لے ان دونوں میں بڑا گناہ ہے اور فائدہ

لِلنَّاسِ وَآثَمُ مِمَّا أَكْبَرُ مِنْ نُّفُوعِهِمَا

بہی لوگوں کو اور ان کا گناہ بہت بڑا ہے ان کے فائدے سے۔

خلاصہ تفسیر

پندرہواں حکم لوگ آپ سے شراب اور قمار کی نسبت دریافت کرتے ہیں، آپ فرمادیں گے کہ ان دونوں چیزوں کے ہستمال میں گناہ کی بڑی بڑی باتیں بھی رہیں ہو جاتی ہیں اور لوگوں کو رہیں، فائدے بھی ہیں اور ذرہ گناہ کی باتیں ان فائدوں سے زیادہ بڑی ہوتی ہیں اس لئے دونوں قابل ترک ہیں۔

معارف و مسائل

صحابہ کرامؓ کے سوالات اور ان کے جوابات کا جو سلسلہ اس سورت میں بیان ہو رہا ہے، اس میں یہ آیت بھی ہے، اس میں شراب اور جوئے کے متعلق صحابہ کرامؓ کا سوال اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے جواب ہوا یہ دونوں مسئلے نہایت اہم ہیں، اس لئے کسی قدر تفصیل کے ساتھ ان کی پوری حقیقت اور احکام سنئے۔

حرمت شراب اور اس کے متعلقہ اعمال

ابتداءً اسلام میں عام رسوم جاہلیت کی طرح شراب خوری بھی عام تھی، جب رسول کریم صلی اللہ

علیہ وسلم ہجرت کر کے مدینہ تشریف لائے تو اہل مدینہ میں بھی شراب اور قمار یعنی جو کھیلنے کا رواج تھا، عام لوگ تو ان دونوں چیزوں کے صرف ظاہری فوائد کو دیکھ کر ان پر فریفتہ تھے، ان کے اندر جو بہت مفاسد اور خرابیاں ہیں ان کی طرف نظر نہیں تھی، لیکن عادیۃ اللہ یہ بھی ہے کہ ہر قوم اور ہر خط میں کچھ عقل والے بھی ہوتے ہیں، جو طبیعت پر عقل کو غالب رکھتے ہیں، کوئی طبیعت خواہش اگر عقل کے خلاف ہو تو وہ اس خواہش کے پاس نہیں جاتے، اس معاملہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا مقام تو بہت ہی بلند تھا کہ جو چیز کسی وقت حرام ہونے والی تھی آپ کی طبیعت اس سے پہلے ہی نفرت کرتی تھی، صحابہ کرامؓ بھی کچھ ایسے حضرات تھے جنہوں نے حلال ہونے کے زمانے میں بھی شراب کو ہاتھ نہیں لگایا، مدینہ طیبہ پہنچنے کے بعد چند حضرات صحابہؓ کو ان کے مفاسد کا زیادہ احساس ہوا حضرت فاروق اعظمؓ اور معاذ بن جبلؓ اور چند انصاری صحابہؓ اسی احساس کی بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور عرض کیا کہ شراب اور قمار انسان کی عقل کو بھی حشراب کرتے ہیں، اور مال بھی برباد کرتے ہیں، ان کے بارے میں آپ کا کیا ارشاد ہے، اس سوال کے جواب میں آیت مذکورہ نازل ہوئی یہ پہلی آیت ہے جس میں شراب اور جوئے سے مسلمانوں کو روکنے کا ابتدائی قدم اٹھایا گیا۔

اس آیت میں بتلایا گیا ہے کہ شراب اور جوئے میں اگرچہ لوگوں کے کچھ ظاہری فوائد ضرور ہیں لیکن ان دونوں میں گناہ کی بڑی بڑی باتیں پیدا ہو جاتی ہیں جو ان کے منافع اور فوائد سے بڑی ہوتی ہیں، اور گناہ کی باتوں سے وہ چیزیں مراد ہیں جو کسی گناہ کا سبب بن جائیں، مثلاً شراب میں سبکے بڑی خرابی یہ ہے کہ عقل و ہوش زائل ہو جاتا ہے جو تمام کمالات اور شرف انسانی کا اصل اصول ہے، کیونکہ عقل ہی ایک ایسی چیز ہے جو انسانوں کو بڑے کاموں سے روکتی ہے، جب وہ نہ رہی تو ہر بڑے کام کے لئے راستہ ہموار ہو گیا۔

اس آیت میں صاف طور پر شراب کو حرام تو نہیں کہا گیا، مگر اس کی خرابیاں اور مفاسد بیان کر دیئے گئے کہ شراب کی وجہ سے انسان بہت سے گناہوں اور خرابیوں میں مبتلا ہو سکتا ہے، مگر اس کے ترک کرنے کے لئے ایک قسم کا مشورہ دیا گیا ہے، یہی وجہ ہے کہ اس آیت کے نازل ہونے کے بعد بعض صحابہ کرامؓ کو اس مشورہ ہی کو قبول کر کے اسی وقت شراب کو چھوڑ بیٹھے، اور بعض نے یہ خیال کیا کہ اس آیت نے شراب کو حرام تو کیا ہے بلکہ مفاسد دینی کا سبب بننے کی وجہ سے اس کو سبب گناہ قرار دیا ہے۔ ہم اس کا اہتمام کریں گے کہ وہ مفاسد واقع نہ ہوں، تو پھر شراب میں کوئی حرج نہیں اس لئے پیتے رہے، یہاں تک کہ ایک روز یہ واقعہ پیش آیا کہ حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ نے صحابہ کرامؓ میں سے چند اپنے دوستوں کی دعوت کی، کھانے کے بعد

حسب دستور شراب پی گئی، اسی حال میں نماز مغرب کا وقت آ گیا، سب نماز کے لئے کھڑے ہو گئے، تو ایک صاحب کو امامت کے لئے آگے بڑھایا، انہوں نے نشہ کی حالت میں جو تلاوت شروع کی تو سورۃ قل یا یٰٰہٰی الخمریون کو غلط پڑھا، اس پر شراب سے روکنے کے لئے دو سرا قدم اٹھایا گیا اور یہ آیت نازل ہوئی۔

یٰٰہٰی الَّذِیْنَ یَنْتَوُوا الْاَلْحَمْرَ بُوَا
الْمُتَلَوِّیْنَ وَ اَنْتُمْ سَکَنَہِی (۲: ۲۱۹)

تین اے ایمان والو تم نشہ کی حالت میں
نماز کے پاس نہ جاؤ۔

اس میں خاص اوقات نماز کے اندر شراب کو قطعی طور پر حرام کر دیا گیا، باقی اوقات میں اجازت رہی جن حضرات صحابہؓ نے پہلی آیت نازل ہونے کے وقت شراب کو چھوڑا تھا اسی آیت کے نازل ہونے کے وقت شراب کو قطعاً ترک کر دیا کہ جو چیز انسان کو نماز سے روکے اس میں کوئی خیر نہیں ہو سکتی، جب نشہ کی حالت میں نماز کی ممانعت ہو گئی تو ایسی چیز کے پاس نہ جانا چاہئے جو انسان کو نماز سے محروم کر دے، مگر چونکہ علاوہ اوقات نماز کے شراب کی حرمت مطلقاً پر اب بھی نازل نہیں ہوئی تھی، اس لئے کچھ حضرات اب بھی اوقات نماز کے علاوہ دوسرے اوقات میں پیتے رہے، یہاں تک کہ ایک اور واقعہ پیش آیا، عتبہ بن مالکؓ نے چند صحابہ کرامؓ کی دعوت کی جن میں سعد بن ابی وقاصؓ بھی تھے، کھانے کے بعد حسب دستور شراب کا ذور چلا، نشہ کی حالت میں عرب کی عام عادت کے مطابق شعرو شاعری اور اپنے اپنے مفاسد کا بیان شروع ہوا، سعد بن ابی وقاصؓ نے ایک قصیدہ پڑھا، جس میں انصار مدینہ کی بھو اور اپنی قوم کی مدح و ثناء تھی، اس پر ایک انصاری نوجوان کو غصہ آ گیا، اور ادب کے جھڑکے کی ہڈی سعد رضی اللہ عنہ کے سر پر مار دی، جس سے ان کو شدید زخم آ گیا، حضرت سعدؓ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور اس انصاری جوان کی شکایت کی، اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا فرمائی، اَللّٰهُمَّ یٰٰہٰی الَّذِیْنَ یَنْتَوُوا الْاَلْحَمْرَ بُوَا یٰٰہٰی اَللّٰہُمَّ صَلِّ عَلَیْہِ سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ، یعنی یا اللہ شراب کے بارے میں ہیں کوئی واضح بیان اور قانون عطا فرما دے، اس پر شراب کے متعلق تیسری آیت سورہ مائدہ کی مفصل نازل ہو گئی، جس میں شراب کو مطلقاً حرام قرار دیا گیا، آیت یہ ہے:

یٰٰہٰی الَّذِیْنَ یَنْتَوُوا الْاَلْحَمْرَ
وَالْمِیْسِرَ وَالْاَنصَابَ الْاَزْلَامِ وَ یٰٰہٰی الَّذِیْنَ
ہُمِلَ عَلَیْہِمْ فَاَجْتَنِبُوْہُ تَعْتَمِدُوْہُ
تَقْلِبُوْہُ وَ اَنْتُمْ سَکَنَہِی
اَنْ یُّزَوِّیَ بَیْنَکُمْ اَعْنَ اَوْیَ
الْبَغْضَاءِ فِی الْخَمْرِ وَالْمِیْسِرِ

تین اے ایمان والو بات یہ ہے کہ شراب
اور جوئے اور کھیل اور قمار کے تیرا یہ سب گھنہ
ہائیں شیطان کا کام ہیں اس سے بالکل الگ
الگ رہو تاکہ تم نہ ہو شیطان قریب
ہے کہ شراب و جوئے کے ذریعہ تمہارے آپس
میں بغض اور مداومت پیدا کر دے

وَيَسْتَكْبِرُونَ وَكَرِهُوا اللَّهَ وَيَحِبُّونَ الصَّلَاةَ
فَقُلْ أَنتُمْ مَنْتَهُونَ (۹۱: ۵)

اور اللہ تعالیٰ کی یاد اور نماز سے تم کو باز رکھے۔
سو کیا اب بھی باز آؤ گے۔

حُرمت شراب کے تدریجی احکام

احکام الہیہ کی اصلی اور حقیقی حکمتوں کو تو احکام الحاکمین ہی جانتا ہے، مگر احکام شریعیہ میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ شریعت اسلام نے احکام میں انسانی جذبات کی بڑی رعایت فرمائی ہے، تاکہ انسان کو ان کے اعتبار میں زیادہ تکلیف نہ ہو، خود مستران کریم نے فرمایا: لَا تَكِلْتُ إِلَهُهُ تَقْسَالًا وَلَا وَشَقًا (۲۸۹: ۲) یعنی اللہ تعالیٰ کسی انسان کو ایسا حکم نہیں دیتا جو اس کی قدرت اور وسعت میں نہ ہو۔ اسی رحمت و حکمت کا تقاضا تھا کہ اسلام نے شراب کے حرام کرنے میں بڑی تدریج سے کام لیا۔ شراب کی تدریجی مانعت اور حرمت کی قرآنی تاریخ کا خلاصہ یہ ہے کہ قرآن کریم میں شراب کے متعلق چار آیتیں نازل ہوئی ہیں، جن کا ذکر ادھر آچکا ہے، ان میں سے ایک آیت سورۃ بقرہ کی چوتھی تفسیر آپ اس وقت دیکھ رہے ہیں، اس میں تو شراب پیدا ہو جانے والے گناہوں اور مفاہ کا ذکر کر کے چھوڑ دیا گیا ہے، حرام نہیں کیا، گویا ایک مشورہ دیا کہ یہ پھوڑنے کی چیز ہے، مگر پھوڑنے کا حکم نہیں دیا۔

دوسری آیت سورۃ نساء کی لَا تَقْرَبُوا الصَّلَاةَ وَأَنتُمْ سُكَارَىٰ میں خاص اوقات نماز کے اندر شراب کو حرام کر دیا گیا، باقی اوقات میں اجازت رہی۔

تیسری اور چوتھی دو آیتیں سورۃ مائدہ کی ہیں، جو ادھر پر مذکور ہو چکی ہیں، ان میں صاف اور قطعی طور پر شراب کو حرام قرار دیا۔

شریعت اسلام نے شراب کے حرام کرنے میں اس تدریج سے اس لئے کام لیا کہ عمر بھر کی عادت خصوصاً نشہ کی عادت کو چھوڑ دینا انسانی طبیعت پر انتہائی شاق اور مگرانہ ہوتا، علماء نے فرمایا: نِظَامُ الْعَادَةِ آمَنٌ مِنْ فُطْرَمِ الْوَصْلَةِ عَيْنٍ جِيسَ بَحْجَ كَوَالٍ كَادِرٍ دَحْ طِينِ كِ عَادَتِ چھوڑ دینا بھاری معلوم ہوتا ہے انسان کو اپنی کسی عادت مستحضرہ کو بدلنا اس سے زیادہ شدید اور سخت ہے، اس لئے اسلام نے حکیمانہ اصول کے مطابق اول اس کی بڑائی ذہن نشین کرائی، پھر نمازوں کے اوقات میں منوع کیا، پھر ایک خاص مدت کے بعد قطعی طور پر حرام کر دیا گیا۔ ان جس طرح ابتدائے تحریم شراب میں آہستگی اور تدریج سے کام لینا حکمت کا تقاضا تھا اسی طرح حرام کر دینے کے بعد اس کی مانعت کے قانون کو بڑی شدت کے ساتھ نافذ کرنا بھی حکمت ہی کا تقاضا تھا، اسی لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے شراب کے بارے میں اول سخت و عید مذاب کی بتلائیں، ارشاد فرمایا کہ یہ اتم الخبائث اور اتم الفواحش ہے، اس کو پی کر آدمی تجھ سے گھٹے

گناہ کا مرکب ہو سکتا ہے۔

ایک حدیث میں ارشاد فرمایا کہ شراب اور ایمان جمع نہیں ہو سکتے، یہ دو ایسی نساتی ہیں، اور جامع ترمذی میں حضرت انسؓ کی روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے شراب کے بارے میں دس آدمیوں پر لعنت فرمائی، پھوڑنے والا، بنانے والا، پینے والا، پلانے والا، اس کو لاد کر لانے والا، اور جس کے لئے لائی جائے، اور اس کا بیچنے والا، خریدنے والا، اس کو بہہ کرنے والا، اس کی آمدنی کھانے والا، اور پھر صرف لربانی تعلیم و تبلیغ پر اکتفا نہیں فرمایا، بلکہ علی اور قانونی طور پر اعلان فرمایا کہ جس کے پاس کسی قسم کی شراب موجود ہو اس کو فلاں جگہ جمع کر دے۔ حتیٰ میں تعلیم حکم کا پیشال جہذا فرمانبردار صحابہ کرامؓ نے پہلا حکم پاتے ہی اپنے اپنے گھر نہیں جو شراب استعمال کیلئے رکھی تھی اُس کو تو اسی وقت پہاڑیا، حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا بیان ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے منادی نے مدینہ کی گھلیوں میں یہ آواز دی کہ شراب حرام کر دی گئی ہے تو جس کے ہاتھ میں جو برتن شراب کا تھا اس کو وہیں پھینک دیا، جس کے پاس کوئی سبویا خم شراب کا تھا اس کو گھر سے باہر لاکر توڑ دیا، حضرت انسؓ اُس وقت ایک مجلس میں دُرِ جام کے ساتی بنے ہوئے تھے، ابو طلحہ، ابو عبیدہ، بن جراح، ابی بن کعب، ہبیل، رضوان اللہ علیہم اجمعین جیسے جلیل القدر صحابہؓ موجود تھے، منادی کی آواز کان میں پڑتے ہی سب نے کہا کہ اب یہ شراب سب گرا دو، اس کے جام و سب توڑ دو، بعض روایات میں ہے کہ اعلان حرمت کے وقت جس کے ہاتھ میں جام شراب ہوں تک پہنچا ہوا تھا اُس لے وہیں سے اس کو پھینک دیا، مدینہ میں اُس روز شراب اس طرح بہہ رہی تھی جیسے بارش کی زد کا پانی، اور مدینہ کی گھلیوں میں عرصہ ملازمت یہ حالت رہی کہ جب بارش ہوتی تو شراب کی بواور رنگ مٹی میں بکھر آتا تھا۔

جس وقت اُن کو یہ حکم ملا کہ جس کے پاس کسی قسم کی شراب، ہر وہ فلاں جگہ جمع کر دے، اس وقت صرف وہ ذخیرے کچھ رہ گئے تھے جو مال تجارت کی حیثیت سے بازار میں تھے، اُن کو فرما سب دار صحابہ کرامؓ نے بلا تا مل معسرہ جگہ پر جمع فرما دیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بنفس نفیس تشریف لے گئے، اور اپنے ہاتھ سے شراب کے بہت سے مشکیزوں کو چاک کر دیا اور بانی دوسرے صحابہ کرامؓ کے حوالے کر کے چاک کرا دیا، ایک صحابی جو شراب کی تجارت کرتے تھے اور ملک مشم سے شراب درآمد کیا کرتے تھے اتفاقاً اس زمانے میں ابھی ساری رقم جمع کر کے ملک شام سے شراب لینے کے لئے گئے ہوئے تھے، اور جب یہ تجارتی مال لے کر واپس ہوئے تو مدینہ میں داخل ہونے سے پہلے ہی اُن کو اعلان حرمت کی خبر مل گئی، جاں نثار صحابیؓ نے اپنے پورے سرمائے اور محنت کی مصلحت کو جس سے بڑے نفع کی امیدیں لئے ہوئے آ رہے تھے اعلان حرمت

سن کر اسی جگہ ایک پہاڑی پر ڈال دیا، اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر اور سوال کیا کہ اب میرے اس مال کے متعلق کیا حکم ہے، اور مجھ کو کیا کرنا چاہئے؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمانِ خداوندی کے مطابق حکم دیدیا کہ سب مشکیزوں کو چاک کر کے شراب بہا دو، فرمانبردار محبتِ خدا و رسولؐ نے بلا کسی جھجک کے اپنے ہاتھ سے اپنا پورا سرمایہ زمین پر بہا دیا، یہ بھی اسلام کا ایک معجزہ اور صحابہ کرامؓ کی حیرت انگیز دے مثال اطاعت ہے جو اس واقعہ میں ظاہر ہوئی، کہ جن چیزوں کی عادت ہو جائے سب چھوڑ دیتے ہیں کہ چھوڑنا سخت دشوار ہے اور یہ حضرات بھی اس کے ایسے عادی تھے کہ تھوڑی دیر اس سے صبر کرنا دشوار تھا، ایک حکم الہی اور فرمانِ نبویؐ نے ان کی عادات میں ایسا عظیم الشان انقلاب برپا کر دیا کہ اب یہ شراب اور مچھ سے ایسے ہی متنفر ہیں، جیسے اس سے پہلے ان کے عادی تھے۔

اسلامی سیاست اور عام
ملکی سیاستوں کا فرق عظیم

مذکورہ آیات پھر واقعات میں حرمتِ شراب کے حکم پر مسلمانوں کے عمل کا ایک نمونہ سامنے آ گیا ہے، جس کو اسلام کا معجزہ کہو یا پیغمبرانہ تربیت کا بے مثال اثر یا اسلامی سیاست کا لازمی نتیجہ کہ نشر کی عادت جس کے چھوڑنے کا انتہائی دشوار ہونا ہر شخص کو معلوم ہے، اور عرب میں اس کا رواج اس حد تک پہنچا ہوا تھا کہ چند گھنٹے اس کے بغیر صبر نہیں کر سکتے تھے، وہ کیا چیز تھی جس نے ایک ہی اعلان کی آواز کان میں پڑتے ہی ان سب کے مزاجوں کو بدل ڈالا، ان کی عادتوں میں وہ انقلاب پیدا کر دیا کہ اب چند منٹ پہلے جو چیز انتہائی مرغوب بلکہ زندگی کا سرمایہ تھی وہ چند منٹ کے بعد انتہائی مبغض اور نفیساں بنا پاک ہو گئی۔

اس کے بالمقابل آج کی ترقی یافتہ سیاست کی ایک مثال کو سامنے رکھ لیجئے کہ اب چند سال پہلے امریکہ کے ماہرینِ صحت اور سماجی مصلحین نے جب شراب نوشی کی بے شمار اور انتہائی مہلک خرابیوں کو محسوس کر کے ملک میں شراب نوشی کو قانوناً ممنوع کرنا چاہا تو اس کے لئے اپنے نشر و اشاعت کے وہ نئے سے نئے ذرائع جو اس ترقی یافتہ سیاست کا بڑا کمال سمجھے جاتے ہیں سب ہی شراب نوشی کے خلاف ذہن ہموار کرنے پر لگادیتے، سینکڑوں اخبارات اور رسائل اس کی خرابیوں پر مشتمل ملک میں لاکھوں کی تعداد میں شائع کئے گئے، پھر امریکی دستوں میں ترمیم کر کے امتناعِ شراب کا قانون نافذ کیا گیا، مگر ان سب کا اثر جو کچھ امریکہ میں آنکھوں نے دیکھا، اور وہاں کے اربابِ سیاست کی رپورٹوں سے دنیا کے سامنے آیا وہ یہ تھا کہ اس ترقی یافتہ اور تعلیم یافتہ قوم نے اس ممانعتِ قانونی کے زمانے میں عام زمانوں کی نسبت بہت زیادہ شراب استعمال کی، یہاں تک کہ مجبور ہو کر حکومت کو اپنا قانون منسوخ کرنا پڑا۔

عرب مسلمانوں اور وہ جو ترقی یافتہ امریکہ کے حالات و معاملات کا یہ عظیم منسحق تو ایک حقیقت اور واقعہ ہے جس کا کسی کو انکار کرنے کی گنجائش نہیں، یہاں غور کرنے کی بات یہ ہو کہ اس عظیم الشان فرق کا اصلی سبب اور راز کیا ہے۔

ذرا سا غور کریں تو معلوم ہو جائے گا کہ شریعتِ اسلام نے صرف قانون کو قوم کی اصلاح کے لئے کبھی کافی نہیں سمجھا، بلکہ قانون سے پہلے ان کی ذہنی تربیت کی اور عبادت و زہادت اور فکرِ آخرت کے کیمیاوی نسخے سے ان کے مزاجوں میں ایک بڑا انقلاب لا کر ایسے افراد پیدا کر دیئے جو رسولؐ کی آواز پر اپنی جان و مال آبر و سب کچھ قربان کرنے کے لئے تیار ہو جائیں سکی زندگی کے پورے دور میں یہی انفراد سازی کا کام رہا حضرات کے ذریعے ہوتا رہا، جب جان نثاروں کی جماعت تیار ہو گئی اس وقت قانون جاری کیا گیا، ذہنوں کو ہموار کرنے کے لئے تو امریکہ نے بھی اپنے بے مثال ذرائع استعمال کرنے میں کوئی کوتاہی نہیں کی، ان کے سامنے سب کچھ تھا مگر فکرِ آخرت نہیں تھی، اور مسلمانوں کے رنگ بپے میں فکرِ آخرت سمائی ہوئی تھی۔ کاش! آج بھی ہمارے عقلاء اس نسخہ کیمیا کو استعمال کر کے دیکھیں تو دنیا کو امن و سکون نصیب ہو جائے۔

شراب کے مفاسد اور فوائد میں موازنہ

اس آیت میں شراب اور قمار دونوں کے متعلق قرآن کریم نے یہ بتلایا ہے کہ ان دونوں میں کچھ مفاسد بھی ہیں اور کچھ فوائد بھی، مگر اس کے مفاسد فوائد سے بڑھے ہوئے ہیں، اس لئے ضرورت ہے کہ اس پر نظر ڈالی جائے کہ ان کے فوائد کیا ہیں اور مفاسد کیا، اور پھر یہ کہ فوائد سے زیادہ مفاسد ہونے کے کیا وجوہ ہیں، آخر میں چند فقہی ضابطے بیان کئے جائیں گے، جو اس آیت سے مستفاد ہوتے ہیں پہلے شراب کر لے لیجئے، اس کے فوائد تو عام لوگوں میں مشہور و معروف ہیں کہ اس سے لذت و فرحت حاصل ہوتی ہے، اور وقتی طور پر قوت میں اضافہ ہو جاتا ہے، رنگ صاف ہو جاتا ہے، مگر ان حقیر وقتی فوائد کے مقابلے میں اس کے مفاسد اتنے کثیر و وسیع اور گہرے ہیں کہ شاید کسی دوسری چیز میں اتنے مفاسد اور مضرات نہ ہوں گے، بدنِ انسانی پر شراب کے مضرات یہ ہیں کہ وہ رفتہ رفتہ معدے کے فعل کو فاسد کر دیتی ہے، کھانے کی خواہش کم کر دیتی ہے، چہرے کی ہیئت بگاڑ دیتی ہے، پیٹ بڑھ جاتا ہے، مجموعی حیثیت سے تمام قوی پر یہ اثر ہوتا ہے جو ایک جرمن ڈاکٹر نے بیان کیا ہے کہ جو شخص شراب کا عادی ہو چالیس سال کی عمر میں اس کے بدن کی ساخت ایسی ہو جاتی ہے، جیسے ساٹھ سالہ بوڑھے کی وہ جوانی اور قوت کے اعتبار سے ٹھیک سے ہوئے بوڑھوں کی طرح ہو جاتا ہے، اس کے علاوہ

شراب بگرا اور گردوں کو خراب کر دیتی ہے، بیل کی پیاری شراب کا خاص اثر ہے، یورپ کے شہروں میں بیل کی کثرت کا بڑا سبب شراب ہی کو بتلایا جاتا ہے، وہاں کے بعض ڈاکٹروں کا قول ہے کہ یورپ میں آدمی اموات مرض بیل میں ہوتی ہیں اور آدمی دوسرے امراض میں، اور اس بیماری کی کثرت یورپ میں اسی وقت سے ہوئی جبکہ وہاں شراب کی کثرت ہوئی۔

یہ تو شراب کی جسمانی اور بدنی مضرتیں ہیں، اب عقل پر اس کی مضرت کو تو ہر شخص جانتا ہے، مگر صرف اتنا ہی جانتے ہیں کہ شراب پی کر جب تک نشہ رہتا ہے اُس وقت تک عقل کام نہیں کرتی، لیکن اہل تجربہ اور ڈاکٹروں کی تحقیق یہ ہے کہ نشہ کی عادت خود وقت مافکہ کو بھی ضیعت کر دیتی ہے، جس کا اثر ہوش میں آنے کے بعد بھی رہتا ہے، بعض اوقات جنون تک اس کی فوبت پہنچ جاتی ہے، اہلباء اور ڈاکٹروں کا اتفاق ہے کہ شراب نہ جزو بدن بنتی ہے اور نہ اس کا خون بنتا ہے، جس کی وجہ سے بدن میں طاقت آئے بلکہ اس کا فعل صرف یہ ہوتا ہے کہ خون میں بھجوان پیدا کر دیتی ہے جس سے وقتی طور پر قوت کی زیادتی محسوس ہونے لگتی ہے، اور یہی خون کا دفعہ ہیجان بعض اوقات اچانک موت کا سبب بھی بن جاتا ہے، جس کو ڈاکٹر ہارٹ نیل ہونے سے تعبیر کرتے ہیں۔

شراب کے شرابیں یعنی وہ رنگیں جن کے ذریعے سانس بدن میں روح پہنچتی ہے سخت ہو جاتی ہیں جس سے بڑھا پا جلدی آ جاتا ہے، شراب کا اثر انسان کے حلقوم اور نفیس پر بھی خراب ہوتا ہے، جس کی وجہ سے آواز بھاری ہو جاتی ہے، اور کھانسی دائمی ہو جاتی ہے، اور وہی آخر کار رسل تک فوبت پہنچا دیتی ہے، شراب کا اثر نسل پر بھی برا پڑتا ہے، شرابی کی اولاد کمزور رہتی ہے، اور بعض اوقات اس کا نتیجہ قطع نسل تک پہنچتا ہے۔

یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ شراب پینے کی ابتدائی حالت میں بظاہر انسان اپنے جسم میں ہستی و چالاکی اور قوت محسوس کرتا ہے، اسی لئے بعض لوگ جو اس میں مبتلا ہوتے ہیں ان میں حقانیت کا انکار کرتے ہیں، لیکن انھیں معلوم ہونا چاہیے کہ شراب کا یہ زہر ایسا زہر ہے جس کا اثر نہ بھی طویل نظر ہو تا شروع ہوتا ہے، اور کچھ عرصہ کے بعد یہ سب مضرتیں مشاہدہ میں آ جاتی ہیں جن کا ذکر کیا گیا ہے۔

شراب کا ایک بڑا مفسدہ تمدنی ہے کہ وہ اکثر لڑائی جھگڑے کا سبب بنتی ہے، اور پھر یہ بغض و عداوت و در تک انسان کو نقصان پہنچاتی ہیں، شریعت اسلام کی نظر میں یہ مفسدہ سب سے بڑا ہے، اس لئے قرآن نے سورۃ مائدہ میں نص صریح کے ساتھ اس مفسدہ کا ذکر فرمایا: **يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْمُونَةُ وَابْعُثَاءُ فِي الْخَمْرِ وَالْمَيْمُونَةِ** (۹۱: ۵)

”یعنی شیطان چاہتا ہے کہ شراب اور جڑے کے ذریعے تمھارے آپس میں بغض و عداوت پیدا کر دے“ شراب کا ایک مفسدہ یہ بھی ہے کہ مدہوشی کے عالم میں بعض اوقات آدمی اپنا پوشیدہ راز بیان کر دیتا ہے جس کی مضرت اکثر بڑی تباہ کن ہوتی ہے، خصوصاً وہ اگر کسی حکومت کا ذمہ دار آدمی ہے اور راز بھی حکومت کا راز ہے، جس کے اظہار سے پورے ملک میں انقلاب آ سکتا ہو اور ملکی سیاست اور جنگی مصالح سب برباد ہو جاتے ہیں، ہوشیار جاسوس ایسے مواقع کے منتظر رہتے ہیں۔

شراب کا ایک مفسدہ یہ بھی ہے کہ وہ انسان کو ایک کھلونا بنا دیتی ہے، جس کو دیکھ کر بچے بھی ہنستے ہیں، کیونکہ اس کا کلام اور اس کی حرکات سب غیر متوازن ہو جاتی ہیں، شراب کا ایک عظیم تر مفسدہ یہ ہے کہ وہ ام الخبائث ہے، انسان کو تمام بُرے سے بُرے جرائم پر آمادہ کر دیتی ہے، زنا اور قتل اکثر اس کے نتائج ہوتے ہیں، اور یہی وجہ ہے کہ عام شراب خانے زنا اور قتل کے اڈے ہوتے ہیں، یہ شراب کی جسمانی مضرتیں ہیں، اور اس کی روحانی مضرت کو ظاہر ہی ہے، کہ نشہ کی حالت میں نہ نماز ہو سکتی ہے نہ اللہ کا ذکر نہ اور کوئی عبادت، اسی لئے قرآن کریم میں شراب کی مضرت کے بیان میں فرمایا: **وَيُضِلُّكُمْ كَثِيرًا ذِكْرَ اللَّهِ وَعَنِ الصَّلَاةِ** (۹۱: ۵) یعنی شراب تم کو ذکر اللہ اور نماز سے روکتی ہے۔

اب مالی مضرت اور نقصان کا حال سنئے جس کو ہر شخص جانتا ہے، کسی بستی میں اگر ایک شراب خانہ کھل جاتا ہے تو وہ پوری بستی کی دولت کو سمیٹ لیتا ہے، اس کی قیاسی بے شمار ہیں، اور بعض اقسام تو بے حد گراں ہیں، بعض اعداد و شمار لکھنے والوں نے صرف ایک شہر میں شراب کا مجموعی خرچ پوری مملکت فرانس کے مجموعی خرچ کے برابر بتلایا ہے۔

یہ شراب کے دینی، دنیوی جسمانی اور روحانی مفاسد کی مختصر فہرست ہے جس کے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک کلمہ میں ارشاد فرمایا ہے کہ وہ ام الخبائث ”یا ام الفواحش“ ہے، جرمنی کے ایک ڈاکٹر کا یہ قول ضرب المثل کی طرح مشہور ہے کہ اس نے کہا کہ اگر آرمے شراب خانے بند کر دیے جاتیں تو میں اس کی ضمانت لیتا ہوں کہ آرمے شفا خانے اور آدھو جیل خانے بے ضرورت ہو کر بند ہو جائیں گے۔ (تفسیر المنار لمفتی عبیدہ، ص ۲۲۶ ج ۲)

علامہ طنطاوی نے اپنی کتاب التاجاہری میں اس سلسلے کی چند اہم معلومات لکھی ہیں، ان میں سے بعض یہاں نقل کی جاتی ہیں۔

ایک فرانسیسی محقق ہنری اپنی کتاب مؤخرات و سوانح فی الاسلام میں لکھتے ہیں: ”بہت زیادہ ہلک ہتھیار جس سے اہل مشرق کی بچ کنی کی گئی اور وہ دھماکا

تو اگر جس سے مسلمانوں کو قتل کیا گیا۔ یہ شراب تھی۔ ہم نے الہود اثر کے لوگوں کے خلاف یہ ہتھیار آزمایا، لیکن ان کی اسلامی شریعت ہمارے راستہ میں رکاوٹ بن کر کھڑی ہو گئی، اور وہ ہمارے اس ہتھیار سے متاثر نہیں ہوتے اور نتیجہ یہ نکلا کہ ان کی نسل بڑھتی ہی چلی گئی، یہ لوگ اگر ہمارے اس تحفہ کو قبول کر لیتے جس طرح کہ ان کے ایک منافق قبیلے نے اس کو قبول کر لیا ہے تو یہ بھی ہمارے سامنے ذلیل و خوار ہو جاتے، آج جن لوگوں کے گھروں میں ہماری شراب کے ذرہ چل رہے ہیں وہ ہمارے سامنے اتنے حقیر و ذلیل ہو گئے ہیں کہ سر نہیں اٹھا سکتے۔ ایک انگریز قانون دان بتام لکھتے ہیں کہ :

”اسلامی شریعت کی بے شمار خوبیوں میں سے ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اس میں شراب حرام ہے، ہم نے دیکھا کہ جب افریقہ کے لوگوں نے اسے استعمال کرنا شروع کیا تو ان کی نسلوں میں پاگل پن سراپت کرنے لگا، اور یورپ کے جن لوگوں کو اس کا چمک لگ گیا ان کی بھی عقلوں میں تغیر آنے لگا، لہذا افریقہ کے لوگوں کے لئے بھی اس کی ممانعت ہونی چاہئے، اور یورپین لوگوں کو بھی اس پر شدید سزائیں دینی چاہئیں۔“

غرض جس بجلے مانس نے بھی ٹھنڈے دل سے غور کیا وہ بے اختیار بکا ر اٹھا کہ یہ جس ہے، شیطانی عمل ہے، زہر ہے، تباہی اور بربادی کا ذریعہ ہے، اس آئم الخبائث سے باز آ جاؤ،

فَقُلْ إِنَّمَا نَنْهَى عَنْتُم مِّنْهُ هَؤُلَاءِ (۱۱:۵)

شراب کی حرمت و ممانعت کے متعلق مسترآن کریم کی چار آیتوں کا بیان اور پر آچکا ہے سورہ نمل میں ایک جگہ اور بھی نشہ کی چیزوں کا ذکر ایک دوسرے انداز سے آیا ہے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کو بھی یہاں ذکر کر دیا جائے، تاکہ شراب و نشہ کے متعلق تمام قرآنی ارشادات مجموعی طور پر سامنے آجائیں، وہ آیت یہ ہے :

وَمِنْ شَرِّهِمُ الْخَيْلُ وَالْأَنْعَابُ مَخْخُونُونَ	اور کھجور اور انگور کے پھلوں سے ہم لوگ نشہ کی چیز اور عمدہ کھانے کی چیزیں بناتے ہو، بے شک میں میں ان لوگوں کے لئے بڑی ذلیل جو جو قتل رکھتے ہیں۔
وَالْأَنْعَابُ مَخْخُونُونَ	
مَنْكَرٌ أَوْ رِقَابٌ	
وَالَّذِينَ لَا يَدْرُونَ مَقَالِمَهُمْ	

پہلے آیتوں میں حق تعالیٰ کی اُن نعمتوں کا ذکر تھا جو انسانی غذا میں پیدا کرنے میں عجیب و غریب صنعت و قدرت کا مظہر ہیں، اس میں

پہلے ذرہ کا ذکر کیا جس کو قدرت نے حیران کے پیٹ میں غن اور فضلہ کی آلائشوں سے الگ کر کے صاف ستھری غذا انسان کے لئے عطا کر دی، جس میں انسان کو کسی مزید صنعت کی ضرورت نہیں، اسی لئے یہاں لفظ نسقیکم استعمال فرمایا کہ ہم نے ذرہ پلایا، اس کے بعد سنسرایا کہ کھجور اور انگور کے کچھ پھلوں میں سے بھی انسان اپنی غذا اور نفع کی چیزیں بناتا ہے، اس میں اشارہ اس طرف ہے کہ کھجور اور انگور کے پھلوں میں سے اپنی غذا اور صنعت کی چیزیں بنانے میں انسانی صنعت کا کچھ دخل ہے، اور اسی دخل کے نتیجہ میں وہ طرح کی چیزیں بناتی ہیں، ایک نشہ آور چیز جس کو غرلہ شراب کہا جاتا ہے، دوسری رزق حسن یعنی عمدہ رزق کہ کھجور اور انگور کو تر و تازہ کھانے میں استعمال کریں یا خشک کر کے ذخیرہ کر لیں، مقصد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کا ملہ سے کھجور اور انگور کے پھل انسان کو دیدیئے، اور ان سے اپنی غذا وغیرہ بنانے کا اختیار بھی دیدیا، اب یہ اس کا انتخاب ہے کہ اس سے کیا بنائے، نشہ آور چیز بنا کر عقل کو خراب کرے یا غذا بنا کر قوت حاصل کرے۔

اس تفسیر کے مطابق اس آیت سے نشہ آور شراب کے حلال ہونے پر کوئی استدلال نہیں ہو سکتا، کیونکہ یہاں مقصود قدرت کے عطیات اور ان کے استعمال کی مختلف صورتوں کا بیان ہے، جو ہر حال میں نعمت خداوندی ہے، جیسے تمام غذائیں اور انسانی منفعت کی چیزیں کہ ان کو بہت سے لوگ ناجائز طریقوں پر بھی استعمال کرتے ہیں، مگر کسی کے غلط استعمال سے اصل نعمت لغت ہونے سے نہیں بچل جاتی، اس لئے یہاں یہ تفصیل بتلانے کی ضرورت نہیں کہ ان میں کونسا استعمال حلال ہے کونسا حرام ہے، تاہم ایک لطیف اشارہ اس میں بھی اس طرف کر دیا کہ ”سکر“ کے مقابل ”رزق حسن“ رکھا جس سے معلوم ہوا کہ سکر اچھا رزق نہیں، سکر کے معنی جہور و فسترقین کے نزدیک نشہ آور چیز کے ہیں، رزق المعانی، قرطبی (جصاص)

یہ آیات اتفاق امت مکتی ہیں، اور شراب کی حرمت اس کے بعد مدینہ طیبہ میں نازل ہوئی، نزل آیات کے وقت اگرچہ شراب حلال تھی اور مسلمان مام طور پر پیتے تھے، مگر اس وقت بھی اس آیت میں اشارہ اس طرف کر دیا گیا کہ اس کا پینا اچھا نہیں، بعد میں صراحت شراب کو شدت کے ساتھ حرام کرنے کے لئے قرآنی احکام نازل ہو گئے (دہا ملخص مانی الجصاص والقرطبی)

۱۵ بعد مام نے اس کے معنی سکر یا بے نشہ بنیڈ کے ہیں (جصاص، قرطبی)، مگر اس جگہ اس اختلاف کے نقل کرنے کی ضرورت نہیں ۱۲ منہ

حرمت قمار (جوا)

میسر مصدر ہے، اور اصل لغت میں اس کے معنی تقسیم کرنے کے ہیں، یا سر تقسیم کرنا کہ جس کو کہا جاتا ہے، جاہلیت عرب میں مختلف قسم کے جوئے رائج تھے جن میں ایک قسم یہ بھی تھی کہ اونٹ ذبح کر کے اس کے حصے تقسیم کرنے میں جو اکھیلا جاتا تھا، بعض کو ایک یا زیادہ حصے ملتے بعض محروم رہتے تھے، محروم رہنے والے کو پوتے اونٹ کی قیمت ادا کرنا پڑتی تھی، گوشت سب فقرائیں تقسیم کیا جاتا خود استعمال نہ کرتے تھے۔

اس خاص جوئے میں چونکہ فقر کا فائدہ اور جو اکھیلنے والوں کی فداوت بھی تھی، اسی لئے اس کھیل کو باعٹ فخر سمجھتے تھے، جو اس میں شریک نہ ہوتا اس کو کجوس اور مخوس کہتے تھے۔

تقسیم کی مناسبت سے قمار کو میسر کہا جاتا ہے، تمام صحابہؓ و تابعینؓ اس پر متفق ہیں کہ میسر میں قمار یعنی جوئے کی تمام صورتیں داخل اور سب حرام ہیں، ابن کثیرؒ نے اپنی تفسیر میں اور جصاصؒ نے احکام المسترآن میں نقل کیا ہے کہ مفسر القرآن حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور ابن عمرؓ اور قتادہؓ اور معاذ بن صالحؓ اور عطاءؓ اور طاؤسؓ نے فرمایا:

المیسر القمار حتی لعب الصنادیان بالکعب والجویر، یعنی ہر قسم کا قمار میسر ہے، یہاں تک کہ بچوں کا کھیل لکڑی کے ٹکڑوں اور اخروٹ وغیرہ کے ساتھ۔

اور ابن عباسؓ نے فرمایا المکھاطرة من الکھتارۃ یعنی مخاطرہ قمار میں سے ہے۔ (رجحان)

ابن سیرینؒ نے فرمایا جس کام میں مخاطرہ ہو وہ میسر میں داخل ہے۔ (روح البیان)

مخاطرہ کے معنی ہیں کہ ایسا معاملہ کیا جائے جو نفع و ضرر کے درمیان دائر ہو، یعنی یہ بھی احتمال ہو کہ بہت سا مال مل جائے اور یہ بھی کہ کچھ نہ ملے، جیسے آجکل کی لاشری کے مختلف طریقوں میں پایا جاتا ہے، یہ سب قسمیں قمار اور میسر میں داخل اور حرام ہیں، اس لئے میسر یا قمار کی تعریف یہ ہے کہ جس معاملہ میں کسی مال کا مالک بنانے کو ایسی شرط پر موقوف رکھا جائے جس کے وجود و عدم کی دونوں جانبیں مساوی ہوں، اور اسی بناء پر نفع خالص یا تادان خالص برداشت کرنے کی دونوں جانبیں بھی برابر ہوں دشامی، ص ۲۵۵ جلد ۲ کتاب الخطر والاباحۃ، مثلاً یہ بھی احتمال ہے کہ زید ہر تادان پڑ جائے، اور یہ بھی ہے کہ عمر پڑ جائے، اس کی جتنی قسمیں اور صورتیں پہلے زمانے میں رائج تھیں یا آج رائج ہیں یا آئندہ پیدا ہوں، سب میسر اور قمار اور مجاہد اہل سنت نے اس کا حل کرنے کا چلتا ہوا کاروبار اور تجارتی لاشری کی عام صورتیں سب اس میں داخل ہیں، ہاں اگر صرف ایک جانب العام مقرر کیا جائے

کہ جو شخص فلاں کام کرے گا اس کو یہ انعام ملے گا، اس میں مضائقہ نہیں، بشرطیکہ اس شخص سے کوئی فیس وصول نہ کی جائے، کیونکہ اس میں معاملہ نفع و ضرر کے درمیان دائر نہیں، بلکہ نفع اور عدم نفع کے درمیان دائر ہے۔

اسی لئے احادیث صحیحہ میں شرط نفع اور جو سر وغیرہ کو حرام قرار دیا گیا ہے، جن میں مسال کی حاجت پائی جاتی ہے، تاش پر اگر روپیہ کی حاجت ہو تو وہ بھی میسر میں داخل ہے۔

صحیح مسلم میں بروایت بریدہؓ مذکور ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص نزد شیر (چوسر) کھیلتا ہے وہ گویا خنزیر کے گوشت اور خون میں اپنے ہاتھ رنگتا ہے، اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا کہ شرط نفع میسر یعنی جوئے میں داخل ہے، اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے فرمایا شرط نفع تو نزد شیر سے بھی زیادہ بڑی ہے (تفسیر ابن کثیر)

ابتداء اسلام میں شراب کی طرح قمار بھی حلال تھا، مگر جب سورۃ روم کی آیات غُلِبَتِ الذِّمَّةُ نَازِل ہوئی، اور مسترآن نے خبر دی کہ اس وقت روم اگرچہ اپنے حرعین کسری سے مغلوب ہو گئے، لیکن چند سال بعد پھر رومی غالب آجائیں گے اور مشرکین مکہ نے اس کا انکار کیا تو حضرت ابوبکر صدیقؓ نے ان سے اسی طرح قمار کی شرط پھرائی، کہ اگر اتنے سال میں رومی غلب آئے تو اتنا مال تمہیں دینا پڑے گا، یہ شرط مان لی گئی، اور واقعہ قرآن کی خبر کے مطابق پیش آیا، تو ابوبکرؓ نے یہ مال وصول کیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لائے، آپؐ نے اس واقعہ پر اظہار مسرت فرمایا مگر مال کو صدقہ کرنے کا حکم دیدیا۔

کیونکہ جو چیز آئندہ حرام ہونے والی تھی اللہ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو حلال ہونے کے زمانے میں بھی اس سے محفوظ فرما دیا تھا، اسی لئے شراب اور متعارف سے ہمیشہ آپؐ نے حبت ناب کیا، اور خاص خاص صحابہؓ کرام بھی ان چیزوں سے ہمیشہ محفوظ رہے۔

ایک روایت میں ہے کہ جبریل امینؑ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر دی کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک جعفر طیار کی چار خصلتیں زیادہ محبوب ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جعفرؓ سے پوچھا کہ آپ میں وہ چار خصلتیں کیا ہیں، عرض کیا کہ میں نے اس کا اظہار اب تک کسی سے نہیں کیا تھا، مگر جب کہ آپؐ کو اللہ تعالیٰ نے خبر دی تو عرض کرتا ہوں کہ وہ چار خصلتیں یہ ہیں کہ میں نے دیکھا کہ شراب عقل کو زائل کر دیتی ہے اس لئے میں کسی اس کے پاس نہیں گیا، اور میں نے یہوں کو دیکھا کہ ان کے ہاتھ میں کسی کا نفع و ضرر نہیں، اس لئے جاہلیت میں بھی کسی بت پرستی نہیں کی، اور مجھے چونکہ اپنی بیوی اور لڑکیوں کے معاملہ میں سخت غیرت ہے اس لئے میں نے کسی زانیہ نہیں کیا، اور میں نے دیکھا کہ بھوٹ بولنا دناہیت اور زوالت کی بات ہر

اس لئے کہیں جہالت میں بھی بھٹ کر نہیں بولا درود (السببان)

قمار کے سامنے اور اجتماعی نقصاناً قمار میں جوئے کے متعلق بھی قرآن کریم نے ہی ارشاد فرمایا جو شراب کے متعلق آیا ہے، کہ اس میں کچھ منافع بھی ہیں مگر نفع سے اس کا نقصان و ضرر بڑھا ہوا ہے، اس کے منافع کو تو ہر شخص جانتا ہے، کہ جیت جاتے تو بیٹھے بیٹھے ایک فقیر بد حال آدمی ایک ہی دن میں مالدار و سرمایہ دار بن سکتا ہے، مگر اس کی معاشی، اجتماعی، سماجی اور روحانی خرابیاں اور مفاسد بہت کم لوگ جانتے ہیں، اس کا اجمالی بیان یہ ہے کہ جوئے کا کھیل سارا اس پر دائر ہے کہ ایک شخص کا نفع دوسرے کے ضرر پر موقوف ہے، جیتنے والے کا نفع ہی نفع ہارنے والے کے نقصان ہی نقصان کا نتیجہ ہوتا ہے، کیونکہ اس کا رد بارے کوئی دولت بڑھتی نہیں وہ اسی طرح منہدم حالت میں رہتی ہے، اس کھیل کے ذریعے ایک کی دولت سلب ہو کر دوسرے کے پاس پہنچ جاتی ہے، اس لئے قمار مجموعی حیثیت سے قوم کی تباہی اور انسانی افغان کی موت ہے، کہ جس انسان کو نفع رسائی خلق اور ایثار و ہمدردی کا پیکر ہونا چاہئے، وہ ایک خوشخوار و درندہ کی خاصیت اختیار کر لے کر دوسرے بھائی کی موت میں اپنی زندگی، اس کی مصیبت میں اپنی راحت اس کے نقصان میں اپنا نفع سمجھنے لگے، اور اپنی پوری قابلیت اس خود غرضی پر صرف کرے، بخلاف تجارت اور بیع و شراء کی جہانز صورتوں کے، ان میں طرفین کا فائدہ ہوتا ہے، اور بذریعہ تجارت اموال کے تبادلہ سے دولت بگھٹی ہے، اور خریدنے والا اور بیچنے والا دونوں اس کا فائدہ محسوس کرتے ہیں۔

ایک بھاری نقصان جوئے میں یہ ہے کہ اس کا عادی اصل کمائی اور کسب کا مادہ محروم ہو جاتا ہے، کیونکہ اس کی خواہش یہی رہتی ہے کہ بیٹھے بٹھائے ایک شرط لگا کر دوسرے کا مال چند منٹ میں حاصل کرے، جس میں نہ کوئی محنت ہے نہ مشقت، بعض حضرات نے جوئے کا نام میسر رکھنے کی یہ وجہ بیان کی ہو کہ اس کے ذریعہ آسانی سے دوسرے کا مال اپنا بن جاتا ہے، جوئے کا معاملہ اگر در چار آدمیوں کے درمیان دائر ہو تو اس میں بھی مذکورہ مضرتیں بالکل نمایاں نظر آتی ہیں، لیکن اس نئے دور میں جس کو بعض سطحی نظر والے انسان عاقبت نا اندیشی سے ترقی کا دور کہتے ہیں، جیسے شراب کی نئی نئی قسمیں اور نئے نئے نام رکھ لئے گئے، سود کی نئی نئی قسمیں اور نئے نئے اجتماعی طریقے بکنگ کے نام سے ایجاد کر لئے گئے ہیں، اسی طرح قمار اور جوئے کی بھی ہزاروں قسمیں چل گئیں جن میں بہت سی قسمیں ایسی اجتماعی ہیں کہ قوم کا تقوڑا تقوڑا رہ رہ کر تباہ ہو جاتا ہے، اور جو نقصان ہوتا ہو وہ ان سب پر تقسیم ہو کر نمایاں نہیں رہتا، اور جس کو یہ رقم ملتی ہے اس کا فائدہ نمایاں ہوتا ہے، اس لئے بہت سے لوگ اس کے شخصی نفع کو دیکھتے ہیں، لیکن قوم کے اجتماعی نقصان پر دھیان نہیں دیتے، اس لئے ان کا خیال ان نئی قسموں کے جواز کی طرف چلا جاتا ہے، حالانکہ

اس میں وہ سب مضرتیں موجود ہیں جو در چار آدمیوں کے جوئے میں پائی جاتی ہیں، اور ایک حیثیت سے اس کا ضرر اس قدیم قسم کے قمار سے بہت زیادہ اور اس کے خراب اثرات دور رس اور پوری قوم کی بربادی کا سامان ہیں، کیونکہ اس کا لازمی اثر یہ ہوگا کہ ملت کے مام افراد کی دولت گھٹتی جائیگی اور چند سرمایہ داروں کے سرمایہ میں مزید اضافہ ہوتا رہے گا، اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ پوری قوم کی دولت سمٹ کر محدود افراد اور محدود خاندانوں میں مرکوز ہو جائے گی، جس کا مشاہدہ سٹڈ بازار اور قمار کی دوسری قسموں میں روزمرہ ہوتا رہتا ہے، اور اسلامی معاشیات کا اہم اصول یہ ہے کہ ہر ایسے معاملے کو حرام قرار دیا جس کے ذریعے دولت پوری ملت سے سمٹ کر چند سرمایہ داروں کے حوالے ہو سکے، قرآن کریم نے اس کا اعلان خود تقسیم دولت کا اصول بیان کرتے ہوئے اس طرح فرمادیا ہے، اِنِّیْ لَا یُکُوْنُ ذُوْ لِقَابٍ اِلَّا غَنٰیًا وَیُنْکَذَرُ (۵۹: ۵۹) یعنی مال نے کی تقسیم مختلف طبقوں میں کرنے کا جو اصول قرآن نے مقرر کیا ہے اس کا منشاء یہ ہے کہ دولت سمٹ کر صرف سرمایہ داروں میں جمع نہ ہو جائے۔

قمار میں جوئے کی خرابی یہ بھی ہے کہ شراب کی طرح قمار بھی آپس میں لڑائی جھگڑے اور فتنہ و فساد کا سبب ہوتا ہے، ہارنے والے کو طبعی طور پر جیت جانے والے سے نفرت اور عداوت پیدا ہوتی ہے، اور یہ تمدن و معاشرت کے لئے سخت ہملک چیز ہے، اسی لئے قرآن حکیم نے خاص طور پر اس مفسدہ کو ذکر فرمایا ہے،

اِنَّمَا یُرِیْدُ الشَّیْطٰنُ اَنْ یَّوْضِعَ
بَیْنَکُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَا فِی
الْاَمْرِ دَیْنِیْمِ وَیَصُدَّ کُمْ
عَنْ ذِکْرِ اللّٰهِ وَتَعِیْنِ الصَّلٰوۃَ (۵۹: ۵۹)

”شیطان تو یہی چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے
کے ذریعے تمہارے آپس میں عداوت اور بغض
و نفرت پیدا کر دے اور تم کو اللہ کے ذکر اور نماز
سے روک دے“

اسی طرح قمار کا ایک لازمی اثر یہ ہے کہ شراب کی طرح آدمی اس میں مست ہو کر ذکر اللہ اور نماز سے غافل ہو جاتا ہے، اور شاید یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے شراب اور قمار کو ایک ہی جگہ ایک انداز سے ذکر فرمایا ہے کہ معنوی طور پر قمار کا بھی ایک نشہ ہوتا ہے جو آدمی کو اس کے پھلے برے کی فکر سے غافل کر دیتا ہے، مذکورہ آیت میں بھی ان دونوں چیزوں کو جمع کر کے دونوں کے یہ مفاسد ذکر فرمائے ہیں، کہ وہ آپس کی عداوت و بغض کا سبب بنتی ہیں، اور ذکر اللہ اور نماز سے مانع بن جاتی ہیں۔

قمار کی ایک اصولی خرابی یہ بھی ہے کہ یہ باطل طریقہ پر دوسرے لوگوں کا مال ہضم کرنے کا ایک طریقہ ہے، کہ بغیر کسی معقول معاوضہ کے دوسرے بھائی کا مال لے لیا جاتا ہے، اسی کو

قرآن کریم نے ان الفاظ میں منع فرمایا ہے۔

لَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ

توگوں کے مال باطل طریقہ پر مست

بِالْبَاطِلِ - (۲: ۲۸۸)

کھاؤ۔

قمار میں ایک بڑی خرابی یہ بھی ہے کہ دفعہ بہت سے گھر بار ہو جاتے ہیں، لکھتی آدمی فقیر بن جاتا ہے، جس سے صرف یہی شخص متاثر نہیں ہوتا، جس نے جرم قمار کا ارتکاب کیا ہے، بلکہ اس کا پورا گھرانہ اور خاندان معیشت میں پڑ جاتا ہے، اور اگر غور کیا جائے تو پوری قوم اس سے متاثر ہوتی ہے، کیونکہ جن لوگوں نے اس کی مالی ساکھ کو دیکھ کر اس سے معاہدے اور معاملے کئے ہوئے ہیں یا قرض دیئے ہوئے ہیں وہ اب دیوالیہ ہو جاتے گا تو ان سب پر اس کی بربادی کا اثر پڑنا لازمی ہے۔

قمار میں ایک مفسدہ یہ بھی ہے کہ اس سے انسان کی قوت عمل سست ہو کر رہی منافع پر لگ جاتی ہے، اور وہ بجائے اس کے کہ اپنے ہاتھ یا رمانگ کی محنت سے کوئی دولت بڑھا کر اس کی فکر اس بات میں محصور ہو کر رہ جاتی ہے کہ کسی طرح دوسرے کی کمائی پر اپنا قبضہ جائے۔ یہ مختصر فرست ہو قمار کے مفسدہ کی جن سے نہ صرف اس جرم کا مرتکب متاثر ہوتا ہو بلکہ اس کے سب متعلقین اہل و عیال اور پوری قوم متاثر ہوتی ہے، اسی لئے قرآن کریم نے فرمایا: **وَإِنَّهُمْ مِمَّا أَكْبَرُ مِنْ قُلْعِهِمَّا**، یعنی شراب و قمار کے مفسدان کے نفع سے زیادہ ہیں۔

چند فقہی ضابطے اور فوائد | اس آیت میں شراب اور قمار کے بعض فوائد کو تسلیم کرتے ہوئے ان سے رکنے کی ہدایت فرمائی گئی ہے جس سے ایک اہم نتیجہ

یہ نکل آیا کہ کسی چیز یا کسی کام میں کچھ دنیوی منافع ہونا اس کے منافی نہیں ہے کہ اس کو شرعاً حرام قرار دیا جائے، کیونکہ جس طرح محسوسات میں اس دوا اور غذا کو مضر کہا جاتا ہے جس کی مضرتیں بہ نسبت اس کے فائدے کے زیادہ سخت ہوں، ورنہ یوں تو دنیا کی کوئی بھری سے بڑی چیز بھی منافع سے خالی نہیں، نہ ہر قائل میں سانپ اور بچھو میں، ورنہ دونوں میں کتنے فوائد ہیں، لیکن مجموعی حیثیت سے ان کو مضر کہا جاتا ہے، اور ان کے پاس جانے سے بچنے کی ہدایت کی جاتی ہے، اسی طرح معنوی اعتبار سے جن کاموں کے مفسدان کے منافع سے زائد ہوں شرعاً ان کو حرام کر دیا جاتا ہے، چوری، ڈاکہ، زنا، اغوار، دھوکہ، فریب، وغیرہ تمام جرائم میں کوئی ناجرم ایسا ہے جس میں کوئی فائدہ نہیں، کیونکہ اگر یہ بالکل بے فائدہ ہوتے تو کوئی عقل و ہوش والا انسان ان کے پاس نہ جاتا، حالانکہ ان سب جرائم میں کامل وہی لوگ ہوتے ہیں جو ہوشیاری عقلمندی میں معروف سمجھے جاتے ہیں، اس سے ہی معلوم ہوا کہ فوائد تو کچھ نہ کچھ تمام جرائم میں ہیں، مگر چونکہ انکی

مضرت فائدہ سے بڑھتی ہوئی ہے، اس لئے کوئی عقلمند انسان ان کو مفید اور جائز نہیں کہتا، شریعت اسلام نے شراب اور قمار کے تحت حرام قرار دیا ہے، کہ اس کے فوائد سے زیادہ مضر اور دینی و دنیوی مضرتیں ہیں۔

ایک اور فقہی ضابطہ | اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جلب منفعت سے دفع مضرت مقدم ہے، یعنی ایک کام کے ذریعے کچھ فائدہ بھی حاصل ہوتا ہے اور ساتھ ہی کوئی مضرت بھی پہنچتی ہے تو مضرت سے بچنے کے لئے اس منفعت کو چھوڑ دینا ہی ضروری ہوتا ہے، ایسی منفعت کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے جو مضرت کے ساتھ حاصل ہو۔

وَيَسْأَلُونَكَ مَاذَا يُنفِقُونَ قُلِ الْعَفْوَ كَذَلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ

اور تم سے پوچھتے ہیں کہ کیا خرچ کریں کہے جو بچہ اپنے خرچ سے اسی طرح بیان کرتا ہے اللہ

لَكُمْ الْآيَاتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُونَ ﴿۲۱۸﴾ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ

تہم کو واسطے علم تاکہ تم فکر کرو، دنیا و آخرت کی باتوں میں

وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الَّتِي تُقَالُ إِصْلَاحٌ لَهُمْ خَيْرٌ مِنْ أَنْ تَنَالَهُمُ

اور تم سے پوچھتے ہیں ان کی باتوں کا حکم کہہ دے سنو ان کے کام کا بہتر ہے اور اگر ان کا خرچ ملا تو وہ

فَأَحْوَاؤُكُمْ وَاللَّهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمَصْلِحِ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ

نہا کہ بھائی ہیں اور اللہ جانتا ہے خرابی کرنے والے اور سوار کرنے والے کو اور اگر اللہ چاہتا تو

لَاَعْتَذِرُكُمْ إِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ﴿۲۱۹﴾ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُرَاتِ

تم پر مشقت ڈالنا، بیشک اللہ زبردست جو تدبیر والا، اور نکاح مت کرو مشرک عورتوں سے

حَتَّى يُؤْمِنَ وَلَا مَآئِمَةً مُؤْمِنَةً خَيْرٌ مِنْ مَّشْرِكَةٍ وَلَوْ أَعْجَبَكُمْ

جب تک ایمان نہ لے آئیں اور ایستہ لونڈی مسلمان بہتر ہے مشرک بیوی سے اگرچہ وہ تم کو بہل لگے،

وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُرَاتِ حَتَّى يُؤْمِنُوا وَلَعَبْدٌ مُؤْمِنٌ خَيْرٌ مِنْ

اور نکاح نہ کرو مشرکین سے جب تک وہ ایمان نہ لے آئیں اور ایستہ غلام مسلمان بہتر ہے مشرک

مُشْرِكٍ وَلَوْ أَعْجَبَكُمْ أُولَئِكَ يَدْعُونَ إِلَى النَّارِ وَاللَّهُ يَدْعُو

سے اگرچہ وہ تم کو بہلا لگے وہ بلا لے ہیں دوزخ کی طرف اور اللہ بلاتا ہے

إِلَى الْجَنَّةِ وَالْمَغْفِرَةِ بِإِذْنِهِ وَيُبَيِّنُ آيَاتِهِ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ

جنت کی طرف اور بخشش کی طرف اپنے حکم سے اور بتلاتا ہے اپنے حکم کو لوگوں کو تاکہ وہ

يَتَذَكَّرُونَ ﴿۲۲۱﴾

تصیحت قبول کریں۔

خلاصہ تفسیر

۱۲ سو لہواں حکم، مقدار اتفاق اور لوگ آپ سے دریافت کرتے ہیں کہ غیر خیرات میں کتنا خرچ کیا کریں آپ فرما دیجئے کہ جتنا آسان ہو کہ اس کے خرچ کرنے سے خود پریشان ہو کر دنیاوی تکلیف میں یا کسی کا حق ضائع کر کے آخری تکلیف میں پڑ جائیں، اللہ تعالیٰ اس طرح احکام کو صاف صاف بیان فرماتے ہیں تاکہ تم کو ان کا علم ہو جائے اور اس علم کی وجہ سے برحق کرنے سے پہلے دنیا و آخرت کے معاملات میں (ان احکام کو) سوچ لیا کرو اور سوچ کر ہر معاملہ میں ان احکام کے موافق عمل کیا کرو۔

۱۳ ستر ہواں حکم، مخالفتِ تمیم رچو نکا ابتداء میں مثل ہندوستان کے عرب میں بھی جیوں کا حق دینے میں پوری احتیاط نہ تھی، اس لئے یہ وعید سنائی گئی کہ جیوں کا مال کھانا ایسا ہے جیسا دوزخ کے اٹھائے پیٹ میں بھرنا، تو سننے والے ڈر کے مارے اتنی احتیاط کرنے لگے کہ ان کا کھانا بھی الگ بکراتے اور الگ رکھواتے، اور اتفاقاً اگر بچہ کم کھاتا تو کھانا بچتا اور ستر ہواں حکم کیونکہ اس کا استعمال نہ ان لوگوں کے لئے جائز تھا، اور نہ تمیم کے مال کو صدقہ کر دینے کا اختیار تھا، اس طرح تکلیف بھی ہوتی اور تمیم کا نقصان بھی، اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا گیا، اس کے متعلق آیت میں یہ ارشاد آیا، اور لوگ آپ سے تمیم بچوں کے خرچ علیحدہ یا شامل رکھنے کا حکم پوچھتے ہیں آپ فرما دیجئے کہ راصل مقصود ہمارا ان کے اموال کھانے کی ممانعت سے یہ ہے کہ ان کی مصلحت کو ضائع نہ کیا جائے، اور جب خرچ شامل رکھنے میں ان کی مصلحت ہے تو ان کی مصلحت کی رعایت رکھنا علیحدہ خرچ رکھنے سے جو خلاف مصلحت ہے، زیادہ بہتر ہے اور تم ان کے ساتھ خرچ شامل رکھو تو کچھ ڈر کی بات نہیں کیونکہ وہ (بچے) تمہارے (دینی، بھائی میں زور بھائی بھائی شامل رہا ہی کرتے ہیں) اور اللہ تم مصلحت کے ضائع کرنے والے کو اور مصلحت کی رعایت رکھنے والے کو دالگ الگ، جانتے ہیں اس لئے کھانے پینے میں اشتراک ایسا نہ ہونا چاہئے جس میں یتیم کی مصلحت ضائع ہو جائے اور باطل و بلا قصد کچھ کی بیشی ہو بھی جائے تو چو نکا اللہ تعالیٰ کو اس کی

تیک یہی معلوم ہے اس لئے اس پر مواخذہ نہ ہو گا، اور اگر اللہ تعالیٰ چاہتے تو اس معاملہ میں سخت قانون معتر کر کے، تم کو عیبت میں ڈال دیتے (کیونکہ) اللہ تعالیٰ زبردست ہیں (مگر قانون سہل اس کو مقرر نہ کیا کرو) سخت دالے بھی، میں (ایسا حکم نہیں دیتے جو نہ ہو سکے)۔

۱۴ اور نکاح مت کر دو کافر عورتوں کے ساتھ جب تک کہ مسلمان اٹھارہواں حکم مناکحت کفار نہ ہو جاویں اور مسلمان عورت (چاہے) لونڈی (کیوں نہ ہو وہ ہزار درجہ) بہتر ہے کافر عورت سے (چاہے وہ آزادی بی ہی کیوں نہ ہو) گوردہ (کافر عورت) بوجہ مال یا جمال کے (تم کو اچھی معلوم ہو) مگر پھر بھی واقع میں مسلمان عورت ہی اس سے اچھی ہے) اور اسی طرح اپنے اختیار کی عورتوں کو کافر مردوں کے نکاح میں مت درجہ تک وہ مسلمان نہ ہو جاؤ اور مسلمان مرد (چاہے) غلام (ہی کیوں نہ ہو وہ ہزار درجہ) بہتر ہے کافر مرد سے (چاہے وہ آزادی کیوں نہ ہو) گوردہ (کافر مرد) بوجہ مال یا جاہ کے (تم کو اچھی معلوم ہو) مگر پھر بھی واقع میں مسلمان ہی اس سے اچھا ہے، اور وہ ان کافروں کے برا ہونے کی اور وہی اصل سبب ان سے مانعت نکاح کا بتایا ہے کہ یہ (کافر) لوگ دوزخ (میں جانے) کی تحریک دیتے ہیں (کیونکہ کفر کی تحریک کرتے ہیں اور اس کا انجام جہنم ہے) اور اللہ تعالیٰ جنت اور مغفرت کے حاصل کرنے کی تحریک کرتے ہیں اپنے حکم سے (اور اس حکم کا بظور اس طرح ہوا کہ کفار کے متعلق یہ حکم صادر فرما دیا کہ ان سے نکاح نہ کیا جائے، تاکہ ان کی تحریک کے اثر سے پوری حفاظت رہ سکے، اور اس سے محفوظ رہ کر جنت اور مغفرت حاصل ہو جائے) اور اللہ تعالیٰ اس واسطے اپنے احکام بتلا دیتے ہیں تاکہ وہ لوگ نصیحت پر عمل کریں (اور سختی جنت و مغفرت ہو جاویں)۔

۱۵ فوائد از بیان القرآن مسئلہ: جو قوم اپنی وضع اور طرز سے اپنی کتاب سمجھ جاتے ہوں، لیکن عقائد کی تحقیق کرنے سے کتابی ثابت نہ ہوں اس قوم کی عورتوں سے نکاح درست نہیں، جیسے آجکل عورتوں کو عام لوگ عیسائی سمجھتے ہیں، حالانکہ تحقیق سے ان کے بعض عقائد بالکل ملحدانہ ثابت ہوئے کہ نہ خدا کے قائل نہ عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت کے معتقدہ انجیل کی نسبت آسمانی کتاب ہونے کا اعتقاد، سوائے لوگ عیسائی نہیں ایسی جماعت میں کی جو عورت ہوا سے نکاح درست نہیں، لوگ بڑی غلطی کرتے ہیں کہ بلا تحقیق یورپ کی عورتیں بیاہ لاتے ہیں۔

۱۶ مسئلہ: اس طرح جو مرد ظاہری حالت میں مسلمان سمجھا جائے لیکن حقائق اس کے کفر تک پہنچے ہوں اس سے مسلمان عورت کا نکاح درست نہیں، اور اگر نکاح ہو جائے کے بعد ایسے عقائد خراب ہو جاویں تو نکاح کو جائز جیسے آجکل بہت آدمی اپنے مذہب کے نادانانہ سنسنے اثر سے اپنے عقائد تباہ کر لیتے ہیں لوگ دلوں پر دیکھ کر پیام آنے کے وقت اول عقائد کی تحقیق کر لیا کریں تب زبان دیں۔

معارف و مسائل

مسلم و کافر کا باہمی ازدواج ممنوع ہے آیات مذکور میں ایک اہم مسئلہ یہ بیان فرمایا گیا کہ مسلمان مردوں کا نکاح کافر عورتوں سے اور کافر مردوں کا نکاح مسلمان عورتوں سے جائز نہیں ہے۔ وجہ یہ ہے کہ کافر مرد اور عورتیں انسان کو جہنم کی طرف لے جانے کے سبب بنتے ہیں، کیونکہ ازدواجی تعلقات، آپس کی محبت و مودت اور یکجہلت کو چاہتے ہیں، اور بغیر اس کے ان تعلقات کا اصلی مقصد پورا نہیں ہوتا، اور شرکین کے ساتھ اس قسم کے تعلقات قریب محبت و مودت کا لازمی اثر ہے کہ ان کے دل میں بھی کفر و شرک کی طرف میلان پیدا ہو یا کم از کم کفر و شرک سے نفرت ان کے دلوں سے نکل جائے، اور اس کا انجام یہ ہے کہ یہ بھی کفر و شرک میں مبتلا ہو جائیں اور اس کا نتیجہ جہنم ہے، اس لئے فرمایا گیا کہ یہ لوگ جہنم کی طرف دعوت دیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ انسان کو جنت اور مغفرت کی طرف دعوت دیتا ہے، اور صاف صاف اپنے احکام بیان فرمادیتا ہے تاکہ لوگ نصیحت پر عمل کریں، اس جگہ چند باتیں قابل غور ہیں۔

اول یہ کہ اس آیت میں لفظ شرک سے اگر مطلقاً غیر مسلم مراد ہوں تو قرآن کریم کی ایک دوسری آیت کی بنا پر اہل کتاب کی غیر مسلم عورتیں اس حکم سے مستثنیٰ ہیں، جس میں ارشاد فرمایا گیا ہے **وَالْمُحْصَنَاتُ مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ مِنْ قَبْلِكُمْ** (۵۱)، اور اگر شرک سے خاص وہ غیر مسلم مراد ہیں جو اہل کتاب نہیں تو یہ آیت اپنی جگہ عام ہے تمام ان غیر مسلموں کو جو کسی پیغمبر اور آسمانی کتاب پر ایمان نہیں رکھتے۔

دوسری بات قابل غور یہ ہے کہ مسلم و کافر کے درمیان ازدواجی تعلقات کو حرام قرار دینے کی جو وجہ شرعاً کریم میں بیان فرمائی گئی ہے کہ ان کے ساتھ ایسے تعلقات شریعہ کفر و شرک میں مبتلا ہو جانے کا سبب بن سکتے ہیں، یہ بات تو بظاہر تمام غیر مسلم فرقوں میں مصادی ہے، پھر اہل کتاب کی عورتوں کو مستثنیٰ کرنے کی کیا وجہ ہے۔

جواب ظاہر ہے کہ اہل کتاب کا اختلاف اسلام کے ساتھ بہ نسبت دوسرے غیر مسلموں کے کم اور ہلکا ہے، کیونکہ عقائد اسلام کے تین عمود ہیں توحید، آخرت، رسالت، ان میں سے عقیدہ آخرت میں تو اہل کتاب یہود و نصاریٰ بھی اپنے اصل مذہب کے اعتبار سے مسلمانوں کے ساتھ متفق ہیں، اسی طرح خدا کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرانا خود ان کے اصل مذہب میں بھی کفر ہے، یہ دوسری بات ہے کہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی عظمت و محبت کے غلو میں شرک تک جا پہنچے۔

اب بنیادی اختلاف صرف یہ رہ جاتا ہے کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو رسول نہیں

مانتے، اور اسلام میں یہ عقیدہ بھی بنیادی عقیدہ ہے، اس کے بغیر کوئی انسان مؤمن نہیں ہو سکتا، بہر حال دوسرے غیر مسلم فرقوں کی نسبت سے اہل کتاب کا اختلاف ہلکا اور کم ہے، اس لئے اس میں مفسدہ کا خطرہ زیادہ نہیں۔

تیسری بات قابل غور یہ ہے کہ جب اہل کتاب کا اختلاف ہلکا قرار دے کر ان کی عورتوں سے نکاح مسلمان کا جائز ہوا تو اس کے برعکس مسلمان عورتوں کا نکاح بھی غیر مسلم اہل کتاب سے جائز ہو جانا چاہئے، مگر ذرا غور کرنے سے فرق واضح ہو جاتا ہے کہ عورت کچھ نقطہ ضعیف ہے اور پھر شوہر اس پر ماکم اور نگران بنایا گیا ہے، اس کے عقائد و نظریات سے عورت کا متاثر ہو جانا مستبعد نہیں، اس لئے اگر مسلمان عورت غیر مسلم کتابی کے نکاح میں رہے تو اس کے عقائد خراب ہو جانے کا قوی اندیشہ ہے، بخلاف اس کے کہ غیر مسلم کتابی عورت مسلمان کے نکاح میں رہے تو اس کے خیالات کا اثر شوہر پر پڑنا اصولاً مستبعد ہے، کوئی بے اصول اور اذرا کاشکار ہو جائے یہ اس کا اپنا قصور ہے۔

چوتھی بات قابل غور یہ ہے کہ ازدواجی تعلقات میں جو کچھ اثر ہوتا ہے وہ طرفین پر یکساں ہوتا ہے، اس لئے جیسے یہ اندیشہ ہے کہ مسلمان کے عقائد غیر مسلم سے متاثر ہو جائیں اسی طرح یہ بھی قوا احتمال ہے کہ معاملہ برعکس ہو، غیر مسلم کے عقائد مسلمان سے متاثر ہو، اور وہ ہی اسلام قبول کرنے کو اس کا مقصد ہے کہ مسلم و غیر مسلم کے ازدواجی تعلقات کو ممنوع نہ کیا جائے۔

لیکن یہاں محنت کی بات یہ ہے کہ جب کسی چیز میں ایک نفع کی امید بھی ہو اور کسی ضرر کا خلوہ بھی ہو تو عقل سلیم کا تقاضا یہ ہے کہ ضرر سے بچے گا، اہتمام نفع کی فکر سے زیادہ ضروری ہے، غار کا ایک حکیمانہ مقولہ مشہور ہے کہ **عقلندہ تریاق بیعتین وزہر گیہاں مخور** اس لئے اس نفع کی امید کو نظر انداز کیا گیا کہ شاید وہ غیر مسلم متاثر ہو کر اسلام قبول کر لے، اہتمام اس کا کیا گیا کہ مسلمان متاثر ہو کر کفر میں مبتلا نہ ہو جائے۔

پانچویں بات قابل غور یہ ہے کہ اہل کتاب یہود و نصاریٰ کی عورتوں سے مسلمان مردوں کو نکاح کی اجازت کے بھی معنی یہ ہیں کہ اگر نکاح کر لیا جائے تو نکاح صحیح ہو جائے گا، اولاد ثابت ہو جائے گی، لیکن روایات حدیث اس پر شاہد ہیں کہ یہ نکاح بھی پسندیدہ نہیں، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مسلمان کو اپنے نکاح کے لئے دیندار صالح عورت تلاش کرنا چاہئے تاکہ خود اس کے لئے بھی دین میں معین ثابت ہو، اور اس کی اولاد کو کم (دیندار ہونے کا موقع میسر آئے، اور جب غیر مسلم مسلمان عورت سے نکاح پسند نہیں کیا گیا تو یہ غیر مسلم سے کیسے پسند کیا جاتا، یہی وجہ ہے کہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کو جب غیر مسلم عورتی عراق دشام کے مسلمانوں میں کچھ ایسے اندیشے

کی کثرت ہونے لگی تو بذریعہ مشرمان اُن کو اس سے روک دیا گیا، اور اس پر توجہ دلائی گئی کہ یہ ازدواجی تعلق دیا نہ بھی مسلم گھرانوں کے لئے خرابی کا سبب ہے، اور سیاست بھی و کتاب الآثار (علامہ محمدؒ) اور آج کے غیر مسلم اہل کتاب یہودی و نصاریٰ اور ان کے سیاسی مفکر و فریب اور سیاسی شادیاں اور مسلم گھرانوں میں داخل ہو کر ان کو اپنی طرف مائل کرنا اور ان کے راز حاصل کرنا وغیرہ جس کا استراخود بعض مسیحی مصنفین کی کتابوں میں میجر جنرل اکبر کی کتاب حدیث و فاع میں اس کی کچھ تفصیلات حوالوں کے ساتھ مذکور ہیں۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فاروق اعظمؓ کی دور بین نظریں ان واقعات کو دیکھ رہی تھیں خصوصاً اس زمانہ کے یورپ کے اکثر وہ لوگ جو عیسائی یا یہودی کہلاتے جاتے ہیں، اور مردم شماری کے رجسٹروں میں ان کی توہمت عیسائی یا یہودی لکھی جاتی ہے اگر ان کے حالات کی تحقیق کی جائے تو ان میں بکثرت ایسے لوگ ملیں گے جن کو عیسائیت اور یہودیت سے کوئی تعلق نہیں وہ بالکل ملحد بے دین ہیں، نہ عیسیٰ علیہ السلام کو مانتے ہیں نہ انجیل کو، نہ موسیٰ علیہ السلام پر ایمان ہے نہ تورات پر نہ خدا تعالیٰ پر نہ آخرت پر ظاہر ہے کہ حلت نکاح کا استراخی حکم ایسے لوگوں کو شامل نہیں، ان کی عورتوں سے نکاح قطعاً حرام ہے ایسے لوگ ظاہر ہے کہ آیت قرآن ذَا الْمُحْصَنَاتِ مِنَ الذِّیْنِ اُذُوْا الْکِتَابِ کے مستثنائین داخل نہیں ہوتے، غیر مسلموں کی طرح ان کی عورتوں کے ساتھ نکاح بھی قطعاً حرام ہے۔

وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الْمَحْضِيِّ قُلْ هُوَ اَذَىٰ فَاَعْتَزِلُوا النِّسَاءَ فِي

اور جو سے بچتے ہیں مسک حیض کا کہنے وہ گندگی ہے سو تم الگ رہو عورتوں سے حیض

الْمَحْضِيْنَ وَلَا تَقْرَبُوْهُنَّ حَتّٰی يَطْهَرْنَ فَاِذَا طَهَّرْنَ فَلَهُنَّ

کے وقت اور نزدیک نہ ہوں گے جب تک پاک نہ ہوں پھر جب خوب پاک ہو جائیں تو مجازاً ان کے

مِنْ حَيْثُ اَمَرَکُمُ اللّٰهُ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ وَيُحِبُّ

پس جہاں سے حکم دیا تم کو اللہ نے بیشک اللہ کو پسند آتے ہیں تو بہ کرنے والے اور پلٹتے آتے ہیں

الْمُتَطَهِّرِيْنَ ۝ نِسَاؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ فَاَنْتُمْ حَرْثُكُمْ اَنْتُمْ

گندگی سے بچنے والے، تمہاری عورتیں تمہاری کھیتی ہیں سو مجازاً اپنی کھیتی میں جہاں سے

سَلَّمْتُمْ زَوْقَیْ مَوَالِیْکُمْ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْا اَنَّکُمْ

چاہو اور آگے کی تدبیر کرو اپنے واسطے اور ڈرتے رہو اللہ سے اور جان رکھو کہ تم کو

مَّا لَقَوْكُمْ وَاَنْتُمْ مُّؤْمِنُوْنَ ۝

اس سے ملنا ہو اور خوش خبری سننا ایمان والوں کو

خلاصہ تفسیر

حکم نمبر ۱۹، حیض میں جماع (۱) وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ (۲) اُن کو خوش خبری دے کہ تم ان سے ملنا ہو اور خوش خبری سننا ایمان والوں کو

کی عزت اور پاکی کی شراکت آپ سے حیض کی حالت میں صحبت وغیرہ کرنے کا حکم پوچھتے ہیں، آپ

فرمادیتے کہ وہ (حیض) اندر کی چیز ہے، تو حالت حیض میں عورتوں کے ساتھ صحبت کرنے سے

علقہ رہا کرو اور اس حالت میں، ان سے قربت مت کرو جب تک وہ (حیض) پاک نہ ہو جائے

پھر جب وہ (عورتیں) اچھی طرح پاک ہو جائیں کہ ناپاکی کا شک نہ رہے (تو ان کے پاس

آ جاؤ لیکن ان سے صحبت کرو) جس جگہ سے تم خدا تعالیٰ نے اجازت دی ہے (یعنی آگے سے)

یقیناً اللہ تعالیٰ محبت رکھتے ہیں تو بہ کرنے والوں سے (مثلاً اتفاقاً یا بے احتیاطی سے حالت

حیض میں صحبت کر بیٹھا پھر متنبہ ہو کر قرب کر لی) اور محبت رکھتے ہیں پاک سات رہنے والوں سے (جو

حالت حیض میں صحبت کرنے سے اور دوسرے مہنیات سے بچتے ہیں اور حالت پاکی میں اجازت

صحبت کی دینا پھر اس قید سے اجازت دینا کہ آگے کے موقع میں صحبت ہو اس لیے کہ تمہاری بیوی

تمہارے لئے (بمنزلہ) کھیت کے ہیں (جس میں لطف بھائے تم کے اور بچہ بھائے پیداوار کے ہے)

سو اپنے کھیت میں جس طرف سے چاہو آ جاؤ اور جس طرح کھیتوں میں اجازت ہے اسی طرح

بیویوں کے پاس پاکی کی حالت میں ہر طرف سے آنے کی اجازت ہے خواہ کر دہ سے ہو یا پیچھے

سے یا آگے بیٹھ کر ہو یا اوپر یا نیچے لیٹ کر ہو، یا جس ہیئت سے ہو، مگر آنا ہو ہر حال میں کھیت

کے اندر کہ وہ خاص آگے کا موقع ہے، کیونکہ پیچھے کا موقع کھیت کے مشابہ نہیں، اس میں صحبت

نہ ہو، اور ان لذات میں ایسے مشغول مت ہو جاؤ کہ آخرت ہی کو بھول جاؤ، بلکہ آئندہ کے واسطے

اپنے لئے کھلا اعمال صالحہ کرتے رہو اور اللہ تعالیٰ سے ہر حال میں ڈرتے رہو، اور یہ یقین رکھو

کہ بے شک تم اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش ہونے والے ہو اور اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم ایسے

ایمان داروں کو جو نیک کام کریں، خدا سے ڈریں، خدا تعالیٰ کے سامنے جائے گا یقین رکھیں خوشی

کی خبر سننا دیجے کہ ان کو آخرت میں ہر طرح کی نعمتیں ملیں گی۔

وَلَا تَجْعَلُوا لِلّٰهِ عُرْضَةً لِأَيْمَانِكُمْ أَنْ تَبَرُّوا وَتَتَّقُوا وَتُصَلُّوا

اور مت بناؤ اللہ کے نام کو نشانہ اپنی قسمیں کھانے کے لئے کہ سبک کرنے سے اور ہر گز گاری اور گلو

بَيْنَ النَّاسِ وَاللّٰهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿۳۸﴾

میں سے جانے والا اور اللہ سب کچھ جانتا ہے۔

خلاصہ تفسیر

حکم نمبر ۳۸: ایک کام نہ کرنے اور اللہ کے نام کو اپنی قسموں کے ذریعہ سے ان امور کا حجاب مت بناؤ کہ تم نبی کے اور کی قسم کی ممانعت تقویٰ کے اور اصلاح فیما بین خلق کے کام کرو یعنی اللہ کے نام کی یہ قسم نہ کھاؤ کہ تم سبک

کام نہ کریں گے، اور اللہ تعالیٰ سب کچھ سنتے جانتے ہیں (تو زبان سنبھال کر بات کرو، اور دل میں برائیالات مت لانا)

لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِي أَيْمَانِكُمْ وَلَكِنْ يُؤَاخِذُكُمْ

بِمَا كَسَبَتْ أَيْمَانُكُمْ وَاللّٰهُ غَفُورٌ حَلِيمٌ ﴿۳۹﴾

جس کا قصد کیا تمہارے دلوں نے اور اللہ بخشنے والا تحمل کرنے والا ہے

خلاصہ تفسیر

حکم نمبر ۳۹: بھوٹی قسمیں کھانیکا حکم اللہ تعالیٰ تم پر آخرت میں دار و گیر نہ فرما دیں گے تمہاری قسموں میں ایسی بیہودہ قسم پر جس میں بلا قصد جھوٹ بولا گیا،

لیکن دار و گیر نہ فرما دیں گے اس بھوٹی قسم پر جس میں تمہارے دلوں نے جھوٹ بولنے کا ارادہ کیا ہے، اور اللہ تعالیٰ غفور ہیں کہ ایسی بیہودہ قسم پر دار و گیر نہ فرمائی، حلیم ہیں کہ قصداً جھوٹی قسم کھانے کی سزا میں آخرت تک کی جہالت دیں

لَّذِينَ يُؤْلُونَ مِنْ نِسَائِهِمْ تَرَبُّصُ أَرْبَعَةِ أَشْهُرٍ فَإِنْ

كَأَوْ قَانَ اللّٰهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿۴۰﴾ وَإِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ

مَامِ لِحَجَّتِ نَوَاسِخُ نَجْشِ وَلَا مَسْرَانِ هَ ا اور اگر شہرایا چھوڑ دینے کو

فَإِنَّ اللّٰهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿۴۱﴾

زبیر اللہ سنتے والا جاننے والا ہے

خلاصہ تفسیر

حکم نمبر ۴۱: ایلا رکا حکم اللہ تعالیٰ (الی قولہ) سَمِيعٌ عَلِيمٌ یعنی جو لوگ (مطلقہ مدت یا چار ماہ یا زائد مدت کے لئے) قسم کھا جیتے ہیں اپنی بیبیوں کے پاس جانے سے ان کیلئے

چار مہینے تک کی جہالت ہے سوا اگر ان چار مہینے کے اندر یہ لوگ (اپنی قسم کو توڑ کر عورت کی طرف رجوع کریں) تب

تو نکاح باقی رہے گا اور اللہ تعالیٰ (ایسی قسم کو توڑنے کا گناہ و کفارہ سے) معاف کر دیں گے (اور چہرہ کو اب بلی کے حقوق

ادا کرنے کا اس پر) مدت فرما دیں گے، اور اگر بالکل چھوڑ دیں گے یا پختہ ارادہ کر لیا ہے (اور اس لئے چار ماہ کے اندر

قسم توڑ کر رجوع نہیں کیا) تو چار ماہ گزرتے ہی قطعی طلاق پڑ جائیگی اور اللہ تعالیٰ (ان کی قسم کو بھی) سنتے ہیں (اور ان کے اس پختہ ارادے کو بھی) جانتے ہیں (اس لئے اس کے متعلق حکم مناسب ارشاد فرمایا)۔

وَالْمُطَلَّقَاتُ يَتَرَبَّصْنَ بِأَنْفُسِهِنَّ ثَلَاثَةَ قُرُوءٍ وَلَا يَحِلُّ

لَهُنَّ أَنْ يَكُنَّ مِنْ مَّا خَلَقَ اللّٰهُ فِي أَسْرَاحٍ وَهِنَّ إِنْ كُنَّ يُؤْمِنُ

بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَبُعُولَتُهُنَّ أَحْسَنُ بِرَدِّهِنَّ فِي ذَلِكَ إِنْ أَرَادُوا

بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَبُعُولَتُهُنَّ أَحْسَنُ بِرَدِّهِنَّ فِي ذَلِكَ إِنْ أَرَادُوا

بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَبُعُولَتُهُنَّ أَحْسَنُ بِرَدِّهِنَّ فِي ذَلِكَ إِنْ أَرَادُوا

بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَبُعُولَتُهُنَّ أَحْسَنُ بِرَدِّهِنَّ فِي ذَلِكَ إِنْ أَرَادُوا

بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَبُعُولَتُهُنَّ أَحْسَنُ بِرَدِّهِنَّ فِي ذَلِكَ إِنْ أَرَادُوا

بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَبُعُولَتُهُنَّ أَحْسَنُ بِرَدِّهِنَّ فِي ذَلِكَ إِنْ أَرَادُوا

بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَبُعُولَتُهُنَّ أَحْسَنُ بِرَدِّهِنَّ فِي ذَلِكَ إِنْ أَرَادُوا

بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَبُعُولَتُهُنَّ أَحْسَنُ بِرَدِّهِنَّ فِي ذَلِكَ إِنْ أَرَادُوا

بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَبُعُولَتُهُنَّ أَحْسَنُ بِرَدِّهِنَّ فِي ذَلِكَ إِنْ أَرَادُوا

بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَبُعُولَتُهُنَّ أَحْسَنُ بِرَدِّهِنَّ فِي ذَلِكَ إِنْ أَرَادُوا

بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَبُعُولَتُهُنَّ أَحْسَنُ بِرَدِّهِنَّ فِي ذَلِكَ إِنْ أَرَادُوا

بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَبُعُولَتُهُنَّ أَحْسَنُ بِرَدِّهِنَّ فِي ذَلِكَ إِنْ أَرَادُوا

وَلَا تَجْعَلُوا لِلّٰهِ عُرْضَةً لِأَيْمَانِكُمْ أَنْ تَبَرُّوا وَتَقْوُوا وَتُصِلُوا

اور مت بناؤ اللہ کے نام کو نشانہ اپنی قسمیں کھانے کے لئے کہ سبک کرنے سے اور پھر ہر گارے اور گلوں

بَيْنَ النَّاسِ وَاللّٰهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿۳۸﴾

میں صلح کرانے سے بچ جاؤ اور اللہ سب کچھ سنتا جانتا ہے۔

خلاصہ تفسیر

حکم نمبر ۳۸: ایک کام نہ کرنے اور اللہ کے نام کو اپنی قسموں کے ذریعہ سے ان امور کا حجاب مت بناؤ کہ تم نبی کے اور کی قسم کی ممانعت تقویٰ کے اور اصلاح فیما بین خلق کے کام کرو یعنی اللہ کے نام کی یہ قسم نہ کھاؤ کہ تم سبک

کام نہ کریں گے، اور اللہ تعالیٰ سب کچھ سنتے جانتے ہیں (تو زبان سنبھال کر بات کرو، اور دل میں برائیالات مت لانا)

لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِي أَيْمَانِكُمْ وَلَكِنْ يُؤَاخِذُكُمْ

بِمَا كَسَبَتْ أَيْمَانُكُمْ وَاللّٰهُ غَفُورٌ حَلِيمٌ ﴿۳۹﴾

جس کا قصد کیا تمہارے دلوں نے اور اللہ بخشنے والا تحمل کرنے والا ہے

خلاصہ تفسیر

حکم نمبر ۳۹: بھوٹی قسمیں کھانیکا حکم اللہ تعالیٰ تم پر آخرت میں دار و گیر نہ فرما دیں گے تمہاری قسموں میں ایسی بیہودہ قسم پر جس میں بلا قصد جھوٹ بولا گیا،

لیکن دار و گیر نہ فرما دیں گے اس بھوٹی قسم پر جس میں تمہارے دلوں نے جھوٹ بولنے کا ارادہ کیا ہے، اور اللہ تعالیٰ غفور ہیں کہ ایسی بیہودہ قسم پر دار و گیر نہ فرمائی، حلیم ہیں کہ قصداً جھوٹی قسم کھانے کی سزا میں آخرت تک کی ہلکت دیں

لَّذِينَ يُؤْلُونَ مِنْ نِسَائِهِمْ تَرَبُّصُ أَرْبَعَةِ أَشْهُرٍ فَإِنْ

كَأَوْ قَانَ اللّٰهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿۴۰﴾ وَإِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ

مابین مل گئے تو اللہ بخشنے والا مہربان ہے، اور اگر تمہارا بھوٹ دینے کو

فَإِنَّ اللّٰهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿۴۱﴾

زبیر اللہ سنتے والا جانتے والا ہے

خلاصہ تفسیر

حکم نمبر ۴۱: ایلا رکا حکم لَّذِينَ يُؤْلُونَ (الی قولہ) سَمِيعٌ عَلِيمٌ یعنی جو لوگ (مطلقہ مدت یا چار ماہ یا زائد مدت کے لئے) قسم کھا جیتے ہیں اپنی بیویوں کے پاس جانے سے ان کیلئے

چار مہینے تک کی ہلکت ہے سوا اگر ان چار مہینے کے اندر یہ لوگ (اپنی قسم کو توڑ کر عورت کی طرف) رجوع کریں تب

تو نکاح باقی رہے گا اور اللہ تعالیٰ (ایسی قسم کو توڑنے کا گناہ و کفارہ سے) معاف کر دیں گے (اور چرکہ اب بانی کے حقوق

ادا کرنے کا اس پر) مدت فرما دیں گے، اور اگر بالکل چھوڑ دیں گے کا پختہ ارادہ کر لیا ہے (اور اس لئے چار ماہ کے اندر

قسم توڑ کر رجوع نہیں کیا) تو چار ماہ گزرنے ہی قطع طلاق پر جاویں گی اور اللہ تعالیٰ (ان کی قسم کو بھی) سنتے ہیں (اور ان کے اس پختہ ارادے کو بھی) جانتے ہیں (اس لئے اس کے متعلق حکم مناسب ارشاد فرمایا)۔

وَالْمُطَلَّقَاتُ يَتَرَبَّصْنَ بِأَنْفُسِهِنَّ ثَلَاثَةَ قُرُوءٍ وَلَا يَحِلُّ

لَهُنَّ أَنْ يَكُنَّ مِنْ مَّا خَلَقَ اللّٰهُ فِي أَسْرَاحٍ وَهِنَّ إِنْ كُنَّ يُؤْمِنُ

بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَبُعُولَتُهُنَّ أَحْسَنُ بِرَدِّهِنَّ فِي ذَلِكَ إِنْ أَرَادُوا

بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَبُعُولَتُهُنَّ أَحْسَنُ بِرَدِّهِنَّ فِي ذَلِكَ إِنْ أَرَادُوا

بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَبُعُولَتُهُنَّ أَحْسَنُ بِرَدِّهِنَّ فِي ذَلِكَ إِنْ أَرَادُوا

بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَبُعُولَتُهُنَّ أَحْسَنُ بِرَدِّهِنَّ فِي ذَلِكَ إِنْ أَرَادُوا

بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَبُعُولَتُهُنَّ أَحْسَنُ بِرَدِّهِنَّ فِي ذَلِكَ إِنْ أَرَادُوا

بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَبُعُولَتُهُنَّ أَحْسَنُ بِرَدِّهِنَّ فِي ذَلِكَ إِنْ أَرَادُوا

بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَبُعُولَتُهُنَّ أَحْسَنُ بِرَدِّهِنَّ فِي ذَلِكَ إِنْ أَرَادُوا

بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَبُعُولَتُهُنَّ أَحْسَنُ بِرَدِّهِنَّ فِي ذَلِكَ إِنْ أَرَادُوا

بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَبُعُولَتُهُنَّ أَحْسَنُ بِرَدِّهِنَّ فِي ذَلِكَ إِنْ أَرَادُوا

بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَبُعُولَتُهُنَّ أَحْسَنُ بِرَدِّهِنَّ فِي ذَلِكَ إِنْ أَرَادُوا

ان کو جین آتا ہو، آزاد ہو، یعنی شرعی قاعدہ سے لونڈی نہ ہوں) اپنے آپ کو نکاح سے روکے رکھیں، عین جین ختم ہونے تک (اور اس کو عزت کہتے ہیں) اور ان عورتوں کو یہ بات حلال نہیں کہ خدا تعالیٰ نے جو کچھ ان کے رحم (بچہ دان) میں پیدا کیا ہو (خواہ صل ہو یا جین) اس کو پوشیدہ کریں (کیونکہ اس کے پوشیدہ کرنے سے عذت کا حساب غلط ہو جاوے گا) اگر وہ عورتیں اللہ تعالیٰ پر اور یوم آخرت پر یقین رکھتی ہیں (جو اس کے کہ اس یقین کا مقتضایہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے ڈریں کہ قیامت میں نافرمانی پر سزا نہ ہو جاوے) اور ان عورتوں کے شوہر جب کہ ان کو طلاق رجعی ملی ہو جس کا بیان آگے آئے گا) ان کے (بلا تجد نکاح) پھر نکاح لینے کا حق رکھتے ہیں اس عذت کے اندل اور اس (نکاح لینے کو رجعت کہتے ہیں) بشرطیکہ رجعت کرنے سے (اصلاح کا قصد رکھتے ہوں) (ورنہ تنگ کرنے کے لئے رجعت کرنا لا حاصل ہے، گو رجعت تو ہو ہی جاوے گی اور یہ حکم اصلاح کا اس لئے کیا گیا کہ) عورتوں کے حقوق (مردوں پر) جو کہ دفع و جوب میں مثل اپنی کے حقوق کے ہیں جو ان عورتوں پر ہیں (مردوں کے ان کو) قاعدہ (شرعی) کے موافق (داد کیا جاوے) اور راتنی بات ضرور ہے کہ مردوں کا ان کے مقابلہ میں کچھ درجہ بڑھا ہوا ہے (اس لئے ان کے حقوق کی نوعیت عورتوں کے حقوق کی نوعیت سے بڑھی ہوئی ہے) اور اللہ تعالیٰ تبارک و تعالیٰ رحاکم) ہیں۔

دور حکیم رہی، ہیں۔
مسائل متعلقہ آیت (۱) اگر غلبہ شہوت سے حالت جین میں صحبت ہو گئی، تو خوب تو بہ کرنا از بیان العشر آن واجب ہے اور کچھ خیر خیرات بھی دیدے تو زیادہ بہتر ہے۔

(۲) پیچھے کے موقع میں اپنی بی بی سے بھی صحبت کرنا حرام ہے۔
(۳) لغو قسم کے رد معنی ہیں، ایک تو یہ کہ کسی گزری ہوئی بات پر جھوٹی قسم بلا ارادہ کل گئی، یا سبکی تو ارادے سے، مگر اس کو اپنے گمان میں صحیح سمجھتا ہے جیسے اپنے علم و گمان کے مطابق قسم کھا بیٹھا کہ زید آگیا جو اور واقع میں وہ نہ آیا تھا، یا آئندہ بات پر اس طرح قسم کل گئی کہ کہنا چاہتا تھا کچھ اور بے ارادہ منہ سے قسم کل گئی اس میں گناہ نہیں ہوتا، اور اس کو اس واسطے لغو کہتے ہیں آخرت میں اس پر مواخذہ نہیں ہوگا، اور اس کے مقابلہ میں جس پر مواخذہ ہونے کا ذکر منسخر مایا ہے یہ وہ قسم ہے جو قصداً جھوٹی سمجھ کر کھائی ہو اس کو لغو تو کہتے ہیں، اس میں گناہ ہوتا ہے، مگر امام ابو حنیفہ کے نزدیک کفارہ نہیں آتا، اور لغو بالمعنی المذكور میں بدرجہ اولیٰ کفارہ نہیں، اس آیت میں انہی دونوں کا بیان ہے، جن میں کفارہ نہیں۔

دوسرے معنی لغو کے یہ ہیں جس پر کفارہ نہ ہو اور اس کو لغو اس لئے کہیں گے کہ مواخذہ نہ رہی یعنی کفارہ اس پر نہیں آتا، اس معنی کے لحاظ لفظ لغو لغو تو کہیں کو بھی شامل ہے، کہ اس میں

اگرچہ گناہ ہوتا ہے لیکن کفارہ نہیں آتا، اس کے مقابلہ میں وہ قسم جس پر کفارہ بھی آتا ہو منعقد کہلاتی ہے، اس کی حقیقت یہ ہے کہ قصداً یوں قسم کھائے کہ میں فلاں فعل کروں گا، یا فلاں کام نہ کروں گا اس میں خلاف کرنے سے کفارہ لازم آتا ہے۔

(۴) اگر کوئی قسم کھائے کہ اپنی بیوی سے صحبت نہ کروں گا اس کی چار صورتیں ہیں: ایک یہ کہ کوئی مدت معین نہ کرے، دوم یہ کہ چار مہینے کی مدت کی قید لگا دے، سوم یہ کہ چار ماہ سے زیادہ کی مدت کی قید لگا دے، چہارم یہ کہ چار ماہ سے کم کی مدت کا نام لے، پس صورت اول دوم اور سوم کو شرع میں ایلا کہتے ہیں، اور اس کا حکم یہ ہے کہ اگر چار ماہ کے اندر اپنی قسم توڑ ڈالے اور بیوی کے پاس چلا آوے تو قسم کا کفارہ اور نکاح باقی ہے، اور اگر چار ماہ گزر گئے اور قسم نہ توڑی، تو اس عورت پر قطعی طلاق پڑ گئی، یعنی بلا نکاح رجوع کرنا درست نہیں رہا، البتہ اگر دونوں رضامندی سے پھر نکاح کر لیں تو درست ہے، حلالہ کی ضرورت نہ ہوگی، اور چوتھی صورت کا حکم یہ ہے کہ اگر قسم توڑے تو کفارہ لازم ہوگا، اور اگر قسم پوری کر لی جب بھی نکاح باقی ہے، (بیان القرآن)

معارف و مسائل

مرد و عورت کے فرق اور میاں بیوی کے باہمی حقوق و فرائض اور ان کے درجات کے بیان میں ایک شرعی ضابطہ کی حیثیت رکھتی ہے، اس آیت سے پہلے اور اس کے بعد کئی رکوع تک اسی ضابطہ کی اہم جزئیات کا بیان ہوا ہے۔

اسلام میں عورت کا موقف اس جگہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پہلے عورت کے اس موقف کی کچھ تشریح کر دی جائے جو اسلام نے اس کو عطا کیا ہے، جس کو سمجھ لینے کے بعد یقینی طور پر اس کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ ایک عادلانہ اور معتدل نظام کا مقتضی یہی تھا، اور یہی وہ مقام ہے جس سے اونچ نیچ یا انحطاط انسان کے دین و دنیا کے لئے عظیم خطرہ بن جاتا ہے۔

غور کیا جائے تو دنیا پر دو پیریں ایسی ہوتی ہیں جو اس عالم کی بقا اور تعمیر و ترقی میں عود کا درجہ رکھتی ہیں، ایک عورت، دوسرے دولت، لیکن تصویر کا دوسرا رخ دیکھا جائے تو یہی دونوں چیزیں دنیا میں فساد و خون ریزی اور طرح طرح کے فتنوں کا سبب بھی ہیں، اور غور کرنے سے اس نتیجہ پر پہنچنا کچھ دشوار نہیں کہ یہ دونوں چیزیں اپنی اصل میں دنیا کی تعمیر و ترقی اور اس کی رونق کا ذریعہ ہیں، لیکن جب کہیں ان کو اپنے اصلی مقام اور موقف سے اِدھر اُدھر کر دیا جاتا ہے تو یہی

چیزیں دنیا میں سب سے بڑا زلزلہ بھی بن جاتی ہیں۔

فترآن نے انسان کو نظام زندگی دیا ہے اس میں ای دو لون چیزوں کو اپنے اپنے صحیح مقام پر ایسا رکھا گیا ہے کہ ان کے فوائد و مميزات زیادہ سے زیادہ حاصل ہوں، اور فتنہ و فساد کا نام نہ رہے، دولت کا صحیح مقام، اس کے حاصل کرنے کے ذرائع اور خرچ کرنے کے طریقے اور تقسیم دولت کا عادلانہ نظام یہ ایک مستقل علم ہے جس کو "اسلام کا معاشی نظام" کہا جاسکتا ہے، اس کا بیان اللہ کسی اور موقع پر ہوگا، احقر کا مطبوعہ رسالہ "تقسیم دولت" بھی ضروری اشارات کا کام دے سکتا ہے۔

اس وقت عورت اور اس کے حقوق و فرائض کا ذکر ہے، اس کے متعلق آیت مذکورہ میں یہ ارشاد فرمایا گیا ہے کہ جس طرح عورتوں پر مردوں کے حقوق ہیں جن کی ادائیگی ضروری ہے اسی طرح مردوں پر عورتوں کے حقوق ہیں جن کا ادا کرنا ضروری ہے، ہاں اتنا فرق ضروری ہے کہ مردوں کا درجہ عورتوں سے بڑھا ہوا ہے، اور تقریباً ہی مضمون سورۃ نسا کی آیت میں اس طرح آیا ہے:-

الزَّكَاةُ لِلرَّحْمَنِ عَلَى الْمِسْكِينِ
فَقَسَلْنَا لَهُمُ فَعْلَهُمُ عَلَىٰ بَعْضٍ وَّ
يَسَاءَ أَتَقَفُوا ۚ اِنَّ اَمْرًا لَّيَسِيرًا ۝۱۲۲

اسلام سے پہلے معاشرہ اسلام سے پہلے زمانہ جاہلیت میں تمام دنیا کی اقوام میں جاری تھا کہ عورت میں عورت کا درجہ کی حیثیت مگر ملو استعمال کی اشیاء سے زیادہ نہ تھی، چوبازوں کی طرح اس کی خرید و فروخت ہوتی تھی، اس کو اپنی شادی سیاہ میں کسی قسم کا کوئی اختیار نہ تھا، اس کے ادبیا جس کے حوالے کر دیتے رہاں جانا پڑتا تھا، عورت کو اپنے رشتہ داروں کی میراث میں کوئی حصہ نہ ملتا تھا بلکہ وہ خود مگر ملو اشیاء کی طرح مالی وراثت بھی جاتی تھی، وہ مردوں کی ملکیت تصور کی جاتی تھی، اس کی ملکیت کسی چیز پر نہ تھی، اور جو چیزیں عورت کی ملکیت کہلاتی تھیں ان میں اس کو مرد کی اجازت کے بغیر کسی قسم کے تصرف کا کوئی اختیار نہ تھا ہاں اس کے شوہر کو ہر قسم کا اختیار تھا کہ اس کے مال کو جہاں چاہے اور جس طرح چاہے خرچ کر ڈالے، اس کو پوچھنے کا بھی کوئی حق نہ تھا، یہاں تک کہ یورپ کے وہ مالک جو آجکل دنیا کے سب سے زیادہ تمدن ملک سمجھے جاتے ہیں ان میں ایسا ہی رنگ اس حد کو پہنچے ہوئے تھے کہ عورت کے انسان ہونے کو بھی تسلیم نہ کرتے تھے۔

عورت کے لئے دین و مذہب میں بھی کوئی حصہ نہ تھا نہ اس کو عبادت کے قابل سمجھا جاتا تھا نہ جنت کے، روم کی بعض مجلسوں میں باہمی مشورہ سے یہ طے کیا گیا تھا کہ وہ ایک ناپاک جانور ہے جس میں رُوح نہیں، عام طور پر باپ کے لئے لڑکی کا قتل بلکہ زندہ درگور کر دینا جائز سمجھا جاتا تھا،

بلکہ یہ عمل باپ کے لئے عزت کی نشانی اور شرافت کا معیار تصور کیا جاتا تھا، بعض لوگوں کا یہ خیال تھا کہ عورت کو کوئی بھی قتل کر دینے نہ تو اس پر قصاص واجب ہے نہ خون بہتا، اور اگر شوہر مر جائے تو بیوی کو بھی اس کی لاش کے ساتھ جلا کر سستی کر دیا جاتا تھا، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کے بعد اور آپ کی نبوت سے پہلے مششعہ میں فرانس نے عورت پر یہ احسان کیا کہ بہت سے اختلافات کے بعد یہ شرار واد پاس کی کہ عورت ہے تو انسان مگر وہ صرف مرد کی خدمت کے لئے پیدا کی گئی ہے۔ الغرض پوری دنیا اور اس میں بسنے والے تمام اقوام و مذاہب نے عورت کے ساتھ یہ برتاؤ کیا ہوا تھا کہ جس کو مرن کر بدن کے گرد گئے کھڑے ہو جاتے ہیں، اس بچاری مخلوق کے لئے نہ کہیں عقل دانٹ سے کام لیا جاتا تھا نہ عدل و انصاف سے۔

قربان جاتے رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے لئے ہونے دین حق کے جس نے دنیا کی آنکھیں کھولیں، انسان کو انسان کی قدر کرنا سکھایا، عدل و انصاف کا قانون جاری کیا، عورتوں کے حقوق مردوں پر ایسے ہی لازم کئے جیسے عورتوں پر مردوں کے حقوق ہیں، اس کو آزاد و خود مختار بنایا، وہ اپنی جان و مال کی ایسی ہی مالک شرار و دی گئی جیسے مرد کوئی شخص خواہ باپ دادا ہی ہو بالغ عورت کو کسی شخص کے ساتھ نکاح پر مجبور نہیں کر سکتا، اور اگر بلا اس کی اجازت کے نکاح کر دیا جائے تو وہ اس کی اجازت پر موقوف رہتا ہے، اگر نا منظور کر دے تو باطل ہو جاتا ہے، اس کے اموال میں کسی مرد کو بغیر اس کی رضا و اجازت کے کسی تصرف کا کوئی حق نہیں، شوہر کے مرنے یا طلاق دینے کے بعد وہ خود مختار ہے کوئی اس پر جبر نہیں کر سکتا، اپنے رشتہ داروں کی میراث میں اس کو بھی ایسا ہی حصہ ملتا ہے جیسا کہ کون کو، اس پر خرچ کرنے اور اس کے راضی رکھنے کو شریعت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام نے ایک عبادت قرار دیا، شوہر اس کے حقوق واجبہ ادا نہ کرے تو وہ اسلامی عدالت کے ذریعہ اس کو ادا، حقوق پر دردمند مطلق پر مجبور کر سکتی ہے۔

عورت کو اس کے حقوق مناسبہ نہ دینا ظلم و جور اور قساوت و شقاوت عورتوں کو مردوں کی سیادت اور نگرانی سے بالکل آزاد کر دینا بھی غلطی ہے، اسی طرح ان کو کھلے ہمارے مجبور کر دینا غلطی ہے، اور مردوں کی نگرانی و سیادت سے آزاد کر دینا، اس کو اپنے گزارے اور معاش کا خود مشغول بنانا بھی اس کی حق تلفی اور بربادی ہے نہ اس کی ساخت اس کی متعل ہے اور نہ مگر ملو کاموں کی ذمہ داری اور اولاد کی تربیت کا عظیم الشان کام جو فطرۃ اس کے سپرد ہے وہ اس کا متعل ہے۔

ملارہ از میں مردوں کی سیادت و نگرانی سے نکل کر عورت پورے انسانی معاشرہ کے لئے خطۃ عظیم ہے جس سے دنیا میں فساد و خون ریزی اور طرح طرح کے فتنے پیدا ہونا لازمی اور روزمرہ کا مشاہدہ متعل ہے۔

ہے، اس لئے قرآن کریم نے عورتوں کے حقوق و اجتہاد کے بیان کے ساتھ ساتھ یہ بھی ارشاد فرمایا کہ
وَالَّذِينَ جَاءُوا مِن بَعْدِهِمْ لَنَنصَرُهُمْ وَيَتَّخِذُونَ آلَآءَهُمْ دَارًا ۚ وَذَرْجَةٌ مِّنْهُم مَّا مَلَآَتْهُمُ الْمَنَافِقُ
یہ کہ مردان کے ننگراں اور ذمہ دار ہیں۔

مگر جس طرح اسلام سے پہلے جاہلیتِ اولیٰ میں اقوامِ عالم سب اس غلطی کا شکار تھے کہ عورتوں کو ایک گھریلو سامان یا چوپایہ کی حیثیت میں رکھا ہوا تھا، اسی طرح اسلام کے زمانہِ انحطاط میں جاہلیتِ آخری کا دور شروع ہوا، اس میں پہلی غلطی کا ردِ عمل اس کے بالمقابل دوسری غلطی کی صورت میں کیا جا رہا ہے، کہ عورتوں پر مردوں کی اتنی سیادت سے بھی چھٹکارا حاصل کرنے اور کراخ کی سب سے مسلسل جاری ہے، جس کے نتیجے میں فحش دہے حیوانی عالم ہو گئی، دنیا جھگڑوں اور فساد کا گھر بن گئی، قتل و خون ریزی کی اتنی کثرت ہو گئی کہ جاہلیتِ اولیٰ کو مات دیدی، عرب کا مشہور مقولہ کہ "أَلْبَاهِنُ أَيْتَانِ مَطْبُورَانِ أَوْ مُكْسَرَانِ" (دو بیوقوف یا دو آرمی کبھی اعتدال پر نہیں رہتا، اگر افرات یعنی حد سے زیادہ کرنے سے باز آ جاتا ہے تو کوتاہی اور تفصیر میں مبتلا ہو جاتا ہے)۔

یہی حال اس وقت امانتے زمانہ کا ہے کہ یا تو عورت کو انسان کہنے اور سمجھنے کے لئے بھی تیار نہ تھے اور آگے بڑھے تو یہاں تک پہنچے کہ مردوں کی سیادت و مگرانی جو مردوں، عورتوں اور پوری دنیا کے لئے عین حکمت و مصلحت ہے اس کا بھوا بھی مردوں سے اُٹا رہا جا رہا ہے جس کے نتائج بد فوئاد آنکھوں کے سامنے آ رہے ہیں، اور یقین کیجئے کہ جب تک وہ قرآن کے اُس ارشاد کے سامنے نہ جھکیں گے ایسے فتنے روز بڑھتے رہیں گے۔

آج کی حکومتیں دنیا میں قیام امن کے لئے روز نئے نئے قانون بناتی ہیں، اس کے لئے نئے نئے ادارے قائم کرتی ہیں، کروڑوں روپیہ اُن پر صرف ہوتا ہے، لیکن فتنے جس چٹھے سے پھوٹ رہے ہیں اس کی طرف دھیان نہیں دیتیں، اگر آج کوئی کمیشن اس تحقیق کے لئے بٹھایا جائے کہ فساد و خون ریزی اور یہاں تک کہ جنگ و جدل کے اسباب کی تحقیق کرے تو خیال یہ ہے کہ پچاس فی صد سے زائد ایسے جرائم کا سبب عورت اور اس کی بے ہوا آزادی نکلتے گی، مگر آج کی دنیا میں نفس پرستی کے غلبہ نے بڑے بڑے حکمران کی آنکھوں کو خیر کیا ہوا ہے، خواہ شائبہ نفسانی کے خلاف کسی مصلحانہ تدبیر کو گوارا نہیں کیا جاتا۔

اللہ تعالیٰ ہمارے قلوب کو نور ایمان سے منور فرمائیں اور اپنی کتاب اور اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات پر پورا عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائیں، کہ دہی دنیا و آخرت میں سرمایہ سعادت ہے۔

مسئلہ: اس آیت کے ضمن میں یہ معلوم ہوا کہ مسترکان حکیم نے زوجهین کو ان کے ذمہ عائد ہونے والے فرائض بتلائے کہ مردوں کے ذمہ عورتوں کے حقوق ادا کرنا ایسا ہی فرض ہے جیسے کہ عورتوں پر مردوں کے حقوق کا ادا کرنا فرض ہے اس میں اشارہ ہے کہ ہر فریق کو اپنے حقوق کا مطالبہ کرنے کے بجائے اپنے فرائض پر نظر رکھنا چاہئے، اور اگر وہ ایسا کر لیں تو مطالبہ حقوق کا تفسیر ہی دنیا میں نہیں آئے گا، کیونکہ مرد کے فرائض ہی عورت کے حقوق ہیں اور عورت کے فرائض ہی مرد کے حقوق ہیں، جب فرائض ادا ہو گئے تو خود بخود حقوق ادا ہو جائیں گے، آجکل دنیا کے سارے جھگڑے یہاں سے چلتے ہیں کہ ہر شخص اپنے حقوق کا مطالبہ تو سامنے رکھتا ہے مگر اپنے فرائض کی ادائیگی سے غافل ہو جاتا ہے اس کا نتیجہ مطالبہ حقوق کی جنگ ہوتی ہے جو آجکل عام طور پر حکومتوں اور عوام میں زوجهین میں، اور در سکرابلی معاملہ میں چلی ہوئی ہے، قرآن کریم کے اس اشارہ نے معاملہ کے رُخ کو یوں بدلا ہے کہ ہر شخص کو چاہئے کہ اپنے فرائض پورا کرنے کا اہتمام کرے، اور اپنے حقوق کے معاملہ میں مساومت اور عفو و درگزر سے کالے، اگر اس شترآنی تعلیم پر دنیا میں عمل ہونے لگے تو گھروں اور خانانوں کے بلکہ ملکوں اور حکومتوں کے بیشتر نزاعات ختم ہو جائیں۔

مرد و عورت میں درجہ کا فرق نہ ہو نہ ہی معاملات میں ہے، آخرت کی فضیلت میں اس کا کوئی اثر نہیں

دنیا میں نظام عالم اور انسانی فطرت اور خود عورتوں کی مصیبت کا تقاضا ہی تھا کہ مردوں کو عورتوں پر ایک قسم کی حاکمیت اور نگرانی کا ذمہ صرف حق دیا جائے بلکہ ان پر لازم کیا جائے، اسی کا بیان آیت ”وَالرِّجَالُ كُفُوًا لِلنِّسَاءِ“ میں آیا ہے، لیکن اس سے سب مردوں کا سب عورتوں سے افضل ہونا لازم نہیں آتا، کیونکہ فضیلت عند اللہ کا تمام ترمذار ایمان اور عمل صالح پر ہے، وہاں درجات کی ترقی و منزلت ایمان اور عمل کے درجات کے مطابق ہوتا ہے، اس لئے امور آخرت میں یہ ضروری نہیں کہ مردوں ہی کا درجہ عورتوں سے بلند ہے، یہ بھی ہو سکتا ہے اور حسب تصریح آیات و روایات ایسا ہو گا بھی کہ بعض عورتیں اپنی طاعت و عبادت کے ذریعہ بہت سے مردوں پر فائق ہو جائیں گی، ان کا درجہ بہت سے مردوں سے بڑھ جائے گا۔

فشرآن مجید میں احکام شرعیہ اور اعمال کی جزاء و سزا اور ثواب و عذاب کے بیان میں اگرچہ حسب تصریح قرآن کریم عورتیں اور مرد بالکل برابر ہیں اور جن احکام میں کچھ فرق ہے، ان کو مستقل طور پر وضاحت کے ساتھ بیان کر دیا گیا ہے، لیکن عام طور پر خطاب مردوں کو کیا گیا ہے، اور صیغہ مذکر کے استعمال کئے گئے ہیں، اور یہ بات صرف قرآن کریم کے ساتھ مخصوص نہیں، عام طور پر حکومتوں کے قوانین میں بھی صیغہ مذکر کے استعمال کئے جاتے ہیں، حالانکہ قانون مرد و عورت کے لئے عام ہوتا ہے۔ اس کا ایک سبب تو وہی منسوق ہے جس کا ذکر فشرآن کریم کی آیات میں مذکور ہوا ہے، کہ مردوں کو عورتوں

ہر ایک حیثیت سے تفوق حاصل ہے۔

دوسری بات شاید یہ بھی مضمحل ہو کہ مستورات کے ذکر کے لئے بھی ستر ہی بہتر ہے، لیکن قرآن کریم میں جا بجا مردوں کی طرح عورتوں کا ذکر نہ ہونے سے ان کو خیال پیدا ہوا تو اتم المؤمنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا اظہار کیا تو سورۃ احزاب کی یہ آیت نازل ہو گئی۔
 اِنَّ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ وَالْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ وَالْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ وَالْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ وَالْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ وَالْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ وَالْمُؤْمِنِيْنَ
 مردوں کے ساتھ ساتھ عورتوں کا مستقل ذکر واضح کر دیا گیا کہ طاعت و عبادت اور اس کی وجہ سے حق تعالیٰ کے قرب و رضا اور درجات جنت میں عورتوں کا درجہ مردوں سے کچھ کم نہیں، یہ روایت لسانی ہنسبر احمد اور تفسیر ابن جریر وغیرہ میں مفصل مذکور ہے۔

اور تفسیر ابن کثیر میں ایک روایت یہ ہے کہ بعض مسلمان عورتیں ازواج مطہرات کے پاس آئیں اور کہا کہ شتران کریم میں جا بجا مردوں کا تو ذکر ہے عورتوں میں سے ازواج مطہرات کا بھی مستقل ذکر ہو کر مگر عام مسلمان عورتوں کا ذکر نہیں، اس پر آیت مذکورہ نازل ہوئی۔

خلاصہ یہ ہے کہ دنیوی نظام میں عورتوں پر مردوں کا ایک گوند تفوق اور حاکمیت اعلیٰ مصلحت اور حکمت کا تقاضا ہے اور دنیا کی جزا و سزا اور درجات کا آخرت میں کوئی فرق نہیں۔

شتران کریم میں ایک دوسری جگہ بھی مضمحل اور بھی وضاحت سے اس طرح مذکور ہے۔
 مِّنْ عَمَلٍ صَالِحٍ مَّا لِحَاثِنِ
 ذَكَرُوا أَذُنًا ذَاتَ آذَانٍ
 خِيَرَةُ حَيَاتِهِمْ (۹۴: ۱۶)
 میں جو مرد و عورت نیک عمل کرے اور وہ مومن بھی ہوں تو ہم اس کو پاکیزہ زندگی عطا کریں گے۔

اس تمہید کے بعد اصل آیت کے الفاظ پر غور کیجئے، ارشاد فرمایا اَلَّذِيْنَ يَتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لِّكُلِّ مَخْرَجٍ مِّنْهُ مَخْرَجًا مِّنْ عَمَلٍ صَالِحٍ مَّا لِحَاثِنِ ذَكَرُوا أَذُنًا ذَاتَ آذَانٍ خِيَرَةُ حَيَاتِهِمْ۔
 ان کے حقوق مردوں کے ذمہ ہیں جیسے کہ ان کے ذمہ مردوں کے حقوق ہیں، اس میں عورتوں کے حقوق کا ذکر مردوں کے حقوق سے پہلے کیا جس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ مرد تو اپنی قوت اور خدا داد تفوق کی بناء پر عورت سے اپنے حقوق وصول کر رہے ہیں، مگر عورتوں کے حقوق کی ہوتی چاہئے، کہ وہ عادتاً اپنے حقوق زبردستی وصول نہیں کر سکتیں۔

دوسرا اشارہ اس میں یہ بھی ہے کہ مردوں کو عورت کے حقوق ادا کرنے میں مسابقت کرنا چاہئے، اور یہاں جو لفظ "مما" کے ساتھ دونوں کے حقوق کی مشابہت اور مساوات کا ارشاد ہے اس کا یہ مطلب تو ہو ہی نہیں سکتا کہ جس طرح کے کام مرد کرے اسی طرح کے عورت بھی، یا برعکس کیونکہ مرد و عورت میں تقسیم کار اور ہر ایک کے فرائض نقطۂ مجرا جدا ہیں، بلکہ مراد یہ ہے کہ دونوں کے حقوق کی

اور ایسی یکساں طور پر واجب ہے، اور اس میں کوتاہی اور قصور کی سزا بھی یکساں ہے۔

یہاں یہ بات بھی قابل نظر ہے کہ شتران کریم نے ایک مختصر سے جملے میں ایک عظیم الشان فرائض و فرائض کو یکساں فرمایا ہے، کیونکہ مفہوم آیت میں عورتوں کے تمام حقوق مردوں پر اور مردوں کے تمام حقوق عورتوں پر داخل اور شامل ہیں (بحر محیط) اس جملے کے آخر میں ایک لفظ بِالْعَزْمِ اور بڑھاکر آپس میں پیش آنے والے جھگڑوں کا خاتمہ فرمادیا کہ حقوق کی ادائیگی معروف طریقے پر کی جائے، کیونکہ معروف کے معنی یہ ہیں کہ جو مشرقاً بھی منکر و ناجائز نہ ہو اور عام عادات اور عروت کے لحاظ سے بھی اس میں کوئی تشدد اور زیادتی نہ ہو اس کا حاصل یہ ہوا کہ مرد و عورت کے حقوق اور ان کو ازیت سے بچانے کے معاملہ میں خالص ضابطہ پڑی کافی نہیں، بلکہ عام عرف و عادت کے اعتبار سے دیکھا جائے گا کہ اس معاملہ میں دوسرے کو کوئی ایذا یا ضرر تو نہیں پہنچتا جو چیزیں عرف و عادت کے اعتبار سے ایذا اور اضرار کی قرار دی جائیں وہ ممنوع و ناجائز ہوں گی، مثلاً بے رخی بے اتھالی یا ایسے افعال اور حرکات جن سے دوسرے کو ایذا پہنچے، یہ چیزیں قانونی دفعات میں تو نہیں آسکتیں، مگر بِالْعَزْمِ کے لفظ نے ان کا احاطہ کر لیا، اس کے بعد فرمایا الَّذِيْنَ يَتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لِّكُلِّ مَخْرَجٍ مِّنْهُ مَخْرَجًا مِّنْ عَمَلٍ صَالِحٍ مَّا لِحَاثِنِ ذَكَرُوا أَذُنًا ذَاتَ آذَانٍ
 اس کا مشہور مطلب مفہوم تو یہی ہے کہ حقوق طرفین مساوی ہونے کے باوجود حق تعالیٰ نے مرد و عورتوں پر ایک درجہ کا تفوق اور حاکمیت عطا فرمادی ہے، اور اس میں بڑی حکمتیں ہیں جس کی طرف آخر آیت کے الفاظ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ میں اشارہ فرمایا ہے، اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے اس جملے کا مطلب یہ بھی بیان فرمایا ہے کہ مردوں کو اللہ تعالیٰ نے عورتوں کے مقابلہ میں بڑا درجہ دیا ہے، اس لئے ان کو زیادہ تحمل سے کام لینا چاہئے کہ اگر عورتوں کی طرف سے ان کے حقوق میں کوئی کوتاہی ہو بھی جائے تو ان کا درجہ یہ ہے کہ یہ اس کو برداشت کریں، اور صبر سے کام لیں، اور ان کے حقوق کی ادائیگی میں کوتاہی نہ کریں (قرطبی)

اَلْطَّلَانِ مَرَّتَيْنِ فَاِمْسَاكُ بِنَعْرِ وَفَاَوْتَسْرِيْمُ بِاِحْسَانٍ وَلَا

طلاق جس سے دو بار تک اس کے بعد رکھ لینا موافق دستور کے یا چھوڑ دینا بھلے طرح سے اور نہ کو

يَجْعَلْ لِّكُمْ اَنْ تَاْخُلُوْا مِمَّا اَنْتُمْ مُّوْهِنٌ شَيْئًا اِلَّا اَنْ يَّتَخَفَا

روا نہیں کہ لیسو کچھ اپنا دیا ہوا عورتوں سے مگر جبکہ خاوند عورت دونوں ڈریں اس

اَلَا يُقِيْمَا حُدُودَ اللّٰهِ اِنْ خِفْتُمْ اَلَا يُقِيْمَا حُدُودَ اللّٰهِ

بات سے کہ قائم نہ رکھ سکیں حکم اللہ کا پھر اگر تم ڈرو اس بات کہ وہ دونوں قائم نہ کر سکیں اللہ کا حکم

فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيمَا افْتَدَتْ بِهِ تِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ فَلَا تَعْتَدُوهَا

تو کہہ گناہ نہیں دونوں پر اس میں کہ عورت بدلہ دے جو چھوٹ جاؤ یہ اللہ کی باندھی ہوئی حدیں ہیں سو ان کے متجاوز نہ ہو

وَمَنْ يَتَعَدَّ حُدُودَ اللَّهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ ۝

اور جو کوئی بڑھ چلے اللہ کی باندھی ہوئی حدوں سے سو وہی ظالم ہیں ظالم ، پھر اگر اس عورت کو طلاق دی

فَلَا تَحِلُّ لَهُ مِنْ بَعْدِ مُحْصًى تَنكِحَ زَوْجًا غَيْرَ ۚ فَإِنْ طَلَقَهَا

دو دہائی تیسری بار تو اب حلال نہیں اس کو وہ عورت اس کے بعد جب تک کہ نکاح نہ کرے کسی غرض سے اس کے سوا پھر اگر طلاق دی

فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا أَنْ يَتَرَاجَعَا إِنْ لَمْ يَأْتِ بَيِّنَاتٌ مِمَّا حُدِّدَ اللَّهُ وَ

دوسرا خاوند تو کہہ گناہ نہیں ان دونوں پر کہ باہم مل جاویں اگر خیال کریں کہ قائم رکھیں گے اللہ کا حکم اور یہ حدیں

تِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ يُبَيِّنُهَا لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ ۝

باندھی ہوئی ہیں اللہ کی بیان فرماتا ہے ان کو واسطے جاننے والوں کے

خلاصہ تفسیر

حکم نمبر ۲۵، طلاق رجعی کی تعداد

طلاق دو مرتبہ کی ہے پھر (دوسرے طلاق دینے کے بعد دوبار اختیار نہیں) خواہ (یہ کہ رجعت کر کے عورت کو) قاعدہ کے مطابق رکھ لے خواہ (یہ کہ رجعت نہ کرے، عذرت پوری ہونے سے) اور اس طرح) اچھے طریقے سے اس کو چھوڑ دے۔

حکم نمبر ۲۶، خلع

اور تیسرے طریقے سے طلاق نہیں کہ (تیسریں کو چھوڑنے کے وقت ان سے) کہہ بھی لو (اگرچہ وہ یہی) اسی (مال) میں سے (کہیں نہ ہو) جو تم نے (دی ہوئی) ان کو دیا تھا اگر (ایک صورت البتہ حلال ہے)

وہ (یہ کہ) کوئی) میاں بیوی ایسے ہوں کہ) دونوں کو خطرہ ہو کہ (دوبارہ حقوق زوجیت) وہ اللہ تعالیٰ کے قائم کردہ

ضابطوں کو قائم نہ رکھ سکیں گے سو اگر تم کو (یعنی میاں بیوی کو) یہ خطرہ ہو کہ وہ دونوں ضوابط خداوندی کو قائم نہ رکھ سکیں گے تو دونوں پر کوئی گناہ نہ ہوگا، اس حال کے لینے دینے نہیں جس کو دے کر

عورت اپنی جان چھڑاتے، (بشرطیکہ ہر سے زیادہ نہ ہو) یہ سب احکام خداوندی ضابطے ہیں، تم انچ باہر نہ نکلیں اور جو شخص خداوندی ضابطوں (کو توڑ کر) باہر نکل جائے تو ایسے لوگ اپنا ہی نقصان کرنے والے ہیں۔

حکم نمبر ۲۷، تین طلاقیں کے بعد حلال

پھر اگر (دو طلاقیں کے بعد) کوئی (تیسری) طلاق (دی) دیدے تو پھر وہ عورت اس (تیسری طلاق

دینے کے بعد اس شخص کے لئے حلال نہ ہوگی جب تک وہ اس خاوند کے سوا دوسرے شخص کے ساتھ

عذت کے بعد نکاح نہ کرے، (اور حقوق زوجیت صحبت کے ادا نہ کرے) پھر اگر یہ دوسرا خاوند اس کو طلاق دیدے اور اس کی عذت بھی گزر جائے، تو ان دونوں پر اس میں کوئی گناہ نہیں کہ

دوبارہ آپس میں نکاح کر کے بدستور پھر مل جاویں، بشرطیکہ دونوں کو اپنے اوپر یہ اعتماد ہو کہ آئندہ خاوندی ضابطہ کو قائم رکھیں گے اور یہ خاوندی ضابطے ہیں حق تعالیٰ ان کو بیان فرماتے ہیں ایسے لوگوں کے لئے جو دانشمندی ہیں۔

معارف و مسائل

طلاق و نکاح کے احکام پر سورۃ بقرہ میں بہت سی آیتوں میں آئے ہیں مگر یہ چند آیتیں جو یہاں مذکور ہیں طلاق کے معاملہ میں ہم ضابطوں کی حیثیت رکھتی ہیں ان کو سمجھنے کیلئے پہلے نکاح کی شرعی حیثیت کو جاننا ضروری ہے۔

نکاح و طلاق کی شرعی حیثیت | نکاح کی ایک حیثیت تو ایک باہمی معاملے اور معاہدے کی ہو، جیسے اور حکیمانہ نظام

بیع و شراء اور لین دین کے معاملات ہوتے ہیں، دوسری حیثیت ایک سنت اور عبادت کی ہے، اس پر تو تمام امت کا اتفاق ہے کہ نکاح عام معاملہ

و معاہدات سے بالاتر ایک حیثیت شرعی عبادت و سنت کی رکھتا ہے، اسی لئے نکاح کے منعقد ہونے کے لئے باجماع امت کچھ ایسی شرائط ضروری ہیں جو عام معاملات بیع و شراء

میں نہیں ہوتیں۔

اول تو یہ کہ ہر عورت سے اور ہر مرد سے نکاح نہیں ہو سکتا، اس میں شریعت کا ایک مستقل قانون ہے، جس کے تحت بہت سی عورتوں اور مردوں کا آپس میں نکاح نہیں ہو سکتا۔

دوسرے تمام معاملات و معاہدات کے منعقد اور مکمل ہونے کے لئے کوئی گواہی شرط نہیں، گواہی کی ضرورت اس وقت پڑتی ہے جب فریقین میں اختلاف ہو جائے، لیکن نکاح ایسا

معاملہ نہیں، یہاں اس کے منعقد ہونے کیلئے بھی گواہوں کا سامنے ہونا شرط ہے، اگر دو مرد و عورت بغیر گواہوں کے آپس میں نکاح کر لیں، اور دونوں میں کوئی فتنہ نہ ہو، لیکن اختلاف و امکان بھی نہ کر

اس وقت بھی شرعاً وہ نکاح باطل کا عدم ہے جب تک گواہوں کے سامنے دونوں کا ایجاب و قبول نہ ہو، اور سنت یہ ہے کہ نکاح اعلان عام کے ساتھ کیا جائے، اس طرح کی اور بہت سی

شرائط اور آداب ہیں، جو معاملہ نکاح کے لئے ضروری یا مستحسن ہیں۔

امام عظیم ابو حنیفہ اور بہت سے دوسرے حضرات ائمہ کے نزدیک تو نکاح میں معاملہ اور معاہدہ کی حیثیت سے زیادہ عبادت و سنت کی حیثیت غالب ہے، اور قرآن و سنت

کے شواہد اس پر قائم ہیں۔

نکاح کی اجمالی حقیقت معلوم کرنے کے بعد طلاق کو سمجھنے، طلاق کا حاصل نکاح کے

معاملے اور معاہدے کو ختم کرنا ہے، جس طرح شریعت اسلام نے نکاح کے معاملے اور معاہدے کو ایک عبادت کی حیثیت سے کر عام معاملات و معاہدات کی سطح سے بلند رکھا ہے اور بہت سی پابندیاں اس پر لگائی ہیں اسی طرح اس معاملہ کا ختم کرنا بھی عام لین دین کے معاملات کی طرح آزاد نہیں رکھا، کہ جب چاہیے جس طرح چاہے اس معاملہ کو فسخ کر دے، اور دوسرے سے معاملہ کرے، بلکہ اس کے لئے ایک خاص حکیمانہ قانون بنایا ہے، جس کا بیان آیات مذکورہ میں کیا گیا ہے اسلامی تعلیمات کا اہل رخ یہ ہے کہ نکاح کا معاملہ اور معاہدہ عمر بھر کے لئے ہو، اس کے ٹوٹنے اور ختم کرنے کی کبھی نوبت ہی نہ آئے، کیونکہ اس معاملہ کے انقطاع کا اثر صرف فریقین پر نہیں پڑتا، نسل و اولاد کی تباہی و بربادی اور بعض اوقات فائدانوں اور قبیلوں میں فساد تک کی نوبت پہنچتی ہے، اور پورا معاشرہ بڑی طرح اس سے متاثر ہوتا ہے، اسی لئے جو اسباب اور وجوہ اس معاملہ کو ٹوٹنے کا سبب بن سکتے ہیں قرآن و سنت کی تعلیمات نے ان تمام اسباب کو راہ سے ہٹانے کا پورا انتظام کیا ہے، نہ وہ جن کے ہر معاملے اور ہر حال کے لئے جو ہدایتیں قرآن و سنت میں مذکور ہیں ان سبب کا حاصل یہی ہے کہ یہ رشتہ ہمیشہ زیادہ سے زیادہ مستحکم ہوتا چلا جائے، ٹوٹنے نہ پائے، ناموافقت کی صورت میں اول انہام و تفہیم کی پھر زجر و تنبیہ کی ہدایتیں دی گئیں اور اگر بات بڑھ جائے اور اس سے بھی کام نہ چلے تو خاندان ہی کے چند افراد کو حکم اور ثالث بنا کر معاملہ طے کرنے کی تعلیم دی، آیت **مَنْكُنْكُمْ مِّنْ اٰهْلِكُمْ فَوَحَّيْهُمْ** اور ثالث ہی کے افراد کو ثالث بنانے کا ارشاد کس قدر حکیمانہ ہے، کہ اگر معاملہ خاندان سے باہر گیا تو بات بڑھ جائے اور دونوں میں زیادہ بعد پیدا ہو جائے کا خطرہ ہے۔

لیکن بعض اوقات ایسی صورتیں بھی پیش آتی ہیں کہ اصلاح حال کی تمام کوششیں ناکام ہو جاتی ہیں، اور تعلق نکاح کے مطلوبہ ثمرات حاصل ہونے کے بجائے طرفین کا آپس میں مل کر رہنا ایک عذاب بن جاتا ہے، ایسی حالت میں اس ازدواجی تعلق کا ختم کر دینا ہی طرفین کے لئے راحت اور سلامتی کی راہ ہو جاتی ہے، اس لئے شریعت اسلام نے بعض دوسرے مذاہب کی طرح یہ بھی نہیں کیا کہ رشتہ ازدواج ہر حال میں ناقابل فسخ ہی رہے، بلکہ طلاق اور فسخ نکاح کا قانون بنایا، طلاق کا اختیار تو صرف مرد کو دیا، جس میں عادتاً فکر و تدبیر اور تحمل کا مادہ عورت سے زائد ہوتا ہے، عورت کے ہاتھ میں یہ آزاد اختیار نہیں دیا، تاکہ وقتی تاثرات سے مغلوب ہو جانا جو عورت میں بہ نسبت مرد کے زیادہ ہے وہ طلاق کا سبب نہ بن جائے۔

لیکن عورت کو بھی بالکل اس حق سے محروم نہیں رکھا کہ وہ شوہر کے ظلم و ستم پہنے ہی پر مجبور ہو جائے، اس کو یہ حق دیا کہ حاکم مشرعی کی عدالت میں اپنا معاملہ پیش کر کے اور شکایات

کا ثبوت دے کر نکاح فسخ کر اسکے اطلاق حاصل کر سکے، پھر مرد کو طلاق کا آزاد اختیار تو دیا، مگر ازل تو یہ کہہ دیا کہ اس اختیار کا استعمال کرنا اللہ کے نزدیک بہت مبغض و مکروہ ہے، صرف مجبوری کی حالت میں اجازت ہے، حدیث میں ارشاد نبوی ہے:

ابغض الحلال الى الله الطلاق
یعنی حلال چیزوں میں سے مکہ زیادہ مبغض اور مکروہ اللہ کے نزدیک طلاق ہے؟

دوسری پابندی یہ لگائی کہ حالت غیظ و غضب میں یا کسی وقتی اور ہنگامی ناگواری میں اس اختیار کو استعمال نہ کریں، اسی حکمت کے ماتحت حالت حیض میں طلاق دینے کو ممنوع قرار دیا، اور حالت ہلم میں بھی جس طہر میں صحت و بہستری ہو چکی ہے، اس میں طلاق دینے کو اس بنا پر ممنوع قرار دیا کہ اس کی وجہ سے عورت کی عدت طویل ہو جائے گی، اس کو تکلیف ہوگی، ان دونوں چیزوں کے لئے قرآن کریم کا ارشاد یہ آیا **فَطَلِّقُوهُنَّ رِحْلَةَ بَعْضِكُمْ** یعنی طلاق دینا ہر تو ایسے وقت میں دو جس میں بلا وجہ عورت کی عدت طویل نہ ہو، حیض کی حالت میں طلاق ہوتی تو موجودہ حیض عدت میں شمار نہ ہوگا، اس کے بعد طہر اور پھر طہر کے بعد حیض سے عدت شمار ہوگی، اور جس طہر میں بہستری ہو چکی ہے، اس میں یہ امکان ہے کہ محل رہ گیا ہو تو عدت وضع محل تک طے مل ہو جائیگی طلاق دینے کے لئے مذکورہ وقت طہر کا مقرر کرنے میں یہ بھی حکمت ہے کہ اس انتظار کے وقفہ میں بہت ممکن ہو کہ غصہ فرد ہو، معافی تلافی ہو کر طلاق کا ارادہ ہی ختم ہو جائے۔

تیسری پابندی یہ لگائی کہ معاہدہ نکاح ٹوٹنے اور فسخ کرنے کا طریقہ بھی وہ نہیں رکھا جو عام بیع و شراء کے معاملات و معاہدات کا ہے کہ ایک مرتبہ معاہدہ فسخ کر دیا تو اسی وقت اسی منٹ میں فریقین آزاد ہو گئے، اور پہلا معاملہ بالکل ختم ہو گیا، ہر ایک کو اختیار ہو گیا کہ دوسرے سے معاہدہ کرے، بلکہ معاملہ نکاح کو قطع کرنے کے لئے ازل تو اس کے تین درجے تین طلاقوں کی صورت میں رکھے گئے، پھر اس پر عدت کی پابندی لگا دی کہ عدت پوری ہونے تک معاملہ نکاح کے بہت سے اثرات باقی رہیں گے عورت کو دوسرا نکاح حلال نہ ہوگا، مرد کے لئے بھی بعض پابندیاں باقی رہیں گی۔

چوتھی پابندی یہ لگائی کہ اگر صاف و صریح لفظوں میں ایک یا دو طلاق دی گئی ہے تو طلاق دیتے ہی نکاح نہیں ٹوٹا، بلکہ رشتہ ازدواج عدت پوری ہونے تک قائم ہے، دوسری عدت میں اگر یہ اپنی طلاق سے رجوع کرے تو نکاح سابق بحال ہو جائے گا۔

لیکن یہ رجوع کرنے کا اختیار صرف ایک یا دو طلاق تک محدود کر دیا گیا، تاکہ کوئی ظالم شوہر ایسا نہ کر سکے کہ ہمیشہ طلاق دیتا رہے، پھر رجوع کر کے اپنی قید میں رکھتا رہے، اس لئے

حکم یہ دید یا کہ اگر کسی نے تیسری طلاق بھی دیدی تو اب اس کو رجوع کرنے کا بھی اختیار نہیں بلکہ اگر دونوں راضی ہو کر آپس میں دوبارہ بھی نکاح کرنا چاہیں تو بغیر ایک مخصوص صورت کے جس کا ذکر آگے آتا ہے، دوبارہ نکاح بھی آپس میں حلال نہیں۔

آیات مذکورہ میں اسی نظام طلاق کے اہم احکام کا ذکر ہے، اب ان آیات کے الفاظ پر غور کیجئے، پہلی آیت میں اول تو ارشاد فرمایا، اِنْ طَلَّقَ مَرْءٌ مَرْءَةً یعنی طلاق دو ہی مرتبہ ہے، پھر ان دونوں مرتبہ کی طلاقوں میں یہ چمک دکھ دی کہ ان سے نکاح بالکل ختم نہیں ہوا، بلکہ عدت پوری ہونے تک مرد کو اختیار ہے کہ رجوع کر کے بیوی کو اپنے نکاح میں روک لے، یا پھر رجوع نہ کرے، عدت پوری ہونے دے، عدت پوری ہونے پر نکاح کا تعلق ختم ہو جائے گا، اسی مضمون کو ان الفاظ میں ارشاد فرمایا فَاِنْ طَلَّقَ مَرْءٌ مَرْءَةً اَوْ كَسْرَتْ يَمِيْنًا یعنی یا تو شرعی قاعدے کے مطابق رجعت کر کے بیوی کو اپنے نکاح میں روک لے، یا پھر خوب صورتی اور خوش معاملگی کے ساتھ اس کی مدت پوری ہونے دے تاکہ وہ آزاد ہو جائے۔

ابھی تیسری طلاق کا ذکر نہیں آیا، درمیان میں ایک اور مسئلہ بیان فرما دیا جو ایسے حالات میں عموماً زیر بحث آجاتا ہے، وہ یہ کہ بعض ظالم شوہر بیوی کو نہ رکھنا چاہتے ہیں، نہ اس کے حقوق کی فکر کرتے ہیں، نہ طلاق دیتے ہیں، بیوی تنگ ہوتی ہے، اس کی مجبوری سے یہ ناجائز فائدہ اٹھا کر طلاق دینے کے لئے اس سے کچھ مال کا یا کم از کم مہر کی معافی یا واپسی کا مطالبہ کرتے ہیں، قرآن کریم نے اس کو حرام قرار دیا، ارشاد فرمایا وَلَا يَحِلُّ لَكَ مِنَ امَالِهَا شَيْءٌ یعنی تمہارے لئے حلال نہیں کہ طلاق کے معاوضہ میں ان سے اپنا دیا ہوا مال اور مہر وغیرہ واپس لینا۔ البتہ ایک صورت اس سے مستثنیٰ فرمادی کہ اس میں مہر کی واپسی یا معافی جائز کر دی، وہ یہ کہ عورت بھی یہ محسوس کرے کہ طبیعتوں میں بعد و مخالفت کی وجہ سے میں شوہر کے حقوق ادا نہیں کر سکتی، اور مرد بھی یہی سمجھے تو ایسی صورت میں یہ بھی جائز ہے کہ مہر کی واپسی یا معافی کے بدلے میں طلاق دی جائے اور لی جائے۔

یہ مسئلہ ضمنی بیان فرمانے کے بعد پھر تیسری طلاق کا ذکر اس طرح فرمایا فَاِنْ طَلَّقَ مَرْءٌ مَرْءَةً ثَلَاثًا یعنی اگر اس شخص نے تیسری طلاق بھی دے ڈالی جو شوہر فاسد دیدہ نہ تھی، تو اب نکاح کا معاملہ بالکل ختم ہو گیا، اس کو رجعت کرنے کا کوئی اختیار نہ رہا، اور چونکہ اس نے شرعی حد دے سے تجاوز کیا کہ بلا وجہ تیسری طلاق دیدی تو اس کی سزا یہ ہے کہ اب اگر یہ دونوں راضی ہو کر پھر آپس میں نکاح کرنا چاہیں تو وہ بھی نہیں کر سکتے اب ان کے آپس میں دوبارہ نکاح کے لئے شرط یہ ہے کہ یہ عورت (عدت طلاق پوری کر کے)

میں دوسرے مرد سے نکاح کرے اور حقوق زوجیت ادا کر کے دوسرے شوہر کے ساتھ رہے، پھر اگر اتفاق سے وہ دوسرا شوہر بھی طلاق دیدے (یا مرجائے) تو اس کی مدت پوری کرنے کے بعد پہلے شوہر سے نکاح ہو سکتا ہے، آیت کے آخری جملے فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا اَنْ يَتَرَاجَعَا کا یہی مطلب ہے۔

میں طلاق اور اس کے یہاں مسترآن کریم کے اسلوب بیان پر غور کرنے سے یہ بات پوری وضاحت احکام کی تفصیل کے ساتھ سامنے آجاتی ہے کہ طلاق دینے کا اصل شرعی طریقہ یہی ہے کہ زیادہ سے زیادہ دو طلاق تک پہنچا جائے، تیسری طلاق تک نوبت پہنچانا مناسب نہیں، الفاظ اِنْ طَلَّقَ مَرْءٌ مَرْءَةً کے بعد تیسری طلاق کو حرج ان کے ساتھ فَاِنْ طَلَّقَهَا فرمانے میں اس کی طرف اشارہ موجود ہے، ورنہ سیدھی تعبیر یہ تھی کہ اِنْ طَلَّقَ ثَلَاثًا کہا جاتا، اس کو چھوڑ کر یہ تعبیر اختیار کرنے میں واضح اشارہ ہے کہ تیسری طلاق تک پہنچنا نہیں چاہئے، یہی وجہ ہے کہ امام مالک اور بہت سے فقہاء نے تیسری طلاق کی اجازت ہی نہیں دی وہ اس کو طلاق بدعت کہتے ہیں، اور دوسرے فقہاء نے میں طلاق کو صرف اس شرط کے ساتھ جائز قرار دیا ہے کہ الگ الگ تین طہروں میں تین طلاقیں دی جائیں، ان فقہاء کی اصطلاح میں اس کو بھی طلاق سنت کے لفظ سے تعبیر کر دیا گیا ہے، مگر اس کا یہ مطلب کسی کے نزدیک نہیں ہے کہ اس طرح تین طلاقیں دینا مسنون اور مجبوب ہے، بلکہ طلاق بدعت کے مقابلے میں اس کو طلاق سنت اس معنی سے کہہ دیا گیا کہ یہ صورت بھی بدعت میں داخل نہیں۔

قرآن و سنت کے ارشادات اور تعامل صحابہؓ و تابعین سے عدت طلاق کے متعلق جو کچھ ثابت ہوتا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ جب طلاق دینے کے سوا کوئی چارہ ہی نہیں رہے تو طلاق کا احسن طریقہ یہ ہے کہ صرف ایک طلاق حالت طہر میں دیدے جس میں مجامعت نہ کی ہو، اور یہ ایک طلاق دے کر چھوڑ دے، عدت ختم ہونے کے ساتھ رشتہ نکاح خود ٹوٹ جائے گا، اس کو فقہاء نے طلاق احسن کہا ہے، اور حضرات صحابہؓ نے اسی کو طلاق بہتر طریق قرار دیا ہے۔ ابن ابی شیبہؒ نے اپنے مصنف میں حضرت ابراہیم نخعیؒ سے نقل کیا ہے کہ صحابہ کرام طلاق دینے میں اس کو پسند کرتے تھے کہ صرف ایک طلاق دے کر چھوڑ دی جائے اور عدت طلاق تین جہن پورے ہونے دیتے جائیں تاکہ عورت آزاد ہو جائے۔

قرآن کریم کے الفاظ مذکورہ سے اس کی بھی اجازت نکلتی ہے کہ دو طلاق تک دیدی جائے

مگر مؤثران کے لفظ میں اس طرف اشارہ فرما دیا گیا ہے کہ دو طلاق بیک لفظ و بیک وقت نہ ہوں بلکہ دو طہروں میں الگ الگ ہوں، انطلاقاً خلافاً سے بھی دو طلاق کی اجازت ثابت ہو سکتی تھی، مگر مؤثران ایک ترتیب و تراخی کی طرف متنبہ ہے، جس سے مستفاد ہوتا ہے کہ دو طلاقیں ہوں تو الگ الگ ہوں، مثال سے یوں بھی کہ کوئی شخص کسی کو دو دفعہ الگ الگ دفعہ دے تو اس کو دو مرتبہ دینا نہیں کہتے، الفاظ قرآن میں دو مرتبہ دینے کا مقصد یہی ہے کہ الگ الگ طہریں دو طلاق دی جائیں (روح المعانی)

بہر حال دو طلاقوں تک قرآن حکیم کے الفاظ سے ثابت ہے، اس لئے باقائے ائمہ و فقہاء یہ طلاق سنت میں داخل ہے، یعنی بدعت نہیں، تیسری طلاق کے غیر مستحق ہونے کی طرف تو خود اسلوب قرآن میں واضح اشارہ پایا جاتا ہے، اس کے غیر مستحق ہونے میں کسی کا بھی اختلاف نہیں۔ اور حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک ارشاد سے تیسری طلاق کا مبغوض و مکروہ ہونا ثابت ہوتا ہے، امام نسائی نے بروایت محمود بن لبید نقل کیا ہے کہ:-

ان خبر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن رجل طلق امرأته ثلاثاً تطليقات جميعاً فقام غضباً ناثماً قال اي لعجب بكتاب الله وانابين اظہر کھ حق قام رجل وقال يا رسول الله الا اقله رضائي كتاب الطلاق، ص ۹۰	رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک دی کے متعلق خبر دی گئی جس نے اپنی بیوی کو ایک ساتھ تین طلاقیں دی تھیں، آپ غصہ ہو کر کھڑے ہو گئے، اور فرمایا کیا اللہ کی کتاب کیسا کھیل کیا جاتا ہے، حالانکہ میں تمہاری درمیان موجود ہوں! اتنے میں ایک آدمی کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا اے اللہ کے رسول کیا میں کو قتل کر دوں!
--	--

اس حدیث کی اسناد کو حافظ ابن تیمیہ نے صحیح علی شرط مسلم قرار دیا ہے (زاد المعاد) اور جوہر نفی میں علامہ اردوبی نے اس حدیث کی سند کو صحیح اور ابن کثیر نے اسناد جید، ابن حبشہ نے زوائد موفقیون فرمایا ہے۔

اس بنا پر حضرت امام مالکؒ اور بعض دوسرے ائمہ فقہاء نے تیسری طلاق کو مطلقاً ناجائز اور طلاق بدعت قرار دیا ہے، دوسرے ائمہ نے تین طہروں میں تین طلاقوں کو اگرچہ طلاق سنت میں داخل کہہ کر طلاق بدعت سے نکال دیا ہے، مگر اس کے غیر مستحق ہونے میں کسی کو اختلاف نہیں۔ خلاصہً یہ کہ شریعت اسلام نے جو طلاق کے تین درجے تین طلاقوں کی صورت میں رکھے ہیں اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ان تینوں درجوں کو عبور کرنا ضروری یا بہتر ہے، بلکہ منشاء

شریعت کا تو یہ ہے کہ اول تو طلاق پر اقدام ہی ایک مبغوض و مکروہ فعل ہے، اگر مجبوری اس وقت دام کی نوبت آجائے تو اس کے کم سے کم درجے یعنی ایک طلاق پر اکتفا کیا جائے اور عدت گزارنے سے قبل تو عدت ختم ہوتے ہی یہی ایک طلاق رشتہ زوجیت قطع کرنے کے لئے کافی ہو جائے گی، اور عورت آزاد ہو کر دوسرے شخص سے نکاح کر سکے گی، یہی طریقہ طلاق احسن کہلاتا ہے، اس طریقے میں یہ حکمت اور فائدہ بھی ہے کہ صریح الفاظ طلاق سے ایک طلاق دینے کی صورت میں طرفین کے لئے مصالحت کی راہیں کھلی ہیں، عدت ختم ہونے سے پہلے پہلے تو صرف طلاق سے رجوع کر لینا بقاء نکاح کے لئے کافی ہو گا، اور عدت ختم ہو جانے کے بعد اگرچہ نکاح ٹوٹ چکے گا اور عورت آزاد ہو جائے گی، مگر پھر بھی یہ گنجائش باقی رہے گی کہ اگر دونوں میں اب مصالحت ہو جائے اور باہم نکاح کرنا چاہیں تو نکاح جدید اسی وقت ہو سکتا ہے۔

لیکن اگر کوئی شخص اس طلاق احسن کے طریقے پر اکتفا نہ کرے، دوران عدت میں مزید ایک طلاق صریح اور صاف لفظوں میں دے تو اس نے قطعاً نکاح کے دو درجے طے کر لئے جس کی ضرورت نہ تھی اور ایسا کرنا شرعاً پسندیدہ بھی نہ تھا، مگر بہر حال دو درجے طے ہو گئے، مگر ان دو درجوں کے طے ہو جانے تک بھی بات وہی رہی کہ دوران عدت میں رجعت کا اختیار باقی ہو، اور عدت ختم ہو جانے کے بعد ہر اضی طرفین نکاح جدید ہو سکتا ہے، فرق صرف اتنا ہے کہ دو طلاق تک پہنچنے میں شوہر نے اپنے اختیار کی ایک کڑی اور توڑ ڈالی اور اس مرحلہ پر پہنچ گیا کہ اگر اب ایک مرتبہ بھی طلاق دیدے تو معاملہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے۔

جس شخص نے یہ دو درجے طلاق طے کر لئے اس کے لئے آگے یہ ہدایت دی گئی کہ **يَتَعَزَّوْا مِنْ اَوْتَسْرِ لِحْمِ بَيٰحْتَانِ**، اس میں بایحسان کا پتھرؤف کے لفظوں میں دو حکم بتلائے گئے، اول یہ کہ عدت کے دوران رجعت کر لینا نکاح جدید کا محتاج نہیں، بلکہ صرف اساک یعنی طلاق سے رجعت کر کے روک لینا کافی ہے، اگر ایسا کر لیا تو سابق نکاح ہی کی بنیاد پر تعلق زوجیت بحال ہو جائے گا۔

دوسرے اس میں شوہر کو یہ ہدایت دی گئی کہ اگر اس کا ارادہ اصلاح حال اور صلح و صفائی کے ساتھ زندگی گزارنے کا ہے تب تو رجعت پر اقدام کرے ورنہ چھوڑ دے کہ عدت گزار کر تعلق زوجیت ختم ہو جائے، ایسا نہ ہو کہ بغیر ارادہ اصلاح کے محض عورت کو پریشان کرنے کے لئے رجعت کرے۔

اس کے بالمقابل **اَوْتَسْرِ لِحْمِ بَيٰحْتَانِ** فرمایا، تشریح کے لئے کھول دینے اور چھوڑ دینے کے ہیں، اس سے اشارہ کر دیا کہ قطع تعلق کے لئے کسی مزید طلاق یا دوسرے کسی عمل کی

ضرورت نہیں، بغیر رجعت کے عدت ختم ہو جانا ہی تعلقات زوجیت ختم کرنے کے لئے کافی ہو۔ امام حدیث ابو داؤد نے بروایت ابو رزین اسدی نقل کیا ہے کہ اس آیت کے نزول پر ایک شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ اللہ تعالیٰ نے الطَّلَاقِ مَرَّتَيْنِ فرمایا، تیسری طلاق کا یہاں کیوں ذکر نہیں کیا؟ آپ نے فرمایا کہ تَنْسِيْ بِمَنْ يَخْتَانِ جو بعد میں مذکور ہے وہی تیسری طلاق ہے، (روح المعانی) مطلب اس کا چہرہ علماء کے نزدیک یہ ہے کہ جو کام تعلقات زوجیت کے کلی انقطاع کا تیسری طلاق سے ہوتا وہی کام اس طرزِ عمل سے ہو جاتا کہ عدت کے اندر رجعت ذکر کرے، اور جس طرح اِمْتَنَانٌ کے ساتھ بِتَعْرِؤٍ کی قید لگا کر یہ ہدایت شرعی کی کہ رجعت کر کے بیوی کو روکا جائے تو جس سلوک کے ساتھ روکا جائے، اسی طرح تَنْسِيْ بِمَنْ يَخْتَانِ کے ساتھ یہاں يَخْتَانِ کی قید لگا کر یہ ہدایت دیدی کہ طلاق ایک معاملہ کا نسخہ ہے، شریف انسان کا کام یہ ہے کہ جس طرح معاملہ اور معاہدہ خوش دلی اور حسن سلوک کے ساتھ کیا جاتا ہے، اسی طرح اگر فریغ معاہدہ کی ضرورت پیش آجائے تو اس کو بھی غصہ یا لڑائی جھگڑے کے ساتھ نہ کریں، بلکہ وہ بھی احسان و سلوک کے ساتھ کریں، کہ رخصت کے وقت مطلقہ بیوی کو کچھ تحفہ، کپڑے وغیرہ کاٹے کر رخصت کریں، جس کا ذکر قرآن کریم کی دوسری آیت میں ہے:

مَتَّحُوْنَ عَلَى الْكَوْبَةِ
وَ عَلَى الْأَعْيُنِ قَدْ رُوِيَ

اور اگر اس نے اس پر بھی ایسا نہ کیا بلکہ تیسری طلاق بھی دے ڈالی تو اب اس نے اپنے سائے اختیارات شریعت کی دی ہوئی آسانیوں کو نظر انداز کر کے بلا وجہ اور بلا ضرورت ختم کر دیے تو اب اس کی سزا یہ ہے کہ نہ رجعت ہو سکے اور نہ بغیر دوسری شادی کے آپس میں نکاح ہو سکے۔

اگر کسی نے غیر متحسن یا غیر مشروع طریقہ سے اس کا جواب عقلی اور عرفی طور پر تو یہی ہے کہ کسی فعل کا جرم و تین طلاق دیدی تو اس کا اثر کسٹ ہوگا؟ گناہ ہونا اس کے مؤثر ہونے میں کہیں بھی مانع نہیں ہوتا، قتل ناحق جرم و گناہ ہے، مگر جس کو گولی یا تلوار مار کر قتل کیا گیا ہے وہ تو قتل ہو ہی جاتا ہے اس کی موت تو اس کا انتظار نہیں کرتی کہ یہ گولی جائز طریقہ سے ماری گئی ہے یا ناجائز طریقہ سے، چوری کرنا اتقان مذاہب جرم و گناہ ہے، مگر جو مال اس طرح غائب کر دیا گیا وہ تو ہاتھ سے بھل ہی جاتا کہ اس طرح تمام معاصی اور جبرائیم کا یہی حال ہے کہ ان کا جرم و گناہ ہونا ان کے مؤثر ہونے میں مانع نہیں ہوتا۔

اس اصول کا مقتضی یہی ہے کہ شریعت کی دی ہوئی آسانیوں کو نظر انداز کرنا اور بلا وجہ

اپنے سائے اختیار طلاق کو ختم کر کے تین طلاق تک پہنچا اگرچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ناراضی کا سبب ہوا جیسا کہ سابقہ روایت میں لکھا جا چکا ہے، اور اس لئے جہور امت کے نزدیک یہ فعل غیر مستحسن اور بعض کے نزدیک ناجائز ہے، مگر ان سب باتوں کے باوجود جب کسی نے ایسا اقدام کر لیا تو اس کا وہی اثر ہونا چاہئے جو جائز طلاق کا ہوتا، یعنی تین طلاق واقع ہو جائیں، اور رجعت ہی کا اختیار نہیں، نکاح جدید کا اختیار بھی سلب ہو جائے۔

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ اس پر شاہد ہے کہ انہما بخصب کے باوجود آپ نے تینوں طلاقوں کو نافذ فرمایا، جس کے بہت سے واقعات کتب حدیث میں مذکور ہیں اور جن علماء نے اس مسئلہ پر مستقل کتابیں لکھی ہیں ان میں ان واقعات کو جمع کر دیا ہے، حال میں مولانا ابوالزہر محمد سرزاد صاحب کی کتاب عمدة الاثبات بھی اس مسئلہ پر شائع ہو گئی ہے جو بالکل کافی ہے، یہاں صرف دو تین حدیثیں نقل کی جاتی ہیں۔

محمود بن لبید کی روایت جو بحوالہ نسائی اور پر لکھی گئی ہے اس میں تین طلاقیں بیک وقت دینے پر انتہائی ناراضگی کا اظہار تو منقول ہے، یہاں تک کہ بعض صحابہ نے اس شخص کو مستوجب قتل سمجھا، مگر یہ کہیں منقول نہیں کہ آپ نے اس کی طلاق کو ایک رجعتی طلاق قرار دیکر بیوی اس کے حوالے کر دی ہو۔

بلکہ دوسری روایت جو آگے آئی ہے جس طرح اس میں اس کی تصریح موجود ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عویمر کی بیک وقت تین طلاق کو باوجود ناراضی کے نافذ فرمادیا، اسی طرح مذکورہ حدیث محمود بن لبید کے متعلق قاضی ابوبکر بن عربی نے یہ الفاظ بھی نقل کئے ہیں، کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عویمر کی تین طلاقوں کی طرح اس کی بھی تین طلاقوں کو نافذ فرمادیا تھا، ان کے الفاظ یہ ہیں:

فلم يرده النبي صلى الله عليه وسلم
بل امضاها كما في حديث عويسر
العجلاني في اللعان حيث مضى
طلاقه الثلاث ولم يرده
وتعد يمين ابن ابي طبع مصر
از عمدة الاثبات

دوسری حدیث صدیقہ عائشہؓ کی صحیح بخاری میں بالفاظ ذیل ہے:

ان رجلاً طلق امرأته ثلاثاً
~ ایک آدمی نے اپنی بیوی کو تین طلاق

تَنْزُوجًا نَظْلًا فَشَلَّ السَّيْبُ
صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَحَصَلَ
لِلْأَوَّلِ قَالَ لَاحِظِي يَذْوِقُ عَيْلَتَهَا
كَمَا ذَاقَهَا الْأَوَّلُ

صحیح بخاری، ص ۲۷۹، ج ۲
صحیح مسلم، ص ۲۶۳

دی اس عورت نے دوسری جگہ نکاح کیا
تو اس دوسرے شوہر نے بھی اسے طلاق
دی نہی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا
کیا یہ عورت پہلے شوہر کے لئے حلال ہے؟
آپ نے فرمایا نہیں جب تک کہ دوسرا
شوہر اسے بھستری کر کے لطف اندوز نہ ہوگا

جس طرح پہلے شوہر نے کیا تھا، اس وقت تک طلاق دینے سے پہلے شوہر کے لئے حلال نہیں ہوگی؟
انفاظ روایت سے ظاہر یہی ہے کہ یہ تینوں طلاق بیک وقت دی گئی تھیں، شرح حدیث
فتح الباری عمدۃ القاری قسطلانی وغیرہ میں روایت کا مفہوم یہی مترادف دیا گیا ہے کہ بیک وقت تین
طلاق دی گئیں اور حدیث میں یہ فیصلہ مذکور ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان تین طلاق کو
نافذ قرار دے کر یہ حکم دیا کہ جب تک شوہر ثانی سے بھستری اور صحبت نہ ہو جائے، تو اس کے
طلاق دینے سے شوہر اول کے لئے حلال نہیں ہوگی۔

تیسری روایت حضرت عمر بن خطابؓ کی ہے کہ انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
کے سامنے اپنی بیوی سے لعان کیا، اور اس کے بعد عرض کیا:

فَلَمَّا خَرَفَا قَالَ عَوِيذُ بْنُ بَشَّ
عَلَيْهَا يَا رَسُولَ اللَّهِ اِنْ اَمْسَكْتَا
فَطَلَقْتَا ثَلَاثًا قَبْلَ اَنْ يَأْمُرَهُ
النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ
صحیح بخاری، فتح الباری، ص ۳۰۱، ج ۲
صحیح مسلم، ص ۲۸۱

پس جب وہ دونوں لعان سے فارغ
ہو گئے تو عویذؓ نے کہا اے اللہ کے رسول میں
اس پر عبوت بولنے والا ہوں گا، اگر میں نے
اس کو اپنے پاس رکھ لیا تو عویذ رضی اللہ عنہ
نے اس کو تین طلاقیں دیدی قبل اس کے
کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم انہیں حکم دے

اور ابو ذرؓ نے اس واقعہ کو بروایت حضرت ہبل بن سعد نقل کر کے یہ الفاظ نقل کئے ہیں:

فَالْفَنُّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ
عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَكَانَ مَا صَنَعَ عِنْدَ
رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ
سَنَةً قَالَ سَعْدُ بْنُ حَفْصَةَ هَذَا
عِنْدَ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ
وَسَلَّمَ فَمَضَتْ السَّنَةُ بَعْدَ فِي

تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے لہ
فرادیا، اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم
کے سامنے جو کچھ پیش آیا وہ سنت قرار پایا
سعدؓ فرماتے ہیں اس موقع پر میں رسول
کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر تھا
پس اس کے بعد لعان کرنے والوں کے

الْمُتَلَاهِيْنَ اِنْ يَفْتَرِقْ بَيْنَهُمَا
ثُمَّ لَا يَجْعَلُ بَيْنَهُمَا اَبْنًا اَوْ ابْنًا اَوْ
ص ۲۰۱، طبع اھم المطابع

بارے میں یہ طریقہ رائج ہو گیا کہ ان کے درمیان
تفریق کر دی جائے، اور پھر وہ کبھی بھی
جمع نہ ہوں؟

اس حدیث میں پوری وضاحت کے ساتھ ثابت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے
حضرت عویذؓ کی بیک وقت تین طلاق کو تین ہی قرار دے کر نافذ فرمایا ہے۔

اور محمود بن لبید کی سابقہ روایت میں بھی ابو بکر ابن عربی کی روایت کے مطابق تین طلاقیں
کر نافذ کرنے کا ذکر موجود ہے، اور بالفرض یہ بھی نہ ہوتا تو یہ کہیں منقول نہیں کہ آپؐ نے اس کو ایک
طلاق دینی مترادف کر بیوی اس کے سپرد کر دی ہو۔

الحال مذکورہ تینوں احادیث سے یہ ثابت ہو گیا کہ اگرچہ تین طلاق بیک وقت رسول
صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک سخت ناراضی کا موجب تھیں مگر بہر حال اثر ان کا یہی ہوا کہ تینوں
طلاقیں واقع قرار دی گئیں۔

حضرت فاروق اعظمؓ کا واقعہ مذکورہ صدر تحریر سے یہ ثابت ہوا کہ بیک وقت تین طلاق کو تین قرار
اور اس پر اشکال جواب دینا خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ تھا، اگرچہ ایک
اشکال حضرت فاروق اعظمؓ کے ایک واقعہ سے پیدا ہوتا ہے، جو صحیح مسلم اور اکثر کتب حدیث
میں منقول ہے، اس کے الفاظ یہ ہیں:

عَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ كَانَ
الطَّلَاقُ عَلَى عَهْدِ رَسُولِ اللَّهِ
صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَابْنِ بَكْرٍ
وَسُنَّتَيْنِ مِنْ خِلَافَةِ عُمَرَ طَلَاقُ
الْمَثَلَاثِ وَاحِدَةٌ فَقَالَ عُمَرُ
الْعَطْلَابُ اِنَّ النَّاسَ قَلِيٌّ فَاسْتَجْلُوا
فِي امْرِكَانْتَ لِهَمَّ نَبِيَهُ اِنَّهُ خَلُو
ارَضِينَا عَلَيْهِمْ فَاَمَضَاهُ عَلَيْهِمْ

تبعث ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ:
رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں اور حضرت
ابو بکرؓ کے عہد خلافت میں اور حضرت عمرؓ کی خلافت
کے ابتدائی دو سالوں میں طلاق کا یہ طریقہ
تین طلاقیں کو ایک قرار دیا جاتا تھا تو حضرت عمرؓ
نے فرمایا کہ لوگ جلدی کرنے لگے ہیں، ایک ایسا معاملہ
میں جس میں ان کے لئے ہلکتی تھی تو مناسب رہو گا
ہم اس کو ان پر نافذ کر دیں، تو آپؓ نے ان پر نافذ کر دیا

(صحیح مسلم، ص ۳۴۰، ج ۱)

فاروق اعظمؓ کا یہ اعلان فقہاء صحابہؓ کے مشورہ سے صحابہ و تابعین کے مجمع عام میں ہوا کسی
اس پر انکار یا تردید منقول نہیں، اسی لئے حافظ حدیث امام ابن حجرؒ نے اس پر اجماع نقل کیا
ہے، ذوقانی شرح مؤلفہ میں یہ الفاظ ہیں:

والجہور علی وقوع الثلاث بل
یحکی ابن عبد البر والاجماع
قائلان خلافہ لا یلتفت الیہ
ذوقانی شرح مؤطا ص ۱۶۷ ج ۳

اور شیخ الاسلام نوویؒ نے شرح مسلم میں فرمایا:

قال الشافعی ومالك والرحمہ
واحمد وجماہیر العلماء من
السلطان والخلف یقیم الثلاث
وقال طائفة وبعض اهل الظاہ
لا یقیم بن ثلاث الا وحده۔

(شرح مسلم ص ۱۶۷ ج ۳)

امام طحاویؒ نے شرح معانی الآثار میں منسرایا:

فخطب عمر بن الخطاب
جميعا وفيهم اصحاب رسول الله
صلی الله علیہ وسلم رضی الله
عنہم الذین قد علما ما تقتضی
من ذلك فی زمن رسول الله
صلی الله علیہ وسلم فلم ینکرو علیہ
منہم منکروا لم یبدوا فحہ دافع
(شرح معانی الآثار ص ۲۸۹)

اور جہور امت میں طلاق کے واقعہ پر
پر متفق ہیں، بلکہ ابن عبد البر نے اس پر اجماع
نقل کر کے فرمایا کہ اس کا خلاف شافعی
جس کی طرف التفات نہیں کیا جائے گا۔

اہم شافعی، امام الکت، امام ابو حنیفہ،
امام احمد اور مسلم و طحاوی کے جماہر علماء
نے فرمایا کہ تین طلاقیں واقع ہوتی ہیں اور
طاؤس اور بعض اہل ظاہر نے کہا کہ اس سے
ایک ہی طلاق واقع ہوتی ہے۔

تیس حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کے
ساتھ لوگوں کو مخاطب فرمایا اور ان لوگوں
میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ
بھی تھے جن کو اس سے پہلے رسول کریم
صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کے طریقے کا
علم تھا، تو ان میں سے کسی انکار کرنے والے
نے اسے زد نہیں کیا، اور کسی زور کرنے والے

مذکورہ واقعہ میں اگرچہ امت کے لئے عمل کی راہ باجماع صحابہ و تابعین مستتر ہو گئی کہ تین
طلاقیں بیک وقت دینا اگرچہ غیر مستحسن اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ناراضی کا سبب ہے، مگر
اس کے باوجود جس نے اس غلطی کا ارتکاب کیا اس کی بیوی اس پر حرام ہو جائے گی، اور بعض
دوسرے شخص سے نکاح و طلاق کے اس کے لئے حلال نہ ہوگی۔

لیکن علی اور نظری طور پر یہاں دو سوال پیدا ہوتے ہیں، اول تو یہ کہ سابقہ تحریر میں متعدد
روایات حدیث کے حوالے سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ تین طلاق بیک وقت دینے والے پر
خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین طلاق کو نافذ فرمایا ہے، اس کو رجعت یا نکاح جسد بد کی

اجازت نہیں دی، پھر اس واقعہ میں حضرت عبداللہ ابن عباسؓ کے اس کلام کا کیا مطلب ہوگا،
کہ عہد رسالت میں اور عہد صدیقی میں اور دو سال تک عہد فاروقی میں تین طلاق کو ایک ہی مانا جاتا
تھا، فاروق اعظمؓ نے تین طلاق کا فیصلہ منسرایا؟

دوسرا سوال یہ ہے کہ اگر واقعہ اسی طرح تسلیم کر لیا جائے کہ عہد رسالت، عہد صدیقی میں
تین طلاق کو ایک مانا جاتا تھا، تو فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے اس فیصلہ کو کیسے بدل دیا، اور بالفرض
ان سے کوئی غلطی بھی ہو گئی تھی تو تمام صحابہ کرامؓ نے اس کو کیسے تسلیم کر لیا؟

ان دونوں سوالوں کے حضرات فقہاء و محدثین نے مختلف جوابات دیے ہیں، ان میں
صاف اور بے تکلف جواب وہ ہے جس کو امام نوویؒ نے شرح مسلم میں اصح کہہ کر نقل کیا ہے،
کہ فاروق اعظمؓ کا یہ منسردمان اور اس پر صحابہ کرامؓ کا اجماع طلاق ثلاث کی ایک خاص صورت
کے متعلق منسردمانا ہے، وہ یہ کہ کوئی شخص تین مرتبہ بیک وقت طلاق کہے تو طلاق بیک وقت
کہے یا میں نے طلاق دی طلاق دی طلاق دی کہے۔

یہ صورت ایسی ہے کہ اس کے معنی میں دو احتمال ہوتے ہیں، ایک یہ کہ کہنے والے
نے تین طلاق دینے کی نیت سے یہ الفاظ کہے ہوں، دوسرے یہ کہ تین مرتبہ محض تاکید کے لئے
مکر رہا ہو، تین طلاق کی نیت نہ ہو، اور یہ ظاہر ہے کہ نیت کا علم کہنے والے ہی کے اقرار سے
ہو سکتا ہے، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں صدق و دیانت عام اور غالب تھی،
اگر ایسے الفاظ کہنے کے بعد کسی نے یہ بیان کیا کہ میری نیت تین طلاق کی نہیں تھی، بلکہ محض تاکید
کے لئے یہ الفاظ مکرر ہوئے تھے تو آپ اس کے معنی بیان کی تصدیق فرمادیتے اور اس کو ایک ہی
طلاق منسردمیتے تھے۔

اس کی تصدیق حضرت رکانہ رضی اللہ عنہ کی حدیث سے ہوتی ہے، جس میں مذکور ہے کہ
انہوں نے اپنی بیوی کو لفظ البتہ کے ساتھ طلاق دیدی تھی، یہ لفظ عرب کے عرب عام میں تین
طلاق کے لئے بولا جاتا تھا، مگر تین اس کا مفہوم صریح نہیں تھا، اور حضرت رکانہؓ نے کہا کہ میری
نیت تو اس لفظ سے تین طلاق کی نہیں تھی، بلکہ ایک طلاق دینے کا قصد تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ
وسلم نے ان کو قسم دی، انہوں نے اس پر حلف کر لیا، تو آپ نے ایک ہی طلاق قرار دیدی۔

یہ حدیث ترمذی، ابوداؤد، ابن ماجہ، دارمی میں مختلف مسندوں اور مختلف الفاظ کے
ساتھ منقول ہے، بعض الفاظ میں یہ بھی ہے کہ حضرت رکانہؓ نے اپنی بیوی کو تین طلاق دیدی تھیں
مگر ابوداؤد نے ترجیح اس کو دی ہے کہ دراصل رکانہؓ نے لفظ البتہ سے طلاق دیدی تھی، یہ لفظ چونکہ
عام طور پر تین طلاق کے لئے بولا جاتا تھا، اس لئے کسی راوی نے اس کو تین طلاق سے تعبیر کر دیا ہو

بہر حال اس حدیث سے یہ بات باتفاق ثابت ہو کہ حضرت رکانہ کی طلاق کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک اُس وقت قرار دیا جب کہ انھوں نے حلفت کے ساتھ بیان دیا کہ میری نیت تین طلاق کی نہیں تھی، اس سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ انھوں نے تین طلاق کے الفاظ صریح اور صاف نہیں کہے تھے پھر تین کی نیت نہ کرنے کا کوئی احتمال ہی نہ رہتا، اُن سوال کی کوئی ضرورت نہ رہی۔ اس واقعہ نے یہ بات واضح کر دی کہ جن الفاظ میں یہ احتمال ہو کہ تین کی نیت کی ہے یا ایک ہی کی تاکید کی ہے، اُن میں آپؐ نے حلفی بیان پر ایک قرار دیدیا، کیونکہ زمانہ صدق و نیت کا تھا، اس کا احتمال بہت بعید تھا کہ کوئی شخص جھوٹی قسم کھالے۔

صدیق اکبرؓ کے عہد میں اور فاروق اعظمؓ کے ابتدائی عہد میں دس سال تک یہی طریقہ جاری رہا، پھر حضرت فاروق اعظمؓ نے اپنے زمانے میں یہ محسوس کیا کہ اب صدق و دیانت کا معیار ٹھٹھ رہا ہے، اور آئندہ حدیث کی پیشین گوئی کے مطابق اور گھٹ جائے گا، دوسری طرف ایسے واقعات کی کثرت ہو گئی کہ تین مرتبہ الفاظ طلاق کہنے والے اپنی نیت صرف ایک طلاق کی بیان کرنے لگے تو یہ محسوس کیا گیا کہ اگر آئندہ اسی طرح طلاق دینے والے کے بیان نیت کی تصدیق کر کے ایک طلاق قرار دی جاتی رہی تو بعید نہیں کہ لوگ شریعت کی دی ہوئی اس سہولت کو بے جا استعمال کرنے لگیں، اور بیوی کو واپس لینے کے لئے جھوٹ کہہ دیں کہ نیت ایک ہی کی تھی، فاروق اعظمؓ کی فراست اور انتظام دین میں دور بینی کو بھی صحابہؓ نے درست سمجھ کر اتفاق کیا، یہ حضرات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مزاج مشناس تھے، انھوں نے سمجھا کہ اگر ہمارے اس دور میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم موجود ہوتے تو یقیناً وہ بھی اب لوگوں کی مخفی نیت اور صاحب معاملہ کے بیان پر مدار رکھ کر فیصلہ نہ فرماتے، اس لئے قانون یہ بنادیا کہ اب جو شخص تین مرتبہ لفظ طلاق کا تکرار کرے گا اس کی تین ہی طلاقیں قرار دی جائیں گی اس کی یہ بات نہ سنی جائے گی کہ اس نے نیت صرف ایک طلاق کی کی تھی۔

حضرت فاروق اعظمؓ کے مذکورہ صدر واقعہ میں جو الفاظ منقول ہیں وہ بھی اسی مضمون کی شہادت دیتے ہیں، انھوں نے فرمایا:

ان الناس قد استعجلوا فی
امور کانت لهم فیہ اناة فلو
امضینا علیہم

لوگ جلدی کرنے لگے ہیں ایک ایسے
مسئلہ میں جن میں اُن کے لئے ہلکت تھی،
تو مناسب بیگا کہ ہم اس کو ان پر نافذ کر دیں

حضرت فاروق اعظمؓ کے اس فرمان اور اس پر صحابہ کرامؓ کے اجماع کی یہ توجیہ جو بیان کی گئی ہے اس کی تصدیق روایات حدیث سے بھی ہوتی ہے، اور اس سے ان دونوں سوالوں

کا خود بخود حل نکل آتا ہے کہ روایات حدیث میں خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے تین طلاق کو تین ہی سترار دے کر نافذ کرنا متعدد واقعات سے ثابت ہے، تو حضرت ابن عباسؓ کا یہ فرمانا کیسے صحیح ہو سکتا ہے کہ عہد رسالت میں تین کو ایک ہی مانا جاتا تھا، کیونکہ معلوم ہوا کہ ایسی طلاق جو تین کے لفظ سے دی گئی یا تکرار طلاق تین کی نیت سے کیا گیا اس میں عہد رسالت میں بھی تین ہی سترار دی جاتی تھیں، ایک قرار دینے کا تعلق ایسی طلاق سے ہے جس میں ثلاث کی تصریح نہ ہو یا تین طلاق دینے کا سترار نہ ہو، بلکہ تین بطور تاکید کے کہنے کا دعویٰ ہو۔

اور یہ سوال بھی ختم ہو جاتا ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تین کو ایک قرار دیا تو فاروق اعظمؓ نے اس کی مخالفت کیوں کی، اور صحابہ کرامؓ نے اس سے اتفاق کیسے کر لیا، کیونکہ اس صورت میں فاروق اعظمؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دی ہوئی سہولت کے بے جا استعمال سے روکا ہے، معاذ اللہ آپؐ کے کسی فیصلہ کے خلاف کیا یہاں کوئی شائبہ نہیں۔

اس طرح تمام اشکالات رفع ہو گئے، واللہ، اس جگہ مسئلہ طلاق ثلاث کی مکمل بحث اور اس کی تفصیلات کا احاطہ مقصود نہیں، وہ شرح حدیث میں بہت مفصل ہے، اور بہت سے علماء نے اس کو مفصل رسالوں میں بھی واضح کر دیا ہے، سمجھنے کے لئے اتنا بھی کافی ہے، واللہ المؤمنین

وَإِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَلْيُغْنِ أَجَلُهُنَّ فَامْسِكُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ أَوْ

اور جب طلاق دی تھیں تو عورتوں کو پھر پہنچیں اپنی مدت کو تو رکھ لو ان کو عرفانی دستور کے یا

سَرَّحُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ وَلَا تُمْسِكُوهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوا وَمَنْ

چھوڑ دو ان کو مکمل طرح سے اور نہ روکے رکھو ان کو ستانے کیلئے تاکہ اُن پر زیارت نہ کرو اور جو ایسا

يَفْعَلْ ذَلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهُ لَا تَخِذْ أُولَٰئِكَ آيَاتِ اللَّهِ هُزُوا

کر کچھ نہ بیشک اپنا ہی نقصان کرے گا، اور مت ٹھہراؤ اللہ کے احکام کو ہنس

وَأَذْكُرُوا نِعْمَتَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَمَا أَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِنَ الْكِتَابِ

اور یاد کرو اللہ کا احسان جو تم پر ہے اور اس کو جو کتابی حکم پر کتاب اور

وَالْحِكْمَةِ يَعِظُكُمْ بِهِ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ بِكُلِّ شَيْءٍ

علم کی باتیں کرتا ہے اور اس کے ساتھ اور ڈرتے رہو اللہ سب کچھ

بہر حال اس حدیث سے یہ بات باتفاق ثابت ہو کہ حضرت رکائش کی طلاق کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک اُس وقت قرار دیا جب کہ انھوں نے حلفت کے ساتھ بیان دیا کہ میری نیت تین طلاق کی نہیں تھی، اس سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ انھوں نے تین طلاق کے الفاظ صریح اور صاف نہیں کہے تھے پھر تین کی نیت نہ کرنے کا کوئی احتمال ہی نہ رہتا، اُن سوال کی کوئی ضرورت نہ رہی۔ اس واقعہ نے یہ بات واضح کر دی کہ جن الفاظ میں یہ احتمال ہو کہ تین کی نیت کی ہے یا ایک ہی کی تاکید کی ہے، اُن میں آپؐ نے حلفی بیان پر ایک قرار دیدیا، کیونکہ زمانہ صدق و نیت کا تھا، اس کا احتمال بہت بعید تھا کہ کوئی شخص جھوٹی قسم کھالے۔

صدیق اکبرؓ کے عہد میں اور فاروق اعظمؓ کے ابتدائی عہد میں دس سال تک یہی طریقہ جاری رہا، پھر حضرت فاروق اعظمؓ نے اپنے زمانے میں یہ محسوس کیا کہ اب صدق و دیانت کا معیار ٹھٹھ رہا ہے، اور آئندہ حدیث کی پیشین گوئی کے مطابق اور گھٹ جائے گا، دوسری طرف ایسے واقعات کی کثرت ہو گئی کہ تین مرتبہ الفاظ طلاق کہنے والے اپنی نیت صرف ایک طلاق کی بیان کرنے لگے تو یہ محسوس کیا گیا کہ اگر آئندہ اسی طرح طلاق دینے والے کے بیان نیت کی تصدیق کر کے ایک طلاق قرار دی جاتی رہی تو بعید نہیں کہ لوگ شریعت کی دی ہوئی اس سہولت کو بے جا استعمال کرنے لگیں، اور بیوی کو واپس لینے کے لئے جھوٹ کہہ دیں کہ نیت ایک ہی کی تھی، فاروق اعظمؓ کی فراست اور انتظام دین میں دور بینی کو بھی صحابہؓ نے درست سمجھ کر اتفاق کیا، یہ حضرات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مزاج مشناس تھے، انھوں نے سمجھا کہ اگر ہمارے اس دور میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم موجود ہوتے تو یقیناً وہ بھی اب لوگوں کی مخفی نیت اور صاحب معاملہ کے بیان پر مدار رکھ کر فیصلہ نہ فرماتے، اس لئے قانون یہ بنادیا کہ اب جو شخص تین مرتبہ لفظ طلاق کا تکرار کرے گا اس کی تین ہی طلاقیں قرار دی جائیں گی اس کی یہ بات نہ سنی جائے گی کہ اس نے نیت صرف ایک طلاق کی کی تھی۔

حضرت فاروق اعظمؓ کے مذکورہ صدر واقعہ میں جو الفاظ منقول ہیں وہ بھی اسی مضمون کی شہادت دیتے ہیں، انھوں نے فرمایا:

ان الناس قد استعجلوا فی
امور کانت لهم فیہ اناة فلو
امضینا علیہم

”لوگ جلدی کرنے لگے ہیں ایک ایسے
مسائل میں جن میں اُن کے لئے ہلکت تھی،
تو مناسب بیگا کہ ہم اس کو ان پر نافذ کر دیں“

حضرت فاروق اعظمؓ کے اس فرمان اور اس پر صحابہ کرامؓ کے اجماع کی یہ توجیہ جو بیان کی گئی ہے اس کی تصدیق روایات حدیث سے بھی ہوتی ہے، اور اس سے ان دونوں سوالوں

کا خود بخود حل نکل آتا ہے کہ روایات حدیث میں خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے تین طلاق کو تین ہی سترار دے کر نافذ کرنا متعدد واقعات سے ثابت ہے، تو حضرت ابن عباسؓ کا یہ فرمانا کیسے صحیح ہو سکتا ہے کہ عہد رسالت میں تین کو ایک ہی مانا جاتا تھا، کیونکہ معلوم ہوا کہ ایسی طلاق جو تین کے لفظ سے دی گئی یا تکرار طلاق تین کی نیت سے کیا گیا اس میں عہد رسالت میں بھی تین ہی سترار دی جاتی تھیں، ایک قرار دینے کا تعلق ایسی طلاق سے ہے جس میں ثلاث کی تصریح نہ ہو یا تین طلاق دینے کا سترار نہ ہو، بلکہ تین بطور تاکید کے کہنے کا دعویٰ ہو۔

اور یہ سوال بھی ختم ہو جاتا ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تین کو ایک قرار دیا تو فاروق اعظمؓ نے اس کی مخالفت کیوں کی، اور صحابہ کرامؓ نے اس سے اتفاق کیسے کر لیا، کیونکہ اس صورت میں فاروق اعظمؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دی ہوئی سہولت کے بے جا استعمال سے روکا ہے، معاذ اللہ آپؐ کے کسی فیصلہ کے خلاف کیا یہاں کوئی شائبہ نہیں۔

اس طرح تمام اشکالات رفع ہو گئے، واللہ، اس جگہ مسئلہ طلاق ثلاث کی مکمل بحث اور اس کی تفصیلات کا احاطہ مقصود نہیں، وہ شرح حدیث میں بہت مفصل ہے، اور بہت سے علماء نے اس کو مفصل رسالوں میں بھی واضح کر دیا ہے، سمجھنے کے لئے اتنا بھی کافی ہے، واللہ الموفق والاعین

وَإِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَلْيُغْنِ أَجَلُهُنَّ فَامْسِكُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ أَوْ

اور جب طلاق دی تھیں تو عورتوں کو پھر پہنچیں اپنی مدت کو تو رکھ لو ان کو عرفانی دستور کے یا

سَرِّحُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ وَلَا تُمْسِكُوهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوا وَمَنْ

چھوڑ دو ان کو مکمل طرح سے اور نہ روکے رکھو ان کو ستانے کیلئے تاکہ اُن پر زیارت کرو اور جو ایسا

يَفْعَلْ ذَلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهُ لَا تَخِذْ وَايَاتِ اللَّهِ هُزُوًا

کر کچھ نہ بیشک اپنا ہی نقصان کرے گا، اور مت ٹھہراؤ اللہ کے احکام کو ہنس

وَأَذْكُرُوا نِعْمَتَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَمَا أَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِنَ الْكِتَابِ

اور یاد کرو اللہ کا احسان جو تم پر ہے اور اس کو جو کتابی حکم پر کتاب اور

وَالْحِكْمَةَ يَعْلَمُكُمْ بِهِ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ بِكُلِّ شَيْءٍ

علم کی باتیں کہ تم کو نصیحت کرتا اس کے ساتھ اور ڈرتے رہو اللہ سب کچھ

عَلَيْكُمْ ۖ وَإِذَا طَلَقْتُمُ النِّسَاءَ فَلْيُكُنْ أَجَلُهُنَّ فَلَا تَعْصِمُوهُنَّ
أَنْ يَتَّكِنَنَّ أَرْوَاجَهُنَّ إِذَا تَرَاضُوا بَيْنَهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ ۚ ذَٰلِكَ

جانتا ہے، اور جب طلاق دی تم نے عورتوں کو پھر پورا کر چکیں اپنی عدت کو تو اب نہ روکوان کو

اِس سے کہ نکاح کر لیں اپنے اپنی خاوندوں سے جبکہ راضی ہو جاویں آپس میں موافق دستور کے یہ نصیحت

یُوَعِّظُ بِهِ مَنْ كَانَ مِنْكُمْ يَوْمَئِذٍ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ۚ ذَٰلِكُمْ أَزْكٰی

اس کو کہ جاتی ہے جو کہ تم میں سے ایمان رکھتا ہے اللہ پر اور قیامت کے دن پر اس میں تمہارا مال

لَكُمْ وَأَطْهَرُ ۗ وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ ۝

بڑی سخنراں اور بہت پاکیزگی اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔

خلاصہ تفسیر

حکم نمبر ۲۸، عورتوں اور جب تم نے عورتوں کو طلاق دی ہو، پھر وہ اپنی عدت گزرنے کے قریب پہنچ جائیں تو تم

کو مطلق رکھنے کی ممانعت ان کو قاعدہ کے موافق (رجعت کر کے) نکاح میں رہنے دو، یا قاعدہ کے موافق ان کو

رہائی دو، اور ان کو تکلیف پہنچانے کی غرض سے مت روکو اس ارادہ سے کہ ان پر ظلم کیا جائے، اور جو شخص یہاں

برتاؤ کرے گا تو وہ اپنا ہی نقصان کرے گا، اور حق تعالیٰ کے احکام کو کھیل نہ بناؤ، اور حق تعالیٰ کی جرم پر عین بیان

کریا دکر، اور خصوصاً کتاب و حکمت کی باتوں کو جو اثر تعالیٰ نے تم پر (اس حیثیت سے) نازل فرمائی ہے کہ ان کے

ذریعے تم کو نصیحت فرماتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو، اور یقین رکھو کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کو خوب جانتے ہیں۔

حکم نمبر ۲۹، عورتوں کو نکاح ثانی اور جب تم اپنی عورتوں کو طلاق دیدو اور عورتیں اپنی میعادِ عدت پوری کر چکیں

سے منع کرنے کی ممانعت تو تم ان کو اس امر سے مت روکو کہ وہ اپنے (تجزیہ کئے ہوئے) شرموں سے علاج

کر لیں جبکہ باہم سب رضا مند ہو جائیں قاعدہ کے موافق، اس ضمن سے نصیحت کی جاتی ہے اس شخص کو جو تم میں سے

اللہ تعالیٰ اور روزِ قیامت پر یقین رکھتا ہو، اس نصیحت کا قبول کرنا تمہارے لئے زیادہ صلاحی اور زیادہ پاکی کی

بات ہے، اور اللہ تعالیٰ (تمہاری مصلحتوں کو) جانتے ہیں تم نہیں جانتے۔

معارف و مسائل

ان سے پہلے بھی وہ آیتوں میں قانونِ طلاق کی اہم دفعات اور اسلام میں طلاق کا عادلانہ اور معتدلانہ

نظام قرآن کریم کے حکیمانہ اسلوب کے ساتھ بیان فرمایا گیا ہے، اب مذکورہ اصول و آیتوں میں چند احکام و مسائل مذکور ہیں۔

احکام طلاق کے بعد رجعت یا انقطاع پہلی آیت میں پہلا مسئلہ یہ ارشاد ہوا ہے کہ جب مطلقہ رجعی

نکاح دونوں کے لئے خاص برائست عورتوں کی عدت گزرنے کے قریب آئے تو شوہر کو دو اختیار

مائل ہیں، ایک یہ کہ رجعت کر کے اس کو اپنے نکاح میں رہنے دے، دوسرے یہ کہ رجعت نہ

کرے، اور تعلقِ نکاح ختم کر کے اس کو بالکل آزاد کر دے۔

لیکن دونوں اختیاراتوں کے ساتھ قرآن کریم نے یہ قید لگائی کہ رکھنا ہو تو قاعدہ کے

مطابق رکھا جائے، اور چھوڑنا ہو تب بھی شرعی قاعدے کے مطابق چھوڑا جائے، اس میں

پاکتصرّف و حق کا لفظ دونوں جگہ ملجھ ملجھ لاکر اس کی طرف اشارہ فرما دیا ہے کہ رجعت کے

لئے بھی کچھ شرائط اور قواعد ہیں اور آزاد کرنے کے لئے بھی، دونوں حالتوں میں سے جس کو بھی

اختیار کرے شرعی قاعدے کے موافق کرے، بعض وقتی غصے یا جذبات کے ماتحت نہ کرے اور

عورتوں کے شرعی قواعد کا کچھ حصہ تو خود شراکین میں بیان کر دیا گیا ہے، باقی تفصیلات رسولِ کریم

صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمائی ہیں۔

مثلاً اگر واقعہ طلاق کے بعد مفارقت کے ناگوار احوال کا خیال کر کے رائے یہ ہو جائے

کہ رجعت کر کے نکاح قائم رکھنا ہے تو اس کے لئے شریعت کا قاعدہ یہ ہے کہ پہلے خصہ ناراضی

کو دل سے نکال کر خجّین معاشرت کے ساتھ زندگی گزارنا اور حقوق کی ادائیگی کا خیال رکھنا

پیش نظر ہو، عورت کو اپنی قید میں رکھ کر مستانہ اور تکلیف پہنچانا مقصود نہ ہو، اسی کے لئے آیت

مذکورہ میں یہ الفاظ ارشاد فرمائے گئے، وَلَا تَمْسِكُوهُنَّ جِسْرًا ۚ وَإِنْ تَحْسَبَنَّ لَهُنَّ عِدَّةً

نکاح میں اس لئے نہ روکو کہ ان پر ظلم کرو۔

دوسرا قاعدہ رجعت کا یہ ہے جو سورۃ طلاق میں ذکر کیا گیا ہے، وَأَشْهَدُ وَأَذْهَبُ

عَنْكِ وَتَنْتَكِمُ وَأَقِيمُوا الشَّهَادَةَ بِلَهُ (۲۱۶:۲) اور آپس میں سے دو معتبر شخصوں کو گواہ کرنا، پھر اگر

گواہی کی حاجت پڑے تو ٹھیک ٹھیک اللہ کے واسطے بلا دروغی گواہی دو۔

مطلب یہ ہے کہ جب رجعت کا ارادہ کرو تو اس پر دو معتبر مسلمانوں کو گواہ بنا لو، اس

میں کوئی قاعدہ نہیں، ایک یہ کہ اگر عورت کی طرف سے رجعت کے خلاف کوئی دعویٰ ہو تو اس

گواہی سے کام لیا جائے۔

دوسرے خود انسان کو اپنے نفس پر بھی بھروسہ نہیں کرنا چاہئے، اگر رجعت پر شہادت

کا قاعدہ نہ جاری کیا جاتے تو ہو سکتا ہے کہ کوئی شخص عدت پوری گذر جانے کے بعد بھی اپنی

غرض یا شیطانی اغواء سے یہ دعویٰ کر بیٹھے کہ میں نے عدت گزرنے سے پہلے رجعت کر لی تھی۔

ان مفاسد کے انسداد کے لئے قرآن نے یہ قاعدہ مقرر فرما دیا کہ رجعت کرو تو اس پر

وہ معتبر گواہ بنائو۔

معاملہ کا دوسرا رخ یہ تھا کہ عذمت کی ہلاکت اور غور و فکر کا وقت ملنے کے باوجود دونوں کا انقباض اور ناراضی ختم نہ ہوئی اور قلعہ تعلق ہی برقرار رکھنا، تو اس صورت میں بہت اندیشہ ہوتا ہو کہ دشمنی اور انتقامی ہڈی بھرک اٹھیں، جن کا اثر دشمنوں سے منہ دی ہو کر دو خاندانوں تک پہنچ سکتا ہو، اور نظریں کی دنیا و آخرت کے لئے خطرہ بن سکتا ہے، اس کے انسداد کے لئے مختصر طور پر تو یہی ارشاد فرمایا گیا کہ **اَوْ مَنِّيْ خَوْفٌ مِّنْهُنَّ يَمْخَرُ عَنْ قُلُوبٍ** یعنی چھوڑنا اور قلعہ کرنا ہی ہو تو وہ بھی قاعدے کے موافق کریں اس قاعدہ کی کچھ تفصیلات خود مشرآن کریم میں مذکور ہیں، باقی تفصیلات رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قولی اور عملی بیان سے ثابت ہیں۔

مثلاً اس سے پہلی آیت میں ارشاد فرمایا، **وَلَا يَجْعَلُ كَعُقْبِ اَنْتُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا بِمَنْ اَتَاكُمْ مِنْكُمْ** یعنی بلا کسی عذر شرعی کے ایسا نہ کرو کہ عورت سے طلاق کے معاوضہ میں اپنا دیا ہو اسامان یا مہر واپس لے لو، یا کچھ اور معاوضہ طلب کرو۔

اور اس کے بعد ایک آیت میں ارشاد فرمایا **وَلَا تَجْعَلُوْا مِمَّا جَاءَ بِالنِّسَاءِ كَوْنٍ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ** (۲۳۲) سب طلاق دی ہوئی عورتوں کے لئے کچھ فائدہ پہنچانا قاعدہ کے موافق مقرر ہوا ہے، ان پر جو اللہ سے ڈرتے ہیں، فائدہ پہنچانے کی تفسیر و رخصت کے وقت مطلقہ عورت کو کچھ نقد یا کم از کم ایک جوڑا کپڑے کا دینا ہے، اس میں طلاق دینے والے شوہر پر مطلقہ بی بی کے کچھ حقوق واجب و لازم کر کے اور کچھ بطور احسان و سلوک کے عائد کر دیئے گئے ہیں، جو بلند اخلاقی اور محسن معاشرت کی پاکیزہ تعلیم ہے، اور جس میں اس طرف ہدایت ہے کہ جس طرح نکاح ایک معاملہ اور باہمی معاہدہ تھا اسی طرح طلاق بھی ایک معاملہ کا ختم کرنا ہے، اس فیج معاملہ کو دشمنی اور جنگ و جدل کا سامان بنانے کی کوئی وجہ نہیں، معاملہ کا انقطاع بھی خوب صورتی اور حسن سلوک کے ساتھ ہونا چاہئے اگر طلاق کے بعد مطلقہ بی بی کو فائدہ پہنچایا جائے۔

اس فائدہ کی تفصیل یہ ہے کہ ایام عدت میں اس کو اپنے گھر میں رہنے دے، اس کا پورا خرچ برداشت کرے، اگر مہر اب تک نہیں دیا ہے اور خلوت ہو چکی تو پورا مہر ادا کرے، اور خلوت سے پہلے ہی طلاق کا واقعہ پیش آگیا ہے تو آدھا ہر خوش دلی کے ساتھ ادا کرے، یہ تو سب صحیح و واجب ہیں جو طلاق دینے والے کو لازمی طور پر ادا کرنا ہیں، اور مستحب اور افضل یہ بھی ہے کہ مطلقہ بی بی کو رخصت کرنے کے وقت کچھ نقد یا کم از کم ایک جوڑا دیئے کر رخصت کیا جائے، سبحان اللہ کیا پاکیزہ تعلیم ہے کہ جو چیسریز عرفاً جنگ و جدل اور لڑائی جھگڑے کے اسباب اور خاندانوں کی تباہی تک پہنچانے والی ہیں ان کو دائمی محبت و مسرت میں تبدیل کر دیا گیا۔

ان سب احکام کے بعد ارشاد فرمایا **وَمَنْ يَفْعَلْ فَاُولَٰئِكَ يَفْعَلْ تَلَاٰ تَلَاٰ** یعنی جو شخص ان حدود و خداوندی کے خلاف کرے گا وہ اپنا ہی نقصان کرے گا، آخرت میں تو ظاہر ہے کہ وہاں ہر ظلم و جور کا انتقام بارگاہ خداوندی میں لیا جائے گا، اور جب تک مظلوم کا بدلہ ظالم سے نہ لے لیا جائے گا آگے نہ بڑھے گا۔

اور دنیا میں بھی اگر بصیرت اور تجربہ کے ساتھ غور کیا جائے تو نظر آئے گا کوئی ظالم بظاہر تو مظلوم پر ظلم کر کے اپنا دل ٹھنڈا کر لیتا ہے، لیکن اس کے نتائج بدایں دنیا میں بھی اس کو اکثر ذلیل و خوار کرتے ہیں اور وہ سمجھے یا نہ سمجھے اکثر ایسی آفتوں میں مبتلا ہوتا ہے کہ ظلم کا نتیجہ اس کو دنیا میں بھی کچھ نہ کچھ چھکنا پڑتا ہے، اسی کو شیخ سعدی علیہ الرحمۃ نے فرمایا ہے

پنداشت بستمگر کہ جفا بر ما کرد

بر گردن دے بماند و بر ما بگذشت

مشرآن کریم کا اسلوب حکیم اور خاص انداز بیان ہے، کہ وہ قانون کو دنیا کے قوانین تعزیرات کی طرح بیان نہیں کرتا، بلکہ مرتبہ انداز میں قانون کا بیان اس کی حکمت و مصلحت کی وضاحت اس کے خلاف کرنے میں انسان کی مضرت و نقصان کا ایسا سلسلہ بیان کرتا کہ جس کو دیکھ کر کوئی انسان جو انسانیت کے جامے سے باہر ہو ان جرائم پر اقدام کر ہی نہیں سکتا، ہر قانون کے پیچھے خدا کا خوف آخرت کا حساب لایا جاتا ہے۔

نکاح و طلاق کو کھیل نہ بناؤ [دوسرا مسئلہ اس آیت میں یہ ارشاد فرمایا گیا کہ اللہ تعالیٰ کی آیات کو کھیل نہ بناؤ، **وَلَا تَجْعَلُوْا اٰیَاتِ اللّٰهِ هُكُوًا**، کھیل بنانے کی ایک تفسیر تو یہ ہے کہ نکاح و طلاق کے لئے اللہ تعالیٰ نے جو حدود و شروط مقرر کر دیئے ہیں ان کی خلاف ورزی کرنا، اور دوسری تفسیر حضرت ابوالدرداءؓ سے منقول ہے وہ یہ ہے کہ زمانہ جاہلیت میں بعض لوگ طلاق دے کر یا غلام آزاد کر کے منکر جاتے اور کہتے تھے کہ میں نے تو ہنسی مذاق میں کہہ دیا تھا، طلاق یا عتاق کی نیت نہیں تھی، اس پر یہ آیت نازل ہوئی، جس نے یہ فیصلہ کر دیا کہ طلاق و نکاح کو اگر کسی نے کھیل یا مذاق میں بھی پورا کر دیا تو وہ نافذ ہو جائے گا نیت نہ کرنے کا عذر مسموع نہ ہوگا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ تین چیزیں ایسی ہیں جن میں ہنسی کے طور پر کرنا اور واقعی طور پر کرنا دونوں برابر ہیں، ایک طلاق، دوسرے عتاق، تیسرے نکاح راخرجہ ابن مردویہ عن ابن عباسؓ وابن المنذر عن عبادۃ بن الصامتؓ۔

اور حضرت ابو ہریرہؓ سے اس حدیث میں یہ الفاظ منقول ہیں،

ثلاث جن جن جد وھزلھن جل
النکاح والطلاق والرجعة

تین تین چیزیں ایسی ہیں جن کو قصد و ارادہ سے کہنا اور ہنسی مذاق کے طور پر کہنا ہرگز ایک نکاح دوسرے طلاق تیسری رجعت کو ظہری

ان تینوں چیزوں میں حکم شرعی یہ ہے کہ دہر و دعورت اگر بلا قصد نکاح ہنسی ہنسی میں گواہوں کے سامنے نکاح کا ايجاب و قبول کر لیں تو بھی نکاح منعقد ہو جاتا ہے، اسی طرح اگر بلا قصد ہنسی ہنسی میں صریح طور پر طلاق دیدے تو طلاق ہو جاتی ہے، یا رجعت کرے تو رجعت ہو جاتی ہے، ایسے ہی کسی غلام کو ہنسی میں آزاد کرنے کو کہہ دے تو غلام باندی آزاد ہو جاتے ہیں، ہنسی طلاق کوئی عذر نہیں مانا جاتا۔

اس حکم کے بیان کے بعد پھر قرآن کریم نے اپنے مخصوص انداز میں انسان کی حق تعالیٰ کی اطاعت اور آخرت کے خوف کا سبق دیا، ارشاد فرمایا: وَإِذَا كُنْزُ الْبُعْثَةِ لَكُمْ عَلَى كُمْ وَمَا أَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِنَ الْكِتَابِ الْحِكْمَةَ تَعْلَمُونَ بِهَا وَأَقْفُوا اللَّهَ وَأَعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ يُخْلِشُ لَكُمْ شَيْءًا عَلَيْهِمْ تَبَيَّنَ أَنَّ اللَّهَ لَمَّا أَنْزَلَ الْكِتَابَ لَكُمْ لَعْنَتُكُمْ وَكَانَ مِنْ لَعْنَتِكُمْ أَنْ تَكُونُوا مِنَ الَّذِينَ يَكُونُونَ وَرَدَّ الْكِتَابُ إِلَى اللَّهِ عَالِي هَرَجٍ كَوْنُ خُوبٍ جَانِئٍ فِيں اتمھاری نیتوں اور ارادوں اور دلوں میں چھپے ہوئے بھیدوں سے باخبر ہیں، اس لئے اگر بیوی کو طلاق دے کر آزاد ہی کرنا ہو تو باہمی نزاع اور ایک دوسرے کی حق تلفی اور ظلم سے بچنے بچانے کی نیت سے کرو، غصہ کے انتقام یا بیوی کو ذلیل و سوا کرنے یا مصلحت پہنچانے کی نیت سے نہ کرو۔

طلاق میں اصل یہی ہرگز مرتبہ عیسر مسئلہ جس کی طرف اس آیت میں اشارہ کیا گیا یہ ہے کہ شریعت اور حقیقی طلاق دی جائے و سنت کی نظر میں اصل یہی ہے کہ کوئی آدمی اگر طلاق دینے پر مجبور ہی ہو جائے تو صاف و صریح لفظوں میں ایک طلاق بھی دیدے، تاکہ عدت تک رجعت کا حق باقی رہے، ایسے الفاظ نہ بولے جن سے فوری طور پر تعلق زوجیت منقطع ہو جائے جس کو طلاق باتن کہتے ہیں، اور نہ تین طلاق تک پہنچے جس کے بعد آپس میں نکاح جدید بھی حرام ہو جائے، یہ اشارہ لفظاً لَكُمْ مِنَ الْكِتَابِ کو مطلق بلا قید کے ذکر کرنے سے حاصل ہوا، کیونکہ جو حکم اس آیت میں بتلایا ہے وہ اگرچہ صرف طلاق رجعی ایک دو تک کے لئے ہے، طلاق باتن یا کین طلاق کا یہ حکم نہیں، مگر قرآن کریم نے کوئی قید اس کی ذکر نہ فرما کر اس طرف اشارہ کر دیا کہ اصل طلاق مشروع رجعی طلاق ہی ہے، دوسری صورتیں کراہت یا ناپسندیدگی سے خالی نہیں مطلقہ عورتوں کو اپنی مرضی کی شادی کرنے دوسری آیت میں اس ناروا ظالمانہ سلوک کا انسداد کیا گیا ہے بلا وجہ شرعی روکنا حرام ہے، ہو، جو عام طور پر مطلقہ عورتوں کے ساتھ کیا جاتا ہے،

کر ان کو دوسری شادی کرنے سے روکا جاتا ہے، پہلا شوہر بھی عموماً اپنی مطلقہ بیوی کو دوسرے شخص کے نکاح میں جانے سے روکتا اور اس کو اپنی عزت کے خلاف سمجھتا ہے، اور بعض خاندانوں میں لڑکی کے اولیاء بھی اس کو دوسری شادی کرنے سے روکتے ہیں، اور ان میں بعض اس طبع میں روکتے ہیں کہ اس کی شادی پر ہم کوئی رقم لینے لے حاصل کر لیں، بعض اوقات مطلقہ عورت پہلے اپنے سابق شوہر سے نکاح پر راضی ہو جاتی ہے، مگر عورت کے اولیاء و استرہاء کو طلاق دینے کی وجہ سے ایک قسم کی عداوت اس سے ہو جاتی ہے، وہ اب دونوں کے راضی ہونے کے بعد بھی ان کے باہمی نکاح سے مانع ہوتے ہیں آزاد عورتوں کو اپنی مرضی کی شادی سے بلا عذر شرعی روکنا خواہ پہلے شوہر کی طرف سے ہو یا لڑکی کے اولیاء کی طرف سے بڑا ظلم ہے، اس ظلم کا انسداد اس آیت میں مندرمایا گیا ہے۔

اس آیت کا شان نزول بھی ایک ایسا ہی واقعہ ہے، صحیح بخاری میں ہے کہ حضرت معقل بن یسار نے اپنی بہن کی مشاوری ایک شخص کے ساتھ کر دی تھی، اس نے طلاق دیدی اور عدت بھی گذر گئی، اس کے بعد یہ شخص اپنے فعل پر پشیمان ہوا، اور چاہا کہ دوبارہ نکاح کر لیں، اس کی بیوی یعنی معقل بن یسار کی بہن بھی اس پر آمادہ ہو گئی، لیکن جب اس شخص نے معقل سے اس کا ذکر کیا تو ان کو طلاق دینے پر غصہ تھا، انھوں نے کہا کہ میں نے تمھارا اعزاز کیا، اپنی بہن تمھارے نکاح میں دیدی تم نے اس کی قید کر لی کہ اس کو طلاق دیدی اب پھر تم میرے پاس آئے ہو کہ دوبارہ نکاح کروں، خدا کی قسم اب وہ تمھارے نکاح سے روکے گی۔

اسی طرح ایک واقعہ جابر بن عبد اللہ کی چچا زاد بہن کا پیش آیا تھا، ان واقعات پر آیت مذکورہ نازل ہوئی جس میں معقل اور جابر کے اس رویہ کو ناپسند و ناجائز قرار دیا گیا۔ صحابہ کرام اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے سچے عاشق تھے، آیت کریمہ کے سنتے ہی معقل بن یسار کا سارا غصہ ٹھنڈا ہو گیا، اور خود جاکر اس شخص سے بہن کا دوبارہ نکاح کر دیا، اور قسم کا کفارہ ادا کیا، اسی طرح جابر بن عبد اللہ نے بھی تعمیل فرمائی۔

اس آیت کے خطاب میں وہ شوہر بھی داخل ہیں جنھوں نے طلاق دی ہے، اور لڑکی کے اولیاء بھی، دونوں کو یہ حکم دیا گیا کہ فَلَا تَعْصُوا لَكُمْ مِنْ أَنْ يَخْتَارَ آذَىٰ جَهَنَّمَ إِذَا تَوَاصَوْا بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوفِ، یعنی مت روکو مطلقہ عورتوں کو اس بات سے کہ وہ اپنے تجویز کئے ہوئے شوہروں سے نکاح کریں، خواہ پہلے ہی شوہر ہوں جنھوں نے طلاق دی تھی، یا دوسرے لوگ، مگر اس کے ساتھ ہی یہ شرط لگا دی گئی إِذَا تَوَاصَوْا بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوفِ، یعنی جب دونوں مرد و عورت شرعی قاعدہ کے مطابق رضا مند ہو جائیں، تو نکاح سے نہ روکو، جس میں اشارہ

فرمایا گیا کہ اگر ان دونوں کی رضامندی نہ ہو کوئی کسی پر زور نہ بردستی کرنا چاہیے تو سب کو رد کرنے کا حق ہے، یا رضامندی بھی ہو مگر شرعی قاعدہ کے موافق نہ ہو، مثلاً بلا نکاح آپس میں میاں بیوی کی طرح رہنے پر رضامند ہو جائیں، یا تین طلاقیں کے بعد ناجائز طور پر آپس میں نکاح کر لیں، یا ایام عدت میں دوسرے شوہر سے نکاح کا ارادہ ہو تو ہر مسلمان کو بالخصوص اُن لوگوں کو جن کا ان مرد و عورت کے ساتھ تعلق ہے رد کرنے کا حق حاصل ہے، بلکہ بعد رہتطاعت روکنا واجب ہے۔

اسی طرح کوئی لڑکی بلا اجازت اپنے اولیاء کے اپنے کفو کے خلاف دوسرے کفو میں نکاح کرنا چاہے، یا اپنے بہر مثل سے کم پر نکاح کرنا چاہے جس کا اثر خاندان پر پڑتا ہے، جس کا اس کو حق نہیں تو یہ رضامندی بھی قاعدہ شرعی کے مطابق نہیں، اس صورت میں لڑکی کے اولیاء کو اس نکاح سے روکنے کا حق مہل ہے، اِذَا تَرَ اَهْلًا کے الفاظ سے اس طرف بھی اشارہ ہو گیا کہ ناقلاً بالغہ لڑکی کا نکاح بغیر اس کی رضایا اجازت کے نہیں ہو سکتا۔

آیت کے آخر میں تین جملے ارشاد فرمائے گئے، ایک یہ کہ **وَلِلّٰهِ يَوْمَئِذٍ حُكْمٌ** (اور اللہ ہی کے لئے اس دن فیصلہ ہوگا)۔ دوسرا یہ کہ **يَوْمَئِذٍ يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ** (اس دن اللہ جو چاہے گا وہ بنائے گا)۔ تیسرا یہ کہ **وَاللّٰهُ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ** (اور اللہ ہی جاننے والا ہے ان دلوں کے جو چاہتے ہیں)۔

دوسرا جملہ یہ ارشاد فرمایا کہ **ذُرِّكُمْ اَرْضُكُمْ** یعنی ان احکام کی پابندی تمہارے لئے پاکی اور صفائی کا ذریعہ ہے۔ اس میں اشارہ فرمایا گیا کہ ان کی خلاف ورزی کا نتیجہ گناہوں کی غلاطت میں آلودگی اور فتنہ و فساد ہے، کیونکہ عاتلہ بالغہ جو ان لڑکیوں کو مطلقاً نکاح سے روکا گیا تو ایک طرف اُن پر ظلم اور ان کی حق تلفی ہے، اور دوسری طرف اُن کی عفت و عصمت کو خطرہ میں ڈالنا ہے، دوسرے اگر خدا سزا مسترد نہ کسی گناہ میں مبتلا ہوں، تو اس کا وبال ان لوگوں پر بھی عائد ہوگا جنہوں نے ان کو نکاح سے روکا، اور وبالِ آخرت سے پہلے بہت ممکن ہے کہ ان مجبور عورتوں کا یہ ابتلا، خود مردوں میں جنگ و جدال اور قتل و قتال تک نہایت پہنچائے جیسا کہ رات دن مشاہدہ میں آتا ہے، اس صورت میں وبالِ آخرت سے پہلے ان کا عمل دنیا ہی میں وبال بن جائے گا، اور اگر مطلقاً نکاح سے تو نہ روکا، مگر ان کی پسند کے خلاف دوسرے شخص سے نکاح پر مجبور کیا گیا تو اس کا نتیجہ بھی دائمی مخالفت اور فتنہ و فساد باطلاق و خلع ہوگا، جس سے ناگوار

اثرات ظاہر ہیں، اس لئے فرمایا گیا کہ ان کو ان کے تجویز کئے ہوئے شوہروں سے نکاح کرنے سے باز رکھنا ہی تمہارے لئے پاکی اور صفائی کا ذریعہ ہے۔

تیسرا جملہ یہ ارشاد فرمایا کہ **وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَأَنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ** یعنی تمہاری مصلحتوں کو اللہ تعالیٰ جانتے ہیں تم نہیں جانتے، اس ارشاد کا منشا یہ ہے کہ جو لوگ مطلقہ عورتوں کو نکاح کے رد کرتے ہیں وہ اپنے نزدیک اس میں کچھ مصالح اور فوائد سوچتے ہیں، مثلاً اپنی عزت وغیرت کا تحفظ، یا یہ کہ ان کی شادی کے بدلے کچھ مالی منفعت حاصل کی جائے، اس شیطانی تمکبیس اور بے جا مصلحت اندیشی کے ازالہ کے لئے فرمایا گیا کہ اللہ تعالیٰ تمہاری مصلحتوں اور فائدوں سے خوب واقف ہیں، ان کی رعایت کر کے احکام دیتے ہیں، اور تم چونکہ حقانیت امور اور معاملات کے انجام سے بے خبر ہو، اس لئے اپنے ناتمام غور و فکر اور ناقص رائے سے کبھی ایسی چیزوں کو مصلحت اور فائدہ سمجھ لیتے ہو جن میں تمہاری ہلاکت و بربادی ہے، تم جس عزت وغیرت کو تمنا کرتے پھرتے ہو مگر مطلقہ عورتیں بے قابو ہو گئیں تو سب عزت خاک میں مل جائے گی، اور مالی منافع کے ناجائز تصورات ممکن ہے کہ تمہیں ایسے فتنوں اور جھگڑوں میں مبتلا کر دیں جن میں مال کے ساتھ جان کا بھی خطرہ ہو جائے۔

قانون سازی اور اس کی تفسیر میں
قرآن کریم کا مینڈیٹ کیا ہے؟

قرآن کریم نے اس جگہ ایک قانون پیش فرمایا کہ مطلقہ عورتوں کو اپنی مرضی کے مطابق نکاح سے رد کرنا جرم ہے، اس قانون کو بیان فرمانے کے بعد اس پر عمل کرنے کو پہل اور اس کے لئے عوام کے ذہنوں کو ہموار کرنے کے واسطے تین جملے ارشاد فرمائے جن میں سے پہلے جملے میں رد و قیامت کے باب اور جرائم کی سزا سے ڈرا کر انسان کو اس قانون پر عمل کرنے کے لئے آمادہ فرمایا، دوسرے جملے میں اس قانون کی خلاف ورزی میں جو مفاسد اور انسانیّت کے لئے مضرتیں ہیں ان کو بتلا کر قانون کی پابندی کے لئے تیار کیا، تیسرے جملے میں یہ ارشاد فرمایا کہ تمھاری اپنی مصلحت بھی اسی میں ہے کہ خدا تعالیٰ کے بتائے ہوئے قانون کی پابندی کرو، اس کے خلاف کرنے میں اگر تم کوئی مصلحت سوچتے ہو تو وہ تمھاری کوتاہ نظری اور عواقب سے بے خبری کا نتیجہ ہے۔

فسترآن کریم کا یہ اسلوب اور طرزِ بیان صرف یہیں نہیں ملے گا تمام احکام میں جاری ہے، کہ ایک قانون بتایا جاتا ہے تو اس کے ساتھ ہی خدا تعالیٰ اور آخرت کے حساب و عذاب سے ڈرایا جاتا ہے، ہر قانون کے آگے پہچے **إِنَّمَا لِلّٰهِ تَحِيَّاتٌ** یا **إِنَّمَا لِلّٰهِ تَعْبَادٌ**، **إِنَّمَا لِلّٰهِ تَعْبَادٌ** یا **بِإِذْنِ اللّٰهِ** وغیرہ چلے لگائے ہوئے ہیں، فسترآن ساری دنیا اور قیامت تک آنے والی نسلوں کے لئے ایک مکمل نظامِ حیات اور ہر شعبہ زندگی پر جاری قانون

ہو، اس میں حدود و تعزیرات کا بھی بیان ہے، لیکن اس کی اداساری دنیا کے قانون کی کتابوں سے نرالی ہے، اس کا طریق بیان حاکمانہ سے زیادہ مرتبہ ہے، اس میں ہر قانون کے بیان کے ساتھ اس کی کوشش کی گئی ہے کہ کوئی انسان اس قانون کی خلاف ورزی کر کے مستحق سزا نہ بنے، دنیا کی حکومتوں کی طرح نہیں کر انھوں نے ایک قانون بنادیا، اور مشالہ کر دیا، جو کوئی اس قانون کی خلاف ورزی کرتا ہے وہ اپنی سزا بھگتنا ہے۔

اس کے علاوہ اس اسلوب قرآن اور اس کے مخصوص انداز بیان سے ایک دُور رس بڑا فائدہ یہ ہے کہ اس کو دیکھنے سے بچنے کے بعد انسان اس قانون کی پابندی صرف اس بنا پر نہیں کرتا کہ اگر خلاف کرے گا تو دنیا میں اس کو کوئی سزا مل جائے گی، بلکہ دنیا کی سزا سے زیادہ اللہ تعالیٰ کی ناراضی اور آخرت کی سزا کی فکر ہوتی ہے، اور اس فکر کی بنا پر اس کا ظاہر و باطن خفیہ و علانیہ برابر ہو جاتا ہے، وہ کسی ایسی جگہ میں بھی قانون کی خلاف ورزی نہیں کر سکتا جہاں کسی ظاہری یا خفیہ پولیس کی بھی رسائی نہ ہو، کیونکہ اس کا عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جل شانہ ہر جگہ حاضر و ناظر اور ذرہ ذرہ سے باخبر ہیں، یہی سبب ہے کہ شرعی تعلیم نے جو اصول معاشرت تیار کئے تھے ہر مسلمان اس کی پابندی کو اپنا مقصد حیات تصور کرتا تھا۔

شرعی نظام حکومت کا یہی ہستیاز ہے کہ اس میں ایک طرف قانون کی حدود و قیود کا ذکر ہے، فرد دوسری طرف ترغیب و ترہیب کے ذریعہ انسان کے اخلاق و کردار کو ایسا بلند کیا گیا ہے کہ قانونی حدود و قیود اس کے لئے ایک طبعی چیز بن جاتی ہیں، جس کے سامنے وہ اپنے جذبات اور تمام نفسانی خواہشات کو پس پشت ڈال دیتا ہے، دنیا کی حکومتوں اور قوموں کی تاریخ اور انہیں جسرم و سزائے واقعات پر ذرا گہری نظر ڈالنے تو معلوم ہو گا کہ نئے قانون سے کبھی کسی قوم یا فرد کی اصلاح نہیں ہوتی محض پولیس اور فوج سے کبھی جرائم کا انسداد نہیں ہوا جب تک قانون کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے خوف و عظمت کا بسکہ اس کے قلب پر نہ بیٹھے، جرائم سے روکنے والی چیز دراصل خوفِ خدا اور خوفِ حسابِ آخرت ہے، یہ نہ ہو تو کوئی شخص کسی سے جرائم کو نہیں چھڑا سکتا۔

وَالْوَالِدَتُ يُرْضِعْنَ أَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ أَرَادَ

اور بچے والی عورتیں دودھ پلا دیں اپنے بچوں کو دو برس پورے جو کوئی چاہے کہ پوری

أَنْ يُمْلِمَ الرِّضَاعَةَ عَلَى الْمَوْلُودِ لَهُ رِشْقُهُنَّ وَكِتَابَتُهُنَّ

کرے دودھ کی مدت اور لڑکے والے یمن باپ پر ہے کھانا اور کپڑا اُن عورتوں کا

بِالْمَعْرُوفِ لَا تَكْلَفُ نَفْسٌ إِلَّا وُسْعَهَا لَا تُضَارُّ وَالِدٌ بَوْلًا

رواقی دستور کے، تکلیف نہیں دی جاتی کسی کو مگر اس کی گنجائش کے موافق، نہ نقصان دیا جائے اور اس کے بچہ کی

وَلَا مَوْلُودٌ لَهُ يُولَدُ عَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذَلِكَ فَإِنْ أَرَادَ الْفَصْلُ

وجہ سے اور نہ اس کو جس کا وہ بچہ ہے یمن باپ کو اس کے بچہ کی وجہ اور وارثوں پر بھی یہی لازم کہ پھر اگر باپ چاہیں کہ دودھ

عَنْ تَرَاضٍ مِنْهُمَا وَتَشَاوُرٍ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا وَإِنْ أَرَادَ ثَمَرَانِ

پھر الیحد یمن دو برس کے اندر ہی اپنی رضا اور مشورے سے تو ای پر کچھ ممانہ نہیں اور اگر تم دوگ چاہو کہ دودھ

تَسْرِعُ صَوًّا أَوْ لَدَكُمْ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِذَا سَلَّمْتُمْ مَا أَنَسْتُمْ

بلو اگر کسی دایہ سے اپنی اولاد کو تو بھی تم پر کچھ ممانہ نہیں جب کہ حوالے کر دو جو تم نے دینا نہیں چاہتا

بِالْمَعْرُوفِ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ

موانع دستور کے اور ڈرو اللہ سے اور جان لے کہ اللہ تمہارے سب کاموں کو خوب دیکھتا ہے۔

خلاصہ تفسیر

حکم نمبر ۲۳ رضاعت | اور مائیں اپنی اولاد کو دو سال کامل دودھ پلا یا کریں (یہ مدت اس کے لئے ہے) جو شیر خوارگی

کی تکمیل کرنا چاہے، اور جس کا بچہ ہے اس کے لئے ہے ان ماؤں کا کھانا کپڑا قاعدہ کے موافق، اور کسی شخص کو کوئی حکم نہیں دیا

جائے اگر اس کی برداشت کے موافق، کسی ماں کو یمن نہیں ہو پھر پھر چاہئے اس کے بچہ کی وجہ سے اور کسی کے بچے تکلیف دینی

چاہئے اس کے بچہ کی وجہ سے اور اگر باپ زندہ نہ ہو تو (مثلاً طریق مذکور کے) بچہ کی پرورش کا انتظام، اس کے (محرم قرابت

دار کے) دفتر، جو (شرعی چاہے) دارث (ہونے کا حق رکھتا) ہے پھر (یہ کچھ لوگ) اگر دونوں (ماں اور باپ) دو سال تک (یا)

دودھ پھر دینا چاہیں، یہی رضا مندی اور مشورے سے تو بھی ان دونوں پر کسی قسم کا گناہ نہیں اور اگر تم لوگ (ماں باپ کے ہوتے

ہوئے بھی کسی معلوت ضروریہ سے مثلاً یہ کہ ماں کا دودھ اچھا نہیں پتہ کو ضرور ہوگا) اپنے بچوں کو کسی اور ماں کا دودھ پلانا چاہو

تب بھی تم پر کوئی گناہ نہیں، جبکہ اُن کے حوالے کر دو جو کچھ ان کو دینا ملے یا ہے، قاعدہ کے موافق، اور حق تعالیٰ سے ڈرتے رہو اور

یقین رکھو کہ اللہ تعالیٰ تمہارے کاموں کو خوب دیکھ رہا ہے۔

معارف و مسائل

اس آیت میں رضاعت یعنی بچوں کو دودھ پلانے کے متعلق احکام ہیں، اس سے پہلے اور

بعد کی آیات میں طلاق کے احکام مذکور ہیں، درمیان میں دودھ پلانے کے احکام اس مناسبت سے

ذکر کئے گئے ہیں کہ عمر طلاق کے بعد بچوں کی پرورش اور دودھ پلانے یا پلوانے کے معاملات زیر نزاع آجاتے ہیں، اور ان میں جھگڑے فساد ہوتے ہیں، اس لئے اس آیت میں ایسے مسئلہ احکام بیان فرمادیے گئے جو عورت و مرد دونوں کے لئے سہل اور مناسب ہیں، خواہ دودھ پلانے یا چھڑانے کے معاملات قیام نکاح کی حالت میں پیش آئیں یا طلاق دینے کے بعد، یہود و مشرک اس کا ایک ایسا نظام بتا دیا گیا جس سے جھگڑے فساد یا کسی فرقہ پر ظلم و تعدی کا راستہ نہ رہے۔ مثلاً آیت کے پہلے حصے میں ارشاد فرمایا، **وَالَّذِينَ آمَنُوا يَتَزَوَّجُ بَعْضُهُمْ أَوْلَادَهُمْ خَوَاتِمًا** عاتلین لیتمن آما اذ ان یزینہ الزواجات، یعنی تائیں اپنے بچوں کو دودھ پلایا کریں دو سال کامل جبکہ کوئی عذر قوی اس سے پہلے دودھ چھڑانے کے لئے مجبور نہ کرے۔

اس آیت سے رضاعت کے چند مسائل معلوم ہوتے ہیں۔

دودھ پلانا ماں کے اول یہ کہ دودھ پلانا دیا نہ ماں کے ذمہ واجب ہے، بلا عذر کسی صند یا ناراضی کے ذمہ واجب ہے سبب دودھ نہ پلانے تو گھنگار ہوگی، اور دودھ پلانے پر وہ شوہر سے کوئی اجرت و معاوضہ نہیں لے سکتی، جبکہ اس کے اپنی نکاح میں ہو، کیونکہ وہ اس کا اپنا فرض ہے۔

پوری مدت رضاعت | دوسرا مسئلہ یہ معلوم ہوا کہ پوری مدت رضاعت دو سال ہے، جب تک کوئی خاص عذر مانع نہ ہو بچے کا حق ہے کہ یہ مدت پوری کی جائے۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ دودھ پلانے کے لئے پوری مدت دو سال دی گئی ہے، اس کے بعد دودھ نہ پلایا جائے، البتہ بعض آیات قرآن اور احادیث کی بناء پر امام اعظم ابو حنیفہ کے نزدیک اگر تین مہینے یعنی ڈھائی سال کے عرصہ میں بھی دودھ پلادیا تو احکام رضاعت کے ثابت ہو جائیں گے، اور اگر بچے کی کمزوری وغیرہ کے عذر سے ایسا کیا گیا تو گناہ بھی نہ ہوگا، ڈھائی سال پورے ہونے کے بعد بچہ کو ماں کا دودھ پلانا باتفاق حرام ہے۔

اس آیت کے دوسرے حصے میں ارشاد ہے **وَعَلَى الْمَوْلُودِ لَهُ يَرْزُقْهُنَّ وَيَسْتَرْضِعْنَ** یا لیمعرو ورن لا تمکنن نفسن الا و شعیہا، یعنی باپ کے ذمہ ہے ماؤں کا کھانا اور کپڑا قاعدہ کے موافق، کسی شخص کو ایسا حکم نہیں دیا جاتا جس کو وہ برداشت نہ کر سکے۔

اس میں پہلی بات قابل غور یہ ہے کہ ماؤں کے لئے تو قرآن نے لفظ **وَالَّذِينَ** استعمال کیا، مگر باپ کے لئے مختصر لفظ **وَالَّذِينَ** مجوز کر کے **وَالَّذِينَ** اختیار نہ کیا، حالانکہ قرآن میں دوسری جگہ لفظ والد بھی مذکور ہے، **لَا يَجْزِي وَالِدٌ عَنْ وَلَدِهِ** مگر یہاں والد کی جگہ مَوْلُودُ کے اختیار کرنے میں ایک خاص راز ہے، وہ یہ کہ پورے ستر آں کریم کا ایک خاص اسلوب اور طریق بیان ہے کہ وہ کسی قانون کو دنیا کی حکومتوں کی طرح بیان نہیں کرتا، بلکہ مرتباً اور شفقتاً

طرز سے بیان کرتا ہے، اور ایسے انداز سے بیان کرتا ہے، جس کو قبول کرنا اور اس پر عمل کرنا انسانی کے لئے آسان ہو جائے۔

یہاں بھی چونکہ بچے کا نفقہ باپ کے ذمہ ڈالا گیا ہے، حالانکہ وہ ماں باپ کی مستاع مشترک ہے، تو ممکن تھا کہ باپ کو یہ حکم کچھ بھاری معلوم ہو اس لئے بچے والہ کے مَوْلُود کا لفظ اختیار کیا (وہ شخص جس کا بچہ ہے) اس میں اس طرف اشارہ کر دیا کہ اگرچہ بچے کی تولید میں ماں اور باپ دونوں کی شرکت ضرور ہے، مگر بچہ باپ ہی کا کہلاتا ہے، نسب باپ ہی سے ملتا ہے، اور جب بچہ اس کا ہوا تو ذمہ داری خرچ کی اس کو بھاری نہ معلوم ہونی چاہئے۔

بچے کو دودھ پلانا ماں کے ذمہ | تیسرا مسئلہ شرعیہ اس آیت سے یہ معلوم ہوا کہ اگرچہ دودھ پلانا اور ماں کا نان و نفقہ و ضرورتاں ماں کے ذمہ ہے، لیکن ماں کا نان نفقہ اور ضرورتاں زندگی باپ کے ذمہ ہیں

نکاح میں یا عدت میں ہے اس وقت تک اور طلاق اور عدت پوری ہونے کے بعد نفقہ ضرورتاً تو ختم ہو جائے گا، مگر بچے کو دودھ پلانے کا معاوضہ دینا باپ کے ذمہ پھر بھی لازم رہے گا (منظری)

زوج کا نفقہ شوہر کی حیثیت | چوتھا مسئلہ اس پر توافق ہے کہ بیاہ ہوئی دونوں امیر مالدار ہوں تو نفقہ طلاق کے مناسب ہونا چاہئے یا زوج کی واجب ہوگا اور دونوں غریب ہوں تو نفقہ شوہر سے واجب ہوگا، البتہ

جب دونوں کے حالات مالی مختلف ہوں، اس میں فقہاء کا اختلاف ہے، صاحب ہدایہ نے خصائص کے اس قول پر فتویٰ دیا ہے کہ عورت غریب اور مرد مال دار ہو تو اس کا نفقہ درمیان حیثیت کا دیا جائے گا کہ غریبوں سے زائد مال داروں سے کم، اور کسب کے نزدیک اعتبار شوہر کے حال کا ہوگا، فتح القدیر میں ہے فقہاء کا فتویٰ اس پر نقل کیا ہے، **والله اعلم بفتح القدر علیہ** (۲۳۳)

آیت مذکورہ میں احکام کے بعد ارشاد فرمایا **لَا تَصْأَرْ دَالِيَةً يَكُونُ لَهُمَا وَكْلٌ** لہ یو کون، یعنی نہ تو کسی ماں کو اس کے بچے کی وجہ سے تکلیف میں ڈالنا جائز ہے، اور نہ کسی باپ کو اس کے بچے کی وجہ سے، مطلب یہ ہے کہ بچے کے ماں باپ آپس میں عند اضدی نہ کریں، مثلاً ماں دودھ پلانے سے معذور ہو اور باپ اس پر یہ سمجھ کر زبردستی کرے کہ آخر اس کا بھی تو بچہ ہے، یہ مجبور ہوگی اور پلا دے گی، یا باپ مفلس ہے، اور ماں کو کوئی معذوری بھی نہیں پھر دودھ پلانے سے اس لئے انکار کرے کہ اس کا بھی تو بچہ ہے، جھک مار کر کسی سے پلوئے کلام

ماں کو دودھ پلانے پر مجبور | **لَا تَصْأَرْ دَالِيَةً يَكُونُ لَهُمَا وَكْلٌ** اسے پانچواں مسئلہ یہ معلوم ہوا کہ کرنے یا نہ کرنے کی تفصیل ماں اگر بچے کو دودھ پلانے سے کسی ضرورت کے سبب انکار کرے

تو باپ کو اسے مجبور کرنا جائز نہیں، اور اگر بچہ کسی دوسری عورت یا جانور کا دودھ نہیں لیتا تو ماں کو مجبور کیا جائے گا، یہ مسئلہ ذیل آیت میں ہے۔

عورت جب تک نکاح میں ہے چھٹا مسئلہ یہ معلوم ہوا کہ اگر بچہ کی ماں دودھ پلانے کی اجرت تو اپنے بچے کو دودھ پلانے کی اجرت ہے تو جب تک اس کے نکاح یا عدت کے اندر ہے، اجرت کے مطالبہ کا حق نہیں، یہاں اس کا مان نفقہ جو باپ کے ذمہ ہے وہی کافی ہے، مزید اجرت کا مطالبہ باپ کو ضرر پہنچاتا ہے، اور اگر طلاق کی عدت گزر چکی ہے اور نفقہ کی ذمہ داری ختم ہو چکی ہے، اب اگر یہ مطلقہ بیوی اپنے بچے کو دودھ پلانے کا معاوضہ اپنے طلب کرتی ہے تو باپ کو دینا پڑے گا، کیونکہ اس کے خلاف کرنے میں ماں کا نقصان ہے، شرط یہ ہے کہ یہ معاوضہ اتنا ہی طلب کرے کہ جتنا کوئی دوسری عورت لیتی ہے، زائد کا مطالبہ کرے گی تو باپ کو حق ہوگا کہ اس کی بجائے کسی اتنا کا دودھ پلاوے۔

قیم بچے کے دودھ پلانے آیت متذکرہ میں اس کے بعد یہ ارشاد ہے، **وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذَلِكَ** یعنی اگر باپ زندہ نہ ہو تو بچے کو دودھ پلانے یا پلانے کا انتظام اس شخص پر ہے جو بچے کا جائز وارث اور محرم ہو، یعنی اگر بچہ مر جائے تو جن کو اس کی وراثت پہنچتی ہو وہی باپ نہ ہونے کی حالت میں اس کے نفقہ کے ذمہ دار ہوں گے، اگر ایسے وارث کئی ہوں تو ہر ایک پر بقدر میراث اس کی ذمہ داری عائد ہوگی، امام اعظم ابو حنیفہؒ نے فرمایا کہ قیم بچے کو دودھ پلانے کی ذمہ داری وارث پر ڈالنے سے یہ بھی معلوم ہوا کہ نابالغ بچے کا خرچہ دودھ پھرانے کے بعد بھی وارثوں پر ہوگا، کیونکہ دودھ کی کوئی خصوصیت نہیں، مقصود بچے کا گزارہ ہے، مثلاً اگر قیم بچے کی ماں اور دادا زندہ ہیں تو یہ دونوں اس بچے کے محرم بھی ہیں، اور وارث بھی، اس لئے اس کا نفقہ ان دونوں پر بقدر حصہ میراث عائد ہوگا، یعنی ایک ہتھائی خرچہ ماں کے ذمہ اور دو ہتھائی دادا کے ذمہ ہوگا، اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ قیم پوتہ کا حق دادا پر اپنے بالغ بیٹوں سے بھی زیادہ ہو، کیونکہ بالغ اولاد کا نفقہ اس کے ذمہ نہیں اور قیم پوتے کا نفقہ اس کے ذمہ واجب ہے، ہاں میراث میں بیٹوں کے موجود ہوتے ہوئے پوتے کو حقدار بنانا اصول میراث اور انصاف کے خلاف ہے، کہ قریب تر اولاد کے ہوتے ہوئے بعید کو دینا معقول بھی نہیں، اور صحیح بخاری کی حدیث **لَا ذَنْبَ عَلَى ذَكَرٍ** کے بھی خلاف ہے، البتہ دادا کو یہ حق ہے کہ اگر ضرورت ہے تو قیم پوتہ کے لئے کچھ وصیت کر جائے، اور یہ وصیت بیٹوں کے حصہ سے قائم بھی ہو سکتی ہے اسی طرح قیم پوتہ کی ضرورت کو بھی پورا کر دیا گیا اور وراثت کا اصول کہ قریب کے ہوتے ہوئے بعید کو نہ دیا جائے یہ بھی محفوظ رہا۔

دودھ چھڑانے کے احکام اس کے بعد آیت متذکرہ میں ارشاد ہوتا ہے **وَإِنْ أَرَادَا فِصَالًا عَنْ تَرَاضٍ مِنْهُمَا وَتَشَاوُرًا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا**، یعنی اگر بچے کے ماں باپ دونوں آپس کی رضامندی اور باہمی مشورے سے یہ ارادہ کریں کہ شیر خوارگی کی مدت یعنی دو سال سے کم میں ہی دودھ چھڑادیں، خواہ ماں کی معذوری کے سبب یا بچے کی کسی بیماری کے سبب، تو اس میں بھی کوئی گناہ نہیں، آپس کے مشورے اور رضامندی کی مشروط اس لئے لگائی کہ دودھ چھڑانے میں بچے کی مصلحت پیش نظر ہونی چاہئے، آپس کے لڑائی جھگڑے کا بچے کو تھمتھ مشن نہ بنائیں۔

ماں کے سوا دوسری عورت آخر میں ارشاد فرمایا گیا **وَإِنْ أَرَادَتْكُمْ أَنَّ تُسَلِّمُوا وَلَدَكُمْ كُمْ** کا دودھ پلانے کے احکام **فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِذَا سَلَّمْتُمْ مَا أَنْتُمْ بِالْمَعْرُوفِ** یعنی اگر تم یہ چاہو کہ اپنے بچوں کی کسی مصلحت سے ماں کی بجائے کسی اتنا کا دودھ پلاؤ تو اس میں بھی کچھ گناہ نہیں، شرط یہ ہے کہ دودھ پلانے والی کی ہوا اجرت معسرہ کی گئی تھی وہ پوری پوری ادا کر دیں، اور اس کو معسرہ اجرت نہ دی گئی تو اس کا گناہ ان کے ذمہ نہیں گا۔

اس سے معلوم ہوا کہ اگر ماں دودھ پلانے پر راضی ہے لیکن باپ یہ دیکھتا ہے کہ ماں کا دودھ بچے کے لئے مضر ہے تو ایسی حالت میں اس کو حق ہے کہ ماں کو دودھ پلانے سے روک دے اور کسی اتنا سے پلاوے۔

اس سے ایک بات یہ بھی معلوم ہوئی کہ جس عورت کو دودھ پلانے پر رکھا جائے اس سے معاملہ تنخواہ یا اجرت کا پوری صفائی کے ساتھ طے کر لیا جائے کہ بعد میں جھگڑا نہ پڑے، اور پھر وقت مقررہ پر یہ طے شدہ اجرت اس کو سپرد بھی جائے، اس میں مال مثول نہ کرے۔

یہ سب احکام رضاعت بیان کرنے کے بعد پھر قرآن نے اپنے مخصوص اذکار و اسلوا کے ساتھ قانون پر عمل کو آسان کرنے اور ظاہر و غائب ہر حال میں اس کا پابند رکھنے کے لئے اللہ تعالیٰ کے خوف اور اس کے علم محیط کا تصور سامنے کر دیا، ارشاد ہوتا ہے **وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ** یعنی اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو، اور یہ سمجھ لو کہ اللہ تعالیٰ تمہارے کھلے اور چھپے اور ظاہر و غائب کو پوری طرح دیکھ رہا ہے، اور وہ تمہارے دلوں کے غمی ارادوں اور نیٹوں سے باخبر ہیں، اگر کسی فریق نے دودھ پلانے یا چھڑانے کے مذکورہ احکام کی خلاف ورزی کی یا بچے کی مصلحت کو نظر انداز کر کے اس بارے میں کوئی فیصلہ کیا تو وہ حق سزا ہوگا

وَالَّذِينَ يَتَّبِعُونَ مَنكُم دِينًا رَّوْنًا أَرَادُوا جَاءَ تَكْرِيضًا اور جو لوگ مجاہدین تم میں سے اور چھوڑ جا دیں اپنی عورتیں تو جانے کہ وہ عورتیں انتظام کیلئے آہلو

أَرْبَعَةَ أَشْهُرٍ وَعَشْرًا ۖ فَإِذَا بَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِي مَا

فَعَلْنَ فِي أَنْفُسِهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ ۚ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ ۝ وَلَا جُنَاحَ

عَلَيْكُمْ فِي مَا عَرَضْتُمْ بِهِ مِنْ خُطْبَةِ النِّسَاءِ أَوْ أَكْنُتُمْ فِي أَنْفُسِكُمْ

ثُمَّ بَدَأْتُمْ مِنْ بَعْدِ ذَلِكَ مِنْهُ ۚ وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِالظَّالِمِينَ ۝

عَلِمَ اللَّهُ أَنَّكُمْ سَتَذْكُرُونَهُنَّ وَلَكِنْ لَا تَأْتِيَنَّ مِنْهُنَّ إِلَّا أَنْ

تَقُولُوا أَقُولَ مَعْرُوفًا وَلَا تَعْنُوا عَقْدَةَ النِّكَاحِ حَتَّى يَبْلُغَ

الْكِتَابُ أَجَلَ ۚ وَأَعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا فِي أَنْفُسِكُمْ فَاحْذَرُوا ۚ

وَأَعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ غَفُورٌ حَلِيمٌ ۝

اور جان رکھو کہ اللہ بخشنے والا اور تحمل کرنے والا ہے

خلاصہ تفسیر

حکم نمبر ۱۲، شوہر کی وفات کے بعد اگر بیوہ چار مہینے اور دس دن پہر جب اپنی عدت کی (معاذ

حکم کر لیں تو تم کو بھی) کچھ گناہ نہ ہوگا، ایسی بات کہ جسے وہ عورتیں اپنی ذات

کے لئے کچھ کارروائی (نکاح کی) کریں قاعدہ کے موافق (البتہ اگر کوئی بات خلاف قاعدہ شرع

کے کریں اور تم باوجود روک رکھنے کے نہ روکو تو تم بھی مشرک گناہ ہو گے، اور اللہ تعالیٰ تمہارے تمام اعمال کی خبر رکھتے ہیں،

حکم نمبر ۱۳، عدت میں (اور تم پر کوئی گناہ نہیں ہوگا جو ان مذکورہ عورتوں کو (جو عدت وفات میں ہیں) پیغام

نکاح کا پیغام دینا (نکاح) دینے کے بارے میں کوئی بات اشارۃً کہہ دو مثلاً یہ کہ مجھ کو ایک نیک

عورت سے نکاح کی ضرورت ہے، یا اپنے دل میں (آئندہ نکاح کرنے کے ارادہ کو) پوشیدہ رکھو جب

بھی گناہ نہیں اور وہ اس اجازت کی یہ ہے کہ، اللہ تعالیٰ کو یہ بات معلوم ہے کہ تم ان عورتوں کا

(ضرور) ذکر ذکر کر رہے (سو خبر ذکر ذکر کرو) لیکن ان سے (صاف لفظوں میں) نکاح کا وعدہ

داد و گفتگو مست کر دے کہ کوئی بات قاعدہ کے موافق ہو تو مضائقہ نہیں، اور وہ بات

قاعدہ کے مطابق یہی ہے کہ اشارۃً کہو، اور تم تعلیق نکاح (فی الحال) کا ارادہ بھی مست کرو،

یہاں تک کہ عدت اپنے مقررہ وقت پر ختم ہو جائے، اور یقین رکھو اس کا کہ اللہ کو اطلاع ہے تمہارے

دلوں کی بات کی سوائے تعالیٰ سے ڈرتے رہ کر و اور ناجائز امر کا دل میں ارادہ بھی مت کیا کرو، اور یقین

یقین رکھو کہ اللہ تعالیٰ معاف بھی کرنے والے ہیں اور حلیم بھی ہیں۔

معارف مسائل

عدت کے (۱) جس کا خاوند مر جائے اس کو عدت کے اندر خوشبو لگانا، سنگھار کرنا، سرمہ اور تیل

بل ضرورت دوا لگانا، مہندی لگانا، رنگین کپڑے پہننا درست نہیں، اور صریح گفتگو سے نکاح

ثانی بھی درست نہیں، جیسا اہل آیت میں آتا ہے، اور رات کو دوسرے گھر میں رہنا بھی درست

نہیں، ترجمہ میں نکاح کے ساتھ جو وغیرہ کہا گیا ہے اس سے یہی امور مراد ہیں، اور یہی حکم ہے

اس عورت کا جس پر طلاق یا تن واقع ہوئی، یعنی جس کی رجعت درست نہیں، مگر اس کو اپنے گھر

سے دن کو بھی بدون سخت مجبوری کے نکلنا درست ہے۔

(۲) اگر چاند رات کو خاوند کی وفات ہوئی تب تو یہ مہینے خواہ تیس کے ہوں خواہ انیس

کے ہوں، چاند کے حساب سے پورے کئے جاویں گے، اور اگر چاند رات کے بعد وفات ہوئی ہے

تو یہ سب مہینے تیس تیس دن کے حساب سے پورے کئے جاویں گے، پس کل ایک سو تیس دن پورے

کریں گے، اس سلسلے سے بہت لوگ غافل ہیں، اور جس وقت وفات ہوئی ہو جب یہ مدت

گزر کر وہی وقت آجے گا، عدت ختم ہو جائے گی، اور یہ جو فرمایا کہ اگر عورتیں قاعدہ کے موافق کچھ

کریں تو تم کو بھی گناہ نہ ہوگا، اس سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص کوئی کام خلاف شرع کرے

تو اور دن پر بھی واجب ہوتا ہے کہ بشرط قدرت اس کو روکیں، ورنہ یہ لوگ بھی گنہگار ہوتے

ہیں، اور قاعدہ کے موافق سے یہ مراد ہے کہ جو نکاح تجویز ہو وہ مشرفاً صحیح اور جائز ہو، تمام

لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِنْ طَلَقْتُمُ النِّسَاءَ مَا لَمْ تَمْسُوهُنَّ أَوْ تَفْسُوهُنَّ
 کچھ گناہ نہیں تم پر اگر طلاق دو تم عورتوں کو اس وقت کہ ان کو ہاتھ بھی نہ لگا یا ہو اور نہ معشرہ سمجھا ہو کہ
 فَرِيضَتُهُنَّ وَتَعَوُّهُنَّ عَلَى الْمَوْسِمِ قَدْ رُكِبَ وَعَلَى الْمَقْتِرِ قَدْ رُكِبَ مَتَاعًا
 لئے کچھ ہوا اور ان کو کچھ خرچہ دو مقدور دالے پر اس کے موافق ہو اور تنگی دالے پر اس کے موافق جو خرچہ
 بِالْمَعْرُوفِ حَقًّا عَلَى الْمُحْسِنِينَ ۳۷ وَإِنْ طَلَقْتُمُوهُنَّ مِنْ قَبْلِ
 قاعدہ کے موافق ہو لازم ہر تنگی کر لے والوں پر اور اگر طلاق دو ان کو ہاتھ لگانے سے پہلے اور
 أَنْ تَمْسُوهُنَّ وَقَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيضَةً فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ إِلَّا
 ٹھہرا ہے تمہیں تم ان کے لئے ہر قول لازم ہوا آدھا اس کا کہ تم معشرہ کر چکے تھے مگر یہ کہ درگزر
 أَنْ تَعْفُوْنَ أَوْ يَعْفُوَ الَّذِي بِيَدِهِ عَقْدُ النِّكَاحِ وَأَنْ تَعْفُوا أَقْرَبُ
 کری عفو میں یا درگزر کرے وہ شخص کہ اس کے اختیار میں ہو کہ نکاح کی مہینہ خاوند اور تم مرد درگزر کر دو قریب
 لِلتَّقْوَى وَلَا تَلْسُوا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ إِنْ أَنْتُمْ تَعْمَلُونَ بَصِيرًا ۳۸
 ہی پر ہر گارہی اور نہ بھلاؤ احسان کرنا آپس میں بے شک اللہ جو کچھ تم کرتے ہو خوب دیکھتا ہے۔

خلاصہ تفسیر

حکم نمبر ۳۳ طلاق قبل الدخول کی صورت طلاق قبل الدخول کے سنی یہ ہیں کہ زوجین میں ایک جان اور خلوت
 میں ہر کے وجوب اور عدم وجوب کا بیان صحیحہ سے پہلے ہی طلاق کی نوبت آجائے اس کی دو صورتیں ہیں یا
 تو اس نکاح کے وقت ہر معشرہ کی مقدار متعین نہیں کی گئی، یا مقدار ہر متعین کر دی گئی، پہلی
 صورت کا حکم اولاً مذکور ہے۔

لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِنْ طَلَقْتُمُ النِّسَاءَ مَا لَمْ تَمْسُوهُنَّ أَوْ تَفْسُوهُنَّ ۳۷
 میں تم پر ہر گناہ کچھ مواخذہ نہیں اگر بیبیوں کو ایسی حالت میں طلاق دیدو کہ نہ ان کو تم نے ہاتھ لگا یا
 ہے اور نہ ان کے لئے کچھ ہر معشرہ کیا ہے (سو اس صورت میں ہر اپنے ذمہ مت سمجھا اور دھڑکا
 ان کو ایک) فائدہ پہنچاؤ صاحب وسعت کے ذمہ اس کی حیثیت کے موافق ہے، اور تنگ دست
 کے ذمہ اس کی حیثیت کے موافق ہے، ایک خاص قسم کا فائدہ پہنچانا جو قاعدہ کے موافق واجب ہے
 خوش معاملہ لوگوں پر ذہنی سب مسلمانوں پر، کیونکہ خوش معاملگی کا بھی سب ہی کو حکم ہے، مراد اس

سے ایک جوڑا پڑوں کا دینا ہے۔
 اور دوسری صورت کا حکم یہ ہے، وَإِنْ طَلَقْتُمُوهُنَّ دَالِي قَوْلِهِ إِنَّ اللَّهَ يَمْتَحِنُكُمْ
 بصیغہ اور اگر تم ان بیبیوں کو طلاق دو قبل اس کے کہ ان کو ہاتھ لگاؤ اور ان کے لئے کچھ
 ہر بھی مقرر کر چکے تھے تو (اس صورت میں) جتنا ہر تم نے مقرر کیا ہو اس کا نصف (واجب) ہو
 (اور نصف معاف) مگر (دو صورتیں اس مجموعی حکم سے مستثنیٰ ہیں، ایک صورت تو یہ کہ وہ عورتیں
 اپنا نصف) بھی معاف کر دیں (تو اس صورت میں نصف بھی واجب نہ رہا) یا (دوسری
 صورت) یہ ہے کہ وہ شخص رعایت کر دے جس کے ہاتھ میں نکاح کا تعلق رکھنا اور توڑنا ہو
 زمین خاوند پورا ہر ہی اس کو دیدے تو اس صورت میں خاوند کی مرضی سے پورا ہی ہر اور اگر نا ہوگا
 اور دالے (پہلے) تمہارا (اپنے حقوق کو) معاف کر دینا بہ نسبت وصول کرنے کے تقویٰ سے زیادہ قریب
 ہے (کیونکہ معاف کرنے سے ثواب ملتا ہے، اور ثواب کا کام کرنا ظاہر ہے کہ تقویٰ کی بات ہو)
 اور آپس میں احسان (اور رعایت) کرنے سے عظمت مت کر دو، بلکہ ہر شخص دوسرے کے
 ساتھ رعایت کرنے کا خیال رکھا کرے) بلاشبہ اللہ تعالیٰ تمہارے سب کاموں کو خوب دیکھتے
 ہیں (تو تم اگر کسی کے ساتھ رعایت و احسان کر دے اللہ تعالیٰ اس کی جزائے خیر تم کو
 دیں گے) (بیان القرآن)

معارف و مسائل

لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِنْ طَلَقْتُمُ النِّسَاءَ مَا لَمْ تَمْسُوهُنَّ أَوْ تَفْسُوهُنَّ ۳۷
 لحاظ سے چار صورتیں ہو سکتی ہیں ان میں سے دو کا حکم ان آیات میں بیان کیا گیا ہے، ایک یہ کہ ہر معشرہ
 نہ صحبت و خلوت، دوسری یہ کہ ہر تو مقرر ہو لیکن صحبت و خلوت کی نوبت نہ آئے، تیسری صورت
 یہ ہے کہ ہر بھی معشرہ ہو اور صحبت کی بھی نوبت آدے، اس میں جو ہر مقرر کیا ہے پورا دینا ہوگا،
 یہ حکم شرآن مجید میں دوسرے مقام پر بیان کیا گیا ہے، چوتھی صورت یہ ہے کہ ہر متعین نہ کیا،
 اور صحبت یا خلوت کے بعد طلاق دی، اس میں ہر مثل پورا دینا ہوگا، یعنی جو اس عورت کی قوم میں
 رواج ہے، اس کا بیان بھی ایک دوسری آیت میں آیا ہے۔

مذکورہ آیت میں پہلی دو قسموں کا حکم بیان کیا گیا ہے، اس میں سے پہلی صورت کا حکم یہ ہے
 کہ ہر کچھ واجب نہیں مگر زوج پر واجب ہے کہ اپنے پاس سے عورت کو کچھ دیدے، کم از کم یہی
 کہ ایک جوڑا پٹریے کا دیدے، دراصل شرآن کریم نے اس عطیہ کی کوئی مقدار متعین نہیں کی
 البتہ یہ بتلادیا کہ مالدار کو اپنی حیثیت کے مطابق دینا چاہئے، جس میں اس کی ترجیح ہے کہ صاحبیت

اس میں تنگی سے کام نہ لے، حضرت حسنؑ نے ایسے ہی ایک واقعہ میں مطلقہ عورت کو بیس ہزار کا علیہ دیا، اور قاضی شریحؒ نے پانسو درہم کا، اور حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ ادنیٰ درجہ پر ہر کہ ایک جوڑا کپڑے کا دیدے (قرطبی)

اور دوسری صورت کا حکم یہ ہے کہ جس عورت کا ہر نکاح کے وقت مقرر ہوا ہو، اور اس کو قبل صحبت و خلوت مجھ کے طلاق دیدی ہو تو مقرر کئے ہوئے ہر کا نصف مرد کے لئے واجب ہوگا، البتہ اگر عورت معاف کر دے یا مرد پورا دیدے تو اختیار ہی اس کا ہے، جیسا کہ آیت **إِلَّا أَنْ يَعْفُوَنَّ أَوْ يُعْفُوا إِلَيْهِ** کا حوالہ ہے۔

(۱) مرد کے پورا ہر دینے کو بھی معاف کئے لفظ سے شاید اس لئے تعبیر کیا کہ عام عادت عوب کی یہ تھی کہ ہر کی رقم شادی کے ساتھ ہی دیدی جاتی تھی، تو طلاق قبل از خلوت کی صورت میں وہ نصف واپس لینے کا حق دار ہو گیا، اب اگر وہ رعایت کر کے اپنا نصف واپس نہ لے تو یہ بھی مشا ہی کرتا ہے، اور معاف کر لے کر افضل اور اقرب للفقہی قرار دیا، کیونکہ یہ معافی علامت اس کی ہے کہ تعین نکاح کا قطع کرنا بھی احسان اور حسن سلوک کے ساتھ ہوا جو مقصد شریعت اور موجب ثواب عظیم ہے، خواہ معافی عورت کی طرف سے ہو یا مرد کی طرف سے۔

(۲) **أَلَّذِي يَعْفُو عَنْ نِكَاحِ** کی تفسیر خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمائی دلی عقد **النكاح الزوج**، یعنی عقد نکاح کا مالک شوہر ہے، یہ حدیث دارقطنی میں بروایت عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جبہ عن قول ہے، اور حضرت علیؓ اور حضرت ابن عباسؓ بھی (قرطبی) اس سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ نکاح مکمل ہو جانے کے بعد نکاح کو قائم رکھنے یا ختم کرنے کا مالک شوہر ہے، طلاق دہی دے سکتا ہے، عورت کا طلاق میں کوئی اختیار نہیں۔

حَفِظُوا عَلَى الصَّلَوَاتِ وَالصَّلَاةِ الْوُسْطَىٰ وَقُومُوا لِلَّهِ قَانِتِينَ ۝۳۹

خبردار رہو سب نمازوں سے اور پنج والی نماز سے اور کھڑے رہو اللہ کے آگے ادب سے

فَإِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا أَوْ رُكْبَانًا فَإِذَا أَمْسَلْتُمْ فَاذْكُرُوا اللَّهَ كَمَا

بہرا اگر تم کو ڈر ہو کسی کا تو پیادہ پڑھو یا سوار پھر جس وقت تم امن پاؤ تو یاد کرو اللہ کو جس طرح

عَلَّمَكُمْ مَا لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ ۝۴۰

کہ تم کو سکھایا ہے جس کو تم نہ جانتے تھے۔

خلاصہ تفسیر

حکم نمبر ۳۳ نمازوں کی حفاظت کا بیان | اس سے آگے جیسے طلاق وغیرہ کے احکام ہیں، درمیان میں نماز کے احکام بیان منسباً اشارہ اس طرف ہے کہ مقصود اصلی توجہ الی الحق ہے، اور معاشرت اور معاملات کے احکام سے علاوہ اور مصامتوں کے اس توجہ کی حفاظت اور ترقی بھی مقصود ہو، چنانچہ جب ان کو خدائی احکام سمجھ کر عمل کیا جاوے گا تو توجہ لازم ہوگی، پھر یہ کہ ان احکام میں ادائے حقوق عباد بھی ہے اور حقوق عباد کے اطلاق سے درجہ الہی سے دردی ہوتی ہے، جس کے لازم میں سے حق و عہد دونوں کی طرف سے بے توجہی ہے، چونکہ نماز میں یہ توجہ زیادہ ظاہر ہے اس لئے اس کے درمیان میں لانے سے اس توجہ کے مقصود ہونے پر زیادہ دلالت ہوگی، تاکہ بندہ اس توجہ کو ہر وقت پیش نظر رکھے۔

حَفِظُوا عَلَى الصَّلَوَاتِ وَالصَّلَاةِ الْوُسْطَىٰ والی قول، تاکہ **تَكُونُوا تَعْلَمُونَ**، حفاظت کرو سب نمازوں کی (عموماً) اور درمیان والی نماز (یعنی عصر) کی (خصوصاً) اور (نماز میں) کھڑے ہو اگر اللہ کے سامنے عاجز بنے ہوئے، پھر اگر تم کو (باقاعدہ نماز پڑھنے میں کسی دشمن وغیرہ کا) اندیشہ ہو تو کھڑے کھڑے یا سوار پر چڑھے چڑھے (جس طرح بن سکے خواہ قبلہ کی طرف بھی نہ ہو) یاد ہو اور گور کو رع و سجود صرف اشارہ ہی سے ممکن ہو، پڑھ لیا کرو (اس حالت میں بھی اس پر محافظت رکھو اس کو ترک مت کرو) پھر جب تم کو (بالکل) اطمینان ہو جاوے (اور اندیشہ جانا نہ رہے) خدائے تعالیٰ کی یاد (یعنی اولائے نماز) اس طریق سے کرو جو تم کو (اطمینان کی حالت میں) سکھایا ہے جس کو تم (پہلے سے) نہ جانتے تھے۔

معارف مسائل

کثرت سے علماء کا قول بعض احادیث کی دلیل سے یہ ہے کہ پنج والی نماز مرد و عورت کے لیے اس کے ایک طرف دو نمازیں دن کی ہیں فجر اور ظہر اور ایک طرف دو نمازیں رات کی ہیں، مغرب اور عشاء، اس کی تاکید خصوصیت کے ساتھ اس لئے کی گئی کہ اکثر لوگوں کو یہ وقت کام کی مصروفیت کا ہوتا ہے، اور "عاجزی" کی تفسیر حدیث میں سکوت کے ساتھ آئی ہے۔

اسی آیت سے نماز میں باتیں کرنے کی ممانعت ہوتی ہے، پہلے کلام کرنا درست تھا۔ اور یہ نماز کھڑے کھڑے اشارہ سے جب صحیح ہوگی جب ایک جگہ کھڑا ہو سکے، اور اس میں سجدے کا اشارہ ذرا زیادہ پست کرے، اور چلنے سے نماز نہیں ہوگی، البتہ جب ایسا ممکن نہ ہو، مثلاً عین لڑائی کا وقت ہو، تو نماز کو قضا کر دیا جاوے گا، دوسرے وقت پڑھ لیں۔ (بیان القرآن)

وَالَّذِينَ يَتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُونَ أَزْوَاجًا وَلَهُنَّ أَزْوَاجٌ

اور جو لوگ تم میں سے مر جادیں اور چھوڑ جائیں اپنی عورتیں تو وہ وصیت کر دیں اپنی عورتوں کا کچھ

مَتَاعًا إِلَى الْحَوْلِ غَيْرِ إِخْرَاجٍ ۚ فَإِنْ خَرَجْنَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِي مَا

خرچ دینا ایک برس تک بغیر نکالنے کے مگر سے بھر اگر وہ عورتیں آپ نکل جادیں تو کچھ گناہ نہیں تم پر اس میں کہ

فَعَلْنَ فِي أَنْفُسِهِنَّ مِنْ مَعْرُوفٍ ۚ وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ﴿۳۱﴾

کر دیں وہ عورتیں اپنے حق میں بھلی بات اور اللہ زبردست ہے حکمت والا

وَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ فِيمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ۚ وَالْمُطَلَّقَاتُ مَتَاعٌ بِالْمَعْرُوفِ حَقَّاقَةٌ ۚ كَذَلِكَ

اور طلاق دی ہوئی عورتوں کے واسطے خرچ دینا ہے فائدہ کے موافق لازم ہو پر ہر کاروں پر اسی طرح

يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمُ آيَاتِهِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ ﴿۳۲﴾

بیان فرماتا ہے اللہ تعالیٰ تمہارے واسطے اپنے حکم تاکہ تم سمجھ لو۔

خلاصہ تفسیر

حکم نمبر ۳۵، بیوہ عورت کی سکونت اور متاع کی بعض اقسام کا بیان

لوگ وفات پا جاتے ہیں تم میں سے اور چھوڑ جاتے ہیں بیویوں کو (ان کے

ذمہ لازم ہے کہ وہ وصیت کر جایا کریں اپنی بیویوں کے واسطے ایک سال تک (نان و نفقہ

اور گھر میں سکونت رکھنے سے) منتفع ہونے کی اس طور پر کہ وہ گھر سے نکالی نہ جادیں ہاں اگر چاہیں

دس دن کے بعد رخصت حل کے بعد عدت گزار کر خود نکل جادیں تو تم کو کوئی گناہ نہیں،

اس قاعدہ کی بات میں جس کو اپنے بائے میں (تجویز) کریں (جیسے نکاح وغیرہ) اور اللہ تعالیٰ

زبردست ہیں (ان کے خلاف حکم مت کر دو) اور حکمت والے ہیں (کہ تمام احکام میں تمہارا

مصلحتیں ملحوظ رکھی ہیں گو تمہاری فہم میں نہ آسکیں)

وَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ فِيمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ۚ وَالْمُطَلَّقَاتُ مَتَاعٌ بِالْمَعْرُوفِ ۚ

دی ہوئی عورتوں کے لئے کچھ فائدہ پہنچانا (کسی درجہ میں معسر ہی) قاعدہ کے موافق (اور یہ) مقرر ہوا

ہے ان پر جو (شرک و کفر سے) پرہیز کرتے ہیں (یعنی مسلمانوں پر خواہ یہ معسر ہو تا وجوب کے

درجہ میں ہو یا استحباب کے مرتبہ میں) اسی طرح حق تعالیٰ تمہارے (عمل کرنے کے) لئے اپنے احکام

بیان فرماتے ہیں اس توقع پر کہ تم (ان کو) سمجھو (اور عمل کرو)۔

معارف مسائل

(۱) وَالَّذِينَ يَتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُونَ أَزْوَاجًا ۚ وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ۚ

وفات زدوں کی عدت ایک سال تھی اور اسلام میں بجائے ایک سال کے چار مہینے دس دن

مقرر ہوئے جیسا کہ اقبل ہی آیت یَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا بَلَغَتِ الْمَرْءُ أَشْهُرَ وَعَشْرًا ۚ اسے معلوم ہو چکا کہ

مگر اس میں عورت کی اتنی رعایت رکھی گئی تھی کہ چونکہ اس وقت تک میراث کا حکم نازل نہ ہوا تھا،

اور بیوی کا کوئی حصہ میراث میں معسر نہ ہوا تھا، بلکہ اوروں کے حق کا مدار محض مردے کی

وصیت پر تھا جیسا کہ آیت کُتِبَ عَلَيْكُمُ إِذَا أَحْصَيْتُمُ وَا ۚ کی تفسیر میں معلوم ہو چکا ہے، اسلئے

یہ حکم ہو گیا تھا کہ اگر عورت اپنی مصلحت سے خاوند کے ترکہ کے گھر میں رہنا چاہو تو سال بھر تک

اس کو رہنے کا حق حاصل ہے، اور اسی کے ترکہ سے اس ذات میں اس کو نان نفقہ بھی دیا جاوے

اس آیت میں اسی کا بیان ہے اور غا دندوں کو حکم ہے کہ اس طرح کی وصیت کر جایا کریں،

اور چونکہ یہ حق عورت کا تھا، اس کو اس کے وصول کرنے نہ کرنے کا اختیار حاصل تھا اس لئے

وارثوں کو تو گھر سے نکالنا جائز تھا، لیکن خود اس کو جائز تھا کہ خود اس کے گھر نہ رہے، اور اپنا

حق درخ کو چھوڑ دے، بشرطیکہ عدت پوری ہو چکے، اور نکاح وغیرہ سب درست تھا، اور یہی

مراد ہے قاعدہ کی بات سے، البتہ عدت کے اندر نکلا اور نکاح کرنا وغیرہ سب گناہ تھا عورت

کے لئے بھی اور جو منع کر سکے اور نہ روکے اس کے لئے بھی، پھر جب آیت میراث کی نازل

ہوئی، گھر بار سب ترکہ میں سے عورت کا حق مل گیا، سو اپنے حصہ میں رہے، اور اپنے حصہ

سے خرچ کرے، یہ آیت منسوخ ہو گئی۔

(۲) وَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ فِيمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ۚ وَالْمُطَلَّقَاتُ مَتَاعٌ بِالْمَعْرُوفِ ۚ

پہلی آیت میں بھی آپکا ہے مگر وہ صرف دو قسم کی مطلقات کے لئے تھا، جن کو صحبت خلوت

سے پہلے طلاق ہو گئی ہو، ایک کو فائدہ پہنچانا یہ تھا کہ جوڑا دیا جلتے، دوسری کو فائدہ پہنچانا یہ

تھا کہ آدھا مہر دیا جائے، اب وہ طلاق والیاں رہ گئیں جن کو صحبت یا خلوت کے بعد طلاق دی جاوے

سوائے جس کا مہر معسر کیا گیا ہو اس کو فائدہ پہنچانا یہ ہے کہ پورا مہر دینا چاہئے، اور جس کا مہر معسر

نہ اور قاعدہ سے مراد یہ تفصیل ہو جاتے گی، اور ہر صورت کے وجوب اور استحباب کا فرق دوسرے دلائل سے ثابت

کیا جائے گا، اور خدا کو واجب کے معنی میں نہیں ملے اور علی الزام کے لئے نہ ہوگا، بلکہ بعض تاکید کے لئے

ہوگا مگر درجہ استحباب ہی نہیں (بیان العسکران)

نہ کیا جاوے اس کے لئے بعد دخول کے ہر مثل واجب ہے، یہ متاع بمعنی مطلق فائدہ پہنچانا اس تفصیل سے تو واجب ہے، اور اگر متاع سے مراد فائدہ خاص یعنی تحفہ یا جوڑا دینا ہی لیا جائے تو ایک مطلقہ کو تو دینا واجب ہے، جس کا ذکر اقبل میں آچکا ہے، اور باقی سب اقسام میں مستحب ہے، اور اگر متاع سے مراد نفقہ لیا جاوے تو جس طلاق میں عدت ہے اس میں عدت گزرنے تک واجب ہے، خواہ طلاق رجعی ہو یا بائن، غرض آیت اپنے الفاظ عامہ سے سب صورتوں کو شامل ہے۔

الْمُتَرَاتِي الَّذِينَ خَرَجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ وَهُمْ أُلُوفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ

کیا نہ دیکھا کہ ان لوگوں کو جو کہ نکلے اپنے گھروں سے اور وہ ہزاروں تھے موت کے ڈر سے

فَقَالَ لَهُمْ اللَّهُ مُوتُوا ثُمَّ أَحْيَاهُمْ إِنَّ اللَّهَ لَذُو فَضْلٍ عَلَى

پھر فرمایا ان کو اللہ نے کہ مر جاؤ پھر ان کو زندہ کر دیا بیشک اللہ فضل کرنے والا ہے

النَّاسِ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُونَ ﴿۲۳۳﴾ وَقَالُوا إِنِّي مَسْبُورُونَ

لوگوں پر لیکن اکثر لوگ شکر نہیں کرتے اور لڑاؤ اللہ کی راہ میں

وَأَعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿۲۳۴﴾

اور جان لو کہ اللہ بے شک خوب سنتا جانتا ہے۔

خلاصہ تفسیر

دائے مخاطب، کیا تجھ کو ان لوگوں کا قصہ تحقیق نہیں ہوا جو کہ اپنے گھروں سے نکل گئے اور وہ لوگ ہزاروں ہی تھے موت سے بچنے کے لئے سوائے اللہ

ان کے لئے (حکم) فرمادیا کہ مر جاؤ (سب مر گئے) پھر ان کو جلا دیا، بیشک اللہ تعالیٰ بڑا افضل کرنے والے ہیں لوگوں کے حال اب یہ مگر اکثر لوگ شکر نہیں کرتے اور اس واقعہ پر غور کر کے اللہ کی راہ میں قتال کرو اور یقین رکھو اس بات کا کہ اللہ تعالیٰ خوب سننے والے اور خوب جاننے والے ہیں رجاء کرنے اور نہ کرنیوالوں کی باتیں سننے اور ہر ایک کی نیت جانتے ہیں، اور سب کو مناسب جزا دیں گے

معارف و مسائل

یہ تین آیتیں جو اوپر مذکور ہوئی ہیں ان میں ایک عجیب لمیح انداز میں اللہ تعالیٰ کی راہ میں جان و مال کی قربانی پیش کرنے کی ہدایت ہے کہ ان احکام کے بیان کرنے سے پہلے تاریخ کا ایک اہم واقعہ ذکر کیا گیا ہے جس سے واضح ہو جاتا ہے کہ موت و حیات تقدیر الہی کے

تاریخ ہے، جنگ و جہاد میں جانا موت کا سبب نہیں اور بزدلی سے جان بچانا موت سے بچنے کا ذریعہ نہیں، تفسیر ابن کثیر میں سلب صحابہ اور تابعین کے حوالہ سے اس واقعہ کی تشریح یہ بیان کی ہو کہ بنی اسرائیل کی کوئی جماعت ایک شہر میں بستی تھی، اور وہاں کوئی سخت دیوار طاعون وغیرہ پھیلا، یہ لوگ جو تقریباً دس ہزار کی تعداد میں تھے گھبرا اٹھے، اور موت کے خوف سے اس شہر کو چھوڑ کر سب کے سب دو پہاڑوں کے درمیان ایک وسیع میدان میں جا کر مقیم ہو گئے، اللہ تعالیٰ نے ان پر اور دنیا کی دوسری قوموں پر یہ واضح کرنے کے لئے کہ موت سے کوئی شخص بھاگ کر جان نہیں چھڑا سکتا، دو فرشتے بھیج دیے، جو میدان کے دونوں سروں پر آکھڑے ہوئے، اور کوئی ایسی آواز دی جس سے سب کے سب بیک وقت فرے ہوئے رہ گئے، ایک بھی زندہ نہ رہا، اس پاس کے لوگوں کو جب اس واقعہ کی اطلاع ہوئی، یہاں پہنچے، دس ہزار انسانوں کے کفن و دفن کا انتظام آسان نہ تھا، اس لئے ان کے گرد ایک احاطہ کھینچ کر حظیرہ جیسا بنا دیا، ان کی لاشیں حسب دستور گل مٹھیں، ہڈیاں پڑی رہ گئیں، ایک زمانہ دراز کے بعد بنی اسرائیل کے ایک پیغمبر جن کا نام حسرت بن قیل بتلایا گیا ہے، اس مقام پر گزرے، اس حظیرہ میں جگہ جگہ انسانی ہڈیوں کے ڈھانچے بکھرے ہوئے دیکھ کر حیرت میں رہ گئے، بذریعہ وحی ان کو ان لوگوں کا پورا واقعہ بتلا دیا گیا، حضرت حزقیل علیہ السلام نے دعا کی کہ یا اللہ ان لوگوں کو بھر زندہ فرما دے، اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا قبول فرمائی، اور انھیں حکم دیا گیا کہ آپ ان شکستہ ہڈیوں کو اس طرح خطاب کریں۔

ایہما العظام البالیتۃ ان اللہ

یا مریک ان تجتبعی

پیغمبر کی زبان سے خدا تعالیٰ کا حکم ان ہڈیوں نے سنا اور حکم کی تعمیل کی، جن کو دنیا میں قتل

ہے شہر بستی ہے مگر دنیا کے ہر ذرہ ذرہ کی طرح وہ بھی تابع فرمان اور اپنے وجود کے مناسب

عقل و ادراک رکھتی ہیں، اور اللہ تعالیٰ کی مطیع ہیں، مگر ان کریم نے آیت اَعْطِیْ سُلَیْمٰنَ شَيْءًا مِّنْ خَلْقِ

شُعْطٰی (۵۰:۱۷) میں اس کی طرف اشارہ فرمایا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کو پیدا فرمایا پھر اس کو

اس کے مناسب حال ہدایت فرمائی، مولانا رومیؒ نے ایسے ہی امور کے متعلق فرمایا ہے

خاک و باد و آب و آتش بندہ اند

بامن و تو مردہ باحق زندہ اند

بہر حال ایک آواز پر ہر انسان کی ہڈیاں اپنی اپنی جگہ لگ گئیں، پھر حکم ہوا کہ اب ان

کو یہ آواز دو۔

ایہما العظام ان اللہ یا مریک

تین لے ہڈی اللہ تعالیٰ تمھیں حکم دیتا ہو

ان تکلتی لحيماً وعصباً وجلبلاً | اپنا گوشت ہیں لا اور پٹھے اور کھال درست کر دو
یہ کہنا تھا کہ ہڈیوں کا ہڑ ہا پھر ان کے دیکھتے دیکھتے ایک شکل لاش بن گئی، پھر حکم ہوا کہ
اب ارواح کو یہ خطاب کیا جائے۔

ایہما الاصلان ان الله یا مریک | یعنی اے ارواح تمہیں اللہ تعالیٰ حکم دیتا ہے
ان ترجع کل روح الی الجسد | کہ اپنے اپنے بدنوں میں لوٹ آئیں جن کی تعمیر
الذی کانت تعمرو | رجعت ان سے وابستہ تھی۔

یہ آواز دیتے ہیں ان کے سامنے سارے لاشے زندہ ہو کر کھڑے ہو گئے، اور حیرت سے چار طرف
دیکھنے لگے، سب کی زبانوں پر تھا مِثْعَاتِلَکَ لَا إِلَهَ إِلَّا أَنتَ۔

یہ واقعہ عالم دنیا کے ظالموں اور مظلوم کے لئے دعوتِ فکر اور منکرینِ قیامت پر محنت
قائمہ ہونے کے ساتھ اس ہدایت پر بھی مشتمل ہے کہ موت کے خوف سے بھاگنا غمراہی ہے
جو یا کسی ربا و طاعون سے اللہ تعالیٰ اور اس کی تقدیر پر ایمان رکھنے والے کے لئے ممکن نہیں، جبکہ
یہ ایمان ہے کہ موت کا ایک وقت مقرر ہو گا اس سے ایک سیکنڈ پہلے آسکتی ہے، اور ایک سیکنڈ
مؤخر ہو سکتی ہے، اس لئے یہ حرکت فضول بھی ہے، اور اللہ تعالیٰ کی ناراضی کا سبب ہونے کی
وجہ بھی۔

اب اس واقعہ کو مفسران کے الفاظ سے دیکھئے، بیان واقعہ کے لئے قرآن نے مندرمایا
أَنفَرْنَا إِلَى الْبِیِّنَاتِ خَرَجْنَا مِنْ دُبَارِهِمْ، یعنی کیا آپ نے ان لوگوں کے واقعہ کو نہیں دیکھا جو
اپنے گھروں سے بڑے موت محل کھڑے ہوئے تھے؟

یہاں یہ بات قابلِ غور ہے کہ یہ واقعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے سے ہزاروں
برس پہلے کا ہے، اس کے دیکھنے کا حضورؐ سے سوال ہی نہیں ہو سکتا، تو یہاں أَنفَرْنَا فرماتے کا کیا
مشاہدہ ہے، مفسرین نے فرمایا ہے کہ ایسے تمام مواقع میں جہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو لفظ
أَنفَرْنَا کے ساتھ خطاب کیا گیا ہے، حالانکہ واقعہ آپ کے زمانے سے پہلے کا ہے، جس کے دیکھنے
کا کوئی تصور نہیں ہو سکتا، ان سب مواقع میں رویت سے رویت قلبی مراد ہوتی ہے جس کے معنی
میں علم و ادراک یعنی أَنفَرْنَا ایسے مواقع میں أَلَمْ نَعْلَمْ کے معنی میں ہوتا ہے، لیکن اس کو لفظ أَلَمْ
نَعْلَمْ سے تعبیر کرنے میں حکمت اس واقعہ کے مشہور و مشہور ہونے کی طرف اشارہ کرتا ہے، کہ یہ واقعہ
ایسا یقینی ہے جیسے کوئی آج دیکھ رہا ہو اور دیکھنے کے قابل ہو، أَلَمْ نَعْلَمْ کے بعد حسرتِ اِلٰی
پر حالے سے اذرتے زبان میں ان کی ایک بڑی تعداد ہونے کا بیان فرمایا گیا وَهَمَّ أَكْثَرُ

اس کے بعد مفسران میں ان کی ایک بڑی تعداد ہونے کا بیان فرمایا گیا وَهَمَّ أَكْثَرُ

یعنی وہ لوگ ہزاروں کی تعداد میں تھے، اس تعداد کی تعیین میں روایات مختلفہ ہیں، لیکن عربی
زبان کے قاعدہ سے یہ لفظ جمع کثرت ہے، جس کا اطلاق دس سے کم پر نہیں ہوتا، اس سے معلوم
ہوا کہ ان کی تعداد دس ہزار سے کم نہ تھی۔

اس کے بعد ارشاد ہے فَقَالَ لَهُمُ اللَّهُ مَوْتُوا، یعنی کہہ دیا ان کو اللہ تعالیٰ نے کہ موات
اللہ تعالیٰ کا یہ حکم بلا واسطہ بھی ہو سکتا ہے اور بلا واسطہ کسی فرشتے کے بھی، جیسے دوسری آیت میں
ارشاد ہے، إِذَا أَرَادَ شَيْءًا أَن يَقُولَ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ۔ (۸۲:۳۶)

اس کے بعد فرمایا ہے إِنَّ اللَّهَ لَذُو فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ، یعنی اللہ تعالیٰ بڑا فضل کرنے
والے ہیں لوگوں پر، اس میں وہ فضل بھی داخل ہے جو بنی اسرائیل کی اس قوم کو دوبارہ زندہ کر کے
فرمایا، اور یہ فضل بھی شامل ہے جو یہ واقعہ امت محمدیہ کو بظاہر ان کے لئے درسِ عبرت بنا یا۔

آخر میں خلقتِ شعائر انسان کو بیدار کرنے کے لئے فرمایا وَفَيَكُنْ أَكْثَرُ النَّاسِ لَا يَشْكُرُونَ
یعنی اللہ تعالیٰ کے فضل و رحمت کے ہزاروں مظاہر انسان کے سامنے آتے رہتے ہیں، مگر اس کے
ادوار اکثر انسان شکر گزار نہیں ہوتے۔

مسائل متعلقہ

اس آیت سے چند مسائل اور احکام مستفاد ہوتے ہیں۔

۱۔ **تدبیر اللہ** | اول یہ کہ تقدیر الہی کے مقابلے میں کوئی تدبیر کارگر نہیں ہو سکتی، اور چہارے یا
طاعون وغیرہ سے بھاگنا جان بچانے کا ذریعہ نہیں ہو سکتا، اور نہ ان میں قاسم رہنا
موت کا باعث ہوتا ہے، بلکہ موت کا ایک وقت معین ہے نہ اس میں کمی ہو سکتی ہے نہ زیادتی۔

۲۔ **میراث** | دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ جس شہر میں کوئی ربانی مرض طاعون وغیرہ
پھیل چکا ہو اس سے بھاگ کر کہیں پھیل چکا ہو اس سے بھاگ کر دوسری جگہ جانا جائز نہیں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم
ان ہمارے ہمارے ہیں | کے ارشاد میں اس پر اتنا اور اضافہ ہے کہ دوسرے لوگوں کو وہاں جانا
بھی درست نہیں، حدیث میں ہے:

ان هذا القسم عذب به الامم
قبلکم فاذا اصابکم به فی الارض
فلا تدخلوها واذ وقع بارض
واستقمعھا فلا تخرجوا فراساً
(بخاری، مسلم، ابی کثیر)

یعنی اس بیماری طاعون کبیر اللہ تعالیٰ نے
تم سے پہلے قوموں پر عذاب نازل فرمایا ہے
سو جب تم پر سنو کہ کسی شہر میں طاعون وغیرہ
ربانی مرض پھیل رہا ہے تو وہاں نہ جاؤ، اور اگر
کسی جگہ پر یہ مرض پھیل جائے اور تم وہاں پہنچ
ہو تو وہاں سے بھاگ کر نہ بھاگو۔

تفسیر قرطبی میں ہے کہ حضرت فاروق اعظمؓ نے ایک مرتبہ ملک شام کے قصد سے سفر کیا، سرحد شام پر تہوک کے قریب ایک مقام میں پہنچ کر معلوم ہوا کہ ملک شام میں سخت طاعون پھیلا ہوا ہے، یہ طاعون ملک شام کی تاریخ میں ایک عظیم سانحہ تھا، یہ طاعون عموماً کے نام سے مشہور ہے، کیونکہ اول یہ طاعون ایک بستی عموماً نامی میں شروع ہوا، جو بیت المقدس کے قریب ہے، پھر سارے ملک میں پھیل گیا، ہزار ہا انسان جن میں بیت سے صحابہؓ و تابعینؓ بھی تھے، اس طاعون میں شہید ہوئے۔

فاروق اعظمؓ نے طاعون کی شدت کی خبر سنی تو اسی مقام پر ٹھہر کر صحابہ کرامؓ سے مشورہ کیا کہ ہمیں ملک شام میں اس وقت جانا چاہیے یا رہیں ہونا مناسب ہے، اس وقت جتنے حضرات مشورہ میں شریک تھے ان میں کوئی ایسا نہ تھا جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کے متعلق کوئی حکم سنا ہو، بعد میں حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ نے اطلاع دی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد اس معاملے کے متعلق یہ ہے:

ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
ذکر الوجد فقال رجز عن اسب
عن مہ الامم ثم بقى منه
بقية في ذل المرو وياتي
الاخرى فمن سمع به بارض
فلا يقدر من عليه ومن كان
بارض وقع بها فلا يخرج فرا
منه، رواه البخاري عن انس
من ذيل وخرجه الاثمة بمثله۔

حضرت فاروق اعظمؓ نے جب یہ حدیث سنی تو رفقاء کو واپسی کا حکم دیدیا، حضرت ابو عبیدہؓ ملک شام کے عامل و امیر مقرر ہوئے، اس مجلس میں موجود تھے، فاروق اعظمؓ کا یہ حکم سن کر فرامان لگے، افراسامہ من قدر اللہ، یعنی کیا آپ اللہ تعالیٰ کی تقدیر سے بھاگنا چاہتے ہیں! فاروق اعظمؓ نے جواب میں فرمایا، ابو عبیدہؓ کا ش یہ بات کوئی اور کہتا، یعنی تمہاری زبان سے ایسی بات قابلِ تعجب ہے، اور پھر فرمایا:

فمن نفر من قدر الله الى
قدر الله
ترشكتم انك قد رى الله في تقدي
كل من بھاگتے ہیں۔

مطلب یہ تھا کہ ہم جو کچھ کر رہے ہیں وہ اللہ ہی کے حکم کے مطابق کر رہے ہیں جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا ہے۔

دورانہ طاعون لڑنا نہ ہوا | رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد مذکور سے معلوم ہوا کہ جس شہر یا بستی کی بھشتیں میں طاعون وغیرہ امراض وبائی پھیلے ہوئے ہوں باہر والوں کو وہاں جانا ممنوع ہے اور وہاں کے رہنے والوں کو اس جگہ سے بخوبی موت بھاگنا ممنوع ہے۔

اور اس کے ساتھ اسلام کا بنیادی عقیدہ یہ ہے کہ نہ کسی جگہ جانا موت کا سبب ہے، نہ کہیں سے بھاگنا نجات کا سبب، اس اہم عقیدہ کے ہوتے ہوئے حکم مذکور بڑی دور رس حکمتوں پر مبنی ہے، باہر والوں کو وہاں جانے سے روکنے کی ایک حکمت تو یہ ہے کہ ممکن ہے وہاں پہنچ کر کسی کی عمر ختم ہو چکی ہو اور اس مرض میں مبتلا ہو کر انتقال ہو گیا تو مرنے والے کو کسی یہ گمان ہو گا کہ اگر میں یہاں نہ آتا تو زندہ رہتا، اور دوسروں کو بھی یہی خیال ہو گا کہ یہاں آنے سے اس کی موت واقع ہوتی، حالانکہ جو کچھ ہوا وہ پہلے سے لکھا ہوا تھا، اس کی عمر اتنی ہی تھی، کہیں بھی رہتا، اس وقت اس کی موت لازمی تھی، اس حکم میں مسلمانوں کے عقیدہ کو تذبذب سے بچایا گیا کہ وہ غلطی کا شکار نہ ہوں۔

دوسری حکمت یہ بھی ہے کہ حق تعالیٰ نے انسان کو یہ ہدایت دی ہے کہ جس جگہ تکلیف پہنچنے کا خطرہ ہو یا جہاں ہلاکت کا اندیشہ ہو وہاں نہ جائے، بلکہ معتد در بھراہیں چیزوں سے بچنے کی فکر کرے جو اس کے لئے مصراً ہلاکت کا سبب بنتی ہیں، اور اپنی جان کی حفاظت ہر انسان کے لئے ہر واجب قرار دی ہے، اس قاعدہ کا تقاضا یہ بھی ہے کہ تقدیر الہی پر ایمان کامل رکھتے ہوئے احتیاطی تدبیروں میں کمی نہ کرے، اور ایک تدبیر یہ بھی ہے کہ ایسی جگہ نہ جائے جہاں جان کا خطرہ ہو۔ اسی طرح اسی بستی کے رہنے والوں کو بخوبی موت وہاں سے بھاگنے کی ممانعت میں بھی بہت سی حکمتیں ہیں۔

ایک حکمت تو اجتماعی اور عوامی ہے کہ اگر یہ بھاگنے کا سلسلہ چلا تو امیر اور پیسے والے اور قدرت و طاقت والے آدمی تو بھاگ جائیں گے، مگر بستی میں ایسے ضعیف، مرد و عورت کا بھی عادی ہونا لازمی ہے جو کہیں جانے پر قدرت نہیں رکھتے، ان کا حشر کیا ہو گا، ازل تو وہ تنہا رہ کر ہیست ہی سے مرنے لگیں گے، پھر ان میں جو بیمار ہیں ان کی خبر گیری کون کرے گا، مر جائیں گے تو دُشمن کف کا انتظام کیسے ہو گا۔

دوسری حکمت یہ ہے کہ جو لوگ اس جگہ موجود ہیں بعید نہیں کہ ان میں اس مرض کے جراثیم اڑ کر کچھ ہوں ایسی حالت میں وہ سفر کریں گے تو اور زیادہ مصیبتوں اور مشقتوں کے شکار ہوں گے۔

سفر کی حالت میں بیمار ہوئے تو ظاہر ہے کہ ان پر کیا گذرے گی، ابن المدینی نے ملایہ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ:

ما فرأى أحد من الصبيان فسلم
(قروطنی) | یعنی جو شخص وہاں سے بھاگتا ہے وہ بھی مسلم
نہیں رہتا۔

تیسری حکمت یہ بھی ہے کہ اگر ان میں مرض کے جراثیم سرایت کر چکے ہیں تو یہ مختلف بستیوں میں پھینک دیے جائیں گے، تو وہاں وہابی جراثیم پھیلیں گے، اور اگر اپنی جگہ صبر و قوت کے ساتھ ٹھہرے رہے تو بہت ممکن ہے کہ مرض سے نجات حاصل ہو جائے، اور بالفرض اسی مرض میں موت مقدر تھی تو ان کو اپنے ممبر و ثبات کی وجہ سے درجہ شہادت کا ملے گا، جیسا کہ حدیث میں ارشاد ہے:

روى البخارى عن يحيى بن يعمر
عن عائشة أنها أخبرته أنها
سألت رسول الله صلى الله عليه
وسلم عن الطاعون فأنشدها
النبي صلى الله عليه وسلم أن
كان عن أبا بيهشة الله على من
يشاء فجعل الله رحمة
للمؤمنين فليس من عبد
يقم الطاعون فيسكت في بلد
صابراً يعلم أنه لن يصيبه إلا
ما كتب الله له إلا كان له مثل
اجر شهيد وهذا نصير لقوله
صلى الله عليه وسلم الطاعون
شهادة والمطعون شهيد

(قروطنی ص ۲۳۵ ج ۲)

میں ارشاد ہے کہ طاعون شہادت ہے اور طاعون زدہ شخص شہید ہے۔

بعض خاص صورتوں کا استثناء | حدیث کے الفاظ میں فلا تخرجوا فراراً منه آیا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص موت سے فرار کے لئے نہیں بلکہ اپنی کسی دوسری ضرورت سے دوسری جگہ چلا جائے تو وہ اس ممانعت میں داخل نہیں، اسی طرح اگر کسی شخص کا عقیدہ اپنی جگہ پختہ ہو

کہ یہاں سے دوسری جگہ چلا جانا مجھے موت سے نجات نہیں دے سکتا، اگر میرا وقت آگیا ہے تو جہاں جاؤں گا موت لازمی ہے، اور وقت نہیں آیا تو یہاں رہنے سے بھی موت نہیں آئے گی، یہ عقیدہ پختہ رکھتے ہوئے ٹھن آہ ہو اکی تبدیلی کے لئے یہاں سے چلا جائے تو وہ بھی ممانعت سے مستثنیٰ ہے۔

اسی طرح کوئی آدمی کسی ضرورت سے اس جگہ میں داخل ہو جہاں وہاں پھیلی ہوئی ہے، اور عقیدہ اس کا پختہ ہو کہ یہاں آنے سے موت نہیں آئے گی وہ اللہ کی مشیت کے تابع ہے، تو ایسی حالت میں اس کے لئے وہاں جانا بھی جائز ہوگا۔

تیسرا مسئلہ اس آیت سے استفادہ ہوا کہ بخوف موت چہاد سے بھاگنا بھی حرام ہے، قرآن کریم میں یہ مسئلہ دوسری جگہ زیادہ تفصیل اور وضاحت سے آیا ہے، جس میں بعض خاص صورتوں کو مستثنیٰ بھی فرمایا گیا ہے۔

جو مضمون اس آیت کا ہے تقریباً یہی مضمون دوسری آیت میں چہاد سے بھاگنے والوں یا اس میں شامل نہ ہونے والوں کے بارے میں آیا ہے، ارشاد یہ ہے:

الَّذِينَ قَالُوا لَا تَحْرِبُوهُمْ
فَقَدْ قَالُوا أَطَاعُوا مَا قُتِلُوا
أَلَمْ قَالُوا إِنَّ اللَّهَ يُحْيِي الْمَوْتَى
إِن كُنْتُمْ صَادِقِينَ ۝۱۵۱

یعنی کچھ لوگ خود بھی چہاد میں شریک نہ ہوئے اور چہاد میں شریک ہو کر شہید ہو جانے والوں کے متعلق لوگوں سے کہتے ہیں کہ ان لوگوں نے ہماری بات نہ سنی اس لئے مارے گئے، اگر یہ جگہ اتنے اہل قتل نہ ہوتے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہوا کہ آپ ان سے فرما دیں کہ اگر موت کے ہمارے سامنے ہستیاں ہیں، تو اور دن کی کیا فکر کرتے ہو تم خود اپنی فکر کرو اور اپنے آپ کو موت سے بھاؤ، میں چہاد میں جانے نہ جانے پر موقوف نہیں، تمہیں مگر بیٹھے ہوئے بھی آخر موت آئے گی۔

ممانعت قدرت سے ہے کہ صحابہ کرام کے سب بڑے جنگی جرنیل سیف اللہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ تعالیٰ عنہ جن کی اسلامی عمر ساری چہاد ہی میں گذری ہے، وہ کسی چہاد میں شہید نہیں ہوئے، بیمار ہو کر گھر میں وفات پائی، وفات کے قریب اپنے بستر پر مرنے کا افسوس کرتے ہوئے مگر والوں کو خطاب کر کے فرمایا کہ میں فلاں فلاں عظیم الشان جنگوں اور چہادوں میں شریک ہوا، اور میرا کوئی حصہ ایسا نہیں جس میں تیر یا نیزے یا چوٹ کے زخم کا اثر و نشان نہ ہو، مگر افسوس ہے کہ میں اب گدھے کی طرح بستر پر مر رہا ہوں، خدا تعالیٰ بزدلوں کو آگام نہ دے، اُن کو میری نصیحت پہنچاؤ۔

اس آیت میں بنی اسرائیل کا یہ واقعہ بطور تمہید لایا گیا تھا، اگلی آیت میں چہاد و قتال

کا حکم دیا گیا جو اس قصہ کے ذکر کرنے سے اصل مقصود تھا، کہ جہاں میں جانے کو موت یا جہنم کو نجات نہ سمجھو، بلکہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی تعمیل کر کے فلاح دارین حاصل کرو، اللہ تعالیٰ تمہاری سب باتیں سننے والے اور جاننے والے ہیں۔
تیسری آیت میں اللہ تعالیٰ کی راہ میں مال خرچ کرنے کی فضیلت کا ذکر ہے۔

مَنْ ذَا الَّذِي يُقْرِضُ اللَّهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضِعَّه لَهُ أَضْعَافًا

کون شخص ہے ایسا جو قرض دے اللہ کو اچھا قرض پھر دوگنا کر دے اللہ اس کو

کثیر ثواب دے گا ۱۰۰ گنا اور اللہ یقیناً دینے والا ہے ۱۰۰ گنا (۱۰۰ گنا)

مکنا اور اللہ ہی سب کچھ کر دیتا ہے اور اسی کی طرف ہم لوٹنے جاؤ گے۔

خلاصہ تفسیر

جہاد و غیرہ کا خبریں (کون شخص ہے ایسا) جو اللہ تعالیٰ کو قرض دے اچھے طور پر قرض دینا یعنی اخلاص کے
انفاق کی توفیق ساتھ) پھر اللہ تعالیٰ اس (قرض کے ثواب) کو بڑھا کر بہت سے حصے کر دے اور
اس کا اندیشہ مت کر دو کہ خرچ کرنے سے مال کم ہو جائے گا، کیونکہ یہ تو اللہ ہی کے قبضہ میں ہے
وہی لکھی کرتے ہیں اور وہی (فراموشی کرتے ہیں) کچھ خرچ کرنے نہ کرنے پر اس کا اصل مدار نہیں اور
تم اسی کی طرف (بعد مرے) لے جائے جاؤ گے (سو اس وقت نیک کام میں خرچ کرنے کی جبراء
اور واجب موقع پر خرچ نہ کرنے کی سزا تم کو ملے گی)

معارف و مسائل

(۱) یُقْرِضُ اللَّهَ قَرْضًا حَسَنًا، قرض سے مراد نیک عمل کرنا اور اللہ تعالیٰ کے راستے میں
خرچ کرنا ہے، اس کو قرض مجازاً کہہ دیا، ورنہ سب اللہ تعالیٰ ہی کی ملک ہے، مطلب یہ ہے کہ جیسے
قرض کا عوض ضروری دیا جاتا ہے اسی طرح تمہارے انفاق کا عوض ضروری ملے گا، اور بڑھانے کا
بیان ایک حدیث میں آیا ہے، کہ ایک خیر اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کیا جائے تو خدا تعالیٰ اس کو اتنا
بڑھاتے ہیں کہ وہ اُحد پہاڑ سے بڑا ہو جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کو قرض دینے کا یہ بھی مطلب بیان کیا گیا ہے کہ اس کے بندوں کو قرض دیا جائے

اور ان کی حاجت برآری کی جائے، چنانچہ حدیث میں مشرطن دینے کی بہت فضیلت وارد ہوئی
ہے، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

یُوَسِّلَانِ رُؤُوسَیْہِیْمَا سَلَامَانَ کُوْقُرُضَہِہِیْمَا

ما من مسلم یقرض مسلماً قرضاً

یقرض دینا اللہ کے راستے میں اس مال کے دو

مرۃ الاکان کھنڈ قنہ مرتین

دفعہ صدقہ کرنے کے برابر ہے ۵

(بخاری بوالاہی ماجہ)

(۲) ابن عربی فرماتے ہیں اس آیت کو سنکر لوگوں کے تین فرقے ہو گئے، پہلا مشرطن
بد نصیب لوگوں کا ہے جنہوں نے یہ آیت سن کر کہا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا رب ہماری طرف
محتاج ہے، اور ہم غنی ہیں۔ اس کا جواب قرآن کریم کی ایک اور آیت نَعْنٰ مَسِیْحَ اللّٰہِ
قَوْلَ الَّذِیْنَ قَالُوْا اِنَّ اللّٰہَ فَقِیْرٌ وَنَحْنُ اَغْنِیَاۗءُ سے دیا۔ دوسرا فرقہ ان لوگوں کا ہے
جنہوں نے اس آیت کو سن کر اس کے خلاف کیا، اور بخل ہی کو اختیار کر لیا، مال کی طرف زیادہ
رغبت اور اس کی حرص نے ان کو اس طرح باندھ لیا کہ ان کو اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کرنے
کی توفیق ہی نہیں ہوئی۔ تیسرا فرقہ ان مخلص مسلمانوں کا ہے جنہوں نے فوراً ہی اس آیت پر
عمل کر لیا، اور اپنا پسندیدہ مال اللہ کے راستے میں دیدیا، جیسا کہ ابوالدرداء وغیرہ، جب یہ آیت
نازل ہوئی تو حضرت ابوالدرداء نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور
آپ سے پوچھا، اللہ کے رسول! میرے مال باپ آپ پر قربان ہوں، کیا اللہ تعالیٰ ہم سے
قرض مانگتے ہیں، حالانکہ وہ قرض سے مستغنی ہیں؟ آپ نے فرمایا، ہاں اللہ تعالیٰ یہ چاہتے
ہیں کہ اس کے ذریعے ہم کو جنت میں داخل کر دیں، ابوالدرداء نے یہ سن کر کہا، اللہ کے
رسول! تم بڑھائیں، آپ نے اپنا ہاتھ بڑھا دیا، ابوالدرداء نے کہنا شروع کیا:
میں کھجور کے دو باغوں کا مالک ہوں، اس کے علاوہ میری ملک میں کچھ نہیں، میں اپنی
یہ دونوں باغ اللہ تعالیٰ کو قرض دیتا ہوں۔

آپ نے ان سے فرمایا ایک اللہ کے راستے میں وقف کر دو اور دوسرا اپنے اہل و عیال
کی معاشی ضرورت کے لئے باقی رکھو۔ ابوالدرداء نے کہا آپ گواہ رہے، ان دونوں میں سے
بہترین باغ جس میں کھجور کے چھ سو درخت ہیں، اس کو میں اللہ کے راستے میں خرچ کرتا ہوں،
آپ نے فرمایا اللہ تمہیں اس کے بدلے میں جنت عطا کریں گے۔

ابوالدرداء اپنے گھر کے اور بیوی کو اس کی اطلاع دیدی، تو وہ بھی ابوالدرداء کے
اس بہترین سودے پر بہت خوش ہوئیں، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

تَمَّعْتُمْ عَنِیْ زِدَّاحٍ وَ زَادَ قِیَاحٌ

کھجوروں سے لبریز بے شمار درخت اور کشتہ

لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ

(قرطبی)

عظمت کس قدر اہوال حدیث کے لئے تیار ہیں

(یعنی جنت میں)

(۳) قرطبی میں واپسی کے وقت اگر زیادتی کی شرط نہ ٹھہرائی گئی ہو اور اپنی طرف سے قرطبی سے کچھ زیادہ ادا کر دیا، تو یہ پسندیدہ ہے، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ان خياركم احسنكم قضاء

”تم میں بہترین شخص وہ ہے جو اپنے حق و قرض کو اچھے طریقے سے ادا کرے“

لیکن اگر زیادتی کی شرط ٹھہرائی گئی تو وہ حرام ہے اور سہو ہے۔

أَلَمْ تَرَ إِلَى الْمَلَائِكَةِ مِثْقَال ذَرَّةٍ مِنْ بَنِي إِسْرَءِيلَ إِذْ قَالُوا لِمَنْ هِيَ

کیا دیکھا تو نے ایک جماعت بنی اسرائیل کو موسیٰ کے بعد جب انہوں نے کہا اپنے نبی سے

لَهُمْ ابْعَثْ لَنَا مَلِكًا يُقَاتِلَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ قَالَ هَلْ عَسَيْتُمْ إِنْ كُتِبَ

مقرر کرد ہوا ہے کہ ایک بادشاہ تاکہ ہم لوہیں اللہ کی راہ میں بیٹھنے کے لئے تو قہر ہو کر

عَلَيْكُمْ الْقِتَالُ أَلا تَقَاتِلُوا قَالُوا وَمَا لَنَا أَلَّا نُقَاتِلَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَ

اگر حکم ہو لڑائی کا تو ہم اس وقت نہ لڑو وہ بولے ہم کو کیا کہ ہم نہ لڑیں اللہ کی راہ میں اور ہم

قَدْ أَخْرَجْنَا مِنْ دِيَارِنَا وَأَبْنَاءِنَا فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ تَوَلَّوْا

تو نکال دیئے گئے اپنے گھروں سے اور بیٹوں سے پھر جب حکم ہوا کہ لڑائی کا تو وہ سب پھر گئے

إِلَّا قَلِيلًا مِنْهُمْ وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِالظَّالِمِينَ ۝ وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ

مگر تھوڑے سے ان میں سے اور اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے جو ظالموں کو اور فرمایا ان سے کہ ان کے نبی نے

إِنَّ اللَّهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوتَ مَلِكًا قَالُوا أَنَّى يَكُونُ لَهُ الْمُلْكُ

یہ کہ اللہ نے معترف فرمایا تھا ہے طالت کو بادشاہ کہنے لگے کیونکر ہو سکتی ہو اس کو حکومت

عَلَيْنَا وَمَنْ آخِزٌ بِالْمُلْكِ مِنْهُ وَلَمْ يُؤْتَ سَعَةً مِنَ الْمَالِ

ہم پر اور ہم زیادہ سخت ہیں سلطنت کے اس سے اور اس کو نہیں ملی کثایت مال میں

قَالَ إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَاهُ عَلَيْكُمْ وَشَرَّاهُ فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ

پہنچنے کا بیشک اللہ نے پسند فرمایا اس کو تم پر اور زیادہ فراخی دی اس کو علم اور جسم میں

وَاللَّهُ يُؤْتِي مَلِكَهُ مَنْ يَشَاءُ وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ ۝ وَقَالَ لَهُمْ

اور اللہ دیتا ہے ملک اپنا جسکو چاہے اور اللہ بے حد وسیع و عظیم ہے اور کہا بنی اسرائیل

نَبِيُّهُمْ إِنَّ آيَةَ مُلْكِهِ أَنْ يَأْتِيَكُمُ التَّابُوتُ فِيهِ سَكِينَةٌ

ہے ان کے نبی نے حکمران کی سلطنت کی نشانی یہ کہ آوی تھوڑا پاس ایک صندوق کہ جس میں نعل خاطر ہے

مِنْ رَبِّكُمْ وَبَقِيَّةٌ مِمَّا تَرَكَ آلُ مُوسَىٰ وَآلُ هَارُونَ تَحْمِلُهُ

تھا اللہ رب کی طرف سے اور کچھ بھی ہوئی چیزیں ہیں ان میں سے جو چھوڑ گئی تھی موسیٰ اور ہارون کی اولاد اور

الْمَلَائِكَةُ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَةً لِّكُمْ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ۝

انہوں نے اس صندوق کو فرشتے بیشک اس میں پوری نشانی ہے تمہارا واسطی اگر تم یقین رکھتے ہو،

فَلَمَّا أَصَلَ طَالُوتُ بِالْجُنُودِ قَالَ إِنَّ اللَّهَ مُبْتَلِيكُمْ بِنَهَرٍ

پھر جب پہنچا طالت لوہیں نے کہہ دیا ہے شک اللہ تمہاری آزمائش کرتا ہے ایک نہری

فَمَنْ شَرِبَ مِنْهُ فَلَيْسَ مِنِّي ۚ وَمَنْ لَمْ يَطْعَمْهُ فَإِنَّهُ مِنِّي إِلَّا

سوں نے ان پر اس نہر کا تو وہ میرا نہیں اور جس نے اس کو نہ چکھا تو وہ بیشک میرا ہے مگر

مَنْ أَغْرَقَ غُرْفَةً فِئْتٍ فَيَسِّرَ يَدًا فَاسْرِي بَوَاسِئِهِ إِلَّا قَلِيلًا مِمَّنْ هُمْ

جو نہ نہری ایک ہوا ہے ہاتھ سے اس کا پانی مگر تھوڑوں نے ان میں سے

فَلَمَّا حَارَدَتْهُمْ هُوَ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ قَالُوا لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ

پھر جب ارہوا طالت اور ایمان والے ساتھ اس کے تو کہنے لگے طاقت نہیں ہم کو آج

بِطَالُوتَ وَجُنُودِهِ قَالَ الَّذِينَ يَظُنُّونَ أَنَّهُمْ مُلْقُوا اللَّهَ كَمُ

طالت اور اس کے لشکروں سے لڑنے کی کہنے لگے وہ تو جن کو خیال تھا کہ ان کو اللہ سے ملانے والا

مِنْ فِتْنَةٍ قَلِيلٌ غَلَبَتْ فِئْتَهُ كَثِيرٌ يَازِينَ اللَّهُ وَاللَّهُ مَعَ الصَّابِرِينَ ۝

تھوڑی جماعت غالب ہوئی بڑی جماعت پر اللہ کے حکم سے اور اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے

وَلَمَّا بَرَزُوا لِجَالُوتَ وَجُنُودِهِ قَالُوا رَبَّنَا أَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَكُنْتَ

اور جب سامنے ہوئے جالوت کے اور اس کی فوجوں کے تو بولے اے رب ہمارا ڈال دے ہمارے صبر کو ہمارے

أَقْدَامَنَا وَانصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ ﴿۲۵۱﴾ فَهَزَمُوهُمْ بِإِذْنِ اللَّهِ

دیکھ ہمارے پاؤں اور ہماری مدد کر اس کافر قوم پر ۔ پھر شکست دی ہر منوں جاوت کے فکر کو اللہ کے

وَقَتْلَ دَاوُدَ جَالُوتَ وَآتَاهُ اللَّهُ الْمُلْكَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَهُ مَا

اور مار ڈالا داؤد نے جاوت کو اور دی داد کو اللہ نے سلطنت اور حکمت اور سکھایا ان کو جو چاہا

يَسَاءُ ذُلًا لَّذِكُ الَّذِي النَّاسُ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ لَّفْسَدَتِ الْأَرْضُ

اور اگر نہ ہوتا دفع کر دینا اللہ کا ایک کو دوسرے کو خواب ہو جاتا ملک ۔

وَلَكِنَّ اللَّهَ ذُو فَضْلٍ عَلَى الْعَالَمِينَ ﴿۲۵۲﴾

لیکن اللہ بہت ہر ان سے جہان کے لوگوں پر ۔

خلاصہ تفسیر

رَبِّ آیات مقصود اس مقام میں زیادہ ترغیب قتال کی ہے، اور پر کا قصہ اسی کی تحدید ہے، اتفاق فی سبیل اللہ کا مضمون اسی کی تائید ہے، آگے طاوت و جالوت کا قصہ اسی کی تائید ہے، نیز اللہ تعالیٰ نے اس قصے میں قبض و بسط کا بھی مشاہدہ کرایا، جس کا ذکر قبل کی آیت وَاللَّهُ يَبْهِطُ وَيَنْهَضُ میں آیا ہے، اگر فقیر کو بادشاہ بنانا اور بادشاہ سے بادشاہت چھین لینا سب اسی کے خست یار میں ہے۔

طالوت اور جالوت کا قصہ (اسے مخاطب) کیا تجھ کو بنی اسرائیل کی جماعت کا قصہ جو موسیٰ علیہ السلام کے بعد ہوا ہے، تحقیق نہیں ہوا، (جس سے پہلے

ان پر کا فر جالوت غالب آچکا تھا، اور ان کے کئی صوبے دہائے تھے) جب کہ ان لوگوں نے اپنے ایک پیغمبر سے کہا کہ ہمارے لئے ایک بادشاہ مقرر کر دیجئے کہ ہم اس کے ساتھ ہو کر اللہ کی راہ میں (جالوت سے) قتال کریں، اس پیغمبر نے فرمایا کہ کیا یہ احتمال ہے اگر تم کو جہاد کا حکم دیا جائے کہ تم (اس وقت) جہاد نہ کرو، وہ لوگ کہنے لگے کہ ہمارے واسطے ایسا کوئی سبب ہو گا کہ ہم اللہ کی راہ میں جہاد نہ کریں، حالانکہ جہاد کے لئے ایک محرک بھی ہے، وہ یہ کہ ہم ان کافروں کے ہاتھوں اپنی بستیوں اور اپنے نر ندروں سے بھی جدا کر دیئے گئے ہیں (کیونکہ ان کی بعض بستیاں بھی کافروں نے دہائی تھیں اور ان کی اولاد کو بھی قید کر لیا گیا تھا) پھر جب ان لوگوں کو جہاد کا حکم ہوا تو باستثناء ایک قلیل مقدار کے (باقی) سب پھر گئے، (جیسا کہ آگے جہاد کی غرض سے بادشاہ کے معتمد رہنے کا اور ان لوگوں کے پھر جانے کا تفصیل بیان آتا ہے) اور

اللہ تعالیٰ ظالموں کو دین خلافت محکم کرنے والوں کو، خوب جانتے ہیں، (سب کو مناسب ہوا دیں گے) اور ان لوگوں سے ان کے پیغمبر نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تم پر طاوت کو بادشاہ معتمد

(رایا، کہنے لگے ان کو ہم پر مکرانی کا کیسے حق حاصل ہو سکتا ہے، حالانکہ بہ نسبت ان کے ہم مکرانی کے زیادہ

مستحق ہیں، اور ان کو کہہ الی وسعت بھی نہیں دی گئی، (کیونکہ طاوت غریب آدمی تھے) ان پیغمبر نے

دعوت میں (فرمایا کہ) اول تو اللہ تعالیٰ نے تمہارے مقابلے میں ان کو منتخب فرمایا ہے (اور انتخاب کی

مصلحتوں کو اللہ تعالیٰ خوب جانتے ہیں) اور (دوسرے) علم (سیاست و حکمرانی) اور جہانت میں اس کو

رایا دل لگایا (اور بادشاہ ہونے کے لئے اس علم کی زیادہ ضرورت ہے، تاکہ ملکی انتظام پر قادر ہو اور جہانت

میں باہر امن ہے کہ موافق و مخالفت کے قلب میں وقعت و ہیبت ہو) اور (تیسرے) اللہ تعالیٰ

(راہب الملک ہیں) اپنا ملک جس کو چاہیں دیں (ان سے کوئی سوال کا منصب نہیں رکھتا) اور (چوتھے)

اللہ تعالیٰ وسعت دینے والے ہیں (کہ کون یاقت سلطنت کی رکھتا ہے) اور (جب ان لوگوں نے پیغمبر سے

یہ درخواست کی کہ اگر کوئی ظاہری جہت بھی ان کی منجانب اللہ بادشاہ ہونے کی ہم مشاہدہ کر لیں تو

اور زیادہ اطمینان ہو جائے، اس وقت) ان سے ان کے پیغمبر نے فرمایا کہ ان کے (منجانب اللہ)

بادشاہ ہونے کی یہ علامت ہے کہ تمہارے پاس وہ صندوق (بدون تمہارے لئے ہوئے) آجائے

میں میں سکین (اور برکت) کی چیز ہے، تمہارے رب کی طرف سے (یعنی تورات اور تورات کا منجانب

اللہ ہو لکھا ہے) اور کچھ بھی ہوئی چیزیں ہیں جن کو حضرت موسیٰ و حضرت ہارون علیہما السلام

ہمو لگئے ہیں (یعنی ان حضرات کے کچھ ملبوسات وغیرہ، غرض) اُس صندوق کو فرشتے آویں گے

اس (طرح کے صندوق کے آجانے) میں تم لوگوں کے واسطے پوری نشانی ہے اگر تم یقین لائے

والے ہو، پھر جب (بنی اسرائیل نے طاوت کو بادشاہ تسلیم کر لیا اور جالوت کے مقابلے کے

لئے نکلیں ہو گئے) اور طاوت فوجوں کو لے کر اپنے مقام یعنی بیت المقدس سے عیالہ کی

طرف، چلے گئے انہوں نے اپنے ہمراہی پیغمبر کی وحی کے ذریعے دریافت کر کے ساتھیوں سے (

ہمراہ آپ حق تعالیٰ (استقلال و بے استقلالی میں) تمہارا امتحان کریں گے ایک نہر کے ذریعے

(جو راہ میں آئے گی اور تم شدت تشنگی کے وقت اُس پر گزرو گے) سو جو شخص اس سے (افراط

کے ساتھ) اپنی ہمرے گا وہ تو میرے ساتھیوں میں نہیں، اور جو اس کو زبان پر بھی نہ رکھے (اور اصل

حکم یہ ہے) وہ میرے ساتھیوں میں ہے، لیکن جو شخص اپنے ہاتھ سے ایک چلو بھر لے (تو اتنی نصرت

ہے، طرہ وہ ہر راستے میں آئی اپنی اس کی تھی شدت) سو سب لے اس سے (بے تحاشا) پنا شروع

کر دیا، پھر صندوق سے آدمیوں نے ان میں سے راہنما کی، کسی نے بالکل نہ پایا ہو گا، کسی نے

چلو سے زیادہ نہ پایا ہوگا) سو جب طاہوت اور جو زمینیں ان کے ہمراہ تھے نہر سے پار اتر گئے، اور اپنے بچ کو دیکھا تو بھڑے سے آدمی رہ گئے، اس وقت بعض آدمی آپس میں کہنے لگے کہ آج تو رہا جمع اتنا کہ ہے کہ اس حالت سے ہم میں جاہوت اور اس کے لشکر کے مقابلے کی طاقت نہیں معلوم ہوتی (یہ سن کر ایسے لوگ جن کو یہ خیال پیش نظر تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے رو برو پیش ہونے والے ہیں کہنے لگے کہ کثرت سے ایسے واقعات ہو چکے ہیں کہ بہت سی چھوٹی چھوٹی جماعتیں بڑی بڑی جماعتوں پر خدا کے حکم سے غالب آگئی ہیں، اصل چیز استقلال ہے) اور اللہ تعالیٰ استقلال والوں کا ساتھ دیتے ہیں، اور جب دیارِ عالم میں پہنچے اور جاؤ اور اس کی فوجوں کے سامنے میدان میں آگئے تو دربار میں حق تعالیٰ سے کہنے لگے کہ اے ہمارے پروردگار ہم پر (یعنی ہمارے قلوب پر) استقلال (غلبہ) نازل فرمائیے اور (مقابلہ کی وقت) ہمارے قدم ہمارے رکھتے، اور ہم کو اس کا فرقہ پر غالب کیجئے، پھر طاہوت والوں نے جاہوت والوں کو خدا تعالیٰ کے حکم سے شکست دیدی اور داؤد علیہ السلام نے (جو کہ اس وقت طاہوت کے لشکر میں تھے اور اس وقت تک نبوت وغیرہ نہ ملی تھی) جاہوت کو قتل کر ڈالا (اور منظر و منصور واپس آئے) اور اس کے بعد ان کو (یعنی داؤد علیہ السلام کو) اللہ تعالیٰ نے سلطنت اور حکمت (یہاں حکمت سے مراد نبوت ہے) عطا فرمائی اور بھی جو منظور ہوا انکو تعلیم فرمایا (جیسے غیر آلات کے زرہ بنانا اور جانوروں کی بولی سمجھنا) آگے اس واقعہ کی مصلحت مآثر فرماتے ہیں) اور اگر یہ بات نہ ہوتی کہ اللہ تعالیٰ بعض آدمیوں کو (جو کہ مفسد ہوں) بعضوں کے ذریعے سے (جو کہ مصلح ہوں) وقتاً فوقتاً دفع کرتے رہا کرتے ہیں (یعنی اگر مصلحین کو مفسدین پر غالب نہ کرتے رہتے) تو سرزمین (تمام) فساد سے پُر ہو جاتی، لیکن اللہ تعالیٰ بڑے فضل والے ہیں چنانچہ والوں پر اس لئے وقتاً فوقتاً اصلاح فرماتے رہتے ہیں۔

معارف و مسائل

۱۔ اِذْ قَالُوا لَنَبِيِّنَا اَنْتُمْ اَبْعَثْتُمْ تِلْكَ الْاَنْبِيَاءَ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ، ان بنی اسرائیل نے حق تعالیٰ کے احکام کو چھوڑ دیا تھا، کفارِ عالمہ ان پر مسلط کر دیئے گئے، اس وقت ان لوگوں کو اصلاح کی فکر ہوئی، اور جن نبی کا یہاں ذکر ہے ان کا نام شموئیل مشہور ہے۔

۲۔ اَنْ يَّاتِيَكُمْ الدَّابُّوْنَ، بنی اسرائیل میں ایک صندوق چلا آتا تھا، اس میں تبرکات تھے حضرت موسیٰ علیہ السلام وغیرہ انبیاء کی بنی اسرائیل اس صندوق کو لڑائی میں آگے رکھتے، اللہ تعالیٰ اس کی برکت سے فتح دیتا، جب جاہوت بنی اسرائیل پر غالب آیا، تو یہ صندوق بھی

لے گیا تھا، جب اللہ تعالیٰ کو صندوق کا پہنچانا منظور ہوا تو یہ کیا کہ وہ کافر جہاں صندوق کو رکھتے ہیں وہاں اور بلا آئی، پانچ شہر ویران ہو گئے، ناچار ہو کر دو بیلیوں پر اس کو لاد کر ایک ڈھانچے میں لے کر ایک کرطاہوت کے دروازے پر پہنچا گئے، بنی اسرائیل اس نشانی کو دیکھ کر طاہوت کی اداہت پر یقین لائے، اور طاہوت نے جاہوت پر فوج کشی کر دی اور موسم نہایت گرم تھا۔

۳۔ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ مُبْتَلِيْكُمْ بَشَعًا، اس امتحان کی حکمت اور توجہ احقر کے ذوق میں معلوم ہوتی ہے کہ ایسے مواقع پر جوش و خروش میں بھیڑ بھڑکاہٹ ہو جایا کرتا ہے، لیکن وقت پر جانے والے کم ہوتے ہیں، اور اس وقت ایسوں کا اکثر جانا باقی لوگوں کے پاؤں بھی اکھاڑ دیتا ہے، اللہ تعالیٰ کو ایسے لوگوں کا ملین کرنا منظور تھا، اس کا یہ امتحان معسر رکھا گیا جو کہ نہایت ہی مناسب ہے، کیونکہ قتال میں ضرورت استقلال و جفاکشی کی ہوتی ہے، سو شدتِ پیاس کے وقت بے وقت والی ملنے پر مضبوط کرنا دلیل ہستی قلال کی اور اندھے بازوؤں کی طرح جاگڑا دلیل بے استقلال کی ہو آگے لڑنے کا مدت ہو کہ زیادہ پانی پینے والے غیبی طور پر بھی زیادہ بیکار اور اذکار رفتہ ہو گئے، ہزاروں المعانی میں بسند ابن ابی حاتم حضرت ابن عباسؓ سے روایت کیا ہے، اور اس قصے میں جو احوال و اقوال مذکور ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں تین قسم کے لوگ تھے۔

۱۔ اہل ایمان جو امتحان میں پورے اترے، اور کائنات میں پورے اترے، مگر اپنی قلت کی فکر ہوئی، اور اکمل جن کو یہ بھی فکر نہیں ہوئی۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ تَتْلُوْهُ اَعْلٰیكَ بِالْحَقِّ ۚ وَاَنْتَ لَمِنْ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۵۷﴾

اے ایسے اللہ کی پس ہم تجھ کو سناتے ہیں غیب کی حکمت اور تو بیشک ہمارے رسولوں میں ہے۔

خلاصہ تفسیر

۱۔ کہ سورۃ کریم کا ایک بڑا مقصد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا اثبات بھی ہے، اس لئے جن جگہ مضمون کے ساتھ مناسبت ہوتی ہے اس کا اعادہ کر دیا جاتا ہے، اس موقع پر اس قصہ کی صحیح صحیح خبر دینا جب کہ آپؐ نے نہ کسی سے پڑھا نہ کہیں سنا نہ دیکھا، ایک مجزہ ہے جو آپؐ کی نبوت کی صحیح دلیل ہے، اس لئے ان آیات میں آپؐ کی نبوت پر استدلال فرماتے ہیں:

نبوت مستند پر یہ آیتیں جن میں یہ قصہ مذکور ہوا، اللہ تعالیٰ کی آیتیں ہیں جو صحیح طور پر ہم استدلال

تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلَى بَعْضٍ مِنْهُمْ

یہ سب رسولانِ فضیلت دی ہم نے ان میں بعض کو بعض سے کوئی تو وہ ہے

مَنْ كَلَّمَ اللَّهُ وَرَفَعَ بَعْضُهُمْ دَرَجَاتٍ ۗ وَآيَاتِنَا لِلَّذِينَ

کو کلام فرمایا اس سے اللہ نے اور بلند کئے بعضوں کے درجے اور دئے ہم نے عینی مریم کے بیٹے

الْبَيِّنَاتِ ۖ وَإِنَّهُ بِرُوحِ الْقُدُسِ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا اقْتُلُوا

کو مجھے سے مرزا اور قوت دی اس کو روح القدس یعنی جبریل اور اگر اللہ چاہتا تو نہ لڑتے وہ لوگ

مِنْ بَعْدِهِمْ مَنْ بَعْدَ مَا جَاءَ ثَمَرُ الْبَيِّنَاتِ وَلَكِنْ اخْتَلَفُوا فِيهِمْ

جو ہوئے ان پیغمبروں کے پیچھے بعد اس کے کہ پہنچ گئے ان کے اس صاف ہم لیکن ان میں اختلاف پڑ گیا،

مَنْ آمَنَ وَمِنْهُمْ مَنْ كَفَرَ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا اقْتُلُوا

پھر کوئی تو ان میں ایمان لایا اور کوئی کافر ہوا اور اگر اللہ چاہتا تو وہ باہم نہ لڑتے ، لیکن

اللَّهُ يَفْعَلُ مَا يَرِيدُ ﴿۱۶﴾

اللہ کرنا ہے جو چاہے ۔

خلاصہ تفسیر

بعض انبیاء اور امتوں کے کچھ احوال یہ حضراتِ مرسلین (جن کا ذکر ابھی آگیا ہے) ایسے ہیں کہ ہم نے ان میں سے بعضوں کو بعضوں پر فوقیت بخشی ہے، (مثلاً) بعضے

ان میں وہ ہیں جن سے اللہ تعالیٰ (بلداوسط فرشتہ کے) ہم کلام ہوئے ہیں، (مراد موسیٰ علیہ السلام) اور بعضوں کو ان میں بہت سے درجوں میں (اعلیٰ مقام سے) سرفراز کیا، اور ہم نے حضرت

عیسے بن مریم علیہ السلام کو کھلے کھلے دلائل (یعنی معجزات) عطا فرمائے، اور ہم نے ان کی تائید روح القدس (یعنی جبریل علیہ السلام) سے فرمائی رہبر وقت یہود سے انکی مخالفت

کرنے کے لئے ساتھ رہتے تھے) اور اگر اللہ تعالیٰ کو منظور ہوتا تو (امت کے) جو لوگ ان (پیغمبروں) کے بعد ہوئے ہیں (کبھی دین میں اختلاف کر کے) باہم قتل و قتال نہ کرتے بعد

اس کے کہ ان کے پاس (دلائل) پیغمبروں کی معرفت پہنچ چکے تھے (جن کا متفقہ اتفاق ہو چکا ہے) قبول پر متفق رہنا، لیکن چونکہ اللہ تعالیٰ کو بعض حکمتیں منظور تھیں اس لئے ان میں اتنا

نہیں نہیں پیدا کیا، وہ لوگ باہم (دین میں) مختلف ہوئے، سو ان میں کوئی تو ایمان لایا، اور کوئی کافر رہا، (پھر اس اختلاف میں فوج قتل و قتال بھی پہنچ گئی) اور اگر اللہ تعالیٰ کو منظور ہوتا تو وہ لوگ باہم قتل و قتال نہ کرتے، لیکن اللہ تعالیٰ (اپنی حکمت سے) جو چاہتے ہیں (اپنی قدرت سے) وہی کرتے ہیں۔

معارف و مسائل

(۱) تِلْكَ الرُّسُلُ اس مضمون میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک مقررہ تسل دینا ہوا کیونکہ جب آپ کی رسالت دلیل سے ثابت تھی جسکو ثَلَاثُ بَلَوَاتٍ میں بھی فرمایا ہوا اور پھر بھی منکرین نہ مانتے تھے، تو یہ آپ کے رنج و افسوس کا محل تھا، اس لئے اللہ تعالیٰ نے یہ بات سننا ہی کہ اور بھی پیغمبر مختلف درجوں کے گزرے ہیں، لیکن ایمان مام کسی کی امت میں نہیں ہوا، کسی نے موافقت کی کسی نے مخالفت، اور اس میں بھی اللہ تعالیٰ کی حکمتیں ہوتی ہیں مگر ہر شخص پر منکشف نہ ہوں، مگر اجمالاً اتنا عقیدہ رکھنا ضروری ہے کہ کوئی حکمت ضرور ہے۔

(۲) تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلَى بَعْضٍ یہاں یہ اشکال پیش آسکتا ہے کہ یہ آیت صراحتاً اس بات پر دلالت کر رہی ہے کہ بعض انبیاء بعض سے افضل ہیں، حالانکہ حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لَا تَفْضَلُوا بَيْنَ الْأَنْبِيَاءِ اللَّهُ يَزِيْرُ مَا يَشَاءُ

لا تفضلو بین انبیاء اللہ لا تختارونی علی موسیٰ۔

انبیاء کے درمیان تفضیل نہ کیا کرو۔

مجھے موسیٰ پر فضیلت نہ دو۔

لا اقول ان احدا افضل من یونس بن مثنیٰ

میں نہیں کہہ سکتا کہ کوئی یونس بن مثنیٰ سے افضل ہے۔

ان احادیث میں بعض انبیاء کو بعض پر فضیلت دینے کی ممانعت وارد ہوئی ہے؟ جو اسب یہ ہے کہ احادیث کا مطلب یہ ہے کہ دلیل کے بغیر اپنی رائے سے بعض کو بعض پر فضیلت دواں نہ کرکس جی کے افضل ہونے کے معنی یہ ہیں کہ اللہ کے یہاں ان کا مرتبہ بہت زیادہ ہے، اور ظاہر ہے کہ اس کا علم رائے اور قیاس سے حاصل نہیں ہو سکتا، لیکن قرآن و سنت کی کسی دلیل سے اگر بعض انبیاء کی بعض پر فضیلت معلوم ہو گئی تو اس کے مطابق اعتقاد رکھا جائے گا۔

اسی کے ملک میں سب کچھ (بھی آسمانوں میں موجودات) ہیں اور جو کچھ زمین میں ہیں ایسا کون شخص ہے جو اس کے پاس (کسی کی) سفارش کرے کہ بدوں اس کی اجازت کے وہ چاہتا ہے ان تمام موجودات کے تمام حاضر و غائب حالات کو اور وہ موجودات اس کی معلومات میں سے کسی چیز کو اپنے احاطہ علی میں نہیں لاسکتے مگر جس قدر علم دینا وہی چاہے اس کی کرسی راسخی بڑی ہے کہ اس نے سب آسمانوں اور زمین کو اپنے اندر رکھا ہے اور اللہ تعالیٰ کو ان دونوں آسمان و زمین کی حفاظت کچھ گراں نہیں گذرتی اور وہ عالی شان عظیم الشان ہے۔

معارف و مسائل

آیت الکرسی کے | یہ آیت قرآن کریم کی عظیم ترین آیت ہے، احادیث میں اس کے بڑے فضائل و برکات خاص فضائل | مذکور ہیں مسند احمد کی روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو سب آیات الفضل شرا پایا ہے، اور ایک دوسری روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے دریافت کیا کہ قرآن میں کونسی آیت سب سے زیادہ عظیم ہے، ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے عرض کیا آیت الکرسی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی تصدیق کرتے ہوئے فرمایا، اے ابوالمنذر تمہیں علم مبارک ہو۔

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قرآن میں عظیم تر آیت کونسی ہے؟ فرمایا آیت الکرسی، (ابن کثیر عن احمد بن محمد) حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سورہ بقرہ میں ایک آیت ہے جو سیدۃ آیات القرآن ہے، وہ جس گھر میں پڑھی جائے شیطان اس سے بچل جاتا ہے۔

انسانی کی ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص ہر نماز فرض کے بعد آیت الکرسی پڑھا کرے تو اس کو جنت میں داخل ہونے کے لئے ہجر موت کے کوئی مانع نہیں ہے، یعنی موت کے بعد فوراً وہ جنت کے آثار اور راحت و آرام کا مشاہدہ کرنے لگے گا۔

اس آیت میں اللہ جل شانہ کی توحید ذات و صفات کا بیان ایک عجیب و غریب انداز میں بیان کیا گیا ہے، جس میں اللہ جل شانہ کا موجود ہونا، زندہ ہونا، سمیع و بصیر ہونا، شکم ہونا، واجب الوجود ہونا، دائم و باقی ہونا، سب کائنات کا موجد و خالق ہونا، تغیرات اور تاثرات سے بالاتر ہونا، تمام کائنات کا مالک ہونا، صاحب عظمت و جلال ہونا، کہ اس کے آگے کوئی بغیر اس کی اجازت کے بول نہیں سکتا، ایسی قدرت کا ذکر کا مالک ہونا کہ ساری عالم اور اس کی کائنات کو پیدا کرنے والی رکھنے اور ان کا نظام حکم قائم رکھنے سے اس کو نہ کوئی تھکان پیش آتا ہے نہ سستی، ایسے علم

محیط کا مالک ہونا جس سے کوئی کھلی یا چھپی چیز کا کوئی ذرہ یا قطرہ باہر نہ رہے، یہ اجمالی مفہوم ہے اس آیت کا، اب تفصیل کے ساتھ اس کے الفاظ کے معنی سنئے:

اس آیت میں دس جملے ہیں، پہلا جملہ ہے **اللَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ**، اس میں لفظ **اللَّهُ** اسم ذات ہے، جس کے معنی ہیں وہ ذات جو تمام کمالات کی جامع اور تمام نقائص سے پاک **لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ** میں اسی ذات کا بیان ہے، کہ قابل عبادت اس ذات کے سوا کوئی چیز نہیں۔

دوسرا جملہ ہے **الْعَلِيُّ الْقَبِيضُ** لفظ **الْعَلِيُّ** کے معنی عربی زبان میں ہیں زندہ، اس لئے کہ یہی ہے یہ لفظ لاکر یہ بتلاتا ہے کہ وہ ہمیشہ زندہ اور باقی رہنے والا ہے، وہ موت سے بالاتر ہے، لفظ **قَبِيضُ** قیام سے نکلا ہے، قیام کے معنی کھڑا ہونا، قائم کھڑا ہونے والے کو کہتے ہیں، قیوم اور قیام مبالغہ کے صیغہ ہوتا ہے، ان کے معنی ہیں وہ جو خود قائم رہ کر دوسروں کو قائم رکھتا اور سنبھالتا ہے، قیوم حق تعالیٰ کی خاص صفت ہے، جس میں کوئی مخلوق شریک نہیں ہو سکتی، کیونکہ جو چیزیں خود اپنے وجود و بقا میں کسی دوسرے کی محتاج ہوں وہ کسی دوسری چیز کو کیا سنبھال سکتی ہیں! اس لئے کہی انسان کو قیوم کہنا جائز نہیں، جو لوگ عبد القیوم کے نام کو بگاڑ کر صرف قیوم بولتے ہیں گنہگار ہوتے ہیں۔

اللہ جل شانہ کے اس بارہ صفات میں حتی و قیوم کا مجموعہ بہت سے حضرات کے نزدیک اسم علم ہے، حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ غزوہ بدر میں میں نے ایک وقت یہ چاہا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھوں آپ کیا کر رہے ہیں، پہنچا تو دیکھا کہ آپ سجدہ میں پڑے ہوئے بار بار یا علی یا قیوم یا حتی یا قیوم کہہ رہے ہیں۔

تیسرا جملہ **لَا تَأْخُذُ بِهِ سِنَةٌ وَلَا نَوْمٌ** ہے، لفظ **سِنَةٌ** سین کے زبر کے ساتھ، اور گنگہ کو کہتے ہیں، جو نیند کے ابتدائی آثار ہوتے ہیں، اور **نَوْمٌ** مکمل نیند کو، اس جملہ کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ جل شانہ اور گنگہ اور نیند سب سے بڑی و بالا ہے، پچھلے جملے میں لفظ قیوم نے جب انسان کو یہ بتلایا کہ اللہ جل شانہ ساری آسمانوں زمینوں اور ان میں ساری والی تمام کائنات کو تھامے اور سنبھالے ہوئے ہیں اور ساری کائنات اسی کے ہوائے قائم ہے، تو ایک انسان کا خیال اپنی جبلت و فطرت کے مطابق اس طرف جانا ممکن ہے کہ جو ذات پاک اتنا بڑا کام کر رہی ہے اس کو کسی وقت تھکان بھی ہونا چاہئے کچھ وقت آرام اور نیند کے لئے بھی ہونا چاہئے، اس دوسرے جملے میں محدود علم و بصیرت اور محدود قدرت رکھنے والے انسان کو اس پر تنبیہ کر دیا کہ اللہ جل شانہ کو اپنے اوپر یا دوسری مخلوقات پر قیاس نہ کرے، اپنا جیسا دیکھے، وہ مثل و مثال سے بالاتر ہے، اس کی قدرت کا طے کرنے کے لئے یہ ساری کلام نہ کہ مشکل ہیں، نہ اس کے لئے بھکان کا سبب ہیں، اور اس کی ذات پاک تمام تاثرات اور محاکات کعب اور ادھم اور نیند سے بالاتر ہے۔

جو تھا جملہ ہے لَمْ تَلَفِ الْكُمُوتِ وَمَلِكِ الْآسَمَاتِ، اس کے شروع میں لفظ لَمْ کا لام ملکی کے معنی کے لئے آگیا ہے، جس کے معنی یہ ہوتے کہ تمام چیزیں جو آسمانوں یا زمین میں ہیں سب اللہ کی ملک ہیں، وہ مختار ہے، جس طرح چاہے اُن میں تصرف فرمائے۔

پانچواں جملہ ہُوَ مَنْ ذَا الَّذِي يَنْفَعُ عِنْدَهُ الْأَمْرُ بِذِيهِ، یعنی ایسا کون ہے جو اس کے آگے کسی سفارش کر سکے بدون اس کی اجازت کے، اس میں چند مسائل بیان فرادیئے ہیں۔

اول یہ کہ جب اللہ تعالیٰ تمام کائنات کا مالک ہے، کوئی اس سے بڑا اور اس کے اوپر حکم نہیں تو کوئی اس سے کسی کام کے بارے میں باز پرس کرنے کا بھی حق دار نہیں، وہ جو حکم جاری فرمائیں اس میں کسی کو چون و چسپاں کی مجال نہیں، ہاں یہ ہو سکتا تھا کہ کوئی شخص کسی سفارش و شفاعت کرے سو اس کو بھی واضح فرمادیا کہ بارگاہِ عزت و جلال میں کسی کو مجالِ دم زدن نہیں، ہاں کچھ اللہ تعالیٰ کے مقبول بندے ہیں جن کو خاص طور پر کلام اور شفاعت کی اجازت دیدی گئی، غرض بلا اجازت کوئی کسی کی سفارش و شفاعت بھی نہ کر سکے گا، حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ محشر میں سب سے پہلے میں ساری امتوں کی شفاعت کروں گا، اسی کا نام مقام محمود ہے، جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیات میں سے ہے۔

چھٹا جملہ ہے يَنْفَعُهُمْ مَتَابِعُ أَيْ يَنْفَعُهُمْ مَتَابِعُ الْآيَاتِ، یعنی اللہ تعالیٰ اُن لوگوں کے آگے بچے کے نام حالات و احوال سے واقف و باخبر ہے، آگے اور پیچھے کا یہ مفہوم بھی ہو سکتا ہے کہ اُن کے پیدا ہونے سے پہلے اور پیدا ہونے کے بعد کے تمام حالات و واقعات حق تعالیٰ کے علم میں ہیں، اور یہ مفہوم بھی ہو سکتا ہے کہ آگے سے مراد وہ حالات ہیں جو انسان کے لئے کھلے ہوئے ہیں، اور پیچھے سے مراد اس سے مخفی واقعات و حالات ہوں تو معنی یہ ہوں گے کہ انسان کا علم تو بعض چیزوں پر ہے، اور بعض پر نہیں، کچھ چیزیں اس کے سامنے کھلی ہوئی ہیں کچھ چھپی ہوئی، مگر اللہ جل شانہ کے سامنے یہ سب چیزیں برابر ہیں، اس کا علم ان سب چیزوں کو یکساں محیط ہے، اور ان دونوں مفہوموں میں کوئی تعارض نہیں، آیت کی وسعت میں یہ دونوں داخل ہیں۔

ساتواں جملہ وَلَا يَكْفِيكَوْنُ يَكْفِيكَوْنُ عَلِيَّةً إِلَّا بِمَا شَاءَ، یعنی انسان اور تمام مخلوقات اللہ کے علم کے کسی حصہ کا بھی احاطہ نہیں کر سکتے، مگر اللہ تعالیٰ ہی خود جس کو جتنا حصہ علم عطا کرنا چاہیں صرف اتنا ہی اس کو علم ہو سکتا ہے، اس میں بتلادیا گیا کہ تمام کائنات کے ذرہ ذرہ کا علم محیط صرف اللہ جل شانہ کی خصوصی صفت ہے، انسان یا کوئی مخلوق اس میں شریک نہیں ہو سکتی۔

آٹھواں جملہ ہے وَسِعَتْ كُرْسِيُّهُ السَّمُوتِ وَالْأَرْضَ، یعنی اس کی کرسی اتنی بڑی ہے

جس کی وسعت کے اندر ساتوں آسمان اور زمین سمیت ہوتے ہیں، اللہ جل شانہ نشست و برخاست اور خیز و مکان سے بالاتر ہیں، اس قسم کی آیات کو اپنے معاملات پر قیاس نہ کیا جائے، اس کی کیفیت و حقیقت کا اور اک انسانی عقل سے بالاتر ہے، البتہ مستند روایات حدیث سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ عرش اور کرسی بہت عظیم الشان جسم ہیں جو تمام آسمان اور زمین سے بڑھا بیڑے ہیں ابن کثیر نے بروایت حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ نقل کیا ہے کہ انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ کرسی کیا اور کیسی ہے، آپ نے فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے ساتوں آسمان اور زمینوں کی مثال کرسی کے مقابلہ میں ایسی ہے جیسے ایک بڑے میدان میں کوئی حلقہ انگشتری جیسا ڈال دیا جائے۔

اور بعض دوسری روایات میں ہے کہ عرش کے سامنے کرسی کی مثال بھی ایسی ہی ہے جیسے ایک بڑے میدان میں انگشتری کا حلقہ۔

نواں جملہ ہے وَلَا يَكْفِيكَوْنُ يَكْفِيكَوْنُ عَلِيَّةً، یعنی اللہ تعالیٰ کو ان دونوں عظیم مخلوقات آسمان و زمین کی حفاظت کچھ گراں نہیں معلوم ہوتی، کیونکہ اس قادر مطلق کی قدرت کا ملکہ سامنے یہ سب چیزیں نہایت آسان ہیں۔

دسواں آخری جملہ ہُوَ الَّذِي يَكْفِيكَوْنُ الْعَظِيمُ، یعنی وہ عالی شان اور عظیم الشان ہے، پچھلے جملوں میں حق تعالیٰ کی ذات و صفات کے کمالات بیان ہوئے ہیں، ان کو دیکھنے اور سمجھنے کے بعد ہر عقل رکھنے والا انسان یہی کہنے پر مجبور ہے کہ ہر عزت و عظمت اور بلندی و برتری کی مالک و سرور اور ہی ذات پاک ہے، ان دس جملوں میں اللہ جل شانہ کی صفات کمال اور اس کی توحید کا مضمون پوری وضاحت اور تفصیل کے ساتھ آگیا۔

لَا اَكْرَاهُ فِي الدِّينِ قَدْ تَبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ فَمَنْ يَكْفُرْ

اور دینی نہیں دین کے معاملہ میں بیشک جدا ہو چکی ہے ہدایت گمراہی سے اب جو کوئی نہ مانے گمراہ

بِالطَّاعَةِ وَكُفْرًا بِاللَّهِ فَقَدْ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقَى لَا انْفِصَامَ

کرنے والوں کو اور یقین لادے اللہ پر تو اس نے پکڑ لیا حلقہ مضبوط جو ٹوٹنے والا

لَهُ وَاللَّهُ تَسْمِيْعٌ عَلِيْمٌ

نہیں اور اللہ سب کچھ سنتا جانتا ہے

خلاصہ تفسیر

دین اسلام کے قبول کرنے میں زبردستی کافی نفع کوئی موقع نہیں دیکھو۔
ہدایت یقیناً عمر اسی سے ممتاز ہو چکی ہے یعنی اسلام کا حق ہونا دلائل سے
واضح ہو چکا ہے، تو اس میں اکراہ کا موقع ہی کیا ہے، اکراہ تو غیر پسندیدہ چیز پر مجبور کرنے سے ہوتا ہے،
اور جب اسلام کی غرض یقیناً ثابت ہے، تو جو شخص شیطان سے با اعتقاد ہو اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ
خوش اعتقاد (یعنی اسلام قبول کرے) تو اس نے بڑا مضبوط حلقہ تمام لیا جو کسی طرح ٹوٹ نہیں
سکتا اور اللہ تعالیٰ خوب سننے والے ہیں (اقوال ظاہری کے) اور خوب جاننے والے ہیں (احوال باطنی کے)

معارف مسائل

اسلام کو مضبوط پکڑنے والا چونکہ ہلاکت اور محرومی سے محفوظ رہتا ہے، اس لئے اس کا
ایسے شخص سے تشبیہ دی جو کسی مضبوط رسی کا حلقہ ہاتھ میں مضبوط تمام کر گرنے سے مامون رہتا ہے
اور جس طرح ایسی رسی کے ٹوٹ کر گرنے کا خطو نہیں اور یوں کوئی رسی ہی چھوڑ دے تو اور بات ہے، اسی
طرح اسلام میں کسی قسم کی ہلاکت اور خسار نہیں ہے، اور خود کوئی اسلام کو ہی چھوڑ دے تو اور بات
ہے (بیان القرآن)

اس آیت کو دیکھتے ہوئے بعض لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ
دین میں زبردستی نہیں ہو، حالانکہ اسلام میں جہاد اور قتال کی تعلیم اس کے معارض ہے۔

اگر ذرا غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ اعتراض صحیح نہیں ہے، اس لئے کہ اسلام
میں جہاد اور قتال کی تعلیم لوگوں کو قبول ایمان پر مجبور کرنے کے لئے نہیں ہے، ورنہ جزیہ لے کر کفار کو اپنی
زمیندار میں رکھنے اور ان کی جان و مال و آبرو کی حفاظت کرنے کے اسلامی احکام کیسے جاری ہوتے
بلکہ دفع فساد کے لئے ہے، کیونکہ فساد اللہ تعالیٰ کو نا پسند ہے جس کے دے پے کافر بہتے ہیں، چنانچہ اللہ تعالیٰ
فرماتے ہیں:-

وَيَبْعُونَ فِي الْأَسْوَاقِ قِسَادًا لِلَّهِ
لَا يُجِبُّ الْمُغْضِبِينَ (۱۴، ۱۵)

یہ لوگ زمین میں فساد کرتے پھرتے ہیں اور اللہ
تعالیٰ فساد کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا

اس لئے اللہ تعالیٰ نے جہاد اور قتال کے ذریعے سے ان لوگوں کے فساد کو دور کرنے کا حکم
دیا ہے، پس ان لوگوں کا قتل ایسا ہی ہے جیسے سانپ، بچھو اور دیگر موذی جانوروں کا قتل۔

اسلام نے عورتوں، بچوں، بزرگوں اور پاچہ وغیرہ کے قتل کو عین میدان جہاد میں بھی سختی سے
رکھا ہے، کیونکہ وہ فساد کرنے پر قادر نہیں ہوتے، ایسے ہی ان لوگوں کے بھی قتل کرنے کو روکا ہے
جو جزیہ ادا کرنے کا وعدہ کر کے قانون کے پابند ہو گئے ہوں۔

اسلام کے اس طرز عمل سے واضح ہو جاتا ہے کہ وہ جہاد اور قتال سے لوگوں کو ایمان قبول
کرنے پر مجبور نہیں کرتا، بلکہ اس سے وہ دنیا میں ظلم و ستم کو مٹا کر عدل و انصاف اور امن و امان قائم
رکھنا چاہتا ہے، حضرت عمرؓ نے ایک نصرانی بڑھیا کو اسلام کی دعوت دی تو اس کے جواب میں اس
کہا: اَنَا عَجُوزٌ كَبِيرَةٌ وَالْمَوْتُ إِلَيَّ قَرِيبٌ "تین میں ایک قریب الگ بڑھیا ہوں، آخری وقت
میں اپنا مذہب کیوں چھوڑ دوں؟" حضرت عمرؓ نے پرسشگر اس کو ایمان پر مجبور نہیں کیا، بلکہ یہی آیت
تلاوت فرمائی: لَا أَكْرَاهُ فِي الدِّينِ مَيْنَ دِينٍ میں زبردستی نہیں ہے۔

درحقیقت ایمان کے قبول پر جبر و اکراہ ممکن بھی نہیں ہے، اس لئے کہ ایمان کا تعلق ظاہری
اعضاء سے نہیں ہے، بلکہ قلب کے ساتھ ہے، اور جبر و اکراہ کا تعلق صرف ظاہری اعضاء سے ہوتا
ہے، اور جہاد و قتال سے صرف ظاہری اعضاء ہی متاثر ہو سکتے ہیں، لہذا اس کے ذریعہ سے ایمان
کے قبول کرنے پر جبر ممکن ہی نہیں ہے، اس سے ثابت ہوا کہ آیات جہاد و قتال آیت "لَا أَكْرَاهُ
فِي الدِّينِ مَيْنَ دِينٍ" کے معارض نہیں ہیں۔ (منظہری، مستطین)

اللَّهُ وَلِيُّ الَّذِينَ آمَنُوا يُخْرِجُهُم مِّنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ وَالَّذِينَ

اللہ مددگار ہے ایمان والوں کا نکال دے ان کو اندھیروں سے روشنی کی طرف اور جو لوگ

كَفَرُوا أُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ يُخْرِجُهُم مِّنَ النُّورِ إِلَى الظُّلُمَاتِ

کافر ہوئے ان کے رفیق ہیں شیطان نکالتے ہیں ان کو روشنی سے اندھیروں کی طرف

أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿۱۶﴾

یہی لوگ ہیں دوزخ میں رہنے والے وہ اسی میں ہمیشہ رہیں گے۔

اللَّهُ وَلِيُّ الَّذِينَ آمَنُوا إِلَىٰ قَوْلِهِ خَلِدُوا فِيهِ اللَّهُ تَعَالَىٰ سَامِعٌ بَصِيرٌ

اللہ کا جواہر ایمان والوں کے ان کو دیکھ کر تاریکیوں سے نکال کر یا بھگا کر نور (اسلام) کی طرف

لاتا ہے، اور جو لوگ کافر ہیں ان کے سامنے شیطان ہیں (انسی یا جنتی) وہ ان کو نور (اسلام) سے

نکال کر یا بھگا کر کفر کی تاریکیوں کی طرف لے جاتے ہیں، ایسے لوگ (جو اسلام کو چھوڑ کر کفر

نہشتیار کریں) دوزخ میں رہنے والے ہیں (اور) یہ لوگ اس میں ہمیشہ ہمیشہ کو رہیں گے۔

اس آیت سے ایمان کا سب سے بڑی نعمت اور کفر کا سب سے بڑی مصیبت ہونا

معارف مسائل بھی معلوم ہوا اور یہ بھی کہ کافروں کی دوستی میں بھی غلطی ہے۔

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ حَاجَّ إِبْرَاهِيمَ فِي رَبِّهِ أَنْ آتَاهُ اللَّهُ الْمُلْكَ
 كِبَاءً دَبَّحًا تَوَلَّىٰ هٰؤُلَاءِ مَوَاجِهًا ۚ وَكَانَ اللَّهُ سَمِيعًا عَلِيمًا ۖ

إِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّيَ الَّذِي يُحْيِي وَيُمِيتُ قَالَ أَنَا أُحْيِي وَأُمِيتُ
 ۚ وَأَنتَ رَاسِمٌ عَلَىٰ مَا تَتَذَكَّرُ ۚ

قَالَ إِبْرَاهِيمُ فَإِنَّ اللَّهَ يَأْتِي بِالنَّمِيسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَأَنْتَ بِهَا
 سَمِيعٌ ۚ

مِنَ الْمَغْرِبِ فَبُهِتَ الَّذِي كَفَرَ ۚ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ
 الضَّالِّينَ ۚ

مغرب سے تب حیران رہ گیا وہ کافر اور اللہ سیدیں راہ نہیں دکھاتا

الظالمین ۝

بے النساؤں کو۔

خلاصہ تفسیر

راے محتاط، کیا تجھ کو اس شخص کا قصہ تحقیق نہیں ہوا (یعنی غزوہ کا جس نے
 ابراہیم علیہ السلام سے مباحثہ کیا تھا اپنے پروردگار کے (وجود کے) بارے میں دینے تو یہ تو یہ خدا
 کے وجود ہی کا مستکر تھا، اس وجہ سے کہ خدا تعالیٰ نے اس کو سلطنت دی تھی (یعنی چاہے تو یہ تھا کہ
 نعمت سلطنت پر احسان ماننا اور ایمان لانا، اس کے برعکس انکار اور کفر شروع کر دیا اور یہ ہر حال
 اس وقت شروع ہوا تھا، جب ابراہیم علیہ السلام نے (اس کے پوچھنے پر کہ خدا کیسا ہے جواب دیا)
 فرمایا کہ میرا پروردگار ایسا ہے کہ وہ چلاتا ہے اور مارتا ہے (یعنی زندہ کرنا اور مارنا اس کی قدرت میں ہے)
 وہ کوڑے معزز جلانے مارنے کا مطلب تو سمجھا نہیں، کہنے لگا کہ یہ کام تو میں بھی کر سکتا ہوں (میں
 بھی چلاتا اور مارتا ہوں) چنانچہ جس کو چاہوں قتل کر دوں یہ تو مارنا ہے اور جس کو چاہوں قتل سے معاف
 کر دوں یہ چلاتا ہے (ابراہیم علیہ السلام نے جب دیکھا کہ بالکل ہی بے عقل کا ہے کہ اس کو چلاتا
 اور مارتا سمجھتا ہے، حالانکہ جلانے کی حقیقت بے جان چیز میں جان ڈال دینا ہے، اسی طرح مارنے کا
 معاملہ سمجھو، اور قرآن سے یہ معلوم ہو گیا کہ یہ جلانے اور مارنے کی حقیقت سمجھ گاہ نہیں، اس لئے اس ضرورت
 سے دوسرے جواب کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا کہ (اچھا) اللہ تعالیٰ آفتاب کو (روزانہ) مشرق

سے نکالتا ہے تو (ایک ہی دن) مغرب سے نکال کر دکھلا، اس پر متحیر رہ گیا وہ کافر اور کچھ جواب
 نہیں آیا اس کا معنی یہ تھا کہ وہ ہدایت کو قبول کرتا، مگر وہ اپنی مگر اس پر جا رہا اس لئے ہدایت نہ ہوئی
 اور اللہ تعالیٰ (کی عادت ہے کہ) ایسے بے جا راہ چلنے والوں کو ہدایت نہیں فرماتے۔

معارف و مسائل

اس آیت سے معلوم ہوا کہ جب اللہ تعالیٰ کسی کافر کو دنیاوی عزت و شرف اور ملک و
 سلطنت عطا کر دیں تو اس نام سے تعبیر کرنا جائز ہے، نیز اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ضرورت کے وقت
 مناظرہ اور مجاہدہ کرنا بھی جائز ہے، تاکہ حق و باطل میں فرق ظاہر ہو جائے (قرطبی)
 بعضوں کو یہ شبہ ہوا کہ اس کو یہ کہنے کی گنجائش تھی کہ اگر خدا موجود ہے تو وہی مغرب سے نکالے،
 دفع اس شبہ کا یہ ہو کہ اس کے قلب میں بلا اختیار یہ بات پڑ گئی کہ خدا ضرور ہے، اور یہ مشرق سے نکالنا
 اسی کا فعل ہے، اور وہ مغرب سے بھی نکال سکتا ہے، اور یہ شخص مغیر ہے، اس کے کہنے سے ضرور ایسا ہو
 اور ایسا ہونے سے انقلاب عظیم عالم میں پیدا ہو گا، کہیں اور لینے کے دینے نہ پڑ جائیں، مثلاً لوگ
 اس شخص کو دیکھ کر مجھ سے مغرب ہو کر ان کی راہ پر ہوں، اور اسی جہت میں سلطنت جاتی رہے،
 یہ جواب تو اس لئے دیا اور دوسرا کوئی جواب تھا نہیں، اس لئے حیران رہ گیا (بیان القرآن)

أَوَلَمْ يَكُنْ لَكُمْ قُرْبَىٰ وَهُوَ أَخَوْنِي ۚ قَالَ بَلْ أَتَىٰ يَٰيُحْيٰ
 كِبَاءً دَبَّحًا تَوَلَّىٰ هٰؤُلَاءِ مَوَاجِهًا ۚ وَكَانَ اللَّهُ سَمِيعًا عَلِيمًا ۖ

کیا نہ دیکھا تو نے اس شخص کو کہ گزرا وہ ایک شہر اور وہ گزرا تھا اپنی جھٹوں پر بولا کیوں کر زندہ کرے گا

هٰذَا اللَّهُ بَعْدَ مَوْتِنَا ۚ قَامَتَهُ اللَّهُ مِائَةً عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهُ ۚ قَالَ

اس کو اللہ مریختے چھپے، پھر مردہ رکھا اس شخص کو اللہ نے تئو برس پھر اٹھایا اس کو کہا تو کہنی

كَمْ كُنْتُ ۚ قَالَ كُنْتُ يَوْمًا أَوْ بَعْضَ يَوْمٍ ۚ قَالَ بَلْ لَّيْسَ بِمِائَةٍ

دیر یہاں رہا، بولا میں رہا ایک دن یا ایک دن سے کچھ کم کہا نہیں بلکہ تو رہا تئو برس

عَامٍ ۚ فَالْظُّرُّ إِلَىٰ لَعْنِ أُولَٰئِكَ ۚ لَمْ يَكُنْ لَهُمْ لَكَ وَانْظُرْ إِلَىٰ جَنَاحِكَ

اب دیکھ اپنا کھانا اور پینا، سٹر نہیں گیا، اور دیکھ اپنے گرد سے کو

وَلَيَجْعَلَنَّ آيَةً لِلنَّاسِ ۚ وَانْظُرْ إِلَىٰ الْعِظَامِ كَيْفَ نُنْشِئُهَا ثُمَّ

اور ہم نے تجھ کو نمونہ بنانا چاہا لوگوں کی واسطے اور دیکھ ہڈیوں کی طرف کہ ہم انکو کس طرح اُٹھا کر جوڑ دیتے ہیں

تَكْسُوْهَا الْحَمَاءُ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهُ قَالَ اَعْلَمُ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ

بہر آن پر پہناتے ہیں گشت، پھر جب اس پر ظاہر ہوا یہ حال تو کہ اٹھا کہ مجھ کو معلوم ہو کہ بیشک

فَدِيْرٌ ۝

اللہ ہر چیز پر قادر

خلاصہ تفسیر

اَوْ كَالَّذِي مَرَّ عَلَى قَرْبَةٍ وَهِيَ نَارٌ تَنْوِّرُ ۖ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝
یہ نام کو اس طرح کا قصہ بھی معلوم ہے، جیسے ایک شخص تھا کہ (چلتے چلتے) ایک بستی پر ایسی
حالت میں اس کا گزر ہوا کہ اس کے مکانات اپنی چیتوں پر گر گئے تھے، (یعنی پہلے چیتیں گریں
پھر ان پر دیواریں گر گئیں، مراد یہ ہے کہ کسی حادثہ سے وہ بستی ویران ہو گئی تھی، اور سب آدمی غمزدہ
گئے تھے، وہ شخص یہ حالت دیکھ کر حیرت سے) کہنے لگا کہ (معلوم نہیں) اللہ تعالیٰ اس بستی کو
یعنی اس کے مردوں کو) اس کے مرے پیچھے کس کیفیت سے (قیامت میں) زندہ کریں گے (یہ تو
یقین تھا کہ اللہ تعالیٰ قیامت میں مردوں کو جلا دیں گے، مگر اس وقت کے چلانے کا جو خیال غالب ہوا
تو ہر اس امر کے عجیب ہونے کے ایک حیرت سی دل پر غالب ہو گئی، اور چونکہ خدا تعالیٰ ایک کام
کو کئی طرح کر سکتے ہیں، اس لئے طبیعت اس کی متلاشی ہوئی کہ خدا جانے جلا دینا کس صورت سے
ہو گا، اللہ تعالیٰ کو منظور ہوا کہ اس کا تماشا اس کو دنیا ہی میں دکھلا دیں، تاکہ ایک نظر کے واقف ہو جائے
سے لوگوں کو زیادہ ہدایت ہو) سو (اس لئے) اللہ تعالیٰ نے اس شخص (کی جان قبض کر کے اس کو)
تو برس تک مردہ رکھا، پھر (سو برس کے بعد) اس کو زندہ اٹھایا (اور پھر) پوچھا کہ تو کتنی مدت
اس حالت میں رہا؟ اس شخص نے جواب دیا کہ ایک دن رہا ہوں گا، یا ایک دن سے بھی کم (تاکہ یہ
مدت قلیل سے) اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ نہیں، بلکہ تو (اس حالت میں) سو برس رہا ہے، (اور اگر
اپنے بدن کے اندر تغیر نہ ہونے سے تعجب ہو) تو اپنے کھانے پینے کی چیز کو دیکھ لے کہ (ذرا)
نہیں سڑی گئی (ایک قدرت تو ہماری یہ ہے) اور (دوسری قدرت دیکھنے کے واسطے) اپنے
(سواری کے) گدھے کی طرف نظر کر کہ گل سڑ کر کیا حال ہو گیا ہے، اور ہم عقرب اس کو
تیرے سامنے زندہ کئے دیتے ہیں) اور (ہم نے تجھ کو اس لئے مار کر زندہ کیا ہے) تاکہ ہم تجھ کو
(اپنی قدرت کی) ایک نظیر لوگوں کے لئے بنادیں (کہ اس نظیر سے بھی قیامت کے روز زندہ
ہونے پر استدلال کر سکیں) اور اب اس گدھے کی، ہڈیوں کی طرف نظر کر کہ ہم ان کو کس طرح

ترکیب دیئے دیتے ہیں، پھر ان پر گوشت چڑھا دیتے ہیں، پھر اس میں جان ڈال دیتے ہیں، غرض
یہ سب امور یوں ہی کر دیئے گئے (پھر جب یہ سب کیفیت اس شخص کو (مشاہدہ سے) واضح ہوئی
تو بے ہمتی و جوش میں آکر) کہہ اٹھا کہ میں (دل سے) یقین رکھتا ہوں کہ بے شک اللہ تعالیٰ
ہر چیز پر پوری قدرت رکھتے ہیں۔

وَ اِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اَرِنِيْ كَيْفَ تُحْيِي الْمَوْتٰی قَالَ اَوْمِ اُتُوْنِیْ

اور یاد کر جب کہا ابراہیم نے اسے پروردگار میرے دکھلاؤ مجھ کو کیونکر زندہ کرے گا تو مرے، فرمایا یا تو تم میرے

قَالَ بَلٰی وَلٰكِنْ لَّيَطْمِئِنُّ قَلْبِيْ ۚ قَالَ فَاُخِذْ اَرْبَعَةً مِّنَ الطَّيْرِ

کہا کیوں نہیں لیکن اس واسطے کہ چاہتا ہوں کہ تسکین ہو جاؤ میرے دل کو فرمایا تو چار پرندوں کو (چار جانور) اڑنے والے

فَصَرَفْنٰ اِلَيْكَ ثُمَّ اَجْعَلْ عَلٰی كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا مِّمَّ اَدْمُغْنَ

پھر ان کو ہلے اپنا ساتھ، پھر رکھ دے ہر پہاڑ پر ان کے بدن کا ایک ایک ٹکڑا پھر ان کو ہلا

يٰۤاٰتِيْنٰكَ سَعِيًا ۚ وَ اَعْلَمُ اَنَّ اللّٰهَ عَزِیْزٌ حَكِيْمٌ ۝

چلے آویں گے تیرے پاس دڑتے ہوئے اور جان لے کہ بیشک اللہ زبردست حکمت والا

خلاصہ تفسیر

اور اس وقت کے واقعہ کو یاد کر جبکہ ابراہیم علیہ السلام نے (حق تعالیٰ سے) عرض کیا کہ
اے میرے پروردگار مجھ کو (یہ) دکھلا دیجئے کہ آپ مردوں کو (قیامت میں مثلاً) کس کیفیت سے
زندہ کریں گے (یعنی زندہ کرنے کا تو یقین ہے، لیکن زندہ کرنے کی مختلف صورتیں اور کیفیتیں
ہو سکتی ہیں وہ معلوم نہیں، اس لئے وہ معلوم کرنے کو دل چاہتا ہے، اس سوال سے کسی کم سمجھ
آدمی کو اس کا شبہ ہو سکتا تھا کہ معاذ اللہ ابراہیم علیہ السلام کو مرنے کے بعد زندہ ہونے پر ایمان
یقین نہیں، اس لئے حق تعالیٰ نے خود یہ سوال قائم کر کے بات کھول دی، چنانچہ ابراہیم علیہ السلام
سے اس سوال کے جواب میں (اول) ارشاد فرمایا کہ کیا تم (اس پر) یقین نہیں لاتے، انھوں نے
(جواب میں) عرض کیا کہ یقین کیوں نہ لانا، لیکن اس عرض سے یہ درخواست کرتا ہوں تاکہ میرے
قلب کو (معتین صورت زندہ کرنے کی مشاہدہ کرنے سے) سکون ہو جاوے (ذہن دوسرے احتمالاً
سے چکر میں نہ پڑے) ارشاد ہوا کہ اچھا تو تم چار پرندے لو پھر ان کو (پال کر) اپنے لئے ہلا لو،

زناکر ان کی خوب شناخت ہر جادے (پھر) سب کو ذبح کر کے اور ہڈیوں پر دو سمیت ان کا قیمہ سا کر کے اس کے کئی حصے کروا دینی پہاڑ اپنی مرضی سے انتخاب کر کے، ہر پہاڑ پر ان میں سے ایک ایک حصہ رکھ دو اور (پھر) ان سب کو بلاؤ (دیکھو) تمہارے پاس (زندہ ہو کر) دوڑ دوڑ کر چلے آویں گے اور خوب یقین رکھو اس بات کا کہ حق تعالیٰ زبردست (قدرت والے) ہیں (سب کچھ کر سکتے ہیں پھر بھی بعض باتیں نہیں کرتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ) حکمت والے (بھی) ہیں، (ہر کام حکمت و مصلحت کے مطابق کرتے ہیں)

معارف و مسائل

حضرت خلیل اللہ کی درخواست یہ ہمیشہ اقصیٰ ہے جو آیت مذکورہ میں بیان فرمایا گیا ہے جس کا خلاصہ حیات بعد الموت کا مشاہدہ ہے کہ خلیل اللہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حق تعالیٰ سے یہ درخواست کی کہ مجھے اس کا مشاہدہ کرا دیجئے کہ آپ مژدوں کو کس طرح زندہ کریں گے؟ حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ اس درخواست کی کیا وجہ ہے؟ کیا آپ کو ہماری قدرت کا ملکہ پر یقین نہیں کہ وہ ہر چیز پر جادوی ہے، ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنا واقعی حال عرض کیا کہ یقین تو کیسے نہ ہوتا، کیونکہ آپ کی قدرت کا ملکہ کے مظاہر ہر لحظہ ہر آن مشاہد میں آتے رہتے ہیں، اور غور و فکر کرنے والے کے لئے خود اس کی ذات میں اور کائنات کے ذرا ذرہ میں اس کا مشاہدہ ہوتا ہے، لیکن انسانی فطرت ہے کہ جس کام کا مشاہدہ نہ ہو خواہ وہ کتنا ہی یقینی ہو اس میں اس کے خیالات منتشر رہتے ہیں، کہ یہ کیسے اور کس طرح ہو گا؟ یہ ذہنی انتشار سکون قلب اور اطمینان میں غلغلہ نامزد ہوتا ہے، اس لئے یہ مشاہدہ کی درخواست کی گئی کہ احیاء موتی کی مختلف صورتوں اور کیفیتوں میں ذہنی انتشار واقع نہ ہو کر قلب کو سکون و اطمینان حاصل ہو جائے۔

حق تعالیٰ نے ان کی درخواست قبول فرمائی کہ ان کے مشاہدہ کی بھی ایک ایسی عجیب صورت تجویز فرمائی جس میں منکرین کے تمام شبہات و غمضات کے ازالہ کا بھی مشاہدہ ہو جائے، وہ صورت یہ تھی کہ آپ کو حکم دیا گیا کہ چار پرندے جانور اپنے پاس جمع کر لیں، پھر ان کو پاس رکھ کر بلا لیں کہ وہ ایسے بل جائیں کہ آپ کے بلانے سے آجایا کریں، اور ان کی پوری طرح شناخت بھی ہو جائے، یہ شبہ نہ ہے کہ شاید کوئی دوسرا پرندہ آگیا ہو، پھر ان چاروں کو ذبح کر کے اور ہڈیوں اور پر وں سمیت ان کا خوب قیمہ سا کر کے اس کے کئی حصے کر دیں، اور پھر اپنی تجویز سے مختلف پہاڑوں پر اس قیمہ کا ایک ایک حصہ رکھ دیں، پھر ان کو بلا لیں، تو وہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کا ملکہ سے زندہ ہو کر دوڑے دوڑے آپ کے پاس آجائیں گے۔

تفسیر روح المعانی میں بسند ابن المنذر حضرت حسن رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ایسا ہی کیا، پھر ان کو پکارا تو فوراً ہڈی سے ہڈی پر سے خون سے خون، گوشت سے گوشت جل ملا کر سب اپنی اپنی اصلی ہیئت میں زندہ ہو کر دوڑنے ہوئے ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے پاس آ گئے، حق تعالیٰ نے فرمایا کہ اے ابراہیم قیامت کے روز اس طرح سب اجزاء و اجساد کو جمع کر کے ایک دم سے ان میں جان ڈالوں گا قرآن کے الفاظ میں **يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا اللَّهَ تَعْبَادُهُ** آیا ہے، کہ یہ پرندے دوڑتے ہوئے آئیں گے، جس سے معلوم ہوا کہ اڑ کر نہیں آئیں گے، کیونکہ آسمان میں اڑ کر آنے میں نظروں سے اوجھل ہو کر بدل جانے کا شبہ ہو سکتا ہے، زمین پر چل کر آنے میں یہ بالکل سامنے رہیں گے، اس وقت میں حق تعالیٰ نے قیامت کے بعد حیات بعد الموت کا ایسا نمونہ حضرت خلیل اللہ کو دکھلایا جس نے مشرکین اور منکرین کے سارے شبہات کا ازالہ مشاہدہ سے کرا دیا۔

حیات بعد الموت اور عالم آخرت کی زندگی پر سب سے بڑا اشکال منکرین کی یہی ہوتا ہے کہ انسان مرنے کے بعد مٹی ہو جاتا ہے، پھر یہ مٹی کہیں ہوا کے ساتھ اڑ جاتی ہے، کہیں پانی کے ساتھ بہہ جاتی ہے، کہیں درختوں اور کھیتوں کی شکل میں برآمد ہوتی ہے، پھر اس کا ذرہ ذرہ دنیا کے اطراف بعید میں پھیل جاتا ہے، ان منتشر ذروں اور اجزاء انسانی کو جمع کر دینا اور پھر اس میں روح ڈال دینا سطحی نظروں سے انسان کی اس لئے سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ سب کو اپنی قدرت پر قیاس کرتا ہے، وہ اپنے سے مافوق اور ناقابل قیاس قدرت میں غور نہیں کرتا۔ حالانکہ اگر وہ ذرا سا اپنے ہی وجود میں غور کرے تو اسے نظر آئے کہ آج بھی اس کا وجود ساری دنیا میں بکھرے ہوئے اجزاء و ذرات کا مجموعہ ہے، انسان کی آفرینش جن ماں اور باپ کے ذریعے ہوتی ہے، اور جن غذاؤں سے اُن کا خون اور جسم بنتا ہے وہ خود چیلن کے تحت لطف گوشتوں سے سمٹے ہوئے ذرات ہوتے ہیں، پھر پیدائش کے بعد انسان جس غذا کے ذریعے نشوونما پاتا ہے، جس سے اس کا خون اور گوشت بدست بنتا ہے، اس میں غور کرے تو اس کی غذاؤں میں ایک ایک چیز ایسی ہے جو تمام دنیا کے مختلف ذرات سے بنی ہوئی ہے، دودھ پیتا ہے تو وہ کسی گھائے، بھینس یا بکری کے اجزاء ہیں، اور ان جانوروں میں یہ اجزاء اس گھاس دانے سے پیدا ہوئے جو انھوں نے کھائے ہیں، یہ گھاس دانے معلوم نہیں کہیں کس خطہ زمین سے آئے ہیں، اور ساری دنیا میں پھرنے والی ہواؤں نے کہاں کہاں کے ذرات کو ان کی تربیت میں شامل کر دیا ہے، اسی طرح دنیا کا دانہ دانہ اور پھل اور ترکاریاں اور انسان کی تمام غذائیں اور دوائیں جو اس کے بدن کا جزو بنتی ہیں وہ کس کس گوشتہ عالم سے کس کس طرح حق تعالیٰ کی قدرت کا ملکہ

اور نظامِ محکم نے ایک انسان کے بدن میں جم فرمادیے، اگر غافل اور کوتاہ نظر انسان دنیا کو چھوڑ کر اپنے ہی تن بدن کی تحقیق (ریس سرچ) کرنے بیٹھ جائے تو اس کو یہ نظر آئے گا کہ اس کا وجود خود ایسے بے شمار اجزاء سے مرکب ہے جو کوئی مشرق کا ہے کوئی مغرب کا، کوئی جنوبی دنیا کا کوئی شمالی حصہ کا، آج بھی دنیا بھر میں پھیلے ہوئے اجزاء قدرت کے نظامِ محکم نے اس کے بدن میں جم فرمادیے ہیں، اور مرنے کے بعد یہ اجزاء پھر اسی طرح منتشر ہو جائیں گے، کوئی دوسری مرتبہ پھر ان کا حج فرما دینا اس کی قدرت کا ملکہ کے لئے کیا دشوار ہے، جس نے پہل مرتبہ اس کے وجود میں ان منتشر ذرات کو جمع فرما دیا تھا۔

واقعہ مذکورہ پر چند سوالات آیت متذکرہ بالا کے مضمون میں چند سوالات پیدا ہوتے ہیں،
جوابات اول یہ کہ حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کو یہ سوال ہی کیوں پیدا ہوا، جبکہ وہ حق تعالیٰ کی قدرت کا ملکہ پر ایمان لانے میں اس وقت کی ساری دنیا سے زیادہ یقین پرست تھے؟

اس کا جواب اس تقریر کے ضمن میں آچکا ہے جو اوپر کی گئی ہے کہ درحقیقت حضرت خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کا سوال کسی شک و شبہ کی بناء پر نہ تھا ہی نہیں، بلکہ سوال کا منشاء صرف یہ تھا کہ حق تعالیٰ قیامت میں مردوں کو زندہ کریں گے، ان کی قدرت کا ملکہ سے یہ کیسی طرح بھی مستبعد یا حیرت انگیز نہیں، بلکہ یقینی ہے، لیکن مردہ کو زندہ کرنے کا کام انسان کی طاقت سے باہر ہے، اس نے کبھی کبھی مردہ کو زندہ ہوتے ہوئے دیکھا نہیں اور مردہ کو زندہ کرنے کی کیفیات اور صورتیں مختلف ہو سکتی ہیں، انسان کی فطرت ہے کہ جو چیز اس کے مشاہدہ میں نہ ہو اس کی کیفیات کی کھوج لگانے کی فکر میں رہا کرتا ہے، اس میں اس کا خیال مختلف راہوں پر چلتا ہوا جس میں ذہنی انتشار کی تکلیف بھی برداشت کرتا ہے، اس ذہنی انتشار کو رفع کر کے قلب کو سکون مل جانے ہی کا نام الطینان ہے، اسی کے لئے حضرت خلیل اللہ نے یہ درخواست پیش فرمائی تھی۔

اسی سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ ایمان اور الطینان میں کیا فرق ہے، ایمان اس اختیاری یقین کا نام ہے جو انسان کو رسول کے اعتماد پر کسی غیب کی بات کے متعلق حاصل ہو جائے، اور الطینان سکون قلب کا نام ہے، بعض اوقات نظروں سے غائب کسی چیز پر یقین کا مل تو ہوتا ہے، مگر قلب کو سکون اس لئے نہیں ہوتا کہ اس کی کیفیات کا علم نہیں ہوتا، یہ سکون صرف مشاہدہ سے حاصل ہو سکتا ہے، حضرت خلیل اللہ کو بھی حیات بعد الموت پر تو کامل ایمان و یقین تھا، سوال صرف کیفیت احیاء کے متعلق تھا۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ جب حضرت خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کا سوال زندہ کرنے کی کیفیت سے متعلق تھا، اصل حیات بعد الموت میں کوئی شک و شبہ نہ تھا، تو پھر ارشاد ربانی **اَوْ لَمْ تُؤْمِنُ** یعنی کیا آپ کو یقین نہیں؟ فرمانے کا کوئی موقع نہیں رہتا؟
 جواب یہ ہے کہ جو سوال حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے پیش فرمایا کہ اصل واقعہ میں کوئی شک نہیں، لیکن اس سوال کا ایک مفہوم تو یہی ہے کہ زندہ کرنے کی کیفیت دریافت کرنا منظور ہے۔

ابنی الفاظ سوال کا ایک دوسرا مفہوم بھی ہو سکتا ہے جو اصل قدرت میں شبہ یا انکار سے پیدا ہوا کرتا ہے، جیسے آپ کسی بوجھ کے متعلق یہ یقین رکھتے ہیں کہ فلاں آدمی اس کو نہیں اٹھا سکتا اور آپ اس کا عاجز ہونا ظاہر کرنے کے لئے کہیں کہ دیکھیں تم کیسے اس بوجھ کو اٹھاتے ہو، چونکہ ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے سوال کا یہ غلط مفہوم بھی کوئی لے سکتا تھا اس لئے حق تعالیٰ نے ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اس غلط بات سے بری ثابت کرنے کے لئے ہی یہ ارشاد فرمایا **اَوْ لَمْ تُؤْمِنُ** تاکہ ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام اس کے جواب میں بتلی فرما کر افزاء پر رازوں کی زد سے نکل جائیں۔

تیسرا سوال یہ ہے کہ اس سوال ابراہیم سے کم از کم اتنا تو معلوم ہوا کہ ان کو حیات بعد الموت پر الطینان حاصل نہ تھا، حالانکہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا کہ اگر عالم غیب سے پردہ اٹھا دیا جائے تو میرے یقین و الطینان میں کوئی زیادتی نہ ہوگی، کیونکہ مجھے ایمان بالغیب ہی سے الطینان کامل حاصل ہے، تو جب بعض امتیوں کو درجہ الطینان حاصل ہو تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اللہ کے خلیل کو الطینان کا درجہ حاصل نہ ہو؟

اس کے متعلق یہ سمجھ لینا چاہئے کہ الطینان کے بھی بہت سے درجات ہیں، ایک وہ الطینان ہے جو اولیاء اللہ اور صدیقین کو حاصل ہوتا ہے، اور ایک اس سے اعلیٰ مقام الطینان ہے جو عام انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کو حاصل ہوتا ہے، اور ایک اس سے بھی فوق ہے، جو خاص خاص کو بصورت مشاہدہ عطا فرمایا جاتا ہے۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو جو درجہ الطینان کا حاصل تھا وہ بلاشبہ حضرت خلیل اللہ کو حاصل تھا، بلکہ اس سے اعلیٰ درجہ الطینان جو مقام نبوت کے ساتھ خاص ہے، اس الطینان میں حضرت خلیل اللہ در سب امتیوں سے فائق تھے، پھر جس کو وہ طلب فرماتے ہیں وہ سب اعلیٰ معیار الطینان ہے جو خاص خاص انبیاء کو عطا فرمایا جاتا ہے، جیسے سرور کائنات سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کو جنت و دوزخ کا مشاہدہ کرنا الطینان خاص بخشا گیا۔

الغرض اس سوال کی وجہ سے یہ کہنا بھی صحیح نہیں کہ ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اطمینان حاصل نہ تھا، یہاں یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ اطمینان کامل جو مشاہدہ سے حاصل ہوا کرتا ہے وہ نہ تھا، اسی کے لئے یہ درخواست فرمائی تھی۔

آیت کے آخر میں فرمایا، اِنَّ اللّٰهَ عَزِيزٌ حَكِيْمٌ۔ بین اللہ تعالیٰ زبردست ہیں، اور حکمت والے ہیں، زبردست ہونے میں قدرت کاملہ کا بیان فرمایا، اور حکمت والا کہہ کر اس کی طرف اشارہ کر دیا کہ مقتضائے حکمت ہر ایک کو حیات بعد الموت کا مشاہدہ نہیں کرایا جاتا، ورنہ حق جل شانہ کے لئے کوئی دشوار نہیں کہ ہر انسان کو مشاہدہ کرا دیں، مگر پھر ایمان بالنبی کی جو فضیلت ہے وہ قائم نہیں رہ سکتی۔

مَثَلُ الَّذِينَ يُنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ أَنْبَتَتْ

مثال اُن لوگوں کی جو خرچ کرتے ہیں اپنے مال اللہ کی راہ میں ایسی ہو کہ جیسے ایک دانہ اس سے اُگھیں

سَبْعَ سَنَآئِلٍ فِي كُلِّ سَنَةٍ مِائَةً حَبَّةٍ وَاللَّهُ يُضَاعِفُ لِمَنْ

سات بائیس ہر سال میں تتر تتر دانتے اور اللہ بڑھاتا ہے جس کے واسطے

يَشَاءُ وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ ۝۱۶۱ الَّذِينَ يُنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ فِي

چاہے اور اللہ بے نہایت بخشش کرنے والا ہے، سب کچھ جانتا ہے، جو لوگ خرچ کرتے ہیں اپنے مال

سَبِيلِ اللَّهِ ثُمَّ لَا يَتَّبِعُونَ مَا أَنْفَقُوا مَنًّا وَلَا أَذًى لَهُمْ

اللہ کی راہ میں، پھر خرچ کر کے پیچیدہ نا احسان رکھتے ہیں اور نہ ستاتے ہیں اُن کے لئے ہے

أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ۝۱۶۲

زواب اُن کا اپنے رب کے یہاں، اور نہ ڈر ہے اُن پر اور نہ غمیں ہوں گے،

قَوْلٌ مَّعْرُوفٌ وَمَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ يَتْبَعُهَا أَذًى وَاللَّهُ

جواب دینا نرم اور درگزر کرنا بہتر ہے اس خیرات سے جس کے پیچھے ہوشیاری اور اللہ بے پروا

عَنِ حُلِيمٍ ۝۱۶۳ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَبْطُلُوا صَدَقَتَكُمْ بِالْمَنِّ

ہو نہایت غمناک والا، اے ایمان والو! مت غمناک نہ ہو اپنی خیرات احسان رکھ کر

وَالَّذِي كَانِي يُنْفِقُ مَالَهُ رِئَاءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَ

اور ایذا دے کر اس شخص کی طرح جو خرچ کر لے اپنا مال لوگوں کے دکھانے کو اور یقین نہیں رکھتا کہ اللہ

الْيَوْمِ الْآخِرِ فَمَثَلُهُ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَيْهِ ثَرَابٌ فَأَصَابَهُ

پراور قیامت کے دن پر سوا اس کی مثال ایسی ہو جیسے صاف پتھر کے اُس پر پڑی ہے کچھ مٹی پھر برسات آئی

وَابِلٌ فَتَرَكَهُ صَلْدًا لَا يَقْدِرُونَ عَلَى شَيْءٍ مِّمَّا كَسَبُوا وَاللَّهُ

زور کا میٹھ کر چھوڑا اس کو بالکل صاف کچھ ہاتھ نہیں لگتا ایسے لوگوں کے ثواب میں چیز کا جو انھوں نے کایا اور اللہ

لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكَافِرِينَ ۝۱۶۴ وَمَثَلُ الَّذِينَ يُنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ

نہیں دکھاتا، سیدھی راہ کا فرد کو، اور مثال اُن کی جو خرچ کرتے ہیں اپنے مال اللہ

اِبْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللَّهِ وَتَثْبِيْتًا مِّنْ أَنْفُسِهِمْ كَمَثَلِ حَبَّةٍ كُرِّيَتْ

کی خوشی حاصل کرنے کو اور اپنے دلوں کو ثابت کر کے ایسی ہو ایک باغ پر بلند زمین پر

أَصَابَهَا وَابِلٌ فَانْتَأَتْ أَكْطَا ضَعْفَيْنِ فَإِنْ لَّمْ يُصِيبْهَا وَابِلٌ فَطُلُّ

اس پر پڑا زور کا میٹھ کر لایا وہ باغ اپنا بھل دو چند اور اگر نہ پڑا اس پر میٹھ تو پھواری کاں ہے،

وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ۝۱۶۵ أَيُّدُكُمْ أَمْ أَنْ تَكُونُ لَهُ جَنَّةٌ

اور اللہ تمہارے کاموں کو خوب دیکھتا ہے، کیا پسند آتا ہے تم میں سے کسی کو یہ کہ ہووے اس کا ایک باغ

مِنْ تَخْيِيلٍ وَأَعْيَابٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ لَهُ فِيهَا مِنْ كُلِّ

کھجور کا اور انگور کا بہتی ہوں نیچے اس کے بہری اس کو اس باغ میں اور بھی سب

الشَّجَرَاتِ وَأَصَابَهُ الْكِبَرُ وَلَهُ ذُرِّيَّتٌ ضَعُفَاءٌ مِنْ أَصَابِهِ

طرح کا میٹھ ہو حاصل اور آگیا اس پر بڑھاپا اور اس کی اولاد میں ضعیف تب آپڑا اس باغ پر

إِعْصَارٌ فِيهِ نَارٌ فَاحْتَرَقَتْ كَذَلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمْ الْآيَاتِ

ایک جگہ لاجس میں آگ تھی جس سے وہ باغ جل اٹھا، ایں سمجھانا ہے تم کو اللہ آیتیں

لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُونَ ۝۱۶۶

تاکہ تم غور کرو۔

خلاصہ تفسیر

جو لوگ اللہ کی راہ میں (یعنی امور خیر میں) اپنے مالوں کو خرچ کرتے ہیں ان کے خرچ کئے ہوئے مالوں کی حالت رحمت اللہ، ایسی ہے جیسے ایک دانہ کی حالت جس سے (فرض کرو) سات بالیں ہمیں (اور) ہر بالی کے اندر ستودا لے ہوں (اسی طرح خدا تعالیٰ ان کا ثواب سات سو حصہ تک بڑھاتا ہے) اور یہ السنو فی غذا تعالیٰ جسکو چاہتا ہے (بعد اس کے اخلاص اور مشقت کے) عطا فرماتا ہے اور اللہ تعالیٰ بڑی وسعت والے ہیں ان کے یہاں کسی چیز کی کمی نہیں وہ سب کو یہ السنو فی دے سکتے ہیں مگر ساتھ ہی (جاننے والے) بھی (ہیں) اس لئے اخلاص نیت وغیرہ کو دیکھ کر عطا فرماتے ہیں) جو لوگ اپنا مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں پھر خرچ کرنے کے بعد نہ تو (جس کو دیا ہے اس پر زبان سے) احسان جتلاتے ہیں اور نہ (برتاؤ سے اس کو) آزار پہنچاتے ہیں ان لوگوں کو ان کے عمل کا ثواب ملے گا ان کے پروردگار کے پاس (جا کر) اور نہ (قیامت کے دن) ان پر کوئی خطرہ ہوگا اور نہ یہ مغموم ہوں گے (ندامت کے وقت جواب میں معقول و مناسب بات کہہ دینا اور اگر سائل بدتمیزی سے قصہ دلاوے یا اصرار سے تنگ کرے تو اس سے) درگزر کرنا اور جہاں بہتر ہے ایسی خیرات دینے سے جس کے بعد آزار پہنچا یا جائے اور اللہ تعالیٰ بخود غنی ہیں کسی کے مال کی ان کو حاجت نہیں، جو کوئی خرچ کرتا ہے اپنے واسطے پھر آزار کس بنا پر پہنچا یا جائے اور آزار دینے پر جو فوراً سزا نہیں دیتے اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ (بھی) ہیں، اے ایمان والو ہم احسان جتلاتے ہیں یا اذہار پہنچا کر اپنی خیرات (کے ثواب بڑھنے) کو برباد مت کر دو جس طرح وہ شخص (خود خیرات کے اصل ثواب ہی کو برباد کر دیتا ہے) جو اپنا مال خرچ کرتا ہے (محض) لوگوں کو دکھلانے کی غرض سے اور ایمان نہیں رکھتا اللہ پر اور یوم قیامت پر مراد اس سے (تقریباً) نبی ایمان کے منافق ہے) سو اس شخص کی حالت ایسی ہے جیسے ایک چکنا پتھر (فرض کرو اس پر) جب کچھ مٹی (آگئی) ہو اور اس مٹی میں کچھ گھاس پھوس جم آیا ہو، پھر اس پر زور کی بارش پڑ جائے سو اس کو جیسا تھا ویسا ہی (بالکل صاف کر دے) اسی طرح اس منافق کے ہاتھ سے اللہ کی راہ میں کچھ خرچ ہو گیا جو ظاہر میں ایک نیک عمل جس میں امید ثواب ہو معلوم ہوتا ہے، لیکن اس کے لفاق نے اس شخص کو ویسا ہی کورا ثواب سے خالی چھوڑ دیا، چنانچہ قیامت میں (ایسے لوگوں کو اپنی کمائی ذرا بھی ہاتھ نہ لگے گی) کیونکہ کمائی نیک عمل ہے اور اس کا ہاتھ لگنا ثواب کا ملنا ہے، اور ثواب ملنے کی شرط ایمان اور اخلاص ہے اور ان لوگوں میں یہ مفقود ہے، کیونکہ ریاکار بھی ہیں اور کافر بھی ہیں) اور اللہ تعالیٰ کافر لوگوں کو قیامت کے

روز ثواب کے مگر میں جنت کا (راستہ نہ جتلاتے) گئے کیونکہ کفر کی وجہ سے ان کا کوئی عمل مقبول نہیں ہوا جس کا ثواب آخرت میں ذخیرہ ہوتا اور وہاں حاضر ہو کر اس کے صلہ میں جنت میں پہنچانے جاتے) اور ان لوگوں کے خرچ کئے ہوئے مال کی حالت جو اپنے مالوں کو خرچ کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کی غرض سے (جو کہ خاص اس عمل سے ہوگی) اور اس غرض سے کہ اپنے نفسوں (کو اس عمل شاق کا خوگر بنا کر ان) میں پختگی پیدا کریں (تاکہ دوسرے اعمال صالحہ سہولت سے پیدا ہو کر ان پس ان لوگوں کے نفعات و صدقات کی حالت) مثل حالت ایک باغ کے ہے جو کسی نیلے پر ہو کہ اس جگہ کی ہوا لطیف اور بار آور ہوتی ہے اور اس پر زور کی بارش پڑی ہو پھر وہ (باغ) لطیف ہوا اور بارش کے سبب اور باغوں سے یا اور دفعوں سے) دونا (چوگنا) پھل لایا ہو اور اگر ایسے زور کا میٹھ نہ پڑے تو ہلکے پھوار (یعنی خفیف بارش) بھی اس کو کافی ہے (کیونکہ زمین اور مرقع اس کا اچھا ہے) اور اللہ تعالیٰ تمہارے کاموں کو خوب دیکھتے ہیں (اس لئے جب وہ اخلاص دیکھتے ہیں ثواب بڑھا دیتے ہیں) بھلا تم میں سے کسی کو یہ بات پسند ہو کہ اس کا ایک باغ ہو کہ جو ریزوں کا اور انگوروں کا (یعنی زیادہ درخت اس میں ان کے ہوں اور اس (باغ) کے (درختوں کے) نیچے ہنریں چلتی ہوں) جس سے وہ خوب سرسبز و شاداب ہوں اور اس شخص کے یہاں اس باغ میں (علاوہ کجوروں اور انگوروں کے) اور بھی ہر قسم کے (مناسب) میوے ہوں اور اس شخص کا بڑھاپا آگیا ہو (جو کہ زمانہ زیادہ احتیاج کا ہوتا ہے) اور اس کے اہل و عیال بھی ہوں جنہیں رکمانے کی قوت نہیں اس صورت میں اہل و عیال سے بھی اس کو توقع خبر گیری کی نہیں ہوگی، بس وجہ معاش صرف وہی باغ ہوا) سو ایسی حالت میں یہ قصہ ہو کہ اس باغ پر ایک بگولہ آئے جس میں آگ (کا مادہ) ہو پھر اس سے) وہ باغ جل جلے (ظاہر بات ہے کسی کو اپنے لئے یہ بات پسند نہیں آسکتی، پھر اسی کے مشابہ تو یہ بات بھی ہے کہ اول صدقہ دیا یا کوئی اور نیک کام کیا جس کے قیامت میں کار آمد ہونے کی امید ہو جو کہ وقت ہو گا غایت احتیاج کا اور زیادہ مدار قبول ہو گا اپنی طاعات پر پھر ایسے وقت میں معلوم ہو گا کہ ہمارے احسان جتلاتے یا غریب کو ایذا دینے سے ہماری طاعات باطل یا بے برکت ہو گئیں، اس وقت کیسی سخت حسرت ہوگی کہ کیسی کیسی آرزوؤں کا خون ہو گیا پس جب تم مثال کے واقعہ کو پسند نہیں کرتے تو ابطال طاعت کو کیسے گوارا کرتے ہو) اللہ تعالیٰ اسی طرح نظائر بیان فرماتے ہیں تمہارے (سمجھانے کے) لئے تاکہ تم سو جا کر (اور سوچ کر اس کے موافق عمل کیا کرو)۔

معارف و مسائل

یہ سورۃ بقرہ کا چھتیسواں رکوع ہے جو آیت نمبر ۲۶۱ سے شروع ہوتا ہے، اب سورۃ بقرہ کے پانچ رکوع باقی ہیں جن میں آخری رکوع میں تو کلیات اور اہم اصولی چیزوں کا بیان ہے، اس سے پہلے چار رکوع میں آیت نمبر ۲۸۳ تک آیت ۲۳۱ ہیں، جن میں مالیات سے متعلق خاص ہدایات اور ایسے ارشادات ہیں کہ اگر دنیا آج ان پر پوری طرح مامل ہو جائے تو معاشی نظام کا وہ مسئلہ خود بخود حل ہو جائے، جس میں آج کی دنیا چار سو بھٹک رہی ہے، کہیں سرمایہ داری کا نظام ہے تو کہیں اس کا رد عمل اشتراکیت اور اشتالیست کا نظام ہے، اور ان نظاموں کے باہمی ٹکراؤ نے دنیا کو قتل و قتال اور جنگ و جدال کا ایک جہنم بنا رکھا ہے، ان آیات میں اسلام کے معاشی نظام کے ایک اہم پہلو کا بیان ہے، جس کے دوسرے ہیں:

۱۔ اپنی ضرورت سے زائد مال کو اللہ کی رضا کے لئے حاجت مند مفلس لوگوں پر خرچ کرنے کی تعلیم جس کو صدقہ و خیرات کہا جاتا ہے۔

۲۔ دوسرے سود کے لین دین کو حرام قرار دے کر اس سے بچنے کی ہدایات۔
ان میں سے پہلے دو رکوع صدقہ و خیرات کے فضائل اور اس کی ترغیب اور اس کے متعلق احکام و ہدایات پر مشتمل ہیں، اور آخری دو رکوع سود کی کاروبار کی حرمت و مانعت اور قرض ادا کر کے جائز طریقوں کے بیان میں ہیں۔

جو آیات اوپر بھی گئی ہیں ان میں اول اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کے فضائل کا بیان فرمایا۔ اس کے بعد ایسی شراائط کا بیان ہے جن کے ذریعے صدقہ و خیرات اللہ کے نزدیک قابل قبول اور موجب ثواب بن جائے، پھر ایسی چیزوں کا بیان ہو جو انسان کے صدقہ و خیرات کو برباد کر کے نیکی برباد گناہ لازم کا مصداق بنا دیتی ہیں۔

اس کے بعد دو مثالیں بیان کی گئی ہیں، ایک ان نفقات و صدقات کی جو اللہ کے نزدیک مقبول ہوں دوسرے ان نفقات و صدقات کی جو غیر مقبول اور فاسد ہوں۔

یہ پانچ مضمون ہیں جو اس رکوع میں بیان ہوئے ہیں۔

یہاں ان مضامین سے پہلے یہ جان لینا ضروری ہے کہ قرآن کریم نے اللہ کے راستے میں مال خرچ کرنے کو کہیں بہ لفظ انفاق بیان فرمایا ہے، کہیں بہ لفظ اطعام، کہیں بہ لفظ صدقہ اور کہیں بہ لفظ ایثار الزکوۃ، ان الفاظ استراکی اور ان کے جگہ جگہ استعمال پر نظر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ لفظ انفاق، اطعام، صدقہ عام ہیں، جو ہر قسم کے صدقہ و خیرات اور رضائے الہی حاصل کرنے

کے لئے ہر قسم کے خرچ پر جاری ہے، خواہ فرض و واجب ہوں، یا نفل اور مستحب، اور زکوۃ فرض کے لئے قرآن نے ایک ممتاز لفظ ایثار الزکوۃ استعمال فرمایا ہے، جس میں اس کی طرت اشارہ ہو کہ اس خاص صدقہ کے لئے حاصل کرنے اور خرچ کرنے دونوں میں کچھ خصوصیات ہیں۔

اس رکوع میں اکثر لفظ انفاق سے اور کہیں لفظ صدقہ سے تعبیر کی گئی ہے، جس کا مفہوم یہ ہو کہ یہاں عام صدقات و میراث کا بیان ہے، اور جو احکام یہاں ذکر کئے گئے ہیں وہ ہر قسم کے صدقات اور اللہ کے لئے خرچ کرنے کی سب صورتوں کو شامل اور حاوی ہیں۔

اللہ کی راہ میں خرچ پہلی آیت میں ارشاد فرمایا ہے کہ جو لوگ اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں یعنی چ میں کرنا ایک مثال یا جہاد میں، یا فقراء و مساکین اور یتیموں پر یا بہ نیت امداد اپنے عزیز و دوستوں پر، اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص ایک دانہ گہوں کا عمدہ زمین میں بولے، اس دانہ سے گہوں کا ایک پودا نکلے، جس میں سات خوشے گہوں کے پیدا ہوں، اور ہر خوشے میں سو دانے ہوں، جس کا نتیجہ یہ ہو کہ ایک دانہ سے سات سو دانے حاصل ہو گئے۔

مطلب یہ ہوا کہ اللہ کی راہ میں خرچ کرنے والے کا اجر و ثواب ایک لے کر سات سو تک پہنچتا ہو، ایک پیسہ خرچ کرے تو سات سو پیسوں کا ثواب حاصل ہو سکتا ہے۔

صحیح و معتبر احادیث میں ہے کہ ایک نیکی کا ثواب اس کا دس گنا ملتا ہے، اور سات سو گئے تک پہنچ سکتا ہے، حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے فرمایا کہ جہاد اور حج میں ایک درہم خرچ کرنے کا ثواب سات سو درہم کے برابر ہے، یہ روایت ابن کثیر نے جو النہ مسند احمد بیان کی ہے۔

الغرض اس آیت نے بتلایا کہ اللہ کی راہ میں ایک روپیہ خرچ کرنے والے کا ثواب ستاسو روپے کے خرچ کے برابر ملتا ہے۔

قبولیت صدقات کی لیکن استراآن حکیم نے اس مضمون کو بجائے مختصر اور صاف لفظوں میں بیان کرنے مثبت شراائط کے دانہ گندم کی مثال کی صورت میں بیان فرمایا، جس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جس طرح کا شیشہ کا ایک دانہ گندم سے سات سو دانے اُسی وقت حاصل کر سکتا ہو جب کہ یہ دانہ عمدہ ہو خراب نہ ہو، اور دانہ ڈالنے والا کا شیشہ بھی کاشت کاری کے فن سے پورا واقف ہو، اور جس زمین میں ڈالے وہ بھی عمدہ زمین ہو، کیونکہ ان میں سے اگر ایک چیز بھی کم ہو گئی تو یا یہ دانہ ضائع ہو جائے گا ایک دانہ بھی نہ نکلے گا، اور یا پھر ایسا بار آور نہ ہوگا کہ ایک دانہ سے سات سو دانے بن جائیں۔

اسی طرح عام اعمال صالحہ اور خصوصاً انفاق فی سبیل اللہ کی مقبولیت اور زیادتی اجر کے لئے بھی یہی تین شرطیں ہیں کہ جو مال اللہ کی راہ میں خرچ کرے وہ پاک اور حلال ہو

کیونکہ حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ پاک اور حلال لاکے سوا کسی چیز کو قبول نہیں فرماتے۔
دوسرے خرچ کرنے والا بھی نیک نیست اور صالح ہو، بدعتی یا نام و نمود کے لئے خرچ کرنے والا اس ناواقف کاشتکار کی طرح ہے جو دانہ کو کسی ایسی جگہ ڈال دے کہ وہ ضائع ہو جائے۔

تیسرے جس پر خرچ کرے وہ بھی صدقہ کا مستحق ہو، کسی نااہل پر خرچ کر کے ضائع نہ کرے، اس طرح اس مثال سے اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کی بہت بڑی فضیلت بھی معلوم ہو گئی، اور ساتھ ہی اس کی عین شرطیں بھی، کہ مال حلال سے خرچ کرے، اور خرچ کر لے کا طریقہ بھی سنت کے مطابق ہو، اور مستحقین کو تلاش کر کے اُن پر خرچ کرے، محض جیب بیکال ڈالنے سے یہ فضیلت حاصل نہیں ہوتی۔

دوسری آیت میں صدقہ کرنے کے صحیح اور مستحسن طریقہ کا بیان اس طرح فرمایا گیا، ہے کہ جو لوگ اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں، پھر خرچ کرنے کے بعد نہ احسان جتاتے ہیں، اور نہ جن کو دیا گیا ہے ان کو کوئی ایذا پہنچاتے ہیں ان کا ثواب ان کے رب کے پاس محفوظ ہے، نہ اُن پر آئندہ کے لئے کوئی خطرہ ہو، اور نہ گزشتہ پر کوئی بوجھ و غم۔

قبولیت صدقہ کی منفی شرائط | اس آیت میں صدقہ کے قبول ہونے کی دو منفی شرطیں بیان فرمائی گئی ہیں، ایک یہ کہ دے کر احسان نہ جتائیں، دوسرے یہ کہ جس کو دیں اس کو عللاً ذلیل و خوار نہ سمجھیں، اور کوئی ایسا برتاؤ نہ کریں جس سے وہ اپنی حقارت و ذلت محسوس کرے یا اس کو ایذا پہنچے۔

تیسری آیت **قَوْلُ الْمُغْتَرِفِ** میں بھی صدقہ و خیرات کے اللہ کے نزدیک مقبول ہونے کی ان دو شرطوں کی مزید وضاحت کی گئی ہے، جن کا بیان اس سے پہلی آیت میں ہو چکا ہے، ایک یہ کہ مال اللہ کی راہ میں خرچ کر کے کسی پر احسان نہ جتائیں، دوسرے یہ کہ جس کو دیں اس کے ساتھ کوئی ایسا برتاؤ نہ کریں جس سے وہ اپنی ذلت و حقارت محسوس کرے، یا جس سے اس کو ایذا پہنچے۔

وضاحت اس طرح کی گئی کہ ناداری یا معذوری کی حالت میں ساتل کے جواب میں کوئی معقول و مناسب غرض پیش کر دینا، اور اگر ساتل بدتمیزی سے غصہ دلا دے تو اس سے درگزر کرنا ہزار درجہ بہتر ہے، ایسی خیرات دینے سے جس کے بعد اس کو ایذا پہنچائی جائے، اور اللہ تعالیٰ خود غنی و عظیم ہیں، اُن کو کسی کے مال کی حاجت نہیں، جو خرچ کرتا ہے اپنے نفع کے لئے کرتا ہے، تو ایک عاقل انسان کو خرچ کرنے کے وقت اس کا لحاظ رکھنا چاہئے، کہ میرا کسی پر احسان نہیں، میں اپنے نفع کے لئے خرچ کر رہا ہوں، اور اگر لوگوں کی طرف سے کوئی ناشکری بھی محسوس کرے تو اخلاق الہیہ کے تابع ہو کر غفور و درگزر سے کام لے۔

چوتھی آیت میں اسی مضمون کو دوسرے عنوان سے اور بھی تاکید کے ساتھ اس طرح ارشاد فرمایا کہ اپنے صدقات کو برادر نہ کرو، زبان سے احسان جتلا کر یا برتاؤ سے ایذا پہنچا کر۔

اس سے واضح ہو گیا کہ جس صدقہ و خیرات کے بعد احسان جتلانے یا مستحقین کو ایذا پہنچانے کی صورت ہو جائے وہ صدقہ باطل کا عدم ہے، اُس پر کوئی ثواب نہیں، اس آیت میں صدقہ کے قبول ہونے کی ایک اور شرط کا اس طرح بیان فرمایا ہے کہ جو شخص لوگوں کے دکھائے اور نام و نمود کے واسطے خرچ کرتا ہے، اور اللہ تعالیٰ اور قیامت پر ایمان نہیں رکھتا اس کی مثال ایسی ہے جیسے کسی صاف پتھر پر کچھ مٹی جم جائے، اور اس میں کوئی دانہ بوسے پھر اس پر زور کی بارش پڑ جائے اور وہ اس کو بالکل صاف کر دے، ایسے لوگوں کو اپنی کمائی ذرا بھی ہاتھ نہ لگے گی، اور اللہ تعالیٰ کافر لوگوں کو راستہ نہ دکھلائیں گے، اس سے قبولیت صدقہ و خیرات کی یہ مشروط معلوم ہوئی، کہ خالص اللہ تعالیٰ کی رضا ہوئی اور ثواب آخرت کی نیت سے خرچ کرے، دکھلانے یا نام و نمود کی نیت نہ ہو، نام و نمود کی نیت سے خرچ کرنا، اپنے مال کو برباد کرنا ہے، اور آخرت پر ایمان رکھنے والا مومن بھی اگر کوئی خیرات محض نام و نمود اور ریاء کے لئے کرتا ہے تو اس کا بھی یہی حال ہو کہ اس کو کوئی ثواب نہیں ملتا، پھر اس جگہ **لَا يَذُوقُ ثَمَارَ الْإِسْلَامِ** کے اضافہ سے شاید اس طرف اشارہ کرنا منظور ہو کہ ریاء کاری، اور نام و نمود کے لئے کام کرنا اس شخص سے متصور ہی نہیں جو اللہ تعالیٰ اور دنیا آخرت پر ایمان رکھتا ہے، ریاء کاری اس کے ایمان میں خلل کی علامت ہے۔

آیت کے آخر میں جو یہ ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ کافر لوگوں کو راستہ نہ دکھائیں گے، اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی بھی ہوتی ہدایات اور آیات جو سب انسانوں کے لئے عام ہیں، کافر جو ان ہدایات پر نظر نہیں کرتے بلکہ تمسخر اور استہزاء کرتے ہیں، اس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ اُن کو توفیق سے محروم کر دیتے ہیں، جن کا اثر یہ ہوتا ہے کہ وہ کوئی ہدایت قبول نہیں کرتے۔

پانچویں آیت میں صدقہ مقبولہ اور انفاق مقبول کی ایک مثال بیان فرمائی ہے کہ جو لوگ اپنے مال خالص اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کی نیت سے خرچ کرتے ہیں کہ اپنے نفسوں میں بخل پیدا کریں ان کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی باغ ہو کسی ٹیلے پر اور اس پر زور کی بارش پڑی ہو، پھر وہ اپنا پھل لایا ہو و چنداں اور اگر ایسے زور کی بارش بھی نہ پڑے تو ٹیلے پھوٹا بھی اس کے لئے کافی ہے، اور اللہ تعالیٰ تمہارے کاموں کو خوب دیکھتے جانتے ہیں۔

اس میں اخلاص نیت اور رعایت شرائط مذکورہ کے ساتھ اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کی بڑی فضیلت اس مثال سے واضح کر دی گئی کہ نیک نیتی اور اخلاص کے ساتھ تمہارا بھی خرچ کیا جائے تو وہ کافی اور موجب خیرات آخرت ہے۔

چھٹی آیت میں صدقہ و خیرات میں شرائط مذکورہ کی خلاف ورزی کر لے پر صدقہ کے باطل و مردود ہونے کا بیان بھی ایک مثال میں اس طرح واضح فرمایا کہ کیا تم میں سے کسی کو یہ بات پسند ہو کہ اس کا ایک بارغ ہو کہ جو راہ ان گورڈوں کا اس کے نیچے نہریں بہتی ہوں، اور اس شخص کے بارغ میں ہر قسم کے میوے ہوں اور اس شخص کا بڑھا پا آگیا ہو، اور اس کے اہل و عیال بھی ہوں جن میں قوت نہیں، ان حالات میں اس بارغ پر ایک گولہ آدے جس میں آگ ہو، پھر وہ بارغ جل جائے، اللہ تعالیٰ اسی طرح نظائر بیان فرماتے ہیں تمھارے لئے تاکہ تم سوچا کرو۔

مطلب یہ ہے کہ خلاف شرائط صدقہ کرنے کی مثال ایسی ہی ہے کہ بظاہر وہ صدقہ کر کے آخرت کے لئے بہت سا ذخیرہ جمع کر رہا ہے، لیکن اللہ کے نزدیک یہ ذخیرہ کچھ بھی کام نہیں آتا۔

اور اس مثال میں جو چند قیدیں بڑھائی گئیں کہ اس کا بڑھا پا آگیا، اس کے اولاد بھی بڑا اور اولاد بھی چھوٹے سچے جو ضعیف کمزور ہیں، ان قیدوں کا مقصد یہ ہے کہ جوانی کی حالت میں کسی کا بارغ یا کھیتی جل جائے تو اسے یہ امید ہو سکتی ہے کہ پھر بارغ لگا لوں گا، اور جس شخص کے اولاد نہ ہو اور اس کو دوبارہ بارغ لگانے کی امید بھی نہ ہو تو بارغ جل جانے کے بعد بھی اس کو کوئی خاص فکر معاش کی نہیں ہوتی، اکیلا آدمی جس طرح چاہے تنگی ترشی سے گزارا کر سکتا ہے، اور اگر اولاد بھی ہو مگر جوان صالح ہوں جن سے یہ توقع کی جائے کہ وہ باپ کا ہاتھ بٹائیں گے، اور مدد کریں گے، ایسی صورت میں بھی انسان کو بارغ کے جل جانے یا کٹ جانے پر بھی کچھ زیادہ صدمہ نہیں ہوتا، کیونکہ اولاد کی فکر سے فارغ ہے، بلکہ اولاد اس کا بھی بوجھ اٹھا سکتی ہے، غرض یہ تینوں قیدیوں شدت جستیاچ کو بیان کرنے کے لئے لائی گئیں، کہ ایسا شخص جس نے اپنا مال اور محنت خرچ کر کے ایک بارغ لگایا، اور وہ بارغ تیار ہو کر پھل بھی دینے لگا، اور اسی حالت میں اس کا بڑھا پا اور کمزوری کا زمانہ بھی آگیا، اور یہ شخص صاحب عیال بھی ہے، اور عیال بھی چھوٹے اور کمزور بچے ہیں، تو ان حالات میں اگر لگا یا ہو بارغ جل جائے تو صدمہ شدید ہو گا، اور تکلیف بے حد ہوگی۔

اسی طرح جس شخص نے رباہ کاری سے صدقہ و خیرات کیا یہ گویا اس نے بارغ لگایا، پھر موت کے بعد اس کی حالت اس بوڑھے جیسی ہو گئی جو کالے اور دوبارہ بارغ لگانے کی قدرت نہیں رکھتا، کیونکہ موت کے بعد انسان کا کوئی عمل ہی نہیں رہا، اور جس طرح عیال دار بوڑھا اس کا بہت محتاج ہوتا ہے کہ پھل کمانی محفوظ ہوتا کہ ضعیفی میں کام کرے، اور اگر اس حالت میں اس کا بارغ اور مال متاع جل جائے تو اس کے دکھ اور ذل کی انتہاء نہ رہے گی، اسی طرح یہ صدقہ و خیرات جو رباہ خورد کے لئے کیا گیا تھا، عین ایسے وقت ہاتھ سے جاتا ہے گا جب کہ وہ اس کا بہت حاجت مند ہو گا۔

اس پوری آیت کا خلاصہ یہ ہوا کہ صدقہ و خیرات کے اللہ کے نزدیک مقبول ہونے کی ایک بڑی شرط اخلاص ہے، کہ خالص اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کے لئے خرچ کیا جائے، کسی نام و نمود کا اس میں دخل نہ ہو۔

اب اس پورے رکوع کی تمام آیات پر مکرر نظر ڈالئے تو ان سے الفاق فی سبیل اللہ اور صدقہ و خیرات کے اللہ کے نزدیک مقبول ہونے کی کچھ شرائط معلوم ہوں گی:

اول اس مال کا حلال ہونا جو اللہ کی راہ میں خرچ کیا جائے، دوسرے طریق سنت کے مطابق خرچ کرنا، تیسرے صحیح مصرف میں خرچ کرنا، چوتھے خیرات دے کر احسان نہ جتلا نا، پانچویں ایسا کوئی معاملہ نہ کرنا جس سے اُن لوگوں کی تحقیر ہو جن کو یہ مال دیا گیا ہے، چھٹے جو کچھ خرچ کیا جائے اخلاص نیت کے ساتھ خالص اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کے لئے ہو، نام و نمود کے لئے نہ ہو۔

دوسری شرط یعنی طریق سنت کے مطابق خرچ کرنا، اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی راہ میں خرچ کرتے وقت اس کا لحاظ رہے کہ کسی حقدار کی حق تلفی نہ ہو، اپنے عیال کے ضروری اخراجات بنیران کی رضا مندی کے بندیا کم کر کے صدقہ و خیرات کرنا کوئی امر ثواب نہیں، حاجت مند داروں کو محروم کر کے سائے مال کو صدقہ و خیرات یا وقف کر دینا تعلیم سنت کے خلاف ہے، پھر اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کی ہزاروں صورتیں ہیں۔

طریق سنت یہ ہے کہ مصرف کی اہمیت اور ضرورت کی شدت کا لحاظ کر کے مصرف کا انتظام کیا جائے، عام طور پر خرچ کرنے والے اس کی رعایت نہیں کرتے۔

تیسری شرط کا حاصل یہ ہے کہ ثواب ہونے کے لئے صرف اتنی بات کافی نہیں کہ اپنے خیال میں کسی کام کو نیک سمجھ کر نیک نیتی سے اس میں صرف کر دے، بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ مصرف شریعت کی رُود سے جائز اور مستحسن بھی ہو، کوئی شخص ناجائز کھیل تماشوں کے لئے اپنی جائداد وقف کر دے تو وہ بجائے ثواب کے عذاب کا حق ہو گا، یہی حال تمام اُن کاموں کا ہو جو شریعت کی رُود سے مستحسن نہیں ہیں۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَنْفِقُوا مِنْ كَسْبِكُمْ رِوَمَا آخَرُ جُنَا

اے ایمان والو خرچ کرو مستحکم چیزیں اپنی کمائی میں سے اور اس چیز میں سے کہ جو

لَكُمْ مِنَ الْأَرْضِ رِوَمَا لَا تَبْهَتُوا الْخَيْثُ مِنْهُ تَنْفِقُونَ وَلَسْتُمْ

ہم نے پیدا کیا تمہارے واسطے زمین سے اور قصداً کہ وہ گمراہی چیز کا اس میں سے کہ اس کو خرچ کر دو، حالانکہ تم

چھٹی آیت میں صدقہ و خیرات میں شرائط مذکورہ کی خلاف ورزی کر لے پر صدقہ کے باطل و مردود ہونے کا بیان بھی ایک مثال میں اس طرح واضح فرمایا کہ کیا تم میں سے کسی کو یہ بات پسند ہو کہ اس کا ایک بارغ ہو کہ جو راہ ان گورڈوں کا اس کے نیچے نہریں بہتی ہوں، اور اس شخص کے بارغ میں ہر قسم کے میوے ہوں اور اس شخص کا بڑھا پا آگیا ہو، اور اس کے اہل و عیال بھی ہوں جن میں قوت نہیں، ان حالات میں اس بارغ پر ایک گولہ آدے جس میں آگ ہو، پھر وہ بارغ جل جائے، اللہ تعالیٰ اسی طرح نظائر بیان فرماتے ہیں تمھارے لئے تاکہ تم سوچا کرو۔

مطلب یہ ہے کہ خلاف شرائط صدقہ کرنے کی مثال ایسی ہی ہے کہ بظاہر وہ صدقہ کر کے آخرت کے لئے بہت سا ذخیرہ جمع کر رہا ہے، لیکن اللہ کے نزدیک یہ ذخیرہ کچھ بھی کام نہیں آتا۔

اور اس مثال میں جو چند قیدی بڑھائی گئیں کہ اس کا بڑھا پا آگیا، اس کے اولاد بھی بڑا اور اولاد بھی چھوٹے سچے جو ضعیف کمزور ہیں، ان قیدوں کا مقصد یہ ہے کہ جوانی کی حالت میں کسی کا بارغ یا کھیتی جل جائے تو اسے یہ امید ہو سکتی ہے کہ پھر بارغ لگا لوں گا، اور جس شخص کے اولاد نہ ہو اور اس کو دوبارہ بارغ لگانے کی امید بھی نہ ہو تو بارغ جل جانے کے بعد بھی اس کو کوئی خاص فکر معاش کی نہیں ہوتی، اکیلا آدمی جس طرح چاہے تنگی ترشی سے گزارا کر سکتا ہے، اور اگر اولاد بھی ہو مگر جوان صالح ہوں جن سے یہ توقع کی جائے کہ وہ باپ کا ہاتھ بٹائیں گے، اور مدد کریں گے، ایسی صورت میں بھی انسان کو بارغ کے جل جانے یا کٹ جانے پر بھی کچھ زیادہ صدمہ نہیں ہوتا، کیونکہ اولاد کی فکر سے فارغ ہے، بلکہ اولاد اس کا بھی بوجھ اٹھا سکتی ہے، غرض یہ تینوں قیدی شدت جستیاچ کو بیان کرنے کے لئے لائی گئیں، کہ ایسا شخص جس نے اپنا مال اور محنت خرچ کر کے ایک بارغ لگایا، اور وہ بارغ تیار ہو کر پھل بھی دینے لگا، اور اسی حالت میں اس کا بڑھا پا اور کمزوری کا زمانہ بھی آگیا، اور یہ شخص صاحب عیال بھی ہے، اور عیال بھی چھوٹے اور کمزور بچے ہیں، تو ان حالات میں اگر لگا یا ہو بارغ جل جائے تو صدمہ شدید ہو گا، اور تکلیف بے حد ہوگی۔

اسی طرح جس شخص نے رباہ کاری سے صدقہ و خیرات کیا یہ گویا اس نے بارغ لگایا، پھر موت کے بعد اس کی حالت اس بوڑھے جیسی ہو گئی جو کالے اور دوبارہ بارغ لگانے کی قدرت نہیں رکھتا، کیونکہ موت کے بعد انسان کا کوئی عمل ہی نہیں رہا، اور جس طرح عیال دار بوڑھا اس کا بہت محتاج ہوتا ہے کہ پھل کمانی محفوظ ہوتا کہ ضعیفی میں کام کرے، اور اگر اس حالت میں اس کا بارغ اور مال متاع جل جائے تو اس کے دکھ اور دکھ کی انتہاء نہ رہے گی، اسی طرح یہ صدقہ و خیرات جو رباہ خورد کے لئے کیا گیا تھا، عین ایسے وقت ہاتھ سے جاتا ہے گا جب کہ وہ اس کا بہت حاجت مند ہو گا۔

اس پوری آیت کا خلاصہ یہ ہوا کہ صدقہ و خیرات کے اللہ کے نزدیک مقبول ہونے کی ایک بڑی شرط اخلاص ہے، کہ خالص اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کے لئے خرچ کیا جائے، کسی نام و نمود کا اس میں دخل نہ ہو۔

اب اس پورے رکوع کی تمام آیات پر مکرر نظر ڈالئے تو ان سے الفاق فی سبیل اللہ اور صدقہ و خیرات کے اللہ کے نزدیک مقبول ہونے کی کچھ شرائط معلوم ہوں گی:

اول اس مال کا حلال ہونا جو اللہ کی راہ میں خرچ کیا جائے، دوسرے طریق سنت کے مطابق خرچ کرنا، تیسرے صحیح مصرف میں خرچ کرنا، چوتھے خیرات دے کر احسان نہ جتلا نا، پانچویں ایسا کوئی معاملہ نہ کرنا جس سے اُن لوگوں کی تحقیر ہو جن کو یہ مال دیا گیا ہے، چھٹے جو کچھ خرچ کیا جائے اخلاص نیت کے ساتھ خالص اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کے لئے ہو، نام و نمود کے لئے نہ ہو۔

دوسری شرط یعنی طریق سنت کے مطابق خرچ کرنا، اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی راہ میں خرچ کرتے وقت اس کا لحاظ رہے کہ کسی حقدار کی حق تلفی نہ ہو، اپنے عیال کے ضروری اخراجات بنیران کی رضا مندی کے بندیا کم کر کے صدقہ و خیرات کرنا کوئی امر ثواب نہیں، حاجت مند داروں کو محروم کر کے سائے مال کو صدقہ و خیرات یا وقف کر دینا تعلیم سنت کے خلاف ہے، پھر اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کی ہزاروں صورتیں ہیں۔

طریق سنت یہ ہے کہ مصرف کی اہمیت اور ضرورت کی شدت کا لحاظ کر کے مصرف کا انتظام کیا جائے، عام طور پر خرچ کرنے والے اس کی رعایت نہیں کرتے۔

تیسری شرط کا حاصل یہ ہے کہ ثواب ہونے کے لئے صرف اتنی بات کافی نہیں کہ اپنے خیال میں کسی کام کو نیک سمجھ کر نیک نیتی سے اس میں صرف کر دے، بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ مصرف شریعت کی رُود سے جائز اور مستحسن بھی ہو، کوئی شخص ناجائز کھیل تماشوں کے لئے اپنی جائداد وقف کر دے تو وہ بجائے ثواب کے عذاب کا حق ہو گا، یہی حال تمام اُن کاموں کا ہو جو شریعت کی رُود سے مستحسن نہیں ہیں۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَنْفِقُوا مِنْ كَسْبِكُمْ رِوَمَا أَخْرَجْنَا

اے ایمان والو خرچ کرو مستحکم چیزیں اپنی کمائی میں سے اور اس چیز میں سے کہ جو

لَكُمْ مِنَ الْأَرْضِ رِوَمَا لَا تَبْسُوَا الْخَيْثُ مِنْهُ تَنْفِقُونَ وَلَسْتُمْ

ہم نے پیدا کیا تمہارے واسطے زمین سے اور قصد کرو مندی چیز کا اس میں سے کہ اس کو خرچ کرو، حالانکہ تم

يَا خِزْيَةُ إِلَّا أَنْ تُغِيضُوا فِيهِ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ غَنِيٌّ حَمِيدٌ ﴿١٢٨﴾

اس کو کسی نہ لو گے مگر یہ کہ چشم پوشی کرجاؤ اور جان رکھو کہ اللہ بے پروا ہے غریبوں والا ،

الْكَافِرُ يُعَذِّبُكُمْ بِالْفَقْرِ وَيَا مَرْكُومًا بِالْفَحْشَاءِ وَاللَّهُ يَعْلَمُكُمْ

شیطان وعدہ دیتا ہے تم کو تنگدستی کا اور حکم کرتا ہے بیحیائی کا اور اللہ وعدہ دیتا ہے تم کو

مَغْفِرَةً مِنْهُ وَفَضْلًا وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ ﴿١٢٩﴾ يُوْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ

اپنی بخشش اور فضل کا اور اللہ بہت کثافت والا ہے سب کچھ جانتا ہے، عنایت کرتا ہے کچھ جس کو

يَشَاءُ وَمَنْ يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا وَمَا يَذَّكَّرُ

چاہے اور جس کو سمجھ مل ہے اس کو بڑی عین مل اور نصیحت دی قبول کرتے ہیں

إِلَّا أُولَ الْأَلْبَابِ ﴿١٣٠﴾ وَمَا أَنْفَقْتُمْ مِنْ نَفَقَةٍ أَوْ نَذَرْتُمْ مِنْ

جو عقل والے ہیں ، اور جو خرچ کر گئے تم خیرات یا قبول کر گئے کوئی منت تو

تَذَرُّوْنَ فَإِنَّ اللَّهَ يَعْلَمُهَا وَمَا لِلظَّالِمِينَ مِنْ أَنْصَارٍ ﴿١٣١﴾ إِنْ تَبَدَّلَا

بیشک اللہ کو سب معلوم ہے اور ظالموں کا کوئی مددگار نہیں ، اگر ظاہر کر کے دو

الْقَدَّاسِ فَنِعْمَ هِيَ وَإِنْ تُخَفُّوْهَا وَتُؤْتُوْهَا الْفَقْرَاءَ فَهِيَ

خیرات تو کیا اچھی بات ہے ، اور اگر اس کو چھپاؤ اور فقیروں کو پہنچاؤ تو وہ

خَيْرٌ لَّكُمْ وَيَكْفُرْ عَنْكُمْ مِنْ سَيِّئَاتِكُمْ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ

بہتر ہے تمہارے حق میں اور دوسرے گناہ کچھ مٹا دے اور اللہ تمہارے کاموں سے

خَيْرٌ ﴿١٣٢﴾ لَيْسَ عَلَيْكَ هَذَا هُمٌّ وَلَكِنَّ اللَّهَ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ

خوب خیر داتا ہرگز نہیں اُن کو راہ پر لانا اور لیکن اللہ راہ پر لادے جس کو چاہے ،

وَمَا تُسْفِقُوا مِنْ خَيْرٍ فَلَا نَفْسِكُمْ وَمَا تُسْفِقُونَ إِلَّا ابْتِغَاءَ وَجْهِ

اور جو کچھ خرچ کر گئے تم مال سوا اپنے ہی واسطے جب تک کہ خرچ کر گئے اللہ ہی کی رضا جوئی

اللَّهُ وَمَا تُسْفِقُوا مِنْ خَيْرٍ لِيُؤْتِيَ إِلَيْكُمْ وَأَنْتُمْ لَا تظْلَمُونَ ﴿١٣٣﴾

میں اور جو خرچ کر گئے خیرات سوہری لے گی تم کو اور تمہارا حق نہ رہے گا ،

لِنَفْسٍ أَعْلَنَ الَّذِينَ أَحْبَبُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ لَا يَسْتَطِيعُونَ ضَرْبًا

خیرات کی فقیروں کیلئے ہے جوڑ کے ہوتے ہیں اللہ کی راہ میں چل پھر نہیں سکتے

فِي الْأَرْضِ مَنْ يَحْبِبُهُمُ الْجَاهِلُ أَغْنِيَاءُ مِنَ التَّعَفُّفِ تَعْرِفُهُمْ

تک میں سمجھیں ان کو نادان مالدار اُن کے سوال نہ کرنے سے تو پہچانتا ہے ان کو

بِسِيمَتِهِمْ لَا يَسْأَلُونَ النَّاسَ إِلْحَافًا وَمَا تُسْفِقُوا مِنْ خَيْرٍ فَإِنَّ

اُن کے چہرے سے ، نہیں سوال کرتے لوگوں سے پٹ کر ، اور جو کچھ خرچ کر گئے کا ان کی چیز وہ

اللَّهُ بِهِ عَلِيمٌ ﴿١٣٤﴾ الَّذِينَ يُسْفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ بِالْأَيْدِ وَالنَّهَارِ

بیشک اللہ کو معلوم ہے ، جو لوگ خرچ کرتے ہیں اپنے مال اللہ کی راہ میں رات کو اور دن کو

سِرًّا أَوْ عَلَانِيَةً فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا تَخَوْفُ عَلَيْهِمْ

چھپا کر اور ظاہر میں تو اُن کے لئے ثواب ہر ان کا اپنے رب کے پاس اور نہ ڈرو اُن پر

وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿١٣٥﴾

اور نہ وہ غمیں ہوں گے ۔

خلاصہ تفسیر

اے ایمان والو! نزدیک کام میں خرچ کرو عمدہ چیز کو اپنی کمائی میں سے اور (عمدہ چیز کو)

اس میں سے جو کہ ہم نے تمہارے کام میں لانے کے لئے زمین سے پیدا کیا اور ردی (ناکارہ) چیز

کی طرف ہست مت لے جایا کر وہ اس میں سے خرچ کر دو حالانکہ (دوسری ہی چیز اگر کوئی تم کو تمہارا

حق واجب کے عوض یا سوغات میں دینے لگے تو تم کہیں اس کے لینے والے نہیں ، ہاں مگر چشم پوشی

(اور رعایت) کرجاؤ (تو اور بات ہے) اور یہ یقین رکھو کہ اللہ تعالیٰ کسی کے محتاج نہیں (جو ایسی

ناکارہ چیزوں سے خوش ہوں) تعریف کے لائق ہیں (یعنی ذات و صفات میں کامل ہیں تو ان کے

دربار میں چیز بھی کامل تعریف کے لائق ہی پیش کرنا چاہئے) شیطان تم کو محتاجی سے ڈراتا ہے ،

وہ اگر خرچ کر دے یا اچھا مال خرچ کر دے تو محتاج ہو جاؤ گے (اور تم کو بڑی بات (یعنی غفلت)

کا مشورہ دیتا ہے) اور اللہ تعالیٰ تم سے وعدہ کرتا ہے (خرچ کرنے پر اور اچھی چیز خرچ کرنے پر)

اپنی طرف سے گناہ معاف کر دینے کا اور زیادہ دینے کا (یعنی چونکہ ایک جگہ خرچ کرنا طاعت ہے

عموم سے امام ابوحنیفہؒ نے استدلال کیا ہے کہ عشری زمین کی ہر قلیل و کثیر پیداوار پر عشر واجب ہے، سورۃ انعام کی آیت اَنْتُمْ اَنْتُمْ حَصَّاصُہُمْ (۶۱:۵۷) و جو پ عشر میں بالکل صریح اور واضح ہے، عشر و خراج شریعت اسلامی کے دو اصطلاحی لفظ ہیں، ان دونوں میں ایک بات مشترک ہے کہ اسلامی حکومت کی طرف سے زمینوں پر عائد کردہ ٹیکس کی ایک حیثیت ان دونوں میں ہے، فرق یہ ہے کہ عشر فقط ٹیکس نہیں بلکہ اس میں ٹیکس سے زیادہ اصلی حیثیت عبادت مالی کی ہے، مثل زکوٰۃ کے، اسی لئے اس کو زکوٰۃ الارض بھی کہا جاتا ہے، اور خراج غا لیس ٹیکس ہے، جس میں عبادت کی کوئی حیثیت نہیں، مسلمان چونکہ عبادت کے اہل اور پابند ہیں، ان سے جو زمین کی پیداوار کا حصہ لیا جاتا ہے اس کو عشر کہتے ہیں، اور غیر مسلم چونکہ عبادت کے اہل نہیں، ان کی زمینوں پر جو کچھ عائد کیا جاتا ہے اس کا نام خراج ہے، عملی طور پر زکوٰۃ اور عشر میں یہ بھی فرق ہے کہ سونا چاندی اور تجارت کے مال پر زکوٰۃ سال بھر گزرنے کے بعد عائد ہوتی ہے، اور عشر زمین سے پیداوار حاصل ہوتے ہی واجب ہر جاتا ہے۔

دوسرا فرق یہ بھی ہے کہ اگر زمین سے کوئی پیداوار نہ ہو تو عشر ساقط ہو جاتا ہے، لیکن اموال تجارت اور سونے چاندی پر اگر کوئی نفع بھی نہ ہو تب بھی سال پورا ہونے پر ان پر زکوٰۃ فرض ہوگی، عشر و خراج کے مسائل کی تفصیل کا یہ موقع نہیں، کتب فقہ میں مذکور ہے، اور احقر نے اپنی کتاب نظام الاراضی میں بھی تفصیل سے لکھ دیا ہے، جس میں پاکستان و ہندوستان کی زمینوں کے خصوصی احکام بھی لکھے گئے ہیں۔

اَنْتُمْ اَنْتُمْ حَصَّاصُہُمْ (۶۱:۵۷) وَمَا يَدْرُ اَنْتُمْ اَنْتُمْ اَنْتُمْ حَصَّاصُہُمْ (۶۱:۵۷) جب کس کے دل میں یہ خیال آئے کہ اگر خیرات کروں گا تو مغلس ہو جاؤں گا، اور حق تعالیٰ کی تاکید سن کر بھی اس کی ہمت نہ ہو، اور دل چاہے کہ اپنا مال خرچ نہ کرے، اور وعدہ الہی سے اعراض کر کے وعدہ شیطانی پر طبیعت کو میلان اور اعتماد ہو تو اس کو یقین کر لینا چاہئے کہ یہ معنوں شیطان کی طرف سے ہے، یہ نہ کہ شیطان کی توہم نے کس صورت بھی نہیں دیکھی، حکم کرنا تو درکنار رہا، اور اگر یہ خیال آوے کہ صدقہ و خیرات سے گناہ بچے جائیں گے، اور مال میں بھی ترقی اور برکت ہوگی تو جان لے کہ یہ معنوں اللہ کی طرف سے آیا ہے، اور خدا کا شکر کرے اور اللہ کے خزانے میں کمی نہیں اس کے ظاہر و باطن نیت و عمل کو خوب جانتا ہے۔

حکمت کے معنی اور تفسیر اَنْتُمْ اَنْتُمْ حَصَّاصُہُمْ (۶۱:۵۷) لفظ حکمت قرآن کریم میں بار بار آیا ہے، اور ہر جگہ اس کی تفسیر میں مختلف معنی بیان کئے گئے ہیں، تفسیر بحر محیط میں اس جگہ تمام اقوال مغیرین کو جمع کیا ہے، وہ تقریباً تین ہیں، مگر آخر میں فرمایا

کہ درحقیقت یہ سب اقوال متقارب ہیں، ان میں کوئی اختلاف نہیں، صرف تعبیرات کا فرق ہے، کیونکہ لفظ حکمت، احکام یا کسر کا مصدر ہے، جس کے معنی ہیں کسی عمل یا قول کو اس کے تمام اوصاف کے ساتھ مکمل کرنا۔

اسی لئے بحر محیط میں آیت بقرہ اِنَّہٗ اللہُ اَللُّکَ وَالْحِکْمَۃُ (۲:۲۵۱) جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے متعلق ہے، اس کی تفسیر میں فرمایا:

”حکمت کے اصل معنی ہر شے کو اس کے محل میں رکھنے کے ہیں اور اس کا کمال صرف نبوت ہے جو سکتا ہے اس لئے یہاں حکمت کی تفسیر نبوت کی گئی ہے۔“	وَالْحِکْمَۃُ وَضَعَ الْاُمُوْرَ فِي مَجْلَعِہَا مَعَالِ الصَّوَابِ وَکَمَالِ ذٰلِکَ اِنْ شَاءَ یَحْصُلُ بِهَا الشُّبُوْحُ
--	--

امام راغب اصفہانیؒ نے مفردات القرآن میں فرمایا کہ لفظ حکمت جب حق تعالیٰ کے لئے استعمال کیا جائے تو معنی تمام استیلاء کی پوری معرفت اور مستحکم ایجاد کے ہوتے ہیں، اور جب غیر اللہ کی طرف اس کی نسبت کی جاتی ہے تو موجودات کی صحیح معرفت اور اس کے مطابق عمل مراد ہوتا ہے۔

اسی مہنوم کی تفسیر میں مختلف الفاظ میں کی گئی ہیں، کسی جگہ اس سے مراد قرآن ہے، کسی جگہ حدیث، کسی جگہ علم صحیح، کہیں عمل صالح، کہیں قول صادق، کہیں عقل سلیم، کہیں فقہ فی الدین کہیں اصابت رائے اور کہیں خشیت اللہ، اور آخری معنی تو خود حدیث میں بھی مذکور ہیں، اِنَّہٗ اللہُ اَللُّکَ وَالْحِکْمَۃُ (۲:۲۵۱) میں حکمت کی تفسیر صحابہؓ و تابعینؓ سے حدیث و سنت منقول ہے، اور بعض حضرات نے یہ فرمایا کہ آیت ذیل لَفْظِ اَلْحِکْمَۃُ میں یہ سب چیزیں مراد ہیں۔ (بحر محیط، ص ۳۲۰، ج ۲)

اور ظاہر یہی قول ہے، اور ارشاد قرآنی وَمَنْ یُّؤْتِ الْحِکْمَۃَ فَقَدْ اَوْفٰی سَعٰیًا کَثِیْرًا سے بھی اس کی طرف اشارہ نکلتا ہے، کہ معنی اس کے یہ ہیں کہ جس شخص کو حکمت دیدی گئی اس کو خیر کثیر دیدی گئی، واللہ اعلم۔

وَمَا يَدْرُ اَنْتُمْ اَنْتُمْ اَنْتُمْ حَصَّاصُہُمْ (۶۱:۵۷) وَمَا يَدْرُ اَنْتُمْ اَنْتُمْ اَنْتُمْ حَصَّاصُہُمْ (۶۱:۵۷) کسی قسم کے خسر خرچ کرنے میں سب خرچ آگئے، وہ بھی جس میں سب شرائط مذکورہ کی رعایت ہو، اور وہ بھی جس میں کل کی یا بعض کی رعایت نہ ہو، مثلاً فی سبیل اللہ نہ ہو، بلکہ معصیت میں ہو یا انفاق میں رہا، شامل ہو یا انفاق کر کے اس پر احسان جتانا ہو، یا حلال یا حرام مال نہ ہو، اسی طرح نذر کے عموم میں سب نذریں آگئیں، مثلاً عبادت مالیہ کی نذر، اور اسی مناسبت سے انفاق کے ساتھ نذر کو لائے ہیں یا عبادت دینیہ کی نذر ہو، پھر وہ مطلق ہو یا کسی امر پر معلق ہو، پھر یہ کہ اس کا ایفاء کیا گیا ہو یا نہ

کیا گیا ہو، اور مقصود اس کہنے سے یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو ان سب چیزوں کا علم ہے وہ اس کی جزاء دیں گے، یہ اس لئے سنایا تاکہ حدود و شرائط کی رعایت کی ترغیب اور عدم رعایت سے ترہیب ہو، اور بے جا کام کرنے والوں سے وہ لوگ مراد ہیں جو ضروری شرائط کی رعایت نہیں کرتے، ان کو صریحاً وعید سنائی۔

إِنْ تَبَدَّلَ الصَّدَقَاتُ فَنِعِمَّا هِيَ رَأْيَ رَبِّهِ، وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ۔
آیت فرض اور نفل سب صدقات کو شامل ہے، اور سبب اخفاء ہی انفل ہے، اس میں دینی مصلحت بھی ہے، کہ ربا سے ابعد ہے، لینے والا بھی نہیں شرابا، اور دنیوی مصلحت بھی ہے کہ اپنے مال کی مقدار عام لوگوں پر ظاہر نہیں ہوتی، اور مراد افضلیت اخفاء سے آیت میں انفلت فی نفسہ ہے، پس اگر کسی مقام پر کسی مارض سے مثلاً نفع نہمت یا امید اقتدار وغیرہ سے اظہار کو ترجیح ہو جائے تو افضلیت فی نفسہ کے منافی نہیں، چنانچہ عَمَّا تَكْتُمُونَ مَتَى تَكْتُمُونَ كَفَارَةٌ سَيِّئَاتٍ لِّمَنْ اخْتَفَا كَے ساتھ تو خاص نہیں، صرف اس بات پر تنبیہ کرنے کے لئے اخفاء کے ساتھ اس کا ذکر کیا ہے کہ اخفاء میں نیچے اگر کوئی ظاہری فائدہ نظر نہ آئے تو منقبض نہیں ہونا چاہئے، اس لئے کہ تمھارے گناہ اللہ معاف کرتا ہے، اور یہ تمھارے لئے فائدہ عظیم ہے۔

لَيْسَ عَلَيْكُمْ مَنَاسِكٌ مِّمَّا تَرَكَتُمْ وَلَا تَنْفَلُوا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللَّهُ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ۔
نیت بہنی تھاری اصل میں اپنے ہی نفع حاصل کرنے کی ہے، اور واقع میں بھی حاصل خاص تم ہی کو ہوگا، پھر ان زوائد پر کیوں نظر کی جاتی ہے، کہ یہ نفع خاص اسی طریق سے حاصل کیا جاوے کہ مسلمان ہی کو صدقہ دیں، اور کافر کو نہ دیں۔

یہاں یہ بات بھی سمجھ لیجئے کہ اس صدقہ سے مراد صدقہ نقلی ہے جن کا ذمی کافر کو بھی دینا جائز ہے، زکوٰۃ مراد نہیں ہے، کیونکہ وہ سوائے مسلمان کے کسی دوسرے کو دینا حرام ہے۔ (مظہری)

مسئلہ: حربی کا زکوٰۃ کسی قسم کا صدقہ وغیرہ دینا جائز نہیں۔
مسئلہ: کافر ذمی یعنی غیر حربی کو صرف زکوٰۃ و عشر دینا جائز نہیں، اور دوسرے صدقات واجبہ و نفل سب جائز ہیں، اور آیت میں زکوٰۃ داخل نہیں۔

لَقَدْ آتَيْنَا الْكَافِرِينَ أَهْمًا مِّمَّا يَتْلُونَ مِنَ الْقُرْآنِ لِيَعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ سَرَّهُمْ وَأَنَّ اللَّهَ شَهِيدٌ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ عَظِيمٌ۔
فراء سے مراد وہ تمام لوگ ہیں جو دینی مشغولیت کی وجہ سے دوسرا کوئی کام نہیں کر سکتے۔
يَحْتَسِبُ الْمُبْتَلَىٰ أَنْ يُعْطِيَ مِمَّا تَرَكَ الْكَاثِرُونَ وَلَا يَحْتَسِبُ أَنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ سَرَّهُمْ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ بِمَا يَفْكُرُونَ۔
اس آیت سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی فقیر نبی پرے پہنچے ہوئے ہو تو اس کی وجہ سے اس کو غنی نہیں کہا جائے گا، بلکہ اس کو فقیر ہی کہا جائے گا۔

اور اپنے آدمی کو زکوٰۃ دینا بھی صحیح ہوگا (قرطبی)
تَعْنِي فَنِعْمًا بِمَنْ تَعْمَلُونَ سے معلوم ہوا کہ علامات کو دیکھ کر حکم لگانا صحیح ہے، چنانچہ اگر کوئی مردہ اس قسم کا پایا جائے کہ اس پر زنا ہے اور اس کا عقد بھی نہیں کیا ہوا ہو تو اس کو مسلمانوں کے قبرستان میں دفن نہیں کیا جائے گا (قرطبی)

لَا يَسْأَلُونَ النَّاسَ إِلْحَافًا، اس آیت سے بظاہر مفہوم ہوتا ہے کہ وہ پست کر نہیں دیتے لیکن بغیر پست کر مانگنے کی نفی نہیں ہے، چنانچہ بعض حضرات کا یہی قول ہے، لیکن جمہور کے نزدیک اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ سوال بالکل ہی نہیں کرتے، لَئِنْ تَعْلَمَ مَتَى تَعْلَمُونَ عَنْ الْمَنَاسِكِ عَقَبَةً نَّاتِيَةً (قرطبی)

آٹھویں آیت الَّذِينَ يَتَّبِعُونَ آمَرَ الْقَوْمِ بِاللَّيْلِ وَالنَّهَارِ فِي مَا هُمْ فِيهِ مُخْلِطُونَ۔
عظیم اور فضیلت کا بیان ہے جو اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کے عادی ہیں، تمام حالات و اوقات میں رات میں اور دن میں، خفیہ اور علانیہ ہر طرح فی سبیل اللہ خرچ کرتے رہتے ہیں، اس کے ضمن میں یہ بھی بتلادیا کہ صدقہ و خیرات کے لئے کوئی وقت مقرر نہیں، نہ رات اور دن کی کوئی تعیین ہے، اس طرح خفیہ اور علانیہ دونوں طرح سے اللہ کی راہ میں خرچ کرنا ثواب ہی بشرطیکہ اخلاص کے ساتھ خرچ کیا جائے، نام و نمود مقصود نہ ہو، خفیہ خرچ کرنے کی فضیلت بھی اسی حد تک ہو کہ علانیہ خرچ کرنے کے لئے کوئی ضرورت داعی نہ ہو، اور جہاں ایسی ضرورت ہو وہاں علانیہ خرچ کرنا ہی افضل ہے۔

رُوحُ السَّعْيِ فِي سَبِيلِ اللَّهِ اس کا نقل کیا ہے کہ حضرت صدیق اکبرؓ نے چالیس ہزار دینار اللہ کی راہ میں اسی طرح خرچ کئے کہ دس ہزار دن میں، دس ہزار رات میں، دس ہزار خفیہ اور دس ہزار علانیہ، بعض مفسرین نے اس آیت کا شان نزول اسی واقعہ صدیق اکبرؓ کو لکھا ہے، اسکے شان نزول کے متعلق اور بھی مختلف اقوال ہیں۔

الَّذِينَ يَأْكُلُونَ الرِّبَا لَا يَقْوَمُونَ إِلَّا كَمَا يَقُومُ الَّذِي يَخْطِئُ

جو لوگ کھاتے ہیں سود نہیں اٹھیں گے قیامت کو مگر جس طرح اٹھتا ہے وہ شخص کہ جس کے حواس

السَّيْطَانُ مِنَ الْمَسِّ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ قَالُوا إِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبَا

شیطان کی طرف سے مس کی حالت ان کی اس واسطے ہو کہ انھوں نے کہا کہ بیع اگر بھی تو ایسی ہے جیسے سود

وَأَحَلَّ اللَّهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبَا فَمَنْ جَاءَكَ مَوْعِظَةٌ مِنْ رَبِّهِ

حالانکہ اللہ نے حلال کیا بیع و سود اگر کوئی حرام کیا بیع و سود کو، پھر موعظہ نبی نصیحت اپنے رب کی

رَبِّهِ قَاتِلْهُ فَاَلَمْ يَكُنْ لَكَ آيَةً ۚ وَمَنْ كَانَ عَدُوًّا

طرف سے اور وہ باز آگیا تو اس کی واسطے ہر چہ ہر چکا اور معاملہ اس کا اللہ کے حوالے ہو اور جو کوئی

فَاُولَٰئِكَ اَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ۝ يَمْحُو اللَّهُ

بہرگز سرد تو وہی لوگ ہیں دوزخ والے وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے ، مٹا دے اللہ

الَّذِينَ لَا يُؤْتُونَ الصَّدَقَاتِ وَاللَّهُ لَا يُغْنِي عَنْهُمْ كَفَارُهُمْ ۝

سود اور بڑھاتا ہر تجارت کو اور اللہ خوش نہیں کسی ناشکر گنہگار سے ،

اِنَّ الَّذِينَ اٰمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَاَقَامُوا الصَّلَاةَ وَ

جو لوگ ایمان لائے اور عمل نیک کئے اور قائم رکھا نماز کو اور

اَتَوْا الزَّكَاةَ لَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ

دیتے رہے زکوٰۃ ان کیلئے ہے ثواب ان کا ان کے رب کے پاس اور نہ ان کو خوف ہے اور

لَهُمْ يَخْشَوْنَ ۝ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَذَرُوا مَا

وہ غمکین ہوں گے ، اے ایمان والو! اللہ سے اور چھوڑ دو جو کچھ

بَقِيَ مِنَ الرِّبَا اِنَّ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ۝ اِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاذْكُرُوْا

باقی رہ گیا ہے سود اگر تم کو یقین ہے اللہ کے فرمانے کا ، پس اگر نہیں چھوڑتے تو تیار ہوجاؤ

بِحَرْبٍ مِّنْ اِلٰهِ وَرَسُوْلِهِ ۚ وَاِنْ تُبْتَلُوْا فَلَكُمْ رُءُوسُ اَمْوَالِكُمْ

لڑنے کو اللہ سے اور اس کے رسول سے اور اگر توبہ کرتے ہو تو تمہارا واسطے ہر اصل مال تمہارا

لَا تُظْلَمُوْنَ وَلَا تَظْلَمُوْنَ ۝ وَاِنْ كَانَ دُوْعٰى قَنَظْرَةً اِلٰی

ذم کسی پر ظلم کر د اور نہ ستم ہو کوئی ، اور اگر ہے تنگدست تو بہت دینی چاہئے کشاکش

مَيْسَرَةٍ ۚ وَاَنْ تَصَدَّقُوا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ وَاتَّقُوا

ہونے تک اور بخش دو تو بہت بہتر ہے تمہارے لئے اگر تم کو سمجھ ہے ، اور ڈرتے رہو

يَوْمَ تَرْجَعُوْنَ فِيْهِ اِلَى اللّٰهِ ۚ ثُمَّ تُوَفَّى كُلُّ نَفْسٍ مَا كَسَبَتْ وَهُمْ

اس دن سے جس دن لوٹائے جائے اللہ کی طرف پھر پورا دیا جائے گا ہر شخص کو جو کچھ اس نے کمایا اور

لَا يَظْلَمُونَ ۝

ان پر ظلم نہ ہوگا

مُحَلِّصَةٌ تَفْسِير

جو لوگ سود کھاتے ہیں (یعنی لیتے ہیں) نہیں کھڑے ہوں گے (قیامت میں قبروں سے) مگر

جس طرح کھڑا ہوتا ہے ایسا شخص جس کو شیطان نے جھلی بنا دیا ہو پٹ کر (یعنی حیران مہوش)

پس سزا اس لئے ہوگی کہ ان (سود خوار) لوگوں نے (سود کے حلال ہونے پر استدلال کرنے کے

لئے) کہا تھا کہ بیچ بھی تو مثل سود کے ہے ، کیونکہ اس میں بھی مقصود نفع حاصل کرنا ہوتا ہے ،

اور بیع یقیناً حلال ہے ، پھر سود بھی جو کہ اس کا مثل ہے حلال ہونا چاہئے (حالانکہ (دونوں

میں کھلا فرق ہے کہ اللہ تعالیٰ نے (جو کہ مالک ہیں احکام کے) بیع کو حلال فرمایا ہے اور سود

کو حرام کر دیا ہے (اس سے زیادہ اور کیا فرق ہوگا) پھر جس شخص کو اس کے پروردگار کی طرف

(اس بارہ میں) نصیحت پہنچی اور وہ (اس سود کے فعل اور اس کفر کے قول سے) یعنی حلال کہنے

(سے) باز آگیا (یعنی حرام سمجھنے لگا اور لینا بھی چھوڑ دیا) تو جو کچھ (اس حکم کے آنے سے) پہلے

(لینا) ہو چکا ہے وہ اس کا بار بار یعنی ظاہر شرع کے نزدیک اس کی یہ توبہ قبول ہوگئی ، اور لیا ہوا

مال اسی کی ملک ہے (اور باطنی معاملہ اس کا کہ وہ دل سے باز آیا ہے یا منافقانہ توبہ کر لی ہے)

(یہ خدا کے حوالے رہا) ، اگر دل سے توبہ کی ہوگی عند اللہ نافع ہوگی ورنہ کا عدم ہوگی ، تم کو

بدگمانی کا کوئی حق نہیں) اور جو شخص (نصیحت مذکور سن کر بھی) اسی قول اور اس فعل کی

طرف) پھر خود کرے تو روبرو اس کے کہ ان کا یہ فعل خود گناہ کبیرہ ہے) یہ لوگ دوزخ میں

جائیں گے (اور روبرو اس کے کہ ان کا یہ قول کفر ہے اس لئے) وہ اس (دوزخ) میں ہمیشہ

رہیں گے (اور سود لینے سے فی الحال مال بڑھتا نظر آتا ہے ، لیکن مال کا کار) اللہ تعالیٰ سود

کو مٹاتے ہیں رکھی تو دنیا ہی میں سب برباد ہو جاتا ہے ورنہ آخرت میں تو یقینی برباد ہو

کیونکہ وہاں اس پر عذاب ہوگا) اور (برخلاف اس کے صدقہ دینے میں گوئی الحال مال گھٹتا

معلوم ہوتا ہے ، لیکن مال کا اللہ تعالیٰ) صدقات کو بڑھاتے ہیں ، (کبھی تو دنیا میں بھی

ورنہ آخرت میں تو یقیناً بڑھتا ہے ، کیونکہ وہاں اس پر بہت سا ثواب ملے گا جیسا اوپر

آیات میں مذکور ہوا) اور اللہ تعالیٰ پسند نہیں کرتا (بلکہ مبغوض رکھتے ہیں) کسی کفر کرنے

والے کو (جو کہ قول مذکور کے مثل کلمات کفر منہ سے بکے) اور اسی طرح پسند نہیں کرتے

کسی گناہ کے کام کرنے والے کو (جو کہ فعل مذکور یعنی سود کے مثل کلمات مریکب ہو)۔

میں ایک جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک کام کئے اور (بالخصوص) نماز کی پابندی کی اور زکوٰۃ دی، ان کے لئے ان کا ثواب ہوگا ان کے پروردگار کے نزدیک اور (آخرت میں) ان پر کوئی خطہ واقع ہونے والا نہیں ہوگا اور نہ وہ (کسی مقصود کے قوت ہونے سے) منہموم ہوں گے،

لے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور جو کچھ سود کا بقایا ہے اس کو چھوڑ دو اگر تم ایمان والے ہو (کیونکہ ایمان کا تقاضا یہی ہے کہ اللہ کی اطاعت کی جائے) پھر اگر تم (اس پر عمل) نہ کرو گے تو اس تمہارے جو جنگ کا اللہ کی طرف سے اور اس کے رسول کی طرف سے (یعنی تمہارے خلاف جہاد ہوگا) اور اگر تم توبہ کر لو گے تو تم کو تمہارے اصل اموال مل جاویں گے (اس قانون کے بعد) نہ تم کسی پر ظلم کرنے پاؤ گے نہ تم اصل مال سے زیادہ لینے لگو اور نہ تم پر کوئی ظلم کرنے پاوے گا (کہ تمہارا اصل مال بھی نہ دلا جاوے) اور اگر (قرضدار) تنگ و سست ہو اور اس لئے میعاد پر نہ دے سکے (تو اس کو) ہمت دینے کا حکم ہے (سود کی تک) یعنی جب اس کے پاس ادا کی گنجائش ہو (اور یہ بات) کہ بالکل معاف ہی کر دو اور زیادہ بہتر ہے تمہارے لئے، اگر تم کو (اس کے ثواب کی) خبر ہو۔

اور (مسلمانو!) اس دن سے ڈرو جس میں تم (سب) اللہ تعالیٰ کی پیشی میں لائے جاؤ گے پھر ہر شخص کو اس کا کیا ہوا (یعنی اس کا بدلہ) پورا پورا ملے گا اور ان پر کسی قسم کا ظلم نہ ہوگا، (تو تم پیشی کے لئے اپنی کارگزاری درست رکھو، اور کسی قسم کی خلاف ورزی مت کرو) +

معارف و مسائل

ان آیات میں رہا یعنی سود کی حرمت اور اس کے احکام کا بیان شروع ہوا ہے، یہ مسئلہ کئی حیثیتوں سے بہت اہم ہے، ایک طرف سود و ربا پر قرآن و سنت کی شدید وعیدیں اور دوسری طرف دنیا کی اقتصادیات میں اس کا جو لازم بن جانا اور اس سے نجات کی مشکلات کا مسئلہ طویل الذیل ہے، اور کئی حیثیتوں سے اس پر غور کرنا ہے۔

اول اس بارے میں قرآن کی آیات کی صحیح تفسیر اور احادیث صحیحہ کے ارشادات میں غور کر کے یہ متعین کرنا کہ قرآن و سنت کی اصطلاح میں ربا کیا چیز ہے، اور کن کن معاملات کو شامل ہے، اور اس کی حرمت کس بھمت و مصلحت پر مبنی ہے، اس میں کس قسم کی مضرتیں ہیں۔ دوسری حیثیت اس کی عقلی اور معاشی ہے کہ کیا فی الواقع سود و ربا ایسی چیز ہے جو دنیا کی اقتصادی ترقی کی ضامن ہو سکے، اور جس کو نظر انداز کرنے کا لازمی نتیجہ تجارت اور عوام اقتصادیات کی تباہی ہو، یا سارا چکر صرف خدا تعالیٰ اور آخرت سے غافل رہاؤں کی پیداوار ہے، ورنہ بغیر اس کے بھی تمام معاشی مسائل حل ہو سکتے ہیں، اور نہ صرف مشکلات کا حل بلکہ دنیا میں اقتصاد امن و اطمینان سود کے چھوڑنے پر موقوف ہے، اور یہ کہ دنیا کے اقتصادی مصائب کا سبب بڑا سبب سود و ربا ہے۔

یہ دوسری بحث ایک معاشی اور اقتصادی مسئلہ ہے، جس کے تحت میں بہت سی اصولی اور فروعی طویل بحثیں ہیں، جن کا تعلق تفسیر قرآن سے نہیں، اس لئے اس جگہ پہلی ہی بحث پر اکتفا کیا جاتا ہے، وہ بھی خاصی طویل ہے۔

یہ چھ آیاتیں ہیں جن میں سود کی حرمت اور احکام کا بیان ہے، ان میں سے پہلی آیت کے پہلے جملہ میں سود خوروں کے انجام بد اور محشر میں ان کی رسوائی اور گراہی کا ذکر ہے، ارشاد ہے کہ جو لوگ سود کھاتے ہیں وہ نہیں کھڑے ہوتے مگر جس طرح کھڑا ہوتا ہے وہ آدمی جس کو کسی شیطان جن نے لپٹ کر خبطی بنا دیا ہو، حدیث میں ہے کہ کھڑے ہونے سے مراد محشر میں قبر اٹھنا ہے کہ سود خور جب قبر سے اٹھے گا تو اس پاگل و مجنون کی طرح لٹھے گا جس کو کسی شیطان جن نے خبطی بنا دیا ہو۔

اس جملہ سے ایک بات تو یہ معلوم ہوتی کہ جنات و شیاطین کے اثر سے انسان بیہوش یا مجنون ہو سکتا ہے، اور اہل تجربہ کے متواتر مشاہدات اس پر شاہد ہیں، اور حافظ ابن قیم جوزی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ اطباء اور فلاسفہ نے بھی اس کو تسلیم کیا ہے، کہ صرع، بیہوشی یا جنون مختلف اسباب سے ہو کرتا ہے، ان میں بعض اوقات جنات و شیاطین کا اثر بھی اس کا

سبب ہوتا ہے، جن لوگوں نے اس کا انکار کیا ہے ان کے پاس بجز ظاہری استبعاد کے کوئی دلیل نہیں۔

دوسری بات یہ غور طلب ہو کہ فترآن نے یہ نہیں فرمایا کہ سود خور محشر میں پھل یا بھون ہو کر اٹھیں گے، بلکہ دیوانہ پن یا بے ہوشی کی ایک خاص صورت کا ذکر کیا ہے، کہ جیسے کسی کو شیطان نے پست کر خلی بنا دیا ہو، اس میں شاید یہ اشارہ ہے کہ بیہوش و بھون تو بعض اوقات چُپ چاپ پڑا بھی رہتا ہے، اُن کا یہ حال نہ ہوگا، بلکہ شیطان کے خلی بنائے ہوؤں کی طرح بھواس اور ہڈیاں اور دوسری بھونانہ حرکتوں کی وجہ سے پہچانے جائیں گے۔

اور شاید اس طرف بھی اشارہ ہو کہ بیماری سے بیہوش یا بھون ہو جانے کے بعد چونکہ احساس بالکل باطل ہو جاتا ہے، اس کو تکلیف یا عذاب کا بھی احساس نہیں رہتا، اُن کا یہ حال نہ ہوگا، بلکہ آسیب زدہ کی طرح تکلیف و عذاب کو پوری طرح محسوس کرے گا۔

اب یہاں یہ دیکھنا ہے کہ جرم و سزائیں کوئی مناسبت ہونی چاہئے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو سزا کسی شخص یا جماعت کے کسی جرم کے مقابلہ میں دی جاتی ہے، وہ یقیناً اس جرم کے مناسب ہوتی ہے، اس لئے سود خوروں کو خلی بنا کر محشر میں اٹھانا شاید اس کا اظہار ہو کہ سود خور روپے پیسہ کی حرص میں اس قدر مدہوش ہوتا ہے کہ اس کو نہ کسی غریب پر رحم آتا ہے نہ کسی کی شرم مانع ہوتی ہے، وہ چونکہ اپنی زندگی میں درحقیقت بیہوش تھا، اس لئے محشر میں بھی اسی حالت میں اٹھایا گیا، یا پسند اس لئے دی گئی کہ دنیا میں اس نے عقلی رنگ میں اپنی بے عقلی کو ظاہر کیا، کہ بیع کو مثل سود قرار دیا، اس لئے اس کو بے عقل کر کے اٹھا دیا گیا۔

یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ آیت میں سود کھانے کا ذکر ہے اور مراد مطلقاً سود لینا اور اس کا استعمال کرنا ہے، خواہ کھانے میں استعمال کرے یا لباس میں یا مکان اور اس کے فرنیچر میں، لیکن اس کو کھانے کے لفظ سے اس لئے تعبیر کیا کہ جو چیز کھائی جائے اس کی دہی کا کوئی امکان نہیں رہتا، بخلاف دوسری ضرورتوں کے استعمال کے کہ اس چیز کو واپس لیا دیا جاسکتا ہے، اس لئے مکمل قبضہ اور تصرف کو کھا جانے کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہو، اور نہ صرف عربی زبان میں بلکہ اردو، فارسی وغیرہ اکثر زبانوں کا یہی محاورہ ہے۔

اس کے بعد دوسرے جملہ میں سود خوروں کی اس سزا کی وجہ یہ بیان فرمائی ہے کہ ان لوگوں نے دوجرم کئے ایک تو بذریعہ سود کے حرام مال کھایا، دوسرے اس کو حلال سمجھا اور

حرام کہنے والوں کے جواب میں یہ کہا بیع و شراء بھی تو ربی کی مثل ہے، جس طرح ربی کے ذریعہ نفع حاصل کیا جاتا ہے اسی طرح بیع و شراء کے ذریعہ نفع مقصود ہے، اگر سود حرام ہے تو بیع بھی حرام ہونی چاہئے، حالانکہ اس کے حرام ہونے کا کوئی قائل نہیں، اس جگہ بظاہر مقتضائے مقام یہ تھا کہ لوگ یوں کہتے کہ ربی بھی تو مثل بیع کے ہے، جب بیع حلال ہو تو ربی بھی حلال ہونا چاہئے، مگر انھوں نے طرز بیان بدل کر حرام کہنے والوں پر ایک قسم کا اتہاز کیا، کہ تم ربی کو حرام کہتے ہو تو بیع کو بھی حرام کہو۔

تیسرے جملے میں ان لوگوں کے اس قول کا جواب حق تعالیٰ نے یہ دیا کہ یہ لوگ بیع کو ربی کی مثل اور برابر قرار دیتے ہیں، حالانکہ بحکم خداوندی ان دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے، کہ اللہ تعالیٰ نے ایک کو حلال قرار دیا اور دوسرے کو حرام، پھر دونوں برابر کیسے ہو سکتے ہیں۔

اس جواب میں یہ بات قابل غور ہے کہ ان لوگوں کا اعتراض تو عقلی طور پر تھا کہ جب دونوں معاملوں کا مقصد نفع کمانا ہے تو دونوں کا حکم ایک ہی ہونا چاہئے، اللہ تبارک و تعالیٰ نے ان کے عقلی شبہ کا جواب عقلی طور پر فرق بیان کر کے نہیں دیا، بلکہ حاکمانہ انداز میں یہ جواب دیا کہ مالک الملک و الملکوت اللہ جل شانہ ہے وہ ہی ہر چیز کے نفع و ضرر اور بھلے برے کو پوری طرح جانتا ہے، جب اس نے ایک کو حلال اور دوسرے کو حرام قرار دیدیا، تو سمجھ لو کہ جس چیز کو حرام کیا ہے اس میں ضرور کوئی نقصان و ضرر اور کوئی خباثت ہے، خواہ عام انسان اس کو محسوس کرے یا نہ کرے، کیونکہ مجموعہ نظام عالم کی پوری حقیقت اور اس کے نفع و ضرر کا احاطہ صرف وہی عظیم و خیر کر سکتا ہے، جس کے علم سے کوئی ذرہ جہاں چھپا ہوا نہیں ہے، عالم کے افراد یا جماعتیں اپنے اپنے مصالح اور مضرتوں کو پہچان سکتے ہیں، پورے عالم کے نفع و ضرر کا احاطہ نہیں کر سکتے، بعض چیزیں ایسی ہوتی ہیں کہ وہ کسی شخص یا جماعت کے حق میں مفید نظر آتی ہیں، مگر پوری قوم یا پورے ملک کے لئے اس میں مضرت ہوتی ہو، اس کے بعد تیسرے جملے میں یہ ارشاد ہے کہ سود حرام ہونے سے پہلے جس شخص نے کوئی رقم جمع کر لی تھی، لیکن جب سود کو حرام قرار دیدیا گیا، تو اگر آئندہ کے لئے اس نے توبہ کر لی، اور باز آگیا، تو اس سے پہلے جمع شدہ رقم ظاہر شرع کے حکم سے اسی کی ہو گئی، اور باطنی معاملہ اس کا کہ وہ دل سے باز آیا، یا منافقانہ توبہ کر لی، اس کا یہ معاملہ خدا کے حوالہ ہے۔ اگر دل سے توبہ کی ہے تو عند اللہ نافع ہوگی ورنہ کالعدم ہوگی، عام لوگوں کو بدگمانی کرنے کا حق نہیں ہو، اور جو شخص نصیحت سن کر بھی اسی قول و فعل کی طرف پھر عود کرے تو

چونکہ یہ فعل سود خوری گناہ ہے، یہ لوگ روزخ میں جائیں گے، اور چونکہ اُن کا یہ قول کہ سود مثل بیع کے حلال ہے کفر ہے اس لئے وہ روزخ میں ہمیشہ رہیں گے۔

دوسری آیت میں جو یہ ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ سود کو مٹانے میں اور صدقات کو بڑھانے میں، یہاں سود کے ساتھ صدقات کا ذکر ایک خاص مناسبت سے لایا گیا ہے، کہ سود اور صدقہ دونوں کی حقیقت میں بھی تضاد ہے، اور ان کے نتائج بھی متضاد ہیں، اور عموماً ان دونوں کاموں کے کرنے والوں کی غرض و نیت بھی متضاد ہوتی ہے۔

حقیقت کا تضاد تو یہ ہے کہ صدقہ میں تو بغیر کسی معاوضہ کے اپنا مال دوسروں کو دیا جاتا ہے، اور سود میں بغیر کسی معاوضہ کے دوسرے کا مال لیا جاتا ہے، ان دونوں کاموں کے کرنے والوں کی نیت اور غرض اس لئے متضاد ہے کہ صدقہ کرنے والا محض اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی اور ثوابِ آخرت کے لئے اپنے مال کو کم یا ختم کر دینے کا فیصلہ کرتا ہے، اور سود لینے والا اپنے موجود مال پر ناجائز زیادتی کا خواہشمند ہو، اور نتائج کا متضاد ہونا شرکاء کریم کی اس آیت سے واضح ہوا کہ اللہ تعالیٰ سود سے حاصل شدہ مال کو یا اس کی برکت کے شادی ہے، اور صدقہ کرنے والے کے مال یا اس کی برکت کو بڑھانے میں جس کا حاصل یہ ہوتا ہے کہ مال کی ہوس کو نیوالے کا مقصد پورا نہیں ہوتا، اور اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنے والا جو اپنے مال کی کمی پر راضی تھا، اس کے مال میں برکت ہو کر اس کا مال یا اس کے ثمرات و فوائد بڑھ جاتے ہیں۔

یہاں یہ بات قابلِ غور ہے کہ آیت میں سود کو مٹانے اور صدقات کو بڑھانے کا کیا مطلب ہے؟ بعض مفسرین نے فرمایا کہ یہ مٹانا اور بڑھانا آخرت کے متعلق ہے کہ سود خور کو اس کا مالِ آخرت میں کچھ کام نہ آئے گا بلکہ اس پر وبال بن جائے گا، اور صدقہ خیرات کرنے والوں کا مالِ آخرت میں ان کے لئے ابدی نعمتوں اور راحتوں کا ذریعہ بنے گا، اور یہ بالکل ظاہر ہے جس میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں، اور عامہ مفسرین نے فرمایا ہے کہ سود کا مٹانا اور صدقہ کا بڑھانا آخرت کے لئے تو ہے ہی، مگر اس کے کچھ آثار دنیا میں بھی مشاہدہ میں آ جاتے ہیں۔ سود جس مال میں شامل ہو جاتا ہے، بعض اوقات تورہ مال خود ہلاک و برباد ہو جاتا ہے، اور پچھلے مال کو بھی ساتھ لے جاتا ہے، جیسے کہ ربوہ سسٹم کے بازاروں میں اس کا ہمیشہ مشاہدہ ہوتا رہتا ہے، کہ بڑے بڑے کروڑ پتی اور سرمایہ دار دیکھتے دیکھتے دیوالیہ اور فقیر بن جاتے ہیں، بے سود کی تجارتوں میں بھی نفع و نقصان کے احتمالات رہتے ہیں، اور بہت سے تاجروں کو نقصان بھی کسی تجارت میں ہو جاتا ہے، لیکن ایسا نقصان کہ عمل کروڑ پتی تھا، اور آج ایک ایک پیسہ کی بھیک کا محتاج ہے، یہ صرف سود اور سسٹم کے بازاروں میں ہی ہوتا ہے۔

اور اہل تجربہ کے بے شمار بیانات اس بارے میں مشہور و معروف ہیں کہ سود کا مال فوری طور پر کتنا ہی بڑھ جائے، لیکن وہ عموماً پائیدار اور باقی نہیں رہتا، جس کا فائدہ اولاد اور نسلوں میں چلے، اکثر کوئی نہ کوئی آفت پیش آ کر اس کو برباد کر دیتی ہے، حضرت معمرؓ نے فرمایا کہ ہم نے بزرگوں سے سنا ہے کہ سود خور پر چالیس سال گزرنے نہیں پاتے، کہ اس کے مال پر حاق زمین ٹھٹھا آجاتا ہے۔

اور اگر ظاہری طور پر مال منافع دہر باد بھی نہ ہو تو اس کے فوائد و برکات و ثمرات سے محرومی تو یقینی اور لازمی ہے، کیونکہ یہ بات کچھ غفلت نہیں کہ سونا چاندی خود تو نہ مقصود ہے نہ کار آمد نہ اس سے کسی کی بھوک بٹ سکتی ہے، نہ پیاس نہ سردی نہ گرمی سے بچنے کے لئے اور صابن بچایا جاسکتا ہے، نہ وہ کپڑوں اور برتنوں کا کام لے سکتا ہے، پھر اس کو حاصل کرنے اور محفوظ رکھنے میں ہزاروں مشقتیں اٹھانے کا منشاء ایک عقلمند انسان کے نزدیک اس کے سوا نہیں ہو سکتا کہ سونا چاندی ذریعہ ہیں ایسی چیزوں کے حاصل کرنے کا کہ جن سے انسان کی زندگی خوشگوار بن سکے، اور وہ راحت و عزت کی زندگی گزار سکے، اور انسان کی فطری خواہش ہوئی ہے کہ یہ راحت و عزت جس طرح اسے حاصل ہوئی اس کی اولاد اور متعلقین کو بھی حاصل ہو۔ یہی وہ چیزیں ہیں جو مال و دولت کے فوائد و ثمرات کہلا سکتے ہیں، اس کے نتیجے میں یکہنا بالکل صحت ہوگا کہ جس شخص کو یہ ثمرات و فوائد حاصل ہوئے اس کا مال ایک حیثیت سے بڑھ گیا، اگرچہ دیکھنے میں کم نظر آئے، اور جس کو یہ فوائد و ثمرات کم حاصل ہوئے اس کا مال ایک حیثیت سے گھٹ گیا، اگرچہ دیکھنے میں زیادہ نظر آئے۔

اس بات کو سمجھ لینے کے بعد سود کا کاروبار اور صدقہ و خیرات کے اعمال کا جائزہ لیجئے، تو یہ بات مشاہدہ میں آجائے گی کہ سود خور کا مال اگرچہ بڑھتا ہوا نظر آتا ہے مگر وہ بڑھنا ایسا ہے کہ جیسے کسی انسان کا بدن ورم وغیرہ سے بڑھ جائے، ورم کی زیادتی بھی تو بدن ہی کی زیادتی ہے، مگر کوئی سمجھدار انسان اس زیادتی کو پسند نہیں کر سکتا، کیونکہ وہ جانتا ہے کہ یہ زیادتی موت کا پیغام ہے، اسی طرح سود خور کا مال کتنا ہی بڑھ جائے، مگر مال کے فوائد و ثمرات یعنی راحت و عزت سے ہمیشہ محروم رہتا ہے۔

یہاں شاید کسی کو یہ شبہ ہو کہ آج تو سود خوروں کو بڑی سے بڑی راحت و عزت حاصل ہو رہی ہے، کوٹھیوں، بنگلوں کے مالک ہیں، عیش و آرام کے سارے سامان ہتیا ہیں، کھانے، پینے، پہننے اور رہنے پہننے کی ضروریات بلکہ فضولیات بھی سب اُن کو حاصل ہیں، تو کر چا کر اور شان و شوکت کے تمام سامان موجود ہیں، لیکن غور کیا جائے تو ہر شخص سمجھ لے گا کہ سامانِ دنیا

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰزَلَوْا کَثْرَیًّا مِنْ عَاقِبَتِهِ
تَصِیْرًا لِّیْ قُلِّی

یعنی سود اگرچہ کتنا ہی زیادہ ہو جائے مگر انجام
نہجہ اس کا قلت ہے۔

یہ روایت مسند احمد اور ابن ماجہ میں مذکور ہے۔

آیت کے آخر میں ارشاد ہے، **وَاِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ مَنِ كَانَ کَفَّارًا** یعنی اللہ تعالیٰ پسند نہیں کرتے کسی کفر کرنے والے کو کسی گناہ کا کام کرنے والے کو، اس میں اشارہ فرمادیا ہو کہ جو لوگ سود کو حرام ہی نہ سمجھیں وہ کفر میں مبتلا ہیں اور جو حرام سمجھنے کے باوجود عملاً اس میں مبتلا ہیں وہ گنہگار فاسق ہیں۔

تیسری آیت میں مومنین صالحین جو نماز و زکوٰۃ کے پابند ہیں ان کے اجر عظیم اور آخرت کی راحت کا ذکر ہے، چونکہ اس سے پہلے آیت میں سود خوردوں کے لئے عذاب جہنم اور ان کی ذلت و خواری کا ذکر آیا تھا، مسترآن کریم کے عام اسلوب کے مطابق اس کے ساتھ ہی ایمان و عمل صالح کے پابند نماز و زکوٰۃ ادا کرنے والوں کے ثواب اور درجات آخرت کا ذکر کر دیا گیا۔

چوتھی آیت **يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَذَرُوا مَا بَقِيَ مِنَ الزَّيْطِ الَّذِي كُنتُمْ تَمُوتُونَ** کا خلاصہ یہ ہے کہ سود و ربوہ کی حرمت نازل ہونے کے بعد جو سود کی بقایا رقیب کسی کے ذمہ باقی تھیں ان کا لینا دینا بھی حرام کر دیا گیا۔

تشریح اس کی یہ ہے کہ سود کی حرمت نازل ہونے سے پہلے عام عرب میں سود کا رواج پھیلا ہوا تھا، آیات متذکرہ سے پہلے آیتوں میں اس کی مانعت آئی تو حسب عادت تمام مسلمانوں نے سود کے معاملات ترک کر دیئے، لیکن کچھ لوگوں کے مطالبات سود کی بقایا رقبوں کے دوسرے لوگوں پر تھے، اسی میں یہ واقعہ پیش آیا کہ بنی ثقیف اور بنی مخزوم کے آپس میں سودی معاملات کا سلسلہ تھا، اور بنو ثقیف کے لوگوں کا کچھ سودی مطالبہ بنی مخزوم کی طرف تھا، بنو مخزوم مسلمان ہو گئے تو اسلام لانے کے بعد انھوں نے سود کی رقم ادا کرنا جائز نہ سمجھا، ادھر بنو ثقیف کے لوگوں نے مطالبہ شروع کیا، اکیہ کہ یہ لوگ مسلمان نہیں ہوئے تھے، مسگر مسلمانوں سے مصالحت کر لی تھی، بنو مخزوم کے لوگوں نے کہا کہ اسلام میں داخل ہونے کے بعد ہم اپنی اسلامی کمائی کو سود کی ادائیگی میں خرچ نہ کریں گے۔

یہ جھگڑا مکہ مکرمہ میں پیش آیا، اس وقت مکہ فتح ہو چکا تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے مکہ کے امیر حضرت معاذؓ اور دوسری روایت میں عتاب بن اسیدؓ تھے، انھوں نے اس جھگڑے کا قضیہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بغرض دریافت حکم لکھ بھیجا،

اس پر مسترآن کی یہ آیت نازل ہوئی، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اسلام میں داخل ہونے کے بعد سود کے تمام سابقہ معاملات ختم کر دیئے جائیں، پچھلا سود بھی وصول نہ کیا جائے، صرف اس المال وصول کیا جائے۔

یہ اسلامی قانون رائج کیا گیا تو مسلمان تو اس کے پابند تھے ہی، جو غیر مسلم قبائل بطور صلح و معاہدہ اسلامی قانون کو قبول کر چکے تھے وہ بھی اس کے پابند ہو چکے تھے، لیکن اس کے باوجود جب حجۃ الوداع کے خطبہ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس قانون کا اعلان کیا تو اس کا اظہار فرمایا کہ یہ قانون کسی خاص شخص یا قوم یا مسلمانوں کے مالی مفاد کے پیش نظر نہیں، بلکہ پوری انسانیت کی تعمیر اور صلاح و فلاح کے لئے جاری کیا گیا ہے، اسی لئے ہم سب کے پہلے مسلمانوں کی بہت بڑی رقم سود جو غیر مسلموں کے ذمہ تھی اس کو چھوڑنے میں ثواب ان کو بھی اپنے بقایا سود کی رقم چھوڑنے میں کوئی عذر نہ ہونا چاہئے، چنانچہ اس خطبہ میں ارشاد فرمایا:

اَلَا اِنَّ كُلَّ رِبَاكَانٍ فِی الْجَاهِلِیَةِ مَوْضُوعٌ عَنْكُمْ کَلِمَةً لِّکُمْ فِیْ اَمْوَالِهِمْ
لَا تَظْلُمُوْنَ وَلَا تَظْلَمُوْنَ وَاَوَّلُ رِبَا مَوْضُوعٌ رِّبَا الْعِیَاسِ ابْنِ عَبَّاسٍ لِّمَطْلَبِ کَلِمَةٍ
رَّابِعٍ کَشِیْرٍ یَّحْوَالِہٖ ابْنُ ابِی حَاتِمٍ: "یعنی زائد جاہلیت میں جو سودی معاملات کئے گئے سب کا سود چھوڑ دیا گیا، اب ہر شخص کو اصل رستم ملے گی، سود کی زائد رقم نہ ملے گی، نہ تم زیادتی وصول کر کے کسی پر ظلم کر سکو گے اور نہ کوئی اصل راس المال میں کمی کر کے تم پر ظلم کرے گا، اور سب کے پہلے جو سود چھوڑا تھا وہ عباس بن عبدالمطلب کا سود ہے، جس کی بہت بھاری رقیب غیر مسلموں کے ذمہ بطور سود کے ماندہ ہوتی تھیں، قرآن مجید کی آیت متذکرہ میں اسی واقعہ کی طرف اشارہ اور بقایا سود چھوڑنے کا حکم مذکور ہے۔

اس آیت کو شروع اس طرح کیا گیا کہ مسلمانوں کو خطاب کر کے **اَوَّلُ اِتَّقُوا اللّٰهَ** کا حکم سنایا کہ اللہ تعالیٰ سے ڈرو، اس کے بعد اصل مسئلہ کا حکم بتلایا گیا، یہ مسترآن حکیم کا وہ خاص طرز ہے جس میں وہ دنیا بھر کے قانون کی کتابوں سے متاثر ہے، کہ جب کوئی ایسا قانون بنایا جاتا ہے جس پر عمل کرنے میں لوگوں کو کچھ دشواری معلوم ہو تو اس کے آگے پیچھے خدا تعالیٰ کے سامنے پیشی اعمال کے حساب اور آخرت کے عذاب و ثواب کا ذکر کر کے مسلمانوں کے دلوں اور ذہنوں کو اس پر عمل کرنے کے لئے تیار کیا جاتا ہے، اس کے بعد حکم سنایا جاتا ہے، یہاں بھی پچھلے ماندہ شدہ سود کی رقم کا چھوڑ دینا انسانی طبیعت پر بار ہو سکتا تھا، اس لئے پہلے **اِتَّقُوا اللّٰهَ** فرمایا، اس کے بعد حکم دیا **وَاَذْرُوا مَا بَقِيَ مِنَ الزَّيْطِ الَّذِیْ کُنتُمْ تَمُوتُونَ** یعنی چھوڑ دو بقایا سود کو، آیت کے آخر میں فرمایا **اِنَّ کُنتُمْ تَمُوتُونَ**، یعنی اگر تم ایمان دلے ہو، اس میں اشارہ کر دیا کہ ایمان کا تقاضا یہ ہے

کہ حکم خداوندی کی اطاعت کی جائے، اس کی خلاف ورزی ایمان کے منافی ہے، یہ حکم چونکہ طہارح پر مہاری تھا، اس لئے حکم سے پہلے **ادْعُوا إِلَىٰ دِينِكُمْ** اور حکم کے بعد **إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ** کے ارشاد ملا دیئے گئے۔

اس کے بعد پانچویں آیت میں اس حکم کی مخالفت کرنے والوں کو سخت وعید سنائی گئی جس کا مضمون یہ ہے کہ اگر تم نے سود کو نہ چھوڑا تو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی طرف سے اعلان جنگ میں لو، یہ وعید شدید ایسی ہے کہ کفر کے سوا اور کسی بڑے سے بڑے گناہ پر قرآن میں ایسی وعید نہیں آئی پھر اس آیت کے آخر میں ارشاد فرمایا ہے۔

وَلَا تَتَّبِعُوا مَن لَّا يَمْلِكُ شَيْئًا سِوَا اللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ یعنی اگر تم توبہ کرو اور آئندہ کے لئے سود کی بقایا رقم چھوڑنے کا عزم کر لو تو تمہیں تمہارے اصل راس المال مل جائیں گے، نہ تم اصل راس المال سے زائد حاصل کر کے کسی پر ظلم کرنے پاؤ گے اور نہ کوئی اصل راس مال میں کسی یا دیر کر کے تم پر ظلم کرنے پائے گا، اس میں اصل راس المال دینے کو اس شرط کے ساتھ مشروط کیا ہے کہ تم توبہ کر لو اور آئندہ کو سود چھوڑنے کا عزم کر لو، تب اصل راس المال ملے گا۔

اس سے بظاہر اس طرف اشارہ ہوتا ہے کہ اگر سود چھوڑنے کا عزم کر کے توبہ نہ کی تو اصل راس المال بھی نہ ملے گا، سوا اس کی تفصیل یہ ہے کہ اگر مسلمان ہو جانے کے باوجود سود کو حرام نہ سمجھے، اس لئے سود چھوڑنے کے لئے توبہ نہیں کرتا تب توبہ شخص اسلام سے خارج اور مرتد ہو گیا، جس کا حکم یہ ہے کہ مرتد کا مال اس کی ملک سے بھل جاتا ہے، پھر جو زمانہ اسلام کی کمائی ہے وہ اس کے مسلمان وارثوں کو مل جاتی ہے، اور جو کفر کے بعد کی کمائی ہے تو وہ بیت المال میں جمع کر دی جاتی ہے، اس لئے سود سے توبہ نہ کرنا اگر حلال سمجھنے کی بناء پر ہو تو اس کو اصل راس المال بھی نہ ملے گا، اور اگر حلال تو نہیں سمجھتا مگر عملاً باز نہیں آتا اور اس کے ساتھ جتھ بنا کر حکومت اسلامیہ کا مقابلہ کرتا ہے تو وہ باغی ہے، اس کا بھی سب مال ضبط کر کے بیت المال میں امانت رکھا جاتا ہے، کہ جب یہ توبہ کر لے تب اس کا مال اس کو واپس دیدیا جائے، شاید اس قسم کی جزئیات کی طرف اشارہ کرنے کے لئے بصورت شرط فرمایا گیا، **وَلَا تَتَّبِعُوا مَن لَّا يَمْلِكُ شَيْئًا سِوَا اللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ** یعنی اگر تم توبہ نہ کرو گے تو تمہارے راس المال بھی ضبط ہو جائیں گے۔

اس کے بعد چھٹی آیت میں سود خوری کی انسانیت سوز حرکت کے بالمقابل پاکیزہ اخلاق اور غریبوں اور ناداروں کے ساتھ مسابقت کے سلوک کی تعلیم دی جاتی ہے، ارشاد

۴۲

ہوتا ہے، **وَلَا تَكُن مِّنَ الَّذِينَ يَدْعُونَ إِلَىٰ بَغْيٍ** یعنی کہ اس کو فراخی تمہارا مدیون تنگ دست ہو، تمہارا تضرع ادا کرنے پر قادر نہ ہو تو حکم شرعی یہ ہے کہ اس کو فراخی اور آسودگی کے وقت تک ہمت دی جائے، اور اگر تم اس کو اپنا قرض معاف ہی کر دو تو یہ تمہارے لئے زیادہ بہتر ہے۔

سود خوروں کی عادت توبہ ہوتی ہے کہ اگر کوئی مدیون مفلس ہے اور میعاد مقررہ پر وہ قرض ادا نہیں کر سکتا تو سود کی رقم اصل میں جمع کر کے سود و سود کا سلسلہ چلاتے ہیں، اور سو کی مقدار بھی اور بڑھا دیتے ہیں۔

یہاں حکم الحاکمین نے یہ قانون بنادیا کہ اگر کوئی مدیون واقعی مفلس ہے، ادا سے قرض پر قادر نہیں تو اس کو تنگ کرنا جائز نہیں، بلکہ اس کو اس وقت تک ہمت دینی چاہئے جب تک کہ وہ ادا کرنے پر قادر نہ ہو جائے، ساتھ ہی اس کی ترغیب بھی دیدی کہ اس غریب کو اپنا قرض معاف کر دو تو یہ تمہارے لئے زیادہ بہتر ہے۔

یہاں معاف کرنے کو تشریح نے بلفظ صدقہ تعبیر فرمایا ہے، جس میں اشارہ ہو کہ یہ معافی تمہارے لئے بحکم صدقہ ہو کر موجب ثواب عظیم ہوگی، نیز یہ جو فرمایا کہ معاف کر دینا تمہارے لئے زیادہ بہتر ہے، حالانکہ بظاہر نزوان کے لئے نقصان کا سبب ہو کہ سود تو چھوڑا ہی تھا اصل راس المال بھی گیا، مگر تشریح نے اس کو بہتر فرمایا، اس کی دود وجہ ہیں، اول توبہ کہ یہ بہتری اس دنیا کی چند روزہ زندگی کے بعد مشاہدہ میں آجائے گی، جب کہ اس حقیر مال کے بدلہ میں جنت کی دائمی نعمتیں اس کو ملیں گی۔

دوسرے شاید اس میں اس طرف بھی اشارہ ہو کہ دنیا میں بھی تمہیں اس عمل کی بہتری کا مشاہدہ ہو جائے گا، کہ تمہارے مال میں برکت ہوگی، برکت کی حقیقت یہ ہے کہ تھوڑے مال میں کام بہت بھل جائیں، یہ ضروری نہیں کہ مال کی مفت دار یا تعداد بڑھ جائے، سو یہ مشاہدہ ہے کہ صدقہ خیرات کرنے والوں کے مال میں بے شمار برکت ہوتی ہے، ان کے تھوڑے مال سے اتنے کام نکل جاتے ہیں کہ حرام مال والوں کے بڑے بڑے اموال سے وہ کام نہیں نکلتے اور جس مال میں بے برکتی ہوتی ہے اس کا یہ حال ہوتا ہے کہ جس مقصد کے لئے خرچ کرتا ہے وہ مقصد حاصل نہیں ہوتا، یا غیر مقصود چیزوں میں مثلاً دوا، علاج اور ڈاکٹروں کی فیسوں میں ایسے مالداروں کی بڑی بڑی رقمیں خرچ ہو جاتی ہیں، جس کا غریبوں کو کبھی سا بقہ نہیں پڑتا، اول تو اللہ تعالیٰ ان کو تندرستی کی نعمت عطا فرماتے ہیں، کہ علاج میں کچھ خسار خرچ کرنے کی ضرورت ہی نہ رہے، اور اگر کبھی بیماری آتی بھی تو معمولی اخراجات سے تندرستی

حاصل ہو جاتی ہے، اس لحاظ سے مدیون مفلس کو مسترض معاف کر دینا جو بظاہر اس کے لئے نقصان نظر آتا تھا، اس شرعی تعلیم کے پیش نظر وہ ایک مفید و نافع کام بن گیا۔

مدیون مفلس کے ساتھ نرمی و مہلت کی تعلیم کے لئے احادیث صحیحہ میں جو ارشادات وارد ہوئے ہیں، ان کے چند جملے سنئے، طہرانی کی ایک حدیث میں ہے کہ جو شخص یہ چاہے کہ اس کے سر پر اس روز اللہ کی رحمت کا سایہ ہو جبکہ اس کے سوا کسی کو کوئی سایہ سر چھپانے کے لئے نہ ملے گا تو اس کو چاہئے کہ تنگ دست مقررہ ص کے ساتھ نرمی اور مہلت کا معاملہ کرے، یا اس کو معاف کر دے۔

اسی مضمون کی حدیث صحیح مسلم میں بھی ہے، اور سند احمد کی ایک حدیث میں ہے کہ جو شخص کسی مفلس مدیون کو مہلت دے گا تو اس کو ہر روز اتنی رستم کے صدقہ کا ثواب ملے گا، جتنی اس مدیون کے ذمہ واجب ہے، اور یہ حساب میعاد و قرض پورا ہونے سے پہلے مہلت دینے کا ہے، اور جب میعاد قرض پوری ہو جائے اور وہ شخص ادا کرنے پر قادر نہ ہو اس وقت اگر کوئی مہلت دے گا تو اس کو ہر روز اس کی دو گنی رقم صدقہ کرنے کا ثواب ملے گا۔

ایک حدیث میں ہے کہ جو شخص یہ چاہے کہ اس کی دعا قبول ہو یا اس کی مصیبت دور ہو تو اس کو چاہئے کہ تنگ دست مدیون کو مہلت دیدے۔

اس کے بعد آخری آیت میں پھر روز قیامت کا خوف اور محشر کے حساب کتاب اور ثواب و عذاب کے ذکر پر احکام سود کی آیات کو ختم کیا، ارشاد فرمایا:

وَاتَّقُوا يَوْمًا تُرْجَعُونَ فِيهِ إِلَى اللَّهِ ثُمَّ تُوَفَّى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ۚ (یعنی ڈرو اس روز سے جس میں تم سب اللہ تعالیٰ کے سامنے پیشی میں لائے جاؤ گے، پھر ہر شخص کو اپنے اپنے عمل کا پورا پورا بدلہ ملے گا)۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ یہ آیت نزول کے اعتبار سے سب سے آخری آیت ہے، اس کے بعد کوئی آیت نازل نہیں ہوئی، اس کے اکتیس روز بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہو گئی، اور بعض روایات میں صرف نو دن بعد وفات ہونا مذکور ہے۔

یہاں تک رہے احکام سے متعلقہ سورۃ بقرہ کی آیات کی تفسیر آئی ہے، رہا کی حرمت و مانعت پر قرآن کریم میں سورۃ بقرہ میں مذکورہ سات آیتیں اور سورۃ آل عمران میں ایک آیت، سورۃ نساء میں دو آیتیں آئی ہیں، اور ایک آیت سورۃ روم میں بھی ہے، جس کی تفسیر میں اختلاف ہے، بعض حضرات نے اس کو بھی سود بیاج کے مفہوم پر محمول کیا ہے، بعض نے دوسری تفسیر بیان کی ہے، اس طرح شرعی حکم کی دس آیتیں ہیں، جن میں سود و رہا کے

احکام مذکور ہیں۔

سود کی پوری حقیقت بتلانے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان باقی آیات کا ترجمہ اور تفسیر بھی اسی جگہ لکھ دی جائے جو سورۃ آل عمران اور سورۃ نساء اور سورۃ روم میں آتی ہیں، تاکہ تمام آیات یک جا ہو کر رہا کی حقیقت سمجھنے میں آسانی ہو۔

آل عمران کے تیرہویں رکوع کی ایک سو تیسویں آیت یہ ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا
الرِّبَا مَضَاعَفًا مُّضَاعَفَةً
دَرَجَاتٍ ۚ أَلَمْ تَكُنْ تُخْلَعُونَ
بِالرِّبَا إِذْ قُضِيَ بِكُمْ دِينُكُمْ يَوْمَ تَأْتِي
السَّاعَةُ وَتُنَادِي السَّاعَةُ الْوَسْطَىٰ
يَوْمَ تَكُونُ الْأَمْوَالُ الْأَنْجَسَىٰ
أَعْيُنًا ۚ وَمِثْقَلُ ذَرَّةٍ مِّنَ الْبِرِّ
يُضَاعَفُ خِزْيًا وَنُجَسًا ۚ أُولَٰئِكَ
سُيِّئُوا مَوَازِينَهُمْ ۚ (۲۲۷-۲۳۱)

”یہی اے ایمان والو! سود مت کھاؤ جسے
زائدہ اور اللہ تعالیٰ سے ڈرو، امید ہے
کہ تم کامیاب ہو“

اس آیت کے نزول کا ایک خاص واقعہ ہے کہ جاہلیت عرب میں سود خوردی کا عام طور پر یہ طریق تھا کہ ایک خاص میعاد معین کے لئے اوصار سود پر دیا جاتا تھا، اور جب وہ میعاد آگئی اور قرضدار اس کی ادائیگی پر قادر نہ ہوا تو اس کو مزید مہلت اس شرط پر دی جاتی تھی کہ سود کی مقدار بڑھادی جائے، اسی طرح دوسری میعاد پر بھی ادائیگی نہ ہوتی تو سود کی مقدار اور بڑھادی یہ واقعہ عام کتب تفسیر میں بالخصوص لباب النقول میں بردایت مجاہد مذکور ہے۔

جاہلیت عرب کی اس ملت کش رسم کو مٹانے کے لئے یہ آیت نازل ہوئی، اسی لئے اس آیت میں اضْعَافًا مُّضَاعَفَةً (یعنی کئی حصے زائد) فرما کر ان کے مرد و عورتوں کی مذمت اور ملت کشی و خود غرضی پر تنبیہ فرما کر اس کو حرام قرار دیا، اس کے معنی یہ نہیں کہ اعضا و اعضاء

نہ ہو تو حرام نہیں، کیونکہ سورۃ بقرہ اور نساء میں مطلقاً رہا کی حرمت صاف صاف مذکور ہے، اعضا و اعضاء مضاعف ہو یا نہ ہو، اس کی مثال ایسی ہے جیسے قرآن کریم میں جاہل فرمایا گیا کہ

لَا تَشْتَرُوا بِإِيمَانِكُمْ سِتْرًا مِّنْكُمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۚ قُلْ كُلٌّ مِّنْكُمْ عِندَ اللَّهِ بِثَمَنٍ كَثِيرٍ ۚ (یعنی میری ایمانوں کے بدلہ میں تھوڑی سی قیمت مت لو، اس میں تھوڑی سی قیمت اس لئے فرمایا کہ آیات الہیہ کے بدلہ میں اگر ہفت تعلیم کی سلطنت

بھی لے لے تو وہ تھوڑی ہی قیمت ہوگی، اس کے یہ معنی نہیں کہ قرآن کی آیات کے بدلے میں تھوڑی قیمت لینا تو حرام ہے اور زیادہ لینا جائز، اسی طرح اس آیت میں اضْعَافًا مُّضَاعَفَةً کا لفظ ان کے شرمناک طریقہ پر فکر کرنے کے لئے لایا گیا، حرمت کی شرط نہیں۔

اور اگر سود کے مرد و عورتوں پر غور کیا جائے تو یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ جب سود خوردی کی عادت پڑ جائے تو پھر وہ سود تنہا سود ہی نہیں رہتا، بلکہ لازماً اعضا و اعضاء مضاعف ہو جاتا ہے، کیونکہ جو رستم سود سے حاصل ہو کر سود خورد کے مال میں شامل ہوئی تو اب اس سود کی زائد رقم کو بھی سود پر چلائے گا تو سود مضاعف ہو جائے گا، اور یہی سلسلہ آگے چلا تو اضْعَافًا مُّضَاعَفَةً

ہو جائے گا، اس طرح ہر سود اضعاف مضاعف بن کر رہے گا۔

اور سورہ نسا میں دوا آئیں سود کے متعلق یہ ہیں:

يُظْلِمُونَ الَّذِينَ لَا يَرْبُوا وَأَخْرَمُوا
عَلَيْهِمْ طَبِيعَتَ أَجَلَتِ لَهُمْ
وَبَصِغَ هَمُ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ
كَثِيرًا وَأَخَذَهُمُ الزَّلْبُ
وَقَدْ نُفِرُوا عَنْهُ وَأَخْلَاهُمْ
أَمْوَالُ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَ
أَعْتَنَّا لِلْكَافِرِينَ مِنْهُمْ
عَنْ آيَاتِ مَا هُوَ (۱۶۱-۱۶۰)

یعنی یہودی کے اپنی بڑے بڑے جرائم کے
سبب ہم نے بہت سی پاکیزہ چیزیں جو ان کے
لئے حلال تھیں ان پر حرام کر دیں اور بسبب
اس کے کہ وہ بہت آدمیوں کو رشہ کی راہ سے
مانع بن جاتے تھے اور بسبب اس کے کہ وہ سود
لے کر تھے، حالانکہ ان کو ان کی ممانعت کی گئی
تھی اور بسبب اس کے کہ وہ لوگوں کا مال
ناحق طریقے سے کھا جاتے تھے اور ہم نے

ان لوگوں کیلئے جو ان میں کافر ہیں دردناک سزا کا سامان معسرہ کر رکھا ہے

ان دونوں آیتوں سے معلوم ہوا کہ شریعت موسویہ میں بھی سود حرام تھا، اور یہود
نے جب اس کی مخالفت کی تو دنیا میں بھی ان کو یہ مناسب سزا دی گئی کہ انھوں نے
حرام دنیا کی خاطر حرام کھانا شروع کر دیا، تو اللہ تعالیٰ نے ان پر بعض حلال چیزیں بھی
حرام فرما دیں۔

اور سورہ روم کے چوتھے رکوع کی آیت میں ہے:

وَمَا أَتَيْتُمُوهَا مِنْ زَبَائِرٍ يُرْوَا
فِي أَمْوَالِ النَّاسِ فَلَا يَزِيدُهَا
عِنْدَ اللَّهِ وَمَا أَتَيْتُمُوهَا
مِنْ كُفْرٍ يُرِيدُونَ وَجْهَ اللَّهِ
فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُضِلُّونَ (۳۹-۳۸)

یعنی جو چیز ہم اس لئے دو گئے کہ وہ لوگوں
کے مال میں پہنچ کر زیادہ ہو جائے تو یہ اللہ
کے نزدیک نہیں بڑھتا، اور جو زکوٰۃ دو گئے
جس سے اللہ کی رضا مطلوب ہو تو ایسے لوگ
خدا کے پاس بڑھاتے رہیں گے

بعض حضرات مفسرین نے لفظ زبا اور زیادتی پر نظر کر کے اس آیت کو بھی سود بیاچ
پر محمول فرمایا ہے، اور یہ تفسیر سرائی ہے کہ سود بیاچ کے لینے میں اگرچہ بظاہر مال کی
زیادتی نظر آتی ہے، مگر درحقیقت وہ زیادتی نہیں، جیسے کسی شخص کے بدن پر وہم ہو جائے
تو بظاہر وہ اس کے جسم میں زیادتی ہے، لیکن کوئی عقلمند اس کو زیادتی سمجھ کر خوش
نہیں ہوتا، بلکہ اس کو ہلاکت کا مقدمہ سمجھتا ہے، اس کے بالمقابل زکوٰۃ و صدقات دینے
میں اگرچہ بظاہر مال میں کمی آتی ہے، مگر درحقیقت وہ کمی نہیں بلکہ ہزاروں زیادتیوں کا موجب ہے

جیسے کوئی شخص ماوۃ ناسہ کے اخراج کے لئے مہل سہتا ہے، یا نقد کھلو اگر خون بکھولا ہے، تو
بظاہر ہسردہ کرد نظر آتا ہے اور اس کے بدن میں کمی محسوس ہوتی ہے، مگر جاننے والوں کی نظر میں
یہ کمی اس کی زیادتی اور قوت کا پیش خیمہ ہے۔

اور بعض علماء تفسیر نے اس آیت کو سود بیاچ کی مانعت پر محمول ہی نہیں فرمایا بلکہ اس کا
یہ مطلب قرار دیا ہے کہ جو شخص کسی کو اپنا مال احتلاص و نیک بنتی سے نہیں، بلکہ اس نیت سے
دے کہ میں اس کو یہ چیز دوں گا تو وہ مجھے اس کے بدلہ میں اس سے زیادہ دے گا، جیسے بہت سی
برادریوں میں نوتا کی رسم ہے کہ وہ ہدیہ کے طور پر نہیں بلکہ بدلہ لینے کی غرض سے دی جاتی ہے، یہ
دینا چونکہ اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کے لئے نہیں بلکہ اپنی غرض کے لئے ہے اس لئے آیت میں
فرمایا کہ اس طرح اگرچہ ظاہر میں مال بڑھ جائے مگر وہ اللہ کے نزدیک نہیں بڑھتا، ہاں جو زکوٰۃ
صدقات اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کے لئے دیتے جائیں ان میں اگرچہ بظاہر مال گھٹتا ہے، مگر
اللہ کے نزدیک وہ دو گنا اور چو گنا ہوتا جاتا ہے۔

اس تفسیر پر آیت مذکورہ کا وہ مضمون ہو جائے گا جو دوسری ایک آیت میں رسول کریم
صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے ارشاد فرمایا ہے، وَلَا تَقْنَطُوا مِنْهُ خَشِيَ ظَنُّهُ، یعنی آپ کسی پراچن
اس نیت سے نہ کریں کہ اس کے بدلہ میں کچھ مال کی زیادتی آپ کو حاصل ہو جائے گی۔

اور سورہ روم کی اس آیت میں بظاہر یہ دوسری تفسیر ہی رائج معلوم ہوتی ہے، اقول تو
اس لئے کہ سورہ روم بھی ہے، جس کے لئے اگرچہ ضروری نہیں کہ اس کی ہر آیت کی ہر مگر
غالب گمان بھی ہونے کا ضرور ہے، جب تک اس کے خلاف کوئی ثبوت نہ ملے، اور آیت
کے مکی ہونے کی صورت میں اس کو حرمیت سود کے مفہوم پر اس لئے محمول نہیں کیا جاسکتا کہ حرمیت
سود مدینہ میں نازل ہوئی ہے، اس کے علاوہ اس آیت سے پہلے جو مضمون آیا ہے اس سے بھی
دوسری تفسیر ہی کار حمان معلوم ہوتا ہے، کیونکہ اس سے پہلے ارشاد ہے:

فَاتَّبِعْ مَا الْقُرْآنُ يُخْطِئُ وَالْيُسْكِينُ وَابْتِنِ السَّبِيلَ ذَلِكُمْ خَيْرٌ لِّمَنْ يَّرِيدُ ذُنُ
وَجْهَ اللَّهِ (۲۸-۲۷) قرابت دار کو اس کا حق دیا کر اور مسکین اور مسافر کو بھی یہ ان لوگوں کے لئے
بہتر ہے جو اللہ کی رضا کے طالب ہیں

اس آیت میں رشتہ داروں اور مساکین اور مسافروں پر خرچ کرنے کے ثواب ہونے
کے لئے یہ شرط لگائی گئی ہے کہ اس میں نیت اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کی ہو، تو اس کے بعد
والی آیت مذکورہ میں اس کی توضیح اس طرح کی گئی کہ اگر مال کسی کو اس غرض سے
دیا جائے کہ اس کا بدلہ اس کی طرف سے زیادہ ملے گا تو یہ رضا جوئی حق تعالیٰ کے لئے خرچ نہ ہوا

اس لئے اس کا ثواب نہ ملے گا۔

بہر حال ممانعتِ سود کے مسئلہ میں اس آیت کو چھوڑ کر بھی مذکورۃ الصدقہ کی آیتیں آئی ہیں جن میں سے سورۃ آل عمران کی ایک آیت میں اضاعت مضاعت سود کی حرمت بیان کی گئی ہے، اور باقی سب آیتوں میں مطلق سود کی حرمت کا بیان ہے، اس تفصیل سے یہ تو واضح ہو گیا کہ سود خواہ اضاعت مضاعت اور سود در سود ہو یا اکہر اسود، بہر حال حرام ہے، اور حرام بھی ایسا شدید کہ اس کی مخالفت کرنے پر اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے اعلانِ جنگ سنا یا گیا ہے۔

مسئلہ سود و ربا

کی کچھ مزید

تشریح و تفصیل

آج کل ربا چونکہ عام نظامِ تجارت کا رکنِ اعظم اور غائب نہیں رہا ہے، اس لئے جب کتاب و سنت کی آیات و روایات میں اس کی حرمت و ممانعت ملنے آتی ہے تو عام طبائع اس کی حقیقت کو سمجھنے سمجھنے کے وقت اس کی حرمت سے چمکپاتی ہیں، اور حیلہ جوئی کی طرف مائل ہوتی ہیں، مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ بحث کا مخزن یہ کر کے اس کے ہر پہلو پر علیحدہ علیحدہ غور و فکر کرنا چاہئے، غلط ملط کرنے کا نتیجہ بحث کے اُبھرنے کے سوا کچھ نہیں ہوتا، یہاں بحث کے تین حصے ہیں:

اول یہ کہ قرآن و سنت میں ربا کی کیا حقیقت ہے اور وہ کن کن صورتوں پر حاوی ہے؟
دوسرے یہ کہ اس ربا کی حرمت و ممانعت کس حکمت و مصلحت پر مبنی ہے؟
تیسرے یہ کہ سود و ربا کتنا ہی بُرا ہی، لیکن آج کل کی دنیا میں وہ نظامِ معاشیات و تجارت کا رکنِ اعظم بن چکا ہے، اگر نستر آئی احکام کے ماتحت اس کو چھوڑ دیا جائے تو نظامِ بنکے تجارت کیسے چلے گا؟

اصل ربا کی تعریف میں کبھی کوئی اہم نہیں رہا | اب سنئے کہ لفظ ربوا عربی زبان کا معروف لفظ ہے، رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک مخالطہ کا جواب

بعثت اور نزولِ قرآن سے قبل جاہلیتِ عرب میں بھی یہ لفظ متعارف تھا، اور نہ صرف متعارف بلکہ ربا کا لائن دین عام طور پر جاری تھا، بلکہ سورۃ نسا کی آیات سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ربا کا لفظ اور اس کے معاملات زمانہِ قورات میں بھی معروف تھے اور قورات میں بھی اس کو حرام

نستر دیا گیا تھا۔

ظاہر ہے کہ ایسا لفظ جو زمانہِ قدیم سے عرب اور اس کے قرب و جوار میں معروف تھا آتا ہو اور اس پر لائن دین کا رواج چل رہا ہے، اور نستر آں اس کی حرمت و ممانعت بیان کرنے کے ساتھ یہ بھی خبر دیتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کی امت پر بھی سود ربا حرام کیا گیا تھا، اس لفظ کی حقیقت کوئی ایسی مبہم چیز نہیں ہو سکتی جس کے سمجھنے سمجھانے میں دشواریاں پیش آئیں۔ یہی وجہ ہو کہ جب شہہ ہجری میں سورۃ بقرہ کی آیات ربا کی حرمت کے متعلق نازل ہوئیں تو صحابہ کرامؓ سے کہیں منقول نہیں کہ ان کو لفظ ربا کی حقیقت سمجھنے میں کوئی اشتباہ پیش آیا ہو، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلمؐ کے دستِ معاملات کی طرح اس کی تحقیق کی نوبت آئی ہو بلکہ جس طرح شراب کی حرمت نازل ہوتے ہی صحابہ کرامؓ نے اس پر عمل کیا، اسی طرح ربا کی حرمت نازل ہوتے ہی ربا کے سب معاملات ترک کر دیئے، پچھلے زمانہ کے معاملہ میں مسلمانوں کا جو ربا غیر مسلموں کے ذمہ واجب الاداء تھا وہ بھی مسلمانوں نے چھوڑ دیا اور جو غیر مسلموں کا مسلمانوں کے ذمہ واجب الاداء تھا، اور مسلمان نزولِ ممانعت کے بعد اس کو دنیا نہیں چاہتے تھے اس کا جھگڑا امیرِ مکہ کی عدالت میں پیش ہوا، انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلمؐ سے دریافت کیا، تو اس کا فیصلہ سورۃ بقرہ کی آیات میں آسان سے نازل ہوا کہ پچھلے زمانہ کے بقایا ربا کا لائن دین بھی اب جائز نہیں۔

اور اس میں چونکہ غیر مسلموں کو یہ شکایت کا موقع مل سکتا تھا کہ ایک سلامی حاکم شرعی کی وجہ سے ہمارا دوپہ کیوں مارا جائے تو اس کے ازالہ کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلمؐ نے حجۃ الوداع کے خطبہ میں یہ واضح کر دیا کہ اس حکم شرعی کا اثر صرف غیر مسلموں پر نہیں، بلکہ مسلمانوں پر بھی یکساں ہے، اور سب سے پہلے جو سود کی رقم چھوڑی گئی وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلمؐ کے حکم محترم حضرت عباسؓ کی کثیر التعداد رقم تھی۔

الغرض ربا کی ممانعت ہونے کے وقت ربا کا مفہوم کچھ مخفی نہ تھا، عام طور پر معروف تھا ہی ربا جس کو عرب ربا کہتے تھے، اور اس کا لائن دین کرتے تھے، قرآن نے حرام کیا، اور رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلمؐ نے اس کو صرف اخلاقی انداز میں نہیں، بلکہ قانونِ مملکت کی حیثیت سے نافذ فرمایا، البتہ بعض ایسی صورتوں کو بھی آپؐ نے ربا میں شامل قرار دیا جس کو عام طور پر ربا نہیں سمجھا جاتا تھا، انھیں صورتوں کی تعیین میں حضرت فاروقِ اعظمؓ کو اشکال پیش آیا، اور انہی میں ائمہ مجتہدین کے نظریات میں اختلاف ہوا، ورنہ اصل ربا جس کو عرب ربا کہتے تھے نہ اس میں کسی کو شک یا شبہ کا موقع تھا، نہ اس میں کسی اختلاف ہوا۔

اب سنے عرب کا مروجہ رہا کیا تھا؟ امام تفسیر ابن جریر نے حضرت مجاہد سے نقل کیا ہے کہ جو رہا جاہلیت میں جاری تھا اور شرانے اسے منع کیا وہ یہ تھا کہ کسی کو ایک میعاد معین کے لئے قرض لے کر اس پر اصل راس المال سے زائد معسرہ زیادتی لینے تھے، اور اگر میعاد معسرہ پر وہ قرض ادا نہ کر سکا تو مزید میعاد اس شرط پر بڑھا دیتے تھے کہ سود میں اضافہ کیا جائے، یہی مضمون حضرت قتادہ اور دوسرے حضرات ائمہ تفسیر سے نقل کیا ہے و تفسیر ابن جریر ص ۲۶۲ ج ۳ اندلس کے مشہور امام تفسیر ابو حیان عسکری کی تفسیر بحر تحیط میں بھی جاہلیت کے رہا کی یہی صورت لکھی ہے کہ ادھار دے کر اس پر نفع لینے اور جتنی مدت ادھار کی بڑھ جائے اتنا ہی سود اس پر بڑھا دینے کا نام رہا تھا، اسی جاہلیت عرب کے لوگ یہ کہتے تھے کہ جیسے بیچ و شرار میں نفع لینا جائز ہے اسی طرح اپنا روپیہ ادھا رکھنے کو نفع لینا بھی حبابز ہونا چاہئے، شران کریم نے اس کو حرام قرار دیا، اور بیچ و رہا کے احکام کا مختلف ہونا واضح فرمایا۔

یہی مضمون تمام مستند کتب تفسیر ابن کثیر، تفسیر کبیر اور روح المعانی وغیرہ میں معتبر روایات کے ساتھ منقول ہے۔

ابن عسکری نے احکام القرآن میں فرمایا: اَلَّذِي يُؤْتِي الْفَقِيرَ الْقَرْضَ وَالْمُزَادَ فِيهِ الْاَدْبُ كُلُّ ذِي قَرْبَةٍ لَا يَكْفِيهَا عَدْوٌ (ص ۲۶۱-۲۶۰) یعنی رہا کے معنی اصل لغت میں زیادتی کے ہیں، اور آیت میں اس سے مراد وہ زیادتی ہے جس کے مقابلہ میں کوئی مال نہ ہو، بلکہ محض ادھار اور اس کی میعاد ہو، امام رازی نے اپنی تفسیر میں سنرا یا کہ رہا کی رد قیس ہیں، ایکٹ معاملات بیچ و شرار کے اندر رہا، دو شرے ادھار کا رہا، اور جاہلیت عرب میں دوسری قسم ہی رائج اور معروف تھی کہ وہ اپنا مال کسی کو معتین میعاد کے لئے دیتے تھے، اور ہر مہینہ اس کا نفع لیتے تھے، اور اگر میعاد معتین پر ادائیگی نہ کر سکا، تو میعاد اور بڑھا دی جاتی تھی، بشرطیکہ وہ سود کی رقم اور بڑھا دیتے، یہی جاہلیت کا رہا تھا، جس کو شران نے حرام کیا۔

امام جصاص نے احکام القرآن میں رہا کے معنی یہ بیان فرمائے ہیں:

هَرَا الْقَرْضُ مِنَ الْمَقْرُوفِ فِيهِ
الْاَجَلُ وَزِيَادَةُ مَالٍ عَلَيْهِ
الْمُسْتَقْبَلُ فِيهِ

حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے رہا کی تعریف یہ فرمائی ہے:

مَنْ قَرْضَ جَرِ نَفْعًا فَهُوَ
رِهًا

دہرا ہے

یہ حدیث جامع صغیر میں ہو اور عزیزی نے اس کو حسن کہا ہے۔

تخللا صما یہ ہے کہ ادھار دے کر اس پر نفع لینے کا نام رہا ہے جو جاہلیت عرب کے زمانہ میں رائج اور معروف تھا، جس کو شران کریم کی آیت مذکورہ نے صراحہ حرام قرار دیا، اور ان آیات کے نازل ہوتے ہی صحابہ کرام نے اس کو چھوڑ دیا، اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قانونی خصوصیات میں اس کو زنا ز فرمایا، اس میں نہ کوئی ابہام تھا نہ اجمال نہ اس میں کسی کو کوئی ہشتباہ و اشکال پیش آیا۔

البتہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے رہا کے مفہوم میں بیچ و شرار کی چند صورتوں کو بھی داخل سنرا یا جن کو عرب رہا نہ سمجھتے تھے، مثلاً چھ چیزوں کی بیچ و شرار میں یہ حکم دیا کہ اگر ان کا تبادلہ کیا جائے تو برابر برابر ہونا چاہئے، اور نقد دست بدست ہونا چاہئے، اس میں کمی بیشی کی گئی یا ادھار کیا گیا تو وہ بھی رہا ہے، یہ چھ چیزیں سونا، چاندی، گہوڑے، بچہ، بکھرا درانگور ہیں۔

اسی اصول کے ماتحت عرب میں معاملات کی جو چند صورتیں مزاحمت اور محالہ کے نام سے رائج تھیں آیات رہا نازل ہونے کے بعد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو رہا میں شامل شرار دے کر منع فرمایا (ابن کثیر بحوالہ مستدرک حاکم، ص ۳۲۴ ج ۱)

اس میں یہ بات قابل غور تھی کہ ان چھ چیزوں کی خصوصیت ہے، یا ان کے علاوہ اور بھی کچھ چیزیں ان کے حکم میں ہیں، اور اگر ہیں تو ان کا ضابطہ کیا ہے، کہیں کس صورت کو داخل رہا سمجھا جائے، یہی اشکال حضرت فاروق اعظمؓ کو پیش آیا، جس کی بنا پر فرمایا:

اِنَّ اَيَّةَ الْمَرْبِ اَمِنْ الْاَخِرِ مَا نَزَلَ مِنْ
الْعَنْ اَنْ وَاَنْ الْمَنْبِ صِلَى اللّٰهِ عَلَيْهِ
قَبْضُ قَبْلِ اَنْ يَبْدُوَ لَنَا ذُو عَوَالٍ لَوْ بُوَا
وَالْمَرْبِ

احکام القرآن، جصاص، ص ۵۵۱

و تفسیر ابن کثیر بحوالہ ابن قدام، ص ۲۸ ج ۱

یعنی آیت رہا قرآن کی آخری آیتوں میں ہے
اس کی پوری تفصیلات بیان فرمانے سے
پہلے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات
ہو گئی، اس لئے اب احتیاط لازم ہے رہا کو
تھوڑا ہی ہے جس صورت میں رہا کا مشابہ
ہی ہو اس کو بھی چھوڑ دینا چاہئے

مذہب مزاحمت پر کہ درخت پر لگے ہوئے پھل کو ٹوٹے ہوئے پھلوں کے بدلے میں اندازہ سے فروخت کیا جائے، اور محالہ یہ کہ کھڑے کھیت کے غلہ گندم چنا وغیرہ کو خشک صاف کئے ہوئے غلہ گندم یا چنے سے اندازہ لگا کر فروخت کیا جائے، اندازہ میں چھوٹے کمی بیشی کا امکان رہتا ہے، اس لئے اس کو منع کیا گیا ۱۲ من

فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی مراد معاملات بیع و شراہ کی وہ صورتیں اور ان کی تفصیلات ہیں جو جاہلیت عرب میں رباہ نہیں سمجھی جاتی تھیں، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو رباہ میں داخل و شراہ دے کر حرام فرمایا، باقی اصل رباہ جو تمام عرب میں معروف و مشہور تھا اور صحابہ کرام نے اس کو چھوڑا، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا قانون نافذ فرمایا، اور حجۃ الوداع کے خطبہ میں اس کا اعلان کیا، اس میں فاروق اعظم کو کوئی اشکال یا اشتباہ ہونے کا کوئی امکان نہیں، پھر جب فاروق اعظم کو رباہ کی جن خاص صورتوں میں ہشتباہ پیش آیا تو اس کا حل یہ تجویز فرمایا کہ جن صورتوں میں رباہ کا شبہ بھی ہو ان کو بھی چھوڑ دیا جائے مگر حیرت ہے کہ آج بعض وہ لوگ جو یورپ کی ظاہری ٹیپٹاپ اور دولت مندی اور موجودہ نظام تجارت وغیرہ میں سود کے رکن بن جانے سے مرعوب ہیں، انہوں نے فاروق اعظم کے اس ارشاد کا یہ نتیجہ نکالا کہ رباہ کا مفہوم ہی مجمل رہ گیا تھا، اس لئے اس میں ماتے کی گنجائش ہے، جس کے غلط ہونے کا کافی مواد سامنے آچکا ہے، احکام القرآن میں ابن عربی نے ان لوگوں پر سخت انکار کیا ہے جنہوں نے اس فاروقی ارشاد کی بناء پر آیات رباہ کو مجمل کہا تھا۔

ابن عربی نے احکام القرآن میں فرمایا:

إِنَّ مَنْ زَعَمَ أَنَّ هَذِهِ الْآيَةُ مُجْمَلَةٌ فَلَمْ يَفْهَمْ مَعَاطِفَ النَّبِيِّ يَقُولُ إِنَّ اللَّهَ تَعَالَى أَرْسَلَ رَسُولَهُ إِلَى قَوْمٍ هُوَ مِنْهُمْ يُلْقِيهِمْ وَآتَاكَ عَلَيْهِمْ كِتَابَهُ نَبِيًّا رَأَيْنَاهُ يَلْسَانِيهِ وَ لَيْسَانِيهِمْ وَ الزَّيْبَانِي اللَّعَنُوهُ الزَّيْبَانِيَّةُ وَالْمُرَادِيَّةُ فِي الْآيَةِ كُلِّ زِيَادَةٍ لَا يَقَابِلُهَا عَوَضٌ

یعنی میں نے یہ کہا کہ یہ آیت مجمل ہے، اسے شریعت کی تصریحات کو نہیں سمجھا، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو ایسی قوم کی طرف بھیجا کہ وہ خود اسی قوم میں سے تھے انہی کی زبان میں سمجھا، ان پر اپنی کتاب آسانی کے لئے انہی کی زبان میں نازل فرمائی اور لفظ رباہ کے معنی ان کی زبان میں زیادتی کے ہیں اور مراد آیت میں وہ زیادتی ہے جس کے مقابلہ میں مال نہیں بلکہ عیباد ہے۔

اور امام رازئی نے تفسیر تیسیر میں فرمایا کہ رباہ کی دو قسمیں ہیں، ایک ادھار کا رباہ دوسرے نقد بیع میں زیادہ لینے کا رباہ، پہلی قسم وہ ہے جو زمانہ جاہلیت میں مشہور و معروف تھی، اور اہل جاہلیت اس کا لین دین کرتے تھے، اور دوسری قسم وہ ہے جو حدیث نے بیان کی، کہ فلاں فلاں چیزوں کی بیع و شراہ میں کمی زیادتی رباہ میں داخل ہے۔ اور احکام القرآن جصاص میں ہے کہ رباہ کی دو قسمیں ہیں، ایک بیع و شراہ کے اندر

دوسری بغیر بیع و شراہ کے اور زمانہ جاہلیت کا رباہ ہے دوسری قسم کا تھا، اور اس کی تعریف یہ ہو کہ وہ شراہ جس میں بحساب میعاد کوئی نفع لیا جائے، اور یہی مضمون ابن رشد نے بدایۃ المجتہد میں لکھا ہے، اور شراہ میں ادھار پر نفع لینے کے رباہ کا حرام ہونا مسترآن، سنت اور اجماع امت سے ثابت کیا ہے۔

امام طحاوی نے شرح معانی الآثار میں اس موضوع پر بڑی تفصیل سے کلام کرتے ہوئے یہ بتلایا ہے کہ شراہ میں جو رباہ مذکور ہے اس سے حلی اور واضح طور پر وہ رباہ مراد ہے جو شراہ میں ادھار پر لیا دیا جاتا تھا، اور اس کو زمانہ جاہلیت میں رباہ کہا جاتا تھا، اس کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان اور آپ کی سنت سے دوسری قسم کے رباہ کا علم ہوا، جو خاص خاص اقسام بیع و شراہ میں کمی زیادتی یا ادھار کرنے کا نام ہے، اور اس رباہ کے حرام ہونے پر بھی اعداد بیش رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم متواتر آتی ہیں، مگر اس قسم کے رباہ کی تفصیلات پوری واضح نہ ہونے کے سبب اس میں بعض صحابہ کرام کو اشکال پیش آیا، اور فقہاء کے اختلافات ہوئے (معانی الآثار ص ۲۳۲ ج ۲)۔

اور حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ نے تجلۃ اللہ الباقیہ میں منسرایا ہے کہ رباہ حقیقی ہے اور ایک وہ جو بحکم رباہ ہے، حقیقی رباہ شراہ میں ادھار پر زیادتی لینے کا نام ہے، اور بحکم رباہ وہ ہے جس کا بیان حدیث میں آیا کہ بعض خاص چیزوں کی بیع میں زیادتی لینے کو رباہ کہا گیا ہے، اور ایک حدیث میں جو آیا ہے (لا با الا فی النسیئۃ دروالبخاری) یعنی رباہ صرف ادھار میں ہے، اس کا یہی مطلب ہے کہ حقیقی اور اصلی رباہ جس کو عام طور پر رباہ سمجھا اور کہا جاتا ہے وہ ادھار پر نفع لینے کا نام ہے اس کے سوا حقیقی اقسام اس کے ساتھ ملحق کی گئی ہیں وہ سب کلمہ رباہ میں داخل ہیں۔

اس تفصیل سے چند چیزیں واضح ہو گئیں

اول یہ کہ نزول شراہ سے پہلے رباہ ایک متعارف چیز تھی، فرض ادھار پر بحساب میعاد زیادتی لینے کو رباہ کہا جاتا تھا۔

دوسرے یہ کہ شراہ میں حرمت رباہ نازل ہوتے ہی سب صحابہ کرام نے اس رباہ کو ترک کر دیا، اس کے معنی سمجھنے سمجھانے میں کسی کو نہ اشکال پیش آیا نہ ہشتباہ۔

تیسرے یہ کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ چیزوں کے بارہ میں یہ ارشاد فرمایا کہ ان کی باہمی بیع و شراہ میں براہری شرط ہے، کمی بیشی رباہ میں داخل ہے، اور ان میں ادھار

کرنا بھی رہا میں داخل ہے، یہ چھ چیزیں سونا، چاندی، گہیوں، جو، گجور، انگور ہیں، اور اسی قانون کے تحت عرب میں مروجہ اقسام بیع مزابنہ، نیا قلد وغیرہ کو حرام قرار دیا گیا، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد میں چھ چیزوں کی بیع و شراء میں کمی بیشی اور ادھار کو تو حرام رہا میں داخل کر کے حرام قرار دیدیا تھا، لیکن اس میں یہ بات محل تفقہ و اجتہاد تھی کہ یہ حکم ان چھ چیزوں کے ساتھ مخصوص ہے یا دوسری اشیاء میں بھی ہے، اور اس کا ضابطہ کیا ہوا؟ اس ضابطہ میں فقہاء نے اپنے اپنے غور و فکر اور اجتہاد سے مختلف صورتیں تجویز کیں، اور چونکہ یہ ضابطہ خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان نہ فرمایا تھا اس میں ہشتمیہ رہنے کے سبب حضرت فاروق اعظمؓ نے اس پر اظہارِ انفس کیا کہ کاش رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود ہی اس کا کوئی ضابطہ بیان فرمادیتے تو مشتبہ حالات میں اطمینان پیدا ہو جاتا، اور پھر یہ ارشاد منسرا یا کہ جہاں رہا کا شبہ بھی ہو اس سے بچنا چاہئے۔

پچھلے یہ معلوم ہوا کہ اصلی اور حقیقی رہا جس کو فقہاء نے ربوا القرآن یا ربوا القرض کے نام سے موسوم کیا ہے وہی ہے جو عرب میں مشابہت تھا یعنی قرض ادھار پر بھابہ میعاد نفع لینا، دوسری قسم کے رہا جو حدیث میں بتلائے گئے وہ سب اسی رہا کے ساتھ ملحق اور اسی کے حکم میں ہیں، اور جو کچھ خلاف و اختلاف امت میں ہوا وہ سب اسی دوسری قسم کے معاملات رہا میں ہوا، پہلی قسم کار با جو رہا القرآن کہلاتا ہے اس کے حرام ہونے میں پوری امت متحدہ میں کسی کوئی اختلاف نہیں ہوا۔

اور آجکل جو رہا انسانی معاشیات کا مدار سمجھا جاتا ہے، اور مسئلہ سود میں جو زیر بحث ہے وہ یہی رہا ہے جس کی حرمت قرآن کی سات آیات اور چالیس سے زیادہ احادیث اور اجماع امت سے ثابت ہے۔

رہا کی دوسری قسم جو بیع و شراء کے ضمن میں ہوتی ہے نہ اس کا رد اجماع ہے نہ اس میں کوئی بحث کرنے کی ضرورت ہے۔

یہاں تک یہ بات واضح ہو گئی کہ مسترآن و سنت میں رہا کی حقیقت کیا ہے جو مسئلہ سود کی پہلی بات ہے۔

حرمت سود کی بحث مصلحت اس کے بعد دوسری بحث اسکی پر کہ رہا کی حرمت و ممانعت کس بحث و مصلحت پر مبنی ہے، اور اس میں وہ کونسی روحانی یا معاشی مضرتیں ہیں، جن کی وجہ سے اسلام نے اس کو اتنا بڑا گناہ قرار دیا ہے۔

اس جگہ پہلے یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ دنیا کی ساری مخادقات اور ان کے معاملات

میں ایسی کوئی چیز نہیں جس میں کوئی بھلائی یا فائدہ نہ ہو، سانپ، بھتو، بھیڑیا، شیر اور سنسکرمیا جیسے ذہر قاتل میں بھی انسان کے لئے ہزاروں فوائد ہیں۔

کوئی برا نہیں قدرت کے کارخانے میں

چوری، ڈاکہ، بدکاری، رشوت، ان میں کوئی ایسی چیز نہیں جس میں کچھ نہ کچھ فائدہ نہ ہو، مگر ہر مذہب و ملت اور ہر مکتب فکر میں یہ دیکھا جاتا ہے کہ جس چیز کے منافع زیادہ اور مضرتیں کم ہیں ان کو نافع و مفید کہا جاتا ہے، اور جن کے مفاسد و مضرت زیادہ اور منافع کم ہیں ان کو مضر اور بیکار سمجھا جاتا ہے، قرآن کریم نے بھی شراب اور قمار کو حرام قرار دیتے ہوئے اس کا اعلان فرمایا کہ ان میں بڑے گناہ بھی ہیں، اور لوگوں کے کچھ منافع بھی، مگر ان کے گناہ کا وبال منافع کے مقابلہ میں بہت زیادہ ہے، اس لئے ان چیزوں کو اچھا یا مفید نہیں کہا جاتا بلکہ ان کو نہایت مضر اور تباہ کن سمجھ کر ان سے جہتناب لازم ہے۔

رہا، یعنی سود کا بھی یہی حال ہے، اس میں سود خور کے لئے کچھ وقتی نفع ضرور نظر آتا ہے، لیکن اس کا دنیوی اور اخروی وبال اس نفع کے مقابلہ میں نہایت شدید ہے۔

ہر چیز کے نفع و نقصان یا مفاسد و مصالح کا موازنہ کرنے میں یہ بات بھی ہر عقل مند کے نزدیک قابل نظر ہوتی ہے کہ اگر کسی چیز میں نفع محض وقتی اور ہنگامی ہو اور نقصان اس کا دیر پا یا دائمی تو اس کو کوئی عقل مند مفید اشیاء کی فہرست میں شمار نہیں کر سکتا، اسی طرح اگر کسی چیز کا نفع شخصی اور انفرادی ہو اور اس کا نقصان پوری ملت اور جماعت کو پہنچتا ہو تو اس کو بھی کوئی ہوشمند انسان مفید نہیں کہہ سکتا، چوری اور ڈاکہ میں چور ڈاکو کا تو نفع کھلا ہوا ہے، مگر وہ پوری ملت کے لئے مضر اور ان کے امن و سکون کو برباد کرنے والا ہے، اسی لئے کوئی انسان چوری اور ڈاکہ کو اچھا نہیں کہتا۔

اس تمہید کے بعد مسئلہ سود پر نظر ڈالتے تو اس میں ذرا سا غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ اس میں سود خور کے وقتی اور ہنگامی نفع کے مقابلہ میں اس کا روحانی اور اخلاقی نقصان اتنا شدید ہے کہ وہ اس کو انسانیت سے نکال دیتا ہے، اور یہ کہ اس کا جو وقتی نفع ہے وہ بھی صرف اس کی ذات کا نفع ہے، اس کے مقابلہ میں پوری ملت کو نقصان عظیم اور معاشی بحران کا شکار ہونا پڑتا ہے، لیکن دنیا کا حال یہ ہے کہ جب اس میں کوئی چیز و راجح یا جاتی ہو تو اس کی خرابیاں نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہیں، اور صرف اس کے فوائد سامنے رہ جاتے ہیں، اگرچہ وہ فوائد کتنے ہی حقیر و ذلیل اور ہنگامی ہوں اس کے نقصانات کی طرف دھیان نہیں جاتا اگرچہ وہ کتنے ہی شدید اور عام ہوں۔

رسم درواج طبائع انسانی کے لئے ایک کلور فارم ہے جو اس کو بے حس بنا دیتا ہے، بہت کم افراد ہوتے ہیں جو چلے ہوئے رسم درواج پر تحقیقی نظر ڈال کر یہ سمجھنے کی کوشش کریں کہ اس میں فائدے کتنے ہیں اور نقصان کتنا، بلکہ اگر کسی کے متنبہ کرنے سے اس کے نقصانات سامنے بھی آجائیں، تو پابندی رسم درواج اس کو صحیح راستہ پر نہیں آئے دیتی۔

سودور با اس زمانہ میں ایک دہائی مرض کی صورت اختیار کر چکا ہے اور اس کا درواج ساری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے چکا ہے، اس نے انسانی فطرت کا ذائقہ بدل دیا ہے کہ کڑور کو میٹھا سمجھنے لگی، اور جو چیز پوری انسانیت کے لئے معاشی بربادی کا سبب ہے، اس کو معاشی مسئلہ کا حل سمجھا جانے لگا، آج اگر کوئی متفکر محقق اس کے خلاف آواز اٹھاتا ہے تو اس کو دیوانہ سمجھا جاتا ہے۔

یہ سب کچھ ہے، لیکن وہ ڈاکٹر اکثر نہیں بلکہ انسانیت کا ڈاکو ہے جو کسی ملک میں دبا پھیل جانے کو اور علاج کے غیر مؤثر ہونے کا مشاہدہ کرنے کی بنا پر اب یہ طے کرے کہ لوگوں کو یہ سمجھائے کہ یہ مرض مرض ہی نہیں، بلکہ عین شفا اور عین راحت ہے، ماہر ڈاکٹر کا کام ایسے وقت میں بھی یہی ہے کہ لوگوں کو اس مرض اور اس کی مصرت سے آگاہ کرتا رہے، اور علاج کی تدبیریں بتاتا رہے۔

انبیاء علیہم السلام اصلاح خلق کے ذمہ دار ہو جاتے ہیں، وہ کبھی اس کی پروا نہیں کرتے کہ کوئی ان کی بات سننے لگا یا نہیں، وہ اگر لوگوں کے سننے اور ماننے کا انتظار کیا کرتے تو ساری دنیا کفر و شرک ہی سے آباد ہوتی، کلمہ لا الہ الا اللہ کا ماننے والا اس وقت کون تھا جب کہ خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی تبلیغ و تعلیم کا حکم منجانب اللہ ملا تھا؟ سودور بالآخر آج کی معاشیات میں ریڑھ کی ہڈی سمجھا جانے لگا ہے، لیکن حقیقت وہ ہے جو آج بھی بعض حکمائے یورپ نے تسلیم کی کہ وہ معاشیات کے لئے ریڑھ کی ہڈی نہیں بلکہ ریڑھ کی ہڈی میں پیدا ہو جانے والا ایک کیڑا ہے، جو اس کو کھا رہا ہے۔

مگر افسوس ہے کہ آجکل کے اہل علم و فن بھی کبھی رسم درواج کے تنگ دائرہ سے آزاد ہو کر اس طرف نظر نہیں کرتے، اور سیکڑوں برس کے تجربے بھی ان کو اس طرف متوجہ نہیں کرتے کہ سودور بالآخر لازمی نتیجہ یہ ہے کہ عام خلق خدا اور تمام ملت فقر و فاقہ اور معاشی بحران کا شکار ہو، اور وہ غریبے غریب تر ہوتے چلے جائیں، اور چند سرمایہ دار پوری ملت کے مال سے فائدہ اٹھا کر، یا یوں کہتے کہ ملت کا خون چوس کر اپنا بدن بڑھاتے اور پالتے چلے جاتیں، اور حیرت ہے کہ جب کبھی ان حضرات کے سامنے اس حقیقت کو بیان

کیا جاتا ہے، تو اس کے جھٹلانے کے لئے ہمیں امریکہ اور انگلینڈ کے بازاروں میں لے جا کر سود کی برکات کا مشاہدہ کرانا چاہئے ہیں اور یہ دکھانا چاہئے ہیں کہ یہ لوگ سود و ربا کی بدولت کیسے پھلے اور پھولے ہیں، لیکن اس کی مثال تو ایسی ہے جیسے کوئی مردم خوروں کی کسی قوم اور ان کے عمل کی برکات کا مشاہدہ کرانے کے لئے آپ کو مردم خوروں کے محلہ میں لے جا کر یہ دکھلائے کہ یہ کتنے موٹے تانے اور تندرست ہیں، اور اس سے یہ ثابت کرے کہ ان کا یہ عمل بہترین عمل ہے۔

لیکن اس کو کسی سمجھ دار آدمی سے سابقہ پڑے تو وہ کہے گا کہ تم مردم خوروں کے عمل کی برکات مردم خوروں کے محلہ میں نہیں دوسٹر محلوں میں جا کر دیکھو جہاں سیکڑوں ہزاروں مرد بے پڑے ہوئے ہیں جن کا خون اور گوشت کھا کر یہ درندے چلے ہیں، اسلام اور اسلامی شریعت کبھی ایسے عمل کو درست اور مفید نہیں مان سکتی جس کے نتیجہ میں پوری انسانیت اور ملت تباہی کا شکار ہو، اور کچھ افراد یا ان کے جتنے پھولتے پھلتے چلے جاتیں۔

سودور با کی معاشی خرابیاں

سودور با میں اگر کوئی دوسرا عیب بھی اس کے سوا نہ ہوتا کہ اس کے نتیجہ میں چند افراد کا نفع اور پوری انسانیت کا نقصان ہے تو یہی اس کی ممانعت اور قابل نفرت ہونے کے لئے کافی تھا، حالانکہ اس میں اس کے علاوہ اور بھی معاشی خرابیاں اور روحانی تباہ کاریاں پائی جاتی ہیں پہلے اس کو سمجھئے کہ سود کے ذریعہ ملت کی تباہی اور خاص افراد کا نفع کیونکر ہو سکتا ہے؟ ہمارے ہاں سودی اور منسروہ طریقہ میں تو ایسا سمجھنا ہے کہ عام ملت کا ضرر اور کسی خاص فرد کا نفع ہر مومن عقل دانے کو بھی سمجھ میں آجاتا تھا، مگر آجکل کی نئی روشنی جس کو نئی اندھیری کہنا زیادہ موزوں ہے، اس نے جس طرح شراب کو مشینوں میں صاف کر کے چوری اور ڈاک کی نئی نئی صورتیں ایجاد کر کے بدکاری و بے حیائی کے نئے نئے ڈھنگ نکال کر کے سب کو ایسا مہذب بنایا ہے کہ سطحی نظروں کو اس کی اندرونی خرابیاں نظر نہ آئیں، اسی طرح ربا اور سود کے لئے بجائے شخصی دکافروں کے مشترک کہنیاں بنائی ہیں جن کو بینک کہا جاتا ہے، اور اب دنیا کی آنکھوں میں خاک جھونکنے کے لئے یہ بتلایا جاتا ہے کہ ربا کے اس جدید طریقہ سے پوری ملت کا فائدہ ہے، کیونکہ علوم جو اپنے روپے سے تجارت کرنا نہیں جانتے یا قلت سرمایہ کی بنا پر نہیں کر سکتے ان سب کار و پیہ بینکوں میں جمع ہو کر ان میں سے ہر ایک کو گو قلیل ہی بھی کچھ نہ کچھ نفع سود کے نام سے مل جاتا ہے، اور بڑے تاجروں کو یہ موقع فراہم کرتے ہیں کہ وہ بینکوں سے سودی قرض لے کر بڑی تجارت کر کے فائدہ اٹھاتے ہیں، اس طرح سود ایسی مبارک چیز بن گئی کہ

ساری ملت کے افراد کو اس سے نفع پہنچ رہا ہے۔

لیکن ذرا انصاف سے کام لیا جائے تو یہ وہ اہل تسرب ہی ہے جو شراب کی گندی پھٹیوں کو صاف ستھرے ہوٹلوں میں اور عصمت منسروشی کے اڈوں کو سنیاءوں اور شبیہ نگہوں میں تبدیل کر کے زیر کو تریاق اور مضر کو مفید بنا کر دکھلانے کے لئے عمل میں لاتی ہے اور جس طرح اہل بصیرت پر یہ بات روشن ہے کہ اخلاق سوز جرائم کو جدید غلات پہنانے کا نتیجہ اس کے سوا نہیں کہ یہ جرائم پہلے سے زیادہ ہو گئے، اور ان کا ہر پہلے سے زیادہ تیز ہو گیا، اسی طرح سود و ربا کی اس نئی شکل نے سود کے چند آنے فی سیکڑہ عوام کے منہ کو لگا کر ایک طرف ان کو اپنے جرم کا شریک کر لیا، اور دوسری طرف اپنے لئے اس جرم کے ارتکاب کا غیر محدود میدان منسراہم کر لیا۔

کون نہیں جانتا کہ یہ چند آنے فی سیکڑہ کا سود جو بیونگ بینکوں اور ڈاکخانہ جات سے لوگوں کو ملتا ہے یہ کسی طرح ان کے معاش کی کفالت نہیں کر سکتا، اس لئے وہ مجبور ہیں کہ اپنا پیٹ بھرنے کے لئے کوئی مزدوری یا ملازمت تلاش کریں، تجارت کی طرف اول تو ان کی نظر خود نہیں جاتی، اور اگر کسی کو اس طرف توجہ بھی ہو جائے تو پوری ملت کا سرمایہ بینکوں میں جمع ہو کر جو صورت تجارت کی بن گئی ہے اس میں کسی چھوٹے سرمایہ دان کو داخل ہونا خود اپنی مورت کو دھرت دینے سے کم نہیں، کیونکہ بینک کوئی بڑا سرمایہ قرض پر صرف اسی کو دے سکتے ہیں جس کی بازار میں اپنی ساکھ ہو اور بڑا کاروبار ہو، دس لاکھ کے مالک کو ایک کروڑ قرض مل سکتا ہے، وہ اپنے ذاتی روپے کی نسبت دس گنا زیادہ کی تجارت چلا سکتا ہو اور تھوڑے سرمایہ دان کے لئے کوئی ساکھ ہوتی ہے نہ بینک اس پر اعتماد کرتے ہیں، ان کو دس گنا زیادہ قرض دینے، ایک ہزار کی مالیت دانے کو دس ہزار تو کیا ایک ہزار ملنا بھی مشکل ہے، اور جب کہ ایک شخص جو ایک لاکھ کی ملکیت رکھتا ہو تو لاکھ بینک کا سرمایہ لگا کر دس لاکھ کی تجارت کرتا ہے، اور قرض کر لیتے کہ اس کو ایک روپیہ فی صد نفع ہوتا ہے تو گویا اس کو اپنے ایک لاکھ پر دس فی صد نفع ہوا، اس کے بالمقابل اگر کوئی شخص صرف اپنے ذاتی روپے سے ایک لاکھ کی تجارت کرتا ہے اس کو ایک لاکھ پر صرف ایک ہی فی صد کا نفع ہوگا، جو اس کے مزدوری اخراجات کے لئے بھی کافی نہ ہوں گے، اور ہمارے بینک میں بڑے سرمایہ دانوں کو عام سانا جس نرخ اور رعایت کے ساتھ ملتا ہے وہ چھوٹے سرمایہ دانوں کو میسر نہیں آسکتا، اس لئے چھوٹے سرمایہ والا مفلوج اور محتاج ہو کر رہ جاتا ہے، اور اگر اس کی ضمانت آتی، اور اس نے بھی کسی ایسی تجارت میں ہاتھ ڈال دیا تو بڑے سرمایہ والا اس کو اپنی خدائی کا شریک

سمجھ کر کچھ اپنی گرہ سے نقصان اٹھا کر بھی بازار کو ایسا ڈاؤن کر دیتا ہے کہ چھوٹے سرمایہ والا اصل اور نفع سب ہاتھ دھو بیٹھتا ہے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ تجارت صرف ان چند افراد میں محدود ہو کر رہ جاتی ہے جو بڑے سرمایہ دار ہیں۔

۱۔ یہ ملت پر کتنا بڑا ظلم ہے کہ ساری ملت اصلی تجارت سے محروم ہو کر صرف بڑے سرمایہ داروں کی دست نگر بن جائے، ان کو وہ جتنا نفع دینا چاہیں بخشش کے طور پر دیدیں۔

۲۔ اور در سرمایہ سے بڑا نقصان جس کی زد میں پورا ملک آ جاتا ہے یہ ہے کہ ایسی صورت میں ہشیا کے نرخ پر ان بڑے سرمایہ داروں کا قبضہ ہو جاتا ہے، وہ گراں سے گراں فروخت کر کے اپنی گرہ مضبوط کر لیتے اور پوری ملت کی گرہیں کھلوانے ہیں، اور قیمت بڑھانے کے لئے جب چاہیں مال کی فروخت بند کر دیتے ہیں، اگر ساری ملت کا سرمایہ بینکوں کے ذریعہ کھینچ کر ان خود غرض لوگوں کی پردریش نہ کی جاتی اور یہ مجبور ہوتے کہ صرف اپنے ذاتی سرمایہ سے تجارت کریں، تو نہ چھوٹے سرمایہ والوں کو یہ مصیبت پیش آتی، اور نہ یہ خود غرض درندے پوری تجارت کے ناخدا بننے، چھوٹے سرمایہ والوں کی تجارت کے منافع سامنے آتے تو دوسروں کا حوصلہ بڑھتا، تجارت کا کاروبار عام ہوتا، جس سے ہر ایک کا اسٹاٹ ملوہ ہوتا، جس سے ہزاروں حاجتمندوں کی روزی پیدا ہوتی، اور تجارتی نفع بھی عام ہوتا، اور ہشیا کی ارزانی پر بھی یقینی اثر پڑتا، کیونکہ باہمی مقابلہ (کمپٹیشن) ہی ایسی چیز ہے جس کے ذریعہ کوئی آدمی اس پر تیار ہوتا ہے کہ اپنا نفع کم کرے، اس عیار نہ طرین کارلے پوری قوم کو ایک ہلک بیماری لگادی اور دوسرے اس کی ذہنیت خراب کر دی کہ اس بیماری ہی کو شفا کچھو ۳۔ بینکوں کے سود سے ملت کا ایک تیسرا معاش نقصان اور دیکھتے کہ جس شخص کا سرمایہ دس ہزار ہے، اور وہ بینک سے سودی قرض لے کر ایک لاکھ کا بیوپار کرتا ہے، اگر کہیں اس کا سرمایہ ڈوب گیا، اور تجارت میں اس کو نقصان پہنچ گیا، اور وہ دیوالیہ ہو گیا، تو خود کیجئے کہ نقصان صرف دس فی صد تو اس پر پڑا، باقی نوٹے فی صد نقصان پوری ملت کا ہوا، جن کا سرمایہ بینک سے لیکر اس نے لگایا تھا، اگر بینک نے دیوالیہ کے نقصان کو سر دست خود ہی برداشت کر لیا، تو یہ ظاہر ہے کہ بینک تو قوم کی جیب ہے، اس کا نقصان انجام کار قوم پر عائد ہوگا، جس کا حاصل یہ ہوا کہ سرمایہ دار کو جب تک نفع ہوتا رہا تو نفع کا وہ تنہا مالک تھا، اس میں ملت کے لئے کچھ نہ تھا یا برائے نام تھا، اور جب نقصان آیا تو نوٹے فی صد نقصان پوری ملت پر پڑ گیا۔

۳۔ سود سے ایک معاشی نقصان یہ بھی ہے کہ سود خور جب گھاسٹے میں آجائے تو پھر وہ پینے کے قابل نہیں رہتا، کیونکہ اتنا سرمایہ تو تھا نہیں جس کے نقصان کو یہ برداشت کر سکے، نقصان کے وقت اس پر دوسری مصیبت ہوتی ہے، ایک تو اپنا نفع اور سرمایہ گیا، اور دوسرے سے بنگ کے قرض میں دب گیا، جس کی ادائیگی کے لئے اس کے پاس کوئی ذریعہ نہیں، اور بے سود کی تجارت میں اگر سارا سرمایہ بھی کسی وقت چلا جائے تو فقیر ہی ہو گا مگر قرض تو نہ ہو گا۔

۱۹۵۲ء میں پاکستان میں روٹی کے برباد پر مشتر آئی ارشاد کے مطابق حاکم کی آفت آئی اور حکومت نے کروڑوں روپے کا نقصان اٹھا کر تاجروں کو سنبھالا، مگر کسی نے اس پر غور نہیں کیا کہ وہ سب سود کی غومت تھی، کیونکہ کاٹن کے تاجروں نے اس کا رو با میں بیشتر سرمایہ بنگوں کا لگایا ہوا تھا، اپنا سرمایہ برائے نام تھا، بقضائے خداوندی روٹی کا بازار اتنا گر گیا کہ اس کے دام ایک سو بچیس سے گر کر دس پر آ گئے، تاجر اس قابل نہ رہے کہ بینکوں میں مارجن پوری کرنے کے لئے روپیہ واپس دیں، مجبور ہو کر مارکیٹ بند کر دی گئی، اور حکومت سے فریاد کی، حکومت نے دس کے بجائے نوے کے دام لگا کر خود مال خریدا اور کروڑوں روپیہ کا نقصان برداشت کر کے ان تاجروں کو دیوالیہ ہونے سے بچا لیا، حکومت کا روپیہ کس کا تھا وہی بچاری غریب ملت و قوم کا، غرض بینکوں کے کاروبار کا کھلا ہوا نتیجہ یہ ہے کہ پوری ملت کے سرمایہ سے چند افراد نفع اٹھاتے ہیں اور جہاں نقصان ہو جاتا ہے تو وہ پوری قوم و ملت پر پڑے۔

خوش پروری اور ملت کشی کی ایک اور مثال

سود و ربا کی ملت کشی اور افراد پروری کا اجمالی نقشہ آپ کے سامنے آچکا ہے، اس کے ساتھ ایک اور ہوشیارسی اور چالاک ریچھے کے سود خوروں نے جب اپنے تجربہ سے بھی اس چیمبر کو محسوس کیا جو قرآن کا ارشاد ہے **يَمْحُجُّ اللَّهُ ذُنُوبَ بَعْضِ الْبَاقِيْنَ** سود کے مال میں حاکم کی آفتیں آنالازی ہیں، جس کے نتیجہ میں دیوالیہ ہونا پڑتا ہے، تو ان آفتوں سے بچنے کے لئے دو مستقل ادارے بنائے، ایک بیمہ (انشورنس) دوسرے سسٹم کا بازار، کیونکہ تجارت میں نقصان آنے کی دو وجہ ہو سکتی ہیں، ایک کوئی آسانی آفت کہ ہمارا ڈوب گیا، یا جل گیا یا کوئی اور ایسی ہی آفت آگئی، دوسرے کہ سامان کا نرخ اس کی قیمت خرید سے کم ہو گیا، ان دونوں صورتوں میں لگا ہوا سرمایہ چونکہ اپنا نہیں بلکہ ملت کا مشترکہ سرمایہ ہے، اس لئے ان کا نقصان کم اور ملت کا زیادہ ہے، مگر انھوں نے اس تھوڑے سے نقصان کو بھی ملت ہی کے سر پر

ڈالنے کے لئے، ایک طرف تو بیمہ کمپنیاں کھولیں، جس میں بینکوں کی طرح پوری ملت کا سرمایہ جمع رہتا ہے، اور جب کسی سودی آفت سے ان سود خوروں پر کوئی نقصان آتا ہے تو بیمہ کے ذریعہ وہ پورا نقصان بھی ملت کے مشترک سرمایہ پر ڈال دیتے ہیں۔

لوگ سمجھتے ہیں کہ بیمہ کمپنیاں خدا کی رحمت ہیں، ڈوبتے کو سہارا دیتی ہیں، لیکن انکی حقیقت کو دیکھیں اور سمجھیں تو یہاں بھی وہی فریب ہو کہ ناگہانی حوادث کے وقت امداد کا لالچ دے کر ملت کا سرمایہ جمع کیا گیا، مگر اس سے بھاری رقموں کا فائدہ تو صرف اونچے سرمایہ داروں کو ملتا ہی جو بعض اوقات خوں سی اپنی سنسودہ موٹر کو آگ لگا کر یا کہیں ٹکرا کر اور بیمہ کمپنی سے رقم لے کر نئی موٹر خریدنا چاہتے ہیں، تنوں میں ایک رو کوئی غریب بھی ایسا ہوتا ہو گا جس کو ناگہانی موت کے سبب کچھ پیسے مل جاویں۔

اور دوسری قسم یعنی نرخ گھٹ جانے کے خطرے سے بچنے کے لئے سسٹم کا بازار گرم کیا، اس سسٹم کے ذریعہ تمام افراد ملت کو متاثر کیا گیا، تاکہ جو نقصان ان کو قیمت گھٹ جانے کی وجہ سے ہونے والا تھا وہ پھر ملت پر منتقل کر دیں۔

اس مختصر بیان میں آپ نے اتنا سمجھ لیا ہو گا کہ بینکوں کا سود اور اس کی تجارت پوری انسانیت کے لئے فقر و فاقہ اور معاشی تنگدستی کا موجب ہے، ہاں چند مال دار افراد کے اموال میں اس سے اضافہ بھی ہوتا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ملت بگڑتی ہے اور چند افراد بگڑتے ہیں، اور ملک کا سرمایہ سمٹ کر ان کے ہاتھ میں آ جاتا ہے، عام حکومتوں نے اس عظیم مفسدہ کو محسوس کیا، لیکن اس کا علاج یہ تجویز کیا کہ بڑے سرمایہ داروں کے لئے انکم ٹیکس کی شرح بڑھا دی جائے، یہاں تک کہ آخری شرح ایک روپیہ میں سے ساڑھے پندرہ آنے کر دی گئی، تاکہ سرمایہ ان کے پاس سے منتقل ہو کر پھر قومی خزانے میں پہنچ جائے۔

لیکن سب کو معلوم ہے کہ اس قانون کے نتیجہ میں عام طور پر کارخانوں کے حساب فزنی اور جمل بننے لگے، اور بہت سا سرمایہ حکومت سے چھپانے کے لئے پھر دینوں کی شکل میں منتقل ہونے لگا۔

خلاصہ یہ ہو کہ دولت سمٹ کر قوم کے چند افراد میں مقید ہو جانے کی انتہائی معتر ملک کے معاشی اور اقتصادی حالات کے لئے سب پر واضح ہے، اسی لئے انکم ٹیکس کی شرح اتنی زیادہ بڑھائی جاتی ہے، لیکن تجربہ شاد ہے کہ یہ تدبیر مرض کا علاج ثابت نہ ہوتی، جس کی بڑی وجہ یہ ہو کہ مرض کے اصلی سبب کو نہیں پہچانایا گیا، اس لئے علاج کی مثال یہ ہو گئی کہ ۵

درہ بہت و دشمن اندر حسانہ بود

دولت بڑے سرمایہ داروں کی طرف سے ملنے کا پہلی سبب صرف سودی کاروبار اور قومی سرمایہ سے خاص خاص انفرادی بے جانف اندوزی ہے، جب تک اسلام کی تعلیمات کے مطابق اسکو بند نہ کیا جائے اور اس کاروبار نہ دیا جائے کہ ہر شخص صرف اپنے سرمایہ سے تجارت کرے اس وقت تک اس مرض کا علاج نہیں ہو سکتا۔

ایک شبہ اور اس کا جواب | اس جگہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ بینکوں کے ذریعہ پوری قوم کا سرمایہ جمع ہو کر کچھ نہ کچھ فوائد عوام کو بھی ملنا چاہئے، لیکن اگر بینکوں کی قلیل ہو اور بڑے سرمایہ داروں نے اس سے زیادہ فائدہ حاصل کر لیا ہو، لیکن اگر بینکوں میں سرمایہ جمع کرنے کا طریقہ نہ ہو تو اس کا نتیجہ وہی ہوگا جو پہلے زمانہ میں تھا کہ لوگوں کا سرمایہ دفینوں اور خزیں کی شکل میں زمین کے اندر رہا کرتا تھا، جس سے نہ ان کو فائدہ ہوگا نہ کسی دوسرے شخص کو۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اسلام نے جس طرح سود کو حرام قرار دے کر اس کا دروازہ بند کیا ہے کہ پوری قوم کی دولت سمٹ کر خاص خاص سرمایہ داروں میں محدود ہو جائے اس کی طرح زکوٰۃ کا فریضہ سرمایہ کیس کی صورت میں عائد کر کے ہر مال دار کو اس پر مجبور کر دیا ہے کہ وہ اپنے سرمایہ کو منجھد حالت میں نہ رکھے، بلکہ تجارت اور کاروبار میں لگائے، کیونکہ زکوٰۃ سرگام کیس کی صورت میں ہونے کی بنا پر اگر کوئی شخص اپنا روپیہ یا سونا چاندی دفینہ کر کے رکھتا ہے تو ہر سال اس کا چالیسواں حصہ زکوٰۃ میں نکلتے نکلتے سرمایہ فنا ہو جائے گا، اس لئے ہر سمجھدار انسان اس پر مجبور ہوگا کہ سرمایہ کو کام میں لگا کر اس سے فائدہ اٹھائے اور دوسروں کو فائدہ پہنچائے، اور اسی نفع میں سے زکوٰۃ ادا کرے۔

فریضہ زکوٰۃ ایک حیثیت | اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ فریضہ زکوٰۃ ادا کرنے میں جیسے یہ عظیم الشان فائدہ معسر ہے کہ قوم کے فقراء و مساکین کی امداد ہو، اسی طرح مسلمانوں کے معاشی حالات کو درست کرنے کے لئے بھی یہ فریضہ تجارت کی ترغیب کا ایک بہترین ذریعہ ہے کیونکہ ہر انسان جب یہ دیکھے گا کہ نقد سرمایہ کو بند رکھنے کا نتیجہ یہ ہے کہ نفع تو کچھ ہوا نہیں، اور سال کے ختم پر چالیسواں حصہ کم ہو گیا، تو ضرور اس کو اس طرف توجہ کرنا پڑے گی کہ اس مال کو کسی تجارت پر لگائے، اور دوسری طرف چونکہ سود ہے، روپیہ چلانا حرام ٹھہرتا تو تجارت کی یہ صورت نہ رہے گی، کہ لاکھوں انسانوں کے سرمایہ سے صرف ایک انسان تجارت کرے بلکہ ہر مالدار خود تجارت میں آنے کی فکر کرے گا، اور جب کہ بڑے سرمایہ دار بھی صرف اپنے

سرمایہ سے تجارت کریں گے تو چھوٹے سرمایہ داروں کو تجارت میں وہ مشکلات پیش نہ آئیں گی جو بینکوں سے سودی روپیہ لے کر بڑی تجارت چلانے کی صورت میں پیش آتی ہیں، اس طرح پورے ملک میں تجارت اور اس کے منافع عام ہوں گے، اور اس کے نتیجہ میں ملک کے غریب و فقراء کو فائدہ پہنچے گا۔

سودی روحانی بیماریاں | یہاں تک سود کی معاشی اور اقتصادی تباہ کاری کا ذکر تھا اب سنئے کہ سودی کاروبار انسان کے اخلاق اور روحانی کیفیات پر کیسے خراب اثرات ڈالتا ہے۔

۱۔ انسانی اخلاق میں سب سے بڑا جو ہر ایشیاء و خوارت کا ہے کہ خود تکلیف اٹھا کر دوسروں کو راحت پہنچانے کا جذبہ ہو، سود کے کاروبار کا لازمی اثر یہ ہوتا ہے کہ یہ جذبہ فنا ہو جاتا ہے، سود خور اپنے پاس سے کسی کو نفع پہنچانا تو کیا دوسرے کو اپنی کوشش اور اپنے سرمایہ سے اپنے برابر آنا نہیں دیکھ سکتا۔

۲۔ وہ مصیبت زدہ پر رحم کھانے کے بجائے اس کی مصیبت سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی فکر میں رہتا ہے۔

۳۔ سود خوری کے نتیجہ میں مال کی حرص اتنی بڑھ جاتی ہے کہ اس میں مست ہو کر اپنے بھلے اور بڑے کو بھی نہیں پہچانتا، اس کے انجام بد سے بالکل غافل ہو جاتا ہے۔

کیا سود کے بغیر کوئی ارباب کی حقیقت اور اس کی دینی و دنیوی خرابیوں کا بیان کسی قدر تفصیل سے آچکا ہے، اب تیسری تجارت نہیں چلی سکتی؟ بحث یہ باقی ہو کر رہا کہ معاشی اور روحانی خرابیاں اور قرآن و سنت میں اس کی شدید حرمت و ممانعت تو واضح ہو گئی، لیکن موجودہ دور میں جبکہ رہا جس تجارت کا رکن اعظم بنا ہوا ہے، ساری دنیا کے کاروبار اسی پر چل رہے ہیں، اس سے نجات حاصل کرنے کی تدبیر کیا ہو؟ بینک سسٹم کو ترک کر دینا اس زمانہ میں گویا تجارت کو بند کر دینا ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ جب کوئی مرض عام ہو کر رہا کی صورت اختیار کر لے تو علاج معالجہ دشوار ضرور ہو جاتا ہے، لیکن بے کار نہیں ہوتا، اصلاح حال کی کوششیں انجام کار کامیاب ہوتی ہیں البتہ صبر و استقلال اور ہمت سے کام لینے کی ضرورت ہوتی ہے، انشاء کریم ہی میں اللہ تعالیٰ کا یہ بھی ارشاد ہے:

مَّا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ ۚ (۲۲:۲۸) | یعنی اللہ تعالیٰ نے دین کے معاملہ میں تم پر کوئی سہی نہیں ڈالی ہے |

اس لئے ضرور ہے کہ رہا سے جہت ناپ کا کوئی ایسا راستہ ضرور ہوگا جس میں معاشی اور

اقتصادی نقصان بھی نہ ہوا اندرونی اور بیرونی تجارت کے دروازے بھی بند نہ ہوں اور با سے نجات بھی ہو جائے۔

اس میں پہل بات تو یہی ہے کہ سطحی نظر میں بینکنگ کے موجودہ اصول کو دیکھتے ہوئے عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ بینک سسٹم کا مدار ہی سود پر ہے، اس کے بغیر بینک چل ہی نہیں سکتے، لیکن یہ خیال قطعاً صحیح نہیں رہا کے بغیر بھی بینک سسٹم اسی طرح قائم رہ سکتا ہے، بلکہ اس سے بہتر اور نافع و مفید صورت میں آسکتا ہے، البتہ اس کے لئے ضرورت ہو کہ کچھ حضرات ماہرین شریعت اور کچھ ماہرین بینک کے مشورہ اور تعاون سے اس کے اصول اور سر فہرست کو بزرگ کریں، تو کامیابی کچھ دور نہیں، اور جس دن بینک سسٹم شرعی اصول پر آگیا تو انشاء اللہ دنیا دیکھ لے گی کہ اس میں پوری قوم و ملت کی کیسی فلاح ہے، ان اصول و قواعد کی تشریح کا یہ موقع نہیں، جن کی بناء پر بینک سسٹم کو بغیر با کے چلایا جاسکتا ہے۔

ربا اور سود کی ایک ضرورت کچھ تجارتی اغراض کے لئے ہوتی ہے اس کا انتظام تو بینک کے موجودہ اصول میں ترمیم کے ذریعہ ہو جائے گا، اور دوسری ضرورت سود و ربا میں مبتلا ہونے کی فقیروما جہند لوگوں کی ہنگامی اور وقتی ضرورتیں ہوا کرتی ہیں، اس کا بہترین علاج اسلام میں پہلے سے بصورت زکوٰۃ و صدقات واجہ موجود ہے، لیکن دین اور علم دین سے بچری اور بے پردائی کا نتیجہ جو جس آجکل نظام زکوٰۃ بھی مدخل کر دیا ہو، بے شمار مسلمان ہیں جو نماز کی طرح زکوٰۃ کے پاس نہیں جاتے، اور جو لوگ نکالتے بھی ہیں ان میں اکثر بڑے سرمایہ والے حضرات حساب کر کے پوری زکوٰۃ ادا نہیں کرتے، اور جو لوگ پوری زکوٰۃ نکالتے بھی ہیں تو وہ بس زکوٰۃ کا نکالنا ہی جانتے ہیں کہ اپنی جیب سے نکال دیں، حالانکہ حکیم الہی زکوٰۃ کے نکالنے کا نہیں، بلکہ ادا کرنے کا ہے اور ادا کرنا جب صحیح ہو سکتا ہے جب اس کے مستحقین کو پہنچا کر ان کو مالکانہ قبضہ دیدیا جائے، اب غور کیجئے کہ ایسے مسلمان کتنے ہیں جو مستحقین کو تلاش کرنے کی فکر کریں، پھر ان کو پہنچانے کا اہتمام کریں، مسلمان قوم کتنی ہی کم سرمایہ سہی، لیکن اگر ہر مسلمان جس پر زکوٰۃ فرض ہے وہ زکوٰۃ پوری ادا کرے، اور ادا کرنے کا صحیح طریقہ اختیار کرے کہ مستحقین کو پہنچائے اور ادا کرنے کا اہتمام کرے، تو یقیناً کسی مسلمان کو اس کی ضرورت نہ ہے، کہ وہ قرض کی ضرورت سے سود و ربا میں مبتلا ہو، اور اگر شرعی قاعدہ کے مطابق

۱۔ احقر نے چند علماء کے مشورے سے سود و بھکاری کا مسودہ وضع ہوا کیا کر بھی دیا تھا اور بھکاری کے بعض ماہرین نے موجودہ دور میں قابل عمل تسلیم بھی کر لیا تھا، اور بعض حضرات نے اس کو شروع بھی کرنا چاہا مگر ابھی تک عام نا جروں کی توجہ اس طرف ہونے کے سبب اور حکومت کی طرف سے اس کو منظور نہ ہونے کے سبب چل نہیں سکا، فانی مثلاً ہشتکی

اسلامی حکومت عادلہ بن جائے اور اس کے تحت شرعی ہیئت المال قائم ہو جائے، اور تمام مسلمانوں کے اموال ظاہر کی زکوٰۃ اس میں جمع ہوا کرے تو اس ہیئت المال سے ہر ایک ضرورت مند کی ضرورت پوری کی جاسکتی ہے، اور کسی بڑی رقم کی ضرورت پڑ جائے تو بطور قرض بھی بغیر سود کے دیا جاسکتا ہے، اور اس طرح بیکار پھرنے والوں کو چھوٹی و کانیں سرکاری یا کسی صنعت میں لگا کر بھی کام میں لگایا جاسکتا ہے، کسی یورپین ماہر نے صحیح کہا کہ مسلمانوں کا نظام زکوٰۃ ایسی سپر ہر کہ اگر مسلمان اس کے پابند ہو جائیں تو اس قوم میں کوئی مفلس اور مصیبت زدہ نظر نہ آئے۔

الغرض اس زمانے میں سود و ربا کے معاملات و با کی طرح پھیل جانے سے یہ سمجھنا صحیح نہیں کہ موجودہ زمانہ میں سود کا کاروبار چھوڑ دینا معاش و اقتصادی خود کشی کے مرادون ہے، اور اس زمانہ کا آدمی سودی کاروبار کرنے میں معذور ہے۔

ہاں یہ ضرور ہے کہ جب تک پوری قوم یا اس کی کوئی معتد بہ جماعت یا کوئی اسلامی حکومت پوری توجہ کے ساتھ اس کام کا ہتھ نہ کرے افراد و اعاد کے لئے دشواری ضرور ہے، مگر معذور پھر بھی نہیں کہا جاسکتا۔

اس وقت ہمارے اس بیان کے دو مقصد ہیں، اول یہ کہ مسلمانوں کی جماعتیں اور حکومتیں جو اس کام کو صحیح طور پر کر سکتی ہیں اس طرف متوجہ ہوں اور مسلمانوں کو بلکہ پوری دنیا کو سود کے مخوس اثرات سے نجات دلائیں۔

دوسرے یہ کہ کم از کم علم سب کا صحیح ہو جائے، مرض کو مرض تو سمجھنے لگیں، حرام کو حلال سمجھنے کا دوسرا گناہ جو پہلے گناہ سے زیادہ عظیم ہے، کم از کم اس کے تو مرتکب نہ ہوں عملی گناہ دینی کچھ نہ کچھ ظاہری فائدہ بھی ہے، لیکن یہ دوسرا علی اور عقیدہ کا گناہ کہ اس کو حلال ثابت کرنے کی کوشش کی جائے، پہلے سے عظیم تر بھی ہے، اور لغو و فضول بھی ہو، سود کو حرام سمجھنے اور اپنے گناہ کا اعتراف کرنے میں تو کوئی مالی نقصان بھی نہیں ہوتا، کوئی تجارت بھی بند نہیں ہوتی، ہاں اعتراف جرم کا نتیجہ یہ ضرور ہوتا ہے کہ کسی وقت توبہ کی توفیق ہو جانے سے اس سے بچنے کی تدبیر سوچیں۔

اس وقت اسی مقصد کے پیش نظر آخر میں چند روایات حدیث اور ارشاد است رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی پیش کرتا ہوں جو اپنی آیات قرآنی کا بیان ہے جن میں سود و ربا کی شدید ممانعت اور اس پر سخت عذاب کی وعیدیں آتی ہیں، تاکہ گناہ کے گناہ ہونے کا احساس تو بیدار ہو، اور اس سے بچنے کی فکر ہو، کم از کم یہ صورت تو نہ رہے کہ

اس حرام کو حلال بنا کر ایک گناہ کے ڈو گناہ بنالیں، اور بڑے بڑے صالح و سیدار مسلمان جو رات کو ہتجد اور ذکر اللہ میں گزاریں صبح جب دکان یا کارخانہ میں پہنچیں تو انہیں یہ خیال بھی نہ آئے کہ ہم سود و قمار کے معاملات میں مبتلا ہو کر کچھ گناہ کر رہے ہیں۔

سود کے بارے میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات

① رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سات ہلک چیزوں سے بچو! صحابہ کرامؓ نے دریافت کیا، یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وہ کیا ہیں؟ آپ نے فرمایا، ایک اللہ تعالیٰ کے ساتھ (عبادت میں یا اس کی مخصوص صفات میں) کسی غیر اللہ کو شریک کرنا، دوسرے چاد و کرنا، تیسرے کسی شخص کو ناحق قتل کرنا، چوتھے سود کھانا، پانچویں یتیم کا مال کھانا، چھٹے جہاد کے وقت میدان سے بھاگنا، ساتویں کسی پاک دامن عورت پر ہتھ باندھنا (یہ حدیث صحیح بخاری اور مسلم میں ہے)

② رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں نے کج رات دو شخصوں کو دیکھا جو میرے پاس آئے، اور مجھے بیت المقدس تک لے گئے، پھر ہم آگے چلے تو ایک خون کی ہنردیکھی جس کے اندر ایک آدمی کھڑا ہوا ہے، اور دوسرا آدمی اس کے کنارہ پر کھڑا ہے، جب یہ ہنر والا آدمی اس سے باہر آنا چاہتا ہے تو کنارہ والا آدمی اس کے منہ پر تھپڑ مارتا ہے، جس کی چوٹ سے بھاگ کر پھر وہ وہیں چلا جاتا ہے جہاں کھڑا تھا، پھر وہ بھٹکے کا ارادہ کرتا ہے، تو پھر یہ کنارہ والا آدمی بھی معاملہ کرتا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے ان دونوں ساتھیوں سے پوچھا کہ یہ کیا ماجرا ہے جو میں دیکھ رہا ہوں؟ انھوں نے بتلایا کہ خون کی ہنر میں قید کیا ہوا آدمی سود کھانے والا اپنے من کی سزا پا رہا ہے، یہ حدیث صحیح بخاری کتاب البیوع میں ہے۔

③ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سود لینے والے پر بھی لعنت فرمائی، اور سود دینے والے پر بھی، اور بعض روایات میں سودی معاملہ پر گواہی دینے والے اور اس کا وثیقہ لکھنے والے پر بھی لعنت آئی ہے۔

اور صحیح مسلم کی ایک روایت میں فرمایا کہ یہ سب گناہ میں برابر ہیں، اور بعض روایات میں شاہد کا تب پر لعنت اس صورت میں ہے جبکہ ان کو اس کا علم ہو کہ یہ سود کا معاملہ ہے۔

④ اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ چار آدمی ایسے ہیں کہ ان کے بارہ میں اللہ تعالیٰ نے اپنے اوپر لازم کر لیا ہے کہ ان کو جنت میں نہ داخل کرے، اور جنت کی نعمت

نہ پہنچے دے، وہ چار یہ ہیں، شراب پیئے کا عادی اور سود کھانے والا اور یتیم کا مال ناحق کھانے والا اور اپنے والدین کی نافرمانی کرنے والا۔ (یہ روایت مستدرک حاکم میں ہے)

⑤ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ آدمی جو سود کا ایک درہم کھاتا ہے وہ پچیس مرتبہ بدکاری کرنے سے زیادہ سخت گناہ ہے، اور بعض روایات میں ہے کہ جو گوشت مال حرام سے بنا ہوا اس کے لئے آگ ہی زیادہ مستحق ہے، اسی کے ساتھ بعض روایات میں ہے کہ کسی مسلمان کی آبروریزی سود سے بھی زیادہ سخت گناہ ہے۔ (یہ روایت مسند احمد طبرانی وغیرہ میں ہے)

⑥ اور ایک حدیث میں ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات سے منع فرمایا کہ بھیل کو قابل استعمال ہونے سے پہلے فروخت کیا جائے، اور نہ فرمایا کہ جب کسی بستی میں بدکاری اور سود کا کاروبار پھیل جائے تو اس نے اللہ تعالیٰ عذاب کو اپنے اوپر دعوت دیدی۔ (یہ روایت مستدرک حاکم میں ہے)

⑦ اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب کسی قوم میں سود کے لین دین کا رواج ہو جائے تو اللہ تعالیٰ ان پر ضروریات کی گرانی مسلط کر دیتا ہے، اور جب کسی قوم میں رشوت عام ہو جائے تو دشمنوں کا دغیب غلبہ ان پر ہو جاتا ہے (یہ روایت مسند احمد میں ہے)

⑧ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ شب معراج میں جب ہم ساتویں آسمان پر پہنچے تو میں نے اپنے اوپر عدد و برقی کو دیکھا، اس کے بعد ہم ایک ایسی قوم پر گزرے جن کے پیٹ رہائشی مکانات کی طرح پھوٹے اور پھیلے ہوئے ہیں، جن میں سانپ بھرے ہیں جو باہر سے نظر آتے ہیں، میں نے جبرئیل امین سے پوچھا کہ یہ لوگ کون ہیں؟ انھوں نے فرمایا کہ یہ سود خور ہیں (یہ روایت مسند احمد کی ہے)

⑨ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عورت بن مالک سے فرمایا کہ ان گناہوں سے بچو جو معاف نہیں کئے جاتے، ان میں سے ایک مال غنیمت کی چوری ہے، اور دوسرے سود کھانا اور طہرائی

⑩ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص کو تم نے قرض دیا ہو اس کا ہدیہ بھی قبول نہ کرو (ایسا نہ ہو اس نے ہدیہ قرض کے عوض میں دیا ہو، جو سود ہے، اس لئے اس کے ہدیہ قبول کرنے سے بھی احتیاط چاہئے)

ربا کی تعریف اور اس کی حقیقت اور اس کی دیوبی تباہ کاری کے متعلق قرآن مجید کی سات آیتیں اور احادیث نبویہ کے دس ارشادات اس جگہ بیان ہو چکے ہیں، سوچئے سمجھئے والے مسلمان کیلئے اتنا کافی ہے، اور اس مسئلے کے باقی ماندہ پہلوؤں پر بحث اور مکمل تحقیق کے لئے احقر کی ایک مستقل کتاب بنام (مسئلہ سود) شائع ہو چکی ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا تَدَايَسْتُمْ بِدِينٍ إِلَى آخِلٍ مِمَّنْ فَاتَّبِعُوهُ
 اسے ایمان والوں جب تم آپس میں معاملہ کرو اور جو کسی وقت مقرر تک تو اس کو لکھ لیا کرو
 وَلْيَكْتُبْ بَيْنَكُمْ كَاتِبٌ بِالْعَدْلِ وَلَا يَأْبَ كَاتِبٌ أَنْ يَكْتُبَ كَمَا
 اور چاہے کہ لکھ دے ہمارے درمیان کوئی لکھنے والا انصاف اور انکار نہ کرے لکھنے والا اس سے کہ لکھ دیوے جیسا
 عَلَّمَهُ اللَّهُ فَلْيَكْتُبْ وَلْيُمْلِلِ الَّذِي عَلَيْهِ الْحَقُّ وَلْيَتَّقِ اللَّهَ رَبَّهُ
 لکھا یا اسکا اللہ نے سوا سوا چاہے کہ لکھ دے اور بتلا جائے کہ جس پر حق ہے اور دوسرے اللہ سے جو اس کا رب ہے
 وَلَا يَبْخَسَ مِنْهُ شَيْئًا فَإِنْ كَانَ الَّذِي عَلَيْهِ الْحَقُّ سَفِيهًا أَوْ ضَعِيفًا أَوْ
 اور کم نہ کرے اس میں سے کچھ پھر اگر وہ شخص کہ جس پر حق ہے بے عقل ہے یا ضعیف ہے یا
 لَا يَسْطِيعُ أَنْ يُمِلَّ هُوَ فَلْيُمْلِلْ وَلِيُّهُ بِالْعَدْلِ وَاسْتَشْهِدُوا شَهِيدَيْنِ
 آپ نہیں بتلا سکتا تو بتلا دے کار گزار اس کا انصاف اور گواہ کرد دو شاہد اپنے
 مِنْ بَرِّ جَالِكُمُ فَإِنْ لَمْ يَكُونَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَامْرَأَتٌ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ
 مردوں میں سے پھر اگر نہ ہوں دو مرد تو ایک مرد اور دو عورتیں ان لوگوں میں سے کہ جس کو تم پسند
 مِنَ الشُّهَدَاءِ أَنْ تَضِلَّ إِحْدَاهُمَا فَتُذَكِّرَ إِحْدَاهُمَا الْأُخْرَى وَلَا
 کرنے ہو گواہوں میں تاکہ اگر بھول جائے ایک ان میں سے تو یاد دلا دے اس کو دوسری اور انکار
 بَابُ الشَّهَادَةِ إِذَا مَاتَ عَوْرٌ وَلَا تَسْمَعُوا أَنْ تَكْتُبُوهُ صَغِيرًا أَوْ
 ذکر میں عوار جس وقت بتلا سے جاوے اور کالی نہ کر داس کے لکھنے سے چھوڑا ہو معاملہ یا
 كَبِيرًا إِلَى آخِلِهِ ذَلِكُمْ أَقْسَطُ عِنْدَ اللَّهِ وَأَقْوَمُ لِلشَّهَادَةِ وَأَدْنَى
 بڑا اس کی میعاد تک اس میں پورا انصاف ہے اللہ کے نزدیک اور بہت درست رکھنے والا اور گواہی کو
 الْأَقْرَبُ تَابُوا إِلَّا أَنْ تَكُونَ تِجَارَةً حَاضِرَةً تُدِيرُونَهَا بَيْنَكُمْ
 اور نزدیک ہو کہ شہر میں نہ چڑو مگر یہ کہ سودا ہو انھوں ہاتھ لینے دیتے ہو اس کو آپس میں تو ہم پر
 فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَلَّا تَكْتُبُوهَا وَأَشْهَدُ وَإِذَا تَبَايَعْتُمْ
 کچھ گناہ نہیں اگر اس کو نہ لکھو اور عوار کر لیا کرو جب تم سودا کرو

وَلَا يَضَارُّ كَاتِبٌ وَلَا شَهِيدٌ وَإِنْ تَفَعَّلُوا فَإِنَّهُ فُسُوقٌ بِكُمْ
 اور نقصان نہ کرے لکھنے والا اور نہ گواہ اور اگر ایسا کر دو تو یہ گناہ کی بات ہے تمہارے اندر
 وَاتَّقُوا اللَّهَ وَيُعَلِّمُكُمُ اللَّهُ وَاللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ﴿۳۸﴾ وَإِنْ كُنْتُمْ
 اور ڈرتے ہو اللہ سے اور اللہ تم کو سکھلاتا ہے اور اللہ ہر ایک چیز کو جانتا ہے اور اگر تم
 عَلَى سَفَرٍ وَلَمْ تَجِدُوا كَاتِبًا فَرِهْنِ مَقْبُوضَةً فَإِنْ آمَنْتُمْ بِبَعْضِ
 سفر میں ہو اور نہ پاؤ کوئی لکھنے والا تو گرد ہاتھ میں رکھنی چاہئے پھر اگر اعتبار کرے ایک دوسرے
 بَعْضًا فَلْيُؤَدِّ الَّذِي فِي أَيْمَانَتِهِ أَمَانَتَهُ وَلْيَسْتَقِ اللَّهَ رَبَّهُ وَلَا تَكْتُمُوا
 کا تو چاہئے کہ پورا کرے وہ شخص کہ جس پر اعتبار کیا اپنی امانت کو اور اگر ڈارے اللہ سے جو رب اسکا اور مست چھوڑ
 الشَّهَادَةَ وَمَنْ يَكْتُمْهَا فَإِنَّهُ آثِمٌ قَلْبُهُ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ عَلِيمٌ ﴿۳۹﴾
 گواہی کو اور جو شخص اس کو چھپا دے تو بے شک گنہگار ہو دل اس کا اور اللہ تمہارے کاموں کو خوب جانتا ہے

خلاصہ تفسیر

اسے ایمان والوں جب معاملہ کرنے لگو اور عوار کا رخوہ دام اور عوار ہوں یا جو چیز خریدنا ہے
 دو ادھار ہو جیسے بیع سلم میں ایک میعاد معین تک (کے لئے) تو اس کی یادداشت و دستاویز
 کو لکھ لیا کرو اور یہ ضرور ہے کہ تمہارے آپس میں (جو کوئی لکھنے والا ہو وہ) انصاف کے ساتھ
 لکھے یعنی کسی کی رعایت کر کے مضمون میں کی بیشی نہ کرے اور لکھنے والا لکھنے سے انکار بھی نہ کرے
 جیسا کہ خدا نے اس کو دکھانا سکھایا ہے اس کو چاہئے کہ لکھ دیا کرے اور (کاتب کو) وہ شخص
 (بتلا دے اور) لکھو دے جس کے ذمہ وہ حق واجب ہو کہ وہ دستاویز کا حاصل اقرار حق کا ہوتا
 ہے تو جس کے ذمہ حق ہے اسی کا اقرار ضرور پھر (اور) لکھاتے وقت اللہ تعالیٰ سے جو اس کا
 پروردگار ہے ڈرتا رہے اور اس (حق) میں سے ذرہ برابر (بتلانے میں) کمی نہ کرے پھر جس شخص کے
 ذمہ حق واجب تھا وہ اگر ضعیف العقل (یعنی معترہ یا مجنون) ہو یا ضعیف البدن (یعنی نابالغ یا
 پیر فرقت) ہو یا (اور کسی اتفاقی امر سے) خود دیوانہ کرنے کی اور) لکھانے کی قدرت نہ رکھتا ہو
 مثلاً مگر گناہ ہے اور لکھنے والا اس کا اشارہ نہیں سمجھتا یا مثلاً دوسرے مالک کا رہنے والا ہو اور
 زبان غیر رکھتا ہے اور لکھنے والا اس کی بولی نہیں سمجھتا تو (ایسی حالت میں) اس کا کارکن

ٹھیک ٹھیک طور پر لکھوائے اور دو شخصوں کو اپنے مردوں میں سے گواہ (بھی) کر لیا کہ درود شرعی اصل دار ثبوت دعویٰ کا یہی گواہ ہیں گو دستاویز نہ ہو اور خالی دستاویز بدو گواہوں کے لیے معاملات میں حجت اور معتبر نہیں دستاویز بکھنا صرف یادداشت کی آسانی کے لیے رہے کہ اس کا مضمون دیکھ کر اور منکر طبعی طور پر اکثر تمام واقعہ یاد آجاتا ہے، جیسا عنقریب قرآن ہی میں آتا ہے) پھر اگر وہ دو گواہ مرد (میسٹر) نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں (گواہ بنالی جائیں) ایسے گواہوں میں سے جن کو تم (ان کے معتبر ہونے کی وجہ سے) پسند کرتے ہو (اور ایک مرد کی جگہ دو عورتیں اس لیے تجویز کی گئیں) تاکہ ان دونوں عورتوں میں سے کوئی ایک بھی (شہادت کے کسی حصہ کو خواہ وہ سے یا شہادت کے وقت بیان کرنے سے) بھول جائے تو ایک دوسری کو یاد دلادے، اور یاد دلانے کے بعد شہادت کا مضمون مکمل ہو جائے) اور گواہ بھی انکار نہ کیا کریں جب (گواہ بننے کے لیے) بلائے جایا کریں (کہ اس میں اعانت ہے اپنے بھائی کی) اور تم اس (دین) کے (بار بار) لکھنے سے آگاہ مسکرت و خواہ وہ (معاملہ دین کا) چھوٹا ہو یا بڑا ہو، یہ لکھ لینا انصاف کا زیادہ قائم رکھنے والا ہے اللہ کے نزدیک اور شہادت کا زیادہ درست رکھنے والا ہے اور زیادہ سزا دار ہے اس بات کا کہ تم (معاملہ کے متعلق) کسی شبہ میں نہ پڑو (اس لئے لکھ ہی لینا اچھا ہے) مگر یہ کہ کوئی سودا دست بدست ہو جس کو باہم لیتے دیتے ہو تو اس کے نہ لکھنے میں تم پر کوئی الزام (اور مضرت) نہیں اور راتنا اس میں بھی ضرور کیا کر دو کہ اس کے خرید و فروخت کے وقت گواہ کر لیا کرو (شاید کل کو کوئی بات نکل آئے مثلاً بائع کہنے لگے کہ مجھ کو دام ہی وصول نہیں ہوئے، یا یہ چیز میں نے فروخت ہی نہیں کی، یا مشتری کہنے لگے کہ میں نے تو دام ہی کا اختیار بھی لے لیا تھا یا ابھی تو بیع پوری میرے پاس نہیں پہنچی) اور جس طرح ہم نے اوپر کاتب اور گواہ کو منع کیا ہے کہ کتابت اور شہادت سے انکار نہ کریں اسی طرح ہم تم کو بھی تاکید کرتے ہیں کہ تمھاری طرف سے کسی کاتب کو تکلیف نہ دی جائے اور نہ کسی گواہ کو (مثلاً اپنی مصلحت کے لئے ان کی کسی مصلحت میں خلل ڈالاجائے) اور اگر تم ایسا کر دو گے تو اس میں تم کو گناہ ہوگا اور خدا تعالیٰ سے ڈرو اور جن کاموں سے اس نے منع کیا ہے وہ مت کرو اور اللہ تعالیٰ (کا تم پر احسان ہے کہ تم کو احکام مفیدہ کی) تعلیم فرماتا ہے اور اللہ تعالیٰ سب چیزوں کے جاننے والے ہیں تو وہ مطیع اور عاصی کو بھی جانتے ہیں ہر ایک کو مناسب جزا دیں گے) اور اگر تم (دین کا معاملہ کرانے کے وقت) کہیں سفر میں ہو اور (دستاویز لکھنے کے واسطے وہاں) کوئی کاتب نہ پاؤ سو ایسی حالت میں اطمینان کا ذریعہ (دین رکھنے کی چیزیں) ہیں جو (مدیون کی طرف سے مستحب حق کے) قبضہ میں دیدی جائیں اور اگر (ایسے وقت میں بھی) ایک دوسرے کا اعتبار کرتا ہو

(اور اس لئے دین کی ضرورت نہ رہے) تو جس شخص کا اعتبار کر لیا گیا ہے (یعنی مدیون) اس کو چاہئے کہ دوسرے کا حق (پرورا پرورا) ادا کر دے اور اللہ تعالیٰ سے جو اس کا پروردگار ہے ڈرے (اور اس کا حق نہ مارے) اور شہادت کا اخفاء مست کرد اور جو شخص اس کا اخفاء کرے گا اس کا قلب گنہگار ہوگا، اور اللہ تعالیٰ تمھارے کئے ہوئے کاموں کو خوب جانتے ہیں (سو اگر کوئی اخفاء کرے گا اللہ تعالیٰ کو اس کا علم ضرور ہے سو وہ سزا دیں گے)۔

معارف و مسائل

قرض اور ادھار کے لئے اقرارنامہ | آیات مذکورہ میں قانون معاملات جن کو آجکل کے قانون لکھنے کی ہدایت اور متعلقہ احکام میں معاہدات کہا جاتا ہے اس کے اہم اصول کا بیان ہے اور اس کے بعد ضابطہ شہادت کے خاص اصول کا ذکر ہے۔

آجکل تو زمانہ لکھنے لکھانے کا ہے، اور تحریر ہی انسان کی زبان کی قائم مقام بن گئی ہے، لیکن آپ چودہ سو سال پہلے زمانہ کی طرف مڑ کر دیکھتے تو اس وقت دنیا کا سب کاروبار صرف زبانی ہوتا تھا، لکھنے لکھانے اور دستاویز بنایا کرنے کا اصول نہ تھا، سب سے پہلے قرآن نے اس طرف توجہ دلائی اور منسرایا:

إِذَا اشْتَرَيْتُمْ مِنْ بَنِي إِسْرَائِيلَ شَيْئًا فَاطْلُبُوا فِي شَهَادَتِهِمْ وَأَنْتُمْ فِي أَعْيُنِهِمْ، یعنی جب تم آپس میں ادھار کا معاملہ کیا کرو کسی معین مدت کے لئے تو اس کو لکھ لیا کرو۔ اس میں ایک اصول قویہ بتلا دیا کہ ادھار کے معاملات کی دستاویز لکھنی چاہئے، تاکہ بھول چوک یا انکار کے وقت کام آئے۔

دوسرا مسئلہ یہ بیان نشرایا گیا کہ ادھار کا معاملہ جب کیا جائے تو اس کی میعاد ضرور مقرر کی جائے، طر معین مدت کے لئے ادھار دینا لینا جائز نہیں، کیونکہ اس سے جھگڑے فساد کا دروازہ کھلتا ہے، اسی وجہ سے فقہاء نے فرمایا کہ میعاد بھی ایسی معسر ہونا چاہئے جس میں کوئی ابھام نہ ہو، عینہ اور تاریخ کے ساتھ معین کی جائے، کوئی مبہم میعاد نہ رکھیں، جیسے کہیتی کھٹے کے وقت، کیونکہ وہ موسم کے اختلاف سے آگے پیچھے ہو سکتا ہے، اور چونکہ لکھنا اس زمانے میں عام نہ تھا، اور آج بھی عام ہونے کے بعد دنیا کی بیشتر آبادی دیہی ہے جو لکھنا نہیں جانتی تو یہ ممکن تھا کہ لکھنے والا کچھ کا کچھ لکھ دے جس سے کسی کا نفع اور کسی کا نقصان ہو جائے، اس لئے اس کے بعد ارشاد فرمایا:

وَلِكَيْلَا يَأْثَبَ الْفَاكِرَ مِنْكُمْ شَيْئًا، یعنی یہ ضروری ہے کہ تمھارے درمیان کوئی لکھنے

والا انصاف کے ساتھ لکھے۔

اس میں ایک تو اس طرف ہدایت کی گئی کہ کاتب کسی فریق کا مخصوص آدمی نہ ہو، بلکہ غیر جانبدار ہو، تاکہ کسی کو شبہ اور غلبان نہ رہے، دوسرے کاتب کو ہدایت کی گئی کہ انصاف کے ساتھ لکھے، دوسرے کے فانی نفع کے لئے اپنا دائمی نقصان نہ کرے، اس کے بعد کاتب کو اس کی ہدایت کی گئی کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو یہ ہنر دیا ہے کہ وہ کچھ لکھ سکے ہے اس کا شکر ادا یہ ہے کہ وہ لکھنے سے انکار نہ کرے۔

اس کے بعد یہ بتلایا گیا کہ دستاویز کی کتابت کس کی طرف سے ہو تو فرمایا: **وَلْيُسْئَلْ اَلَّذِي مَعْلُومٌ اَلْحَقُّ**، یعنی لکھوادے وہ آدمی جس کے ذمہ حق ہے، مثلاً سزا خریدا اور قیمت کا ادھار کیا تو جس شخص کے ذمہ ادھار ہے وہ دستاویز کا مضمون لکھوانے کیونکہ یہ اس کی طرف سے اقرار نامہ ہوگا، اور لکھوانے میں بھی یہ احتمال تھا کہ کوئی کمی بیشی کر دے، اس لئے فرمایا: **وَلَا يَتَّبِعْ اَنفُسَهُ وَلَا يَتَّبِعْ مَنَّهُ مَشِئَةً**، یعنی اللہ تعالیٰ سے جو اس کا پروردگار ہے ڈرتا ہے اور حق کے لکھوانے میں ذرہ برابر کمی نہ کرے، معاملات میں کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ جس شخص پر حق ماند ہو وہ خیف لعل یا سٹھیا ہوا بوڑھا یا نابالغ بچہ یا گویا ہو یا کوئی دوسری زبان بولنے والا ہو جس کو کاتب نہیں سمجھتا، اس لئے دستاویز لکھوانے پر اس کو قدرت نہیں ہوتی اس لئے اس کے بعد فرمایا کہ اگر ایسی صورت پیش آئے تو ان کی طرف سے ان کا دلی لکھوادے مجنون اور نابالغ کی طرف سے تو دلی کا ہونا ظاہر ہے کہ ان کے سامنے معاملات ولی ہی کی معرفت ہوا کرتے ہیں، اور اگر گھٹے یا دوسری زبان بولنے والے کا دلی بھی یہ کام کر سکتا ہے، اور اگر وہ کسی کو اپنا وکیل بنائے تو بھی ہو سکتا ہے، قرآن میں اس جگہ لفظ ولی دونوں معنی پر حاوی ہے۔

مضابطہ شہادت کے یہاں تک معاملات میں دستاویز لکھنے اور لکھوانے کے اہم اصول کا بیان تھا آگے یہ بتلایا گیا کہ دستاویز کی صورت تحریر کو کافی نہ سمجھیں، بلکہ اس پر گواہ بھی بنالیں کہ اگر کسی وقت باہمی نزاع پیش آجائے تو عدالت میں ان گواہوں کی گواہی سے فیصلہ ہو سکے، یہی وجہ ہے کہ فقہاء رحمہم اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ محض تحریر حجت شرعی نہیں جب تک کہ اس پر شہادت شرعی موجود نہ ہو خالی تحریر پر کوئی فیصلہ نہیں کیا جاسکتا، آجکل کی عام عدالتوں کا بھی یہی دستور ہے کہ تحریر پر زبانی تصدیق و شہادت کے بغیر کوئی فیصلہ نہیں کر رہیں۔

گواہی کیلئے دو مرد یا ایک مرد اور دو عورتیں ہونا ضروری ہیں، مثلاً (۱) گواہ دو مرد یا ایک مرد و دو عورتیں ہونا ضروری ہیں، ایک

اکیلہ مرد یا صرف دو عورتیں عام معاملات کی گواہی کے لئے کافی نہیں۔

گواہوں کی شرائط (۲) دوسرے یہ کہ گواہ مسلمان ہوں، لفظ میں تو جائز ہے اس کی طرف ہدایت کی گئی ہے (۳) تیسرے یہ کہ گواہ ثقہ اور عادل ہوں جن کے قول پر اعتماد کیا جاسکے، فاسق و فاجر نہ ہوں، **وَالَّذِينَ تَزَوَّجْتُمْ مِّنْ اَشْهُقَاتِ** میں یہ حکم مذکور ہے۔

گواہی دینے سے بعد مذکورہ شرائط اس کے بعد لوگوں کو یہ ہدایت کی گئی کہ جب ان کو کسی معاملہ میں گواہ انکار کرنا گناہ ہے، بنانے کے لئے بلایا جائے تو وہ آنے سے انکار نہ کریں، کیونکہ شہادت

ہیں احیائے حق کا ذریعہ اور جھگڑے چکانے کا طریقہ ہے، اس لئے اس کو اہم قومی خدمت سمجھ کر تکلیف برداشت کریں، اس کے بعد پھر معاملات کی دستاویز لکھنے کی تاکید کرتے ہوئے فرمایا کہ معاملہ چھوٹا ہو یا بڑا سب کو لکھنا چاہئے، اس میں اکساتیں نہیں، کیونکہ معاملات کا قلب بند کر لینا انصاف کو قائم رکھنے اور صحیح شہادت دینے اور شک و شبہ سے بچنے کے لئے بہترین ذریعہ ہے، ہاں اگر کوئی معاملہ دست بدست ہو اور عارضہ ہو اس کو اگر نہ لکھیں تب بھی کچھ حرج نہیں مگر اتنا اس میں بھی کیا جائے کہ معاملہ پر گواہ بنالیں کہ شاید کسی وقت فریقین میں کوئی نزاع و اختلاف پیش آجائے، مثلاً بائع کہے کہ قیمت وصول نہیں ہوئی، یا مشتری کہے کہ مجھے بیعہ پوری وصول نہیں ہوئی، تو اس جھگڑے کے فیصلہ میں شہادت کام آئے گی۔

اسلام میں صلہ و انصاف قائم کرنے کا اہم اصول آیت کے شروع میں لکھنے والوں کو یہ ہدایت دی گئی ہے کہ وہ لکھنے یا شہادہ بننے سے

انکار نہ کریں، تو یہاں یہ احتمال تھا کہ لوگ ان کو پریشان کریں گے، اس لئے آخر آیت میں فرمایا **وَلَا يَتَّبِعْ اَنفُسَهُ وَلَا يَتَّبِعْ مَنَّهُ مَشِئَةً**، یعنی کسی لکھنے والے یا گواہی دینے والے کو نقصان نہ پہنچایا جائے، یعنی ایسا نہ کریں کہ اپنی مصلحت اور فائدہ کے لئے ان کی مصلحت اور فائدہ میں خلل ڈالیں پھر فرمایا **وَاِنْ كُنْتُمْ اَوْفَاكُم مَّقْصُودًا**، یعنی اگر تم نے لکھنے والے یا گواہ کو نقصان پہنچایا تو اس میں تم کو گناہ ہوگا۔

اس سے معلوم ہوا کہ لکھنے والے یا گواہ کو نقصان پہنچانا حرام ہے، اسی لئے فقہائے فرمایا کہ اگر لکھنے والا اپنے لکھنے کی مزدوری مانگے یا گواہ اپنی آمد و رفت کا ضروری خرچ طلب کرے تو یہ اس کا حق ہے، اس کو ادا نہ کرنا بھی اس کو نقصان پہنچانے میں داخل اور ناجائز ہے، اسلام نے اپنے نظام عدالت میں جس طرح گواہ کو گواہی دینے پر مجبور کیا ہے، اور گواہی چھپانے کو سخت گناہ قرار دیا ہے، اس طرح اس کا بھی انتظام کیا کہ لوگ گواہی سے بچنے پر مجبور نہ ہو جائیں، اسی دو طرفہ احتیاط کا یہ اثر تھا کہ ہر معاملہ میں سچے بے غرض گواہ

دل جاتے اور فیصلے جلد اور آسان حق کے مطابق ہو جاتے آج کی دنیا نے اس فستراکی اصول کو نظر انداز کر دیا ہے تو سارا نظام عدالت برباد ہو گیا، واقعہ کے اصل اور سچے گواہ ملنا تقریباً مفقود ہو گیا ہر شخص گواہی سے جان چرانے پر مجبور ہو گیا، وجہ یہ کہ جس کا نام گواہی میں آ گیا اگر معاملہ پولیس اور فوجداری کا ہے تو روز وقت بے وقت تھا نیدار صاحب اس کو بلا بھیجتے ہیں، اور بعض اوقات گفتگوں جمعہ سے رکھتے ہیں، دیوانی عدالتوں میں بھی گواہ کے ساتھ ایسا معاملہ کیا جاتا ہے جیسے یہ کوئی مجرم ہے، پھر روز روز مقدمہ کی پیشیاں بدلتی ہیں، تاریخیں لگتی ہیں، گواہ بچارہ اپنا کاروبار اور مزدوری اور ضروریات چھوڑ کر آنے پر مجبور ہو، درندہ وارنٹ کے ذریعہ گرفتار کیا جاتا اس لئے کوئی شریف کاروباری آدمی کسی معاملہ کا گواہ بننا اپنے لئے ایک مذاب سبھے اور مقدمہ اس سے بچنے پر مجبور کر دیا گیا، صرف پیشہ ور گواہ ملتے ہیں، جن کے ہاں جھوٹ سچ میں کوئی امتیاز نہیں ہوتا، فستراک حکیم نے ان بنیادی ضروریات کو اہمیت کے ساتھ بتلا کر ان تمام خرابیوں کا انسداد فرمایا، آیت کے آخر میں ارشاد ہے: **وَاتَّقُوا اللَّهَ وَيَعْلَمَ كُفْرُ اللَّهِ قَدْ عَلِمَ كُلُّ يَوْمٍ تَكْلِيمًا** یعنی ڈرو اللہ سے، اور اللہ تعالیٰ تمہیں اصول صحیح کی تعلیم دیتا ہے (یہ اس کا احسان ہے) اور اللہ تعالیٰ ہر چیز کا جاننے والا ہے، چونکہ اس آیت میں بہت سے احکام آئے ہیں، بعض فقہاء نے میں اہم مسائل فقہی اس آیت سے نکالے ہیں، اور فستراک کریم کی عام عادت ہو کہ قانون بیان کرنے سے آگے اور پیچھے خوب خدا اور خوب روز جزاء دلا کر لوگوں کے ذہنوں کو تعمیل حکم کے لئے آمادہ کرتا ہے، اسی طریقہ کے مطابق اس آیت کا خاتمہ خوب خداوندی پر کیا اور یہ بتلایا کہ اللہ تعالیٰ پر کوئی جیسز چسپی ہوئی نہیں، اگر تم کسی ناجائز حیلہ سے بھی کوئی خلافت درزی کرو گے تو خدا کو دھوکہ نہیں دے سکتے۔

دوسری آیت میں دو اہم مضمون بیان فرمائے گئے، ایک یہ کہ اُدھار کے معاملہ میں اگر کوئی یہ چاہے کہ اعشار کے لئے کوئی جیسز گردی رکھ لے تو اس کی بھی اجازت ہے، مگر اس میں لفظ مقبوضۃ سے اس طرف اشارہ پایا جاتا ہے کہ شے مرہون سے نفع اٹھانا اس کے لئے جائز نہیں، مگر جن کو صرف اتنا حق ہے کہ اپنے قرض وصول ہونے تک اس کی چیز پر اپنا قبضہ رکھے، اور منافع اس کے وہ سب اصل مالک کا حق ہیں۔

دوسرا مضمون یہ ارشاد فرمایا کہ جس شخص کو کسی نزاعی معاملہ کا صحیح علم ہو وہ شہادت کو نہ چھپائے، اور اگر اس نے چھپایا تو اس کا دل گہنگار ہے، دل کو اس لئے گہنگار نہ لایا کہ کوئی شخص اس کو خالی زبان ہی کا گناہ نہ سمجھے کیونکہ اقل ارادہ تو دل ہی سے ہوا ہے، اس لئے اول گناہ دل ہی کا ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ مَا فِى الْاَرْضِ وَ اِنْ تَبَدَّلَ مَا فِى الْاَرْضِ ثَمَرًا

اللہ ہی کا ہے جو کچھ کہ آسمانوں اور زمین میں ہے اور اگر ظاہر کرو گے اپنے جی کی بات

اَوْ ثَمَرًا يَّحَاسِبُكُمْ بِهٖ اللّٰهُ فَيُخَفِّضُ لِمَنْ يَّشَاءُ وَ يَرْفَعُ لِمَنْ يَّشَاءُ

یا چھپاؤ گے اس کو حساب لے گا اس کا تم سے اللہ پھر نیچے گا جس کو چاہے اور مڑا کرے گا جس کو

يَّشَاءُ ۚ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ

چاہے اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

خلاصہ تفسیر

اللہ ہی کی ملک میں ہیں سب (مخلوقات)، جو کچھ آسمانوں میں ہیں اور جو کچھ زمین میں ہیں، (جیسے خود زمین و آسمان بھی اسی کی ملک میں ہیں) اور جب وہ مالک ہیں تو ان کو اپنی ملک و اشیاء میں ہر طرح قانون بنانے کا حق ہے، اس میں کسی کو مجال کلام نہ ہونی چاہئے، جیسا کہ ایک قانون یہ ہے کہ، جو باتیں عقائد فاسدہ یا اخلاق مذمومہ یا گناہوں پر بوجہ عزم و ارادہ کی، تمہارے نفسوں میں ہیں ان کو اگر تم زبان و جوارح سے ظاہر کرو گے (مثلاً زبان سے کلمہ کفر کہہ دیا یا اپنے منکر، حسد وغیرہ کا خود اظہار کر دیا یا کسی گناہ جس کا قصد تھا اس کو کفر ہی ڈالا) یا کہ (دل ہی میں) پوشیدہ رکھو گے (دونوں حالتوں میں) حق تعالیٰ تم سے (مثلاً دوسرے معاصی کے ان کا) حساب لیں گے پھر (حساب لینے کے بعد پھر کفر و شرک کے) جس کے لئے (بخشنا) منظور ہوگا بخش دیں گے اور جس کو سزا دینا منظور ہوگا سزا دیں گے اور اللہ تعالیٰ ہر شے پر پوری قدرت رکھنے والے ہیں۔

معارف و مسائل

پہلی آیت میں شہادت کے اہلکار کا حکم اور چھپانے کی ممانعت مذکور تھی یہ آیت بھی اسی مضمون کا تکرار ہے۔ انسان کو متنبہ کیا گیا ہے کہ شہادت کا چھپانا حرام ہے، اگر تم نے معاملہ کو جاننے ہوئے چھپایا تو رب علیم و خیر تم سے اس کا حساب لے گا، حضرت ابن عباسؓ، عکرمہؓ، شعبیؓ اور مجاہدؓ سے یہی تفسیر منقول ہے (قرطبی)۔

اور علوم الفاظ کے اعتبار سے عام ہے، اور تمام اعتقادات، عبادات اور معاملات کو شامل ہے، حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا مشہور قول اس آیت کی تفسیر میں بھی ہوا اور معنی آیت

کے یہ ہیں کہ حق تعالیٰ اپنی مخلوق کے تمام اعمال کا محاسبہ فرمائیں گے، وہ عمل بھی جس کو وہ کر گزرے ہیں اور وہ بھی جن کا دل سے بچتہ ارادہ کر لیا، اور اس کو دل میں چھپا کر رکھا، مگر عمل کی نوبت نہیں آئی، جیسا کہ صحیح بخاری و مسلم میں بروایت حضرت ابن عمر منقول ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ مومن قیامت کے روز اپنے رب کے جل و عل سے قریب کیا جائے گا یہاں تک کہ حق تعالیٰ اس کے ایک ایک گناہ کو یاد دلائیں گے، اور سوال کریں گے کہ تو جانتا ہے کہ تو نے یہ گناہ کیا تھا، بندہ مومن اقرار کرے گا، حق تعالیٰ فرمائیں گے کہ میں نے دنیا میں بھی تیری پردہ پوشی کی، اور تیرا گناہ لوگوں میں ظاہر نہیں ہونے دیا، اور میں آج اس کو معاف کرتا ہوں، اور حسنات کا اعمال نامہ اس کو دیدیا جائے گا، لیکن کفار اور منافقین کے گناہوں کو مجھ نام میں بیان کیا جائے گا۔

اور ایک حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے روز فرمائے گا کہ یہ وہ دن ہے جس میں پرشیدہ چیزوں کا جائزہ لیا جائے گا، اور دلوں کے پرشیدہ راز کھولے جائیں گے، اور یہ میرے کاتب اعمال فرشتوں نے تو تمہارے صریح وہ اعمال لکھے ہیں جو ظاہر تھے، اور میں ان چیزوں کو بھی جانتا ہوں جن پر فرشتوں کو اطلاع نہیں، اور نہ انھوں نے وہ چیزیں تمہارے نامہ اعمال میں لکھی ہیں، اور اب وہ سب تمہیں بتلاتا ہوں، اور ان پر محاسبہ کرتا ہوں، پھر جس کو چاہوں گا بخش دوں گا اور جس کو چاہوں گا عذاب دوں گا، پھر مومنین کو معاف کر دیا جائے گا اور کفار کو عذاب دیا جائے گا۔ (قرطبی)

یہاں پر شبہ ہو سکتا ہے کہ حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے۔

إِنَّ اللَّهَ حَيٌّ وَرَعْنُ أَعْمَى عَمَّا

خَفَتْ أَنْفُسُهُمَا مَا لَمْ يَكْتُبُوا

أَوْ يَكْتُبُوا بِهِ (قرطبی)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دل کے ارادہ پر کوئی عذاب و عتاب نہیں، اور تمام قرطبی نے فرمایا کہ یہ حدیث احکام دنیا کے متعلق ہے، طلاق، حلق، تیغ، تہہ وغیرہ محض دل میں ارادہ کر لینے سے منع نہیں ہو جاتے، جب تک ان کو زبان سے یا عمل سے نہ کیا جائے، اور آیت میں جو کچھ مذکور ہے احکام آخرت سے متعلق ہے، اس لئے کوئی تنازعہ نہیں، اور دوسرے حضرات علماء نے اس شبہ کا جواب یہ دیا ہے کہ جس حدیث میں دل کی چھپی ہوئی چیزوں کی معافی مذکور ہے اس سے مراد وہ رساوس اور غیر اختیاری خیالات ہیں جو انسان کے دل میں بغیر قصد و ارادہ کے آجاتے ہیں، بلکہ ان کے خلاف ارادہ کرنے پر بھی وہ آتے رہتے ہیں، ایسے غیر

اختیاری خیالات اور رساوس کو اس امت کے لئے حق تعالیٰ نے معاف کر دیا ہے، اور آیت مذکور میں جس محاسبہ کا ذکر ہے اس سے مراد وہ ارادے اور نیتیں ہیں جو انسان اپنے قصد و اختیار سے اپنے دل میں جانتا ہے، اور اس کے عمل میں لانے کی کوشش بھی کرتا ہے، پھر اتفاق سے کچھ موافق پیش آنے کی بنا پر ان پر عمل نہیں کر سکتا، قیامت کے دن ان کا محاسبہ ہوگا پھر حق تعالیٰ جس کو چاہیں اپنے فضل و کرم سے بخش دیں، جس کو چاہیں عذاب دیں، جیسا کہ مذکورہ حدیث بخاری و مسلم میں گلد چکا ہے، اور چونکہ آیت مذکورہ کے ظاہری الفاظ میں دو قسم کے خیالات داخل ہیں خواہ اختیاری ہوں یا غیر اختیاری، اس لئے جب یہ آیت نازل ہوئی تو صحابہ کرام کو سخت فکر و غم لاحق ہو گیا، کہ اگر غیر اختیاری خیالات و رساوس پر بھی مواخذہ ہونے لگا تو کون نجات پائے گا، صحابہ کرام نے اس فکر کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا، تو آپ نے سب کو یہ تلقین فرمائی کہ جو کچھ حکم ربانی نازل ہوا اس کی تعمیل و اطاعت کا پختہ قصد کرو اور کہو: سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا، یعنی ہم نے حکم سن لیا اور تعمیل کی، صحابہ کرام نے اس کے مطابق کیا اور اس پر یہ جملہ قرآن کا نازل ہوا: لَا يَخْلِفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وَشَعَهَا، یعنی اللہ تعالیٰ کسی شخص کو اس کی قدرت سے زائد تکلیف نہیں دیتا۔

جس کا حاصل یہ ہے کہ غیر اختیاری رساوس اور خیالات پر مواخذہ نہیں ہوگا، اس پر صحابہ کرام کا اطمینان ہو گیا، یہ حدیث صحیح مسلم میں بروایت ابن عباس نقل کی گئی ہے (قرطبی) یہ پوری آیت آگے آرہی ہے۔

اور تفسیر مظہری میں ہے کہ انسان پر جو اعمال اللہ تعالیٰ کی طرف سے فرض کئے گئے ہیں یا حرام کئے گئے ہیں وہ کچھ تو ظاہری اعضاء و جوارح سے متعلق ہیں، نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج اور تمام معاملات اسی قسم میں داخل ہیں، اور کچھ اعمال و احکام وہ بھی ہیں جو انسان کے قلب اور باطن سے تعلق رکھتے ہیں، ایمان و اعتقاد کے تمام مسائل تو اسی میں داخل ہیں، اور کفر و شرک جو سب سے زیادہ حرام و ناجائز ہیں ان کا تعلق بھی انسان کے قلب سے ہی ہے، اخلاق و صفات، معتبر، قناعت، سخاوت وغیرہ، اسی طرح اخلاق رذیلہ کبر، حسد، بغض، حسد و نیاہرین وغیرہ سب چیزیں ایک درجہ میں حرام قلعی ہیں، ان سب کا تعلق بھی انسان کے اعضاء و جوارح سے نہیں بلکہ دل سے اور باطن سے ہے۔

اس آیت میں ہدایت کی گئی ہے کہ جس طرح اعمال ظاہرہ کا حساب قیامت میں لیا جائے اسی طرح اعمال باطنہ کا بھی حساب ہوگا، اور خطا پر بھی مواخذہ ہوگا، یہ آیت سورہ بقرہ کے اخیر میں لائی گئی، اس میں بڑی حکمت ہے، کیونکہ سورہ بقرہ شتران کریم کی ایسی بڑی اور ہم سورہ

ہے جس میں احکام الہیہ کا بہت بڑا حصہ آگیا ہے، اس سورۃ میں اصولی اور فردی معاش و معاد کے متعلق اہم ہدایات، نماز، زکوٰۃ، روزہ، قصاص، حج، جہاد، طہارت، طلاق، عدت، خلع، رضاعت، حرمت شراب، ربا اور قرض، الین دین کے جائز و ناجائز طریقوں کا تفصیل بیان آگیا ہے، اسی لئے حدیث میں اس سورت کا نام تسام العتران بھی آیا ہے، یعنی مستران کا سبک بلند حصہ، اور ان تمام احکام کی تعمیل میں سب کی روح اخلاص ہے، یعنی کسی کام کو کرنا یا اس سے بچنا دونوں خالص اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کے لئے ہوں، ان میں نام و نمود و یاد و سسری نفسانی اغراض شامل نہ ہوں، اور یہ ظاہر ہے کہ اخلاص کا تعلق اللہ کے باطن اور قلب سے ہے سب کی درستی اسی پر موقوف ہے، اس لئے سورت کے آخر میں اس آیت کے ذریعہ انسان کو تنبیہ کر دی گئی کہ فرائض کی ادائیگی یا محرمات سے پرہیز کے معاملہ میں مخلوق کے سامنے توجیل جوئی کے ذریعہ بھی راہ فرار اختیار کی جاسکتی ہے، مگر حق تعالیٰ عظیم و خیر ہے، اس سے کوئی چیز بھی مخفی نہیں، اس لئے جو کچھ کرے یہ سمجھ کر کرے کہ رقیب حفظ میرے سب ظاہری اور باطنی حالات کو لکھ رہا ہے، اور سب کا حساب قیامت کے روز دینا ہے، یہی وہ روح ہے جو قرآن مجید انسانوں میں پیدا کرتا ہے کہ ہر قانون کے اول یا آخر میں خوب خدا اور فکر آخرت کا ایسا محاذ نظر ان کے قلوب پر ٹھاتا ہے کہ وہ راست کی اندھیری میں اور خلوتوں میں بھی کسی حکم کی خلاف ورزی کرتا ہوا ڈرتا ہے۔

أَمَّا الرُّسُولُ فَمَا أُنْزِلَ إِلَيْهِ مِنْ رَبِّهِ وَالْمُؤْمِنُونَ لَمْ يَكُنْ أَمَّا

ان لیا رسول نے جو کچھ آتا اس پر اس کے رب کی طرف سے اور مسلمانوں نے بھی سب نے مانا

بِاللَّهِ وَمَلَائِكَتِهِ وَكُتُبِهِ وَرُسُلِهِ لَا نَقُولُ بَيْنَ يَدَيْهِ مِنْ

اللہ کو اور اس کے فرشتوں کو اور اسکی کتابوں کو اور اسکے رسولوں کو کہتے ہیں کہ ہم مجدا نہیں کرتے

رُسُلِهِ وَقَالُوا سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا إِنَّكَ رَبَّنَا وَرَبُّ كُلِّ الْمُسْلِمِينَ

کسی کو اس کے پیغمبروں میں سے اور کہہ اٹھے کہ ہم نے سنا اور قبول کیا تیری بخشش چاہتے ہیں اے ہمارے رب تیری ہی طرف سے نجات

لَا يَكْفُرُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا رُسْعًا ط لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ

اللہ تکلیف نہیں دیتا کسی کو مگر جس قدر اس کی گنجائش ہے، اسی کو ملتا ہے جو اس نے کیا اور اسی پر پڑتا ہے جو اس نے کیا

رَبَّنَا لَا تَزِدْنَا ظَنًّا أَنْ لَيْسَ نَا أَوْ أَخْطَا نَا رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَا

اے ہمارے رب نہ بکڑھ ہم کو اگر ہم بھولیں یا بچرکیں، اے رب ہمارے اور نہ دکھ ہم پر بوجھ

إِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهُ عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِنَا رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْنَا مَا لَا طَاقَةَ

بہاری جیسا رکھا تھا ہم سے اگلے لوگوں پر اے رب ہمارے اور نہ اٹھوا ہم سے وہ بوجھ کہ جس

لِنَا بِهٖ رَاحَةٌ رَاحَةٌ وَاعْفُ عَنَّا إِنَّكَ غَفُورٌ رَحِيمٌ أَنْتَ مَوْلَانَا فَانصُرْنَا

کی بکھڑاقت نہیں اور درگزر کر ہم سے اور بخشش ہو کہو اور رحم کر ہم پر تو ہی ہمارا رب ہر مدد کر ہماری

عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ ﴿۲۸۹﴾

کافروں پر

حُلاصۃ تفسیر

اعتقاد رکھنے میں رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) اس چیز کے حق ہونے کا جو آنگے پاس لکھ رہا

کی طرف سے نازل کی گئی ہے (یعنی قرآن) اور دوسرے) مؤمنین بھی (اس کا اعتقاد رکھتے ہیں،

آگے قرآن پر اعتقاد رکھنے کی تفصیل ہے کہ کس کس چیز کے عقیدہ رکھنے کو قرآن پر اعتقاد رکھنا

کہا جائے گا، سب کے سب (رسول بھی اور دوسرے مؤمنین بھی) عقیدہ رکھتے ہیں اللہ کے حق

کہ وہ موجود ہے اور واحد ہے اور ذات و صفات میں کامل ہے) اور اس کے فرشتوں کے ساتھ

کہ وہ موجود ہیں اور انہوں سے پاک ہیں اور مختلف کاموں پر مقرر ہیں، اور اس کی کتابوں کے ساتھ (کا اصل میں سب کچھ ہیں،

اور اس کے پیغمبروں کے ساتھ (کہ وہ پیغمبر ہیں اور کچھ ہیں اور پیغمبروں پر عقیدہ رکھنا ان کا اس طور پر ہے کہ کہتے ہیں کہ ہم

اس کے پیغمبروں میں سے کسی میں (عقیدہ رکھتے ہیں) تو فریق نہیں کرتے کہ کسی کو پیغمبر سمجھیں کسی کو

نہ سمجھیں) اور ان سب نے یوں کہا کہ ہم نے (آپ کا ارشاد) سنا اور (اس کو) خوشی سے مانا، ہم

آپ سے بھٹکنا چاہتے ہیں اے ہمارے پروردگار اور آپ ہی کی طرف (ہم سب کو) فتنہ ہے،

یعنی ہم نے جو پہلی آیت میں کہا ہے کہ نفوس کی پوشیدہ باتوں پر بھی محاسبہ ہو گا اس سے مراد

امور غیر اختیار دی نہیں بلکہ صرف امور اختیار دیہ ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ کسی کو احکام شرعیہ میں

مکلف نہیں بناتا یعنی ان امور کو واجب یا حرام نہیں فرماتا، مگر اسی کا جو اس کی طاقت اور

اختیار میں ہو اس کو ثواب بھی اسی کا ہوتا ہے جو ارادہ سے کرے اور اس پر عذاب بھی اسی کا ہو گا

جو ارادہ کرے اور جو وسوسہ سے باہر ہے اس کا مکلف نہیں کیا گیا اور جس کے ساتھ قصد اور

ارادہ متعلق نہیں اس کا نہ ثواب ہے نہ عذاب اور وسوسہ طاقت سے خارج ہیں تو ان کے آنے کو

حرام اور ان کے نہ آنے دینے کو واجب نہیں کیا، اور نہ ان پر عذاب رکھا، اے ہمارے رب

ہم پر وار نہ کر نہ فرما یہ اگر ہم بھول جاویں یا بچو کہ، جاویں، اے ہمارے رب (ہماری یہ بھی درگزر

ہے کہ حساب و کتاب اور جزاء و سزا اعمال اختیار کے ساتھ مخصوص میں انحال غیر اختیاریہ کا نہ انسان مکلف ہے نہ ان پر اس کو ثواب یا عذاب ہوتا ہے۔

اس طرح وہ انحال جن کا تعلق باطن یعنی دل کے ساتھ ہے ان کی بھی دو قسمیں ہیں ایک اختیاری ہے کفر و شرک کا عقیدہ جس کو قصد و اختیار کے ساتھ دل میں جمایا ہے، یا سوچ سمجھ کر ارادہ کے ساتھ اپنے آپ کو بڑا سمجھنا جس کو تکبر کہا جاتا ہے یا پختہ ارادہ کرنا کہ شراب پیوں گا، اور دوسرے غیر اختیاری، مثلاً بغیر قصد و ارادہ کے دل میں کسی بڑے خیال کا آجانا، ان میں بھی حساب و کتاب اور جزاء و سزا صرف اختیاری انحال پر ہو، غیر اختیاری پر نہیں۔

اس تفسیر سے جو خود قرآن نے بیان کر دی صحابہ کرام کو اطمینان ہو گیا کہ غیر اختیاری دسارے و خیالات کا حساب و کتاب اور ان پر عذاب و ثواب نہ ہوگا، اسی معنوں کو آخر میں اور زیادہ واضح کرنے کے لئے فرمایا ہے، لَا مَا كَسَبَتْ وَ عَلَيْهِمَا مَا آتَا كُتُبَهُنَّ، یعنی انسان کو ثواب بھی اس کام کا ہوتا ہے جو ارادہ سے کرے اور عذاب بھی اس کام پر ہوتا ہے جو ارادہ سے کرے۔

اور مراد یہ ہے کہ ابتداءً بلا واسطہ اس عمل کا ثواب یا عذاب ہوگا جو قصد و ارادہ سے کرے، کسی ایسے عمل کا ثواب و عذاب بلا واسطہ ہو جانا جس کا اس نے ارادہ نہیں کیا اس کے منافی نہیں، اس سے اس شبہ کا جواب ہو گیا کہ بعض اوقات آدمی کو بلا قصد و ارادہ بھی ثواب یا عذاب ہوتا ہے، جیسا کہ قرآن شریف کی دوسری آیات اور بہت سی روایات حدیث سے ثابت ہو کر جو آدمی کوئی ایسا نیک کام کرے جس سے دوسرے لوگوں کو بھی اس نیک کی توفیق ہو جائے تو جب تک لوگ یہ نیک کام کرتے رہیں گے اس کا ثواب اس پہلے دلے کو بھی ملتا رہے گا، اسی طرح اگر کسی شخص نے کوئی طریقہ گناہ کا جاری کیا تو آئندہ جتنے لوگ اس گناہ میں مبتلا ہوں گے اس کا وبال اس شخص کو بھی پہنچے گا جس نے اول یہ طریقہ جاری کیا تھا، اسی طرح روایات حدیث سے ثابت ہو کہ کوئی شخص اپنے عمل کا ثواب دوسرے آدمی کو دینا چاہے تو اس کو یہ ثواب پہنچتا ہے، ان سب صورتوں میں بغیر قصد و ارادہ کے انسان کو ثواب یا عذاب ہوتا ہے۔

اس شبہ کا جواب ہو کہ یہ ظاہر ہے کہ یہ ثواب عذاب بلا واسطہ اس کو نہیں پہنچتا، بلکہ درجہ کے واسطے سے پہنچتا ہے، اس کے علاوہ جو واسطہ بنا ہے اس میں اس کے لئے عمل اور اختیار کو بوجہ مل ضرور ہے، کیونکہ جس شخص نے کسی کا ایجا و کیا ہو اچھا یا بُرا طریقہ اختیار کیا اس میں پہلے شخص کے عمل اختیار کا دخل ضرور ہو اگرچہ اس نے اس خاص اثر کا ارادہ نہ کیا ہو، اس طرح کوئی کسی کو ایصالِ ثواب بھی کرتا ہے جب اس نے اس پر کوئی احسان کیا ہو، اس لحاظ سے یہ دوسرے کے

کے ذکر میں لایا گیا، اس کے بعد مؤمنین کے ایمان کا علیحدہ تذکرہ کیا گیا اس میں اشارہ ہے کہ اگرچہ نفسِ ایمان میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور سب سلطان شریک ہیں لیکن درجہ ایمان کے اعتبار سے ان دونوں میں بڑا فرق ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا علم مشاہدہ اور سماع کی بناء پر ہے، اور دوسرے مسلمانوں کا علم ایمان بالغیب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رویت کی بناء پر۔

اس کے بعد اس ایمان بھل کی تفصیل بتلائی جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور عام مؤمنین میں شریک تھا کہ وہ ایمان تھا اللہ تعالیٰ کے موجود اور ایک ہونے پر اور تمام صفات کاملہ کے ساتھ متصف ہونے پر، اور فرشتوں کے موجود ہونے پر، اور اللہ تعالیٰ کی کتابوں اور سب رسولوں کے سچے ہونے پر۔

اس کے بعد اس کی وضاحت فرمائی کہ اس امت کے مؤمنین پچھلی امتوں کی طرح ایسا نہ کریں گے کہ اللہ کے رسولوں میں باہمی تفرق ڈالیں کہ بعض کو نبی مانیں اور بعض کو نہ مانیں، جیسے یہود نے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور نصاریٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو نبی مانا مگر خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کو نبی نہ مانا، اس امت کی یہ درج فرمائی کہ یہ اللہ کے کسی رسول کا انکار نہیں کرتے اور پھر صحابہ کرام کے اس جملہ پر ان کی تعریف کی گئی، جو انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے موافق زبان سے کہا تھا، بِمَعْقَدَاتِ الْحَقِّ عَقْنِ اَقْلَقَ رَبَّنَا وَ كَيْفَ الْعَصِيَّةُ۔

اس کے بعد دوسری آیت میں ایک خاص انداز سے وہ شبہ دور کیا گیا جو پچھلی آیت کے بعض جملوں سے پیدا ہو سکتا تھا کہ دل میں چھپے ہوئے خیالات پر حساب ہو تو عذاب سے کیسے بچیں گے، ارشاد فرمایا لَا يَكْلِفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا، یعنی اللہ تعالیٰ کسی شخص کو اس کی طاقت سے زیادہ کام کا حکم نہیں دیتے، اس لئے غیر اختیاری طور پر جو خیالات دوسرے دل میں آجائیں اور پھر ان پر کوئی عمل نہ ہو تو وہ سب اللہ تعالیٰ کے نزدیک معاف ہیں، حساب اور مواخذہ صرف ان انحال پر ہوگا جو اختیار اور ارادہ سے کئے جائیں۔

تفصیل اس کی یہ ہے کہ جس طرح انسان کے اعمال و انحال جو ہاتھ ہر آنکھ اور زبان وغیرہ سے تعلق رکھتے ہیں جن کو اعمال ظاہرہ کہا جاتا ہے، ان کی دو قسمیں ہیں ایک اختیاری جو ارادہ اور اختیار سے کئے جاتیں، جیسے ارادہ سے بولنا، ارادہ سے کسی کو مارنا، دوسرے غیر اختیاری جو بلا ارادہ سرزد ہو جاتیں، جیسے زبان سے کہنا چاہتا تھا کچھ اور نکل گیا کچھ یا ریشہ سے بلا اختیار ہاتھ کی حرکت ہوئی، اس سے کسی کو تکلیف پہنچ گئی، ان میں سب کو معلوم

عمل کا ثواب و عذاب بھی درحقیقت اپنے ہی عمل کا ثواب یا عذاب ہے۔

بالکل اخیر میں قرآن کریم نے مسلمانوں کو ایک خاص دعا کی تلقین فرمائی جس میں بھول چوک اور بلا واسطہ خطا کسی فعل کے سرزد ہونے کی معافی طلب کیگی، فرمایا، رَبَّنَا لَا تُؤْخِذْنَا فِي شَيْءٍ نَّسِيْنَا وَلَا جَهْلًا نَّكَرْنَا ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ۔ پھر فرمایا رَبَّنَا لَا تُؤْخِذْنَا فِي شَيْءٍ نَّسِيْنَا وَلَا جَهْلًا نَّكَرْنَا ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ۔ یعنی اے ہمارے پروردگار ہم پر بھاری اور سخت اعمال کا بوجھ نہ ڈالنے جیسا ہم سے پہلے لوگوں (بنی اسرائیل) پر ڈالا گیا ہے، اور ہم پر ایسے فرائض عائد نہ فرما جسے جن کی ہم طاقت نہیں رکھتے۔

اس سے مراد وہ سخت اعمال ہیں جو بنی اسرائیل پر عائد تھے کہ کھڑا پانی سے پاک نہ ہو، بلکہ کاٹنا یا جلانا پڑے، اور قتل کے بغیر توبہ قبول نہ ہو، یا مراد یہ ہے کہ دنیا میں ہم پر عذاب نازل نہ کیا جائے جیسا کہ بنی اسرائیل کے اعمال بد پر کیا گیا، اور یہ سب دُعائیں حق تعالیٰ نے قبول فرمائے کا اظہار بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ کر دیا۔

سورۃ بقرہ تمام ہوئی و الحمد للہ و لا اُخر و دہا لہ و ہو المستعان

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ
۲۵ ذیقعدہ ۱۳۸۵ھ

دیباچہ طبع اول

اللہ تعالیٰ کا ہزاراں ہزار شکر ہے کہ معارف القرآن کی جلد اول جس میں سورۃ فاتحہ اور سورۃ بقرہ کی تفسیر پر عمل شائع ہو چکی ہے، اور بعد اللہ قرق سے زائد مقبولیت کے آثار محسوس کئے جاتے ہیں، اب اللہ تعالیٰ کے نام پر یہ جلد دوم طبع کی جا رہی ہے جس میں سورۃ آل عمران اور سورۃ نساء کی مکمل تفسیر ہے، تفسیر کی خصوصیت یہی ہیں جن کا ذکر پہلی جلد کے شروع میں کیا گیا ہے، البتہ جلد دوم میں بعض نئی چیزیں اور التزام کیا گیا جو اللہ اللہ فائدے کے لحاظ سے بہت اہم ثابت ہو گا۔

ایک نوید کہ زیر متن ترجمہ حضرت شیخ الہند کا پورا لے لیا گیا ہے، جو دراصل شاہ عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ کا ترجمہ ہے۔

دوسرے یہ کہ خلاصہ تفسیر میں اس کا التزام کیا گیا ہے کہ حضرت حکیم الامت تھانویؒ کی تفسیر "بیان العشر آئی" میں جو شروع میں خلاصہ تفسیر مختصر انداز میں پیش کیا گیا ہے اس کو پورا کا پورا لیا گیا ہے، البتہ اس خلاصہ میں جو جو مشکل الفاظ تھے ان کی تشریح اپنی عبارت میں کر دی گئی ہے۔ تیسرے یہ کہ اس خلاصہ تفسیر میں حضرت نے یہ التزام کیا ہے کہ ترجمہ تشریح کے ساتھ ہی کچھ الفاظ تفسیر کے بڑھا کر مختصر جامع تفسیر اس طرح لکھی ہے کہ اصل ترجمہ کے اوپر خط کھینچ کر ممتاز کر دیا ہے، اور تفسیری نوٹ کو بغیر خط کے بین القوسین لکھا ہے۔

اس طرح سے اس خلاصہ تفسیر میں پورا ترجمہ حضرت حکیم الامت کا بھی آگیا، اور مزوری تفسیر بھی، اس التزام کے ساتھ ناظرین "معارف القرآن" کے لئے دو مستند ترجمے مستقبل سامنے آجائیں گے ایک زیر متن ترجمہ حضرت شیخ الہند کا، دوسرا خلاصہ تفسیر کے ضمن میں حضرت حکیم الامت قدس سرہ کا باقی خصوصیات تفسیر وہی ہیں جو پہلی جلد میں ملحوظ رہی ہیں، واللہ المستعان و علیہ التکلان

بندہ محمد شفیع

دارالعلوم کراچی نمبر ۱۲

شعبان ۱۳۸۵ھ

یہ دوسرے ایڈیشن میں جلد اول کو بھی ان امور کے مطابق کیا گیا ہے، اس لئے یہ جلد دوم کی خصوصیات نہیں رہیں۔ اب معارف القرآن کی تمام جلدوں کا ایک ہی طرز ہے۔ (صحیح)